دعوتِ اصلاح و تبلیغ کا ترجمان

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا اِلٰہ اِلا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہو اور ہمارا ایمان ہو کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہو

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہو، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہو، دراصل یہ

اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی

اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لاچکے ہیں ان کا فرض ہو کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السموٰت والارض انت ولیی فی الدنیا والاٰخرۃ

توفنی مسلما والحقنی بالصٰلحین۔

"ادارۂ الفرقان"

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۷۸۶

ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

شرحِ چندہ — ہندوستان اور پاکستان سے

سالانہ :- پانچ روپئے
ششماہی :- تین روپئے
فی پرچہ :- آٹھ آنہ

شرحِ چندہ — غیر ممالک سے

سالانہ :- ۱۲ شلنگ
ششماہی :- ۷ شلنگ
فی پرچہ :- دس آنہ

جلد (۱۹) بابت ماہ محرم الحرام ۱۳۷۱ھ مطابق اکتوبر ۱۹۵۱ء نمبر (۱)

☐ **یہ سرخ پنسل کا نشان!** اِس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری اس شمارہ پر ختم ہو گئی ہے، اگر آپ کو آئندہ سال بھی الفرقان سے تعلق رکھنا منظور ہے تو براہِ کرم سالانہ چندہ مبلغ (پانچ روپئے) روانہ فرما دیجئے، آپ کی آسانی کے لئے منی آرڈر فارم حاضر ہے، ورنہ بصورت دیگر ایک کارڈ کے ذریعہ اپنے ارادہ سے دفتر کو مطلع فرما دیجئے۔ اگر ۱۰ر دسمبر تک آپ کا چندہ یا انکاری کارڈ موصول نہ ہوا تو حسبِ قاعدہ اگلے مہینہ کا پرچہ بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا، اس میں آپ کے چھ آنے زیادہ خرچ ہوں گے، اور اگر خدانخواستہ آپنے وصول نہ فرمایا تو الفرقان کو آپ کی ذات سے چھ آنے کا نقصان پہونچے گا، اِس بات کو ملحوظ رکھئے ——— ناظم الفرقان لکھنؤ

نوٹ:- پاکستانی حضرات اپنا چندہ ذیل کے پتہ پر ارسال فرمائیں:-

"جناب حاجی عبد الجبار صاحب ایس، جے، اینڈ جی فضل الٰہی کمپنی، ساؤتھ نیپیئر روڈ کراچی

اور منی آرڈر رسید ہمیں بھیجدیں ——— نمبر خریداری کا حوالہ دینا ضروری ہے

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحِ جلد نوزدہم (۱۹)

الحمد للہ لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کل شیٍٔ قدیر
لا حول ولا قوۃ الا باللہ ولا نعبد ولا نستعین الا ایاہ لہ النعمۃ ولہ الفضل ولہ الثناءُ
الحسن - لا الٰہ الا اللہ مخلصین لہ الدین ولو کرہ الکافرون اللّٰھُمّ لا مانع لما اعطیت
ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منک الجد
نسئلک اللّٰھمّ ان تصلی وتسلم علیٰ نبیک الکریم سیدنا محمّد وآلہ واصحابہ اجمعین
واتباعہ الیٰ یوم الدین -

الفرقان اپنی عمر کے اٹھارہ (۱۸) سال طے کرکے آج انیسویں (۱۹) سال میں قدم رکھ رہا ہے - اٹھارہ سال کے اس طویل عرصہ میں دین کی اگر کچھ خدمت ہوسکی تو وہ محض اللہ کی طرف سے تھی اور اسکی توفیق سے، اور جو غلطیاں اور کوتاہیاں ہوئیں وہ اپنی طرف سے - اللہ تعالیٰ ہماری سب چھوٹی بڑی غلطیوں کو معاف فرمائے، اُن کو بھی جو نادانستہ نادانی کی وجہ سے ہوئیں، اور اُن کو بھی جو دانستہ نفس کی شرارت سے - اور آئندہ ہر اُس چیز سے حفاظت فرمائے جو اُسکی مرضی کے خلاف ہو -

یہ زمانہ دین کی غربت اور کس مپرسی کا ہے، ایسے وقت میں جس بندہ کو دین کی خدمت کا کوئی موقع ملے وہ اس کی بڑی خوش نصیبی ہے، لیکن ساتھ ہی یہ زمانہ سخت فتنوں کا بھی ہے، اس لئے اس دور میں خدمتِ دین کا معاملہ بہت نازک ہے اور توفیقِ الٰہی دستگیری نہ فرمائے تو سخت خطرے ہیں - ناظرین کرام بھی دعا فرمائیں کہ جب تک یہ خدمت میسر رہے قلم کو اللہ تعالیٰ ہر زیغ وضلال سے بچاتے ہوئے دین کی صحیح خدمت، اور بلا خوف لومۃ لائم اظہارِ حق کی توفیق نصیب فرمائے، اور ایک لمحہ کیلئے بھی ہمیں ہمارے نفس کے حوالہ نہ کرے -

یا حی یا قیوم برحمتک نستغیث اصلح لنا شاننا کلہ ولا تکلنا الی انفسنا طرفۃ عین فانک ان تکلنا الی انفسنا تکلنا الی ضعفٍ وعورۃ وذنبٍ وخطیئۃ -

"ادارہ الفرقان"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

اکتوبر کی ۱۶ تاریخ تھی، ہم جدہ سے بمبئی آرہے تھے، بمبئی پہونچنے میں ابھی ۲-۳ دن باقی تھے گویا ہمارا جہاز بیچ سمندر میں تھا عصر کا وقت آنے والا تھا کہ جہاز کے ایک مسلمان افسر نے خبر دی کہ ابھی پاکستان ریڈیو نے بتلایا ہو کہ "لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان کو راولپنڈی کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کسی ظالم نے گولی کا نشانہ بنادیا۔ انکی حالت نازک ہے۔ لیکن ڈاکٹر مایوس نہیں ہیں" ——— ہر سننے والے کو رنج و قلق ہوا، بعض بندے دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگئے، مگر قضا و قدر کا فیصلہ دوسرا ہوچکا تھا، تھوڑی ہی دیر کے بعد انہی صاحب نے پھر خبر سنائی کہ مرحوم جانبر نہ ہوسکے اور اس جہان سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ——— سننے والوں نے مغفرت کی دعا کی۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ وتقبل حسناتہ وتجاوز عن سیئاتہ

مرنا جینا اس دنیا کا کوئی نیا نرالا واقعہ نہیں، آمد و رفت کا یہ سلسلہ ہر روز اور ہر دم جاری ہو، ہر شہر کے قبرستان میں دو چار نئی قبروں کا اضافہ روزانہ ہو ہی جاتا ہو، لیکن بعض حادثے اپنی خاص نوعیت کے لحاظ سے بڑے عبرت انگیز ہوتے ہیں۔ یقیناً پاکستان کے وزیر اعظم کا یہ حادثہ بھی انہی میں سے ہو اور جو دل اس سے سبق نہ لے وہ انسانی دل نہیں، پتھر کا ٹکڑا ہو۔

دنیا کی بے ثباتی و ناپائیداری، قضا و قدر کے مقابلہ میں بڑی سے بڑی طاقت اور اعلیٰ سے اعلیٰ انتظامات کی بے چارگی و درماندگی اور موت کا یقینی ہونا، اور مقرر وقت سے ایک سکنڈ کے لیے بھی نہ ٹل سکنا، یہ سب اس حادثہ کے ظاہری و عمومی اسباق ہیں، لیکن اس وقت خصوصیت کے ساتھ جس چیز کی طرف توجہ دلانا مقصود ہو وہ یہ ہو کہ اس قسم کے حوادث سے ہم یہ سبق خاص طور سے لیں کہ موت کس قدر اچانک آتی ہو اور بڑے سے بڑے آدمی کو بھی تیاری کی کوئی مہلت نہیں دیجاتی ——— اللہ تعالیٰ مرحوم کی پوری پوری مغفرت فرمائے اور ان کے اس مظلومانہ اور بیرحمانہ قتل کو کفارۂ سیئات اور رفع درجات کا ذریعہ اور حصولِ درجۂ شہادت کا وسیلہ بنائے، مگر ہم زندوں کو اپنے واسطے سبق لینے کے لیے سوچنے کی بات یہ ہو کہ اس دوسرے عالم میں پہونچ کر جسکی پہلی منزل قبر کا گڑھا ہو کتنے اعمالِ خیر اور کتنے اوامر خداوندی کے متعلق اس طرح جانیوالوں کو حسرت ہوتی ہوگی کہ کاش ہم ان میں کوتاہی نہ کرتے اور اپنے

کیے ہوئے کتنے کاموں کے متعلق رنج و افسوس ہوتا ہوگا کہ کاش وہ ہم سے سرزد نہ ہوئے ہوتے۔ لیکن وہاں یہ حسرت اور یہ رنج و افسوس کچھ کام نہ آئے گا، زندگی کے ختم ہونے کے ساتھ دفن ہونے سے پہلے ہی اعمال نامہ پر مہر لگ چکی ہوگی۔

یہ دن یقیناً ہم سب کے لیے آنا ہے اور اسی طرح آنا ہے کہ اس دن کی صبح تک بھی ہمیں خبر نہیں دی جائے گی کہ آج تمھارے کوچ کا دن ہے، پس موت کے لیے تیاری کا یہی وقت ہے جسکو ہم موت سے غافل ہو کر بے فکری اور بیدردی سے ضائع کر رہے ہیں ——— اور موت کی تیاری یہی ہے کہ اس دنیا میں پیدا کرنے والے اپنے جس مالک کے حضور میں موت کے بعد ہمیں حاضر ہونا ہے بس اس حضوری اور پیشی کا دھیان اور فکر رکھتے ہوئے اس دنیوی زندگی میں اس کے فرمانبردار اور اسکی شریعت کے پیرو کار ہو کر رہیں اور اپنی زندگی کے ہر شعبہ کو اُسکے زیر حکم کر دیں وامامن خاف مقام ربہ ونہی النفس عن الھوی فان الجنۃ ھی الماویٰ ——— فھل من مدکر!

ہمارے مخدوم محترم مولانا گیلانی نے اپنے ایک حالیہ مکتوب گرامی میں (جو برخوردار عتیق الرحمٰن سلمہ کے نام ہے) اسی حادثۂ فاجعہ کے سلسلہ میں چند سطریں تحریر فرمائی تھیں وہ اس لائق ہیں کہ ہر لکھا پڑھا مسلمان انھیں بار بار پڑھے اور اس وقت کی تاریکیوں میں ان سے روشنی حاصل کرے، تحریر فرماتے ہیں۔

"لوگ جان بچانے کے لیے پاکستان بھاگے جاتے تھے، مگر دیکھ لیا انھوں نے پاکستان پہونچکر، پاکستان کے سب سے بڑے اقتداری عہدے پر قابض ہونے کے بعد بھی قابض ارواح کو کوئی روک نہیں سکا۔ مرحوم کی موت سے مجھے تو زندگی کا یہی پیغام ملتا ہے۔ قل ان الموت الذی تفرون منہ فانہ ملاقیکم۔ ملاقات کے لیے بہرحال عزرائیل علیہ السلام وزارت کی کرسی پر بھی پہونچ ہی جاتے ہیں۔ اسی قسم کے مرنے والوں کی زبان سے سننے والوں نے یالیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین سنا ہے۔

جب ہند میں گاندھی جی کا واقعہ پیش آیا تھا اسوقت بھی دل نے یہی سمجھا تھا کہ غیروں کے ملک، غیروں کی جماعت میں نہیں، اپنوں میں اور کیسے اپنے جنکے جسم پر بھی حکومت قائم تھی اور روح بھی جنکی قابو میں تھی، ان ہی میں سے چاہنے والے کا جب ارادہ ہوا، تو ایک شخص کو اٹھایا گیا اور وہی وہ کچھ کر گزرا جسکی بڑے سے بڑے دشمن سے بھی عقل توقع نہیں کر سکتی تھی۔

عقل سے انسان سوچتا ہے، اسکے فیصلے بسا اوقات غلط ثابت ہوئے۔ کاش! انسان کبھی مسلمان بن کر سوچا کرے۔ سوچنے کی اسکو توفیق ہو، اور گوناگوں کثرتوں سے بھرا ہوا یہ عالم اسکو بھی ایک واحد ارادہ اور مشیت کے شیرازے میں جکڑا ہوا نظر آئے۔ جیسے قرآن پر ایمان والے کو نظر آتا ہے" یا

اسے نظر آنا چاہیے۔ تب قیمت سمجھ میں آتی ہو اس آیت کی جسکو یوسف علیہ السلام کی زبان سے قرآن میں نقل کیا گیا ہو۔ یہ فرمانے کے بعد کہ

ماکان لنا ان نشرک باللہ من شئ۔ — ہمارے لیے اسکی گنجائش ہی نہیں رکھی گئی ہو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو خواہ وہ کوئی ہو، ہم عالم کے نظام میں ساجھی مانیں۔

یہ کیا عجیب دل دوز، دل آویز، روح پرور فقرہ ہو کہ

ذالک من فضل اللہ علینا و علی الناس و لکن اکثر الناس لا یشکرون — (ساری کائنات کو ایک ہی مشیت اور ارادے کے ساتھ وابستہ یقین کرنا) یہ اللہ کا فضل ہم پر بھی ہو اور اور لوگوں پر بھی ہو۔ مگر اکثر آدمی اس کا شکر نہیں کرتے۔

اس سے زیادہ فضل اور کیا ہو سکتا ہو کہ لامحدود اسباب کی گتھیوں کو سلجھانے کی جگہ ہم پر یہ راز واضح کر دیا گیا کہ ہر چھوٹی بڑی بات میں ہمیں ایک ہی سے کہنا ایک ہی سے لینا اور دینا ہو۔ یہی مطلب ہو "موعظۂ یوسفی" کے اس جز کا جو فرمایا گیا کہ

أأرباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القهار۔ — بہت سے متفرق پروردگار بہتر ہیں، یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہو۔

بہرحال عقل والے انسانوں کو یہ بھولنا نہ چاہیے کہ عقل کے ساتھ ساتھ انکو قرآن کی شکل میں بھی علم کا ایک مستقل ذریعہ ارزانی فرمایا گیا ہو لیکن جو مسلمان ہو کر بھی ہمیشہ انسان ہی بننے پر اصرار کرتے ہیں جب انکا یہ حال ہو، تو جو غریب ابھی صرف انسان ہیں" اصحاب قرآن" کی جماعت میں شریک نہیں ہوئے ہیں انکا شکوہ کیا۔

ایک زرّیں وصیت اور نصیحت!

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنے مشائخ حرمین کے تذکرہ میں ایک مختصر سا رسالہ" انسان العین فی مشائخ الحرمینؒ" تحریر فرمایا ہو کل اتفاق سے اسکو دیکھ رہا تھا، چند سطریں اسمیں ایسی نظر پڑیں جنھیں خاصکر اس زمانہ کے اہل علم و دین کے لیے بڑا سبق ہے" الفرقان" کی خوش قسمتی ہوگی کہ یہ سطریں اس کے صفحات پر آجائیں۔

شاہ صاحبؒ اپنے استاذ حدیث شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی (مدنی) کا حال بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دن صوفیا کرام کے احوال کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ موصوف نے فرمایا ـــــ ان حضرات میں اگرچہ آپس میں اختلافات ہوں لیکن میں ان کے انکار سے بہت ڈرتا اور بچتا ہوں، اسی سلسلہ کلام میں شیخ موصوف نے شیخ اکبر ابن العربی کی" فتوحات مکیہ"

کا باب الوصیت نکال کر مجھے وہ مقام پڑھکر سنایا جہاں شیخ نے لکھا ہو کہ

ایک شخص سے مجھے عداوت اور نفرت تھی اور اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ شخص شیخ ابو مدین مغربی کو برا کہتا تھا اور میں انکو پوری بصیرت کیساتھ مقبولین میں سے جانتا تھا — ایک دن خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنی زیارت سے مشرف فرمایا، اور ارشاد فرمایا۔

لم تبغضت فلاناً	فلاں شخص سے تمہیں کیوں بغض ہو؟
قلت لانہ یبغض ابامدین وانا علی بصیرۃ منہ	میں نے عرض کیا اسلیے کہ وہ شیخ ابو مدین سے بغض رکھتا ہو اور میں علی وجہ البصیرت انسے عقیدت رکھتا ہوں۔
قال الیس یحب اللہ ورسولہ	حضورؐ نے ارشاد فرمایا کیا اسکو اللہ و رسول سے محبت نہیں ہے؟
قلت نعم!	میں نے عرض کیا ہاں اللہ و رسول سے تو وہ محبت رکھتا ہو۔
قال فلم تبغضہ لبغضہ ابامدین ولا تحبہ لحب اللہ ورسولہ	حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ پھر یہ کیوں ہو کہ ابو مدین سے بغض رکھنے کی وجہ سے تم اس سے بغض رکھتے ہو اور اللہ و رسول کی محبت کی بنا پر تم اس سے محبت نہیں کرتے۔

شیخ اکبر فرماتے ہیں — میں نے اپنی اس حالت سے اسی وقت توبہ کی اور اس شخص کے گھر پہونچا اور معذرت کر کے معافی چاہی اور ایک بیش قیمت کپڑا ان کی خدمت میں ہدیہ کیا اور میں نے ان کو راضی کر لیا اور خواب کا قصہ بھی بیان کر دیا — پھر میں نے ان سے پوچھا کہ شیخ ابو مدین کو برا کہنے کی وجہ آپ کے لیے کیا ہو؟ — انھوں نے ایک ایسی بات بیان کی جو سراسر غلط فہمی پر مبنی تھی۔ میں نے ان کو حقیقت حال بتائی، انھوں نے اپنی غلطی پر مطلع ہو کر فوراً رجوع کر لیا اور اسی وقت توبہ کی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہم سب میں سرایت کر گئی۔"

(انسان العین صفحہ ۴۲)

کیا دینی مدرسوں، خانقاہوں، اور دینی تحریکوں سے تعلق رکھنے والے ہم لوگ اس سے وہ سبق لیں گے جس کے لیے ہم سب کے مقتدا حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے استاذ شیخ ابو طاہر کے اس درس کو اپنے رسالہ میں محفوظ کیا تھا — بزرگوں کی نصیحت تو یہ ہو کہ "در نوشت است پند بر دیوار"۔

جماعتِ اسلامی سے متعلق مضمون[1] کا تکملہ

(از محمد منظور نعمانی)

ذیقعدہ کے شمارے میں "جماعتِ اسلامی" سے متعلق جو مضمون شائع ہوا تھا، اگرچہ معاملہ کی نزاکت اور اہمیت کے پیش نظر اس عاجز نے وہ خوب سوچ سمجھ کے اور کافی غور و فکر کے بعد لکھا تھا، لیکن جس دن میں نے اُس کو لکھ کر ختم کیا، چونکہ اُسی دن مجھے سفرِ حجاز کے لئے روانہ ہو جانا تھا اسلئے میں اُس پر ایک نظر بھی اطمینان سے نظرِ ثانی نہیں کر سکا تھا۔ حجاز سے واپسی پر "الفرقان" میں اپنا وہ مضمون میں نے چھپا ہوا پڑھا، اور اسی وقت احساس ہوا کہ دو تین باتیں جن کا ذکر کرنا میرے لئے ضروری تھا وہ ذکر سے رہ گئیں ——— ذیل کی سطروں میں وہی چیزیں عرض کرتا ہوں، گویا یہ سطور اسی مضمون کا تکملہ ہیں۔

"جماعت اسلامی ہند" نے اپنے مرکز رامپور میں ارکان کی تربیت کا ایک شعبہ قائم کر رکھا ہے، گذشتہ سال ایک دفعہ جب رامپور جانا ہوا تھا تو میں نے اُس کے نظام و نصاب کو تفصیل سے دیکھا اور سمجھا تھا، اور اُس وقت یہ اندازہ کر کے طبیعت خوش ہوئی تھی کہ جماعت سے تعلق رکھنے والے جو افراد اس شعبہ سے پورا فائدہ اٹھائیں گے وہ انشاء اللہ بہت سے اُن مفاسد سے محفوظ ہو جائیں گے جو میرے خیال میں جماعت کے بعض حلقوں میں پیدا ہو رہے ہیں، اور جن کی نشاندہی اس عاجز نے الفرقان کے اُس مضمون میں کی تھی ——— رامپور کی اس حاضری کے موقع پر اس شعبہ کے متعلق اس عاجز نے کچھ دوستانہ مشورے بھی دیئے تھے۔

بہرحال میرا خیال ہے کہ اپنے پچھلے مضمون میں جہاں میں نے جماعت کے بعض حلقوں میں پیدا ہونیوالے مفاسد کا تذکرہ کیا تھا وہیں مجھے جماعتِ اسلامی ہند کے اُس شعبۂ تربیت کا اور مفاسد کی اصلاح یا تقلیل کی آس سے مجھے جو اُمید ہوئی تھی اُس کا بھی تذکرہ وہیں مجھے کر دینا چاہیئے تھا۔

مجھے معلوم نہیں کہ جماعتِ اسلامی پاکستان [illegible] کام کی طرف کس درجہ میں متوجہ ہے، اور اس کے لئے کوئی ایسا

---

[1] شائع شدہ الفرقان ماہ ذیقعدہ ۱۳۷۰ھ

موزوں آدمی اُس کو ملا ہے یا نہیں؟ جیسے کہ ہندوستان کی جماعت کو مولوی حامد علی صاحب ملے ہوئے ہیں، جو جماعت کے حلقہ میں اس کام کے لئے موزوں ترین آدمی ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح ایک یہ چیز بھی ظاہر کر دینا میرے لئے ضروری ہے کہ جماعتِ اسلامی سے متعلق جو باتیں میں نے اپنے اس مضمون میں لکھی ہیں اور اکابر جماعت سے جن پر غور و توجہ کی استدعا کی ہے اُن میں سے بعض کبھی کبھی میں نے جماعتِ اسلامی ہند کے ذمہ داروں سے زبانی بھی عرض کی ہیں، انھوں نے از راہِ اخلاص و اعتماد اس عاجز کو کئی دفعہ اس کا موقع دیا، اور جہاں تک اپنا اندازہ ہے ہر دفعہ میری ان باتوں کو ان حضرات نے مخلصانہ مشورہ سمجھ کر ہی سنا ہے، اور اگر اپنی یہ معروضات مجھے جماعت اسلامی پاکستان کے حضرات تک پہونچانی نہ ہوتیں تو غالباً میں اُن کے لئے الفرقان کے صفحات کو استعمال کرنا پسند نہ کرتا کیونکہ جماعت اسلامی ہند کے اہل حل و عقد سے ملاقات اور گفتگو کی راہ کھلی ہوئی ہے، اور ہم ایک دوسرے پر اعتماد کے ساتھ کھل کر باتیں کر لیتے ہیں۔

اسی طرح ایک یہ بات عرض کر دینا بھی میرے لئے ضروری ہے کہ جماعتِ اسلامی کے ذمہ دار بزرگوں سے جو کچھ عرض کرنا اس عاجز کے نزدیک ضروری اور مناسب تھا، اگرچہ وہ سب بے تکلفی اور صفائی سے عرض کر دیا گیا ہے، لیکن دین کو برسرِ اقتدار لانے کی جو جد و جہد اس وقت خصوصاً وہ پاکستان میں کر رہے ہیں اس کے ساتھ اس عاجز کو بہرحال دلی، اور گہری ہمدردی ہے۔ اور میں پوری صفائی اور صراحت کے ساتھ اپنی طرف سے یہ اعلان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ انکی یہ جد و جہد اصولی اور مقصدی طور پر میرے نزدیک قطعاً دینی جد و جہد ہے، مجھے اس کے ساتھ خاص ہمدردی ہے، اور میں ان کی بھی نیت کر کے دُعا کرتا ہوں — اللھم انصر من نصر دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) واجعلنا منھم واخذل من خذل دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ولا تجعلنا منھم۔

آخر میں ایک بات یہ بھی عرض کرنی ہے کہ جماعتِ اسلامی کے بعض حلقوں میں پیدا ہونیوالے جن مفاسد کی میں نے اپنے مضمون میں نشاندہی کی ہے اُس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ جماعت سے تعلق رکھنے والے تمام افراد ان مفاسد میں مبتلا ہیں، بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ یہ چیزیں بس جماعت کی ایک معتد بہ تعداد میں پیدا ہو رہی ہیں اور پھیل رہی ہیں، ورنہ میں جماعت سے تعلق رکھنے والے ایسے بہت سے افراد سے ذاتی طور پر واقف ہوں جو بحمد اللہ ان چیزوں سے محفوظ ہیں۔ یہ بات اگرچہ میں اپنے مضمون میں بھی صراحت کیساتھ ظاہر کر چکا تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے مضمون کے بعض ناظرین نے اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے اسلئے مکرر اسکی تصریح کرتا ہوں۔

حکمرانی کے دو نظریے

"مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ایک عربی مقالہ کا ترجمہ"

(از عتیق الرحمٰن سنبھلی)

اگر ہم حکومتوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ممکن ہے بظاہر دیکھنے میں ہمیں بیسیوں قسم کی حکومتیں نظر آویں لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکومت کی اصل قسمیں دو سے زیادہ نہیں ہیں اور ماضی وحال کی تمام حکومتیں ان ہی دو میں سے کسی ایک کے تحت میں آجاتی ہیں ــــــ حکومت برائے عیش و دولت یا حکومت برائے ہدایت و خدمت ــــــ یہ دونوں قسمیں ہر بات میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہیں، ہر ایک اپنا ایک خاص مزاج رکھتی ہے، ہر ایک کے الگ الگ رجحانات ہوتے ہیں، ہر ایک اپنے لئے خاص سیرت وکردار کے آدمی چاہتی ہے، اور پھر ہر ایک کے کام کے نتائج بھی الگ الگ شکلوں میں رونما ہوتے ہیں۔

دونوں قسموں کا فرق! جس حکومت کا مطمح نظر تحصیلِ عیش و دولت ہوتا ہے اُس کا سارا نظام بس اسی فکر کے ماتحت گردش کرتا ہے کہ اس کا مالیہ زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو، آمدنی بے حساب ہو، اہلِ حکومت کو عیش و آرام کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر ہوں، ملک کی معیاری تہذیب تکلفات اور ٹیپ ٹاپ کا مرقع ہو، اور شہریت اور اس کے مظاہر میں اس بلا کا حُسن و جاذبیت اور اس غضب کی رونق اور سجاوٹ ہو جائے کہ دیکھنے والے کو جنّتِ ارضی کا گمان ہو۔ چاہے ان اغراض کیلئے اُسے غریبوں کا خون چوسنا پڑے، مزدوروں اور کسانوں پر ستم توڑنے پڑیں، جان لیوا ٹیکس اور محاصل عائد کرنے پڑیں، اُسے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ غریب رعایا پر کیا گذرے گی، بھاری بھاری ٹیکسوں کے نیچے دب کر اس کی کیا گت بنے گی، یا جس شہریت کے ایک رخ کو وہ اتنا خوش منظر بنانا چاہتی ہے اس کا دوسرا رُخ کتنا کریہہ المنظر ہو جائے گا۔ اسکی تمام تر دلچسپیاں صرف ان کاموں اور ان چیزوں سے تعلق رکھتی ہیں جن سے اس کی آمدنی اور آمدنی کے ذرائع میں اضافہ ہو، جن سے اس کی شان و شوکت میں چار چاند لگتے ہوں، جو بادشاہ یا رئیس مملکت اور اس کے وزراء کے لئے ان کی آل و اولاد کے لئے ان کے خاندان اور اہلِ خاندان کیلئے ان کے دوستوں اور دوستوں کے عزیزوں کیلئے ان کے خدمت گزاروں، حاشیہ نشینوں اور رجی حضوریوں کے لئے عیش و عشرت کے سامان مہیا کریں، اور جن

چیزوں کی بدولت وہ شاندار محل اور عالیشان کوٹھیاں تعمیر کرا سکیں، اور بڑی بڑی جائدادوں، کارخانوں، اور فیکٹریوں کے مالک بن سکیں۔ اس قسم کی حکومت کو اس کے علاوہ اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی۔

ایسی حکومت کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ جمہور کی اخلاقی اور رُوحانی تربیت سے غفلت برتتی ہے، ان کے اخلاق اور جذبات کی نگرانی کی قطعاً فکر نہیں کرتی، کیونکہ اس کے نزدیک کسی چیز کے قابل توجہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ اس میں کوئی مالی یا سیاسی فائدہ نظر آئے۔ اسی لئے بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر کسی معیوب یا ممنوع کام کے ارتکاب میں حکومت کو کوئی اس قسم کا فائدہ نظر آتا ہے تو وہ اس کام کو قانوناً جائز قرار دے دیتی ہے بلکہ اس میں لوگوں کی ہمت افزائی کرتی ہے، اور اس کے برعکس اگر کسی جائز کام میں کسی مالی یا سیاسی نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے تو اس کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس کی مالی حرص بلکہ بھوک اس حد تک پہنچی ہوئی ہوتی ہے کہ ہر وہ کام اور ہر وہ اقدام جو آمدنی بڑھانے کا ذریعہ بن سکتا ہو فی نفسہٖ خواہ کتنا ہی معیوب کیوں نہ ہو اس کی نگاہ میں مستحسن ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات عبادات اور مرنے جینے تک پر (کسی بہانہ سے) ٹیکس لگا دیا جاتا ہے اور اس طرح یہ حکومت اپنے اصل فرائض (یعنی عوام کے مفاد کی نگرانی، ان کی راحت اور خوشحالی کی فکر، اور ان کی اصلاح و تربیت کے انتظام) کو پسِ پشت ڈال کر ایک بڑی تجارتی کمپنی کا پارٹ ادا کرنے لگتی ہے جسے نفع اندوزی کے سوا نہ کوئی فکر ہے نہ کوئی کام۔

اس کے برعکس دوسری قسم کی حکومت یعنی جو "حکومت برائے ہدایت" کے نظریہ پر قائم ہوتی ہے اُسکے سامنے ایسے پست اور ذلیل مقاصد نہیں ہوتے، وہ مالی منفعت اور سیاسی قوت کی بندگی نہیں کرتی، بلکہ اس کا ایک بالکل بے غرض اور بے لوث مشن ہوتا ہے جس کی خدمت کو وہ اپنے اقتدار اور اختیار کا سب سے اہم اور اوّل مصرف سمجھتی ہے۔ وہ مشن کیا ہوتا ہے ——؟ لوگوں کو اللہ کی بندگی کی طرف بُلانا، انھیں بھلائی اور سچائی کی راہ پہ لگانا، اور بُرائی کی راہ سے ہٹانا —— وہ اپنی کامیابی کا معیار زیادہ آمدنی اور زیادہ بچت کو نہیں قرار دیتی، بلکہ اُسکے نزدیک کامیابی کا معیار یہ ہے کہ اس کی قلمرو میں عام طور سے لوگوں کا کیرکٹر بلند ہو، ان کے دل اور انکی روحیں پاکیزہ ہوں، ان کی سیرتیں پسندیدہ اوصاف اور اچھی عادات کا آئینہ ہوں، مرنے کے بعد والی زندگی ان کی توجہات کا مرکز ہو، اس دنیا کے لذائذ اور منافع میں ان کا انہماک کم سے کم ہو، معیشت میں قناعت کے اصول پر عمل پیرا ہوں، معمولی گذر بسر کیلئے جتنا کافی ہو اس سے زیادہ کی ہوس نہ رکھتے ہوں، بُری باتوں سے نفرت رکھتے ہوں، خالق کی نافرمانی کے قریب جانے سے ڈرتے ہوں، اور اچھی باتوں اور بھلے کاموں میں ہر شخص دوسروں سے بڑھ جانے کی حرص رکھتا ہو —— یہ ہے اس حکومت کی کامیابی کا معیار۔ اگر یہ باتیں اس کے جمہور میں پائی جاتی ہیں تو وہ اپنے آپ کو انتہائی کامیاب اور خوش نصیب سمجھتی ہے، اگرچہ اس کامیابی کی قیمت اُسے اپنے پورے خزانہ سے

ادا کرنی پڑے، اور بچت کے نام کی ایک کوڑی بھی نہ ہے۔

اپنے پرخلوص مشن کی تکمیل کے لئے یہ حکومت طرح طرح کی کوششیں کرتی ہے، ملک کے ہر حصے میں واعظوں کا تقرر کرتی ہے، مبلغین بھیجتی ہے، امورِ خیر میں ہمت افزائی کرتی ہے، شراب سازی اور شراب نوشی بند کرتی ہے، ہر بُرے اور نازیبا کام پر دار وگیر کرتی ہے، ناچ رنگ کی محفلیں سرد کرتی ہے، اخلاق اور جذبات کو بگاڑنے والے کھیل تماشوں کو ممنوع قرار دیتی ہے، عریانی اور فحاشی پھیلانے والے عناصر کو معاشرہ میں سے نکال کر پھینک دیتی ہے۔ غرض وہ نظامِ عقاید، نظامِ اخلاق، اور نظامِ معاشرت میں بگاڑ پیدا کرنے والے تمام عوامل اور محرکات کا انسداد کرتی ہے، اور اس کو وہ اپنا اہم فرض سمجھتی ہے۔ اس حکومت کے دور میں مسجدیں آباد اور میکدے ویران نظر آتے ہیں، اچھے عناصر طاقت پاکر اُبھرتے ہیں اور ملک پر اپنی اچھائیوں کے ساتھ چھا جاتے ہیں، اس کے برعکس بُرے عناصر دبنے اور روپوش ہوجانے پر مجبور ہوجاتے ہیں، ہر طرف نیک کرداری اور نیک عملی کا دور دورہ ہوتا ہے، اور

"الذین ان مکنا ھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور" (وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین پر اقتدار بخشیں تو یہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، معروف کا حکم کریں اور منکر سے منع کریں۔ اور بیشک اللہ ہی کے قبضہ میں ہے انجام کار)۔

کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

اس حکومت کی پوری مشینری میں، اور اول الذکر قسم کی حکومت کی مشینری میں ہر لحاظ سے بڑا اختلاف ہوتا ہے۔ یہ اپنے طبعی میلانات اور جذبات میں اپنے کردار اور معاملات میں اُس سے بالکلیہ مغایر ہوتی ہے، اس کے کاموں میں حُبِّ خیر اور احتساب کی شان، ایثار وخدمت اور دیانت داری کی اسپرٹ اور قربانی وو فاشعاری کے جذبات نظر آتے ہیں، اس کا ہر قدم اسی اسپرٹ اور انھیں جذبات کے ماتحت اُٹھتا ہے۔ اس کے برعکس دوسری قسم کی حکومت (جس کا اصل مقصد تحصیلِ دولت ہوتا ہے) کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی مشینری میں خدمت، ایثار اور دیانتداری کی رُوح بالکل مفقود ہوتی ہے، اِسلئے خود مملکت کے قانون اور اس کی مشینری کے درمیان سخت کشاکش دیکھنے میں آتی ہے۔ خود حکومت کی مشینری ہی حکومت کے قانون کو ناکام اور بے بس کرنے اور اس سے گلو خلاصی کے درپے رہتی ہے۔ وہ عوام کے مقابلے میں خود کو برتر سمجھتی ہے، اُسے اپنی حیثیت پر غرور اور گھمنڈ ہوتا ہے، اس کے کل پُرزے جھوٹ، بد دیانتی، منافقت اور رشوت ستانی کے اس درجہ خوگر ہوتے ہیں کہ بعض وقت ایک شریف انسان خانۂ کعبہ تک میں یہ دُعا کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ خدایا! ان سے کبھی واسطہ نہ ڈالئے!۔ ان لوگوں کی یہ خصلتیں

یہ حال کر دیتی ہیں کہ جب تک آدمی اِدھر اُدھر تھوڑا بہت خرچ نہ کر دے اپنے اُن حقوق کا فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتا جو بحیثیت مملکت کے شہری ہونے کے مملکت کا قانون اُس کے لئے تسلیم کرتا ہے، حتیٰ کہ انصاف جیسے بنیادی حق کے حاصل کرنے کے لئے بھی اُسے کچھ قیمت چکانی پڑتی ہے۔ غرض اس حکومت کے سایہ میں عام باشندوں کو بڑی سخت پریشانیوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسے کہ ببول کے سایہ میں کانٹوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اسلئے کہ اس حکومت کی مشینری کا کوئی فرد یہ عقیدہ تو رکھتا نہیں کہ مجھے جو کچھ اختیار اور قوت حاصل ہے وہ قوم اور اہلِ ملک کی امانت ہے جس کا مجھے غلط استعمال نہیں کرنا چاہئے، اور میں صرف ایک خادم ہوں۔ بلکہ وہ تو اپنے بارے میں یہ خیال رکھتا ہے کہ میں ایک محصل ہوں اور مجھے جو کچھ اختیار حاصل ہے اس کا صحیح مصرف تحصیل وصول ہے ——— اور وہ بھی جہاں تک ہو سکے اپنے لئے، نہ کہ سرکاری خزانے کے لئے ——— حکومت نے مجھے اس عہدے یا پوسٹ پر پہونچا کر کمائی کا ایک بہترین موقع دیا ہے، میں اسے کیوں ہاتھ سے جانے دوں۔ یہ تو بہتی گنگا ہے جس میں ہر شخص ہاتھ دھو رہا ہے، میں ہی کیوں محروم رہوں، اور جب لٹیروں کے قافلے میں شرکت ہی کی ہے تو ان کے امتیازی پیشے سے پرہیز کیونکر کروں؟۔

حکومت برائے ہدایت کا ایک مثالی نمونہ

تاریخ میں اس ننگِ انسانیت حکومت کی سیکڑوں مثالیں موجود ہیں اور آج بھی ہم اپنے چاروں طرف اسی قسم کی حکومتیں پاتے ہیں، اسلئے نہ تو اسکی تمثیل کی چنداں ضرورت ہے اور نہ اس کی خصوصیات کی مزید وضاحت کی، البتہ وہ حکومت جس کے پیشِ نظر بندگانِ خدا کی ہدایت اور بھلائی ہوتی ہے اس کی مثالیں تاریخ میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں، اور فی زمانا تو وہ بالکل ہی عنقا ہے، اسلئے اس کی وضاحت کے لئے ضرورت ہے کہ اس قسم کی حکومت کی کوئی مثال بیان کی جائے۔

چھٹی صدی عیسوی میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو مخاطبین کا وہ بہترین عنصر اس دعوتِ حق کی طرف کھنچ آیا جس نے اپنے زمانے میں اپنے کو قرآن کی ان آیات کا بہترین مصداق ثابت کیا۔

"فتیۃٌ آمنوا بربھم وزدناھم ھدًی وربطنا علٰی قلوبھم اذ قاموا فقالوا ربنا رب السمٰوات والارض لن ندعو من دونہٖ الٰھًا لقد قلنا اذًا شططا ھٰؤلاء قومنا اتخذوا من دونہٖ اٰلھۃً، لولا یاتون علیھم بسلطانٍ بینٍ، فمن اظلم ممن افترٰی علی اللہ کذبا۔

(ترجمہ) "وہ ایک جماعت تھی جو اپنے سچے رب پر ایمان لائی اور ہم نے ان کو اور زیادہ ہدایت دی اور مضبوط کر دیا ان کے دلوں کو جبکہ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے یہ کہتے ہوئے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمان و زمین کا رب ہے، ہم ہرگز نہ پکاریں گے اُسکے سوا کسی کو (اور بالفرض اگر ایسا کیا گیا) تو ہماری یہ بات عقل سے بہت دُور ہوگی، یہ ہماری قوم والے ہیں جنھوں نے اُس ایک کے سوا دوسرے معبود بنا لئے ہیں، یہ اُن کے معبود ہونے پر کوئی وزنی دلیل کیوں نہیں لاتے (اور اگر دلیل نہیں ہے) تو اُس سے بڑھ کر نا انصاف کون ہے جو اللہ پر بہتان تراشے۔"

رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس دعوت پر لبیک کہنا سوسائٹی کی نظر میں ان کا بہت بڑا جرم تھا جس کی پاداش میں یہ مردانِ باصفا، جور و جفا اور قہر و بلا کے تیروں پر رکھ لئے گئے، خوب خوب مشقِ ستم کی گئی، اور پوری سنگدلی کے ساتھ ستائے گئے، مگر اُن سے تو پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا۔

"احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنّا وھم لا یفتنون ولقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین۔" (ترجمہ) "کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انھیں صرف "آمنّا" کہنے پر چھوڑ دیا جائے گا اور ان کے اس دعوے کی آزمائش نہیں کی جائیگی حالانکہ ہم نے ان کے اگلوں کو آزمایا ہے — اللہ تعالیٰ ضرور جان لے گا اُن کو جو سچے ہیں اور اُن کو جو جھوٹے ہیں۔"

اِسلئے آزمائش کے کسی مرحلے میں ان کے قدم ذرا نہ ڈگے اور پہاڑوں کی شانِ استقامت کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹے رہے، انھوں نے پہچان لیا کہ یہ مصائب تو وہی ہیں جن کے ورود کی خبر اللہ اور اللہ کے رسول نے ہمیں پہلے ہی دے دی تھی۔ ھذا ما وعدنا اللہ ورسُولہٗ وصدق اللہ ورسُولہٗ۔ وہ آزمائش و ابتلا کے ان کٹھن مراحل کو پورے صبر و ثبات کے ساتھ طے کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کا کھرا پن اور سچائی ظاہر ہوگئی، اور اللہ نے ہجرت کی اجازت مرحمت فرما دی، اب ان کی دعوت کو نسبتاً کم دشوار گذار راستہ مل گیا پہلی سی مزاحمتوں کا سامنا نہ رہا اسلئے کامیابی کی رفتار تیز ہوگئی اور رفتہ رفتہ یہ جماعت اس پوزیشن میں آگئی، کہ خلافتِ ارضی کی ذمہ داریاں سنبھال سکے پس مشیتِ الٰہی کا تقاضہ ہوا کہ انھیں اقتدارِ حکومت بخشدیا جائے، تاکہ یہ دنیا میں اعتدال قائم کریں، ظلم اور بے انصافی کا استیصال کریں، انسانوں کو ظنون و اوہام کی اندھیریوں سے نکال کر نورِ حقیقت سے آشنا کریں، جن غلط اصولوں کی پابندی اور رسُوم و رواج

کی بندشوں نے ان پر زندگی تنگ کر رکھی ہے ان سے نجات دلا کر ان پر جینا آسان کریں اور ان کو انھیں جیسے انسانوں کی غلامی سے آزاد کرا کر صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کی غلامی اور بندگی کا سبق پڑھائیں ــــــ یہ ذمہ داریاں تھیں جو حکومت کے ساتھ ان پر عائد کی گئیں ــــــ تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے ان ذمہ داریوں کا حق ادا کر دکھایا، اور وہی کام کئے جو حکومت برائے ہدایت کا طرۂ امتیاز ہیں، نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کیا، ہر برائی کی بندش کی، اور ہر بھلائی کی پرورش!۔

بہر حال دعوتِ اسلامی کا یہ شجر حکومت کا پھل لایا، اور جن لوگوں نے اس پودے کے نشو و نما اور اس کی حفاظت و بقا کی خاطر اپنی جانوں کی بازیاں کھیلی تھیں انھوں نے اپنی قربانیوں کا پہلا صلہ عزت و شوکت اور اقتدار کی صورت میں پالیا۔

لیکن سچ یہ ہے کہ یہ انعام بجائے خود ایک بڑا امتحان تھا، بلکہ اب تک کے تمام امتحانوں اور تمام آزمائشوں سے زیادہ سخت اور نازک امتحان تھا مشیت کے اس تازہ فیصلہ نے انھیں ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا ــــــ حکومت کے دوراہے پر ــــــ! جہاں ان کے سامنے دو راستے تھے، ایک راستہ "حکومت برائے خدمت و ہدایت" کا تھا، اور دوسرا راستہ "حکومت برائے دولت و راحت" کا تھا، اس منزل تک یہ قافلہ بغیر حکومت کے ہدایت و خدمت ہی کی راہ پر گامزن تھا۔ مگر یہاں پہونچ کر ایک دوسری راہ بھی سامنے آگئی تھی جس کا ہر ذرہ مجسم کشش تھا، اس میں قدم قدم پر مال و دولت کے انبار تھے، سیم و زر کی چمک دمک تھی، عیش و عشرت کے مواقع تھے، اور سب سے بڑھ کر حکومت کے نام سے خدائی تھی، بس شرط اتنی تھی کہ یہ اس راستہ پر قدم بڑھا دیں اور اس راہ کے پیشرؤوں کی طرح رعایا کو ٹیکس، محاصل اور رشوت و خراج کے بھاری بوجھوں تلے دبا دیں ــــــ ان دونوں میں سے کسی ایک راہ کا انتخاب کرنا تھا، اسلئے یہ قافلہ ذرا ٹھٹکا، مگر فوراً ہی ہاتفِ غیبی نے پکار کر کہا۔

"خبردار! تم جناب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جانشین ہو، جو دنیا کو سیدھی راہ پر لگانے آئے تھے، کچھ وصول کرنے نہیں آئے تھے، وہ صرف ہادی تھے، نہ کہ محصّل"

انھیں ذرا بھی تردد نہ ہوا اور ایک لمحہ کی پس و پیش کے بغیر "حکومت برائے ہدایت" کی راہ اختیار کر لی اور فیصلہ کر لیا گیا کہ اللہ کے بخشے ہوئے اس اقتدار کو شخصی اور ذاتی منفعت و جاہ طلبی کے بجائے عالم انسان کی ہدایت اور ہر پہلو سے اس کی زندگی کی اصلاح و تربیت کیلئے استعمال کیا جائے گا، اور یہی کام ہماری اس نوزائیدہ مملکت کا امتیازی نشان ہو گا، اس طرح وہ اس سخت ترین آزمائش میں بھی پورے اُترے۔ رضی اللہ عنھم و ارضاھم

بالفرض اگر وہ اس کے برعکس فیصلہ کر لیتے اور فرائض کو نظر انداز کر کے منافع کا راستہ اختیار کر لیتے تو واقعہ یہ ہے کہ انھیں کوئی روکنے والا نہ تھا، دنیا نفع پرست اور فرض ناشناس حکومتوں کی عادی تھی، اس کے جسم پر

اس قسم کی سیکڑوں جونکیں چمٹی ہوئی تھیں، اگر اس نئی حکومت کے قیام سے بھی اس کی جونکوں میں ایک اور جونک کا اضافہ ہوجاتا، تو یہ کوئی ایسا حادثہ نہ ہوتا جس پر یہ چیخ اٹھتی، لیکن ایک خیال تھا جو اس وقت آڑے آیا، اور اس نے ان کا دامن پکڑ کر کہنا شروع کیا —— آپ کو اختیار ہے کہ جس راستے کو چاہیں اپنے لئے پسند کرلیں! مگر یہ سمجھ لیجئے کہ اگر آپ نے دعوت و ہدایت کی راہ کو چھوڑ کر ذاتی عیش و آرام اور نفع پرستی کی راہ کو اختیار کیا تو یہ اپنے اُن ساتھیوں کے ساتھ غداری ہوگی جو اپنی قربانیوں اور جاں نثاریوں کا پھل چکھے بغیر رخصت ہوچکے ہیں، یہ اُن مخلصین کے ساتھ بے وفائی ہوگی جن کے حصّے میں جہاد کی سختیوں اور بھوک پیاس کی شدتوں کے سوا کچھ نہیں آیا، آپ کا یہ فعل اُن اصحاب باصفا کی مقدس روحوں پر ظلم ہوگا جن کی زندگی مسلسل فاقوں میں گذری، اور آج کی زبردست فتوحات اور بے شمار مال غنیمت میں ان کا کچھ بھی حصّہ نہیں ہے۔ جیسے عثمان بن مظعونؓ، حمزہ بن عبدالمطلبؓ، مصعب بن عمیرؓ، انس بن نضرؓ اور سعد بن معاذؓ وغیرہ جن کی قربانیوں، جاں نثاریوں اور فاقہ مستیوں کی بدولت آپ کو یہ حکومت و اقتدار نصیب ہوا ہے، دراصل یہ اقتدار ایک حیثیت سے ان کی امانت ہے اسلئے یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ آپ اس کو اپنے مصالح اپنے منافع اپنی خواہشات اور اپنی اغراض کی تکمیل میں استعمال کریں، اقرباء پروری اور احبّاء نوازی کے کام میں لائیں، شکم پروری اور عیش کوشی کا ذریعہ بنائیں۔ اسلام کے ان جاں نثاروں نے اِسلئے وطن نہیں چھوڑا تھا، اِسلئے فاقے نہیں کئے تھے، اِسلئے جہاد نہیں کیا تھا، اور اِسلئے مصیبتیں مول نہیں لی تھیں کہ وہ اور ان کے ساتھی طاقت حاصل کرکے قیصر وکسریٰ کی جانشینی کریں اور اونچے اونچے محلوں میں دادِ عیش دیں، یہ پاپڑ انھوں نے اسلئے بیلے تھے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقصد بعثت کی تکمیل کریں، اور رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کا مقصد عالمِ انسانی کی ہدایت تھا ہدایت! اِسکے سوا کچھ نہیں۔

بس یہ خیال تھا جس نے ان کو اقتدار کے غلط استعمال سے باز رکھا، اور صحیح راہ کے انتخاب میں امداد دی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے شایانِ شان راستے کا انتخاب کرلیا، اور فیصلہ کرلیا کہ وہ بھی اسی طرح سے زندگی گذار کر اپنے رفقاء کے پاس پہونچیں گے جیسے انھوں نے گذُاری تھی۔

پھر ان کے عمل نے اس فیصلے کا کتنا احترام کیا؟ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ مملکت کے قیام کے بعد چند ہی سال کے عرصے میں جب اس کے مجاہدین نے شام و ایران کو فتح کرلیا، اور قیصر وکسریٰ کے ہاتھوں سے اقتدار کی باگیں چھین لیں، اور ان دونوں مفتوح شہنشاہیتوں کے سارے خزانے اس نئی مملکت کے پایۂ تخت — مدینۂ منورہ — میں لاکر ڈھیر کردیئے گئے، بلکہ کہنا چاہئے کہ چاندی سونے کے دُو دریا ان دُو عظیم ترین سلطنتوں سے نکل کر مدینہ کی سمت میں بہنے لگے اور دونوں سلطنتوں کے وہ بہترین اموال اور ٹھاٹھ باٹھ کے وہ لاجواب اسباب

اس نئی مملکت کے سربراہ کاروں کے قدموں میں آپڑے، جنھیں انھوں نے اپنی پوری عمر میں بیداری میں توکیا شاید خواب میں بھی نہ دیکھا تھا ——— تو اس وقت اس کا پورا پورا موقع تھا کہ ان میں سے کوئی اگر چاہتا کہ کسریٰ کا تاج زرنگار اس کے سر پر رکھ دیا جائے یا قیصر کا بستر خاص اس کے نیچے بچھا دیا جائے تو بلا تکلف ایسا ہو جاتا۔ مگر ——— ہمیں حیرت ہو جاتی ہے جب ہم یہ سنتے ہیں کہ ——— اس ارادہ سے تو انھوں نے ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہ لگایا ——— پھر ہماری حیرت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب ہم اس پہلو پر بھی نظر کرتے ہیں کہ یہ موقع انھیں اس وقت حاصل ہوا تھا جبکہ انھیں زندگی کی تلخیاں برداشت کرتے، کھانے پینے اور پہننے میں تنگی اور تکلیف اُٹھاتے ہوئے تقریباً ایک چوتھائی صدی گذر چکی تھی، اس مدت میں انھیں مشکل ہی سے اتنا کھانا اور کپڑا میسر ہوتا تھا جس سے پیٹ بھرا جا سکے، اور تن ڈھکا جا سکے ——— ایسے وقت میں دنیا کی دو عظیم ترین سلطنتیں مع اپنے ہر قسم کے مال و دولت کے ان کے قبضے میں آتی ہیں، اور یہ ان کے مال و دولت کو نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتے ——— بڑی بات تھی! ——— استغناء و استقامت کا حیرت انگیز مظاہرہ!! ——— بخدا ایسی استقامت! جس کی توقع پہاڑوں سے بھی نہیں کی جا سکتی، استغناء کے ایسے امتحان میں بڑے بڑے ضرب المثل کرداروں کو فیل ہوتے دیکھا ہے ——— مگر یہ کامیاب ہوئے ——— کیوں ——— ؟ اِسلئے کہ اُنھوں نے اس مسئلہ کو سرسری نظر سے نہیں دیکھا، اُن کے نزدیک یہاں سوال صرف یہ نہیں تھا کہ وہ تنگ دستی اور فاقہ مستی سے نجات پاکر خوش حالی اور کشائش اختیار کرنا چاہتے ہیں کہ نہیں۔؟ بلکہ اصل سوال ان کے خیال میں یہ تھا کہ کیا وہ آج اس مال و دولت، اس تاج و تخت، اور "زینتِ دُنیا" پر ریجھ کر ہمیشہ کے لئے اپنے اصول، اپنے مقاصد، اپنی دعوت، راہِ حق کی رہبری اور اُسکے تقاضوں کو خیرباد کہہ دینے کا فیصلہ کرتے ہیں، یا یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ سیم و زر کے اس سیلاب، اور سکّوں کی جھنکار میں بھی دعوتِ نبویؐ کی اصل رُوح کو مضبوطی سے تھامے رہیں گے، اور جانشینانِ انبیاءؑ و حاملانِ دعوتِ حق کے مثالی کردار پر حرصِ دُنیا کا کوئی ہلکے سے ہلکا دھبّہ بھی نہ لگنے دینگے۔

ان کے لئے بہترین موقع تھا [illegible] ن و ایرانی شہنشاہتیوں کے سقوط کے بعد وہ ایک عظیم عربی شہنشاہیت کی نبیاد ڈالدیتے، او [illegible] انھی کے ارباب [illegible] ندار کی طرح عیش و عشرت میں ڈوب جاتے، اسلئے کہ یہ دونوں شہنشاہیاں بیک وقت ان کی مٹھی میں تھیں ——— کسریٰ اگر تنہا مملکتِ ایران کی دولت اور وسائل کے بل پر عیش و عشرت کے ریکارڈ قائم کرسکتا تھا ——— !قیصر اگر تنہا رومی شہنشاہیت کی دولت اور وسائل پر ناز کر کے شان و شوکت کے متکبرانہ مظاہرے کرسکتا تھا ——— ! تو خطاب کے بیٹے عمر فاروقؓ کیلئے بھی یہ سب کچھ کرنے، بلکہ اس سے بہت زیادہ کرنے کا موقع حاصل تھا، کیونکہ ان کا اقتدار بیک وقت روم و ایران دونوں پر تھا۔

بیشک عمرؓ اور ان کے رفقاء کرنے کو ایسا کرسکتے تھے ——— ! مگر وہ اس کو کیا کرتے کہ کانوں میں تو قرآن کی

یہ تنبیہ ہر وقت گونج رہی تھی ۔

"تلک الدار الآخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علواً فی الارض ولا فساداً والعاقبۃ للمتقین" (ترجمہ) "اس دارِ آخرت میں ہم اُن لوگوں کو عیش کا حق دیں گے جو دنیا میں نہ اپنی بڑائی کے خواہشمند ہیں، نہ (اس غرض کے لئے) فساد برپا کرتے ہیں، ——— اچھا انجام تو متقیوں ہی کا حق ہے"

اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد حافظہ کی تختیوں پر اُبھر اُبھر کر سامنے آرہا تھا، کہ:۔

"لا الفقر اخشیٰ علیکم ولکن اخاف ان تبسط علیکم الدنیا کما بسطت علی من کان قبلکم فتھلککم کما اھلکتھم" (ترجمہ) مجھے تمھارے فقر و فاقہ سے خطرہ نہیں ہے، بلکہ مجھے خطرہ اس سے ہے کہ دُنیا تم پر کشادہ ہو جائے، جیسے تم سے اگلوں پر ہوئی تھی، اور اُس نے جیسے انھیں برباد کر دیا تھا تمھیں بھی کر دے"

اسلئے وہ سب کے سب بیک آواز بول اُٹھے :۔

"اللّٰھم لا عیش الا عیش الآخرۃ فاغفر الانصار والمھاجرۃ"

(ترجمہ) بیشک زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے، خدایا تو ہم سب انصار و مہاجرین کو بخشدے۔

الغرض انھوں نے ہر قیمت پر اپنی دعوتی رُوح اور اپنے دعوتی کردار کی حفاظت کی، حکومت کی مگر حاکمانہ انداز کے بجائے داعیانہ انداز سے، دنیا میں رہے مگر اہلِ دنیا کی طرح نہیں بلکہ طالبِ آخرت بن کر، انھوں نے اس سیل تند و تیز میں بھی اپنے اوپر پورا قابو رکھا جس میں ہزاروں حکومتیں، سیکڑوں قومیں، ان کا تہذیب و تمدن، ان کے اصول و اخلاق، اور علوم و فنون خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ یہ قوت و اقتدار کا سیلاب تھا جس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا ہے :۔ ؎

تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے — صاحب نظراں، نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے — عقل و خرد و علم و ہنر ہے خس و خاشاک

لوگ تاریخ اسلام کے اس واقعہ کو انتہائی حیرت اور تعجب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ مجاہدینِ اسلام حضرت سعد بن وقاصؓ کی قیادت میں اپنے گھوڑوں سمیت دریائے دجلہ میں پھاند پڑے اور بغیر کسی جانی اور مالی نقصان کے اس کے پھاٹ کو پار کر کے دوسرے کنارے پر جا اُترے ——— بیشک واقعہ اپنی جگہ پر تعجب خیز ضرور ہے

اور اس پر زیادہ سے زیادہ تعجب کرنا بجا ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ قابل تعجب بات یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے دور میں روم وایران کو فتح کرنے والے مسلمان رومی وایرانی تہذیب وتمدن کے تلاطم خیز سمندر میں گھسے اور اس کنارے سے اُس کنارے تک جا نکلے، مگر اس ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ کہ ان کے اخلاق واطوار کا دامن ذرا بھی تر نہ ہونے پایا۔

عین فتوحات کے شباب کے زمانے میں ان کے بڑے سے لیکے چھوٹے تک ہر ایک نے اپنے تمدن کی زہد، سادگی، اور جفاکشی جیسی خصوصیات کو پوری طرح برقرار رکھا اور اپنی رُوح اور اپنے مزاج کو ان مفتوح اقوام کے عیش پرستانہ تمدن کی آلودگیوں سے بالکل پاک رکھا، حالانکہ "قعر دریا" میں پہونچ کر تردامنی سے بچے رہنے کو عقل آج تک محال سمجھتی رہی ہے!۔

عزت واقتدار کی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کے باوجود ان کی سادگی اور متاعِ دنیا سے بے رغبتی کا جو عالم تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ شاہ اہواز ہرمزان نے جب خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کیا، تو :-

> "خدام نے اس کی خاص شاہانہ وضع بنائی، دیباج کی ایک زرنگار پوشاک زیب تن کی گئی، اس پر سامانِ زینت آراستہ کیا گیا، سر پر آذین نامی تاج رکھا گیا جس میں یاقوت جڑے ہوئے تھے، تاکہ خلیفۂ اسلام اور مسلمان اس کو ہیئت شاہی میں دیکھیں چنانچہ اس کو اس شان کے ساتھ لئے ہوئے حضرت عمرؓ کے مکان پر پہونچے، وہاں آپ کو نہ پایا، تو لوگوں سے دریافت کیا کہ کہاں ملیں گے؟ معلوم ہوا کہ کوفہ کے ایک وفد سے مسجد نبوی میں ملاقات کر رہے ہیں، لہٰذا مسجد کا رُخ کیا، مگر آپ وہاں بھی نظر نہ آئے، پھر واپس ہوئے، راستے میں مدینہ کے کچھ لڑکے کھیلتے ہوئے ملے، انھوں نے دریافت کیا کیا معاملہ ہے؟ کیا امیر المومنین کی تلاش ہے؟ وہ تو دیکھو مسجد کے داہنے حصے میں اپنی بُرنس سر کے نیچے رکھے ہوئے سو رہے ہیں (ہوا یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کوفی وفد سے ملاقات کے وقت اپنی بُرنس پہنے ہوئے تھے، جب اُن سے فارغ ہوگئے اور وہ وفد اُٹھ کر چلا گیا اور آپ تنہا رہ گئے تو بُرنس جسم سے اُتار کے تکیہ کی جگہ سر کے نیچے رکھ کر سو گئے تھے) خیر وہ پھر پلٹے، اور اب کے اُن کے ساتھ کچھ تماشبین بھی ہو گئے تھے، مسجد میں داخل ہوئے، حضرت عمرؓ پر نظر پڑی تو آپ کے قریب بیٹھ گئے، آپ بالکل تنہا تھے، ہاتھ میں درہ لٹکا ہوا تھا، ان کے بیٹھنے پر ہرمزان (شاہ اہواز) نے دریافت کیا کہ

عمرؓ کہاں ہیں؟ بتلایا کہ یہ سو رہے ہیں (اور یہ خیال کر کے کہ باتوں سے امیر المومنین کی نیند خراب نہ ہو جائے) وفد نے باقی لوگوں کی طرف خاموشی کا اشارہ کیا (ہرمزان نے بھی اس کو محسوس کیا) اور اپنے ساتھ والوں سے کان میں پوچھا، ان کے دربان اور محافظ کہاں ہیں؟ انھوں نے کہا ان کا نہ کوئی دربان ہے نہ محافظ، نہ دفتر نہ محرر، اور نہ دربار و ایوان اس پر ہرمزان بولا! پھر تو انھیں نبی ہونا چاہئے تھا! کہا گیا کہ نبی گو نہیں ہیں مگر یہ کام نبیوں ہی کا کرتے ہیں، اسی اثناء میں حضرت عمرؓ کی آنکھ کھل گئی اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، ہرمزان پر نظر پڑی تو فرمایا کون؟ ہرمزان! وفد نے کہا جی ہاں! حضرت عمرؓ نے پھر اس کی ہیئت اور لباس کو غور سے دیکھا تو فرمایا: اعوذ باللہ من النار واستعین اللہ (میں جہنم کی آگ سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں اور اس کی اعانت کا طالب ہوں)" پھر فرمایا" الحمد للہ الذی اذل بالاسلام ھذا واشیاعہ۔ (تعریف اُس خدا کی جس نے اسلام کی قوت سے اس کو اور اس کے اعوان و انصار کو ذلیل و خوار کرایا)" پھر مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ برادرانِ اسلام! اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہو، اپنے نبی کے طریقِ زندگی کو اختیار کئے رہو، خبردار! یہ دنیا تمھیں اپنے دام فریب میں نہ لے لے، یہ بڑی ہی دھوکہ باز ہے۔ اس کے بعد وفد اہواز نے ہرمزان کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا: "یہ اہواز کے بادشاہ ہیں، ان سے گفتگو فرمائیے"۔ آپ نے فرمایا: "نہیں! میں اس سے اس وقت تک خطاب نہیں کروں گا جب تک کہ اس کے جسم سے زینت و آرائش کی ایک ایک چیز نہ الگ کر دی جائے"۔ یہ سنکر اس نے صرف بقدر ستر کپڑے کے علاوہ اپنے بدن کی ہر چیز اُتار ڈالی، اور ایک موٹے کھردرے قسم کا لباس اس کو پہنا دیا گیا، تب آپ نے اس سے گفتگو فرمائی[1]

یہ حال تو مملکت اسلامی کے دوسرے خلیفہ کا تھا، اسی مملکت کے چوتھے خلیفہ کا بھی حال سُن لیجئے جن کا دور آنے تک حدودِ مملکت کچھ اور وسیع ہو چکی تھیں۔

ضرار بن ضمرہؓ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد ان کے دور خلافت کا حال حضرت معاویہؓ سے بیان کرتے ہیں، کہ:-

"آپ دنیا کی رنگینیوں سے نفور تھے، رات کی تاریکیوں اور تنہائیوں سے آپ کو اُنس تھا،

---

[1] تاریخ طبری جلد ۴ ص ۲۱۷

قلبِ مضطر اور چشم اشکبار پائی تھی، آخرت کے سوچ میں ڈوبے رہتے، اور اسی سوچ میں کبھی کبھی خود اپنی ذات سے مخاطب ہو جاتے، روکھا پھیکا کھانا اور موٹا جھوٹا پہننا پسند فرماتے، خدا گواہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو اپنی برابر سمجھتے، ہم اگر کوئی درخواست کرتے تو آپ منظور فرماتے، ہم اگر آپ کے پاس جاتے تو خود بڑھ کر خندہ پیشانی سے ملتے، ہم اگر آپ کو دعوت دیتے تو تشریف لاتے، اہل دین کی توقیر فرماتے، ناداروں سے محبت رکھتے، کوئی طاقت ور یا ذی اثر فریق (طاقت اور اثر کے بل پر) آپ سے نامنصفانہ فیصلہ کرا لینے کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا، اور کوئی کمزور اپنی کمزوری پر نظر کر کے آپ کے انصاف اور اپنے حق سے مایوس نہیں ہوتا تھا، خدا گواہ ہے کہ بعض مواقع پر ان آنکھوں نے یہ منظر دیکھا ہے کہ شبِ تاریک اپنے پردے چھوڑ چکی ہے، ستاروں تک کو نیند آ چکی ہے مگر وہ اپنی خلوت گاہ میں اپنی داڑھی پکڑے ہوئے کھڑے ہیں، تڑپ رہے ہیں، بلبلا رہے ہیں، جیسے کسی کو سانپ نے ڈس لیا ہو، اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں جیسے کبھی کسی غم نصیب کو روتے دیکھا ہو، آپ کے اس وقت کے یہ الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ یادنیا! اِلیَّ تعرضتِ اَم لی تشوفتِ۔ هیهات هیهات غرّی غیری، قد بتتك ثلاثاً لا رجعة لی فیك فعمرك قصیر وعیشك حقیر وخطرك كبیر۔ آہ! من قلة الزاد وبعد السفر ووحشة الطریق۔

اے دنیا! کیا تو میرے آگے اپنا جال بچھا رہی ہے؟ کیا تو مجھ پر اپنے بناؤ سنگار کا جادو چلانا چاہتی ہے؟ جا دُور ہو جا! کسی اور کو بہلا، کسی اور کو پھسلا! میں تو تجھ کو تین طلاقیں دے چکا ہوں، اب تو مجھ سے مایوس ہو جا، اب میں تیری طرف رُخ نہیں کر سکتا، تیری عمر بہت تھوڑی ہے، تیرا عیش بہت حقیر ہے، لیکن تجھ سے خطرات بہت بڑے ہیں ——— آہ! توشہ کتنا کم! منزل کتنی دُور!! اور راستہ کتنا وحشت ناک[1]!!!۔

بہرحال خلفائے راشدین کے دور میں اسلامی حکومت کا شعار انسانی برادری کی خدمت اور دعوت و ہدایت

---

[1] صفۃ الصفوۃ لابن الجوزی ج ۱ - ۱۲

کی جدوجہد تھا، حکومت دین و اخلاق کے لئے بڑے بڑے مالی خسارے برداشت کرتی تھی، اگر کسی موقع پر اس کے سامنے لوگوں کے رُوحانی و اخروی منافع اور اپنے مادی و مالی فوائد میں ترجیح کا سوال آجاتا تو وہ بڑی خوشی سے لوگوں کی رُوحی واخروی منفعت کی خاطر اپنی مالی منفعت قربان کر دیتی، اور اگر کبھی کوئی ایسی صورت ہوجاتی جس سے اس کو تو کچھ مالی فائدہ حاصل ہوجاتا مگر دوسرے لوگوں کو رُوحانی اعتبار سے نقصان پہونچ جاتا تو اس پر خود حکومت کو اور عام مسلمانوں کو اتنا رنج و افسوس ہوتا جیسے کہ ان کے ہاتھ سے حکومت جاتی رہی، پہلے چار خلفاء اور پانچویں خلیفۂ راشد حضرت عمر بن العزیز رحمۃ نے ہمیشہ غیر مسلم مفتوحین سے جزیہ وصول کرنے پر ان کے اسلام لانے اور ہدایت یاب ہونے کو ترجیح دی، باوجودیکہ ان کے اسلام قبول کرنے کی صورت میں اسلامی بیت المال کو مالی اعتبار سے زبردست نقصان پہونچتا تھا، مگر چونکہ اس نقصان کے مقابلے میں بندگانِ خدا کو نجات اور دخول جنّت کا عظیم الشان اخروی فائدہ پہونچتا تھا جس کے لئے خود دعوت دینا اور لوگوں کو راغب کرنا ان کی حکومت کا اوّلیں مقصد اور ان کا منصبی فرض تھا، اِسلئے اس پر وہ دل سے خوش ہوتے تھے، اور اگر اس کے برعکس غیر مسلم اسلام لانے سے انکار کر دیتے تو باوجودیکہ جزیہ کی رقم سے بیت المال کو فائدہ پہونچتا، مگر انھیں سخت دکھ ہوتا، اِسلئے کہ ان لوگوں کا ہدایت پاجانا انھیں اپنے اس مالی فائدہ سے کہیں زیادہ محبوب تھا ——— اس سلسلہ کا ایک واقعہ مؤرخ طبری نے بروایت زیاد بن جزء الزبیدی بیان کیا ہے :-

> "زیاد کہتے ہیں، کہ :- ایک مرتبہ مصر میں ہم نے عیسائی قیدیوں کو ایک جگہ جمع کیا، کچھ شہری عیسائی بھی اکھٹے ہوگئے، پھر ہم نے یہ کرنا شروع کیا کہ ایک قیدی کو سامنے لاتے اور اس سے سوال کرتے کہ نصرانیت ہی پر قائم رہنا چاہتے ہو یا اسلام کو پسند کرتے ہو؟ اگر وہ اسلام کو اختیار کر لیتا تو ہم جوشِ مسرت سے اتنا زوردار نعرۂ تکبیر بلند کرتے کہ کسی شہر کے فتح کرنے کی خوشی میں بھی اتنے زوردار نعرے نہیں لگاتے تھے، پھر ہم اس کو اپنی جماعت میں شامل کر لیتے، اور اگر وہ نصرانیت ہی کو پسند کرتا تو عیسائیوں کی طرف سے خوشی کی آواز بلند ہوتی، اور وہ اس کو اپنی طرف لے لیتے، تب ہم اُس پر جزیہ مقرر کر دیتے، مگر بادل ناخواستہ، اِسلئے کہ اس صورت میں ہمیں اتنا رنج ہوتا تھا کہ جتنا کسی مسلمان کے نصرانی ہوجانے کی صورت میں ہو سکتا تھا[1]"

خلفاء راشدین کے یہی جذبات اور ان کا یہی داعیانہ طرزِ عمل تھا جس کے نتیجے میں اسلام گنتی کے چند سال میں مدینے سے نکل کر مشرق و مغرب کی وسعتوں میں پھیل گیا اور انسانی دنیا اخلاقِ فاضلہ کی دولت سے مالا مال ہوگئی

---

[1] تاریخ طبری جلد ۴ صفحہ ۲۲۷

——— خلفاء اربعہؓ کے گذر جانے کے بعد حکومت کی نوعیت بدل گئی، اسلئے رفتہ رفتہ آثار و نتائج بھی دوسرے رنگ کے ظاہر ہونے لگے، جاہلی طور و طریق زندہ ہونے لگے، اسلام کے سادہ تمدن میں تزئین و تفاخر کا رنگ بھرا جانے لگا، اور جامع الفاظ میں اقتدار کا نشہ رنگ لانے لگا۔ اسی اثناء میں حکومت کی باگ عمر بن عبدالعزیز کے ہاتھ میں آئی، یہ اس دوسرے دور کے خلفاء کے راستے کو چھوڑ کر خلفاء اربعہ کے راستے پر چلے، انھوں نے پھر سے حکومت کو دعوتِ دین کا خادم بنایا، ہدایت و خدمت کو شعارِ حکومت قرار دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گو انھیں کام کرنے کے لئے دو سال چند مہینے ہی کا وقت ملا، مگر انھوں نے عالمِ اسلامی کا رنگ بدل کر رکھ دیا، عیش پرستی کے سیلاب کو روکا، تمدن کا نقشہ بدلا، کارپردازانِ حکومت کے دماغ سے "نشۂ قوت" دور کیا، غیر اسلامی رسوم اور جاہلی تخیلات کا قلع قمع کیا، اور دینِ حق کو سربلند اور کفر کو سرنگوں کرنے کے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جن سے بڑی بڑی طویل المدت اسلامی حکومتیں قاصر رہیں ——— کیونکہ وہ مخلوق کی ہدایت و بھلائی کو اپنا واحد نصب العین بنانے کا فیصلہ کرنے پر قادر نہ ہو سکیں، بلکہ تحصیل مال و منفعت کو بھی اس کے ساتھ لیکر چلنا چاہا، اور جہاں ان دونوں چیزوں میں ٹکراؤ ہوا وہاں حکومت اکثر اپنی مالی منفعت کی طرف جھک گئی۔

حکومت راشدہ کے دور میں اسلامی ریاست کے مرکزی مقامات، دعوت و ہدایت کا بھی مرکز تھے، بایں معنی کہ جب کوئی مسلمان ان مقامات میں پہونچتا تو وہ صاف طور پر محسوس کرتا کہ وہ اسلام کے مرکز میں چل پھر رہا ہے، اسلامی فضا میں سانس لے رہا ہے، کیونکہ وہ کھلی آنکھوں سے دیکھتا کہ اسلامی حدود قائم ہیں، شرعی قوانین نافذ ہیں، اور ہر مسئلہ میں شریعت کا فیصلہ آخری فیصلہ ہے۔ وہاں اُسے کوئی متنفس ایسا نظر نہیں آتا جو دینی امور میں سست ہو، دین کی وقعت کو کم کرتا ہو، یا کھلے بندوں احکامِ اسلامی کی خلاف ورزی کرتا ہو۔ وہاں اُسے بدعت و معصیت کا وجود نہ ملتا، وہاں کے تمدن میں اُسے عریانی و فحاشی اور بے حیائی کا نام و نشان نظر نہ آتا، وہاں وہ حکومت کی مشینری کے متعلق رشوت کے چرچے اور بد دیانتی کے قصے نہ سنتا، غرض اُسے وہاں کوئی چیز بھی ایسی نظر نہ آتی جو رُوحِ اسلام کے منافی ہو، بلکہ ہر طرف تعلق باللہ اور فکرِ آخرت کی دعوت، حُسنِ اخلاق اور خدا ترسی کی دعوت، اتباعِ کتاب و سنت کی دعوت، شرک و بدعت سے بچنے کی دعوت، اور دین سے مکمل وابستگی کی دعوت و تاکید کے چرچے ہی سُننے میں آتے، وہ ان مقامات کے باشندوں کو اسی ذکر و فکر میں ڈوبا ہوا، اور اسی کے مقتضی پر عمل پیرا دیکھتا، خواہ وہ جلوت میں ہوں یا خلوت میں، بازار میں ہوں، یا رہگذر میں، اپنے گھر میں ہوں یا حکومت کے دفتر میں ——— اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان مقامات کے قیام سے اس شخص کی رگ رگ میں دین کی روح سرایت کر جاتی، وہ دین کا لذت شناس ہو جاتا، اس کا ایمان تازہ ہوتا، دل ایمانی قوت، اور اہل ایمان کی محبت سے لبریز ہو جاتا، دین کے احکام و مسائل معلوم ہوتے، اور دماغ حکمت و بصیرت سے

بہرہ ور ہوجاتا، اور وہ وہاں سے علم و حکمت، ایمان و استقامت، اہلِ دین کی محبت، اور اس کے نمائندوں پر اعتماد کی بیش بہا دولتیں لیکر اپنے گھر لوٹتا ——— یا اگر کوئی غیر مسلم یا بالکل نو مسلم ان مقامات میں پہونچ جاتا تو اس پر غیر اسلامی نظامِ حیات کے مقابلے میں اسلامی نظامِ حیات کی اور غیر اسلامی حکومت کے مقابلے میں اسلامی حکومت کی بہتری اور برتری عیاں ہوجاتی، اس کا جی چاہتا کہ یہیں رہ پڑے اور یہاں سے لوٹ کر غیر اسلامی حکومت میں جانے کا تصور تو اس کے لئے ایسا رُوح فرسا ہوتا جیسے اُسے جنت سے نکال کر جہنم میں ڈھکیلا جا رہا ہے۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جنھیں اس ہدایت شعار حکومت میں سب سے زیادہ مرکزیت حاصل تھی بس صرف حکومت کے صدر مقامات ہی نہیں تھے، بلکہ دین کی مثالی درسگاہ اور اسلامی تہذیب کا گہوارہ بھی تھے۔ یہاں اسلامی زندگی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر تھی، عالم اسلامی کے گوشہ گوشہ سے مسلمان یہاں کھنچ کر آتے تھے تاکہ دین کی حقیقت کو سمجھیں، اور اس کے عملی نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ پھر وہ یہاں سے دینی علم و عمل اور دعوتی رُوح کی سوغاتیں لے کر اپنے وطن واپس ہوتے، اور ہر معاملے میں اہلِ حرمین کے طرزِ عمل کو بطور حجت کے پیش کرتے، اور اس کو حجت مانا بھی جاتا، کیونکہ اس وقت حجاز کتاب و سنت کا علماً و عملاً امین و محافظ تھا، اور وہاں کی حکومت کو ہر دم اس بات کی لگن تھی کہ مرکزِ اسلام میں زندگی کا نقشہ پوری طرح کتاب و سنت کے مطابق ہو۔

اس حکومت کے مثالی دور کا خاتمہ لیکن ایک وقت آیا کہ جب مسلمانوں نے اس حقیقت کو بھلا دیا کہ یہ اقتدار اصل میں ایک انعام تھا، جو انکے اسلاف کو داعیانہ اور مجاہدانہ خدمات کے صلے میں دربارِ خداوندی سے عطا ہوا تھا، اور اب انھیں کے صدقے میں ان کو حاصل ہوا تھا۔ وہ اس بات کو بھول گئے کہ اگر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مبعوث نہ ہوتے، اگر انھوں نے دنیا کو اللہ کا پیغام اور اس کے دین کی دعوت نہ دی ہوتی، اگر آپ نے اس کے لئے قریش مکہ اور قبائلِ عرب کے ہاتھوں دل ہلا دینے والے مظالم نہ سہے ہوتے، اگر آپ نے اس دعوت کے لئے مکہ جیسا وطن نہ چھوڑا ہوتا، اگر آپ نے اس کے لئے کئی دن ثور کے بھیانک غار میں چھپنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی ہوتی، اگر معرکۂ اُحد میں دندانِ مبارک نہ شہید ہوئے ہوتے، اور اگر اُسی اُحد کے دن آپ کے پیارے چچا اس دعوتِ حق کے لئے شہید نہ ہوئے ہوتے، ہندہ نے ان کا مثلہ کرکے ان کا جگر مبارک نہ چبایا ہوتا، اگر بیر معونہ پر مقدس صحابہؓ کا دردناک قتل نہ ہوا ہوتا، اور اگر خبیب[1] پھانسی کے تختے پر

---

[1] یہ انصاری صحابی ہیں جن کے جسمِ مبارک کو کفار نے پہلے بھالوں سے چھیدا، اور پھر پھانسی دیدی، مگر اس استقامت و فداکاری کے پُتلے نے یہ شعر پڑھتے ہوئے جان دیدی: ؎

ولست اُبالی حین اُقتل مسلماً　　　علی ای جنب کان فی اللہ مصرعی

(اگر میرا قتل راہِ خدا میں ہے تو پھر مجھے پرواہ نہیں کیسے ہی قتل کیا جاؤں)

نہ چڑھے ہوتے ——— تو یہ دنیا آج یوں عربوں کی قدمبوس نظر نہ آتی، اور نہ یہ دمشق و بغداد[1] شہرت کے ہفت آسمان پر پہونچتے، نہ بنی مروان روم و ایران سے باج و خراج وصول کر سکتے تھے، اور نہ ہارون الرشید کا یہ منہ ہوتا کہ گذرتے بادلوں سے کہہ سکے:-

"امطری حیث شئت فسیأتینی خراجك" (جا، جہاں جی چاہے برس، تیری پیداوار کا خراج بہرحال میرے پاس آئے گا) ———

بہرحال ایک زمانہ آیا کہ مسلمان اس حکومت اور دعوت کے تعلق کو بھول گئے، خلافت راشدہ کے بعد ان کے حکمرانوں نے "حکومت برائے ہدایت" کے اساسی نظریہ کو بدل کر "حکومت برائے دولت و قوت" کی بنیاد ڈالی، اور اس خداداد اقتدار کو دعوتِ نبوی کی خدمت کے بجائے مالی منافع اور سیاسی مصالح کا آلۂ کار بنا دیا، دنیا کو اللہ کی بندگی کی طرف بلانے اور جنت کی راہ پر لگانے کا کام چھوڑ دیا، شریعت کی مقرر کردہ حدود عملاً معطل کر دی گئیں، جمہور کے دین و اخلاق پر سے احتساب اٹھا لیا گیا، امر بالمعروف، نہی عن المنکر کا سسٹم گویا اڑا دیا گیا، غرضیکہ قرآن پاک نے انبیاء سابقین کے گمراہ ہو جانے والے اخلاف کے متعلق جو فرمایا تھا:-

"فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشھوات" (ان اسلاف کی جگہ ایسے اخلاف نے لی جنھوں نے نمازوں کو لاپروائی کی نذر کیا، اور خواہشات کی پیروی کی)-

ان مسلمان حکمرانوں نے اپنے آپ کو اس کا صحیح مصداق بنا لیا - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے مرکز اب باہر سے آنے والے مسلمانوں کو نہ دینی زندگی کا درس دیتے، اور نہ ان کے سامنے اسلامی تہذیب و تمدن کی صحیح تصویر پیش کرتے، اب یہاں آنے والے ایمان و یقین کی روح پرور کیفیات، عقاید کے استحکام، دین اور اہلِ دین پر اعتماد کے بجائے شک و نفاق اور بے اعتمادی کے امراض میں مبتلا ہو کر لوٹتے۔ پہلے جن مقامات سے اطراف عالم کے مسلمان شعائر اسلامی کی توقیر، دین پر استقامت کا جوش، اس کے احکام کی تعمیل میں چستی اور اس کے نمائندوں کے ساتھ حسن ظن کی سوغات لیکر لوٹا کرتے تھے، اب وہ وہاں سے تعظیم و توقیر کی جگہ استخفاف و بے وقعتی، جوشِ استقامت کی جگہ ضعف، چستی کی جگہ سستی، اور حسنِ ظن کی جگہ سوءظن کی پوٹ لیکر اپنے گھر واپس آتے، اور پہلے جس طرح وہاں کے طرز عمل اور طرز زندگی کو ہر معاملے میں بطور حجۃ پیش کیا جاتا تھا، اب بھی اسی طرح پیش کیا جاتا ——— حالانکہ اب وہ اس قابل نہ رہا تھا۔

---

[1] بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانہ کے دار السلطنت - ۱۲

—— اور ناواقف لوگ اب بھی اس کی اس حیثیت کو تسلیم کرتے، اور یہ چیز اُن لوگوں کے لئے بڑی مصیبت اور ان کی راہ میں زبردست رکاوٹ بنی، اور آج بھی بن رہی ہے جو عالمِ اسلامی کے مختلف حصّوں میں پھر سے اسلام کے نظامِ حیات کو زندہ کرنے کے لئے کوشاں تھے، یا کوشاں ہیں۔

اسلامی دنیا بلکہ کُل انسانی دنیا کی سب سے بڑی ضرورت

آج عالمِ اسلامی کی بیسیوں مختلف ضروریات ہیں، مگر اس کی سب سے بڑی سب سے اہم اور سب سے مقدم ضرورت ایک ایسی حکومت ہے جو دعوت و ہدایت، اور خدمت و خیر خواہی کے نظریہ پر قائم ہو، اور عالمِ اسلامی کی اصل حیثیت کو دنیا کے سامنے پیش کرے، اسلئے، کہ اسلام اس وقت تک نہ لوگوں کے دلوں کو اپیل کرسکتا ہے اور نہ مفکرین عالم کے دماغوں کو مطمئن کرسکتا ہے جب تک کہ روئے زمین پر اُسے ایک ایسا ٹکڑا نہ مل جائے جہاں نظامِ زندگی کی تشکیل اس کی مرضی کے مطابق ہو، جہاں صرف اس کی تہذیب اور اس کا تمدن رائج ہو، جہاں انفرادی اور اجتماعی زندگی کا سارا کاروبار اُسکے نقشہ کے مطابق چلے، اور پھر دنیا اس تجربے کے نتائج دیکھے! —— یہ تجربہ اگرچہ چھوٹے سے چھوٹے خطۂ زمین پر بھی ہو مگر اس کے نتائج دنیا کو مجبور کر دینگے کہ وہ سنجیدگی سے اسلام پر غور کرے، اور پھر اگر خدا نے چاہا تو یدخلون فی دین اللہ افواجًا کا وہ منظر جسے دیکھنے کے لئے آنکھیں مدّت سے ترسی ہوئی ہیں ایک بار پھر دیکھا جاسکے گا۔

یاد رہے کہ یہ ضرورت تنہا عالمِ اسلامی ہی کی نہیں ہے بلکہ پوری انسانی دنیا اس قسم کی حکومت کی اتنی ہی حاجت مند ہے جتنی حاجت مند اسلامی دُنیا ہے، اسلئے کہ آج کی مریض و مجروح انسانیت کے دُکھ درد اور دلدّر دُور ہونے کی کوئی صورت اس کے سوا اور نہیں ہے کہ زمین کے کسی خطہ پر ایک ایسی حکومت کا قیام عمل میں آوے جس کی بنیاد اللہ کی اطاعت و عبدیت، نوعِ انسانی کے احترام و عظمت، مادی منافع کے مقابلہ میں روح کی اہمیت، خواہشات پر اخلاقی احساس کے غلبہ، اور دولت بنانے پر آدمی بنانے کو ترجیح دینے کے بلند نظریات پر رکھی گئی ہو —— یہ حکومت چاہے کتنی ہی چھوٹی اور کتنی ہی قلیل الوسائل ہو، مگر جس وقت بھی اور جہاں کہیں بھی قائم ہوگئی تو دنیا کے لئے ایک نادر واقعہ ہی نہیں جانفزا مژدہ بھی ہوگی، جس کے نتائج منظرِ عام پر آتے ہی ہر طرف سے بے اختیار مرحبا مرحبا کی آوازیں بلند ہوں گی، دنیا کے بڑے بڑے سیاسین اور مدبرین اور ائمہ فکر جو انسانیت کا حالِ زار دیکھ دیکھ کر روز بروز اس کے مستقبل سے مایوس ہوتے جارہے ہیں، ایک نئی اُمید کے ساتھ اس کی طرف نظریں اُٹھائیں گے —— لو وہ گہن سے نکلا سورج

بُرج × محن سے نکلا سورج

روشن اپنا مستقبل ہے

انسانیت کے اُلجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے میں اس کی کامیابی ضرب المثل بنے گی، آج جو مفکرین عالم اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں، وہی دنیا کو اس کی دعوت دیں گے، اور اس پر بڑی بڑی ضخیم تالیفات و تصانیف کا ڈھیر لگا دیں گے۔ دنیا کے عوام کے لئے اس کا قیام ایک ایسی نعمتِ غیر مترقبہ ہوگا جیسے ڈوبتے کو کہیں کنارہ مل جائے، انسانیت کی مظلوم اولاد، تہذیب جدید کی خوشنما ناگن کے ڈسے ہوئے اور رنا ہوا سماج کے ستائے ہوئے انسان، حکومتوں کے جور و ستم اور لوٹ کھسوٹ کے مارے ہوئے عوام ہر طرف سے اس نئی حکومت، نئی تہذیب، اور نئے سماج کے سایۂ عافیت میں پناہ لینے کے لئے دوڑیں گے ——— اور بلاشبہ یہ حکومت جبینِ دہر کا نور، اور رخ انسانیت کا خالِ دلکش قرار پائے گی۔

انسانیت سکھ اور چین کی تلاش میں بہت سی حکومتوں کا تجربہ کر چکی، اس نے شخصی حکومت کو بھی آزما لیا، جمہوری راج کو بھی آزما لیا، سرمایہ داری اور اشتراکیت کو بھی آزما کے دیکھ لیا، مگر کہیں اس غریب کی اُمیدیں بر نہ آئیں، کسی دُکان پر اس کے درد کی دوا نہ ملی، اسے رکھوالوں کے بھیس میں رہزن ملے جنھوں نے اس کا سہاگ لوٹ لیا، اس کی رگِ جاں کا خون چوس لیا، ہر نیا تجربہ کچھ نئی تلخیوں اور نئی اُلجھنوں کا باعث بنا، اور اب بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہونچ گئی ہے کہ ان حکومتوں کے نام ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف سہی مگر اصل سب کی ایک ہی ہے صورتوں میں کتنا ہی فرق سہی مگر حقیقت سب کی ایک ہی ہے، فطرت ایک ہی ہے، مزاج ایک ہی ہے، اور مطمح نظر سب کا ایک ہی ہے، اور وہ ہے ——— اس کا خون چوسنا اور موٹا ہونا، اس کو تباہ کر کے خود کو بنانا ———!

اب اگر ایسے وقت میں ایک نئی مملکت وجود میں آتی ہے جس کا صدر مسلمان، وزراء مسلمان، اور ارکان و حکام مسلمان! مگر اپنی حقیقت، اپنی فطرت، اپنے مزاج، اور اپنے مقاصد و نظریات کے اعتبار سے وہ دنیا کی دوسری حکومتوں سے مختلف و ممتاز نہیں ہے۔ تو یہ دنیا کا کوئی نرالا واقعہ نہ ہوگا، نہ یہ مظلوم انسانی دنیا اس کو کوئی خاص اہمیت دے گی، اور نہ کوئی بڑی اُمیدیں اس سے وابستہ کرے گی، اسلئے کہ اس قسم کی تو ہزاروں حکومتیں پہلے ہی سے موجود ہیں جو اپنی حدود کے لحاظ سے اس نئی حکومت سے کہیں زیادہ وسیع ہیں، ان کا میزانیہ بھی اس کے میزانیہ سے بہت زیادہ مضبوط ہے، ان کی پیداوار اور برآمد بھی زیادہ ہے، فوجی طاقت میں بھی اُن کا پلہ بھاری ہے، بری فوج ان کی زیادہ مضبوط، بحری بیڑہ ان کا زیادہ طاقت ور، اور فضائی طاقت میں بھی وہ اس سے فائق تر، کارخانے اور فیکٹریاں ان کے پاس زیادہ، صنعت و تجارت کے میدان میں بھی وہ زیادہ ترقی یافتہ، آرائش و نمائش کے لحاظ سے ان کی تہذیب و تمدن کا معیار بھی زیادہ بلند، ملکی نظم و نسق کے لحاظ سے بھی ان کی حالت بہتر، ان کے عوام میں تعلیم بھی نسبتاً عام، غرض دوسری موجودہ حکومتیں خصوصاً مغربی دنیا کی حکومتیں جب اس قسم کی چیزوں میں اس نوزائیدہ مسلم حکومت سے بدرجہا زیادہ آگے ہوں گی تو کیونکر اس کا قیام دنیا کی نظر میں کوئی خاص اہمیت حاصل کر سکے گا، جبکہ

اس کے پاس نہ کوئی نیا مقصد ہو نہ کوئی نیا نظریہ، اور نہ وہ اپنی خو بو میں ان سے مختلف ہو۔

دینی و اصلاحی دعوتوں کی تاریخ پر عبور رکھنے والے اور عادات الٰہیہ کے جاننے والے جانتے ہیں کہ دنیا کے کسی حصے میں مسلمانوں کی کسی سلطنت کا وجود میں آنا ایک ایسے نادر موقع کے ہاتھ آنے کے مرادف ہے، جو صدیوں میں کبھی ہاتھ آتا ہے، یہ گردش لیل و نہار کا ایک سنہرا لمحہ ہوتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے رات کی گھٹا ٹوپ اندھیریوں کے بیچ بیچ میں کبھی بجلی چمک جائے، لیکن جس قدر یہ موقع قیمتی ہے ارباب حکومت کیلئے اتنا ہی بڑا امتحان بھی ہے۔ اگر انھوں نے اس موقع کو اپنے ذاتی مفادات اور مصالح کے لئے استعمال کرنے کے بجائے اپنے دین کی دعوت کو طاقت ور اور مؤثر بنانے اور اس کے نظریات کو بروئے کار لانے کے لئے استعمال کیا تو بیشک انھوں نے اس کی قیمت پہچانی اور اس کا حقیقی فائدہ حاصل کیا، بیشک انھوں نے اپنے دین کی صحیح نمائندگی کی اور لوگوں کے حسن ظن کو حق بجانب ثابت کر دکھایا، اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنے والوں نے اپنے دین ہی کا نام اونچا نہیں کیا، بلکہ خود اپنی ذات کو بھی لافانی فائدہ پہونچا دیا، جو انھیں مرنے کے بعد ضرور معلوم ہو جائے گا، اور اگر انھوں نے اس کا الٹا کیا، یعنی دین، اس کی دعوت، اس کے مصالح، اس کے پھیلانے اور اس کا علم تھامے رہنے کیلئے لوگوں کی قربانیاں، نیز قیام حکومت کے سلسلہ میں ان کی مساعی وغیرہ ان تمام چیزوں کو نظر انداز کر کے اس نادر موقع سے صرف اپنی ذات اور متعلقین کے لئے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، اور بنو امیہ اور بنو عباس کے نقش قدم پر چلے، تو بیشک انھوں نے بہت برا راستہ اختیار کیا، انھوں نے اس بہترین موقع کو ضائع کر دیا، انھوں نے اپنا بھی نقصان کیا اور اپنے ساتھ دینی دعوت کا بھی نقصان کیا، اب کسے پتہ ہے کہ یہ موقع دوبارہ کب آئے گا۔ یا کبھی آئیگا بھی یا نہیں؟ اس کے متعلق کوئی کیا کہہ سکتا ہے —— تاریخ ایسی بہت سی امتوں اور جماعتوں کے متعلق بتلاتی ہے —— جنھوں نے اپنی حکومت و اقتدار کے موقع کو ضائع کر دیا، اور اس کا اصل فائدہ نہ اٹھایا —— کہ جب ان کا دور ختم ہو گیا اور یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو وہ زندگی کے میدان سے ہٹ گئیں، اور بصد حسرت و ندامت پچھڑی ہوئی قوموں کی صف میں کھڑے ہو کر عہد رفتہ کی واپسی کا انتظار کرنے لگیں —— مگر کسے پتہ ہے کہ یہ موقع لوٹ کر آئیگا یا نہیں یا اگر آئے گا تو کب آئے گا ——

اسلامی حکومتوں سے!

آج روئے زمین پر جتنی مسلمان حکومتیں قائم ہیں ان کے ارباب حل و عقد کو گویا یہ زریں موقع حاصل ہے۔ کاش! وہ اس سے فائدہ اٹھائیں اور ایک بڑے کارنامے کا سہرا اپنے سر باندھیں۔ ان کے لئے موقع ہے کہ ہمت اور توجہ سے کام لیکر وہ مرتبہ حاصل کرلیں جس پر بڑے بڑے اتقیاء و صلحاء اور عباد و زہاد بھی نہیں پہونچ پاتے، اسلئے کہ انھیں قوت و اقتدار، اور وہ مواقع کار حاصل ہیں جو دوسروں کو حاصل نہیں، ان کے لئے موقع ہے کہ اگر عزم و اخلاص کیساتھ

کھڑے ہو جائیں تو صرف ایک دن میں دین کی خدمت اور اس کے احیاء، سوسائٹی کی اصلاح، اور جاہلیت سے اسلام کی طرف اس کے رُخ کی تبدیلی کا اتنا کام ہو جائے جتنا مصلحین و اہل قلم برسوں میں نہیں کر سکتے، اور پھر دین و دنیا میں اللہ کی اتنی خوشنودی حاصل ہو جس پر بڑے بڑے زاہدوں اور متقیوں کو بھی رشک آجائے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کو ایک عظیم المرتبت مجدّد اور خلیفۂ راشد کے لقب کا اعزاز آخر اسی بنا پر تو حاصل ہوا کہ اسلامی حکومت خلافتِ راشدہ کے بعد جس غلط سمت میں سرگرم عمل ہوگئی تھی ـــــ ان کے ہاتھ میں جوں ہی باگ ڈور آئی ـــــ انھوں نے فوراً ہی اُسے اس سمت سے ہٹا کر صحیح سمت پر ڈال دیا، سیاست، تمدن، اور معاشرت میں زبردست اصلاحات کا بیڑا اُٹھایا، اور جاہلیت کی ایک ایک آمیزش کو بین ڈالا، اور اس سلسلہ میں ہر وقت ہر ناراضگی اور ہر چیں بجبینی کا انتہائی ثابت قدمی اور جوانمردی سے مقابلہ کیا ـــــ اور پھر اس کارِ عظیم کی انجام دہی میں انھوں نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے! تو واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ جان بوجھ کر کھو دیا، وہ اس شے کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہے، جس کو انھوں نے پالیا، اور اس پہلو سے ان کا یہ کارنامہ ان کی انتہائی دانشمندی کا بھی ثبوت ہے۔ جو چیزیں انھوں نے کھوئیں وہ تھیں ہی ایسی کہ ایک نہ ایک دن کھونی ضرور تھیں یعنی دنیا کا عیش، مال و متاع، لذیذ کھانے، عمدہ پوشاکیں، اور خدم و حشم ـــــ جنھیں نذرِ فنا ہو جانا ہی تھا، لیکن اتنا کچھ کھو کر جو کچھ انھوں نے پالیا تھا وہ ایسا تھا کہ دنیا و مافیہا کے عوض میں بھی ملجائے تو سستا ہے یعنی ایک دائمی راحت، لازوال عیش، پائیدار مسرت، سرکارِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک نظرِ کرم، اور آپ کے حلقۂ رفاقت کی شرکت کی اُمید، اور بعد والوں کے دلوں میں وقعت اور زبانوں پر ذکرِ خیر!۔

آج اسلام کو پھر ایک عمر بن عبدالعزیز کی ضرورت ہے ـــــ! دیکھیں یہ سعادت کس نصیب ور کیلئے مقدر ہے۔

امام ابن تیمیہ اور ابن القیّم ولی اللّٰہی مکتبِ خیال کی نظر میں!

(از۔ محمد منظور نعمانی)

اس عاجز نے دارالعلوم دیوبند کا طالب علم بننے سے پہلے بھی جہاں کہیں اور جس مدرسہ میں پڑھا، عموماً دیوبندی سلسلہ کے اساتذہ ہی سے پڑھا، اور جہاں تک یاد ہے اپنے ان سب اساتذہ کا یہی حال دیکھا کہ مختلف مباحث و مذاکرات کے سلسلہ میں امام ابن تیمیہ اور ابن القیم کا ذکر یہ حضرات احترام کے ساتھ کرتے تھے اور ان کی جلالت قدر کا اعتراف کرتے تھے ——— پھر جب توفیقِ الٰہی نے دارالعلوم دیوبند پہنچایا اور استاذی حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ کے حلقۂ درس کی حاضری کی نعمت نصیب ہوئی تو دیکھا کہ حضرت ممدوح کے درس میں حافظ ابن تیمیہ کا ذکر خصوصیت سے بڑی کثرت سے آتا ہے، ان کی بہت سی باتوں پر بحث و تنقید بھی کرتے ہیں، جوابات دیتے ہیں، لیکن انکی جلالتِ قدر کے پورے اعتراف کے ساتھ، (اور اسی) انداز میں جس طرح دوسرے علماء سلف اور اکابر امت کی تحقیقات اور آراء پر درس میں بحث ہوتی تھی۔

بہرحال اپنے اساتذہ کے اس طرزِ عمل کا اثر مجھ پر قدرتی طور سے یہی پڑا کہ امام ابن تیمیہ اور ابن القیمؒ کو میں اکابر علماء اہلِ سنت میں سے سمجھتا رہا ——— پھر "طالب علمی" کا یہ دور ختم کرنے کے بعد جب ان دونوں حضرات کی بعض تصانیف دیکھیں تو اس مطالعہ نے مجھے ان کی جلالت و عظمت کا اور زیادہ قائل کر دیا، اور ان دونوں بزرگوں کو میں امت کے مخصوص ترین دینی و علمی محسنوں میں سے سمجھنے لگا۔

اب ۱۵-۱۶ سال پہلے کی بات ہے ایک مناظرہ میں ایسا اتفاق ہوا کہ میں نے علم غیب نبوی کے مدعی ایک مبتدع مناظر کے سامنے ملا علی قاری حنفی کی "موضوعات کبیر" سے ایک عبارت پیش کی، اُس مناظر نے بڑی بیباکی سے کہا کہ

"یہ عبارت خود ملّا علی قاری کی نہیں ہے، بلکہ ابن قیم بدمذہب کے ایک رسالہ کی یہ عبارت ہے جو ملّا علی قاری نے یہاں رد کیلئے نقل کی ہے، اسکی عبارت ہم پر حجت نہیں، وہ بدمذہب تھا اور اس کا استاذ ابن تیمیہ بھی بدمذہب تھا" ــــــــــــ

اس "مہذب اور باتمیز" مناظر کے الفاظ غالباً یہی تھے، مجھے بڑا دکھ ہوا کہ یہ شخص ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے جلیل القدر اماموں اور اُمّت کے ایسے محسنوں کے متعلق کیا کہہ رہا ہے، اور کن الفاظ، اور کیسے انداز میں کہہ رہا ہے ــــــــ بہرحال میں نے اس کے اس جواب کو رد کرتے ہوئے، اور اصل مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہا:۔ تم بالکل غلط کہتے ہو، جو عبارت میں نے پیش کی ہے وہ خود ملّا علی قاری کی ہے، امام ابن القیمؒ کی جو عبارت میری اس پیش کردہ عبارت سے کئی صفحے پہلے انھوں نے نقل کرنی شروع کی تھی وہ اس عبارت سے بہت پہلے ختم ہو چکی ہے، اور یہ کہنا بھی غلط ہے، بلکہ سراسر جھوٹ ہے کہ ملّا علی قاری نے شیخ ابن القیمؒ کی وہ عبارت رد کیلئے نقل کی تھی، ملّا علی قاری نے اس کے رد میں ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے ــــــــ پھر تم ابن القیمؒ کو بدمذہب کہتے ہو، حالانکہ یہی ملّا علی قاری ان کے متعلق شہادت دیتے ہیں کہ ابن القیم اور اُن کے استاذ امام ابن تیمیہ دونوں اہلسنت کے اکابر علماء میں سے، اور اس اُمّت کے خاص اولیاء اللہ میں سے ہیں[1]"

بہرحال مجھے یہاں صرف یہ عرض کرنا تھا کہ امام ابن تیمیہ اور ابن القیم کے متعلق یہ رائے میں نے ان ہی الفاظ میں بریلوی جماعت کے ایک بدنام ترین مناظر کی زبان سے اب سے ۱۵-۱۶ سال پہلے ایک مناظرہ میں سُنی تھی ــــــــ ابن حجر ہیثمی وغیرہ بعض مصنفین نے کسی غلط فہمی کی بنا پر، یا اور کسی وجہ سے ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس سے بھی میں واقف نہیں تھا، اور یہ خیال کر کے ان باتوں کو نظر انداز کر دیتا تھا کہ معاصرین یا آگے پیچھے کے مصنفین کی کتابوں میں ایک دوسرے کے متعلق اس قسم کی باتیں کہیں کہیں جو لکھی گئی ہیں ان کا حق یہی ہے کہ ان کو بالکل نظر انداز کیا جائے، اور ان کے لئے استغفار کیا جائے ــــــــ ورنہ ابن حجر ہیثمی کے اس تطاول ہی کا "جواب" دیتے ہوئے اُن ہی جیسے ایک دوسرے مصنف نے یہ بھی تو لکھا ہے "دابن حجر لا یساوی قلامۃ اظفار شیخ الاسلام (غایۃ الامانی) اور پھر ابن تیمیہ و ابن القیم ہی پر کیا موقوف ہے، اُمّت کے ائمہ میں سے کتنے ایسے ہیں جن کے خلاف طعن و جرح کے سخت سے سخت کلمات تلاش کر کے کتابوں سے نہیں نکالے جا سکتے ــــــ "ما من امام الا وقد طعن فیہ طاعنون وھلک فیہ ھالکون"
(تاج الدین السبکی فی طبقات الشافعیۃ الکبریٰ)

ــــــــــــــــ

بہرحال امام ابن تیمیہ اور ابن القیم کے متعلق میرا خیال اور میرا علم وہی تھا جو میں نے اوپر عرض کیا، اور حضرت شاہ ولی اللہؒ اور اُن سے علمی انتساب رکھنے والے سلسلۂ دیوبند کے اپنے اساتذہ تک کے متعلق میں ابتک یہی جانتا تھا کہ

ــــــــــــــــ

[1] ملّا علی قاری نے ان دونوں حضرات کے متعلق اپنی یہ رائے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں، اور شرحِ شمائل ترمذی میں ظاہر کی ہے۔ ۱۲

یہ سب بھی ان دونوں حضرات کو اکابر علماء اہل سنت میں سے سمجھتے ہیں، اور ابن حجر ہیثمی جیسے ان کے خاص مخالفین اور طاعنین کی اس رائے سے متفق نہیں ہیں جو انھوں نے ان دونوں حضرات کے متعلق ظاہر کی ہے ——— لیکن دار العلوم دیوبند کے رسالہ ——— "دار العلوم" (بابت ماہ محرم) میں مولانا حکیم عبد الرشید محمود صاحب گنگوہی کا جو ایک مضمون "جماعت اسلامی" سے متعلق شائع ہوا ہے، اس میں ابن تیمیہ و ابن القیم کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے پہلی دفعہ یہ معلوم ہوا کہ دیوبند سے علمی انتساب رکھنے والے ہمارے حلقہ میں بھی بعض ایسے حضرات ہیں جو ان دونوں بزرگوں کو اہل حق اور اہل سنت میں سے نہیں سمجھتے، بلکہ تجسیم جیسی شدید ترین قسم کی گمراہیوں میں مبتلا (فاسد العقیدہ اور گمراہ) سمجھتے ہیں، اور وہ ان دونوں اماموں پر اس بندوق کے چلانے کیلئے دوش غیر کی تلاش "کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے، بلکہ خود مدعی بنکر ان دعاوی اور الزامات کے ثبوت میں ابن حجر ہیثمی جیسے گواہوں کو پیش کر رہے ہیں ——— حالانکہ ابن حجر ہیثمی کی اس قسم کی تحریروں کی بناء پر ابن تیمیہ و ابن القیم کو ان جرائم کا مجرم قرار دینا قریب قریب ایسا ہی ہے جیسا کہ آج کوئی شخص مولوی عبد السمیع صاحب میرٹھی صاحب انوار ساطعہ کے بیان کی بنا پر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور اُن کے محبین و متبعین کو اُن جرائم کا مجرم قرار دینے لگے جو اُن پر مولوی عبد السمیع صاحب نے "انوار ساطعہ" میں عائد کئے ہیں[1]۔

پھر انتہائی حیرت اس بات سے ہوئی کہ حکیم صاحب موصوف نے اپنے اس مضمون میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے متعلق بھی لکھا ہے، کہ: "حضرت شاہ ولی اللہؒ کے کلام میں ان پر (ابن تیمیہ پر) سخت رد موجود ہے۔" (دار العلوم بابتہ ماہ محرم ص۲۴) ——— لیکن شاہ صاحبؒ کی کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا گیا کہ مراجعت کرکے دیکھا جا سکتا۔

اس عاجز نے حضرت شاہ صاحبؒ کی تصانیف اور مکاتیب کا جہاں تک مطالعہ کیا ہے، یاد نہیں پڑتا کہ کہیں شاہ صاحب نے ابن تیمیہ کا "سخت رد" کیا ہو، بلکہ اسکے برعکس ابن تیمیہ کی منقبت میں شاہ صاحبؒ کا ایک مستقل مکتوب ہے جس میں انکی طرف سے بہت سے اُن اعتراضات کی جوابدہی بھی کی گئی ہے جو اُن کے مخالفین کی طرف سے ان پر کئے گئے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کے کوئی ذی علم معاصر مخدوم معین الدین تہتائی ہیں، انھوں نے ایک خط کے ذریعہ شاہ صاحبؒ سے دریافت کیا، کہ "ابن تیمیہ کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے، اور ہم انھیں کیسا سمجھیں؟" ——— شاہ صاحبؒ کا جواب (جو گویا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے اعربی میں ہے ——— چند سطر کی تمہید کے بعد اصل جواب کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں، کہ:—

...... فانا قد تحققنا من حاله انه عالم بكتاب الله ومعانيه اللغوية والشرعية و حافظ لسنة رسول الله (صلى الله عليه وسلم) وآثار السلف بمعانيها اللغوية والشرعية

[1] ہمارے دیوبندی اور گنگوہی سلسلہ کے حضرات کو شاید یہ تو معلوم ہوگا کہ یہ مولوی عبد السمیع صاحب میرٹھی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے منتسبین و متوسلین میں سے تھے۔ ۱۲

..... محرر لمذھب الحنابلۃ فروعہ واصولہ فائق فی الذکاء ذولسن فی الذب عن عقیدۃ اھل السنۃ لم یؤثر عنہ فسق ولا بدعۃ اللھم الا ھٰذہ الامور التی ضیق علیہ لاجلھا ولیس شئی منھا الا ومعہ دلیلہ من الکتاب والسنۃ وآثار السلف فمثل ھٰذا الشیخ عزیز الوجود فی العالم ومن یطیق ان یلحق شأوہ فی تحریرہ وتقریرہ والذین ضیقوا علیہ ما بلغوا معشار ما آتاہ اللہ تعالیٰ۔" (یعنی شیخ تقی الدین ابن تیمیہ (عاملہ اللہ تعالیٰ بفضلہ) کے حالات کے متعلق جو کچھ ہمیں تحقیق سے معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب پاک کا خاص علم نصیب فرمایا ہے وہ آیاتِ قرآنی کے لغوی معانی کے بھی شناسا ہیں، اور ان کی شرعی مراد سے بھی واقف ہیں، اسی طرح وہ احادیث نبویہ اور آثارِ سلف کے حافظ اور ان کے لغوی اور شرعی معانی کے عارف ہیں۔ حنابلہ کے مذہب کے محقق ہیں، اس کے اصول و فروع کے محرر ہیں، ذہانت وذکاوت میں ان کا پایہ بہت بلند ہے، عقیدۂ اہلسنت کی حمایت میں ان کا خاص مقام ہے، ان کے بارے میں فسق و بدعت کی کوئی بات نقل نہیں کی جاتی، بجز اُن چند مشہور باتوں کے جن کی وجہ سے ان کو بہت تنگ بھی کیا گیا، اور حال یہ ہے کہ ان میں سے ہر بات کے اور ہر مسئلہ کے متعلق ان کے پاس کتاب وسنت کے دلائل، اور آثار سلف کے شواہد ہیں۔ بہرحال شیخ ابن تیمیہ جیسی جامع الکمالات ہستیاں دنیا میں شاذ و نادر ہی ہوتی ہیں، اور کس میں طاقت ہے کہ تحریر و تقریر میں ان کا مقابلہ کرسکے۔ اور وہ علماء و مصنفین جنھوں نے ان کی سخت مخالفتیں کیں، اور ان کے لئے تنگیاں اور پریشانیاں پیدا کیں، اُن کے پاس اُن کمالات کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے جو اللہ نے شیخ ابن تیمیہ کو عطا فرمائے تھے[1]"۔

یہ اس مکتوب کی ابتدائی سطریں ہیں، اسکے بعد حضرت شاہ صاحب نے ان الزامات کا کسی قدر تفصیلی جائزہ بھی لیا ہے جو شیخ موصوف پر عام طور سے لگائے گئے ہیں، اور دکھایا ہے کہ ہر الزام غلط ہے اور اصل حقیقت نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں نے شیخ کے خلاف یہ باتیں کہی ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا مکتوب خاصا طویل ہے، گویا ایک مختصر رسالہ ہے، لیکن جو ابتدائی سطریں اوپر نقل کی گئی ہیں وہی یہ اندازہ کرنے کیلئے کافی ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو کیسا سمجھتے ہیں۔

یہاں تک ہی لکھ چکا تھا ابھی کچھ اور بھی لکھنے کا ارادہ تھا کہ امام ابن تیمیہ ہی کے متعلق مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی کا ایک مستقل مضمون اشاعت کیلئے آگیا، موصوف نے بھی یہ مضمون حکیم عبدالرشید محمود صاحب کا مضمون پڑھ کر اور اس سے متأثر ہو کر ہی لکھا ہے، اب آئندہ اشاعت میں انشاء اللہ وہی ہدیۂ ناظرین کر دیا جاوے گا۔

---

[1] یہ مکتوب شاہ صاحب کے اُس مجموعۂ مکاتیب میں موجود ہے جو اُن کے شاگرد رشید خواجہ محمد امین کشمیری کا مرتب کیا ہوا ہے، اس عاجز کے پاس [illegible] ... شاہ رفیع الدین [illegible] ... مکتوب جامع الفضائل [illegible] ... معین الدین [illegible] ... در [illegible] شیخ تقی الدین احمد بن تیمیہ حنبلی و بیان فضائل و تنویہ شان او در زمرۂ علماء اہلسنت در وجہے کہ زبان طعن در حق وے دراز کنند و اظہار حسن عقیدۂ خویش بہ نسبت او رضی اللہ عنہ و عن سائر علماء دین تحریر یافت" ص ۲۷ - ۱۲

مکتوب حرمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۸ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ پنجشنبہ
رباط بھوپال، محلہ شامیہ، مکہ معظمہ

از محمد منظور نعمانی

عزیزان من سلمکما اللہ تعالےٰ، وعافاکما۔ سلام مسنون

مکہ معظمہ پہونچے تقریباً دو ہفتے ہوچکے اور حج سے فارغ ہوئے بھی تقریباً ایک ہفتہ گزر چکا، لیکن ان دنوں میں مشغولیت ایسی رہی کہ خط لکھنے کے لیے کم سے کم وقت بھی فارغ نہیں کرسکا ــــــ اس سے پہلا خط جو جدہ پہونچ کر روانہ کیا تھا، جدہ پہونچنے تک کے حالات اس میں لکھ چکا ہوں، آگے کے واقعات کا تمہیں انتظار ہوگا۔ اس لیے خاص خاص باتیں لکھتا ہوں۔

جمعہ کا دن جدہ ہی میں گزر گیا۔ رات کو بعد نماز عشا موٹر بس پر سوار ہوگئے اور یہاں کے حساب سے قریب ۸-۹ بجے کے (ہندستان ٹائم سے قریباً ۱۱-۱۲ بجے) موٹر بس مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوئی، روانگی سے ذرا پہلے خیال ہوا کہ یہ موٹر اب رات کے آخری حصے میں مکہ معظمہ پہونچے گی اور مسلسل بیٹھے رہنے اور جاگنے کی وجہ سے اس وقت اپنی طبیعت بھی خستہ اور تھکی ہاری ہوگی ــــــ اور جی یہ چاہتا تھا کہ اللہ کے بلد امین میں داخلہ دن میں ہو اور اس وقت طبیعت بھی تھکی ہاری نہ ہو ــــــ اس لیے یہ ارادہ کیا کہ اس موٹر سے اسباب اتروالیا جائے اور کل صبح کسی اور موٹر سے جایا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی رکاوٹ ڈالی کہ یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا اور بادلِ ناخواستہ اسی موٹر میں سوار ہونا پڑا ــــــ بہرحال موٹر روانہ ہوئی ــــــ

جدہ سے ۳۵ کیلومیٹر چل کر ایک منزل آتی ہو "بحرا" یہاں چار کے ہوٹل ہیں، گزرنے والی ہر موٹر اور لاری یہاں رکتی ہو، ڈرائیور اور اکثر مسافر اتر کر چار وغیرہ پیتے ہیں اور آگے چل دیتے ہیں، بعض ڈرائیور کچھ دیر کے لیے یہاں نیند بھی لے لیتے ہیں۔ بہرحال رات کے ایک بجے کے بعد ہماری موٹر یہاں پہونچ کر رُکی

اکثر مسافر بھی اُترے۔ ہم سے پہلے پہونچنے والی ایک بس یہاں پہلے سے کھڑی تھی اور اس کا ڈرائیور سوگیا تھا اتفاق سے اسی وقت قدوائی صاحب[1] مکۂ معظمہ سے جدہ کے لیے آرہے تھے، کار روک کر اترے پہلے اس لاری کے پاس پہونچے جو ہم لوگوں سے پہلے سے کھڑی تھی، اور اس کے مسافروں سے (جو سب ہندوستانی تھے) بہت ہمدردانہ گفتگو کی اور پوچھا کہ اگر آپ کو کوئی تکلیف یا کوئی شکایت ہو تو مجھ سے بتلائیے پھر پوچھا کہ آپ کی بس کا ڈرائیور کہاں ہو؟ مسافروں نے بتلایا کہ وہ تو سوگیا۔ قدوائی صاحب نے خود جاکر اسے اٹھایا اور کہا تم سو رہے ہو اور تمھارے مسافر تکلیف میں ہیں پہلے انھیں پہونچاؤ۔ اور اس کے بعد سوؤ غرض اس موٹر بس کو اپنے سامنے روانہ کرایا۔ پھر اتفاق سے مجھ پر نظر پڑی، مزاج پرسی کے بعد پوچھا کہ کیا آپ کا ڈرائیور بھی سوگیا ہے، میں نے کہا نہیں، ہم تو ابھی آئے ہیں ذرا چائے پئیں گے، ڈرائیور بھی چائے پی رہا ہوگا۔ قدوائی صاحب کی اس فرض شناسی اور اس چستی کو دیکھ کر طبیعت بڑی خوش ہوئی، اس کے بعد وہ جدہ روانہ ہوگئے۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ ہمارا ڈرائیور بھی سوگیا ہو اور اب ہماری موٹر فجر کے بعد چلے گی۔ یہ معلوم کرکے میں نے تو دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ یہ گویا میری عین مراد تھی، قریب ہی میں ایک صاف ستھرا چبوترا تھا، وضو کرکے چند رکعت نماز پڑھی اور احرام کی چادر سر کے نیچے رکھ کے جانماز ہی پر سو رہا۔ صبح صادق ہوجانے پر آنکھ کھلی اس طرح دو گھنٹے کے قریب سونے کا موقع مل گیا اور الحمدللہ طبیعت بالکل ہلکی ہوگئی۔ اٹھ کر جماعت سے نماز فجر پڑھی اور طلوع آفتاب سے پہلے ہی ہماری موٹر مکۂ معظمہ کے لیے روانہ ہوگئی، اور سورج نکلنے پر ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ ہم اللہ کے بلد امین میں جا اُترے۔ اسباب اتروا کے رکھا اور اپنے معلم مولوی عبدالہادی صاحب سے کہا کہ اگر آپ غسل کا انتظام آسانی سے کراسکیں تو جی چاہتا ہو کہ غسل کرکے مسجد حرام میں حاضر ہوں، اللہ انھیں جزائے خیر دے اسی وقت انھوں نے غسل خانہ میں پانی پہونچوایا اور میں نہا کر عمرہ کے طواف کے لیے مسجد حرام آیا پہلے طواف کیا اس کے بعد رکعتین طواف پڑھنے کے لیے مقام ابراہیمؑ کی طرف آیا، وہاں اژدحام اور کشمکش دیکھ کر حطیم میں جاکر دوگانہ پڑھا، اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسی وقت ملتزم پر موقع مل گیا، دعا کی اور سعی کے لیے مسعیٰ میں آگیا۔ سعی سے فارغ ہو کر اسی وقت طواف قدوم کیا، ان سب کاموں سے فارغ ہو کر معلم صاحب کے مکان پر آیا، غلام محمد صاحب بھی ان ہی کے مکان کے ایک حصہ میں فروکش ہیں، مولوی عبدالہادی صاحب کھانا لائے، غلام محمد صاحب نے بھی اپنے ہاں سے ماحضر منگوایا، کھانے سے فارغ ہو کر ظہر کے لیے مسجد حرام آگئے، مولنا علی میاں اگرچہ دو دن سے سخت بےچینی کے ساتھ انتظار کر رہے تھے لیکن ابھی تک ملاقات نہیں ہوسکی تھی، نماز ظہر سے فارغ ہو کر انھوں نے مجھے اور میں نے انھیں پایا، یہ ذی الحجہ کی ۶ تاریخ تھی اور دن شنبہ کا تھا، مکۂ مکرمہ ہی میں

---

[1] حکومت ہند کے موجودہ سفیر یا قنصل برائے حجاز مقیم جدہ ۱۲۔

رہنا ہوا اور ۸ کی صبح کو مکہ سے منیٰ پیدل روانگی ہوئی، دو ڈھائی گھنٹہ میں پہونچ گئے، گرمی کی شدت کی وجہ سے سایہ دار جگہ کی ضرورت تھی اور دیر ہو جانے کی وجہ سے مسجد خیف میں جگہ ملنے کا وقت نہیں رہا تھا لیکن اللہ تعالیٰ سے فضل کی امید باندھے ہوئے گئے اور بحمد اللہ بہت اچھی جگہ مل گئی۔ بقیہ دن اور رات بھی وہیں گزاری، نویں کی صبح کو عرفات روانگی ہوئی اور چونکہ مولانا علی میاں اور اکثر تبلیغی رفقا کے معلم سلیمان ہاشم تھے اس لیے میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ آج کا دن ان سب احباب و رفقا کے ساتھ سلیمان ہاشم ہی کے خیمہ میں گزاروں، سلیمان ہاشم نے ان حضرات کے لیے ایک بہت بڑے اور اچھے آرام دہ خیمہ کا انتظام کیا تھا، ظہر سے قریباً دو گھنٹے پہلے ہم سب اس خیمہ میں جمع ہو گئے تھے، پہلا کام یہ کیا گیا کہ اپنے سب احباب و رفقا کو جمع کر کے آج کے دن کی اہمیت بیان کی گئی اور یہ کہ شام تک کا وقت کس طرح اور کن مشاغل میں گزارا جائے۔ پھر طے ہوا ان باتوں کو حتی الوسع خیمہ خیمہ پہونچانے کے لیے جماعتیں گشت کریں، اسی وقت دس جماعتیں بن گئیں ان میں سے چھ ہندستان و پاکستان کے حجاج میں کام کرنے کے لیے اور ۴ عربی ممالک سے آئے ہوئے حجاج کے لیے، ان چاروں جماعتوں میں دو دو آدمی وہ تھے جو بحمد اللہ عربی زبان میں دعوت و تبلیغ کی اچھی مشق بہم پہونچا چکے ہیں، قریباً ڈیڑھ گھنٹہ ان جماعتوں نے گشت کیا، ظہر کی نماز کے بعد آس پاس کے خیموں کے بہت سے لوگ بھی ہمارے اس خیمہ میں آ گئے۔ اس موقع پر مولانا علی میاں نے ایک تقریر فرمائی اور آج کے دن دعا اور توبہ و استغفار اور اس میں الحاح اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن بلکہ مغفرت و رحمت کا یقین اپنے اندر پیدا کرنے کی تلقین فرمائی اور اس کے بعد سب اپنے اپنے طور پر دعا وغیرہ میں مشغول ہو گئے۔ پھر شاید کوئی بھی نہ تھا جو آنکھوں سے اور دل سے نہ رو رہا ہو، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اپنے ان بندوں کو جن کا رونا اور تڑپنا دوسروں کو بھی رُلا رہا تھا اور تڑپا رہا تھا۔ اولٰئک قومٌ لا یشقی جلیسہم۔

جب دن آخر ہونے لگا سب لوگ جبل رحمت کی طرف چلے، یہ عاجز بھی مولانا علی میاں اور چند اور رفقا کے ساتھ تھا، جیسی کچھ اللہ نے توفیق دی سب نے وہاں دعائیں کیں۔ یہاں تک کہ آفتاب گویا ہماری آنکھوں کے سامنے غروب ہوا ——— اس کے بعد ہم لوگ یہیں سے مزدلفہ کو پیدل روانہ ہوئے اور قریباً ڈھائی گھنٹہ میں مزدلفہ پہونچے، وہم و گمان بھی نہ تھا کہ خاص مشعر حرام میں ہمیں جگہ مل جائے گی مگر اللہ کے فضل سے اس کے بالکل وسط میں جگہ ملی، یہاں پہونچ کر مغرب و عشا کی نماز ادا کی اور کچھ دیر کے لیے سو گئے۔ قریباً ڈھائی تین گھنٹہ کی نیند کے بعد سب ساتھیوں کی آنکھ کھل گئی، الحمد للہ طبیعت بالکل ہلکی ہو چکی تھی، اب تھکن کا کوئی اثر نہ تھا وضو کر کے سب نوافل میں اور ذکر و دعا میں مشغول ہو گئے

صبح صادق نمودار ہوئی، فجر کی نماز پڑھی اور طلوع آفتاب سے کچھ پہلے تک ذکر و دعا میں مشغول رہے ———
ان دنوں میں یہاں گرمی انتہا کو پہونچی ہوئی تھی (ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ ۹ کو عرفات میں اور ۱۰ کو منیٰ میں درجہ حرارت ۱۲۵ تھا)، مجھے اور بعض اور ساتھیوں کو نزلہ کی شکایت تھی جسکی وجہ سے کچھ حرارت بھی تھی۔ اس لیے لاری سے منیٰ جانے کا فیصلہ کیا۔ بہت انتظار اور تلاش کے بعد ایک کار ملی اس لیے ہم ایسے وقت روانہ ہو سکے کہ آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ راستہ میں سخت رش ہونے کی وجہ سے مزدلفہ سے منیٰ کا قریباً صرف ۳-۴ میل کا راستہ کار نے کوئی دو گھنٹہ میں طے کیا ——— منیٰ پہونچ کر جمرۃ العقبیٰ کی رمی کی، طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے خود منحر جانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے قربانی کا کام بعض دوسرے رفقاء کے سپرد کر دیا۔ اور اللہ انھیں جزائے خیر دے انھوں نے اس کو انجام دیا۔ اور خود میں نے وہ پورا دن مسجد حنیف کے اندر کے حصہ میں گزارا۔ مولانا علی میاں وغیرہ اپنے معلم سلیمان ہاشم کے خیمہ میں رہے اور انھوں نے گرمی کی بڑی تکلیف اٹھائی۔ ان دنوں میں یہاں گرمی کی شدت جیسا کہ ابھی لکھ چکا ہوں انتہا کو پہونچی ہوئی تھی، محتاط اندازہ ہو کہ عرفات اور منیٰ کے ۴ دنوں میں ڈیڑھ ہزار سے کم اموات نہ ہوئی ہوں گی۔ میں تو منیٰ کے زمانۂ قیام میں مسجد حنیف ہی میں گویا معتکف رہا، دن میں بس رمی کے لیے نکلتا تھا اور الحمدللہ اس کی وجہ سے گرمی کی تکلیف سے میں بہت محفوظ رہا۔

۱۳ ذی الحجہ کی شام کو عصر پڑھ کر منیٰ سے مکۂ معظمہ آ گئے ——— اب مکۂ معظمہ ہی میں قیام ہو طبیعت الحمدللہ بالکل اچھی ہے۔ مولانا علی میاں، مولانا عبداللہ صاحب ندوی، مولوی معین اللہ، مولوی عبدالرشید مولوی رضوان، مولوی محمد رابع، مولوی محمد طاہر، یہ سب حضرات پہلے سے بھوپال کی رباط میں مقیم ہیں، میں یہاں گویا ان سب کا مہمان ہوں، مکۂ معظمہ میں اور وہ بھی خاص موسم حج میں آرام دہ قیام گاہ اور عادت کے مطابق وقت پر کھانے پینے کا انتظام صرف ان لوگوں کو نصیب ہو سکتا ہو جو اس کے حاصل کرنے کے لیے ہزاروں خرچ کر سکیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان مخلص دوستوں کے طفیل یہ سب کچھ عطا فرما رکھا ہو۔ اللھم ما اصبح بی من نعمۃ او باحد من خلقک فمنک وحدک لا شریک لک لا احصی ثناءً علیک انت کما اثنیت علی نفسک۔

مولانا علی میاں کے غنا نفس اور توکل کو تو ہم جانتے ہی ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہو کہ ان کی صحبت و رفاقت اور اس وادی غیر ذی زرع کے قیام کی برکت سے ان سب دوستوں کو بھی توکل کی خوب مشق ہو گئی ہو پاس کچھ نہیں ہو بالکل فقیر بے نوا ہیں لیکن روزانہ صبح کو چاء پورے اہتمام کے ساتھ بنا کر مجھے پلاتے ہیں۔ دوپہر کو ترکاری سالن خود اپنے ہاتھ سے پکاتے ہیں، روٹی بازار سے پکی پکائی لے آتے ہیں، برف تک کا اہتمام کرتے ہیں۔ گویا حافظ شیرازی کی اس نصیحت کو انھوں نے پوری طرح قبول کیا ہو۔

ہنگام تنگ دستی در عیش کوش و مستی　　کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را

دوپہر کا کھانا ظہر کے بعد ہوتا ہے اس کے بعد عصر تک آرام کا وقت ہے۔ عصر کے وقت حرم شریف جانے کے بعد اکثر عشا پڑھ کے ہی واپسی ہوتی ہے ان دوستوں نے رات کو بالکل نہ کھانے کا اپنے کو عادی بنالیا ہے اور یہ عادت کم از کم یہاں کے لیے تو بڑی اچھی ہے۔ میں بھی ان حضرات کے ساتھ بس دوپہر ہی کو کھاتا ہوں، رات کو نہ کھانے کی وجہ سے طبیعت بڑی اچھی اور ہلکی پھلکی رہتی ہے۔

اس سفر کی خاص برکات اور منافع میں سے مصر و شام کی بعض ان خاص ہستیوں سے تعارف اور تعلق ہے جو ان ممالک میں احیاءِ دینی کی مساعی میں مصروف ہیں جن سے مولانا علی میاں کے مصر و شام کے دورہ میں ربط و تعارف ہوا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس سال ایسے اہم افراد کافی تعداد میں آئے ہیں، ان میں سے ایک شخص سے طبیعت خاص طور سے متاثر ہوئی، یہ الاخوان المسلمون کے خاص آدمی ہیں، سعید رمضان نام ہے۔ یہ وہی ہیں جن کے متعلق گزشتہ سال اخبارات میں ہم نے پڑھا تھا کہ سعودی حکومت نے حجاز میں ان کے داخلہ پر پابندی لگا رکھی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ پابندی ابھی تک اٹھائی نہیں گئی ہے لیکن یہ اس سال آئے ہیں، پہلی ہی ملاقات میں جب مولانا علی میاں نے میرے متعلق انھیں بتایا کہ یہ میرا ساتھی ہے اور ہم دونوں گویا ایک ہی وجود کے دو بازو ہیں تو اس طرح ملے کہ میرا دل بھر آیا اور آنکھیں رونے لگیں۔ حرم شریف میں روزانہ ملنا ہوتا ہے، ہر وقت معانقہ کے وقت وہ شخص مجسم محبت اور سراپا حرارت محسوس ہوتا ہے۔

یہ خط ۱۰ ذی الحجہ کو مکۂ معظمہ میں لکھنا شروع کیا تھا، لیکن اس دن پورا نہ ہو سکا تھا، پھر رہ ہی گیا یہاں تک کہ مدینۂ طیبہ روانگی کا وقت آگیا ——— ہم لوگ چونکہ سب سے آخری جہاز یعنی محمدی سے آئے تھے اس لیے اگر موٹر سے مدینۂ طیبہ آتے تو یہاں کے قواعد کی رو سے کہیں وسط محرم میں ہمیں مدینۂ طیبہ کے لیے موٹر ملتی اس لیے ہم نے ہوائی جہاز سے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ۱۸ ذی الحجہ پنجشنبہ کو ٹکٹ حاصل کرلیا۔ اور ۲۰ ذی الحجہ شنبہ کے دن طواف رخصت کرکے جدہ کو روانہ ہوگئے۔ شنبہ اور یکشنبہ کی درمیانی رات مطار (ہوائی اڈہ) ہی پر گزاری، نماز فجر پڑھ کر سوار ہوئے اور صرف ۷۵ منٹ میں ہمارا جہاز مدینۂ طیبہ کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا اڈہ ہی پر وضو کیا، چائے پی اور تھوڑی دیر بعد سرکاری بس پر سوار کرا کے شہر روانہ کر دیے گئے، بس چند منٹ ہی چلی تھی کہ مدینۂ منورہ کے آثار نظر آنے لگے، ذرا اور آگے بڑھی تو مسجد شریف کے مینارے اور گنبدِ خضرا آنکھوں کے سامنے تھا، الحمد للہ دل نے، زبان نے اور آنکھوں نے اپنا اپنا وظیفہ ادا کیا۔ اپنے اڈہ پر پہونچ کر بس ٹھہر گئی، سامان ایک مزدور سے اٹھوایا، مصطفےٰ خاں منزل کے سامنے پہونچے تو غلام احمد صاحب سامنے

کھڑے تھے (جو ہم سے دو دن پہلے ہوائی جہاز ہی سے یہاں پہونچ چکے تھے) انھوں نے بڑھ کر سامان اتروایا اور رکھوایا۔ اور کھانے پینے کے لیے پوچھا، میں نے کہا اگر غسل کرنے کا کوئی انتظام ہو سکے تو بس یہ کرا دیجیے۔ فوراً انھوں نے بندوبست کیا، میں نے غسل کیا، کپڑے بدلے، اور مسجد شریف آیا، باب جبرئیل پر پہونچا تو وہاں کے بواب (دربان) نے پہچان لیا، اور مرحبا مرحبا کہہ کے لپٹ گیا اور دیر تک لپٹا رہا، میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے ــ اللہ اس کو دنیا و آخرت کی نعمتوں سے بھرپور حصہ دے اس کی اس محبت و عنایت سے لبریز معانقہ نے اس وقت بڑا ہی نفع پہونچایا اور الحمد للہ اس چیز کے پیدا کرنے میں بڑی مدد دی جس کا میں اس وقت بڑا حاجتمند تھا ــــــ "بسم اللہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ" کہہ کر مسجد شریف میں داخل ہوا۔ پہلے روضۃ الجنۃ میں پہونچکر تحیۃ المسجد پڑھی، سجدۂ شکر کیا، دعا کی اور پھر مواجہہ شریف میں حاضر ہوا، سلام عرض کیا اور جو کچھ عرض کرنا تھا جس طرح اسوقت عرض کیا جا سکا عرض کیا۔ تم دونوں کا، تمھاری آپا کا اور ان سب بزرگوں اور دوستوں کا سلام پہونچایا جنھوں نے کہا تھا۔ پھر اپنے لیے اور ان سب کے لیے جن کا اپنے پر کسی قسم کا کوئی حق ہو، قرابت کا، احسان کا، محبت کا، خدمت کا، سب ہی کے لیے شفاعت کی درخواست کی۔ اس سفر میں ہر ایسے موقع پر ــــــ قاری عبدالوہاب صاحب، ماسٹر محمد یسین صاحب (پہلے سفر کے رفیق) اور محمد احمد صاحب خاص طور سے یاد رہے۔

اس سب کے بعد مسجد شریف سے واپس آیا، مدرسۂ شرعیہ میں قیام کی اجازت لی اور سامان وہاں منتقل کرایا ــــــ آج یہاں آئے تیسرا دن ہے، اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی ہر طرح کی راحتیں نصیب فرما رکھی ہیں، گویا کسی کریم کی مہمانی میں ہیں۔ عجب حال ہے، عجب کیف ہے، چہ گویم و چہ گو نہ گویم۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل   نسیم صبح تری مہربانی

اَللّٰهُمَّ لَكَ الحمد شكراً ولك المن فضلا

کل روضۂ اقدس پر اس جانب کھڑے ہو کر جدھر حضورؐ کے قدم مبارک ہیں درود شریف پڑھ رہا تھا اسوقت والد ماجد علیہ الرحمہ کے اس احسان کی عظمت دل پر وارد ہوئی کہ انھوں نے ہم کو علم دین کے راستہ پر ڈالا اور صرف اس نیت سے ڈالا کہ ہم کو علم دین آ جائے اور اس کے واسطے سے ہم اللہ و رسول سے اپنا صحیح تعلق جوڑ سکیں۔ اسوقت والد ماجد کے یہ الفاظ گویا کانوں میں گونج رہے تھے جو انھوں نے بار بار اس ناچیز سے بھی مختلف اوقات میں فرمائے تھے، کہ مجھے اس کی فکر نہیں کہ تم لوگ بڑے دولتمند ہو جاؤ۔ میں بس یہ چاہتا ہوں، اور اللہ سے اس کی دعا کرتا ہوں کہ تمھیں دین نصیب ہو .... اللہ تعالیٰ ان کی اور والدۂ ماجدہ کی قبر کو نور سے بھر دے، جو کچھ نصیب ہو اللہ کے فضل کے بعد ان ہی کی نیتوں اور دعاؤں کا طفیل ہے

ربّ اغفر لی ولوالدیّ۔ ربّ ارحمہما کما ربیانی صغیرا

انشاء اللہ اب ۱۰-۱۲ دن یہاں قیام رہے گا۔ ۳-۴ محرم کو جدہ واپسی کا ارادہ ہے، امید ہے کہ جدہ سے پھر مکۂ معظمہ حاضری نصیب ہوگی، اور خدا نے چاہا تو ۴-۵ دن قیام کا بھی موقع مل جائے گا، اب تک کا اندازہ یہ ہے کہ ۱۴ ذی الحجہ (۱۳ اکتوبر) کو جدہ سے اسلامی جہاز جو روانہ ہوگا انشاء اللہ اس سے ہم سب سوار ہوسکیں گے۔ یہ جہاز ۹-۱۰ دن میں بمبئی پہونچا دیتا ہے۔ اس حساب سے انشاء اللہ آخر محرم تک لکھنؤ پہونچ جائیں گے ـــ مولنا علی میاں، مولوی محمد رابع، مولوی معین اللہ، مولوی عبد الرشید انشاء اللہ سب ساتھ ہی آئیں گے ـــ محمد شفیع صاحب برابر ساتھ ہیں، اچھی طرح ہیں ان کے کارخانہ جا کر کہدیا جائے۔ والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۲۳ ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ سہ شنبہ

(ہوائی ڈاک سے روانہ کرنے کا ارادہ تھا لیکن غلام احمد صاحب کی واپسی کا وقت آگیا اب ان کے ذریعہ بھیجتا ہوں)

(۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزان من! سلّمکم اللہ تعالیٰ دعا فاکم سلام مسنون۔

اس وقت جب کہ یہ خط لکھنا شروع کر رہا ہوں،.... غلام احمد صاحب کے ذریعہ میرا وہ خط تمہیں اس سے پہلے مل چکا ہوگا جس کا کچھ حصہ میں نے مکۂ معظمہ میں لکھا تھا اور کچھ مدینۂ طیبہ پہونچکر لکھ سکا تھا۔ تمہیں اس کے بعد کے حالات کا انتظار ہوگا ـــ جیسا کہ پہلے خط سے معلوم ہو چکا ہوگا میں ۲۱ ذی الحجہ کو مدینۂ طیبہ پہونچ گیا تھا اور یکم محرم کو دسویں دن وہاں سے واپسی ہوئی۔ الحمد للہ وللہ المنہ کہ اس پورے وقت میں اللہ تعالیٰ کا وہ فضل رہا جس کا ہرگز کوئی استحقاق نہ تھا، طبیعت بھی بڑی شاداب رہی، البتہ اس دفعہ اس چیز کا احساس پہلے سے بھی زیادہ ہوا کہ ساری اسلامی دنیا سے آنے والے حجاج و زائرین کی غالب اکثریت حج و زیارت کے مقصد اور اس کی حقیقت سے اور حرمین پاک کے حقوق و آداب سے اور اللہ و رسولؐ کے احکام سے کس قدر بے خبر ہے اور پھر اس بے خبری کے احساس اور اس کے انجام کی فکر سے کس درجہ غافل ہے ـــ کاش ایسا ہوتا کہ مختلف ممالک سے اللہ کے جو لاکھوں بندے ہزاروں میل کے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے اور ہزاروں روپے خرچ کر کے حج و زیارت کے لیے یہاں آتے ہیں کم از کم وہی ایسے ہوتے یا ایسے بن کر آیا

کرتے کہ ان کے اجتماع سے یہاں ایک ایسا ماحول بن جایا کرتا جس میں اصلی ایمان و اسلام کی بہار کچھ دیکھی جا سکتی اور ہمارے دینی ضعف کو اس سے کچھ تقویت اور غذا ملا کرتی۔ لیکن معاملہ کچھ اس کے برعکس ہی، معلوم ایسا ہوتا ہو کہ جو خوبیاں اور جو برائیاں جو ایمانی فضیلتیں اور برکتیں اور جہالت و گمراہی اور بدعملی و بدکرداری کی جو بری عادتیں اور نحوستیں عالم اسلامی میں منتشر ہیں حج کے موقع پر وہ سب یہاں یکجا ہو کر اور زیادہ اُبھر جاتی ہیں، اور چوں کہ ہم مسلمانوں کی زندگی میں بحیثیت مجموعی شر کی مقدار زیادہ ہو اور اس کے مقابلہ میں خیر بہت کم اور مغلوب ہو اس لیے حج کے موقع پر ہم جیسے عوام کی آنکھیں مکہ معظمہ کی مسجد حرام اور مدینہ طیبہ کی مسجد نبوی میں بھی خیر اور نورانیت کو غالب اور چھایا ہوا دیکھنے کے لیے ترستی ہی رہتی ہیں فالی اللہ المشتکی وھو المستعان۔

مسجد حرام میں اور مسجد نبوی میں بیٹھے بیٹھے بار بار یہ خیال یا وسوسہ دل میں پیدا ہوتا تھا کہ اگر کعبۃ اللہ کو حجر اسود کو مقام ابراہیم کو اور مطاف کو کچھ بولنے کی اجازت ہو یا روضۂ انور سے کوئی چیز ہمیں سنوانے کا حکمت الٰہی فیصلہ کرے تو اس میں بڑا حصہ غالباً ہماری بے ادبیوں، بدتمیزیوں اور طرح طرح کی جاہلانہ و موذیانہ حرکتوں کی شکایت کا اور اس تکلیف و اذیت کا ہوگا جو روح نبویؐ اور ان شعائر اللہ کی روحوں کو ہم زائرانِ حرمین کے احوال و اعمال سے پہونچتی ہو۔

مرحوم اقبال نے تو غالباً دین کے حقوق اور تقاضوں کو ادا نہ کرنے والے "حاملانِ دین" کا گلہ کرتے ہوئے کہا تھا لیکن ہمارے اس دور کے زائرین حرمین کے متعلق بھی اگر کہا جائے تو بالکل صحیح ہوگا کہ۔

گلۂ جفائے وفا نما حرم کو جو "اہل حرم" سے ہے
جو بتکدہ میں بیاں کروں تو صنم بھی کہے ہری ہری

بہرحال اس دفعہ خصوصاً مدینۂ طیبہ کے زمانۂ قیام میں عام زائرین کے ان احوال و اعمال کو دیکھ دیکھ کر جو یقیناً اللہ کو سخت ناپسند ہیں اور روح نبوی کو یقیناً اذیت پہونچانے والے ہیں اس تاثر و احساس کا بہت غلبہ رہا، بلکہ ایک دن تو ایسا ہوا کہ میں روضۂ اقدس کے جنوبی مشرقی گوشے کے قریب مشرقی جانب کی جالی سے متصل کچھ دیر بیٹھا رہا۔ قریباً ڈیڑھ دو گھنٹہ کی مدت میں مختلف ملکوں کے زائرین کے بیسیوں پچاسوں گروہ اس جانب گئے اور آئے — اس وقت خواہش بھی تھی اور ایک حد تک اس کی کوشش بھی کہ لوگ اپنی جہالت اور ناتربیتی کی وجہ سے جو نامناسب حرکتیں یہاں کرتے ہیں میں ان کو نہ دیکھوں، لیکن اس کے باوجود مختلف ملکوں کے گروہوں کے مردوں اور عورتوں کی جہالت اور گمراہی کے اتنے نمونے آپ سے آپ اس نظر کے

سے وقت میں سامنے آئے کہ دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ جب امت کا عموم اس درجہ بگڑ چکا ہو تو اصلاح کی جاری کوششیں بے نتیجہ اور بیکار ہیں۔ اس لیے اصلاحی کوششوں میں وقت صرف کرنے والوں کو اب اپنا وقت اور اپنی کوششیں اس میدان میں خرچ نہیں کرنی چاہئیں۔ لیکن بعد میں یہ خیال پیدا ہوا کہ سب کچھ کرنے والے دراصل جب اللہ تعالیٰ ہیں اور وہ اس سے بدتر حال کو بھی اچھے حال سے بدل سکتے ہیں اور رات کی اندھیاری کے بعد روزانہ صبح کا اجالا پیدا کرکے اور خزاں کے بعد بہار کو لاکے وہ اپنی قدرت کا نمونہ برابر دکھلاتے رہتے ہیں تو امت کی موجودہ بگڑی ہوئی حالت سے مایوس ہوکر اصلاحی کوششوں سے کنارہ کش ہو جانے کا خیال صحیح نہیں، حکم الٰہی کی تعمیل میں ہمیں اپنی سعی کوششوں اور دعاؤں کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے اور اللہ کی اس قدرت پر یقین رکھنا چاہیے کہ ــــــ " ھو الذی ینزل الغیث من بعد ماقنطوا وینشر رحمتہ وھو الولی الحمید " ــــــ اور ــــــ اعلموا ان اللہ یحیی الارض بعد موتھا قد بینا لکم الآیات لعلکم تعقلون ٥

مدینۂ طیبہ کے زمانۂ قیام میں ایک دن سید الشہداء حضرت حمزہ اور دیگر شہداءِ اُحد کے مدفن پر بھی جانا ہوا جو اسی اُحد پہاڑ کے دامن میں ہو۔ اُس دن اس تصور سے طبیعت کو ایک خاص کیف حاصل ہوا کہ یہ پہاڑ وہی ہو اور یقیناً وہی ہو جس کے متعلق حضور نے ارشاد فرمایا تھا "یحبنا ونحبہ" (اس کو ہم سے اور ہم کو اس سے محبت ہو)، اور یہی وہ بابرکت پہاڑ ہو جس کے متعلق صحیح روایات میں آیا ہو کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم، کو ساتھ لے کر اس پر چڑھے تو پہاڑ میں ایک خاص قسم کی حرکت اور جنبش پیدا ہوئی، حضور نے پہاڑ کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا " اُثْبُتْ احد! فانما علیک نبی وصدیق وشہیدان " (اُحد! ٹھہر جا تیرے اوپر اس وقت ایک اللہ کا پیغمبر ہو، ایک صدیق ہو، اور راہِ خدا میں دو شہید ہونے والے ہیں) ــــ حضورؐ کے محترم چچا حضرت حمزہ اور دیگر شہداءِ اُحد کے مدفن پر پہونچ کر راہ خدا میں حضرت حمزہ کا شہید ہونا ان کے ناک اور کان کاٹے جانا، ان کے جگر کا چبایا جانا یاد آیا، حضرت مصعب بن عمیر کی زندگی کا اول و آخر یاد آیا کہ اسلام لانے سے پہلے بڑے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ رہنے والے وہ ایک رئیس زادہ تھے۔ دو دو سو درہم کی قیمت کی ایک ایک چادر اوڑھتے تھے، اور اسی احد کے میدان میں جب راہِ خدا میں وہ شہید ہوئے تو ان کے کفن کے لیے اس کملی کے سوا کوئی کپڑا نہ تھا جس کو پہنے ہوئے وہ شہید ہوئے اور وہ بھی اتنی چھوٹی تھی کہ جب اس سے ان کے سر اور چہرے کو ڈھکتے تھے تو پاؤں کی طرف سے کھل جاتا تھا۔ اور جب پاؤں ڈھکتے تھے تو چہرا اور سر کھل جاتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ مصعب کے

کفن کے لیے ان کی کملی کے سوا کچھ نہیں ہو اور وہ اتنی چھوٹی ہو کہ سر ڈھانکتے ہیں تو پاؤں کھلتے ہیں اور پاؤں ڈھانکتے ہیں تو سر کھلا رہ جاتا ہو ؟ حضورؐ نے فرمایا کہ سر اور چہرہ کفنی ہی سے ڈھانک دو اور خدا کی راہ میں امیر سے فقیر بن جانے والے اس شہید کے پاؤں اذخر گھاس سے چھپا دو ، چناں چہ ایسا ہی کر کے انھیں دفن کیا گیا۔

عبداللہ بن جحشؓ بھی یاد آئے اور ان کی قابل یادگار دعا بھی یاد آئی ، انھوں نے اُحد کا معرکہ گرم ہونے سے ایک دن پہلے دعا کی تھی ۔ کہ ۔۔ "خداوندا میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ جب اس میدان میں حق و باطل کی جنگ برپا ہو تو میرا مقابلہ کسی بہادر کافر سے ہو ، وہ مجھے قتل کر ڈالے ، میرا پیٹ پھاڑ ڈالے ، میرے ناک کان کاٹ ڈالے ، پھر جب میں اس حالت میں تیرے پاس پہونچوں تو مجھ سے تو پوچھے کہ اے عبداللہ تیرے ساتھ یہ کیوں کیا گیا ؟ تو میں عرض کروں کہ صرف تیری راہ میں" ۔۔۔ عبداللہ بن جحشؓ کی یہ دعا حرف بحرف قبول ہوئی ، وہ شہید کیے گئے اور ان کے ناک کان کاٹے گئے ۔

سعد بن ربیعؓ بھی یاد آئے ، اسی جنگ اُحد میں ان کے جسم پر تیروں ، نیزوں اور تلواروں کے ستر سے اوپر زخم آئے تھے ، جنگ کے خاتمہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ میدان میں جا کر سعد بن ربیع کو تلاش کرو ، اور اگر وہ زندہ نظر آجائیں تو انھیں میرا سلام کہو اور میری طرف سے ان کا حال پوچھو ! چنانچہ ان صحابی نے انھیں ایسے حال میں پڑا پایا کہ ان کا جسم اگرچہ زخموں سے چھلنی تھا مگر شاید حضور کا سلام و پیام پہونچانے ہی کیلئے اللہ نے ابھی انھیں زندہ رکھا تھا ، بہرحال صحابی نے حضور کا سلام پہونچایا اور حال پوچھا ، عرض کیا حضور کو میرا آخری سلام پہونچا دینا اور عرض کر دینا کہ میں جنت کی خوشبو پا رہا ہوں ، اور میری قوم انصار کو میرا یہ پیام پہونچا دینا کہ تم میں سے ایک آدمی کے زندہ ہوتے ہوئے بھی اگر حضور پر کوئی آنچ آئی تو اللہ کے سامنے تمھارا کوئی عذر نہ چل سکے گا ۔

حضورؐ کے نہایت بوڑھے صحابی ابوسعد خیثمہ بھی یاد آئے جن کے جوان صاحبزادہ سعد بدر میں شہید ہو چکے تھے ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب اُحد کے لیے تیاری کر رہے تھے تو انھوں نے آ کر حضور سے عرض کیا کہ میں نے اپنے بیٹے سعد کو خواب میں دیکھا ہے انھوں نے مجھ سے کہا ہے کہ ابا جان ! جنت کی زمین ایسی نفیس و خوشبودار ہے اس کا پانی ایسا لذیذ اور شیریں ہے اور اس میں ایسی ایسی نعمتیں ہیں اس لیے آپ شہید ہو کے جلدی یہاں پہونچ جائیے ۔۔ حضور اب میری طبیعت اس دنیا سے اکھڑ چکی ہے میں جلدی ہی اپنے بیٹے سعد کے پاس جنت میں چلا جانا چاہتا ہوں اس لیے مجھے بھی اس معرکہ میں ساتھ چلنے اور شریک ہونے کی اجازت مرحمت فرمائیے۔ حضور نے اجازت دی اور وہ شہید ہو کر اپنی مراد کو پہونچے ۔ اور وہیں دفن ہیں ۔

اس گنج شہیداں پہ یہ سب یاد آئے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ اصلی ایمان انہی کے پاس تھا اور اسی نے ان کے لیے راہ خدا میں اس طرح مرنا اور مٹنا آسان کر دیا تھا بلکہ اس کو محبوب بنا دیا تھا ۔ اور ہم اس ایمان سے خالی ہو چکے ہیں ۔۔۔ اس احساس کے بعد خیال کے دھرف خیال سکے ، کانوں سے سنا گویا اللہ کے یہ بندے

اپنی قبروں سے پکار کر کہہ رہے تھے ـــــ نفاق چھوڑو، ایمان اختیار کرو، زندگی سے زیادہ موت کی فکر کرو، دنیا کی نعمتوں سے زیادہ جنت کی چاہت اپنے اندر پیدا کرو، اور پھر دنیا اور آخرت میں اللہ کے وعدوں کا ظہور دیکھو[۵] ــ اللہ کی رحمتیں ہوں ان بندوں پر ایمان کی ایسی مثالیں قائم کر گئے ہیں کہ انکو یاد کر کے اپنے پر نفاق کا شبہ ہوتا ہے۔

اسی روز غزوۂ خندق والے میدان میں بھی جانا ہوا، اب وہاں مختلف ناموں سے پانچ مسجدیں بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک مسجد الفتح کے نام سے مشہور ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ جس جگہ یہ مسجد ہے اسی جگہ حضورؐ خندق کے موقعہ پر فروکش تھے اور آپ یہیں مصروف دعا رہے تھے، جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت تیز آندھی کی شکل میں آسمانی مدد آئی تھی جس نے دشمنوں کے ٹڈی دل لشکر کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا ـــــ خندق کے محل وقوع اور طویل وعریض رقبہ کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اللہ اکبر اس زمانہ میں جبکہ خندقیں کھودنے کا کوئی خاص آلہ نہ تھا معمولی کدالوں سے اتنی لمبی چوڑی خندق اس سنگستان میں اللہ کے بندوں نے کیسے کھودی ہوگی۔ خندق کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی پاک زبانوں سے نکلا ہوا ایمانی ترانہ " اللھم لا عیش الا عیش الاخرہ" اس میدان کی ہواؤں اور فضاؤں سے خیال کے کانوں نے بار بار سنا۔ گویا کہ دنیا اور اس کی رنگ رلیوں میں گم ہو جانے والے ہم نام کے مسلمانوں کے لیے جو ایک تماشائی زائر کی طرح ان سب مقامات پر جاتے ہیں اس میدان کے سنگریزوں اور وہاں کی ہواؤں اور فضاؤں کا یہی پیام تھا۔" اللھم لا عیش الا عیش الاخرہ"۔

مدینۂ طیبہ میں قیام اس دفعہ بھی " مدرسۃ العلوم الشرعیہ" میں رہا۔ مدرسہ کا اصلی موضوع تو تعلیم ہی ہے۔ اور مختلف درجوں کی درسگاہوں کو طالبوں سے معمور اور اساتذہ کو اپنے کام میں مشغول ومنہمک دیکھ کر دل بڑا خوش ہوتا رہا کہ کیسا بابرکت ہے ہندوستان کا وہ خاندان جس نے یہاں یہ درسگاہ قائم کی اور کیسے مبارک اور خوش نصیب ہیں وہ بندے جن کی مالی شرکت و توجہ سے بلد النبی الامین میں یہ فیض جاری ہے، لیکن زمانۂ حج میں سینکڑوں یا ہزاروں سے بھی زیادہ زائرین مدینہ کو مدرسہ کی عمارتوں میں قیام سے جو آرام ملتا ہے بلاشبہ وہ بھی مدرسہ کا بہت بڑا فیض ہے خود اپنی آنکھوں سے ۹۔۱۰ دن برابر دیکھا کہ ہر قسم کے حجاج آکر ٹھہرتے ہیں جن میں سے بہت سے نہایت ہی ناتربیت یافتہ بھی ہوتے ہیں جو بڑی ہی تکلیف دہ گندگی مدرسہ میں کرتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس مدرسہ کا

---

[۵] ہرگز کسی کو غلط فہمی نہ ہو یہ کوئی آواز اور پکار نہیں تھی جس کو میرے سر کے کانوں نے سنا ہو، بلکہ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ اپنے خیال میں وہاں یہ بات آ رہی تھی کہ اگر اللہ کے یہ بندے ہمیں کوئی پیغام دے سکتے تو غالباً یہی دیتے " "

سارا عملہ بڑی سے بڑی بے تمیزی پر بھی غصہ یا ناراضی کا اظہار گویا جانتا ہی نہیں، اللہ تعالیٰ انھیں دنیا اور آخرت میں خوش رکھے۔

یکم محرم کو ہمیں مدینۂ طیبہ سے روانہ ہونا تھا، ہندستانی ٹائم سے دن کے ۹ بجے کے قریب مسجد نبوی رُضۃ الجنۃ میں وداعی نفل پڑھے، پھر مواجہہ شریف میں رخصتی سلام کے لیے حاضر ہوئے اور جو عرض کرنا تھا وہ کیا۔ بڑی محبت سے پیش آنے والے باب جبریل کے بوّاب سے ملے اور قیام گاہ سے سامان لے کر ہوائی جہاز کے دفتر پر آئے کچھ دیر کے بعد وہاں سے بس میں سوار کر کے ہوائی اڈہ بھیج دیے گئے۔ جس طیارہ سے ہمیں روانہ ہونا تھا وہ مصر سے آنے والا تھا اُس کے آنے میں کچھ دیر ہوئی پھر اس کے عملہ نے کچھ دیر آرام کیا، ہم نے ظہر وہیں پڑھی اسکے بعد طیارہ پر سوار ہوئے اور تقریباً سوا گھنٹہ میں جدہ اتر گئے۔ عصر حجاج منزل میں پہونچکر پڑھی۔ رات کو وہیں رہے، اگلے دن مکۂ معظمہ چلے گئے۔ بدھ۔ جمعرات۔ جمعہ پورے تین دن اللہ تعالیٰ نے پھر رہنا نصیب فرمایا۔ حجاج کا مجمع بہ نسبت سابق کے چوں کہ بہت کم ہو چکا تھا اس لیے ان دنوں میں اور زیادہ انشراح نصیب رہا — مدینۂ طیبہ جانے سے پہلے یہ طے ہو چکا تھا کہ وہاں سے میری واپسی پر علوی یا اسلامی جہاز سے ہماری واپسی ہوگی، اور مولنا علی میاں اور ان کے رفقاء مولوی معین اللہ ندوی، مولنا عبد الرشید ندوی مولوی محمد رابع ندوی سلمہ سب ساتھ ہی چلیں گے، لیکن مدینۂ طیبہ سے جب مکۂ معظمہ واپس آیا تو معلوم ہوا کہ بعض مخلصین کی رائے ہو کہ مولنا ہندستان جانے سے پہلے چند روز کے لیے ریاض تشریف لے جائیں، مسئلہ میرے سامنے بھی پیش کیا گیا، اگرچہ طبیعت کا سخت تقاضا یہ تھا کہ مولنا ساتھ ہی چلیں لیکن دینی مصلحت کا اقتضا یہ معلوم ہوا کہ وہ ضرور ریاض تشریف لے جائیں، چنانچہ یہی فیصلہ ہو گیا اور اب مولنا غالباً آخر نومبر تک پہونچ سکیں گے —— میں نے علوی جہاز ہی سے آنا اب طے کر لیا ہو، علوی اسلامی سے ایک ہفتہ پہلے ۶ یا ۷ اکتوبر کو جدہ سے چل کر انشاء اللہ ۱۷ یا ۱۸ کو بمبئی پہونچے گا۔ بمبئی میں ایک دو دن سے زیادہ قیام کا ارادہ نہیں ہو — واپسی میں بھوپال اطلاع دینے کا وعدہ مولنا محمد عمران خاں صاحب سے کر لیا تھا اسلیے بمبئی سے انھیں اطلاع دینی پڑے گی اور اگر وہ بھوپال ہوئے اور اسٹیشن تشریف لے آئے تو بلا اتارے مانیں گے نہیں اور مجھے اترنا پڑ جائے گا۔ پھر بھی ۲۰، ۲۱ محرم تک لکھنؤ انشاء اللہ پہونچ ہی جاؤں گا۔

یہ خط لکھ تو لیا ہو لیکن پچھلے کئی دفعہ کے تجربہ کی بنا پر خطرہ ہو کہ شاید میرے لکھنؤ پہونچنے کے بھی بعد پہونچے۔ اس پورے سفر میں مجھے تمھارا صرف ایک خط مل سکا ہو جو تم نے ۸ ذی الحجہ کو ہوائی ڈاک سے روانہ کیا تھا یہ مجھے ۲۸ یا ۲۹ ذی الحجہ کو مدینۂ طیبہ میں ملا۔

میرے پیچھے تم پر کاموں کا بہت بوجھ پڑا ہوگا۔ میں برابر دعائیں کرتا رہا ہوں اور یہاں سے دعا کے سوا اور کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا۔ اور سچ تو یہ ہو کہ کارساز تو ہر حال میں بس اللہ ہی ہو اس لیے قریب ہو کر بھی جو کچھ آدمی کسی کے ساتھ کر سکتا ہو، دعا، اُس سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی ہو، کاش اللہ تعالیٰ ہمیں دعا کی حقیقت اور اس کا عرفان نصیب فرما دیں۔ من فتحت له ابواب الدعاء فتحت له ابواب الرحمه۔

اللھم اجعلنا منہم ——————— والسّلام

محمد منظور نعمانی، عفا اللہ عنہ

مولانا علی میاں کی تشریف آوری

لکھنؤ میں تبلیغی ہفتہ

الحمد للہ مولانا علی میاں حجاز اور دیگر ممالک اسلامیہ کے ۱۴ ماہ کے دورہ کے بعد لکھنؤ تشریف لے آئے، یہاں کے تبلیغی رفقاء نے نومبر کے آخری ہفتہ میں ۲۲ صفر مطابق ۲۲ نومبر سے ۲۹ صفر مطابق ۲۹ نومبر تک اصلاح و تبلیغ کی جد و جہد کا ایک خاص پروگرام طے کیا ہے، اس سلسلہ میں ۲۶ نومبر سے ۲۹ نومبر تک شہر میں بڑے پیمانہ پر اجتماعات بھی ہوں گے۔ ادارۂ "الفرقان" نے طے کیا ہے کہ انشاء اللہ اس پورے ہفتہ کی کارروائی (مع تقریروں کے) الفرقان کی آئندہ اشاعت میں ہدیۂ ناظرین کی جائے گی۔

اس غرض کے لیے آئندہ اشاعت صفر و ربیع الاول کی مشترک اشاعت ہوگی۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ آئندہ ماہ ربیع الاول کے آخر تک اپنے ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

والسّلام

ناظم "الفرقان" لکھنؤ

مکہ معظمہ سے لکھنؤ تک

۱۹ محرم کو یہ عاجز بخیر و عافیت لکھنؤ پہونچ گیا ــــ محرم کا یہ شمارہ جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے کتابت کی منزل میں تھا، اس میں میرے وہ دو خط شائع ہونے والے تھے جو گزشتہ صفحات میں ناظرین نے ملاحظہ فرمائے ہوں گے۔ مناسب معلوم ہوا کہ مکہ معظمہ سے لکھنؤ تک کے اپنے سفر کا بھی کچھ حال لکھ کر اس "لذیذ حکایت" کی ایک گونہ تکمیل کر کے انہی خطوں کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔ لذت و دلچسپی کے علاوہ بعض باتوں سے واقفیت ناظرین کے لیے انشاء اللہ فائدہ مند بھی ہوگی۔

ناچیز ــ محمد منظور نعمانی

علوی جہاز جس سے میں نے آنے کا ارادہ کر لیا تھا وہ ۵ محرم مطابق ۶ اکتوبر شنبہ کے دن روانہ ہونے والا تھا۔ اس لیے طے یہ کیا کہ جمعہ کا دن مکہ معظمہ میں گزار کر بعد نماز مغرب طوافِ وداع کر کے انشاء اللہ جدہ روانہ ہوں گے، چنانچہ مغرب کی نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر طواف وداع کیا، طائفین کے کافی اژدحام کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس طواف کے اول و آخر میں حجر اسود تک پہونچ کر اطمینان سے سنت کے مطابق استلام اپنے خاص فضل سے میسر فرمایا۔ طواف کے بعد رکعتین طواف حطیم میں ادا کیں۔ وہاں سے ملتزم پر آئے یہاں اچھا خاصا مجمع تھا لیکن حق تعالیٰ نے کسی طویل انتظار کے بغیر یہاں بھی جگہ دلوادی، الحمد للہ بڑے اطمینان سے عرض و معروض کا موقع مل گیا، یہاں سے ہٹ کر پھر و داعی استلام (یعنی بوسہ) کے لیے حجر اسود پر آئے، اس دفعہ بھی اللہ تعالیٰ نے اطمینان سے استلام نصیب فرمایا والحمد للہ علیٰ ذالک اس کے بعد زمزم شریف پی کر حرم شریف سے رخصت ہوئے اور اس مقام پر پہونچے جہاں سے جدہ کے لیے موٹریں ملتی ہیں۔ کچھ دیر کے بعد مسافروں کو جدہ لے جانے والی ایک موٹر بس آئی اور ہم اس میں سوار ہو بھی گئے، لیکن اس کے نگراں نے ہمارا "ورقہ اجازہ" دیکھ کر کہا کہ آپ صرف "شرکہ" کی موٹر سے سفر کر سکتے ہیں اور ہماری بس دوسری کمپنی کی ہے اس لیے ہم آپ کو جدہ نہیں لے جا سکتے اور شرکہ کی آخری بس بھی جا چکی اس لیے اب آپ کل بعد نماز فجر شرکہ کی بس سے جا سکیں گے ــ یہ معلوم کر کے ہمیں اترنا پڑا۔ لیکن افسوس کم اور الحمد للہ خوشی زیادہ ہوئی کہ چلو ایک رات اور رہنے کا موقع مل گیا اور اگر

علوی سے جانا مقدر ہو تو وہ بھی انشاء اللہ مل ہی جائے گا ــــــــ الغرض وہاں سے حرم شریف اور پھر وہاں سے قیام گاہ (رباط بھوپال) واپس آئے۔

آج دن میں آرام کرنے کا موقع بالکل نہیں ملا تھا اس لیے بڑا تکان تھا اور سونے اور آرام کرنے کا طبیعت پر بڑا تقاضا تھا۔ گویا طبیعت اس کے لیے مضطر تھی اللہ تعالیٰ کے کرم کے قربان کہ اس وقت کا سفر ملتوی کرا کے اس نے غیب سے آرام کی یہ صورت پیدا کی۔ تین چار گھنٹے اطمینان سے سوئے، الحمدللہ طبیعت ہلکی ہو گئی، اُٹھ کر حرم شریف آئے۔ حسب توفیق نوافل پڑھے، طواف کیا، جب اذان فجر کا وقت قریب آیا تو پھر وداع کی نیت سے طواف کیا۔ اس طواف میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے اول و آخر میں بڑے اطمینان سے استلام کا موقع فراہم فرمایا۔ رکعتین طواف اب کے بھی غالباً حطیم ہی میں پڑھیں، اس کے بعد ملتزم پر پہونچے سخت ہجوم کے باوجود اللہ تعالیٰ کے کرم خاص نے اس وقت پھر جگہ عنایت فرمائی اور عرض و معروض کی بھی توفیق نصیب فرمائی۔ (واقعہ یہ ہو کہ اگر ادھر سے عطا نہ ہو تو بندہ کے بس میں یہ بھی نہیں) اس اثنا میں اذان فجر شروع ہوئی اس کے خاتمہ پر رکعتین فجر پڑھیں، وہاں کے رواج اور قاعدہ کے مطابق چند ہی منٹ بعد فجر کی نماز شروع ہو گئی، نماز سے فارغ ہو کر یہ عاجز وداعی استلام کے لیے پھر حجر اسود پر حاضر ہوا، اس دفعہ بھی اطمینان سے تقبیل کا اللہ تعالیٰ نے پھر موقع نصیب فرما دیا اور یہ سمجھ کر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہی "یمین اللہ فی الارض" ہو۔ اپنا منھ اس پر رکھ دیا اور جو اس وقت عرض کرنے کی توفیق ملی وہ عرض کیا۔

معلوم ہوا تھا کہ شرکہ کی پہلی موٹر بس نماز فجر سے تھوڑی دیر بعد ہی چھوٹ جاتی ہو اور نماز کے بعد ذرا دیر کی جائے تو اس میں جگہ ملنی مشکل ہو جاتی ہو اس لیے حرم شریف سے براہ راست اس کے اسٹیشن پر پہونچے اس میں جگہ اطمینان سے مل گئی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد روانہ ہو کر بس نے قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ہمیں جدہ پہونچا دیا۔ یہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ علوی جہاز جس کو آج جانا تھا اس کے جدہ پہونچنے میں کچھ تاخیر ہو گئی، اسلیے اب بجائے آج کے وہ کل ۷ اکتوبر کو انشاء اللہ روانہ ہوگا۔ اس طرح ایک دن جدہ میں اطمینان کا اور مل گیا اگرچہ اس سفر میں اس سے پہلے تین دفعہ جدہ قیام ہو چکا تھا، سب سے پہلے جہاز سے اُتر کر ایک دن سے زیادہ ٹھہرنا پڑا تھا، پھر مدینہ طیبہ جاتے وقت بھی جدہ ٹھہرنا ہوا تھا، پھر مدینۂ طیبہ سے واپس آکر مکہ معظمہ جانے سے پہلے بھی قریباً ۲۴ گھنٹے جدہ میں گزرے تھے۔ اور ہر دفعہ حجاج منزل ہی میں قیام ہوا تھا اور ہر مرتبہ اس کا احساس ہوا تھا کہ اگر "حجاج منزل" بن جائے تو اس سے حاجیوں کو کتنا آرام مل سکتا ہے۔ لیکن آخری دو دفعہ کے قیام جدہ میں اس احساس نے سخت تقاضے کی شکل اختیار کر لی اور اس عاجز نے

حکیم نعیم صاحب اور ان کے برادر معظم مولانا محمد سلیم صاحب سے اس بارہ میں گفتگو کی اور کچھ معلومات حاصل کیے اور آخر میں یہ تجویز پیش کی کہ آپ بنام خدا اس سال کم از کم "حجاج منزل" کی مجوزہ مسجد اور اس کے ساتھ چند پاخانوں، غسلخانوں اور چند کمروں کی تعمیر کا کام شروع کرنے کا ارادہ کرلیں، لیکن ان حضرات نے جب سامان تعمیر کے وہاں کے نرخ بتلائے اور معماروں، مزدوروں کی شرح اجرت تو واقعہ یہ ہو کہ میں بھی سکتہ میں رہ گیا ـــــ پھر بھی سوچ سمجھ کر میں نے ان سے یہی عرض کیا کہ بہرحال آپ مسجد اور اس سے متعلق چند کمروں، پاخانوں اور غسل خانوں کی تیاری کا تخمینہ کسی ماہر فن سے بنوائیے اور حجاج منزل کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کرنے والے اور اس کی تعمیر کے مسئلہ سے دلچسپی اور ہمدردی رکھنے والے ہندوستان و پاکستان کے اپنے واقفین کو بھیج دیجیے۔ اگر انھوں نے اپنا فرض ادا کیا تو انشاء اللہ یہ کام آپ اس سال شروع کرسکیں گے اور خدا نے چاہا تو درمیان میں آپ کو کام روکنا نہ پڑے گا۔ اور جتنی طویل و عریض مسجد زیر تجویز ہو اگر فی الحال صرف وہی تیار ہوگئی اور اس سے متعلق چند کمرے بن گئے اور پاخانوں، غسل خانوں کا معقول انتظام ہوگیا تو اتنی تعمیر سے بھی ہزاروں حاجیوں کے آرام کا سامان ہوجائے گا۔ خصوصاً چوں کہ موسم کے حساب سے آئندہ ۱۵-۲۰ سال تک حج اب سخت گرمیوں ہی میں ہوگا۔ اس لیے کم از کم اتنی عمارت جتنی جلد تیار ہو سکے اور اس کے لیے جو کچھ ہم کرسکیں اس سے ہمیں دریغ نہ کرنا چاہیے۔ ان حضرات نے وعدہ تو کیا ہو، خدا کرے یہ کام کسی طرح ہو جائے، دراصل اس کی اہمیت کو وہی حضرات محسوس کرسکتے ہیں جو اس سے واقف ہیں کہ حجاج کو جدہ میں وکیلوں کے دروازوں پر پڑکر کیسی تکلیف ہوتی ہو اور آئندہ سالوں میں جب حج سخت گرمی کے موسم ہی میں ہوا کرے گا تو یہ تکلیف کتنی خطرناک ہوگی۔ جیسا کہ عرض کیا میرا اندازہ ہو کہ اگر حجاج منزل کی مجوزہ مسجد اور اس کے ساتھ چند کمرے (جن میں سے دو چار کمرے مستورات کے لیے مخصوص ہوں) تیار ہوجائیں تو ہزاروں حاجی انشاء اللہ آرام سے رہ سکا کریں گے۔ واللہ المیسر لکل عسیر وعلیہ التکلان۔

مولانا علی میاں، ان کے رفقاء مولانا عبداللہ صاحب ندوی، مولانا معین اللہ صاحب ندوی، مولانا عبدالرشید ندوی، عزیزی مولوی محمد رابع ندوی، مولوی محمد رضوان (سلمہم اللہ) یہ سب حضرات مجھے رخصت کرنے کے لیے ۹ر اکتوبر کی شام کو جدہ تشریف لائے تھے ـــــ ۱۰ر اکتوبر کو بعد نماز ظہر بلکہ قریب عصر ہم علوی جہاز پر سوار ہوئے، یہ سب حضرات بھی خصوصی اجازت سے جہاز پر تشریف لائے اور ہم مسافروں کو "فی امان اللہ" کہہ کر اس وقت جہاز سے اُترے جب کہ جہاز چھوٹنے لگا ـــــ بہرحال جہاز نے جدہ کا ساحل چھوڑا اور بمبئی کے لیے روانہ ہوگیا ـــــ ۲۰ر کی شام کو چل کر ۱۰ر اکتوبر کی صبح کو ہمارا جہاز

بمبئی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا. گویا قریباً ۱۱ دن میں پہونچا۔ یہ دن الحمد اللہ بڑے اچھے گزرے۔ تجربہ کاروں سے سُنا ہو کہ اس موسم میں سمندر عموماً اتنا پُرسکون نہیں ہوتا جتنا کہ الحمدللہ ان دنوں میں رہا. طبیعت بہت اچھی رہی، عام طور سے حجاج خوش رہے، علوی جہاز کا عملہ بھی بڑا اچھا نظر آیا — چھوٹے بڑے سب نرم طبیعت اور خوش اخلاق، امیر حجاج حیدر آباد دکن کے ایک وکیل مرتضیٰ احمد صاحب انصاری تھے، ہر شخص کو خوش رکھنا اور ہر ایک کی فرمائش کی تعمیل کرنا تو کسی کے لیے بھی آسان نہیں، لیکن اس عاجز کا اندازہ یہ ہو کہ انھوں نے اپنے فرائض منصبی اور حجاج کی ضروریات و شکایات سے تغافل نہیں برتا، ورنہ بعض جہازوں میں تو ایسے لوگ امیر حجاج بنا دیے جاتے ہیں کہ سفر کی آخری منزل تک بھی جہاز کے مسافر نہیں جانتے کہ اس جہاز میں کوئی امیر حجاج بھی ہیں اور ان کا عام مسافروں سے کوئی تعلق ہو.

جیسا کچھ بن پڑا جہاز میں تعلیم و تبلیغ کا سلسلہ بھی کچھ جاری رہا، بعض رفقائے سفر نے اللہ انھیں جزائے خیر دے "اسلام کیا ہو" اور "حکایات صحابہ" کے مضامین جہاز کے مختلف حصوں میں چکر لگا لگا کر سنائے علوی مغل لائن کے چھوٹے جہازوں میں سے ہو. جس میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہو کہ دو تین سو آدمی بھی ایک جگہ بیٹھ سکیں اس لیے کسی بڑے اجتماع اور تقریر کی کوئی صورت سمجھ میں نہ آئی اور تین چار دن ایسے ہی گزر گئے. بالآخر جہاز کے ایک حصہ کو جس میں بمشکل ڈیڑھ سو دو سو آدمی بیٹھ سکتے تھے، اس کے لیے منتخب کر لیا گیا اور روزانہ بعد نماز عصر تقریر کا سلسلہ شروع ہو گیا. ان تقریروں کی حیثیت تقریر سے زیادہ مسلسل درس و تعلیم کی تھی. اس سلسلہ میں دین کے تمام شعبوں، ایمانیات، پھر اعمال میں حقوق اللہ، حقوق العباد، معاشرت و معاملات اور اخلاق و آداب سب کو ترتیب وار بیان کیا گیا، اور جو غلطیاں اور خرابیاں عام مسافروں میں نسبتہً زیادہ تھیں ان کی اصلاح پر زیادہ زور دیا گیا — آخر ان کی تقریر کے بعد اللہ کے بہت سے بندوں نے زندگی کی سابقہ غلطیوں سے استغفار کے ساتھ آئندہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے عہد بھی کیے. اللہ تعالیٰ ان کو ان عہود و مواثیق کو یاد رکھنے اور ان پر قائم رہنے کی توفیق دے.

حج چونکہ دین کا مقدس رکن اور تکمیلی فریضہ ہو اس لیے حج کرنے والوں کے متعلق لوگوں کا تصور عام طور سے اچھا اور بلند ہی ہوتا ہو. اور ہونا بھی چاہیے. لیکن جب آدمی اس راہ سے گزرتا ہو تو اسے آنکھوں سے وہ دیکھ کر جس کا اسے پہلے وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا بڑی حیرت اور بعض اوقات بڑی مایوسی ہوتی ہو. وہ دیکھتا ہو کہ بیت اللہ اور مدینۃ الرسول سے واپس آنے والے جنھیں اگر "ولی" نہیں تو کم از کم "بھلا آدمی" تو ضرور ہی بن جانا چاہیے تھا. ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو بازاریوں کی طرح آپس میں لڑتے ہیں، گالم گلوج کرتے

ہیں، اور بعض اوقات گتھم گتھا بھی ہو جاتے ہیں اور کاہے پر ؟ نل سے پہلے یا بعد میں پانی لینے پر، بستر کے ذرا آگے یا پیچھے کر لینے پر، اور بعض اوقات اس سے بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر، لاحول ولا قوۃ الا باللہ ـــ خیر یہ باتیں تو اس عاجز کے لیے نئی نہ تھیں، لیکن اس سفر میں ایک دفعہ یہ دیکھ کر بڑی تکلیف اور روحانی اذیت ہوئی کہ حج سے واپس آنے والوں میں ایسے گھٹیا درجہ کے جاہلانہ اور مشرکانہ خیالات رکھنے والے بھی ہوتے ہیں جنھیں سن کر شاید بت پرست اور اہلِ تثلیث بھی ہنسیں۔

ایک دن وضو کر رہا تھا، قریب میں یو، پی کے ایک پوربی ضلع کے چند حاجی صاحبان بیٹھے باتیں کر رہے تھے، ایک صاحب ان میں بول رہے تھے اور باقی خاموشی سے سن رہے تھے، میرے کانوں تک بعض ایسے الفاظ پہونچے جنھوں نے مجھے ادھر متوجہ کر دیا۔ میں نے سنا وہ اپنے ساتھیوں کو سنا رہے تھے ـــ نقل کفر کفر نہ باشد ـــ "ایک آدمی تھا وہ غوث پاک کو بہت مانتا تھا، ان کی گیارھویں اور نذر نیاز ہمیشہ کیا کرتا تھا اور اس کے سوا کچھ نہیں کرتا تھا، وہ جب مرا اور لوگوں نے اسے قبر میں دفن کر دیا تو منکر نکیر فرشتے اس کے پاس آئے اور پوچھا بتا تیرا رب کون ہے ؟ اس نے کہا غوث پاک، فرشتے حیران ہوئے کہ یہ کیا کہتا ہے، انھوں نے پھر پوچھا تو اس نے پھر وہی جواب دیا کہ غوث پاک، فرشتوں نے تیسرے دفعہ پھر پوچھا کہ تیرا رب کون ہے ؟ اس نے پھر کہا غوث پاک۔ اب فرشتہ نے مارنے کے لیے اپنا گرز اٹھایا، اس نے فوراً پکارا "یا غوث المدد!" ابھی فرشتہ نے گرز مارا بھی نہیں تھا کہ فوراً غوث پاک نے آکر اس کو پکڑ لیا اور ہاتھ سے گرز چھین لیا اور کہا خبردار! تو نے سنا نہیں وہ ہمارا نام لے رہا ہے ـــ فرشتے حیران ہوئے اور خدا کے دربار میں پہونچکر پوچھا یا اللہ پاک! یہ کون ہے جس کو تو نے ایسے اختیارات دے دیے ہیں اور ایسی قوت دے دی ہے کہ اس نے ہم سے گرز چھین لیا ـــ اللہ تعالیٰ نے کہا، خبردار ان سے کبھی نہ الجھنا، یہ ہمارے غوث ہیں ـــ"

یہ قصہ قریب قریب انہی الفاظ میں اس عاجز نے اس بندۂ خدا کی زبان سے اپنے کانوں سے سنا۔ بڑا دکھ ہوا لیکن زبان سے کچھ کہنے سے پہلے سوچا کہ میں ان لوگوں سے کیا کہوں اور کس طرح کہوں جس سے ان پر کچھ اثر پڑ سکے اور یہ اس شرک کی گندگی سے نکل سکیں ـــ دیر کے بعد ایک تدبیر سمجھ میں آئی، میرے ساتھ حکیم عبدالرشید صاحب کان پوری ایک بڑے ذی فہم اور باسلیقہ رفیق تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آج میں نے ان لوگوں کو یہ باتیں کرتے سنا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ان بیچاروں کی اصلاح کی کوشش کریں، لیکن اگر میں براہ راست ان سے اس سلسلہ میں بات کروں گا تو شیطان انھیں سمجھنے نہیں دے گا۔ اس لیے ان بیچاروں کی اصلاح کے لیے ایک حکیمانہ تدبیر کرنی ہے، اور آپ اس کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ آپ کوشش کر کے آج ان

صاحبوں کو شام کی تقریر میں لائیے۔ میں توحید کے متعلق بھی کچھ بیان کروں گا جس میں ان لوگوں کی اس بات چیت کا تو کوئی ذکر نہ کروں گا، البتہ کچھ ایسی اصولی چیزیں انشاء اللہ کہوں گا جن سے ان کا ذہن کچھ درست ہو۔ پھر تقریر کے بعد کسی ایسے وقت جب کہ یہ لوگ ہم سے اور آپ سے قریب بیٹھے ہوں آپ مجھ سے تقریر کی بنیاد پر کچھ سوالات کریں اور اس قسم کے جاہلوں میں حضرت پیران پیر کے متعلق اس جاہلانہ کہانی کے علاوہ جو اور کہانیاں کچھ اسی قسم کی مشہور ہیں آپ ان کے بارہ میں مجھ سے پوچھیں، لیکن خاص اس کہانی کا اس وقت ذکر نہ کریں۔ میں آپکے سوال کا جو جواب دوں گا انشاء اللہ اس سے ان کے عقیدے کی اصلاح ہو جائے گی۔ پھر دوسرے وقت خاص اس کہانی کے متعلق بھی مناسب طریقہ سے ان سے اور کچھ کہا جائے گا تو انشاء اللہ وہ اس گندگی سے صاف ہونے پر آمادہ ہو جائیں گے ——— حکیم صاحب کو میں نے خود ہی ایسے دو ایک قصے تبلا بھی دیے۔ بہر حال یہی تدبیر کی گئی، حکیم صاحب کوشش کر کے بعد عصر تقریر میں ان لوگوں کو لے آئے۔ اس عاجز نے اس دن کی تقریر میں توحید کے متعلق بھی کچھ کہا اور تبلایا کہ حج سے توحید کی تکمیل بھی ہونی چاہیے، اور توحید بھی وہ جس کی تعلیم انبیاء علیہم السلام نے اور خاص کر سیدنا حضرت ابراہیم اور سیدنا حضرت محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام نے دی۔ پھر کسی قدر تفصیل سے قرآن مجید کی آیات اور احادیث نبوی سے تبلایا کہ اس توحید کی حقیقت کیا ہے ——— بہر حال تقریر میں نہ میں نے بیچارے ان حاجیوں کی طرف خطاب کیا جن کے عقیدہ کی میں در اصل اصلاح کرنا چاہتا تھا۔ نہ اپنے نزدیک کوئی ایسی بات کہی جس سے انھیں خیال ہوتا کہ یہ بات خاص ہمارے متعلق ہے، اور ہم سے کہی جارہی ہے، چنانچہ دوران تقریر ہی میں نے ان کے چہروں سے اندازہ کیا کہ وہ میری باتوں سے مطمئن ہو رہے ہیں ——— تقریر کے ختم پر مغرب کی نماز ہوئی، وہ لوگ بھی جماعت میں شریک ہوئے۔ پھر ایک وقت جب کہ وہ لوگ میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے، حکیم عبد الرشید صاحب نے پوچھا کہ آپ نے تو اپنی تقریر میں یہ بیان کیا کہ اللہ کی قضا و قدر میں کسی کا دخل نہیں، اور کوئی اس کے فیصلوں کو بدل نہیں سکتا، وہ جس کی موت کا فیصلہ کرے کوئی اس کو زندہ نہیں رکھ سکتا۔ اور وہ جس کو زندہ رکھنا چاہے کوئی اس کو مار نہیں سکتا ——— لیکن بزرگان دین کے ایسے بہت سے قصے مشہور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب باتوں میں ان کو بھی دخل ہے، چنانچہ حضرت غوث پاک کے متعلق مشہور ہے کہ کوئی بڑھیا ان کی مرید تھی اس کا اکلوتا جوان لڑکا بیمار ہوا، وہ روتی ہوئی حضرت کے پاس آئی، حضرت نے اسے اطمینان دلایا کہ جا تیرا بیٹا نہیں مرے گا۔ وہ گھر واپس آئی تو دیکھا کہ اس کے پہونچنے سے پہلے بیٹا ختم ہو چکا ہے، وہ روتی پیٹتی حضرت کی خدمت میں آئی اور عرض کیا کہ آپ نے تو فرمایا تھا وہ نہیں مرے گا وہ تو مر گیا۔ میں تو اپنا بیٹا آپ ہی سے لوں گی، آپ نے کہا اچھا ہم ابھی تیرے بیٹے کو بخشے دیں گے، اور یہ کہہ کر آپ آسمان کی طرف اُڑے اور راستے

ہی میں موت کے فرشتے کو پکڑ لیا وہ بہت سی روحیں ایک تھیلے میں بند کیے ہوئے لیے جا رہے تھے جن میں اس بڑھیا کے بیٹے کی روح بھی تھی، آپ نے وہ تھیلا ان کے ہاتھ سے چھین لیا اور چھین کر اس کا منھ کھول دیا، وہ سب روحیں نکل گئیں اور اس دن کے سارے مردے زندہ ہوگئے، بڑھیا کا بیٹا بھی زندہ ہوگیا ——— تو ایسے قصوں کی کیا حقیقت ہے؟ -

میں نے کہا اصل بات یہ ہے کہ شیطان انسانوں کا اور خاص طور سے مسلمانوں کا بڑا دشمن ہے وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح انھیں شرک اور کفر کے راستے پر ڈال کر اللہ سے دور اور جنت سے محروم کر کے دوزخ میں پہونچا دے۔ اور بہت سے لوگوں پر اس کا جادو چل جاتا ہے اور چلتا رہے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگلی امتوں میں جو برائیاں آئیں وہ سب تم میں آئیں گی اور جو کچھ انھوں نے کیا وہ سب تم بھی کروگے اور قرآن شریف میں عیسائیوں کے متعلق ہے۔

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم۔ انھوں نے اپنے عالموں اور پیروں فقیروں کو اور مسیح بن مریم کو اللہ کے علاوہ اپنا رب بنا لیا۔

تو حضور کی پیشین گوئی کے مطابق ضروری تھا کہ اس امت میں بھی یہ گمراہی آئے چنانچہ آئی اور بہت سے جاہل لوگوں میں بزرگان دین کے متعلق ایسے خیالات شیطان نے پیدا کر دیے۔ دراصل ان قصوں کے ذریعہ شیطان بزرگان دین کی شان بڑھانا نہیں چاہتا بلکہ اللہ کی اور اس کے فرشتوں کی شان گھٹانا چاہتا ہے اور بزرگان دین کی محبت اور عظمت کا دھوکا دے کر لوگوں کو اللہ اور رسول کے راستے کے خلاف لے جانا چاہتا ہے۔ شیطان بڑا فریبی اور بڑا گھاگ ہے۔ اس نے اس بات کو خوب سمجھ لیا ہے کہ لوگوں کو بزرگوں اور پیروں کی محبت کے نام سے بڑی آسانی سے گمراہ کیا جا سکتا ہے، اسی دھوکے سے اس نے عیسیٰ علیہ السلام کی ساری امت کو شرک میں مبتلا کیا، بیچارے شیعہ اسی راستے سے گمراہ ہوئے اور ہم ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کو دیکھتے ہیں کہ شیطان نے انھیں بزرگوں کی محبت اور عظمت کا دھوکا دے کر ایسے عقیدوں میں مبتلا کر دیا ہے جو سراسر شرک ہیں اگر شیطان یا کوئی اس کا چیلا چانٹا کسی مسلمان سے صاف اور سیدھے لفظوں میں یہ کہے کہ اللہ ایسا نہیں ہے کہ اس کا ہر حکم چلے تو کوئی مسلمان کبھی بھی ایسی بیہودہ بات کہنے کے لیے تیار نہ ہوگا، مگر شیطان نے بزرگان دین کے نام پر ایسے قصے پھیلا کر ہزاروں مسلمانوں سے گویا یہ بات کہلوا دی، آپ خود سوچیے اس قصے کا یہی تو مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کی موت کا فیصلہ کیا، فرشتہ نے اللہ کے حکم سے اس کی روح قبض کی، لیکن حضرت پیران پیر نے زبردستی بیچ میں آکر اللہ کی بات نہیں چلنے دی۔ اس طرح کے قصوں سے دراصل شیطان بزرگان دین کو بڑھانا نہیں چاہتا، بلکہ اللہ کی اور اس کے فرشتوں کی شان گھٹانا چاہتا ہے۔ اور خیر شیطان تو شیطان ہے،

تعجب اور حیرت اس پر ہو کہ کوئی مسلمان یا کوئی سمجھ دار انسان ایسی باتوں پر یقین کیسے کر سکتا ہو۔ ایک دفعہ حضرت پیران پیر ہی کے متعلق ایک صاحب نے قصہ سنایا کہ جب وہ پیدا ہونے والے تھے تو والدۂ ماجدہ کو بڑی تکلیف تھی اور کسی طرح ولادت نہ ہوتی تھی، بہت دوائیں دی گئیں مگر سب بیکار رہیں، آخر ایک بزرگ کے پاس گئے انھوں نے فرمایا تم احمق ہو، انھیں خبر نہیں کہ یہ پیدا ہونے والا بچہ غوث ہوگا وہ برہنہ پیدا نہیں ہونا چاہتا، اس لیے سوا گز کپڑا اس کی ماں کو نگلوا دو وہ تہبند باندھ کر فوراً پیدا ہو جائیں گے۔ جب میں نے یہ قصہ سنا تو بیان کرنے والے شخص سے کہا کہ گڑھنے والا کوئی اتنا جاہل اور احمق ہو کہ یہ بھی نہیں جانتا کہ رحم کا منھ سے کوئی تعلق نہیں اور منھ کے راستے کوئی چیز رحم میں نہیں پہونچائی جا سکتی، اس کے علاوہ اس قصے سے معلوم ہوتا ہو کہ حضرت پیران پیر تمام انبیاء سے، بلکہ سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل ہیں کہ وہ سب عام انسانی قانون کے مطابق بغیر کسی کپڑے کے پیدا ہوئے اور پیران پیر ماں کے پیٹ سے تہبند باندھ کر تشریف لائے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

ان سوال وجواب سے جو باتیں جن حاجی صاحبان کو سنانی مقصود تھیں اگرچہ ان کی طرف روئے سخن بالکل نہیں کیا گیا، لیکن انھوں نے بڑی توجہ سے سنی، اور الحمد للہ اس تدبیر سے ان کا عقیدہ درست ہو گیا۔ اس کے بعد وہ روزانہ پابندی سے تقریریں آتے رہے اور پھر دوسری صحبتوں میں براہ راست ان کو مخاطب بنا کر بھی اصلی اسلامی توحید ان کو سمجھائی گئی! والحمد للہ جہانتک اپنا اندازہ ہو وہ شرک کی گندگی سے نکل گئے۔

بات طویل ہو گئی۔ لیکن قصہ عبرت انگیز تھا اور امید ہو کہ اللہ کے بندوں کے لیے مفید بھی ہوگا اس لیے ذکر کر دیا گیا ورنہ اگر جہاز کی روز مرہ کی مجلسوں کی اس قسم کی سب باتیں نقل کی جائیں تو ضخیم کتاب بن جائے گی۔

---

۱۰ ر اکتوبر مطابق ۱۶ ر محرم جمعرات کے دن ہمارا جہاز بمبئی کے ساحل پر لگا، قریباً آٹھ بجے ہم لوگ اُتر گئے مولانا محمد قاسم صاحب شاہجہانپوری، مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی، محمد حسین صاحب تو پہلے سے گودی پر تھے پہلے ملاقات ہوئی اگلے دن جمعہ کی نماز تک محب مخلص عبد الکریم دعوت پچو بھائی کے مکان پر بڈّی میں قیام ہا مولانا قاری ذاکر حسین صاحب نے ایک ملاقات میں ذکر فرمایا کہ یہاں بمبئی کے کسی اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ جس محمدی جہاز سے آپ یہاں سے گئے تھے اُسی میں مولوی حشمت علی صاحب بھی تھے اور آپ کے اور ان کے درمیان کوئی مکالمہ اور مباحثہ ہوا، یہ سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا، یہ تو صحیح ہو کہ محمدی جہاز سے جانے والوں میں مولوی حشمت علی صاحب بھی تھے، اور مجھے ان کی مزاجی خصوصیات اور افتاد طبع سے اس کا اندیشہ بھی تھا کہ شاید وہ کوئی ناسنجیدہ رویہ اختیار کریں اور بحث جدال کی کوئی صورت پیدا ہو لیکن میں اول تو طویل تجربوں کے بعد اس سلسلہ کی بحثوں کو مفید نہ سمجھ کر ان سے بالکل کنارہ کش ہو چکا ہوں، اور اللہ جتنی توفیق دیتا ہو

ان طریقوں سے کام کرنا چاہتا ہوں جن کو میں مفید اور مؤثر سمجھتا ہوں۔ علاوہ ازیں اس سفر میں ہر شخص کی خواہش قدرتی طور پر یہی ہونا چاہیے کہ اس کے دل میں کوئی تکدر نہ ہو، اور اللہ توفیق دے تو حرمین کے مختصر زمانۂ قیام میں دل خارجی خطرات و خیالات سے بالکل صاف اور خالی رہے۔ اس لیے بھی مجھے جب یہ معلوم ہوا تھا کہ مولوی حشمت علی صاحب بھی اسی جہاز سے جانے والے ہیں تو اس کی کچھ فکر تھی اور میں نے پورے عزم کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ انشاء اللہ اذا مرّوا باللغو مرّوا کراما اور والذین ھم عن اللغو معرضون کی قرآنی تعلیم کی پوری پوری پابندی کرنی ہو، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی کیں کہ وہ ہر اس چیز سے دل و دماغ کی حفاظت فرمائے جو اس سفر کے مناسب نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہو کہ اس نے پوری پوری حفاظت فرمائی، اور ایک ہفتہ کے جہاز کے سفر میں کم از کم اس بارے میں تو مولوی حشمت علی صاحب کو میں نے بالکل بدلا ہوا پایا کہ انھوں نے بھی کوئی چھیڑ چھاڑ کی بات نہیں کی، ان کے متعلق اتنی معقولیت کا بھی یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ آخری دنوں میں جب کہ جہاز کے پہونچنے میں غالباً دو دن باقی تھے مجھے میقات کے متعلق وہ سوال یاد آیا جو پچھلے چند سالوں میں بعض اہل علم نے اٹھایا ہو یعنی یہ کہ آج کل جو دخانی جہاز ہندوستانی حاجیوں کو لے کر جدہ جاتے ہیں وہ یلملم کی پہاڑیوں سے کہا جاتا ہو کہ قریباً پچھتر میل کے فاصلہ سے گزرتے ہیں اور دوربین جیسے کسی آلے سے بھی وہ پہاڑیاں وہاں سے دکھائی نہیں دیتیں۔ ایسی صورت میں ہندوستانیوں کو احرام اسی جگہ سے باندھنا چاہیے یا جدہ کو ان کا میقات سمجھا جائے، یا جدہ سے مکۂ معظمہ جاتے ہوئے پھر جو ایک مقام آتا ہو جہاں سے یلملم کی پہاڑیوں کی پھر محاذاۃ ہوتی ہو اس کو میقات سمجھا جائے ـــ اس بارہ میں ہندستان کے اکثر علمی حلقوں کی رائے کا تو مجھے علم تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے اس سلسلہ میں اپنی کوئی رائے ظاہر کی ہو یا نہیں، چنانچہ میں نے یہ خیال کیا کہ مولوی حشمت علی صاحب سے دریافت کروں چنانچہ ایک روز جبکہ میں اس طرف سے گزر رہا تھا جہاں جہاز میں ان کی قیام گاہ تھی میں ان کے پاس چند منٹ کے لیے بیٹھا۔ کم از کم میرے سابقہ تجربوں اور میری توقع کے خلاف وہ زیادہ معقولیت سے پیش آئے میں نے ان سے ذکر کیا کہ پچھلے دنوں بعض اہل علم نے یہ سوال اٹھایا ہو۔ مجھے اپنے اکابر علما ردیوبند اور ہندستان کے اکثر دوسرے علمی حلقوں کا خیال تو معلوم ہو لیکن یہ معلوم نہیں کہ آپ کے اعلیٰ حضرت نے اس مسئلہ پر کہیں اس سوال کو اٹھا کر بحث کی ہو یا نہیں؟۔ میں نے یہ بھی پوچھا کہ کیا مناسک پر ان کی کوئی مستقل تصنیف ہو، انھوں نے بتلایا کہ ہاں ہو، اور یہ بھی کہا کہ وہ میرے ساتھ اس سفر میں بھی ہو اور یہ کہ ہمارے نزدیک احرام وہیں سے باندھنا چاہیے جہاں سے اب باندھا جاتا ہو۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے صرف یہ دریافت کرنا ہو کہ دخانی جہازوں کے موجودہ راستے کی وجہ سے صورت حال میں جو فرق پڑا ہو اس کو سامنے رکھ کر آپ کے

اعلیٰ حضرت نے کوئی رائے ظاہر کی ہو یا نہیں، ورنہ احرام تو میں خود بھی وہیں سے باندھتا ہوں اور دوسروں کو بھی وہیں سے بتلاتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اعلیٰ حضرت نے اس سوال کو اٹھایا نہیں لیکن مسئلہ وہی ہو — ہاں اسی ملاقات میں مولوی حشمت علی نے یہ بھی کہا کہ میں نے سُنا ہو کہ آپ نے اپنی کسی تقریر میں یہ مسئلہ بیان کیا ہو کہ بغیر "سوق ہدی" کے قارن نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کسی نے آپ سے غلط بیان کردیا، اہلحدیث حضرات کا یہ مسلک ہو ممکن ہے کسی اہلحدیث عالم نے بیان کیا ہو۔ ہم احناف کے نزدیک تو بغیر سوق ہدی کے بھی قِران ہوسکتا ہو اور میں نے خود بھی قِران کا ارادہ کیا ہو۔

اس کے علاوہ کسی اختلافی مسئلہ میں کوئی گفتگو میرے ان کے درمیان مطلق نہیں ہوئی۔ بلکہ چند منٹ کی اس ملاقات کے سوا اس پورے سفر میں کوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی، مجھے معلوم نہیں کہ مکالمہ اور مباحثہ کا کوئی افسانہ بعد کو انھوں نے گڑھا یا بمبئی ہی میں گڑھا گیا۔

ابھی بتلا چکا ہوں کہ بمبئی پہونچنا جمعرات کے دن ہوا تھا، ہر جمعرات کو چونا بھٹی والی مسجد میں تبلیغی جماعت کا اجتماع ہوتا ہو۔ واپس آنے والے حجاج میں کام کرنے کے لیے دہلی، میوات، حیدرآباد، گجرات سے جماعتیں بمبئی آئی ہوئی تھیں۔ اجتماع میں اس عاجز نے تقریر کی اور دین کی خدمت اور خود دین کی تحصیل کے لیے اوقات صرف کرنے کی دعوت دی گئی۔ جمعہ کے دن نماز جمعہ پڑھ کر اسٹیشن آئے، بمبئی کے اکثر احباب رخصت کرنے تشریف لائے۔ سوا تین بجے ٹرین روانہ ہوئی جس نے اگلے روز رات کو پونے آٹھ بجے لکھنؤ پہونچادیا۔

آئبون تائبون عابدون لربنا حامدون

انتخاب :——— (از۔ ادارہ)

سچّی باتیں

شہر کے کسی کباڑیئے کی دوکان پر تو کبھی آپ کا گذر ضرور ہوا ہوگا، ضرورتاً نہ سہی، تفریحاً، یا سرِ رہگذر پڑ جانے کی حیثیت سے۔ نخاس لکھنؤ کا سارا بازار ہی گویا ایک عظیم الشان کباڑ گھر کا نام ہے۔ پھر آپ ایسی جگہوں میں کیا پاتے ہیں؟ ایک عظیم اشیاء کا ڈھیر، ایک انبارِ عظیم، بیکار، بے مصرف، ردی اور ناقابلِ استعمال چیزیں، ٹوٹے ہوئے گلاس، ورکی ہوئی چمنیاں، چٹخی ہوئی چائے دانیاں، ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، دیمک کھائے ہوئے کوچ اور صوفے، قلعی لوٹے، زنگ کھائے ہوئے برتن، پھٹے ہوئے پاجامے، نچے کھچے ہوئے کوٹ، بوسیدہ گھڑیاں، بے مرمت سائیکلیں، پرزہ پرزہ ٹوٹے ہوئے بدرنگ موٹر، غرض ساری دنیا کا ملبا، یا کوڑا کرکٹ جمع، مگر یہ کوڑے کرکٹ کا انبار ہے کیا؟ سب کی سب ایسی چیزیں جو ابھی کل تک آپ کو کس قدر عزیز تھیں! وہی سامان جسے آپ نے کس شوق سے، کس تلاش و محنت سے کتنا روپیہ خرچ کر کر کے جمع کیا تھا! وہی ساز و سامان جس کے پیچھے آپ دیوانہ ہوئے جا رہے تھے! ——— کیا دنیا کی بڑی سی بڑی رغبت بھی کچھ دن کے بعد، کچھ وقت گذر جانے کے بعد، کہنہ، فرسودہ ہو کر آخر بے رغبتی ہی میں تبدیل ہو کر نہیں رہتی؟

حقیقت بھی ہے، اور جذباتی نقطۂ نظر سے افسوس بھی ہے کہ لذیذ غذاؤں کے لقمے کس ذوق و شوق سے آپ منہ تک لے جاتے ہیں، لیکن وہی لذیذ ترین اور مرغوب ترین غذائیں دم بھر میں حلق سے اترنے کے بعد کیسی نامرغوب، بلکہ نفرت انگیز ہو جاتی ہیں؟ ہر جوانی کی قسمت میں بوڑھا ہونا اور ہر شوق کے نصیب میں پژمردہ ہونا ہے ——— جوانی کو قائم اور تازگی کو سدا بہار رکھنے کا نسخہ آسان ترین اور عملی صرف ایک ہے، اپنا دل اپنے پیدا کرنے والے سے ذرا لگا لیجئے، اور دنیا کی جس چیز سے بھی شوق، یا رغبت پیدا کیجئے، انھیں کے واسطہ اور تعلق سے پیدا کیجئے، گرمی میں ٹھنڈے پانی کی لذت پوری طرح محسوس کیجئے، بس صرف یہ سمجھتے ہوئے کہ "اتنی بڑی نعمت کس کی دی ہوئی ہے" بیوی سے ملئے، بچوں کو پیار کیجئے، بس یاد صرف اتنا رکھے رہئے کہ "یہ سب نعمتیں بھی کس کی بخشی ہوئی ہیں" اتنا ہلکا پھلکا نسخہ، جس کی تیاری میں نہ ایک منٹ کی مشقت، نہ ایک پیسہ کا خرچ، کیا اسلئے ناقابلِ التفات اور حقیر رہے گا کہ گھر بیٹھے، آپ سے آپ مل گیا؟ ———

(صدق جدید لکھنؤ)

چندہ		۷۸۶	چندہ	
غیر ممالک سے		ماہنامہ الفرقان لکھنؤ	ہندوستان اور پاکستان سے	
سالانہ	۱۲ شلنگ		سالانہ	صہ ر
ششماہی	۷ شلنگ		ششماہی	سے ر
			فی پرچہ	۸ ر
اس پرچہ کی قیمت	عہ ر		اس پرچہ کی قیمت	عہ ر

جلد ۱۹ ‖ ماہ صفر و ربیع الاول سنہ ۱۳۷۱ھ مطابق دسمبر و جنوری سنہ ۱۹۵۱ء ‖ نمبر ۲ و ۳

یہ سرخ پنسل کا نشان! اس بات کی علامت ہو کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارہ پر ختم ہوگئی ہو، اگر آپ کو آئندہ سال بھی الفرقان سے تعلق رکھنا منظور ہو تو براہ کرم سالانہ چندہ مبلغ (پانچ روپے) روانہ فرما دیجیے، آپ کی آسانی کے لیے منی آرڈر فارم حاضر ہے، ورنہ بصورت دیگر ایک کارڈ کے ذریعہ اپنے ارادہ سے دفتر کو مطلع فرما دیجیے، اگر ۲۰ر جنوری تک آپ کا چندہ یا انکاری کارڈ موصول نہ ہوا تو حسب قاعدہ اگلے مہینے کا پرچہ بذریعہ وی، پی بھیجا جائے گا، اس میں آپ کے چھ آنے زیادہ خرچ ہوں گے، اور اگر خدا نخواستہ آپ نے وصول نہ فرمایا تو الفرقان کو آپ کی ذات سے چھ آنے کا نقصان پہونچے گا۔ اس بات کو ملحوظ رکھیے۔ —— ناظم الفرقان لکھنؤ

باسمہ سبحانہ — حامداً و مسلماً

نگاہِ اوّلیں

[الفرقان کے اس شمارہ میں "تبلیغی تحریک" یا "دعوت اصلاح و تبلیغ" سے متعلق ناچیز مدیر الفرقان اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی کی چند تقریریں شائع ہو رہی ہیں جو گزشتہ مہینہ (صفر دم، نومبر) کے آخری ہفتہ میں ان عام اجتماعات میں کی گئی تھیں جو اسی دینی دعوت کے سلسلہ میں لکھنؤ میں ہوئے تھے، ان تقریروں سے اس دینی دعوت کے مرکزی مقصد اور طریق کار کے متعلق انشاء اللہ بہت کچھ معلوم ہو سکے گا — ناظرین کی مزید بصیرت کے لیے "نگاہ اولیں" کے ان صفحات میں بھی اس دعوت ہی کے متعلق چند تصریحات پیش کرنا مناسب معلوم ہوا۔]

تبلیغی جماعت سے جو حضرات کچھ بھی واقف ہیں یا جنھوں نے اس سے واقف ہونے کی کبھی کوئی کوشش کی ہو وہ اتنا ضرور جانتے ہوں گے کہ موجودہ زمانے کی دوسری عام جماعتوں اور جمعیتوں کی طرح کی وہ کوئی منظم جماعت نہیں ہے، نہ اسکے ارکان ہیں، نہ ممبران، نہ رئیس نہ امیر، نہ صدر نہ سکریٹری، نہ دفتر نہ رجسٹر، نہ فارم نہ عہدنامہ، نہ شرائط نہ قواعد و ضوابط، — بلکہ وہ مسلمانوں میں اصلی ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے کی ایک خاص طریقہ پر دعوت اور کوشش ہے، یعنی اسکی طرف سے مسلمانوں سے یہ نہیں کہا جاتا کہ ہماری کوئی جماعت ہے تم اسمیں آجاؤ، اسکے رکن یا ممبر یا معاون یا ہمدرد بن جاؤ، بلکہ صرف یہ کہا جاتا ہے کہ اپنی اور اپنے دینی بھائیوں کی ایمانی اور دینی حالت درست کرنے کی فکر اور کوشش کرو، اور اسکا ایک مناسب زمانہ طریقہ جس کا ہم نے تجربہ کیا ہے اسکو جان لو اور سیکھ لو، اور اگر تم کو بھی وہ صحیح معلوم ہو تو اپنے اللہ کو راضی کرنے کے لیے اور آخرت کی نہ ختم ہونیوالی زندگی میں دائمی عیش و راحت حاصل کرنے کے لیے تم بھی اسی طریقہ پر کوشش میں لگ جاؤ۔

یہ بات اگرچہ ہے تو صاف اور سیدھی لیکن اس زمانہ میں اس طرح کے اجتماعی کام چونکہ منظم جماعتیں ہی کرتی ہیں اور "باقاعدہ پارٹیاں" ہی ایسی وسیع تحریکوں کو چلاتی ہیں، اسلیے بہت سے لوگوں کو تبلیغی جماعت کی اس خاص نوعیت کو سمجھنا بڑا مشکل ہوتا ہے — ایک دفعہ حکومت کے ایک متجسس (سی، آئی، ڈی انسپکٹر) تبلیغی جماعت کے متعلق ایک سوالنامہ لیکر میرے پاس آئے، وہ سوالات کرتے گئے میں جوابات دیتا گیا، لیکن جماعت کی اس خاص پوزیشن کو میں انھیں بڑی مشکل سے سمجھا سکا، وہ بار بار کہتے تھے کہ یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنی بڑی اور اتنی وسیع تحریک کسی منظم پارٹی کے بغیر چل رہی ہے — بہرحال ایسے لوگوں کے لیے اس حقیقت کا سمجھنا خواہ کیسا ہی مشکل ہو، لیکن واقعہ بالکل یہی ہے۔

اس دور میں اس خاص طریقہ سے اس کام کی ابتدا حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی، ہم لوگ ان کی چیزوں کو آسمانی وحی یا نص شارع تو نہیں سمجھتے (بلکہ ایسا خیال کرنے کو بھی گمراہی سمجھتے ہیں)، لیکن فکر و تجربہ اور دینی مطالعہ سے اس حقیقت پر ہمارا اطمینان روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے کہ اس کام کے لیے جو اصول اور طریقہ اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق سے حضرت

مولاناؒ نے اختیار فرمایا تھا وہ خاص کر اس زمانہ میں اصولی طور پر صحیح ترین طریقہ ہو۔

اس تحریک کا کوئی وسیع لٹریچر تو بیشک نہیں ہے لیکن پھر بھی جتنا کچھ اسکے متعلق ابتک لکھا جاچکا ہے وہ اسکو اور اسکے اصول اور طریقہ کو سمجھنے کے لیے — تحریر کی حد تک — ناکافی بھی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم اور جامع چیز مولانا سید ابوالحسن علی کی مرتب کردہ حضرت مولانا مرحوم کی سوانح حیات ہے جو — "مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت" — کے نام سے اب ۷۔۸ سال پہلے شائع ہوچکی ہے۔ اس تحریک کو سمجھنے کے لیے اسکو ضرور پڑھنا چاہیے[1] اور خاص کر جو حضرات اس دینی دعوت سے عملاً وابستہ ہیں انھیں تو اس کو (اور مولانا مرحوم کے ملفوظات کو بھی) بار بار پڑھتے رہنا چاہیے۔

مولانا مرحوم امت کی جن بیماریوں کو مہلک سمجھتے تھے اور اپنی اس دینی تحریک کے ذریعہ جن کا براہ راست علاج کرنا چاہتے تھے ان میں سے ایک اُمت کے مختلف طبقوں اور حلقوں کا وہ بعد و اختلاف تھا جو خواہ مخواہ غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی وجہ سے اور دور دور رہنے سے پیدا ہوا اور بڑھا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی مولانا مرحوم کی سوانح حیات میں لکھتے ہیں :-

مولانا کی دعوت کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ امت کے مختلف طبقوں اور حلقوں میں جو بعد و بیگانگی اور غلط فہمیوں کی بنا پر جو وحشت و تنفر پیدا ہوگیا ہے وہ دور ہو ان میں پھر ربط و الفت پیدا ہو اور وہ اسلام کے لیے تعاون اور اشتراک عمل کریں، ایک دوسرے کی تعظیم اور وقار کرنا جانیں اور ہر ایک کو دوسرے کے محاسن سے فائدہ اٹھانے کی توفیق ہو۔ (صہ ۱۲۳)

اسی سلسلۂ کلام میں تین صفحہ کے بعد پھر لکھتے ہیں :-

خیالات کے تھوڑے تھوڑے اختلافات اور عرصہ سے ایک دوسرے سے دور رہنے سے اہلسنت کی مختلف جماعتوں میں ایک دوسرے سے وحشت پیدا ہوگئی تھی، ہر جماعت اپنے دین کی حفاظت اسی میں سمجھتی تھی کہ دوسرے کے سایہ سے بھاگے، ایک کو دوسرے کے محاسن کی بالکل خبر نہیں تھی، ایک دوسرے سے نفع اٹھانے کے راستے عرصہ سے بند ہوچکے تھے۔

ان اختلافات کو دور کرنے کا طریقہ ...... مولانا کے نزدیک یہ تھا کہ اخلاق و اکرام سے ان کے

---

[1] اس کے علاوہ چھوٹے رسائل میں "ایک اہم دینی دعوت" اور "دعوت اصلاح و تبلیغ" اور "تبلیغی تحریک کا مقصد اور طریق کار" بھی اس تحریک کے مقصد، اصول اور طریق عمل کو سمجھنے کے لیے بڑی حد تک کافی ہیں۔ خاصکر آخری مختصر رسالہ تو ہر کارکن کو پڑھنا چاہیے اور ہر جماعت کے ساتھ رہنا چاہیے۔ یہ حال ہی میں لکھنؤ کی جماعت کی طرف سے شائع ہوا ہے ۱۲۔

ذہن کی گرہیں کھولی جائیں اور دل کی سلوٹیں اور شکن دور کیے جائیں، تعلق پیدا کیا جائے، اور مانوس کیا جائے ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے اور برتنے سے غلط فہمیاں خود بخود رفع ہو جائیں گی۔ (صفحہ ۱۲۶ و ۱۲۷)

مولانا مرحوم کی علالت کے آخری ایام میں مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت کے ایک بڑے ذی اثر اور معتدر بزرگ عیادت کیلیے تشریف لائے، یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی مختلف سیاسی پارٹیوں میں سخت جوتم پیزار ہو رہا تھا۔ اُسدن مولانا بالکل بولنے کے قابل نہ تھے، ضعف کا یہ عالم تھا کہ خدام لبوں پر کان لگا لگا کے بات سنتے تھے، اسکے باوجود مولانا نے ان صاحب سے دیر تک گفتگو فرمائی اور اسی گفتگو میں فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مدد حاصل ہونے کے لیے" اعزۃ علی الکافرین" کے ساتھ "اذلۃ علی المومنین" کی صفت کا ہونا بھی ضروری ہے، مسلمانوں میں جب تک دوسرے مسلمانوں کیلئے تذلل (یعنی ان کے مقابلہ میں نیچا ہو جانے اور ان کے سامنے ذلیل ہو جانے) کی خصلت پیدا نہ ہوگی، اللہ کی رحمت اور مدد ہرگز نہیں آئے گی۔)

آخری علالت ہی کے زمانہ میں ایکدفعہ دہلی میں مسلمانوں کی ایک مشہور جماعت کا اجلاس ہو رہا تھا، راقم السطور کو حضرت مولانا نے بلا کر فرمایا، اس اجلاس میں اس جماعت کے فلاں فلاں بزرگ تشریف لائے ہونگے تم اُنسے جا کر ملو اور مناسب طریقہ اور موقع سے میری بات بھی انکو پہونچاؤ۔ — میں نے عرض کیا ایک مدت سے ان حضرات سے میرے تعلقات اچھے نہیں رہے ہیں اسلیے میرا انکی خدمت میں جانا مناسب نہ ہوگا اور نہ میرا بات کرنا مفید ہوگا — فرمایا میں تمھیں اسی لیے تو بھیج رہا ہوں، انکے پاس جا کے اپنے کو ذلیل اور پامال کرو، اسی سے تعلقات درست ہوں گے، اور اللہ کی رحمت ان ہی کے لیے ہے جو اللہ کے واسطے اور صرف دین کے رشتہ سے دوسرے ایمان والوں کے سامنے خود کو ذلیل کرلیں۔

بہرحال مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور حلقوں کے اُن اختلافات کو جو محض غلط فہمیوں کی پیداوار ہیں اور خواہ مخواہ کی بدگمانیوں کی وجہ سے بڑھ گئے ہیں، ختم کرانا اور انھیں باہم قریب اور ایک دوسرے کے محاسن کا قدر شناس بنا کر اصل دین کیلئے تعاون اشتراک کی اور ایمانی اخوت اور الفت کی فضا پیدا کرنا حضرت مولانا مرحوم کی اس دعوت کے خاص مقاصد میں سے تھا۔ اس دینی دعوت سے تعلق رکھنے والے ہم لوگوں کا فرض ہے کہ اس مقصد سے اور خود اپنے طرز عمل کو اس اصول کے مطابق بنانے کی فکر سے کبھی غافل نہ ہوں اور اس بارہ میں ہمارے عمل اور طرز عمل میں جتنی کمی اور کوتاہی ہو اس کو کمی اور کوتاہی سمجھیں اور اس کی اصلاح کی فکر کریں۔

تحزب اور دھڑے بندی کے اس زمانہ میں حضرت مولانا مرحوم کے دل میں امت کی اس بیماری کا درد اور اسکی غیر معمولی اہمیت کا احساس پیدا کرنا اور اس چیز کو اپنی دعوت کے مقاصد میں شامل کرلینے پر انھیں آمادہ کر دینا اللہ تعالیٰ کا خاص انعام و احسان تھا، اگر ہم اس سے تغافل برتیں گے تو اس نعمت کی یہ سخت ناشکری بھی ہوگی۔

معارف الاحادیث

(از محمد منظور نعمانی)

(اب سے کئی سال پہلے اس عنوان کے تحت احادیث نبوی کی تشریح کا ایک سلسلہ الفرقان میں شروع ہوا تھا جو کئی سال تک جاری رہا ——— پھر اس عاجز کے وقت پر ایسے مشاغل کے غالب آجانے کی وجہ سے جو کسی اطمینان طلب کام کی مہلت نہیں دیتے، ایک مدت سے وہ سلسلہ منقطع ہو گیا ——— اس دفعہ کہ معظمہ میں ایک محترم بزرگ نے میرے اس طرز عمل پر کہ ایک عرصہ سے میں نے علم دین کی خدمت سے اپنے کو گویا فارغ اور سبکدوش کر لیا ہو، بڑا سخت مؤاخذہ کیا اور اس وقت تک میرا تعاقب نہ چھوڑا جب تک کہ ان سے اس عاجز نے وعدہ نہ کر لیا ——— اور وہیں عہد کر لیا کہ جس طرح بھی بن پڑے گا "معارف الاحادیث" کے چھوڑے ہوئے سلسلہ کو انشاء اللہ پھر شروع کروں گا ——— چنانچہ بنام خدا آج اس کو پھر شروع کر رہا ہوں۔

ایمان اور اس کے مختلف شعبوں سے متعلق پچاس حدیثوں کی تشریح اس سے پہلے لکھی جا چکی ہو، آج ان حدیثوں کی شرح کا سلسلہ شروع کرنا ہو جن میں "ما بعد الموت" یعنی عالم برزخ (قبر) قیامت، حشر، (جنت دوزخ) کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ امور بیان فرمائے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحی سے آپ کو معلوم ہوئے تھے۔ واللہ الموفق ———)

عالم برزخ

قبر کا سوال وجواب اور عذاب وثواب :-

اس سلسلہ کی حدیثیں پڑھنے اور ان کے مطالب سمجھنے سے پہلے چند اصولی باتیں ذہن میں حاضر کر لینی چاہئیں، ان باتوں کے مستحضر کر لینے کے بعد عالم برزخ کے سلسلہ کی حدیثوں کے مضامین کے متعلق وہ وساوس اور شبہات انشاءاللہ پیدا نہ ہوں گے جو حقیقت ناشناسی کی وجہ سے بہت سے دلوں میں اس زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) انبیاء علیہم السلام کا خاص کام (جس کے لیے وہ مبعوث ہوتے ہیں) ہمیں ان باتوں کا بتلانا ہو جن کے ہم

ضرورت مند تو ہیں لیکن اپنے عقل و حواس سے بطور خود ہم ان کو نہیں جان سکتے یعنی وہ ہماری عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔

(۲) انبیاء علیہم السلام کے لیے یقینی علم کا ایک خاص ذریعہ جو دوسرے عام انسانوں کے پاس نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی وحی ہے، ان کو اسی ذریعہ سے ان چیزوں کا علم ہوتا ہے جن کو ہم اپنی آنکھوں، کانوں سے، اور اپنی عقل و فہم سے دریافت نہیں کر سکتے، جس طرح دوربین رکھنے والا آدمی بہت دور کی وہ چیزیں دیکھ لیتا ہے جن کو عام آدمی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے۔

(۳) کسی نبی کو نبی مان لینے اور اس پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہی ہوتا ہے کہ ہم نے اس بات کو تسلیم کر لیا اور پورے یقین کے ساتھ اس کو مان لیا اور قبول کر لیا کہ وہ ایسی جو باتیں بتلاتا ہے جن کو ہم خود نہیں جانتے اور نہیں دیکھتے وہ اللہ کی وحی سے ان کا علم حاصل کر کے ہمیں بتلاتا ہے، اور وہ سب حرف بحرف صحیح ہے، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

(۴) انبیاء علیہم السلام کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے جو عقلاً ناممکن اور محال ہو، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری عقل اور ہمارے حواس بطور خود اس کو سمجھ لینے سے عاجز اور قاصر ہوں۔ بلکہ ایسا ہونا ضروری ہے اگر انبیاء علیہم السلام صرف وہی باتیں بتلائیں جن کو ہم خود ہی غور و فکر سے معلوم کر سکتے ہوں تو پھر ان کی ضرورت ہی کیا ہے۔

(۵) انبیاء علیہم السلام نے عالم برزخ (عالم قبر) اور عالم آخرت کے متعلق جو کچھ بتلایا ہے اس میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو عقلاً ناممکن اور محال ہو، ہاں ایسی چیزیں ضرور ہیں جن کو ہم اپنے غور و فکر سے نہیں جان سکتے اور اس دنیا میں ان چیزوں کے نمونے نہ ہونے کی وجہ سے ہم ان کو اس طرح سمجھ بھی نہیں سکتے جس طرح اس دنیا کی دیکھی بھالی چیزوں کو سمجھ لیتے ہیں۔

(۶) علم کے جو عام فطری ذریعے اور وسیلے ہمیں دیئے گئے ہیں، مثلاً آنکھ، ناک، کان، عقل و فہم، ظاہر ہے کہ ان کی طاقت اور ان کا دائرۂ عمل بہت محدود ہے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ جدید آلات کی خارجی مدد سے ان کے ذریعہ بہت سی وہ چیزیں ہمارے علم میں آ جاتی ہیں جن کا پہلے کبھی تصور بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ مثلاً پانی میں یا خون میں جو جراثیم پائے جاتے ہیں اب خوردبین کی مدد سے آنکھ ان کو دیکھ لیتی ہے، ریڈیو کی مدد سے کان ہزاروں میل دور تک کی آواز سن لیتے ہیں۔ اسی طرح کتابی معلومات کی مدد سے پڑھے لکھے انسان کی عقل اس سے زیادہ سوچ لیتی ہے جتنا کہ آنکھ کان کے ذریعہ حاصل شدہ معلومات کی مدد سے سوچ سکتی تھی۔ اس تجربے سے معلوم ہوا کہ کسی حقیقت کا صرف اس بنیاد پر انکار کر دینا کہ آج ہم اس کو نہیں دیکھتے، نہیں سنتے، یا ہماری عقل اس کو نہیں سمجھتی، بڑی بے عقلی کی بات ہے وما اوتیتم من العلم الا قلیلا ۔

(۷) انسان دو چیزوں سے مرکب ہے، ایک جسم جو ظاہر ہے اور نظر آتا ہے، دوسری رُوح جو اگرچہ آنکھوں سے نظر نہیں آتی لیکن اس کے ہونے کا ہم سب کو یقین ہے۔ پھر انسان کے ان دونوں اجزا کا باہمی تعلق اس دنیا میں اس طرح ہے کہ تکلیف و مصیبت یا راحت و لذت کی جو کیفیت یہاں آتی ہے وہ براہ راست جسم پر آتی ہے اور روح اس سے تبعاً متأثر ہوتی ہے۔ مثلاً انسان کو چوٹ لگتی ہے، وہ زخمی ہوتا ہے، یا مثلاً وہ کہیں آگ سے جل جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ چوٹ اور آگ کا تعلق براہ راست اس کے جسم سے ہوتا ہے لیکن اس کے اثر سے روح کو بھی دُکھ ہوتا ہے۔ اسی طرح کھانے پینے سے جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ بھی براہ راست جسم ہی کو حاصل ہوتی ہے لیکن روح بھی اس سے لذت حاصل کرتی ہے۔

الغرض اس دنیا میں انسان کے وجود اور اس کے حالات میں گویا جسم اصل ہے اور روح اس کے تابع ہے۔ لیکن قرآن و حدیث میں عالم برزخ کے متعلق جو کچھ بتلایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔ یعنی اس عالم میں جس پر جو اچھی بری واردات ہوگی وہ براہ راست اس کی روح پر ہوگی اور جسم اس سے تبعاً متأثر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے (شاید اسی لیے کہ اس حقیقت کا سمجھنا ہمارے لیے آسان ہو جائے) اس دنیا میں بھی اس کا ایک نمونہ پیدا کر دیا ہے، اور وہ عالم رویا یعنی خواب ہے۔ عقل و ہوش رکھنے والا ہر انسان اپنی زندگی میں بار بار ایسے خواب دیکھتا ہے جن میں اس کو بڑی لذت ملتی ہے یا بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن خواب میں یہ لذت یا تکلیف براہ راست دراصل روح کے لیے ہوتی ہے اور جسم تبعاً اس سے متأثر ہوتا ہے۔ یعنی خواب میں آدمی مثلاً جب یہ دیکھتا ہے کہ وہ کوئی لذیذ کھانا کھا رہا ہے تو صرف یہی نہیں دیکھتا کہ میری روح ہی کھا رہی ہے یا خیالی قوت ہی کھا رہی ہے، بلکہ اس وقت وہ یہی دیکھتا ہے کہ بیداری کی طرح وہ اپنے اس جسم والے منھ سے کھا رہا ہے جس سے روزانہ کھایا کرتا ہے۔ اسی طرح خواب میں اگر وہ یہ دیکھتا ہے کہ کسی نے اس کو مارا تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کی روح کو مارا گیا، بلکہ وہ اس وقت یہی دیکھتا ہے کہ مار اس کے جسم پر پڑی اور اس کے جسم پر اس وقت ویسی ہی چوٹ لگی جیسی بیداری میں مار پڑنے سے لگتی ہے۔ حالانکہ واقعہ میں جو کچھ گزرتا ہے وہ خواب میں دراصل روح پر گزرتا ہے اور جسم اس سے تبعاً متأثر ہوتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی جسم کا یہ تاثر اتنا محسوس ہوجاتا ہے کہ آدمی بیدار ہونے کے بعد جسم پر اس کے نشانات اور اثرات بھی پاتا ہے۔ الغرض نیند کی حالت میں اچھے یا بُرے خواب دیکھنے والے شخص پر جو کچھ گزرتا ہے اس کی نوعیت یہی ہے کہ وہ براہ راست اور اصلی طور پر روح پر گزرتا ہے اور جسم پر اس کا اثر تبعاً پڑتا ہے۔ اسی لیے خواب دیکھنے والے کے قریب والا آدمی بھی اس کے جسم پر کوئی واردات گزرتے ہوئے نہیں دیکھتا، کیوں کہ ہم اس دنیا میں کسی انسان کے ان ہی حالات کو دیکھ سکتے ہیں جن کا تعلق براہ راست اُس کے جسم سے ہو۔ پس عالم برزخ میں (یعنی مرنے کے بعد سے قیامت تک کے دور میں) اچھے برے انسانوں پر جو کچھ گزرنے والا ہے (جس کی بعض تفصیلات مندرجہ ذیل حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں)، اس کی نوعیت بھی یہی ہے

کہ وہ اصلی طور پر اور براہ راست روح پر گزرے گا اور جسم تبعاً اس میں شریک ہوگا ۔ اور عالم رویا (خواب) کے تجربات کی روشنی میں اس کو سمجھ لینا کسی سمجھنے والے آدمی کے لیے مشکل نہیں ہو ــــــ امید ہو کہ اس دنیا اور عالم برزخ کے اس فرق کو جان لینے کے بعد وہ عامیانہ اور جاہلانہ شبہے اور وسوسے پیدا نہوں گے جو اس سلسلہ کی حدیثوں کے متعلق بعض ضعیف الایمان اور کم عقل لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا کرتے ہیں ۔

---

(۵۱) عن البراء بن عازب عن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال .... یاتیه ملکان فیجلسانه فیقولان له من ربك ؟ فیقول ربی الله فیقولان له ما دینك ؟ فیقول دینی الاسلام، فیقولان له ما هذا الرجل الذی بعث فیکم ؟ فیقول هو رسول الله فیقولان له وما یدریك ؟ فیقول قرأت کتاب الله فآمنت به وصدقت ، فذالك قوله " یثبت الله الذین آمنوا بالقول الثابت الآیه" قال فینادی مناد من السماء ان صدق عبدی فافرشوه من الجنة والبسوه من الجنة وافتحوا له بابا الی الجنة فیفتح له ، قال فیاتیه من روحها وطیبها ویفتح له فیها مد بصره ــــــ واما الکافر فذکر موته قال ویعاد روحه فی جسده ویاتیه ملکان فیجلسانه فیقولان من ربك ؟ فیقول هاه هاه لا ادری ، فیقولان له ما دینك ؟ فیقول هاه هاه لا ادری، فیقولان ما هذا الرجل الذی بعث فیکم ؟ فیقول هاه هاه لا ادری ، فینادی مناد من السماء ان کذب فافرشوه من النار والبسوه من النار وافتحوا له بابا الی النار قال فیاتیه من حرها وسمومها قال ویضیق علیه قبره حتی تختلف فیه اضلاعه ثم یقیض له اعمی اصم معه مرزبة من حدید لو ضرب بها جبل لصار ترابا فیضربه بها ضربة فیصیح صیحة یسمعها ما بین المشرق والمغرب الا الثقلین فیصیر ترابا ثم یعاد فیه الروح (رواہ احمد و ابوداؤد)

(ترجمہ) حضرت براء بن عازب صحابی سے مروی ہو، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے (ایک سلسلۂ کلام میں مردہ کے سوال و جواب اور عالم برزخ یعنی قبر کے ثواب و عذاب کا تذکرہ کرتے ہوئے) فرمایا کہ (اللہ کا مومن بندہ اس دنیا سے منتقل ہو کر جب عالم برزخ میں پہونچتا ہو یعنی قبر میں دفن کر دیا جاتا ہو تو) اس کے پاس اللہ کے دو فرشتے آتے ہیں وہ اس کو بٹھاتے ہیں، پھر اس سے پوچھتے ہیں کہ تیرا رب کون ہو؟ وہ کہتا ہو کہ میرا رب اللہ ہو، پھر پوچھتے ہیں تیرا دین کیا ہو ؟ وہ کہتا ہو کہ میرا دین اسلام ہو، پھر پوچھتے ہیں کہ یہ آدمی جو تمھارے اندر (نبی کی حیثیت سے) کھڑا کیا گیا تھا (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے بارہ میں تمھارا کیا خیال ہو ؟ وہ کہتا ہو وہ اللہ کے سچے رسول ہیں، وہ فرشتے کہتے ہیں کہ تمھیں یہ بات کس نے بتلائی ؟ (یعنی

تمہیں ان کے رسول ہونے کا علم کس ذریعہ سے ہوا؟) وہ کہتا ہو کہ میں نے اللہ کی کتاب پڑھی (اس نے مجھے بتلایا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں) تو میں ایمان لایا اور میں نے ان کی تصدیق کی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ) مومن بندہ کا یہی جواب ہو جس کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو کہ "یثبت اللہ الذین آمنوا بالقول الثابت فی الحیوٰۃ الدنیا وفی الاٰخرۃ" اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو سچی پکی بات (یعنی صحیح عقیدہ اور صحیح جواب) کی برکت سے ثابت رکھے گا دنیا میں اور آخرت میں (یعنی وہ گمراہی سے اور اس کے نتیجہ میں آنے والے عذاب سے محفوظ رکھے جائیں گے)۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (مومن بندہ فرشتوں کے مذکورۂ بالا سوالات کے جب اس طرح ٹھیک ٹھیک جوابات دے دیتا ہو) تو ایک ندا دینے والا آسمان سے ندا دیتا ہو (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسمان سے اعلان کرایا جاتا ہو) کہ میرے بندہ نے ٹھیک بات کہی اور صحیح صحیح جوابات دیئے لہذا اس کے لیے جنت کا فرش کرو اور جنت کا اس کو لباس پہناؤ اور جنت کی طرف اس کے لیے ایک دروازہ کھول دو، چناں چہ وہ دروازہ کھول دیا جاتا ہو اور اس سے جنت کی خوشگوار ہوائیں اور خوشبوئیں آتی ہیں اور جنت میں اس کے لیے منتہائے نظر تک کشادگی کر دی جاتی ہو۔ (یعنی پردے اس طرح اٹھا دیے جاتے ہیں کہ جہاں تک اس کی نگاہ جائے وہ جنت کی بہاروں اور اس کے نظاروں سے لذت اور فرحت حاصل کرتا رہے)۔ ———— (یہ حال تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرنے والے سچے اہل ایمان کا بیان فرمایا) اس کے بعد ایمان نہ لانے والے (کافر) کی موت کا ذکر آپ نے کیا اور فرمایا کہ (مرنے کے بعد) اس کی روح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہو اور اس کے پاس بھی دو فرشتے آتے ہیں، وہ اس کو بٹھاتے ہیں اور اس سے بھی پوچھتے ہیں کہ تیرا رب کون ہو؟ وہ (خدا ناشناس) کہتا ہو "ہائے ہائے میں کچھ نہیں جانتا"۔ پھر فرشتے اس سے پوچھتے ہیں کہ دین تیرا کیا تھا؟ وہ کہتا ہو کہ ہائے ہائے میں کچھ نہیں جانتا" پھر فرشتے اس سے کہتے ہیں کہ یہ آدمی جو تمھارے اندر (بحیثیت نبی کے) مبعوث ہوا تھا تمھارا اس کے بارے میں کیا خیال تھا؟ وہ پھر بھی یہی کہتا ہو ہائے ہائے میں کچھ نہیں جانتا (اس سوال و جواب کے بعد) آسمان سے ایک ندا دینے والا اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکارتا ہو کہ اس نے جھوٹ کہا (یعنی اس نے فرشتوں کے سوال کے جواب میں اپنا بالکل ان جان اور بے جرم ہونا جو ظاہر کیا یہ اس نے جھوٹ بولا، کیوں کہ واقعے میں وہ اللہ کی توحید کا، اس کے دین اسلام کا اور اس کے رسول برحق کا منکر تھا)۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے منادی ندا کریگا کہ اس کے لیے دوزخ کا فرش کرو، اور دوزخ کا اس کو لباس پہناؤ اور اس کے لیے دوزخ کا ایک دروازہ کھول دو (چنانچہ یہ سب کچھ کر دیا جائے گا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ (دوزخ کے اس دروازے سے) اس کو برابر دوزخ کی گرمی اور دوزخ کی لپٹیں اور جلانے جھلسانے والی ہوائیں اس کے پاس آتی رہیں گی۔

.... اور اس کی قبر اس پر نہایت تنگ کر دی جائے گی جس کی وجہ سے (اتنا دباؤ پڑے گا کہ) اس کے سینہ کی پسلیاں ادھر سے اُدھر ہو جائیں گی، پھر اس کو عذاب دینے کے لیے ایک ایسا فرشتہ اس پر مسلط کیا جائے گا جو نہ کچھ دیکھے گا نہ سنے گا۔ اس کے پاس لوہے کی ایسی مگری ہوگی کہ اگر اس کی ضرب پہاڑ پر لگائی جائے تو وہ بھی خاک ہو جائے وہ فرشتہ اُس مگری سے اس پر ایک ضرب لگائے گا جس سے وہ اس طرح چیخے گا جس کو ـــــ جن وانس کے علاوہ ـــــ وہ سب چیزیں سنیں گی جو مشرق اور مغرب کے درمیان ہیں۔ اس ضرب سے یہ خاک ہو جائیگا اس کے بعد اس میں پھر روح ڈالی جائے گی"۔

(۵۲) عن انس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ انّ العبد اذا وضع فی قبره وتولّی عنه اصحابه انّه لیسمع قرع نعالهم اتاه ملکان فیقعدانه فیقولان ما کنت تقول فی هٰذا الرجل لمحمد فاما المومن فیقول اشهد انه عبد الله ورسوله فیقال له انظر الی مقعدك من النار قد ابدلك الله به مقعداً من الجنته فیراهما جمیعاً واما المنافق والکافر فیقال له ما کنت تقول فی هذا الرجل فیقول لا ادری کنت اقول ما یقول الناس فیقال له ما دریت ولا تلیت ویضرب بمطارق من حدید ضربةً فیصیح صیحةً یسمعها من یلیه غیر الثقلین۔

(متفق علیه ولفظه للبخاری)

(ترجمہ) حضرت انسؓ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (مرنے کے بعد) بندہ جب اپنی قبر میں رکھ دیا جاتا ہو اور اس کے ساتھی (یعنی اس کے جنازے کے ساتھ آنے والے) واپس چل دیتے ہیں (اور ابھی وہ اتنے قریب ہوتے ہیں کہ) ان کی جوتیوں کی چاپ وہ سن رہا ہوتا ہو تو اسی وقت اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں وہ اس کو بٹھاتے ہیں، پھر اس سے پوچھتے ہیں کہ تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے تھے؛ ـــــ ان کا یہ سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہوتا ہو ـــــ پس جو سچا مومن ہوتا ہو وہ کہتا ہو کہ (میں گواہی دیتا رہا ہوں اور اب بھی) میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول برحق ہیں۔ (یہ جواب سُن کے) فرشتے اس سے کہتے ہیں کہ (ایمان نہ لانے کی صورت میں) دوزخ میں جو تمھاری جگہ ہونے والی تھی ذرا اس کو دیکھ لو، اب اللہ نے بجائے اس کے تمھارے لیے جنت میں ایک جگہ عطا فرمائی ہو (اور وہ یہ ہو اس کو بھی دیکھ لو، یعنی دوزخ اور جنت کے دونوں مقام اس کے سامنے کر دیے جائینگے) چنانچہ وہ دونوں کو ایک ساتھ دیکھے گا ـــ اور جو منافق اور کافر ہوتا ہو تو اسی طرح (مرنے کے بعد) اس سے بھی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق) پوچھا جاتا ہو کہ اس شخص کے بارے میں تم کیا کہتے تھے؟ (اور اس کو کیا اور کیسا سمجھتے تھے؟) پس وہ منافق اور کافر کہتا ہو کہ میں ان کے بارے میں خود تو کچھ جانتا نہیں، دوسرے

لوگ جو کہا کرتے تھے وہی میں بھی کہتا تھا (اس کے اس جواب پر) اس کو کہا جائے گا کہ تو نے نہ تو خود جانا اور نہ (جاننے والے) ایمان لانے والوں کی تو نے پیروی کی اور لوہے کے گرزوں سے اس کو مارا جائے گا جس سے وہ اس طرح چیخے گا کہ ــــ جن وانس کے علاوہ ــــ اس کے آس پاس کی ہر چیز اس کا چیخنا سنے گی۔"

(ف) پہلی حدیث سے معلوم ہوا تھا کہ مرنے والے سے فرشتے تین سوال کرتے ہیں، اور اس دوسری حدیث میں صرف ایک ہی سوال کا ذکر کیا گیا ہے، اصل بات یہ ہے کہ یہ سوال چونکہ باقی دونوں سوالوں پر بھی حاوی ہے اور اسکے جواب سے ان دونوں سوالوں کا جواب بھی معلوم ہو جاتا ہے اسلیے بعض حدیثوں میں صرف اسی ایک سوال کا ذکر کر دیا جاتا ہے، قرآن وحدیث کا طریق بیان یہی ہے کہ ایک واقعہ کو کبھی تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے اور کبھی صرف اس کے بعض اجزا ہی بیان کر دیے جاتے ہیں ــــــــــ معارف الاحادیث کے اسی سلسلہ میں یہ بات پہلے بھی ذکر کی گئی ہے اور اب پھر اس کو یاد دلایا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں تصنیفی مقالات نہیں ہیں بلکہ عموماً مجلسی ارشادات ہیں اور کسی معلم اور مربی کے مجلسی ارشادات میں ایسا ہونا کہ کبھی ایک بات کو پوری تفصیل سے بیان کیا جائے اور کبھی اس کے صرف بعض اجزاء کا ذکر کر دیا جائے بالکل صحیح اور فطری بات ہے۔

حضرت انس والی اس دوسری حدیث میں اس سوال جواب کے سلسلہ میں قبر کا لفظ بھی آیا ہے اور اسی طرح بعض اور حدیثوں میں بھی قبر کا ذکر ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ سوال وجواب صرف ان ہی مردوں سے مخصوص ہے جو قبروں میں دفن ہوتے ہیں۔ دراصل قبر کا ذکر ان حدیثوں میں صرف اس لیے کر دیا گیا ہے کہ وہاں مردوں کو قبروں ہی میں دفن کرنے کا عام رواج تھا اور لوگ صرف اسی طریقہ کو جانتے تھے، ورنہ اللہ کے فرشتوں کی طرف سے یہ سوال وجواب ہر مرنے والے سے ہوتا ہے خواہ اس کا جسم قبر میں دفن کیا جائے خواہ دریا میں بہایا جائے، خواہ آگ میں جلایا جائے خواہ گوشت خور جانوروں کے پیٹ میں چلا جائے ــــ اور جیسا کہ اوپر بتلایا جا چکا ہے یہ سب کچھ براہ راست اور اصلی طور سے روح کے ساتھ ہوتا ہے اور جسم خواہ کہیں ہو اور کسی حال میں ہو وہ تبعاً اس سے متاثر ہوتا ہے اور خواب کی مثال اس کے سمجھنے کے لیے کافی ہے ــــ اور خواب ہی کی مثال سے اس شبہ کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مردہ دو چار دن تک ہمارے سامنے پڑا رہتا ہے اور اس سوال وجواب کی آواز اس کی لاش سے کوئی نہیں سنتا، اور نہ اس پر عذاب یا ثواب کا کوئی اثر معلوم ہوتا ہے ــــ پس یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ خواب میں ایک آدمی پر سب کچھ گزر جاتا ہے، وہ بات چیت کرتا ہے، کھاتا ہے پیتا ہے، لیکن اس کے برابر والوں کو کچھ بھی نظر نہیں آتا،

اسی قسم کے عامیانہ اور جاہلانہ شبہوں میں سے قبر کے اس سوال وجواب پر ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ قبر میں جانے کے لیے جب کوئی راستہ اور کوئی چھوٹے سے چھوٹا روزن بھی نہیں ہوتا تو فرشتے اس میں جاتے کس طرح

ہیں؛ ــــ یہ شبہ دراصل ان حقیقت ناشناسوں کو ہوتا ہے جو فرشتوں کو شاید اپنی طرح گوشت پوست سے بنی ہوئی مادّی مخلوق سمجھتے ہیں ــــ بہرحال فرشتوں کے کہیں پہونچنے کے لیے دروازہ کی یا کھڑکی کی ضرورت نہیں ہماری نگاہیں یا آفتاب کی شعاعیں جس طرح شیشوں میں سے نکل جاتی ہیں، اسی طرح فرشتے اپنے وجود کی لطافت اور اللہ کی دی ہوئی قدرت سے پتھروں میں سے بھی پار ہو جاتے ہیں۔ سبحانہ تعالیٰ شانہ۔

---

(۵۲) عن عبد اللہ بن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان احدکم اذا مات عرض علیہ مقعدہ بالغداۃ والعشی ان کان من اھل الجنۃ فمن اھل الجنۃ وان کان من اھل النار فمن اھل النار فیقال ھذا مقعدک حتی یبعثک اللہ الیہ یوم القیٰمۃ۔　　(متفق علیہ)

(ترجمہ) حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ تم میں سے کوئی جب مر جاتا ہے تو ہر صبح و شام اس کے سامنے اس کا ٹھکانا پیش کیا جاتا ہے، اگر وہ جنتیوں میں سے ہے تو جنتیوں کے مقام میں سے (اس کا جو مقام ہونے والا ہوتا ہے وہ ہر صبح و شام اس کے سامنے کیا جاتا ہے اور اس کو دکھلایا جاتا ہے) اور اگر وہ مرنے والا دوزخیوں میں سے ہوتا ہے تو (اسی طرح صبح و شام) دوزخیوں کے مقامات میں سے (اس کا مقام اس کے سامنے کیا جاتا ہے) اور کہا جاتا ہے کہ یہ ہونے والا ہے تیرا مستقل ٹھکانا (اور یہ اس وقت ہوگا) جبکہ اللہ تجھے اپنی طرف اٹھائے گا قیامت کے دن۔

(ف) قبر میں روزانہ صبح و شام جنتیوں کو اپنا مقام دیکھ کر جو غیر معمولی لذت و مسرت حاصل ہوا کرے گی اور دوزخیوں کو دوزخ کا اپنا ٹھکانا دیکھ کر روزانہ صبح و شام جو رنج و غم مزید ہوا کرے گا اس دنیا میں کوئی اس کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اہل جنت میں شامل فرمائے۔

---

(۵۳) عن عثمان رضی اللہ عنہ انہ کان اذا وقف علی قبر بکی حتی یبل لحیتہ فقیل لہ تذکر الجنۃ والنار فلا تبکی وتبکی من ھذا فقال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال انّ القبر اول منزل من منازل الاٰخرۃ فان نجا منہ فما بعدہ ایسر منہ وان لم ینج منہ فما بعدہٗ اشد منہ۔ قال وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما رأیت منظراً قط الّا والقبر افظع منہ۔　(رواہ الترمذی وابن ماجہ)

(ترجمہ) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (کہ ان کا حال یہ تھا) کہ جب وہ کسی قبر کے پاس

کھڑے ہوتے تو بہت روتے، یہاں تک کہ آنسوؤں سے ان کی ڈاڑھی تر ہو جاتی، ان سے پوچھا گیا (یہ کیا بات ہے) کہ آپ جنت و دوزخ کو یاد کرتے ہیں تو نہیں روتے، اور قبر کی وجہ سے اس قدر روتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے، پس اگر بندہ اس سے نجات پا گیا تو آگے کی منزلیں اس سے زیادہ آسان ہیں، اور اگر قبر کی منزل سے بندہ نجات نہ پا سکا تو اس کے بعد کی منزلیں اس سے اور زیادہ سخت اور کٹھن ہیں۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی فرماتے تھے کہ نہیں دیکھا میں نے کوئی منظر مگر یہ کہ قبر کا منظر اس سے زیادہ خوفناک اور شدید ہے۔

(ف) مطلب یہ ہے کہ جب کسی قبر سے میرا گزر ہوتا ہے تو قبر کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات یاد آجاتے ہیں اور فکر و غم میں مبتلا کر کے مجھے رلاتے ہیں۔

---

(۵۵) عن عثمان رضی اللہ عنہ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا فرغ من دفن المیت وقف علیہ فقال استغفروا لاخیکم ثم سلوا لہ بالتثبیت فانہ الآن یسأل۔

(رواہ ابوداؤد)

(ترجمہ) حضرت عثمان ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ جب میت کے دفن سے فارغ ہو جاتے تو قبر کے پاس کھڑے ہوتے اور فرماتے کہ اپنے اس بھائی کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرو۔ اور یہ بھی استدعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو سوالوں کے جواب میں ثابت قدم رکھے، کیوں کہ اس وقت اس سے پوچھ گچھ ہوگی۔

---

(۵۶) عن جابر قال خرجنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی سعد بن معاذ حین توفی فلمّا صلی علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و وضع فی قبرہ وسوّی علیہ سبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فسبحنا طویلاً ثم کبّر فکبرنا فقیل یا رسول اللہ لم سبحت ثم کبّرت فقال لقد تضایق علی ھذا العبد الصالح قبرہ حتیّٰ فرجہ اللہ عنہ۔

(رواہ احمد)

(ترجمہ) حضرت جابر سے مروی ہے کہ جب مشہور انصاری صحابی سعد بن معاذ کی وفات ہوئی تو ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ان کے جنازہ پر گئے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی اور ان کو قبر میں اتار کر جب قبر برابر کر دی گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سبحان اللہ سبحان اللہ

کہا (آپ کو دیکھکر آپکے اتباع میں) ہم بھی دیر تک سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے رہے، پھر آپ نے اللہ اکبر اللہ اکبر کہنا شروع کیا تو ہم بھی آپکے اتباع میں اللہ اکبر اللہ اکبر کہنے لگے ۔ پھر آپ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ اس وقت آپ کی اس تسبیح اور تکبیر کا کیا خاص سبب تھا؟ آپنے فرمایا کہ اللہ کے اس نیک بندہ پر اس کی قبر تنگ ہوگئی تھی (جس سے اس کو تکلیف تھی) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے تنگی کی اس کیفیت کو دور فرما کر کشادگی پیدا فرما دی اور اس کی تکلیف دور کر دی۔

(ف) یہ سعد بن معاذ انصاریؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور اور ممتاز اصحاب کرام میں سے تھے، غزوۂ بدر کی شرکت کی فضیلت اور سعادت بھی انھیں حاصل تھی ۵ھ میں ان کا وصال ہوا، اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا کہ ستر ہزار فرشتوں نے ان کے جنازے میں شرکت کی اور آسمان کے دروازے ان کے لیے کھولے گئے ــــ باوجود اس کے قبر کی تنگی کی تکلیف سے ان کو بھی واسطہ پڑا (اگرچہ فوراً ہی وہ اٹھالی گئی) ــــ اس میں ہم جیسوں کے لیے بڑا انتباہ اور بڑا سبق ہے۔ اللّٰھم ارحمنا اللّٰھم احفظنا !!

---

(۵۷) عن اسماء بنت ابی بکر قالت قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطیباً فذکر فتنۃ القبر التی یفتتن فیہا المرء فلما ذکر ذالک ضج المسلمون ضجۃً۔ (رواہ البخاری)

(ترجمہ) حضرت اسماء بنت ابی بکر سے مروی ہے، کہتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں اُس آزمائش کا ذکر فرمایا جس میں مرنے والا مبتلا ہوتا ہے۔ تو جب آپ نے اس کا ذکر فرمایا تو خوف و دہشت سے سب مسلمان چیخ پڑے اور ایک کہرام مچ گیا۔

---

(۵۸) عن زید بن ثابت قال بینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حائط بنی النجار علی بغلۃ لہ و نحن معہ اذ حادت بہ فکادت تلقیہ واذا اقبر ستۃ او خمسۃ فقال من یعرف اصحاب ھٰذہ الاقبر قال رجل انا قال فمتیٰ ماتوا قال فی الشرک فقال ان ھٰذہ الامۃ تبتلیٰ فی قبورھا فلولا ان لاتدافنوا لدعوت اللہ ان یسمعکم من عذاب القبر الذی اسمع منہ ثم اقبل علینا بوجھہ فقال تعوذوا باللہ من عذاب النار قالوا نعوذ باللہ من عذاب النار قال تعوذوا باللہ من عذاب القبر قالوا نعوذ باللہ من عذاب القبر قال تعوذوا باللہ من الفتن ما ظھر منھا وما بطن قالوا نعوذ باللہ من الفتن ما ظھر منھا وما بطن، قال تعوذوا باللہ من فتنۃ الدجال قالوا نعوذ باللہ من فتنۃ الدجال۔ (رواہ مسلم)

(ترجمہ) حضرت زید بن ثابت انصاری سے مروی ہے کہ ایک دفعہ اس حال میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اپنی خچری پر سوار قبیلۂ بنی نجار کے ایک باغ میں سے گزر رہے تھے، اچانک آپ کی خچری راستہ سے ہٹی اور ٹیڑھی ہوئی (اور اسکی ایسی حالت ہوئی) کہ قریب تھا کہ آپ کو گرا دے۔ اچانک نظر پڑی تو دیکھا کہ وہاں چھ یا پانچ قبریں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ان قبر کے مردوں سے کون واقف ہے؟ (یعنی تم میں کوئی ہو جو ان لوگوں کو جانتا ہو جو ان قبروں میں مدفون ہیں؟ (ساتھیوں میں سے) ایک شخص نے کہا میں جانتا ہوں۔ آپ نے فرمایا یہ لوگ کس زمانہ میں مرے تھے؟ اس شخص نے عرض کیا زمانہ شرک میں ۔۔۔ آپ نے فرمایا یہ لوگ اپنی قبروں میں عذاب میں مبتلا ہیں، اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ تم مردوں کو دفن نہ کرسکوگے تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ قبر کے عذاب میں سے جتنا کچھ میں سُن رہا ہوں وہ اسمیں سے کچھ تم کو بھی سُنا دے ۔۔۔ یہ فرمانے کے بعد آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا دوزخ کے عذاب سے اللہ سے پناہ مانگو! سب کی زبان سے نکلا ہم دوزخ کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، ۔۔۔ آپ نے فرمایا قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو، سب نے کہا ہم قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ آپ نے فرمایا سب فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگو، ظاہری فتنوں سے بھی اور باطنی فتنوں سے بھی، سب نے کہا ہم ظاہری و باطنی فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں ۔۔۔ آپ نے فرمایا کہ دجال کے (عظیم ترین) فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگو، سب نے کہا ہم دجالی فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔"

(ف) اس سلسلہ کی بعض حدیثوں سے پہلے معلوم ہو چکا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے برزخ (قبر) کے عذاب کو جن و انس سے مخفی رکھا ہے، انھیں اس کا بالکل پتہ نہیں چلتا، لیکن ان کے علاوہ دوسری مخلوقات کو اس کا ادراک و احساس کچھ ہوتا ہو۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ بنی نجار میں دفن شدہ ان لوگوں پر جو عذاب ہو رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ رُفقار کو اگرچہ اس کا کوئی احساس نہیں ہوا لیکن جس خچری پر آپ سوار تھے اسکو اسکا احساس ہوا اور اس پر اثر پڑا ۔ اسکی حکمت ظاہر ہو، مرنے والوں پر مرنے کے بعد جو کچھ گزرتا ہو اگر ہم سب بھی اسکو دیکھ یا سُن لیا کرتے تو "ایمان بالغیب" نہ رہتا، اور دنیا کا یہ نظام بھی نہ چل سکتا، جس وقت ہمارے سامنے ہمارا کوئی عزیز سخت تکلیف اور مصیبت میں مبتلا ہو ہم سے اسوقت کوئی کام نہیں ہو سکتا، اگر کہیں قبروں کا عذاب ہم پر منکشف ہو جایا کرتا تو کسی اور کام کا کیا ذکر، مائیں بچوں کو دودھ بھی نہ پلا سکتیں ۔۔۔۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان قبر والوں پر جو عذاب ہو رہا تھا اور اسکی وجہ سے جو چیخ پکار ان قبروں میں مچی ہوئی تھی جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ والے صحابہ کرام بالکل نہیں سن رہے تھے، خود آپ اسکو سن رہے تھے۔

یہ ایسا ہی تھا جیسا کہ وحی کا فرشتہ جب وحی لیکر آتا تھا تو بسا اوقات صحابۂ کرام بھی اسوقت آپکے قریب ہوتے تھے لیکن آنے والے فرشتہ کو ان کی آنکھیں عام طور سے نہیں دیکھ سکتی تھیں، نہ وہ اسکی آواز سنتے تھے[۱]، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھتے اور اس کی آواز سنتے تھے، اہل مکاشفہ تو اس صورت حال کو بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں، لیکن ہم جیسے عوام بھی اسکو خواب والی مثال ہی سے کچھ سمجھ سکتے ہیں۔

۱ (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے)

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ "لولا ان لا تدافنوا لدعوت اللہ ان یسمعکم من عذاب القبر الذی اسمع منہ" (یعنی اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ تم مردوں کو دفن نہ کرسکو گے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا کہ قبر کے عذاب میں سے جتنا کچھ میں سن رہا ہوں اس میں سے کچھ وہ تم کو بھی سنا دے) اس کا مطلب یہ ہے کہ قبر کے عذاب کی جو کیفیت اللہ تعالیٰ نے مجھ پر منکشف فرما دی ہے اور عذاب اور عذاب دیے جانے والوں کی چیخ پکار جو میں سن رہا ہوں اگر اللہ تعالیٰ وہ تمھیں بھی سنوا دے تو اس کا خطرہ ہے کہ تمھیں موت سے اتنی دہشت ہو جائے کہ مردوں کے دفن و کفن کا انتظام بھی نہ کرسکو اس لیے میں اللہ سے دعا نہیں کرتا کہ وہ تمھیں بھی سنا دے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو تعوذ (اللہ سے پناہ مانگنے) کی طرف متوجہ کیا — اس میں اس کی تعلیم ہے کہ مومنین کو چاہیے کہ وہ قبر کے عذاب کو جاننے اور دیکھنے کی فکر کے بجائے اس سے بچنے کی فکر کریں۔ اور اس سے — اور ہر قسم کے عذاب اور فتنہ سے — بچانے والا بس اللہ ہی ہے، لہٰذا اس سے برابر پناہ مانگتے رہیں دوزخ کے عذاب سے پناہ مانگیں، عذاب قبر سے پناہ مانگیں، ظاہر باطن کے سب فتنوں سے پناہ مانگیں خاص کر دجال کے عظیم ترین فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگتے رہیں اور کفر و شرک اور ان سب فتنوں اور معصیتوں سے بچنے کی فکر رکھیں جو عذاب کو لانے والے ہیں۔ اللّٰھم انا نعوذ بک من عذاب القبر ونعوذ بک من عذاب النار ونعوذ بک من الفتن ما ظھر منھا وما بطن ونعوذ بک من فتنۃ الدجال۔

لے (حاشیہ صفحہ گزشتہ) عام سنۃ اللہ اور عادۃ اللہ یہی ہے کہ برزخ کی واردات کو جن و انس سے کلی طور پر مخفی رکھا جاتا ہے۔ نہ ہم اس کو دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں۔ لیکن یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بطور خرق عادت کے کسی مرنے والے کے برزخی عذاب یا ثواب کی کوئی جزدی کیفیت کسی حکمت اور مصلحت کی بنا پر اپنے کسی بندے کو دکھلا دے — شیخ ابن القیمؒ نے کتاب الروح میں بڑے عبرت انگیز اس قسم کے بہت سے واقعات قریباً ۹ صفحہ پر نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:— "وھذہ الاخبار واضعافھا واضعاف اضعافھا مما لا یتسع لھا الکتاب مما اراہ اللہ سبحانہ بعض عبادہ من عذاب القبر ونعیمہ عیاناً واما رؤیۃ المنام فلو ذکرناھا لجاءت عدۃ اسفار ..... ولیس عند الملاحدۃ والزنادقۃ الا التکذیب بما لم یحیطوا بعلمہ" (کتاب الروح ص ۱۱۲)
جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ واقعات جو میں نے یہاں ذکر کیے اس قسم کے اور بھی بے شمار واقعات ہیں جن کی اس کتاب میں گنجائش نہیں یہ سب اسی قبیل سے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض خاص بندوں کو قبر کے عذاب یا ثواب کا کبھی مشاہدہ بھی کرا دیتا ہے، یعنی بیداری کی حالت میں آنکھوں سے دکھا دیتا ہے۔ — رہا خواب میں دیکھنا تو اس کے واقعات تو اتنے ہیں کہ اگر ان کو لکھا جائے تو کئی جلدیں تیار ہو جائیں ...... لیکن ملحد اور زندیق قسم کے لوگوں کا حال یہی ہے کہ جن حقائق سے وہ ناآشنا اور محروم ہیں وہ ان کو جھٹلاتے اور ان کا انکار کرتے ہیں۔ ۱۲

مُجرم ابنِ تیمیہؒ

از مولانا محمد ادریس صاحب ندوی (نگرامی)

لاؤ تو قتل نامہ مرا، میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی!

رسالۂ دار العلوم (بابت ماہ اکتوبر ۱۹۵۱ء) میں مولانا حکیم عبد الرشید محمود صاحب گنگوہی کا ایک خط جماعتِ اسلامی کے سلسلہ میں شائع ہوا ہے، اس میں ایک موقع پر شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا ذکر ایسے انداز سے کیا گیا ہے کہ خط کے اُس حصہ کو طاؤس کے پائے زشت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ جن کے متعلق حافظ ذہبی نے فرمایا ہے کہ:۔

"ان کا مقام اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے کہ مجھ جیسا شخص اُن کی سیرت و فضیلت بیان کرے، قسم خدا کی اگر میں خانۂ کعبہ میں عین رکن و مقام کے درمیان قسم کھاؤں کہ نہ تو میری آنکھوں نے ان کا مثل دیکھا اور نہ خود انھوں نے اپنا ہمتا، تو میری قسم سچی ہوگی۔ اور میرے لئے کفارۂ یمین نہیں"[1]

حافظ ابو الحجاج مزی نے کہا:۔

"نہ میں نے ان کا مثل دیکھا اور نہ خود انھوں نے کسی کو اپنا ہمتا پایا، اور نہ میں نے کسی شخص کو ان سے زیادہ کتاب و سنت کا علم رکھنے والا اور کتاب و سنت کا اتباع کرنے والا دیکھا ——— چار سو برس سے ایسا باکمال نہیں پیدا ہوا"[2]

حافظ برزالی کا ارشاد ہے:۔

"ہم نے ابن تیمیہؒ سے بڑھ کر نہ تو کسی کو کتاب و سنت کا عالم دیکھا اور نہ عامل"[3]

---

[1] القول الجلی۔ و تذکرۂ مولانا آزاد ص۱۳۸ [2] القول الجلی و تذکرہ ص۱۳۹ [3] تذکرہ ص۱۴۷۔ ۱۲

جب ابن دقیق العید ابن تیمیہؒ سے ملے تو پہلی ملاقات سے متأثر ہو کر کہا:۔

"کب اُمید تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ جیسے آدمی اب بھی پیدا کرے گا۔"

بعد کو لوگوں سے کہا:۔

"میں نے ایک ایسا آدمی دیکھا کہ سارے علم اس کی آنکھوں کے سامنے ہیں، جس کو چاہتا ہے اُٹھا لیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے۔"[1]

حافظ عماد الدین واسطی نے فرمایا:۔

"قسم خدا کی آسمان کے نیچے آج تمہارے شیخ ابن تیمیہ کا نظیر و مثیل کوئی دکھائی نہیں دیتا نہ علم میں نہ عمل میں، نہ حال میں نہ اخلاق میں، نہ اتباع حق اور نہ شیوۂ کرم و کمال حلم میں، اور نہ اللہ اور اس کے شعائر کے حفظ و قیام کی راہ میں ——— قسم خدا کی ہم نے اپنے زمانہ میں کسی کو نہ دیکھا جس کے اقوال و افعال سے نبوت محمدیؐ کے انوار اور ان کی سنت کی روشنیاں چھن چھن کر نکلتی ہوں مگر ابن تیمیہ کو ——— ان کو دیکھ کر دل بے اختیار بول اُٹھتا ہے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حقیقی اتباع اس کو کہتے ہیں، او رایسا ہوتا ہے۔"[2]

وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ جن کے مداحوں میں حافظ ابن قیمؒ، حافظ ذہبیؒ، محدث ابن کثیرؒ، شمس الدین بن قدامہؒ، ابن قاضی الجبل، طوفی صرصری، ابن الوردی، زین الدین حرانی، ابن مفلح، شرف الدین بن المنجا، ابن ناصر الدین، حافظ عسقلانی، علامہ عینی، شیخ ابراہیم کورانی، مُلا علی قاری، علامہ سویدی بغدادی، شیخ آلوسی بغدادی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسے محققین اور یگانۂ روزگار لوگوں کا نام بے تکلف لیا جا سکتا ہے!۔

وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ

جن کی زندگی ہی میں یہ حال تھا کہ بڑے بڑے اکابر و اعاظم علم ائمۂ سلف کی کتابیں فروخت کر ڈالتے تاکہ مؤلفات ابن تیمیہ خرید سکیں۔ شیخ شہاب الدین شافعی نے امام نواوی کی شرح مسلم فروخت کر دی اور اس کی قیمت سے امام موصوف کی الرد علی النصاریٰ خریدی، ایک شخص نے اس پر اعتراض کیا کہ شرح مسلم دے کر ابن تیمیہ کی کتاب خریدتے ہو تو کہا کہ میرے پاس شرح مذکور کے دو نسخے تھے ایک فروخت کر دیا، لیکن اگر ایک ہی نسخہ ہوتا جب بھی مصنفات ابن تیمیہ کیلئے

---

[1] القول الجلی ص۵۔ و تذکرہ ص۲۲۵ [2] جلاء العینین و تذکرہ ص۱۵۳۔۱۱

بلا تامل فروخت کر دیتا، کیونکہ ما فی شرح مسلم اعرفه وما فی مولفاته انا محتاج الیه"[1]

وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کہ انھوں نے

"جب وفات پائی تو اکثر بلاد اسلام میں اُن کے لئے نماز جنازہ غائب پڑھی گئی حتیٰ کہ یمن اور چین میں اور سیاحوں کی زبانی معلوم ہوا کہ چین کے نہایت بعید گوشوں میں جمعہ کے دن منادی کرنے والے نے پکارا کہ ترجمان القرآن کے لئے نماز جنازہ پڑھی جائے گی"[2]

حافظ برزالی نے کہا، کہ :-

"امام احمد بن حنبل کے بعد اور کسی کے جنازے پر خلق اللہ کا اس قدر اجتماع نہیں ہوا، اور نہ اتنی نمازیں پڑھی گئیں جس قدر امام ابن تیمیہ کے جنازے پر ——— جب جنازہ اٹھا اور انبوہ کا یہ حال ہوا کہ صرف عورتوں کی تعداد پندرہ ہزار سے زیادہ اندازہ کی گئی تو ایک شخص نے منارۂ مسجد سے ندا دی، کہ اس طرح اہل سنت کا جنازہ اٹھتا ہے"[3]

تعجب ہے کہ ایسے جلیل القدر شیخ کو محض ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ حدیثیہ پر اعتماد کرتے ہوئے ان جرائم کا مجرم قرار دے دیا جائے جن کے متعلق خود شیخ کی تصنیفات کی ایک ایک سطر پکار کر کہہ رہی ہے کہ :- ؎

آمادۂ قتلِ من آں شوخ ستمگارے
ایں طرفہ تماشا بیں ناکردہ گنہگارے

اور پھر لطف یہ ہے کہ خود ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے براہ راست شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی کتابوں کا مطالعہ بھی نہیں فرمایا ہے جس کا ثبوت اس فتاویٰ حدیثیہ ہی میں موجود ہے، ص۸۷ میں ابن تیمیہ کے جرائم شمار کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو شخص شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتابوں کو دیکھے گا وہ ان الزامات کو انکی طرف منسوب نہ کرے گا"

یہ "بعض لوگ" اُنکی رائے میں اس قدر تذبذب پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ بعد کو فرماتے ہیں :-

"کہ ایسے سخت الزامات لگانے والے محققین ہیں اسلئے امید ہے کہ انھوں نے تحقیق کے بعد یہ بات کہی ہوگی، بہر حال اگر الزامات صحیح ہیں تو خدا اُن کے ساتھ اپنے عدل کا معاملہ فرمائے، اور اگر یہ الزامات صحیح نہ ہوں تو خدا ہم کو اور اُن کو معاف فرمائے"

اس عبارت سے واضح ہے کہ خود ابن حجر مکی کے پیش نظر شیخ الاسلام کی تصنیفات نہ تھیں بلکہ معاملہ نقل در نقل کا ہے، اور

---

[1] تذکرہ ص۲۰۱　[2] تذکرہ ص۱۹۹　[3] تذکرہ ص۲۰۱ ۔

اس نقل در نقل میں وہ جن محققین کا نام لیتے ہیں وہ امام ابو الحسن سبکی، ان کے بیٹے تاج الدین سبکی، اور امام عز بن جماعہ ہیں، ان کا حال بھی ملاحظہ ہو کہ یہ امام ابو الحسن تقی الدین سبکی شیخ الاسلام کو ابن حجر مکی کی طرح

عبد خذله الله واضله واعماه واصمه واذله

کہنے کے بجائے ہمیشہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں، سبکی کی شفاء السقام اس پر شاہد عادل ہے، اس موقع پر امام ذہبی کے نام تقی الدین سبکی یا ان کے بیٹے تاج الدین سبکی کا وہ خط[1] قابل ذکر ہے جس میں لکھتے ہیں:۔

"یقین کیجئے کہ یہ خادم ان کی (یعنی ابن تیمیہؒ کی) قدر و منزلت کی بے پایانی، علوم نقلیہ و عقلیہ میں وسعت نظر، کمال ذکاوت و اجتہاد، اور ان سارے اوصاف کمال میں وہاں تک پہونچ جانے کا معترف ہے جو حد توصیف سے باہر ہے، علی الخصوص ان اوصاف کے ساتھ ان کا زہد و ورع اور دیانت و حق پرستی اور صرف اللہ کیلئے نصرت حق میں قیام و ثبات اور طریق سلف پر سلوک اور مواد سلفیہ سے بہ حد کمال اخذ و نظر اور بہ حیثیت مجموعی ان کا وہ مرتبہ کمال کہ موجودہ عہد میں اپنی نظیر آپ ہیں بلکہ کتنے عہدوں سے ایسے باکمال پیدا نہیں ہوئے[2]۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اپنے مخالف شیخ سبکی کے ساتھ کیا طرز عمل رکھتے تھے اس کو خود شیخ سبکی کے بیٹے تاج الدین سبکی کی "طبقات" سے سن لیجئے کہ:۔

"امام ابن تیمیہ اپنے معاصرین میں جس قدر احترام شیخ تقی الدین سبکی کا کرتے تھے اس قدر احترام کسی دوسرے کا نہ کرتے تھے بلکہ وہ سبکی کے اس رد کی (جو انھوں نے ابن تیمیہؒ پر کیا ہے) بے حد تعریف کرتے تھے۔"

امام ابن تیمیہ کے مخالفین میں ابن حجر مکی نے دوسرا نام تاج الدین سبکی کا لیا ہے، مگر یہ شیخ الاسلام سے اس قدر متاثر تھے کہ لکھتے ہیں کہ حافظ مزی شیخ الاسلام کا لفظ صرف تین آدمیوں کے لئے لکھتے تھے، ایک تو انکے والد تقی الدین سبکی کے لئے، دوسرے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کیلئے، تیسرے شیخ شمس الدین ابو عمرو کے لئے[3]۔

اب غور کیجئے کہ تاج الدین سبکی کے نزدیک اگر ابن تیمیہؒ بلند مرتبہ نہ ہوتے یا وہ مبتدع اور زندیق ہوتے تو کیا تاج الدین سبکی پسند کرتے کہ اپنے والد کے ساتھ شیخ الاسلام کا ذکر کرتے!۔

ابن حجر مکی نے تیسرا نام عز الدین بن جماعہ کا لیا ہے، یہ نحو میں ابو حیان کے شاگرد تھے، ابو حیان پہلے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے

---

[1] اس بحث کیلئے کہ یہ خط باپ کا ہے یا بیٹے کا مولانا آزاد کا تذکرہ ملاحظہ ہو ص۲۲۳

[2] درر کامنہ جلد اول ص۔ و تذکرہ ص۲۲۲۔ [3] القول الجلی ص۱۱

بڑے معتقد اور مدّاح تھے، ابن تیمیہؒ کی منقبت میں ذیل کے اشعار انھیں کے ہیں! ـ سہ

قام ابن تیمیۃ فی نصر شرعتنا
مقام سید تیم اذ عصت مضر

فاظہر الحق اذ آثارہ درست
واخمد الشر اذ طارت لہ شرر

کنا نحدث عن حبر یجیٔ فہا
انت الامام الذی قد کان ینتظر

لیکن ایک موقع پر ابن تیمیہؒ نے سیبویہ کی نحوی غلطیوں کے متعلق کچھ ذکر کیا، اُس وقت سے ابوحیان ابن تیمیہؒ سے ناراض ہو گئے، اور بقول حافظ ابن حجر عسقلانی کے "یہ ایک ناقابلِ معافی گناہ ہو گیا"[1]

اس تلمذ کے اثر کی وجہ سے اگر عزالدین بن جماعہ کو ابن تیمیہؒ سے کچھ اختلاف پیدا ہو گیا ہو تو بعید نہیں! ـ

حکیم صاحب موصوف نے ابن تیمیہ کے ناقدین میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلویؒ کا نام بھی لیا ہے، پس اگر کسی مسئلہ میں اختلافِ رائے کے معنی مخالفت کے ہیں تب تو کچھ نہیں عرض کیا جا سکتا ورنہ خود شاہ صاحبؒ نے ابن تیمیہ کی طرف سے دفاع کیا ہے اور نہایت بلند الفاظ میں ان کے فضل و کمال کی شہادت دی ہے، اس سلسلے میں شاہ صاحبؒ نے مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں تحریر فرماتے ہیں، کہ:ـ

"ہم نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے حالات کو جانچا ہے، وہ کتاب اللہ کے عالم اور سنّتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حافظ ہیں، ان میں فسق و بدعت کی کوئی بات نہیں ہے اور جن مسائل میں ان پر اعتراض کیا گیا ہے ان مسائل میں ان کے ساتھ کتاب وسنّت اور آثارِ سلف کے دلائل ہیں، ایسا عالم بہ مشکل پیدا ہوتا ہے اور جن لوگوں نے ابن تیمیہ پر اعتراض کئے ہیں وہ ابن تیمیہ کو دسواں حصّہ بھی نہیں پہونچتے ہیں"[2]

حضرت شاہ صاحبؒ تو شیخ الاسلام سے اس قدر متاثر ہیں کہ اپنی کتابوں میں صفحات کے صفحات ابن تیمیہ کی کتابوں کے نقل کر دیئے ہیں مگر غالباً اہل زمانہ کے تعصب کی وجہ سے نام لینا قرین مصلحت نہیں سمجھا، راقم سطور نے "الفرقان" کے "ولی اللہ نمبر" میں ان مقامات کی نشان دہی کی تھی! ـ

حکیم صاحب نے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا نام بھی ابن تیمیہؒ کے

---

[1] دررکامنہ جلد اوّل ـ
[2] جلاء العینین صہ۲۹

رد کرنے والوں میں لیا ہے!۔

اس سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ جو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ ایسے وسیع القلب ہوں کہ علامہ ابن حزم ظاہری کی تحقیقات سے نفع اٹھاتے ہوں مثلاً ان کا رسالہ "السر الجلیل" از اول تا آخر علامہ ابن حزم کی کتاب "الفصل فی الملل والنحل" جلد ۴ (بحث وجوہ الفضل والمفاضلہ بین الصحابہ) سے ماخوذ ہے، جس کا جی چاہے دونوں کو ملا کر دیکھ لے، مگر غالباً تعصب اہلِ سنت کے باعث ابن حزم کا نام نہیں لیتے ہیں، وہ شاہ عبدالعزیز صاحب اس قدر تنگ دل نہیں ہوسکتے ہیں کہ ابن تیمیہ جیسے محقق جلیل سے بدظن ہوں۔

صورت یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کے جس فتویٰ کا ذکر حکیم صاحب نے فرمایا ہے انھی سے ظاہر ہے کہ شاہ صاحب نے ابن تیمیہ کے خلاف فتاویٰ میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی اصل کتابوں کو دیکھ کر نہیں بلکہ نقول کی بنیاد پر لکھا ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں، کہ:۔

"وہذہ المواضع منقولۃ موجودۃ عندی" (فتاویٰ عزیزی، ج ۲ ص ۸۷)

اوران منقولات کے غیر معتمد ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ان میں ابن تیمیہ کی طرف وہ مسائل منسوب ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے اسی فتویٰ میں شاہ صاحبؒ نے ابن تیمیہ کی "منہاج السنۃ" کا حوالہ دیا ہے، اور اس کی بعض عبارتوں کو موحش بتلایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کے پیش نظر "منہاج السنۃ" نہ تھی، اس کی دلیل یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اسی مجموعۃ الفتاویٰ ص ۱۳۶ میں ان کتابوں کو شمار کرایا ہے جو تحفہ اثنا عشریہ کی تصنیف کے وقت اُن کے پیش نظر تھیں اس فہرست میں منہاج السنۃ (جو اس سلسلہ کی اہم ترین کتاب ہے) کا نام نہیں لیتے ہیں!۔

یہ بات بھی لطف سے خالی نہیں ہے کہ یہی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اپنی کتاب "بستان المحدثین" میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے وسعتِ علم پر حیرت کرتے ہیں اور اس کو اُمت پر خدا کے انعامات میں سے شمار کرتے ہیں ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:۔

> "شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کے متعلق یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ انھوں نے سورۂ نوح کی تفسیر ایک سال سے زیادہ بیان کی، سبحان اللہ اس اُمت کو "رب زدنی علماً" کہنے والے کے صدقے میں کیا وسعتِ علم نصیب فرمائی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے[1]"
> (بستان المحدثین ص ۸۹)

---

[1] ناچیز مدیر الفرقان عرض کرتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی طرف منسوب ہو کر فتاویٰ کا جو مجموعہ چھپا ہوا ہے جو شخص اُس کو اول سے آخر تک دیکھے گا اُس کو اس میں متعدد ایسے فتوے نظر پڑیں گے جن کی نسبت شاہ صاحبؒ کی طرف وہی کرسکتا ہے جو شاہ صاحبؒ کے (بقیہ ص ۲۳ پر)

اب ذرا ابن تیمیہ کی وہ فرد جرم بھی سُن لی جائے جو حکیم صاحب نے ابن حجر مکی کی تبعیت میں ان پر عائد فرمائی ہے ارشاد ہوتا ہے :-

"انھوں نے حدیث شد رحال کے سلسلہ میں روضۂ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زیارت کو ممنوع قرار دیا، وہ خدا کے ذو جہت اور مجسّم ہونے کے قائل تھے، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا سخت تخطیہ کرتے تھے، حضرت علیؓ کی تین سو غلطیاں پکڑیں، انبیاءؑ کو معصوم نہیں جانتے تھے، توریت اور انجیل کے الفاظ کو غیر محرف مانتے تھے ۔"

اس سلسلہ میں پہلی گذارش یہ ہے کہ کسی کو مجرم اور ملزم قرار دینے کے لئے کیا صرف مخالفین کا نام لے دینا اور جرائم کا گنا دینا کافی ہے؟ بتلایا جائے کہ ان مخالفین نے ابن تیمیہ کے کس مسئلہ سے اختلاف کیا ہے؟ اور وہ مسئلہ ابن تیمیہؒ کی کس کتاب میں اور کہاں درج ہے؟ اور اگر ابن تیمیہ کے بعض تفردات ہیں تو کیا سلف میں اس بارہ میں اُن کا ہم زبان کوئی نہیں ہے؟ اور کیا وہ تفردات ان کے فسق و ضلال یا کفر کا باعث بن سکتے ہیں ؟ -

ہم ابن تیمیہ کو معصوم نہیں مانتے ہیں اور بے شبہ غلطیوں سے معصوم کے سوا دوسرے کو نجات نہیں[1] خوب کہا ہے حافظ ابن حجر عسقلانی نے، کہ :-

"ابن تیمیہ غلطی بھی کرتے تھے لیکن ان کی غلطیاں صحیح مسائل کے مقابلہ میں کم ہیں اور جہاں ان سے غلطیاں ہوتی ہیں اس میں ان کی پیروی نہ کی جائے گی[2]"

محدث ابن کثیر نے فرمایا، کہ :-

"صحیح مسائل کے مقابلہ میں ابن تیمیہ کی غلطیوں کی مثال ایسی ہے جیسے سمندر کے مقابلہ میں قطرہ[3]!"

(صلہ ۲۲ کا بقیہ حاشیہ) علمی مقام اور مسلک سے واقف نہ ہو۔ مثلاً عرض کرتا ہوں کہ اس میں قبروں پر پھول چڑھانے جیسے نیم مشرکانہ عمل کا مدلل جواز بھی موجود ہے ــــــ پس اس مجموعۂ فتاویٰ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے متعلق جو سطریں موجود ہیں (جن کا حوالہ اپنے مضمون میں حکیم صاحب نے دیا ہے) اغلب یہ ہے کہ بعض اور فتوؤں کی طرح وہ بھی شاہ صاحبؒ کی طرف سے تصنیف کر کے اس میں شامل کی گئی ہیں اور اس کے دو قوی قرینے ہیں، اوّل "بستان المحدثین" میں شیخ الاسلام کے متعلق شاہ صاحبؒ کا یہ اعتراف و احترام، دوسرے شاہ ولی اللہؒ کا مکتوب جس سے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ بے خبر نہیں ہو سکتے ــــــ علاوہ ازیں "فتاویٰ عزیزی" کے بعض فتوؤں کی نسبت شاہ صاحبؒ کی طرف صحیح نہ ہونا علماء محققین کے نزدیک ایک معلوم و مشہور حقیقت ہے - ۱۲

[1] القول الجلی صفحہ ۴۲ - [2] القول الجلی صفحہ ۸ - [3] القول الجلی صفحہ ۶ -

کاش حکیم صاحب نے ابن آلآلوسی بغدادی کی "جلاء العینین" ہی کے مطالعہ کی زحمت گوارا فرمائی ہوتی تو وہ دیکھتے کہ باریک مصری ٹائپ کی تین سو ساٹھ صفحہ کی اس کتاب میں ابن حجر مکیؒ کی اس قسم کی تمام غلط فہمیوں کا کس طرح ازالہ کیا گیا ہے!۔

محقق آلوسی زادہ اس قسم کے تمام الزامات کے متعلق فرماتے ہیں :۔

"ان میں سے بعض اعتراضات وہ ہیں جن کا ذکر تک ابن تیمیہ کی کتابوں میں نہیں ہے، بعض وہ ہیں کہ جن کے خلاف ان کی کتابوں میں تصریحات موجود ہیں، بعض محض افتراء ہیں[1]"

ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

"گذشتہ مباحث سے معلوم ہوگا کہ ابن حجر مکی نے جو کچھ ابن تیمیہ کی طرف منسوب کیا ہے ان میں سے اکثر اقوال کی کوئی بنیاد نہیں ہے، اور ان کے نقل کی کوئی سند نہیں ہے[2]"

کتاب کے آخر میں فرماتے ہیں :۔

"بعض الزامات جھوٹے ہیں، بعض لازم مذہب ہیں (گو لازم مذہب مذہب نہیں) بعض وہ ہیں جو حنابلہ کا مسلک ہے، اور بعض وہ ہیں جو شیخ کے مجتہدات میں سے ہیں، اور شیخ مرتبۂ اجتہاد کو پہونچ چکے تھے[3]"

رسالہ "دار العلوم" میں جو اعتراضات منقول ہیں اب ذرا اختصار کے ساتھ ان کا جائزہ بھی لے لیا جائے پہلا اعتراض یہ ہے کہ ابن تیمیہ زیارتِ قبرِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روکتے تھے۔ صاحبِ "القول الجلی" لکھتے ہیں، کہ :۔

"یہ بات شہرت پاگئی ہے کہ ابن تیمیہ زیارتِ قبور کو منع کرتے ہیں، حالانکہ یہ بالکل جھوٹ ہے" (ص۵۰)

شیخ الاسلام کا رسالہ "مناسکِ حج" آج مطبوعہ موجود ہے اُس میں زیارتِ قبرِ مبارک کے آداب تحریر ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ابن تیمیہ کو بعض روایات کی بنا پر شدِ رحال سے اختلاف تھا! گو ہم اُن سے اس معاملہ میں متفق نہیں ہیں، مگر کیا ابن تیمیہ اپنے اس خیال میں متفرد ہیں؟ اور کیا ان کا یہ اختلاف تفسیق و تضلیل و تکفیر کا باعث بن سکتا ہے؟ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں، کہ :۔

"ابن تیمیہ کا زیارت قبرِ مبارک سے روکنا ثابت نہیں ہے بلکہ وہ بعض روایات کی بنا پر زیارت کیلئے

---

[1] جلاء العینین ص۳ ـ [2] جلاء العینین ص۳۲۹ ـ [3] جلاء العینین ص۳۵۹ ـ

سفر سے روکتے تھے، یہ اُنکی اجتہادی بات تھی، اس مسئلہ میں اُن پر نشتر زنی کرنا مناسب نہیں ہے[۱]۔"

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ابن تیمیہ خدا کے ذوجہت اور مجسّم ہونے کے قائل تھے! آلوسی زادہ فرماتے ہیں :۔

"یہ بات قطعاً درست نہیں ہے۔ بلکہ ابن تیمیہ اس عقیدے سے ہزار ہا منزل دور ہیں، اس جھوٹ کے لئے اُن کی کتابیں اور علماء کی شہادتیں فیصلہ کُن ہیں[۲]۔"

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ ابن تیمیہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا تخطیہ کرتے تھے، حضرت علیؓ کی تین سو غلطیاں پکڑیں — شیخ ابن الآلوسی اس سلسلہ میں ابن تیمیہ کی عبارتوں کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :۔

"متذکرۂ بالا عبارتوں سے معلوم ہوگا کہ صحابہؓ کے متعلق ابن تیمیہ پر جو الزام عائد کیا گیا ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے بلکہ شیطانی فعل ہے، شیخ ابن حجر نے ابن تیمیہ کی طرف جو کچھ منسوب کیا ہے اُس میں زیادہ حصّہ جھوٹ ہے[۳]۔"

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ ابن تیمیہ انبیاءؑ کو معصوم نہیں جانتے تھے، یہ بھی محض غلط ہے یا غلط فہمی ہے عصمتِ انبیاءؑ کے بارے میں اُن کا مسلک جمہور اہلسنت سے مختلف نہیں محقق ابن الآلوسی اس بحث کے خاتمے پر لکھتے ہیں :۔

"یہ بات صاف ہوگئی کہ اس مسئلہ میں ابن تیمیہ نے وہی بات کہی جو تمام فضلاء نے کہا ہے انھوں نے اپنی طرف سے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے[۴]۔"

پانچواں اعتراض یہ ہے کہ ابن تیمیہ توراۃ اور انجیل کے الفاظ کو غیر محرف مانتے تھے۔ صاحب جلاء العینین فرماتے ہیں :۔

"اگر یہ بات صحیح ہو تو ابن تیمیہ اس خیال میں تنہا نہیں ہیں، لیکن حافظ ابن تیمیہ نے ابو نصر مسیحی کو جو خط لکھا ہے اُس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ انجیل کے صرف معانی کی تحریف کے قائل نہ تھے۔" (ص ۳۲۹)

اُمید ہے کہ یہ چند سطریں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی طرف سے بدگمانیوں کے دُور کرنے میں ضرور معاون ہوں گی، ورنہ حقیقت تو وہ ہے جو امام ذہبی نے فرمایا، کہ :۔

"جو لوگ امام ابن تیمیہ کے مقامات و مراتب کے جاننے والے ہیں وہ تو مجھ کو الزام دینگے کہ جس قدر مدح و توصیف کرنی تھی نہ کی، اور جو بے خبر اور مخالف ہیں وہ میرے بیان کو غلو اور مبالغہ قرار دینگے[۵]۔"

---

[۱] جلاء العینین ص ۳۱۷ ۔ [۲] جلاء العینین ص ۲۱۱ ۔ [۳] جلاء العینین ص ۲۱۱ ۔ [۴] جلاء العینین ص ۔ [۵] تذکرہ ص ۲۳۹ ۔

دجّالی فتنہ اور سورۂ کہف

(از۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

قسط نمبر (۱۸)

"اس شمارے میں اس مضمون کی اٹھارویں قسط ہدیۂ ناظرین کی جا رہی ہے۔ مولانا نے ایک گرامی نامہ میں جیسا کہ تحریر فرمایا ہے ابھی اس سلسلہ کی دو ایک قسطیں اور باقی ہیں ——— اس قسط میں مولانا نے "یاجوج ماجوج" سے متعلق اپنے وہ خیالات قلمبند فرمائے ہیں، جن کی طرف اُن کا ذہن قرآن مجید کے بعض اشارات سے منتقل ہوا ہے، یا بعض دوسرے علمی یا قیاسی ذرائع سے جن کا اُن کو سُراغ لگا ہے ——— خود مولانا پہلی بعض قسطوں میں تصریح بھی فرما چکے ہیں کہ اس سلسلہ میں وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اُس کی حیثیت "تفسیر و تاویل" کی نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اُن کے ذہنی انتقالات ہیں جن سے قرآن پاک میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے نئی نئی راہیں کھلتی ہیں، اور دراصل وہی اس مضمون کے اصل مخاطب ہیں۔"

"مدیر"

کچھ بھی ہو "یاجوج وماجوج" کے الفاظ کی نوعیت قرآن کے ان اجمالی الفاظ اور اشارات کی نہیں ہے جن کی تفصیل و تشریح قرآنی مطالب و مقاصد کے سمجھنے اور سمجھانے کیلئے غیر ضروری ہو۔

اہمیت ان الفاظ کی یوں بھی ظاہر ہے کہ سورۂ کہف میں ذوالقرنین کے اس قصّہ کے سوا، قرآن ہی کی دوسری سورۃ الانبیاء نامی میں بھی ان دونوں الفاظ "یاجوج وماجوج" کو ہم اس مشہور آیت یعنی:-

"حتی اذا فتحت یاجوج وماجوج وھم من کل حدب[1] ینسلون" (تا آنکہ جب کھول دیئے جائیں یاجوج وماجوج ہر حدب سے تیزی کے ساتھ چلیں گے)"

---

[1] حدب کا ترجمہ میں نے حدب ہی کر دیا ہے، آئندہ اس کی شرح آنے والی ہے۔ "کوزہ پشتی" کی صفت کو عربی میں حدب کہتے ہیں۔ (بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

میں پاتے ہیں، بلکہ دو مختلف سورتوں کی دو مختلف آیتوں میں "یاجوج و ماجوج" کے ان الفاظ کو پاکر بقول حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ "من تبادر الاوھام فقط" (یعنی خواہ مخواہ اس وہم میں لوگ مبتلا ہوگئے) کہ ذوالقرنین کی حکومت کی طرف سے دونوں پہاڑوں کے بیچ میں یہ دیوار جو بنائی گئی تھی، اسی دیوار کو توڑ کر یاجوج ماجوج نکل پڑیں گے حالانکہ بقول شاہ صاحب:-

ولیس فی القران ان هذا الخروج یکون عقیب الاندکاک متقبلا بل فیه وعد باندکاکه فقط فقد اندك کما وعد، اما ان خروجهم موعود بعد اندکاکه بدون فصل فلاحرف فیه۔

(فیض الباری شرح بخاری)

(جلد ۴ - ص ۲۳)

قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے کہ یاجوج وماجوج کے خروج کا واقعہ دیوار کے ڈھ جانے کے ساتھ ہی پیش آئے گا، بلکہ دیوار کے ڈھ جانے کا صرف وعدہ (سورۂ کہف) والی آیت میں کیا گیا ہے، اور دیوار حسب وعدہ ڈھ گئی، لیکن یہ بات کہ دیوار کے ڈھ جانے کے ساتھ اسی وقت بغیر کسی وقفہ کے یاجوج ماجوج نکل پڑیں گے، قرآن میں کوئی حرف ایسا نہیں پایا جاتا جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سورۂ کہف کی آیت جس میں ذوالقرنین نے یہ کہتے ہوئے کہ "دیوار کی تعمیر میں کامیابی یہ صرف میرے پروردگار کی مہربانی ہے، پھر جب میرے رب کا وعدہ آجائے گا، تو اُس وقت وہی میرا رب اس کو ریزہ ریزہ کردے گا" یعنی (هذا رحمة من ربی فاذا جاء وعد ربی جعله دکاء) اس آیت کا جو ترجمہ اور حاصل ہے، خود ہی اس پر غور کیجئے اور دیکھئے اس میں کون سا نقطہ ہے جس سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہو کہ دیوار کے گرنے یا گرانے اور توڑنے کے بعد یاجوج و ماجوج نکل پڑیں گے۔

مگر کیا کیجئے کہ عوام میں یہی مشہور ہوگیا ہے، کہ بند ہونے کے بعد یاجوج و ماجوج کی قوم روزانہ اس کے توڑنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے، اور آخر میں کسی نہ کسی دن اس کے توڑنے میں وہ کامیاب ہوجائیگی، حالانکہ اسی موقع پر اسی آیت سے پہلے قرآن ہی میں:-

"فما اسطاعوا ان یظهروه وما استطاعوا له نقبا" پس وہ (یعنی یاجوج ماجوج والے) نہ اس دیوار پر چڑھنے ہی کی قدرت رکھتے تھے اور نہ ان کے بس میں یہ تھا کہ اس دیوار میں نقب لگائیں، یعنی سوراخ کریں۔

(ص ۲۶ کا بقیہ حاشیہ) گویا سمجھنا چاہئے کہ پانی کے اندر سے زمین کا جو حصہ اُبھر کر باہر نکل آیا ہے، اُبھار کی وجہ سے کوزہ پشتی کی کیفیت اس میں چونکہ پائی جاتی ہے اسلئے اسی کو حدب کہا گیا ہے۔ نیسلون کی تفصیل بھی آگے آرہی ہے ۔۱۲

کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔

بھلا نقب لگانا بھی جس دیوار میں اُن کے بس کی بات نہ رہی تھی، قرآن کی اس واضح اور صاف خبر کے بعد یہ باور کرنا کہ وہی یاجوج و ماجوج والے اسی دیوار کو دکا یعنی ڈھا ڈھو کر برابر کر دینگے، یا انھوں نے برابر کر دیا، قرآنی بیان سے لاپروائی کے سوائے اور کیا کہا جا سکتا ہے ـــــ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ "جعلہ دکاء" (بنائے گا میرا رب اس دیوار کو ریزہ ریزہ) کی قرآنی اطلاع سے بھی ان کو چشم پوشی ہی کرنی پڑتی ہے، جو اس خبر کے مقابلہ میں کہتے ہیں کہ یاجوج و ماجوج والے اس کو دکاء (ریزہ ریزہ) کر دینگے۔

یہ صحیح ہے کہ تفسیری روائتوں میں بھی بعض ایسی روائتیں پائی جاتی ہیں جن سے اسی عام پھیلے ہوئے خیال کی تائید ہوتی ہے، یا شاید اس عام پھیلے ہوئے خیال کا منشاء ممکن ہے تفسیری کتابوں کی یہی روائتیں ہوں ـــــــــ

ـــــ لیکن حضرت مولانا انور شاہ کشمیری (رحمۃ اللہ علیہ) جیسے ناقد علامہ اسی مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے جب فرماتے تھے کہ:۔

انا لم نجد فی القران ولا فی حدیث صحیح۔ (فیض الباری شرح بخاری) (جلد ۴ ص ۲۳)

یعنی (یاجوج و ماجوج کا خروج دیوار توڑ کر ہوگا) اس مسئلہ کو نہ ہم قرآن ہی میں پاتے ہیں، اور نہ کسی صحیح حدیث میں۔

تو اسی سے ان روائتوں کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں ترمذی کی اس روایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس میں ہے کہ:۔

> "یاجوج و ماجوج والے روزانہ دیوار کو کھودتے ہیں، پھر جب کچھ حصہ باقی رہ جاتا ہے، تو گھروں کو یہ کہتے ہوئے پلٹ جاتے ہیں کہ کل ہم باقی کام کو پورا کریں گے، مگر انشاء اللہ تعالیٰ نہیں کہتے، پس جب دوسرے دن واپس ہوتے ہیں تو کھودی ہوئی دیوار کو اسی حال میں پاتے ہیں، یعنی کھودنے سے پہلے جیسی تھی، ویسا ہی اس کو پائیں گے، یوں ہی یہ سلسلہ جاری رہے گا، تا اینکہ ایک دن انشاء اللہ اُن میں سے کسی کی زبان سے نکل جائے گا، تب صبح کو جب آئیں گے تو دیوار کھدی ہوئی حالت میں ملے گی، اسی کے بعد اس دیوار کو ڈھا دینگے اور زمین میں فساد پھیلانے کیلئے نکل پڑیں گے۔"

گو تفسیری روایات کے سب سے بڑے مشہور ناقد ابن کثیر کے نزدیک اس روایت کی سند میں غیر معمولی الجھنیں ہیں، خود حضرت شاہ صاحبؒ کا ذاتی فیصلہ تو یہ ہے کہ مشہور نومسلم یہودی عالم کعب احبار کا یہ قول ہے، اور اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہے۔[1]

[1] تفصیل کیلئے دیکھئے شرح بخاری (جلد ۴ ص ۲۴) ۔ شاہ صاحبؒ کے الفاظ ہیں کہ "بحکم وجدانی انہ لیس بموضوع بل ہو من کعب نفسہ"

بقیہ ص ۲۹ پر

اور جب آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآنی الفاظ ہی نے ان روائتوں کی تصحیح کی گنجائش باقی نہیں رکھی ہو، قرآن خبر دے رہا ہے کہ دیوار میں نقب زنی بھی ان کے بس کی بات نہ تھی، تو پھر اُسی دیوار کے متعلق یہ باور کرنا کہ یاجوج و ماجوج والے اس میں نقب لگانے ہی میں کامیاب نہ ہوئے، بلکہ اس کو دکاء (یعنی ریزہ ریزہ) کرکے رکھ دیا، یہ کچھ سمجھ میں آنے کی بات ہے؟۔

خلاصہ یہ ہے کہ دیوار کا حق تعالیٰ کے مقرر کردہ وقت پر منہدم ہوجانا، یہ بجائے خود ایک الگ واقعہ ہے جس کی اطلاع سورۂ کہف میں دی گئی ہے، اور یاجوج و ماجوج کا کھول دیا جانا، یا اُن کا خروج جس کی پیشین گوئی سورۃ الانبیاء میں کی گئی ہے، یہ دوسرا مستقل واقعہ ہے، اسی لئے ان دونوں واقعات کا ذکر بھی دو مختلف سورتوں میں کیا گیا ہو۔

اس عام غلط فہمی کے ازالہ کے بعد اب میں چاہتا ہوں کہ یاجوج و ماجوج کے متعلق قرآن سے جو معلومات فراہم ہوتے ہیں، اُن کو ایک خاص ترتیب کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کردوں، ذیلاً اس سلسلہ میں معلومات کے دوسرے ذرائع سے بھی کچھ کام لیا جائے گا۔

یہ صحیح ہے کہ سرسری طور پر قرآنی آیات سے گذرنے والوں کو بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن نے "یاجوج و ماجوج" کے ذکر میں حد سے زیادہ اجمال سے کام لیا ہے، لیکن آپ اگر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ باوجود اجمال کے پھر بھی قرآن نے اس قوم کے حال کو چار مختلف ادوار پیریڈ (PEREOD) میں گویا تقسیم کرکے بیان کیا ہے۔

(۱)

اس سلسلہ میں قرآن سب سے پہلے اُن کے جس حال سے ہمیں روشناس کرتا ہے وہ اسی سورۂ کہف کی آیت

ان یاجوج و ماجوج	یاجوج و ماجوج زمین میں بگاڑ
مفسدون فی الارض	پیدا کرنے والے لوگ ہیں۔

کے الفاظ سے سمجھا جاتا ہے۔ ذوالقرنین دو پہاڑوں کے بیچ میں رہنے والی قوم میں جب پہونچے، تو اس قوم نے ان ہی الفاظ میں "یاجوج و ماجوج" والوں کے متعلق ان کے یعنی ذوالقرنین کے دربار میں رپورٹ پیش کی، یہ واقعہ دنیا کے

(صفحہ ۲۵ کا بقیہ حاشیہ) جہاں تک میرا خیال ہے مسلمانوں میں یاجوج و ماجوج کے متعلق زیادہ تر قصے یہودیوں ہی کی کتابوں سے ماخوذ ہیں، اور جیسا کہ قدیم مکاشفات کا قاعدہ تھا کہ استعارے کے رنگ میں لوگ مطلب کو بیان کیا کرتے تھے، اگر یہ سمجھا جاتے کہ یاجوج و ماجوج باہر نکلنے کیلئے باہمی اتفاق و اتحاد کی کوشش میں دن بھر اپنی قوتِ تقریر صرف کیا کرتے تھے، لیکن رات کو جب واپس ہوتے تو اختلافات پھر تروتازہ ہوجاتے، دیوار کو زبان سے چاٹ چاٹ کر پتلی بنانے کا مطلب ممکن ہے کہ یہی ہو، اس زمانہ میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ یورپ کی قومیں اپنے مشکلات کو کمیشن اور مجلس، انجمن وغیرہ کی تقریروں سے حل کرتی ہیں۔ بہرحال ان یہودی روائتوں کا نہ قرآن ہی ذمہ دار ہے، اور نہ اس کے لانے والے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحیح بیانات میں ان کا منشاء ملتا ہے۔ ۱۲

کس خطّہ کا ہے؟ اور کس زمانہ کا ہے؟ عرض کر چکا ہوں اس کا پتہ چلانا آسان نہیں ہے، لیکن واقعہ کہیں کا ہو، اور جس زمانہ میں بھی پیش آیا ہو، اتنا تو بہر حال رپورٹ کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں فساد پیدا کرنا ہی اس قوم کی سب سے بڑی خصوصیت تھی رہے اس افساد یعنی فساد پیدا کرنے کے تفصیلات، تو ظاہر ہے کہ افساد عربی زبان کے لفظ اصلاح کا مدمقابل ہے، بنی آدم کے مختلف افراد میں تعلقات کے سلجھانے اور ان سے امن وامان کے ساتھ رہنے کی کوششوں کا نام اصلاح ہے، اسی کے بالمقابل اس قسم کے حرکات جن سے باہم لوگوں میں پھوٹ اور نفاق، لاگ ڈانٹ، عداوت وبغض کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں، اور ملک کے آبادکاروں میں باہم ایک دوسرے پر اعتماد باقی نہ رہے، ایک دوسرے کی فکر میں لگ جائے، جان ومال، عزت وآبرو لوگوں کی خطرے میں پڑ جائے، یہی شکلیں ہیں جن کی تعبیر اصلاح کے مقابلہ میں فساد کے لفظ سے کی جاتی ہے۔

بہرحال یاجوج وماجوج کی یہ پہلی قومی خصوصیت ہے، قرآن نے ان کی قومی زندگی کے پہلے دور میں اسی خصوصیت یعنی فساد فی الارض (زمین میں بگاڑ پیدا کرنے) کی نشاندہی کی ہے۔

(۲)

دوسرا دور (PEREOD) وہ ہے، جب ذوالقرنین نے اپنی سائنٹفک دیوار قائم کرکے دوسری قوموں تک ان کی رسائی کی راہ بند کر دی تھی، قرآن نے اس دور کے حال کی تعبیر

وترکنا بعضھم یومئذٍ	اور چھوڑ دیا ہم نے بعض انکے بعض
یموج فی بعض ———	کے ساتھ موج مارنے لگے ———

کے الفاظ سے کی ہے، جس کا مطلب یہی ہوا کہ غیر قوموں کے مقابلے میں تو افساد فی الارض (زمین میں بگاڑ پیدا کرنے کی) کارروائیوں کو وہ اختیار کرتے تھے[1] لیکن غیروں سے رُخ جب ان کا دیوار بن جانے کی وجہ سے پھر گیا، تو آپس ہی میں باہم

---

[1] بعض مفسرین نے قرآن ہی کی ایک دوسری آیت یعنی اذا تولی سعیٰ فی الارض لیفسد فیھا ویھلک الحرث والنسل (جب وہ پیٹھ پھیرتا ہے تو دوڑتا پھرتا ہے زمین میں تاکہ فساد پیدا کرے اس میں اور برباد کرتا پھرتا ہے کھیتوں اور مویشیوں کو) اس سے یہ سمجھانا چاہا ہے کہ یاجوج ماجوج والوں کا وطیرہ یہی تھا کہ کھیتوں اور مویشیوں کو برباد کرتے تھے، گویا مفسدین فی الارض ہونے کی خبر یاجوج ماجوج والوں کے متعلق جو دی گئی ہے اس کا یہی مطلب تھا۔ لیکن کھیتوں اور مویشیوں کے برباد کرنے کا ذکر تو مذکورۂ بالا آیت میں فساد فی الارض کے جرم کے بعد کیا گیا ہے، جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کھیتوں اور مویشیوں کے برباد کرنے کے جرم کے سوا افساد فی الارض والا جرم اپنی علیحدہ مستقل نوعیت رکھتا ہے، اور وہ بھی اصلاح اور بنی آدم کے باہمی تعلقات کے سلجھاؤ کے مقابلہ میں ان کے تعلقات کو بگاڑ کر امن وامان اور باہمی اعتماد کے اطمینان کی زندگی کو برباد کرنا ہو سکتا ہے، قرآن ہی میں دوسری جگہ ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جن میں اپنی برتری اور علو کا خبط سما جاتا ہے (بقیہ صـ۳۱ پر)

ایک دوسرے کے ساتھ ایسی زندگی گذارنے لگے، جسے قرآن نے خاص الفاظ یعنی بعضہم یموج فی بعض کے ذریعہ ادا کیا ہے، اس میں ان کے تعلقات کی کس نوعیت اور کیفیت کی تعبیر ہے؟ غیروں سے مایوس ہوجانے کے بعد یاجوج و ماجوج والے زندگی کے اس دور میں لڑتے بھڑتے اور باہم دست و گریبان رہتے تھے۔ اس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے عربی زبان میں بیسیوں تعبیریں مل سکتی تھیں۔

اسی طرح میل ملاپ باہمی امداد و مواساۃ مؤانست کی زندگی کی تعبیر کے لئے بھی اس زبان میں الفاظ کی کمی نہ تھی لیکن تعبیر و بیان کے ان دونوں طریقوں کو چھوڑ کر قرآن نے بعضہم یموج فی بعض کے الفاظ جو یہاں استعمال کئے ہیں، واضح طور پر ان دونوں حالتوں میں سے کسی خاص حالت کو متعین کرنا دشوار ہے۔

لغتہً موج کے لفظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تلاطم اور طوفان کے وقت سمندر اور دریا میں موجوں کی جو کیفیت ہوتی ہے، یعنی سمندر کی سطح بجائے ساکن کے صرف لرزش و اضطراب، بے چینی اور بے قراری کی تصویر بن جاتی ہے، اور لامحدود بے شمار موجیں اُٹھ اُٹھ کر ایک دوسرے کو ڈھکیلتی ہی چلی جاتی ہیں، اور اسی طرح ہر پچھلی موج اگلی موج کو آگے بڑھاتی ہی چلی جاتی ہے۔ ہم ان موجوں کے متعلق یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان میں ایک دوسرے پر چڑھ جانا بھی چاہتی ہے، اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان میں ہر ایک کی ہستی دوسری کی ہستی سے وابستہ بھی ہے، اور ایک دوسرے کو آگے بڑھنے اور بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی بھی چلی جاتی ہے، آپس میں موجیں ایک دوسرے سے گویا لڑتی بھی ہیں، لیکن ان میں ہر ایک کی بقا کی ضامن بھی باہم یہی موجیں، اور ان کے قوی تعلقات ہی ہوتے ہیں۔

الغرض بعضہم (یومئذ) یموج فی بعض کے الفاظ سے صرف یہ مطلب نکالنا کہ غیروں سے ہٹ جانے کے بعد یاجوج و ماجوج والے باہم ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے ہی رہتے تھے، یا اس کے بالمقابل یہ سمجھنا کہ جیسے سمندر کی موجوں کا وجود باہم ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ و ہم رشتہ رہتا ہے، اور ہر موج دوسری موج کو آگے بڑھاتی ہے، اسی طرح یاجوج و ماجوج والے بھی آپس میں بجائے دست و گریبان رہنے کے ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا تعلق رکھتے تھے، یعنی غیروں میں تو بجائے اصلاح اور سنوار کے فساد اور بگاڑ پیدا کرتے تھے، لیکن آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے باہم ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ ان دونوں مطالب میں سے کسی ایک مطلب کے ساتھ قرآنی الفاظ اور تعبیر کو محدود کر دینا غالباً صحیح نہ ہوگا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اگر یہی سمجھانا قرآن کا مقصود تھا، تو ان دونوں مطالب میں سے ہر ایک کی تعبیر کے لئے

(صہ ۳ کا بقیہ حاشیہ) انکی طرف بھی فساد ہی کے جرم کو منسوب کیا گیا ہی۔ فرمایا گیا ہے: "تلک الدار الآخرۃ نجعلها للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا" جس سے معلوم ہوا کہ اپنی برتری اور حاکمانہ اقتدار کو قائم رکھنے کیلئے لوگوں میں پھوٹ ڈالنا اسی پالیسی کو یہ لوگ اختیار کر لیتے ہیں۔ ۱۲

عربی زبان میں جیساکہ جاننے والے جانتے ہیں، سرمایہ کی کیا کمی تھی؟ پھر جب ان ساری تعبیروں کو ترک کر کے ایک مخصوص تعبیر اس موقع پر قرآن میں جو اختیار کی گئی ہے، ہمیں اس کی مصلحت سے چشم پوشی نہ کرنی چاہیئے، اور لاپروائی سے کام لیتے ہوئے ان دونوں مطالب میں سے کسی ایک مطلب کا سرسری ذکر کر کے آگے بڑھ جانا قرآنی الفاظ کی ناقدری ہوگی۔ ہمیں اس ذمہ داری کو محسوس کرنا چاہیئے کہ خالقِ کائنات کے کلام پر ہم غور کر رہے ہیں، ہر بولنے والے آدمی کے کلام پر اس لاہوتی کلام کو قیاس کرنا مناسب نہ ہوگا۔

سوال یہی ہوتا ہے کہ پھر ان الفاظ کا مطلب کیا سمجھا جائے؟ ظاہر ہے کہ موج کا لفظ سمندر اور دریا کی متلاطم سطح اور اس پر اُبھرنے والی موجوں کی جس تصویر کو بے نقاب کر رہا ہے، اسی تصویر کو ہم اپنے سامنے رکھ کر قرآن جو کچھ سمجھانا چاہتا ہے اُسے کیوں نہ سمجھیں، کوئی مانے یا نہ مانے لیکن فقیر کا ذہن تو یہی پاتا ہے کہ غیروں سے ہٹ جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں یاجوج و ماجوج کی قوم کی زندگی صرف اضطراب اور بے قراری، ہنگامہ اور لرزش و جنبش بن کر رہ گئی تھی، ایسے مشاغل میں وہ مبتلا تھے جن میں صبح و شام، شب و روز تگ و دو، دوڑ دھوپ، آمد و رفت، چلنے پھرنے، دوڑنے بھاگنے کے ہنگامے ہی برپا رہتے ہیں۔

یہ تو ان کی عام زندگی کا غالباً نقشہ تھا، اور باہم اس قوم کی مختلف ٹولیاں ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھی بھی رہتی تھیں، لیکن اسی کے ساتھ ان میں کوئی ٹولی دوسری ٹولی کو کلیۃً ختم کرنے کا بھی فیصلہ اسلئے نہیں کر سکتی تھی کہ اس میں خود اپنے وجود کے اختتام کا خطرہ اس کو محسوس ہوتا تھا، کچھ حالات اس قوم کے ایسے تھے، کہ نہ ایک دوسرے سے کلیۃً الگ ہی ہو سکتے تھے، اور نہ ان میں کوئی دوسرے سے ٹوٹ کر یا جدا ہو کر فنا ہونے ہی کے لئے تیار تھا، گویا ان میں وہی تعلقات قائم تھے جو باہم دریا کی موجوں میں ہوتے ہیں، بایں طور کہ باہم ایک دوسرے کو ڈھکیلتے بھی رہتے تھے، لیکن اسی کش مکش میں ارادی یا غیر ارادی طور پر ایک کو دوسرے سے آگے بڑھ جانے میں مدد بھی مسلسل ملتی چلی جاتی تھی۔

اسی کے ساتھ میرا دھیان بعضھم یومئذ یموج فی بعض کے الفاظ سے کچھ ادھر بھی جاتا ہے کہ تبعیض و تجزی یعنی باخود ہا یاجوج و ماجوج کی تقسیم بھی محدود نہ تھی، بلکہ موجوں کا جو حال ہوتا ہے کہ اُن کو کوئی گنا چاہے تو گن نہیں سکتا، ان میں بڑی موجیں بھی ہوتی ہیں اور چھوٹی بھی، کچھ یہی حال معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں اُن کا ہو گیا تھا، کہ ان گنت، بے شمار ٹولیوں میں وہ بٹے ہوئے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ غیروں میں تو فساد اور بگاڑ پیدا کرنا یہی یاجوج و ماموج والوں کا شیوہ تھا، اور خود باہم ایک دوسرے کے ساتھ موجی تعلقات رکھتے تھے۔

اب تک قرآن کی دو اطلاعوں سے اس قوم کی ان ہی دو خصوصیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ باقی اُن کی زندگی کے

دوسرے دور کو بیان کرتے ہوئے شروع میں ترکنا (چھوڑ دیا ہم نے) کا لفظ جو پایا جاتا ہے کیا اس سے بھی کسی خاص واقعہ اور یاجوج و ماجوج والوں کے متعلق کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج والوں کے متعلق اتنی بات تو بہرحال اجتماعی ہے کہ یہ لوگ نہ دیوزادے ہیں اور نہ ان کا تعلق جن وغیرہ جیسی ہستیوں سے ہے، بلکہ حضرت آدم (علیہ السلام) ہی کی اولاد میں بالاتفاق ان کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔ بعض ناقابل اعتبار روائتوں میں کچھ اس قسم کا اشارہ پایا جاتا ہے جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ماں کی طرف سے حضرت حوا پر یاجوج ماجوج کی نسل ختم نہیں ہوتی، بالفاظ دگر دادیہال تو ان کی وہی ہے جو عام انسانی نسلوں کی ہے، لیکن نانیہال میں کچھ فرق پیدا ہو گیا ہے[1]۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ سارے قصے سب تخمینی ہیں، اور کوئی فیصلہ قطعی ان معاملات میں دشوار ہے، تاہم یاجوج و ماجوج کے متعلق رطب و یابس روائتوں کا جو ذخیرہ کتابوں میں پایا جاتا ہے، اسی میں ایک روایت کے اندر یہ الفاظ بھی ملتے ہیں:-

یاجوج وماجوج لم یکن فیهم صدیق قط ولا یکون ابداً۔	یاجوج ماجوج میں نہ کبھی کوئی "صدیق" ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔

(درمنثور) ص۲۵۰ ج۴

"صدیق" ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ سے خصوصی تعلق رکھنے والوں کے ایک خاص طبقہ کی قرآنی تعبیر ہے حضرت یوسف علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کے لئے بھی اسی صدیق کے لفظ کو قرآن نے استعمال کیا ہے، ہر قسم کے شکوک و شبہات سے جس کی تصدیق اور جس کا یقین کلیتہً پاک ہو، بظاہر صدیق اس کو کہتے ہیں۔

بہرحال "ترکنا" (چھوڑ دیا ہم نے) کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں جب وہ سراپا اضطراب،

---

[1] یہ میرا نہ ذاتی خیال ہے اور نہ میری اپنی تراشی ہوئی کوئی تعبیر، بلکہ حضرت شیخ اکبر محی الدین بن عربی (رحمۃ اللہ علیہ) کے الفاظ سے خیال بھی اور تعبیر بھی ماخوذ ہے، فتوحات کعبہ میں انھوں نے لکھا ہے، ابن حجر نے "فتح الباری" میں بھی اس کو بایں الفاظ نقل کیا ہے کہ "یاجوج وماجوج من اولاد ادم لا من حواء عند جماهیر العلماء" (ج۱۳ ص۹۱ فتح الباری) لفظی ترجمہ جس کا یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج والے آدم کی ایسی اولاد ہیں جو حوا سے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ شیخ نے اسی کو جمہور علماء کا خیال قرار دیا ہے، ابن حجر کو ان کے اس دعویٰ پر تعجب ہوا ہے، لیکن العلماء سے مراد علماء کشف و شہود ہوں، تو شیخ کے کلام کی توجیہ کی ایک صورت پیدا ہو سکتی ہے، خود خاکسار کو کشف و شہود سے تعلق نہیں، لیکن بعض رویا میں خود اس کو بھی کچھ یہی دکھایا گیا تھا، اور اسی لئے علماء کا مطلب میری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ علماء رسوم مراد نہیں ہیں، آگے بھی اپنے اس خواب کے بعض اجزاء کی طرف اشارہ کروں گا۔ ۱۲

اور ہمہ تن حرکت و گردش بن کر رہ گئے تھے، قدرت نے بھی اُن کو چھوڑ دیا تھا، اور آسمانی راہ نمائی نے انکی دستگیری نہیں کی، اسی لئے ان کی تاریخ کا یہ عہد نبوات و رسالات اور ان کے آثار سے بالکل خالی ہو گیا، اور ایسی قوم یا اُمت جو آسمانی راہ نمائی کی روشنی سے محروم ہو، مجبور ہے کہ اپنی شخصی، خاندانی، قومی، عام انسانی تعلقات کے لحاظ سے اپنے آپ ہی قوانین بنائے، قدرت کی چھوڑی ہوئی، یا متروک اللہ قوم، خود سوچئے کہ اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتی ہے۔[۱]

---

[۱] واقعہ یہ ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) اور ان کے عہد کے مشہور طوفان کا ذکر فرماتے ہوئے قرآن میں ہے "وجعلنا ذریته هم الباقین" (ہم نے نوح ہی کی نسل کو باقی رہنے دیا) اس سے سمجھا جاتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی موجودہ نسل کا نسب نامہ نوح علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے، لیکن قرآن ہی کی سورۃ ہود میں یہ آیت بھی ملتی ہے یعنی "قیل یا نوح اهبط بسلام منا وبرکات علیک وعلی امم ممن معک وامم سنمتعهم ثم یمسهم منا عذاب الیم" (یعنی کہا گیا کہ اے نوح اتر جا سلامتی ہو تیرے ساتھ میری جانب سے، اور برکتیں تجھ پر بھی ہوں اور اُن اُمتوں پر بھی ہوں جو تیرے ساتھ ہیں، اور کچھ امتیں ہیں جنھیں آئندہ زمانہ میں ہم متاع اور سرمایہ بخشیں گے، پھر اُن کو پکڑے گا ہماری طرف سے دردناک عذاب) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام اور کشتی میں جو اُن کے ساتھ تھے۔ اُن کے سوا بھی کچھ امتیں ایسی ہیں جنھیں آئندہ زمانہ میں دنیاوی مال و متاع سے استفادہ کا موقع دیا جائے گا، پھر ان کو عذاب پکڑے گا۔ جس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں کو جو کچھ دیا جائے گا، اس سے غلط کام لیں گے۔ بہرحال قرآن کی دونوں آیتوں کو پیش نظر رکھ کر اگر یہ سمجھا جائے کہ بقاء کی خبر نوح کی ذریت ہی کے متعلق جو دی گئی ہے، یہ ان لوگوں کی حد تک محدود ہے جن کی طرف نوح علیہ السلام مبعوث تھے، گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ اُن لوگوں میں صرف نوح علیہ السلام کی ذریت ہی طوفان سے بچ کر رہ گئی، اور آئندہ زمانے میں مال و متاع کا وعدہ جن کے متعلق قرآن میں کیا گیا ہے، یہ دوسرے لوگ تھے۔ اسی موقع پر مذکورۂ بالا آیت کے بعد فرمایا گیا ہے، کہ یہ غیب کی خبریں ہیں، نہ تم ہی ان کو جانتے تھے اور نہ تمھاری قوم ہی میری وحی کرنے سے پہلے ان سے واقف تھی، یعنی "ذلک من انباء الغیب نوحیها الیک ما کنت تعلمها انت ولا قومک من قبل هذا" کا جو خلاصہ ہے، یہ حصہ بھی قابل توجہ ہے، نوح علیہ السلام کے قصے سے جیسا کہ معلوم ہے اور جاہلیت کے کلام سے بھی پتہ چلتا ہے کہ عرب کے باشندے واقف تھے، جب یہود و نصاریٰ سے ان کے تعلقات تھے تو ناواقف رہنے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے، خصوصاً طوفان کا یہ قصہ ایسا قصہ ہے جس کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں دنیا کی تمام قوموں میں پایا جاتا ہے، حتیٰ کہ امریکہ والوں میں بھی اور گمنام جزائر کے باشندوں میں بھی، ایسی صورت میں قرآن کا یہ دعویٰ کہ نہ تم ہی واقف تھے نہ تمھاری قوم، اس کا تعلق بظاہر خبر کی مجموعی حیثیت سے معلوم ہوتا ہے، خصوصاً یہ خبر کہ نوح کے ساتھیوں کے سوا بھی کچھ امتیں ہیں جنھیں آئندہ دنیا سے استفادہ کا موقع دیا جائے گا۔ یہ قطعاً نئی خبر ہے، قرآن ہی میں سب سے پہلے اس کو ہم پاتے ہیں، اب اسی کے ساتھ سورۂ الحدید کی اس آیت میں غور کیجئے، یعنی: "لقد ارسلنا نوحاً وابراهیم وجعلنا فی ذریتهما النبوة والکتاب" (ہم نے نوح کو اور ابراہیم کو رسول بنایا، اور ان ہی دونوں (نوح و ابراہیم) کی نسل کو نبوت اور کتاب ہم نے دی) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کی نسل میں جو امتیں نہ تھیں اُن کو نبوت اور کتاب سے محروم رکھا گیا، گویا ترکنا کے (بقیہ صـ۳۵ پر)

بہرحال عام طور پر تو معمورۂ ارض پر پھیلی ہوئی انسانی نسلوں کی موروثی روائتوں اور تاریخی شہادتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عام معاشی ضرورتوں کی فراہمی کے لئے یہاں ان کو حواس (بینائی شنوائی وغیرہ کی قوتوں) اور ان حسی وادراکی قوتوں کے معلومات کے استعمال کے واسطے عقل دیگئی ہے، اُن ہی کے ساتھ بنیادی سوالات زندگی کے متعلق انسانی فطرت میں جو پیدا ہوتے رہتے ہیں، یعنی ہم کہاں سے آئے ہیں، کہاں جارہے ہیں، اور یہاں ہمارے آنے کی اور چند دن کے قیام کے بعد روانہ ہوجانے کی آخر غرض کیا ہے، یعنی وہی ابتداء، انتہاء، وجود کے مدعا کے سوالوں کے جواب کا علم عقل وحواس کے سوا ایک اور مستقل علمی ذریعہ (وحی ونبوت) کی راہ سے عطا کیا گیا ہے۔

لیکن اگر کسی اُمت یا قوم کی تاریخ علم کے اس مستقل ذریعہ کے ذکر سے خالی ہے، اور اسی لئے زندگی کے مذکورۂ بالا بنیادی سوالوں کے متعلق قطعی فیصلہ کے علم ویقین سے اپنے آپ کو وہ محروم پاتی ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے سوا اور گنجائش ہی کس بات کی تھی، ایسا آدمی جو بینائی کی قوت سے محروم ہو، اگر روشنی کے متعلق صحیح علم اپنے اندر نہیں پاتا، تو آخر وہ بیچارہ کرے کیا؟۔ ہر چیز کے جاننے کا قدرت ہی نے ایک خاص ذریعہ مقرر بنا دیا ہے، آواز کو ہم آنکھوں سے، یا

(صفحہ ۳۴ کا بقیہ حاشیہ) مجمل لفظ میں جو اشارہ یہاں پایا جاتا ہے، ہم اس اشارے کو ان تفصیلات سے سمجھ سکتے ہیں، باقی نوح کے سوا کچھ ہنیں جو رُگئی تھیں قرآن کے رو سے آئندہ زمانہ میں تمتع کا موقع جن کو ملنے والا تھا۔ اس کے متعلق کچھ اشارے بائبل میں ملتے ہیں۔ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل (قائن) میں جیسا کہ معلوم ہے قائن (قابیل) نے ہابیل کو مار ڈالا (کہتے ہیں کہ ہبل نامی بت عرب میں جو پوجا جاتا تھا وہ اسی ہابیل کی مورتی تھی۔ واللہ اعلم) بہرحال قائن کے متعلق بائبل میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے قائن کو زمین کا لعنتی قرار دیا، تب قائن نے کہا کہ یہ سزا میری برداشت سے باہر ہے، اور بولا کہ: "دیکھ! آج تو نے مجھے روئے زمین سے نکال دیا ہے، میں تیرے حضور سے روپوش ہو جاؤں گا" (پیدائش ۴/۱۴) ظاہر ہے کہ روئے زمین سے مراد زمین کا وہ آباد حصہ ہی ہوسکتا ہے جسمیں عام آبادی آباد تھی، اور طوفان نوح میں بظاہر یہی روئے زمین والے آدمی بجز ذریت نوح کے ہلاک ہوگئے، اور قائن روپوش ہوکر زمین کے ایسے حصوں میں جا کر چھپ گیا جو عموماً انسانی سہولتوں سے خالی تھیں، پھر آگے بائبل میں بیان کیا گیا ہے، کہ "نود نامی علاقہ میں قائن جا بسا" واللہ اعلم یہ نود کس علاقہ کا نام ہے، اسی موقع پر یہ بھی ہے، کہ "قائن خدا کے حضور سے نکل گیا"، پھر بائبل میں اطلاع دیگئی ہے کہ "قائن اپنی بیوی کے پاس گیا وہ حاملہ ہوئی" یہاں یہ پیچیدہ سوال ہے کہ جب وہ اُس جماعت سے روپوش ہوگیا جسمیں آدم اپنی اولاد کے ساتھ تھے، تو قائن کو عورت کہاں سے ملی، نسلِ انسانی اُسوقت تک پھیلی نہ تھی، اور جس علاقہ میں آدم تھے اُسی علاقہ تک محدود تھی۔ خیر قائن کا بیٹا لکھا ہے کہ حنوک نامی پیدا ہوا، اور حنوک کی چوتھی پشت میں لمک پیدا ہوا، لمک نے دو عورتوں سے نکاح کیا، ہر ایک سے بائبل میں لکھا ہے ایک ایک بیٹا لمک کے پیدا ہوا، جن میں ایک بیٹا بین اور بانسلی بجانے والوں کا باپ تھا، اور دوسرا بیٹا تیز ہتھیاروں کا بنانے والا تھا، یہی ہتھیاروں بنانے والے کا نام تو بائبل میں بلقائن بتایا گیا ہے، گویا گانا بجانا اور مردم کشی کے آلات کے موجد قائن ہی کی اولاد تھی۔ مشرق سے مغرب کی طرف جانے والوں کو ملقان نامی علاقہ سے گذرنا پڑتا ہے، یہ ساری باتیں قابل توجہ ہیں۔ ۱۲

رنگ کو ہم کانوں سے جاننا چاہیں گے، تو کیا اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں، پھر زندگی کے بنیادی سوالوں کے حل اور ان کے جوابات کے جاننے کی جو قدرتی راہ ہے یعنی وحی و نبوت اس سے محروم رہ کر صرف حواس و عقل کے زور سے کوئی قطعی غیر مشکوک فیصلہ ان سوالوں کے متعلق اپنے اندر کیسے پا سکتا ہے۔ روایتوں میں جو آیا ہے، کہ "ان میں نہ کبھی کوئی صدیق ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا"؛ اس کا مطلب یہی تو ہے، صدیق کے معنی ہی یہ ہیں کہ ان بنیادی سوالوں کے جوابوں کا ایسا غیر مشتبہ یقین و علم اس کے اندر پایا جائے، جو ہر قسم کے شکوک و شبہات کی آلائشوں سے پاک ہو۔ اور ان جوابوں کے علم و یافت کی جو قدرتی راہ ہے، اس سے محروم رہ جانے والوں کے لئے اس علم و یقین تک رسائی کی آخر شکل ہی کیا ہے، عقل کے زور سے اس کو پانا بھی چاہیں گے، تو ان کی مثال اُس بہرے کی ہوگی، جو سونگھ کر، یا چھو کر آواز کے سُننے کی کوشش کر رہا ہو۔

باقی ایسی قوم یا قومیں دنیا میں کبھی پائی گئی ہیں، یا اب بھی پائی جاتی ہیں، اس کے لئے چاہئے کہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے، اور موجودہ قوموں کی قومی روایات کا جائزہ لیا جائے[1]۔

البتہ اس موقع پر یہ ایک معقول سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم و یقین کے ایسے ناگزیر، اور اہم ترین ذریعہ سے محرومی کی اس مہیب، ہولناک، انجام سوز، عاقبت گداز سزا کی مستحق یہ قوم کس جرم اور قصور کی وجہ سے قرار پائی؟ جس کا نتیجہ یہی ہے، اور اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا تھا کہ زندگی کا یہ سارا سفر بے معنی بلکہ پاگلوں کا سفر بن کر رہ جاتا ہے، گویا کسی ایسے مسافر کا سفر ہے، جو نہ یہ جانتا ہے کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے، اور نہ اسی سے واقف ہے کہ کہاں جا رہا ہے، اور یہ کہ کس لئے وہ چل رہا ہے، اس سے بھی آگاہ نہیں ہے، مگر پھر بھی چلا ہی جا رہا ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو عالم کا یہ سارا نظام ہی صرف دیوانے کا ایک لاحاصل خواب پریشاں بن کر رہ جاتا ہے کسی جبلّی[2] نقص، یا اصل سرشت میں کوتاہی کے دعوےٰ سے

---

[1] ہمارے بزرگ، جامعہ عثمانیہ کے مشہور استاذ، فاضل علامہ مولانا عبدالباری صاحب ندوی فرماتے تھے، کہ یورپ کی قوموں کی تاریخ کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے میں نے کیا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ کسی زمانہ میں ہم اس قوم کے اندر نبوت و وحی کا ذکر نہیں پاتے۔ بعد کو باہر سے جب عیسائی مذہب ان میں آیا تو چاہئے تھا کہ اب وہ علم کے اس خاص ذریعہ سے مانوس ہو جاتے، لیکن بجائے اس کے وحی و نبوت کی تشریح کے ایسے پیرایہ پر اصرار بلیغ انکی طرف سے کیا جا رہا ہے، جس کا حاصل یہی ہو سکتا ہے کہ علم کے عام ذرائع عقل و حواس ہی کے جھمیلے میں اس کو بھی گم کر دیا جائے، یا پھر وہم مالیخولیا، جنیا وغیرہ جیسے دماغی امراض کے ذیل میں وہ شریک ہو جائے۔ ۱۲

[2] مطلب یہ ہے کہ وحی و نبوت سے مانوس و مالوف ہونے کے لئے جن فطری رجحانات کی ضرورت ہے، اُن ہی سے گویا یہ قوم خالی ہے، پھر بکروں، یا بیلوں کو جیسے نہیں سمجھایا جا سکتا ہے کہ وحی کس چیز کا نام ہے، یا نبوت و رسالت سے کیا مطلب ہے، یہی حال اس قوم کا بھی ہے۔ پچھلے ایک فٹ نوٹ کی وہ بات یاد ہوگی کہ قابیل (قائن) جب روئے زمین سے نکالا گیا، اور آدم علیہ السلام سے روپوش ہوا، اور خدا کے حضور سے نکل گیا (بقیہ صفحہ ۳ پر)

اس کی توجیہ اوّلاً آسان نہیں ہے، اور اس قسم کی فطری کوتاہیوں کا اقرار بھی کر لیا جائے، تو آگے بڑھ کر پھر وہی سوال واپس ہو جاتا ہے کہ قدرت نے انسانی نسل میں پیدا کر کے اس کوتاہی کو ان میں باقی کیوں رہنے دیا۔

بلکہ اصل یہی ہے کہ بنی آدم کے سارے نوعی اقتضاؤں کو جب ہم ان ہی پاتے ہیں، وہ بھی اسی طرح دیکھتے ہیں جیسے انسانوں کی ساری دوسری نسلیں دیکھتی ہیں، اسی طرح سنتے ہیں، جیسے سب سنتے ہیں، اسی طرح سوچتے ہیں جیسے سب سوچتے ہیں۔ ان ہی چیزوں کی ضرورت وہ بھی محسوس کرتے ہیں، جن کی ضرورت سب محسوس کرتے ہیں۔

الغرض اندر ہو، یا باہر، پانے والوں نے جب سب کچھ ان میں بھی پایا ہے، جو کچھ دوسروں میں پایا جاتا ہے، یا پایا جا سکتا ہے، تو پھر کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، وحی و نبوت سے ان کی لاپروائیوں، اور ان کی اجنبیت و توحش کو جبلت کے کسی نقص یا کوتاہی کا نتیجہ قرار دیا جائے، بلکہ یقیناً اس میں ان کے ارادی طغیان اور سرکشی کے ان احساسات کو دخل ہے جنھیں بے باکانہ مشاغل کے انہماک نے ان میں پیدا کر دیا ہے۔

کسی مجازاتی و مکافاتی ہمہ جا، ہر وقت نگراں قوت کے حضور کا خیال ان کی من مانی خواہشوں، اور رعنان گسیختہ امنگوں اور ارمانوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھا، گریز کی واحد منطق یہی ہو سکتی تھی کہ جس ذریعہ سے اس قوت کی نگرانی و حضور کا دباؤ انسانی فطرت محسوس کرتی ہے، اسی سے انجان بن جانے کی ذہنیت کی پرورش میں اتنا مبالغہ کیا جائے، کہ کوئی اس کا مطلب سمجھانا بھی چاہے تو سمجھنے سے اپنے آپ کو معذور بنایا جائے۔

الغرض سارے انسانی اقتضاؤں کے اشتراک کے ساتھ ساتھ اچانک انسانی فطرت ہی کے اسی ایک خاص اقتضاء کے ساتھ ان کا یہ برتاؤ کسی اضطرار اور بے چارگی کا نہیں، بلکہ ان کے اختیار و ارادہ کی غمازی کر رہا ہے،

(صفحہ ۳ کا بقیہ حاشیہ) تو روپوشی کے اس زمانہ میں عورت کے پانے کا امکان یقیناً اُس کے لئے باقی نہ رہا تھا، مگر بائبل میں خبر دی گئی ہے کہ وہ عورت کے پاس گیا، وہ حاملہ ہوئی، اور اسی سے قائن کی نسل جاری ہوئی، یہ عورت اس کو کہاں ملی؟ میں تو اس کو خواب و خیال ہی سمجھتا ہوں کہ بجائے انسانی عورت کے بندروں کی ایسی مادہ سے جو انسانوں سے شکلاً و صورۃً زیادہ قریب تھی اسی سے قائن نے نسل کشی کا کام لیا، لیکن کیا کہا جائے کہ دیکھنے والوں کو کچھ اسی قسم کا خواب دکھایا گیا ہے، تخیلات کے بدل جانے کی وجہ سے قائن کی آئندہ نسلوں میں کچھ کوتاہیاں فطرۃً رہ گئیں، مگر ایک فائدہ بھی ہوا کہ غیب سے کلیتہً منقطع ہو کر صرف عالمِ محسوس ہی میں ان کی ساری توانائیاں جذب ہو گئیں۔ گانے بجانے کے آلات اور مردم کشی کے اوزار کی ایجاد کا سہرا غالباً اسی ایک سوئی کی بدولت انکے سر بندھا، (واللہ اعلم بالصواب) اسی لئے شاید پچھلے دنوں یورپ میں یہ غلغلہ بلند ہوا کہ انسانی شجرۂ نسب کی انتہا سائنس کے رو سے بندروں پر ہوئی ہے، یوں بھی لوگ کہتے ہیں کہ خچر کو دیکھ کر بہ یک وقت گھوڑے کیساتھ گدھے کی، اور گدھے کیساتھ گھوڑے کی صورت جھانکنے لگتی ہے۔ اسی طرح بعض خاص نسلوں کے افراد کو دیکھ کر عوام کے دل میں آدمی کیساتھ بندروں کا، اور بندر کیساتھ انسان کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ للموئے وغیرہ الفاظ سے اپنے اس احساس کا عوام اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ ۱۲

جان سکتے ہیں، لیکن نہ جاننے کا فیصلہ ہی کر کے جو بیٹھ گئے ہوں ان کے جاننے کی صورت ہی کیا باقی رہتی ہے[1]۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کے قومی مزاج کے اسی طاغوتی فیصلہ نے ان کو وحی و نبوت سے محرومی کی سزا کا سزاوار ٹھہرایا، جب وہ طے ہی کئے ہوئے تھے کہ ہم نہیں سنیں گے تو سنانے والوں کو ان میں بھیجنے کا حاصل ہی کیا ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ گو "ترکنا" کے قرآنی لفظ کو چنداں اہمیت نہیں دی گئی، چنداں کیا معنی؟ سوال ہی نہیں اٹھایا گیا کہ اس خاص لفظ کو قرآن نے اس موقع پر کیوں استعمال کیا ہے، اسی لئے اس اجمال کی تفصیل میں مجھے ذرا زیادہ دراز نفسیوں سے کام لینا پڑا، ورنہ پہلے سے کتابوں میں اس کے متعلق اگر کچھ مواد موجود رہتا، تو چند الفاظ ہی ان کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کافی ہو سکتے تھے۔

قرآن سے یاجوج و ماجوج والوں کی زندگی کے دوسرے دور کے جن خصوصیات کا پتہ چلتا ہے، وہ تو یہی تھے۔ اب آیئے ان ہی لوگوں کی زندگی کے تیسرے دور پر۔

(۳)

دوسرے دور میں بتایا گیا تھا، کہ " باہم ایک دوسرے میں موج زن رہے" گویا غیر قوموں سے اس دور میں ان کا رشتہ منقطع ہو گیا تھا، لیکن سورۂ کہف میں تو نہیں، بلکہ سورۂ الانبیا کی اس مشہور آیت سے یعنی :۔

---

[1] اس موقع پر جاحظ کی مشہور ادبی کتاب " البخل و البخلاء " کے ایک لطیفہ کا خیال آرہا ہے :۔ "بغداد کے ایک تاجر کے پاس قزوین کا کوئی تاجر ہر سال مہمان بن کر مہینوں قیام کیا کرتا، میزبان بھی میزبانی میں خاطر و مدارات کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا تھا، قزوینی مہمان ہمیشہ بغدادی میزبان سے آرزو کرتا کہ آپ کبھی قزوین نہیں آتے، میرے دل کی حسرت دل ہی میں رہ جائے گی، برسوں کے بعد ایک دفعہ بغدادی میزبان قزوین کسی ضرورت سے پہونچا، اپنے قزوینی دوست کا خیال آیا، دوکان پر پہونچا، خیال تھا کہ دیکھتے کے ساتھ قزوینی دوست اچھل پڑے گا، سامنے اپنی دکان پر دیکھا کہ بیٹھا ہوا ہے، بغدادی نے سلام کیا، لیکن اُدھر سے جواب بھی نہ ملا، خیال ہوا کہ سفر کے لباس میں ہونے کی وجہ سے قزوینی دوست نے پہچانا نہیں، عبا اُتار دی اور سلام کیا، مگر وہی بے رخی اب بھی باقی تھی، عمامہ اتار دیا، مگر ادھر پھر بھی کسی قسم کی جنبش نہ ہوئی، صرف کرتے اور پائجامے میں جیسے گھر میں رہتا تھا، بے تکلف ہو کر کھڑا ہو گیا، تب قزوینی دوست نے کہا :۔ ۶

"اگر از چرمت بدر آئی من ترا نمی شناسم"

یعنی اپنی کھال اتار کر بھی میرے سامنے تم کھڑے ہو جاؤ گے تب بھی میں تمھیں نہیں پہچانوں گا"

جب نہ پہچاننے کا فیصلہ ہی قزوینی کر چکا تھا تو ظاہر ہے کہ اب اس کے بعد پہچاننے کے لئے گنجائش ہی کیا باقی رہ گئی تھی۔

حتی اذا فتحت یاجوج وماجوج وھم من کل حدب ینسلون۔ تا اینکہ کھول دیئے گئے یاجوج وماجوج اور وہ ہر حدب سے تیزی کے ساتھ چل نکلے۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر قوموں سے منقطع اور بے تعلق ہوجانے کے بعد، پھر ان کو ایک موقع غیر قوموں کی طرف رُخ کرنے کا دیا جائے گا، اور اسی کو میں یاجوج و ماجوج والوں کی قومی زندگی کا تیسرا دور قرآن کے رو سے خیال کرتا ہوں۔ چونکہ اس دور کا ذکر سورۂ کہف میں نہیں، بلکہ عرض کرچکا ہوں کہ یہ سورۂ الانبیاء کی آیت ہے، اسلئے اُس کے تفصیلات کا ذکر آئندہ کروں گا۔

پہلے چوتھے دور کے متعلق جس کا تذکرہ سورۂ کہف میں کیا گیا ہے، اُسے پڑھ لیجئے۔

(۴)

یہ چوتھا دور اُن کا میرے خیال میں وہی ہے جسے ہم سورۂ کہف کی اس آیت میں پاتے ہیں یعنی:-

ونفخ فی الصور فجمعناھم جمعا (سورۂ کہف) اور پھونک دیا جائے صور، پھر ہم ان کو (یاجوج و ماجوج) کو اچھی طرح سمیٹ کر سمیٹ لیں گے۔

مطلب وہی ہوا کہ نفخ صور کے بعد جیسے ساری انسانی نسلیں، اُن کے اگلے پچھلے، بڑے چھوٹے، مرد و عورت سب ہی دوبارہ جمع کئے جائیں گے، اسی طرح "یاجوج و ماجوج" بھی اس چوتھے دور میں اپنے آپ کو پائیں گے کہ ایک ایک کرکے اوّل سے آخر تک، سب اکٹھے کرلئے گئے ہیں۔

اس چوتھے دور اور تیسرے دور میں فرق یہ ہے کہ چوتھے دور کا ظہور تو قرآن کے رو سے نفخ صور یعنی قیام قیامت کے وقت ہوگا، برخلاف اس کے غیر قوموں سے منقطع اور بے تعلق ہوجانے کے بعد یاجوج و ماجوج والوں کو پھر اُنکی طرف جس زمانہ میں کھولا جائے گا۔ قرآن ہی کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ صورت حال قیامت کے قائم ہونے سے پہلے پیش آئے گی۔

آخر خود سوچئے، یاجوج و ماجوج کے کھلنے کے بعد ارشاد ہوا ہے، کہ:-

واقترب الوعد الحق فاذا ھی شاخصة ابصار الذین کفروا یاویلنا قد کنا فی غفلة۔ (سورۂ الانبیاء) اور سچا پکا وعدہ (قیامت کا) بہت زیادہ نزدیک ہوگیا، پس اچانک اُن لوگوں کی نگاہیں جنھوں نے انکار کی راہ اختیار کی اوپر کی طرف اُٹھ جائینگی (وہ کہیں گے) کہ ہم پر افسوس، ہم غفلت میں تھے۔

حاصل جس کا یہی ہے کہ یاجوج و ماجوج کے کھل پڑنے کے بعد بھی جب اس سچے اور پکے وعدے یعنی قیام قیامت کے وقوع پذیر ہونے کی نہیں بلکہ قریب آجانے کی خبر دی جارہی ہے، تو یقیناً یاجوج و ماجوج کے کھلنے کے اس زمانے کو

قیامت کے قائم ہونے سے پہلے بدرجہ اولیٰ ماننا پڑے گا، بلکہ انکار کرنے والوں کی طرف اسی آیت میں اپنے غافل رہ جانے کا اعتراف خود بتا رہا ہے کہ اس وقت تک قیامت کی ہیبتناکیاں ان کے سامنے بے نقاب ہو کر سامنے نہیں آ گئی تھیں، ورنہ غافل رہ جانے کا مطلب ہی کیا ہو گا۔

بہرحال قرآنی الفاظ سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ یاجوج و ماجوج والوں کی قومی زندگی کا یہ تیسرا دور یعنی منقطع ہونے کے بعد پھر غیر قوموں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا موقع ان کو قیام قیامت سے پہلے دیا جائے گا، ان کی قومی زندگی کے اسی دور کی تعبیر فتح یاجوج و ماجوج یا خروج یاجوج و ماجوج کے الفاظ سے کی جاتی ہے۔

اور جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ آثار و اخبار کا جو سرمایہ ہماری کتابوں میں پایا جاتا ہے، اس کے بڑے حصے سے ارباب تنقید و تحقیق مطمئن نہیں ہیں، لیکن ایک دو روایتیں اس سلسلہ کی بخاری جیسی معتبر کتابوں میں جو ملتی ہیں، ان سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ یاجوج و ماجوج کے خروج کے زمانہ میں کاروبار کے لحاظ سے دنیا کے عام تمدنی و عمرانی مشاغل میں کسی قسم کا کوئی خاص نمایاں تغیر و انقلاب رونما نہ ہو گا۔ آخر حضرت ابو سعید خدری صحابی کی یہ مشہور روایت، کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے تھے:۔

لیحجن البیت ولیعتمرن بعد خروج یاجوج وماجوج (بخاری)	لوگ بیت اللہ (کعبہ) کا حج بھی یاجوج و ماجوج کے نکل پڑنے کے بعد کرتے رہیں گے، اور عمرہ بھی۔

کا مطلب، یا مزید اضافہ کے ساتھ یہی روایت بخاری کے سوا دوسری کتابوں میں جو پائی جاتی ہے یعنی:۔

ان الناس لیحجون ولیعتمرون ولیغرسون النخل بعد خروج یاجوج وماجوج (فتح الباری)	لوگ یاجوج و ماجوج کے نکل پڑنے کے بعد حج بھی کرتے رہیں گے، اور عمرہ بھی۔ اور نخلستان (باغ) بھی لگاتے رہیں گے۔

بتایا جائے کہ اس سے اور کیا سمجھا جائے۔

یقیناً حج و عمرہ یا غرس نخل (نخلستان لگانا) ان کا ذکر بطور مثال فرمایا گیا ہے، مقصد بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب حج و عمرہ جیسے عبادات جن کے لئے طول و طویل مسافتوں کو طے کر کے لوگوں کو مکہ معظمہ پہونچنا پڑتا ہے، اور نخلستان جن کے لگانے کا ارادہ وہی کر سکتے ہیں، جن کے سامنے پر امید مستقبل ہو، ورنہ قیامت کی رستخیزیوں میں جب:۔

"لکل امرئ منهم یومئذ شان یغنیه"

کی کیفیت دماغوں پر مسلط ہو گی، بھلا باغ و راغ کی گنجائش ہی کیا رہ جائے گی۔

اور سچ تو یہ ہے کہ نیند سے بیدار ہو کر ایسی حالت میں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، بخاری میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) فرما رہے تھے، کہ:۔

فتح الیوم من ردم یاجوج وماجوج مثل ھذہ۔ — یاجوج وماجوج والے بند میں اس کے ایسا سوراخ آج کھول دیا گیا۔

مثل ھذہ (یعنی ایسا سوراخ) کو بتاتے ہوئے عقدانامل کی اصطلاح میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سمجھایا تھا مطلب یہ تھا کہ بہت ہی باریک سوراخ گویا اس بند میں آپ کو دکھایا گیا تھا۔

بہرحال اس مشہور روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) گویا اسکی اطلاع دے چکے تھے کہ یاجوج وماجوج کی قومی زندگی کے تیسرے دور کے ظہور کے امکانات آپ ہی کے زمانہ میں قریب آچکے تھے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر کوئی کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے، کہ ظہور کے آغاز کی کرن گویا عہد نبوت میں پھوٹ چکی تھی[1]۔

پس عام طور پر" یاجوج وماجوج" کے خروج کو قیامت کے علامات میں جو شمار کیا جاتا ہے، تو زیادہ سے زیادہ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ یہ اسی قسم کی علامت ہے، جیسے خود رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کو بھی قیامت کے اشراط وعلامات میں شمار کیا جاتا ہے، اور سچ پوچھئے تو یاجوج وماجوج کا خروج کے بعد آخری انجام جو ہوگا جن روایتوں میں اس دردناک انجام کی تفصیل کی گئی ہے، لوگوں نے ان کو خروج سے متعلق کر دیا ——— آئندہ اس کی تفصیلی بحث آرہی ہے۔

بہرحال یہ مسئلہ کہ خروج کے ساز وسامان، اور زمین کی تیاری کا کام عہد نبوت میں جو شروع ہو چکا تھا، اس کی تکمیل کا وقت بھی کیا کوئی متعین کیا گیا ہے؟۔ اسی سورۃ الانبیاء کی آئت:—

حتی اذا فتحت یاجوج وماجوج وھم من کل حدب ینسلون۔ — تا اینکہ کھول دیئے گئے یاجوج وماجوج اور ہر حدب سے تیز چلتے ہوئے وہ نکل پڑے۔

کے آخری ٹکڑے یعنی "ھم من کل حدب ینسلون" میں اگر غور کیا جائے، اور یہ سوچا جائے کہ زمین کے وہی حصے

---

[1] کہہ چکا ہوں کہ یاجوج وماجوج کے خروج کے اس واقعہ کو ذوالقرنین والی دیوار کے انہدام واندکاک سے کوئی تعلق نہیں ہے، حضرت الاستاذ کشمیری کی تحقیق اس باب میں نقل کر چکا ہوں، ایسی صورت میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نیند سے بیدار ہو کر یہ فرمانا، کہ: "یاجوج وماجوج والے ردم (بند) میں اتنا سوراخ ہو چکا" اس کا مطلب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ رویا (خواب) میں یاجوج وماجوج کے خروج کی ابتداء کا تمثل دیوار کے سوراخ کی شکل میں ہوا، لیکن ظاہر ہے کہ خواب میں دودھ دکھایا جاتا ہے اور مطلب اس کا علم ہوتا ہے، قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ قحط خشک خوشوں اور دبلی پتلی گایوں کی شکل میں دکھایا گیا۔ بہرحال اس روایت سے یہ سمجھنا کہ واقعی یاجوج وماجوج والے اسی دیوار میں سوراخ کرنے پر وہ قادر ہو گئے تھے جس کے متعلق قرآن میں اطلاع دی گئی ہے کہ نقب لگانا اس میں اُن کے بس کی بات نہ تھی، حقائق وواقعات سے اغماض ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ ۱۲۔

جو بانی سے مکشوف اور نمایاں ہوئے ہیں، جن میں حدبیت (کوزہ پشتی اور ابھار) پایا جاتا تھا، گویا حاصل یہی ہوا کہ زمین کے سارے معمورہ میں پھیل پڑیں گے، اور اس طور پر پھیل پڑیں گے، کہ ان کی آمد کا یہ سلسلہ جاری رہے گا، اور بڑی تیزی کیساتھ زمین کے آباد حصّوں میں یہ گھسنے لگیں گے۔ تب سمجھا جائے گا کہ عہد نبوت میں جس خروج کے لئے سوراخ پیدا ہوا تھا، وہ مکمل ہوگیا، اور "فتحت یاجوج وماجوج" (کھول دیئے گئے یاجوج وماجوج) کی قرآنی پیشین گوئی تکمیلی شکل میں سامنے آگئی۔ حضرت الاستاذ مولٰنا انور شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کا خیال اسی لئے یہ تھا کہ یاجوج وماجوج کے خروج کا واقعہ دفعۃً پیش آنے والا ایک واقعہ نہیں ہے، بلکہ :۔

لهم خروج مرة بعد مرة — ان کے خروج کا یہ واقعہ یکے بعد دیگرے پیش آتا رہے گا۔

(فیض الباری شرح بخاری ج ۴ ص ۲۳)

اور یہ معلوم بھی ہوتا ہے، کہ خروج کا ان کے یہ قصّہ تدریجی طور پر آہستہ آہستہ پایۂ تکمیل کو پہونچا ہے، یہ عجیب بات ہے کہ "نیا عہدنامہ" ــــ یعنی انجیل کے نام سے جو مجموعہ اہل کتاب میں موسوم ہے اس میں ایک چھوٹا سا رسالہ بالکل آخر میں "یوحنا عارف کا مکاشفہ" ــــ کے نام سے بھی شریک ہے، کتاب کی ابتدائی عبارت سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ یوحنا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے حواری ہیں، اور ان کو کچھ غیبی مکاشفات ہوئے ہیں، جنھیں قلم بند کرکے ساتوں کلیسا کے نام ایک ایک نسخہ روانہ کیا گیا تھا۔ بہرحال آئندہ پیش آنے والے واقعات ہی سے زیادہ تر ان مکاشفوں کا تعلق ہے، منجملہ دوسرے مکاشفات کے ایک مکاشفہ کے الفاظ یہ ہیں، کہ :۔

"پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا، اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے، اور اس پر ایک سوار ہے، جو سچا اور برحق کہلاتا ہے، اور وہ راستی کے ساتھ انصاف اور لڑائی کرتا ہے، اور اس کی آنکھیں آگ کے شعلے ہیں، اور اس کے سر پر بہت سے تاج ہیں، اور اس کا ایک نام لکھا ہوا ہے جسے اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، اور وہ خون کی چھڑکی ہوئی پوشاک پہنے ہوئے ہے، اور اس کا نام کلام خدا کہلاتا ہے، اور آسمان کی فوجیں سفید گھوڑوں پر سوار، اور سفید صاف مہین کتانی کپڑے پہنے اُس کے پیچھے پیچھے ہیں، اور قوموں کے مارنے کے لئے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے اور وہ لوہے کی عصا سے ان پر حکومت کرے گا، اور قادر مطلق خدا کے سخت غضب کی مے کے حوض میں انگور روندے گا، اور اس کی پوشاک اور ران پر یہ نام لکھا ہوا ہے ــــــــــــــــــ
بادشاہوں کا بادشاہ، اور خداوند کا خداوند"

(یوحنا کا مکاشفہ - ۱۹ - ۱۱ تا ۱۶)

نہیں کہا جاسکتا، کہ "سچا اور برحق" کن الفاظ کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ "الصادق الامین" (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کون واقف نہیں ہے، ان سے بھی، ان بادشاہوں سے بھی، جن کے سر کے تاج ان کے نہیں بلکہ آپ ہی کے مقدس فرقِ مبارک کے تاج تھے، گھوڑوں پر چڑھے ہوئے فرشتوں کو بھی لوگوں نے بدر کے میدان میں دیکھا تھا۔ جو انصاف کے مستحق تھے اُن کے ساتھ انصاف، اور جنھوں نے لڑنے کا ارادہ کیا ان کے ساتھ لڑائی، اور ان ہی لڑائیوں میں خون کے چھینٹوں کا دامن پر پڑنا، انھیں پہنچنے کے ساتھ، ایسی حکومت قائم کرنا کہ شریروں کے حوصلے پست ہوگئے، اور جو مقابلے کے لئے کھڑے ہوئے وہ گرائے گئے، روندے گئے، بادشاہوں کے اس بادشاہ اور خداوندوں کے اس خداوند کو کون نہیں پہچانتا،

صلوات اللہ علیہ وسلامہ

اسی مکاشفہ کے بعد دوسرا طویل مکاشفہ اور ہے، جس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک فرشتہ آسمان سے اترا، اور اس نے:-

"پرانے سانپ کو جو ابلیس اور شیطان ہے پکڑ کر ہزار برس کے لئے باندھا اور اسے اتھاہ گڑھے میں ڈال کر بند کر دیا، اور اُس پر مہر کر دی تاکہ وہ ہزار برس پورے ہونے تک قوموں کو پھر گمراہ نہ کرے" (۲۰-۲-۳)

آگے اسی کے بعد یہ کہتے ہوئے، کہ:-

"اس کے بعد ضرور ہے کہ تھوڑے عرصہ کے لئے کھولا جائے"

اسی تھوڑے عرصے کے متعلق جس میں شیطان کا کھلنا بیان کیا ہے کہ ضروری ہے، اسی مکاشفہ میں اسی کی یہ تفصیل بھی پائی جاتی ہے، لکھا ہے، کہ:-

"اور جب ہزار برس پورے ہوچکیں گے، تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا"

چھوٹ کر کیا کرے گا، مکاشفہ میں ہے:-

"ان قوموں کو جو زمین کی چاروں طرف ہوں گی، یعنی یاجوج وماجوج کو گمراہ کر کے لڑائی کے لئے جمع کرنے کو نکلے گا"

قرآن کے رو سے تو "من کل حدب" کے مفہوم کو ادا کرنے والے الفاظ چاہئے تھا کہ یہاں ہوتے، واللہ اعلم اصل مکاشفہ کی عبارت کیا تھی، جس کا مترجم نے "زمین کے چاروں طرف" کے الفاظ سے ترجمہ کیا ہے۔ اب بادشاہوں کے بادشاہ، خداوندوں کے خداوند "الصادق الامین" کو جو پہچانتے ہیں وہ حساب کر کے دیکھ سکتے ہیں، کہ یاجوج وماجوج والوں کی قومی زندگی کے اس تیسرے دور کی تکمیل کا زمانہ کیا ہونا چاہئے۔[1]

---

[1] اس موقع پر بے ساختہ الفرڈ ویبر کا قول یاد آجاتا ہے، اُس نے اپنی کتاب "تاریخ فلسفہ" میں لکھا ہے، کہ:- (بقیہ صفحہ ۴۴ پر)

یوحنا عارف یا حواری کے اسی مکاشفہ میں "یاجوج وماجوج" والوں کے متعلق جنھیں شیطان اکسا کر باہر نکالے گا، آگے یہ بیان بھی درج ہے، کہ:-

"ان کا (یاجوج وماجوج) کا شمار سمندر کی ریت کے برابر ہوگا، اور وہ تمام زمین پر پھیل جائینگی

اور مقدسوں کی لشکرگاہ اور عزیز شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیں گی"

مقدسوں کی لشکرگاہ اور عزیز شہر سے مراد کیا ہے؟ عزیز کا مادہ عزت ہے، "البلد الحرام" کے عربی لفظ کا ترجمہ اگر کیا جائے تو بھی "عزیز شہر" ہو سکتا ہے، باقی دس ہزار قدسیوں کے جس لشکر کا نظارہ موسیٰ (علیہ السلام) کو جس مقام پر کرایا گیا تھا، اس سے تورات کے پڑھنے والے خوب واقف ہیں[1]۔

یوحنا کے اسی مکاشفہ کے آخر میں ہے، کہ:-

"آسمان سے آگ نازل ہو کر انھیں کھا جائے گی"

"انھیں" سے یاجوج وماجوج والوں ہی کی طرف اشارہ ہے جس سے آتشیں ہتھیاروں کے استعمال پر بھی روشنی پڑتی ہے، لیکن یہ انجام تو خیر آئندہ پیش آئے گا، اس وقت تو مجھے صرف یہ بتانا ہے، کہ یاجوج وماجوج والوں کے خروج کی تکمیل کے زمانے کو اس مکاشفہ کی روشنی میں ہم متعین کر سکتے ہیں، اسی طرح دوسری دفعہ غیر قوموں سے رشتہ جوڑنے کا موقع جب ان کو دیا جائے گا، اُس وقت وہ کیا کریں گی، اس کا بھی کچھ اندازہ اسی مکاشفہ کے الفاظ سے ہوتا ہے یعنی

"وہی فتنہ وفساد، لڑائی جھگڑوں کے قصوں کو یہ چھیڑ دیں گے، تا اینکہ "عزیز شہر"

کو چاروں طرف سے یہ گھیر لیں گے"

گویا قرآن میں "ذوالقرنین" کی دیوار کی تعمیر سے پہلے ان کی قومی خصوصیت کی تعبیر:-

ان یاجوج وماجوج مفسدون فی الارض — یاجوج وماجوج زمین میں بگاڑ پیدا کرنے والے ہیں

کے الفاظ میں ہم جو پاتے ہیں، دوبارہ کھلنے کے بعد پھر اپنی اسی جبلی عادت اور اقتضاء کے ساتھ نمایاں ہوں گے،

(صفحہ ۴۳ کا بقیہ حاشیہ) "پندرھویں صدی کے وسط سے مغربی یورپ میں یکے بعد دیگرے متعدد حیرت انگیز واقعات ہوئے"

(مترجمہ خلیفہ عبدالحکیم صاحب صفحہ ۲۴۴)

چھٹی صدی عیسوی کے وسط (سنہ ۵۵۰ء) سے پندرھویں صدی کے وسط تک جوڑ لیجئے کہ اوسط مدت کیا ٹھہرتی ہے۔ کاش "تاریخ" کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے، یقیناً نشأت ثانیہ کے نام سے جو دور "مہذب ممالک" کا موسوم ہے اس کی ابتداء اور تدریجی ارتقاء کا مطالعہ اس نظر سے بڑا دلچسپ ہوگا۔"

[1] تورات کی کتاب استثناء کا مشہور فقرہ ہے "فاران ہی کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا" (باب ۳۳) بخاری میں ہے، کہ:-

"فتح مکہ کے وقت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) دس ہزار صحابہ کے ساتھ تشریف فرما ہوئے"

ہمارے ہاں کی روائتوں میں ایک یہ روایت جو پائی جاتی ہے، کہ:۔

ان یاجوج وماجوج من ولد آدم	یاجوج وماجوج آدمؑ ہی کے اولاد میں ہیں، اور
ولو اسلموا لافسدوا علی الناس	اگر وہ یعنی یاجوج وماجوج والے اسلام بھی قبول کرلیں
معائشھم۔	جب بھی لوگوں پر اُن کے ذرائع معاش کو درہم برہم
(کنز العمال بحوالہ مسند عبد بن حمید)	کرتے رہیں گے۔

اس سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے، کہ فساد، بگاڑ، اور لوگوں پر ان کی معاشی زندگی کو تلخ بنا دینا انکی جبلّی فطرت ہے، حتیٰ کہ اسلام بھی اگر قبول کرلیں گے، جب بھی ان کی یہ قومی خصوصیت اپنے آثار و نتائج کو ظاہر ہی کرتی رہیگی، گویا اسلام کو یہ قبول بھی کریں گے تو اوپر ہی سے قبول کریں گے، اور اندر ان کا جوں کا توں اسی حال میں رہے گا، جس حال میں اسلام سے پہلے تھا، اور جب اسلام کے ساتھ ان کی فطرت کا یہ تعلق ہوگا، تو دوسرے انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی کی طرف منسوب ہوجانے کا چاہیئے کہ نتیجہ بھی یہی ہو، بلکہ اسلام جیسے محفوظ مذہب کے ساتھ اُنکے تعلق کی نوعیت جب یہ ہوگی، تو جن پیغمبروں کی صحیح تعلیمات اپنی اصلی شکل وصورت میں باقی نہیں رہی ہیں، انکی طرف انتساب اور صرف انتساب اُن کے جبلّی تقاضوں کو کیسے بدل سکتا ہے[1]

لیکن یاجوج و ماجوج کی اس قرآنی اصطلاح یا تعبیر کے متعلق اس وقت تک جو کچھ پیش کیا جاچکا ہے، کیا اسی حد تک ان کا قصہ محدود ہے؟ مطلب یہ ہے، کہ:۔

۱۔ غیروں میں پہونچ کر فساد انگیزی۔

۲۔ یا خود آپس میں ان کا موجی تعلقات کے رکھنے پر اصرار جن کی تفصیل گذر چکی ہے، یعنی باہم ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھتے بھی رہنا، لیکن اسی کے ساتھ کلیۃً ٹوٹ کر جدا بھی نہیں ہونا۔

---

[1] یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج والوں کی فسادی فطرت کا تجربہ ماقبل التاریخ ایام میں بھی ہوتا رہا ہے، اولاً یہ بات قرآن ہی سے معلوم ہوتی ہے کہ ذوالقرنین کے عہد میں اسی کی شکایت کی گئی، ہندوؤں کی کتابوں میں بھی معمولی لفظی تغیر یعنی بجائے یاجوج و ماجوج کے کوک دوکوک کے الفاظ ملتے ہیں، یہ ایسی ہی بات ہے جیسے اسی یاجوج و ماجوج کا تلفظ گوگ ماگوگ، غوغ وماغوغ وغیرہ شکلوں میں پایا گیا ہے۔ رگ وید میں رچا ۲۲ سکتہ ۴ منڈل ۷ کا ایک دعائیہ فقرہ ہے کہ: "اے [illegible] ہماری [illegible] کوکوں کی لعنت سے بچا" اس میں تو صرف کوک کا ذکر ہے، لیکن کلکی پران کے نام سے جو کتاب ہندوؤں کے ہاں پائی جاتی ہے، اس میں کوک کے ساتھ وکوک کا بھی ذکر ہے، اور یہ بھی کہ ان کے رتھ (سواری) کا رنگ کالا ہوگا، اور چھچھوندر، گیدڑ، گدھے وغیرہ کی آواز [illegible] نکالیں گے [illegible] انکی آنکھیں [illegible] ہوں گی۔

([illegible] ۲۰۲)

۳۔ متروکیت، یعنی غیب سے تعلقات قائم کرنے کے لئے ہبوطی زندگی میں عام نسل انسانی کو علم کے ایک خاص ذریعہ وحی و نبوت کے ساتھ قدرت جو سرفراز کرتی رہی ہے، گویا خاکدانِ ارضی پر آدم (علیہ السلام) کو رخصت کرتے ہوئے:۔

فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع	پھر جب تمہارے پاس ہمارے ہاں سے ہدایت کرنیوالے
ھدای فلا خوف علیھم ولا	آتے رہیں تو جو پیرو ہوگا میرے اُن ہدایت کرنیوالوں کا
ھم یحزنون۔	پھر نہ اُس کو کچھ ڈر ہے اور نہ وہ کڑھیں گے۔

کی آخری وصیت جو کی گئی تھی، اور اسی وصیت کے مطابق ہر اُمت میں نذیر (چونکانے والے) جو آتے رہے، زمینی زندگی کی اس خاص لاہوتی نعمت سے اپنی فطری طغیانی اور سرکشی کی بدولت یاجوج وماجوج والے محروم رہے، اور یوں خدا کی چھوڑی ہوئی اُمت بن کر رہ گئے، چاہا جائے تو ڈاکٹر اقبال مرحوم کی اس حکیمانہ و عارفانہ تشخیص کو پڑھنے والے ان کی پیشانی کی لکیروں میں پڑھ سکتے ہیں، یعنی:۔

پا بزندانِ مظاہر بستہ	از حدود حس بروں ناجستہ
کور و یزداں ناشناس ادراک او	ناکساں زنجیری پیچاک او
فطرتش از سوزِ عشق آزاد ماند	در جہان جستجو ناشاد ماند

ایں مئے دیرینہ در میناش نیست
شور یارب قسمتِ شبہاش نیست

۴۔ اور قرآنی الفاظ "من کل حدب" سے یہ اشارہ جو ملتا ہے کہ زمین کا ہر وہ حصہ جو اُبھر اُبھر کر پانی سے باہر ہو گیا ہے، خواہ وہ جزائر ہوں، یا جزیرہ نما ہوں، یا خشکی کے وہ قطعات ہوں جنھیں بحر کے مقابلہ میں بر کہتے ہیں "کل" کے لفظ کا اقتضاء تو یہی ہے، سب ہی میں یہ پہونچ جائیں گے، صرف پہونچنے ہی کا پتہ نہیں چلتا ہے، بلکہ "من" کے لفظ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اور مرکز بنا بنا کر وہاں سے نکلیں گے، اور قرآن کے اسی اشارے کی تفصیل یوحنا عارف کے مکاشفہ میں ملتی ہے۔ یعنی:۔

"کب نکلیں گے؟ کس لئے نکلیں گے؟ اور کہاں تک پھیل جائیں گے؟"

گذر چکا کہ ان سارے سوالوں کا جواب اس مکاشفہ میں دیا گیا ہے، یعنی الامین الصادق بادشاہوں کے بادشاہ خداوندوں کے خداوند کے ہزار سال بعد ان کو منقطع ہونے کے بعد پھر غیر قوموں کی طرف چل پڑنے کا انکو موقع دیا جائے گا، یہ جواب تو "کب نکلیں گے" کے سوال کا ملتا ہے "لڑائی کے لئے شیطان ان کو باہر نکالے گا، یہ "کس لئے نکلیں گے؟" کا جواب دیا گیا ہے، اور ــــــ "عزیز شہر" ــــــ کو چاروں طرف سے گھیر لیں گے، یہ ان کے فتوحات کی وسعت کا حال ہوگا۔

۵ - اور "ینسلون" کا لفظ "من کل حدب" کے بعد جو قرآن میں پایا جاتا ہے، جیسا کہ ظاہر ہے مادہ اس کا نسل ہے، لغت والوں نے لکھا ہے، کہ "شیرے کہ از پستان بے دوشیدن بیروں آید" یعنی دوہنے کی کوشش کے بغیر تھن سے جو دودھ خود بخود بہہ پڑے اسی کو عربی میں نسل کہتے تھے۔ اسی طرح بکثرت اُون جب مویشیوں کے بدن سے جھڑنے لگے تو اس پر بھی اسی نسل کے لفظ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ پھر اسی مناسبت سے تیز سے تیز رفتار کی تعبیر نسل سے ہونے لگی، ان لغوی اشاروں سے اگر یہ سمجھا جائے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کی منتقلی میں جن ذرائع یا سواریوں سے وہ کام لیں گے وہ حد سے زیادہ تیز رفتار ہوں گی، تو یقیناً یہ کوئی ایسی بات نہ ہوگی، جس کے متعلق دعویٰ کیا جائے کہ زبردستی قرآن سے یہ سمجھ لیا گیا ہے۔

۶ - اور ہمارے ہاں کی روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی سچے نبی اور پیغمبر کے دین کو وہ اگر قبول بھی کر لیں گے، تب بھی لوگوں کے معاشی نظام کو بگاڑنے اور زیر و بالا کرنے سے یہ باز نہ آئیں گے، خواہ وہ دین اسلام ہی کیوں نہ ہو۔

۷ - اسی طرح اگر یہ مان لیا جائے اور ثابت ہو جائے کہ یاجوج و ماجوج والوں کا نسلی تعلق قائن (قابیل) حضرت آدم (علیہ السلام) کے اس نافرمان، عاق شدہ لڑکے سے ہے، جس پر حضرت آدم (علیہ السلام) نے لعنت کی تھی، اور اسی لئے اُس آبادی سے جس میں آدم (علیہ السلام) اپنے بچوں کے اور ان کی اولاد کے ساتھ رہتے تھے بھاگ کر وہ روپوش ہو گیا تھا، تو ایسی صورت میں مردم کشی کے نت نئے ہتھیاروں کی ایجاد و اختراع اسی طرح رقص و سرود، گانے بجانے کے غیر معمولی ذوق و شوق، اور اس سلسلہ میں حیرت انگیز صنائع و بدائع کے ظاہر کرنے پر تعجب نہ ہونا چاہئے کہ ان ہی دونوں خصوصیتوں کو قابیلی نسل کی طرف بائبل میں منسوب کیا گیا ہے، بلکہ ہابیل یعنی قابیل کے مقتول کے نام لیواؤں کے ساتھ انکی چیرہ دستیوں کے قصوں کو بھی چاہئے کہ یاجوج و ماجوج کے موروثی عام عادات و خصائل میں شمار کیا جائے۔

(باقی آئندہ)

رُوئداد اجتماعات دعوتِ اصلاح و تبلیغ

منعقدہ لکھنؤ

۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، نومبر ۱۹۵۱ء

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ گذشتہ ماہ کے الفرقان میں ہم نے اپنے ناظرین کو جس تبلیغی ہفتہ کی روئداد کا منتظر بنایا تھا وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق بحسن و خوبی تمام ہوا، لکھنؤ سے قریب کے مختلف تبلیغی مرکزوں کو اس پروگرام کی اطلاع اور اس میں شرکت کی دعوت دیدی گئی تھی، چنانچہ تقریباً ان تمام مراکز کی جماعتوں نے اس میں شرکت کی۔ کانپور، گھاٹم پور، اناؤ، سندیلہ، بارہ بنکی، الہ آباد، رائے بریلی، گونڈہ، سیتاپور، رام پور، نگرام وغیرہ کی تمام جماعتوں کے افراد کی مجموعی تعداد تین سو کے لگ بھگ تھی، جن میں سے اکثر حضرات نے ۲۶ نومبر سے ۲۹ نومبر تک لکھنؤ کے مرکز میں قیام کیا۔ لکھنؤ کے مرکز کی عمارت جو ایک عرصہ سے زیر تعمیر تھی، اسی موقع پر اس کے ایک بڑے حصہ کی تعمیر مکمل ہوئی، جس کے بعد وہ پہلی بار اس قابل ہوئی کہ اُس سے مرکز کا کام لیا جا سکے، اور باہر سے آنے والی جماعتیں اس میں قیام کر سکیں۔ تعمیر جس دن مکمل ہوئی ہے اُسی روز یعنی ۲۵ نومبر کو مرکز کا افتتاح اس طور پر عمل میں آیا کہ سب سے پہلے مرکز کی مسجد میں "الصلوٰۃ الوسطیٰ" یعنی نماز عصر با جماعت ادا کی گئی، نماز کے بعد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ایک مختصر سی تقریر فرمائی، جس میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کا شکر ادا کرنے کے بعد ایک دینی مرکز کی تعمیر کی مناسبت سے حاضرین کو (جن میں بیشتر رفقائے دعوت تھے) دنیا میں سب سے پہلے "دینی مرکز" (اول بیت وضع للناس) کی تعمیر یاد دلائی، اور بتلایا کہ یہ سب فیض اسی مرکز کا، اور اس کے بنانے والوں کے اخلاصِ نیت کا ہے۔ ؎

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

آپ نے حاضرین کو اس پہلو کی طرف بڑی اہمیت کے ساتھ توجہ دلائی کہ اس عمارت کا بن جانا کوئی خاص خوشی کی بات نہیں ہے

اصل چیز اس کا مقصد اور اس کے لئے اخلاص ہے۔ یہی سیدنا حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی اصل میراث ہے، اور یہی ان مسجدوں کا مقصد اور ان مرکزوں کی روح ہے"۔ اس کے بعد مولٰنا نعمانی نے چند الفاظ فرما کر دعا فرمائی، مغرب کی نماز ہوئی نماز کے بعد چائے سے حاضرین کی تواضع کی گئی جس کا اہتمام بعض رفقاء نے ذاتی طور پر کیا تھا۔

---

۲۶ نومبر کی صبح کو بیرونی جماعتوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ زیادہ تر جماعتیں ۲۷ نومبر تک لکھنؤ پہونچ گئیں، اور اسی نوتعمیر مرکز میں قیام پذیر ہوئیں، حسب معمول ہر شخص اپنے مصارف خورد و نوش کا خود ذمہ دار تھا۔

مرکز کے دوران قیام میں جماعتوں کا وقت بحمداللہ بہت منظم اور بامقصد طریقے پر گذرا۔ ان کے وقت کی تنظیم اور تقسیم یوں کی گئی تھی، کہ

صبح نماز فجر کے بعد مختصر اصلاحی و تربیتی تقریر ہوتی۔ اس کے بعد سے ۸ بجے تک کا وقت ناشتہ اور دیگر ضروریات سے فراغت کے لئے دیا جاتا تھا، ٹھیک ۸ بجے سے تعلیم کا پروگرام شروع ہوتا تھا جس میں بلا استثناء جماعتوں کے تمام افراد پوری پابندی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ ۱۱ بجے تک مشغول رہتے تھے۔ اس تعلیمی پروگرام میں سیرت اور منتخب کتابوں سے عمومی دینی تعلیم کے علاوہ درس قرآن کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ قرآن مجید کا درس مولٰنا سید ابوالحسن علی ندوی دیتے تھے، جس کا وقت کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ تھا۔ ان تین چار دنوں کے درس کے لئے مولٰنا نے بہت سوچ سمجھ کر سورۂ یونس کو منتخب فرمایا تھا، اور جیسا کہ ارادہ فرمایا تھا، اللہ کی توفیق سے ان چار دنوں میں اس پوری سورۃ کا درس تمام ہوگیا، یہ درس اس پروگرام کا خاص جزو تھا، اولاً اسلئے کہ کتاب اللہ کا درس تھا، اور دوسرے اس وجہ سے کہ اس جزو کی ذمہ داری خود مولٰنا علی میاں نے اپنے ذمہ لے لی تھی، غالباً اسی وجہ سے شہر کے بہت سے حضرات بھی دور دور سے صبح سویرے پروگرام کے اس جزو میں شرکت کے لئے تشریف لاتے تھے ——— گیارہ بجے تعلیمی پروگرام ختم ہوتا، اور یہ منظم مجمع کھانے سے فراغت پانے کیلئے منتشر ہوجاتا، کھانے کے بعد ظہر کی نماز تک آرام کا وقت تھا، ظہر کی نماز کے بعد سب لوگ جماعتیں بنا کر شہر میں پھیل جاتے تھے تاکہ شہر کے باشندوں سے ملیں، اور انھیں دین کی طرف توجہ دلائیں، اور رات کے عام اجتماع میں شرکت کی دعوت دیں۔ ان گشتی جماعتوں میں کچھ جماعتیں عوام سے ملنے کیلئے ہوتی تھیں، اور کچھ جماعتیں خواص سے ملاقات کرنے کیلئے۔ شام تک یہ جماعتیں اس طرح سے کام کرتی رہتی تھیں۔ شام کو واپس آکر جماعتیں کھانے سے فراغت حاصل کرتیں، اور نماز عشاء ادا کرکے اجتماع گاہ میں پہونچ جاتیں۔ اجتماع ختم ہونے پر جماعتوں کے تمام افراد مرکز میں واپس تشریف لے آتے، اور وہیں رات گذارتے ——— چوتھا اور آخری اجتماع چونکہ جمعرات کا تھا اسلئے حسب معمول شہر سے باہر ندوۃ العلماء کی وسیع مسجد میں منعقد ہوا، یہاں سے رات کو واپس جانا نہ تھا، اسلئے مرکز کی پوری آبادی اس رات کو یہیں آباد رہی ——— یہ ہے اس تبلیغی ہفتہ کی مختصر روئداد، اب رہا اس کا اجتماعات کی تقریروں والا حصہ وہ آپ اگلے صفحے سے پڑھئے۔

"نیا ایمان"

دعوتِ اصلاح و تبلیغ کے پہلے عام اجتماع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تقریر جو ۲۶ نومبر ۱۹۵۱ء کو جناب شیخ اقبال علی صاحب ایڈوکیٹ کی کوٹھی کے وسیع میدان میں منعقد کیا گیا تھا۔

خطبۂ مسنونہ کے بعد ——————

بھائیو اور بزرگو! آپ حضرات کو اس تعداد میں دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا جی چاہتا ہے کہ دین کی آواز پر اپنے کاموں کو چھوڑ کر آپ یہاں تشریف لائے، اور سب سے بڑا احساس یہ ہوتا ہے کہ ایمانی دعوت میں اب بھی یہ طاقت ہے کہ دُور دراز کے بھائیوں کو ایک جگہ جمع کر سکتی ہے، جی چاہتا ہے کہ ایمان کی قوت اس سے زیادہ بڑھے، اور ہمارے اندر از سرِ نو ایمانی زندگی پیدا ہو۔

دوستو! ایک چیز ہے دین، اور ایک ہے ایمان، ان دونوں میں ایک فرق ہے۔ دین تو وہ نظام ہے جس کو لیکر تمام انبیاءؑ آتے رہے، اور جس کا آخری پیغام رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) لیکر تشریف لائے، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ اس دین کو مکمل فرمایا: "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا" دین تو یقیناً مکمل ہو چکا، اب اس میں جو کوئی ترمیم اور اضافہ کرنا چاہے وہ دجال، کاذب، و مفتری ہے۔ لیکن دوسری چیز ہے اس دین پر یقین کرنا، اور اسی دین کی حقیقتوں پر ایمان لانا۔ دین پر تو بیشک مہر لگ چکی ہے، اس پر کسی اضافہ کی دعوت نہیں دی جا سکتی، اس میں سے جس طرح کچھ گھٹایا نہیں جا سکتا، بڑھایا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن ایمان کا معاملہ یہ نہیں ہے، اس میں زیادہ سے زیادہ ترقی کی گنجائش ہے اسلئے ایمان میں تازگی اور زیادتی کی دعوت قیامت تک جاری رہے گی، بلکہ ضروری ہے کہ دین پر اپنے ایمان و یقین کو مضبوط کرنے، اس کو اپنی زندگی بنانے، اور ہر چیز کو اس پر قربان کرنے، اور اس کو کسی چیز کے عوض ہاتھ سے نہ دینے کی کوشش برابر جاری رہے۔ اس امّت کی ہر نسل، ہر حصّے، اور ہر دور کو اس دین پر نیا ایمان لانا اور از سرِ نو دین کو سمجھنا ضروری ہے۔

دوستو اور بزرگو! آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کے وقت بھی دین کے بعض حصّے موجود تھے، نماز و حج وغیرہ کسی نہ کسی جگہ اور کسی نہ کسی حالت میں پائے جاتے تھے، دین کا وجود بالکل ختم نہیں ہو چکا تھا، قدیم مذاہب و ادیان کی بہت سی

شکلیں اور صورتیں موجود تھیں، لیکن جو چیز کھوئی گئی تھی وہ یہ تھی کہ دین میں کوئی طاقت باقی نہیں رہی تھی۔ ان لوگوں کا ان حقیقتوں پر تو ایمان و یقین تھا کہ سانپ کا زہر قاتل ہے، ہوا زندگی کے لئے ضروری ہے، کھانے سے پیٹ بھرتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے اور بہت سے تجربی حقائق پر وہ دل سے یقین رکھتے تھے، لیکن اس پر ایمان نہیں تھا کہ دوزخ کی آگ کیسی خطرناک ہے، اور جنت کا آرام اور اس کی راحتیں کیسی قابل رشک ہیں۔ اُن کا ایمان نہیں تھا کہ اللہ کو ناراض کرکے وہ دنیا میں فلاح نہیں پاسکتے، درانحالیکہ اُن کا نوکر اُن کی نافرمانی کرکے اُن کے گھر میں نہیں رہ سکتا تھا، اُن کا ایمان تھا کہ آگ کی ایک چنگاری گھروں کو خاک سیاہ کرسکتی ہے، لیکن اُن کا ایمان نہیں تھا کہ گناہ و ظلم سے بستیاں اور ملک تباہ ہوسکتے ہیں۔ وہ جتنا ایک طبیب کی باتوں پر اعتماد کرتے تھے، رسُول کی باتوں پر انھیں اُتنا بھی اعتماد نہیں تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کا تعلق دین اور دوسری زندگی سے مردہ ہوچکا تھا، اور انھیں اس سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی، صرف دنیا کی زندگی اور اسکی دیکھی بھالی اور آزمائی ہوئی حقیقتیں ان پر چھائی ہوئی تھیں۔

دوستو! کچھ ایسا ہی حال اب ہمارا ہوگیا ہے، اگر اسی وقت کوئی یہاں آکر کہدے کہ عجائب گھر سے شیر چھوٹ گیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ پورا مجمع اسی خبر کی طرف متوجہ ہو جائے گا، اور سب کو اپنی اپنی فکر پیدا ہو جائے گی، اجتماع کا سارا سکون، انتشار سے بدل جائے گا، کیونکہ ہماری زندگی ہمارے اوپر حاوی ہے۔ جب کوئی خطرہ زندگی کو چیلنج کرتا ہے تو ہماری قوتیں بیدار ہوجاتی ہیں اور زندگی کے لئے محافظ بن جاتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص اس زندگی کے خطرات سے آپ کو آگاہ کرے جو ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہے، اور جس میں تکلیف ہے تو دوامی، اور آرام ہے تو دوامی اور غیر فانی۔ تو ہم نہایت بے توجہی اور بے فکری سے سُن لیں گے۔ اس کا سبب بے دینی نہیں ہے، بلکہ دین پر ایمان کی کمی اور کمزوری، اور ایک طرح کی بے یقینی ہے، اور ظاہر ہے کہ ایمان کی اس درجہ کمزوری کے ساتھ ایک ایسی زندگی سے کیسے دلچسپی ہوسکتی ہے، اور کیسے اُس کے خطرات سے فکر پیدا ہوسکتی ہے جو بالکل آڑ اور اوٹ میں ہے۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جب اللہ تعالیٰ نے اپنا رسُول بنایا، اُس زمانہ میں عرب میں ایک یہ دستور تھا کہ اگر کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلہ پر حملہ آور ہوتا، اور اس قبیلہ کا کوئی شخص حملہ آور لشکر کو اُسوقت دیکھ لیتا جب وہ بالکل سر پر پہونچ چکا ہوتا، تو وہ شخص دوڑ کر پہاڑ پر چڑھ جاتا اور بالکل برہنہ ہوجاتا، اور دہائی دیتا، اس شخص کو "النذیر العریان" کہا جاتا تھا، اُس کا یہ فعل اس بات کی علامت ہوتی کہ دشمن بالکل سر پر آ پہونچا ہے، اور جس حال میں بھی ہو اُسی حال میں مقابلے کیلئے کھڑے ہو جاؤ۔

اسی دستور کے مطابق آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک دن ایک پہاڑ پر چڑھ گئے۔ مگر آپ کپڑے پہنے رہے، اور پکارا "انا النذیر العریان"، مکہ والے آپ کی صداقت اور شرم و حیا کے معترف تھے، اسلئے سارا شہر آناً فاناً کام کاج چھوڑ کر پہاڑ کے دامن میں جا جمع ہوا، انھوں نے اتنی توجہ اور فکر سے اسلئے کام لیا تھا کہ حضورؐ کے اس فعل کو انھوں نے

اپنی اس زندگی کے لئے ایک خطرے کی علامت سمجھا تھا، وہ سمجھے تھے کہ کوئی دشمن حملہ آور ہو رہا ہے جس کی اطلاع یہ ہمیں دیں گے، چنانچہ جب حضورؐ نے فرمایا کہ اگر میں تم سے کہوں کہ پہاڑ کے پیچھے دشمن کا لشکر چھپا ہوا ہے، جو تمھاری گھات میں ہے تو کیا تم مجھے سچا سمجھو گے؟ حالانکہ تم اُسے نہیں دیکھ رہے ہو، مگر میں چونکہ اوپر کھڑا ہوں اسلئے میری نظر اور اُس کے درمیان کوئی آڑ نہیں ہے۔ سب نے کہا بیشک ہم آپ کی بات کی تصدیق کریں گے۔ مگر جب آپؐ نے فرمایا کہ وہ لشکر عذاب الٰہی کا لشکر ہے جو بالکل سر پر کھڑا ہوا ہے، میری بات مانو تو اُس کے حملہ سے بچ سکتے ہو۔ بس یہ سُنکر ان کی ساری توجہ اور ساری فکر ختم ہوگئی، وہ آکر پچھتائے، اور کہنے لگے کہ کیا آپ نے یہی بات سنانے کو ہمیں یہاں بُلایا تھا؟ —— یہ کیا بات تھی؟، اُن پر بس اپنی دنیا کی زندگی چھائی ہوئی تھی، اُس کے ہر خطرے پر اُن کے کان کھڑے ہو جاتے تھے، مگر دوسری زندگی کا انھیں خیال نہ تھا، اِسلئے اس کے خطرات کی انھیں مطلق فکر نہ ہوتی تھی۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں مختلف مذاہب موجود تھے اور وہ ایمان کے مدعی تھے، مگر اُن کے ماننے والوں کا ایمان اتنا بے جان اور بوسیدہ ہوگیا تھا کہ محض فرضی اور خیالی تکالیف کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اُن کی مرغوب معصیتیں اور بداخلاقیاں نہیں چھڑا سکتا تھا، اُن کے پاس دین تو موجود تھا، مگر ایمان کی طاقت اور تازگی کھو جانے کی وجہ سے وہ دین چھوٹے چھوٹے حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی اُنھیں آمادہ نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لائے ہوئے دین پر سچے دل سے ایمان لانے والوں کا حال ان لوگوں سے بالکل مختلف تھا، انھیں اس زندگی سے زیادہ دوسری زندگی سے دلچسپی تھی، اس کی فکر تھی، اور ان کا دین اُن سے بڑی سے بڑی قربانی بآسانی کرا لیتا تھا، اسلئے کہ دین اور دینی حقیقتوں پر ان کا ایمان تازہ اور نہایت جاندار تھا۔ دوسرے مذاہب کے ٹھیکیداروں اور ان سچے دینداروں میں ایسا فرق تھا جیسا کاغذ کی تصویر اور ایک زندہ انسان میں، یا آگ کی تصویر اور خود آگ میں جیسا فرق ہوتا ہے، صحابہ کرامؓ کے نئے ایمان نے ان کی رگ رگ میں وہ آگ بھر دی تھی کہ مقابلے میں آنے والے جو اس ایمان سے محروم تھے مومی تصویروں کی طرح پگھل جاتے تھے یا اپنی خیر مناتے ہوئے سامنے سے ہٹ جاتے تھے، انکی تلواروں میں لوہے کی گرمی نہ تھی، بلکہ ان کے ایمانوں کی گرمی تھی، وہ فاقہ کش اور ژندہ پوش مجاہد دراصل ہتھیار کی طاقت پر نہیں بلکہ ایمان کی طاقت پر لڑتے تھے اور دشمنوں کے چھکے چھڑا دیتے تھے۔ اُن کا یقین تو یہ تھا کہ اگر ساری دنیا کی تلواریں ہماری گردنوں پر پڑیں، مگر اللہ کا حکم نہ ہو تو ہمیں کوئی نہیں مار سکتا، جبکہ ان کے مقابل یہ یقین رکھتے تھے کہ تلوار کا ایک ہی وار ہمارا خاتمہ کر دیگا۔ اس نئے ایمان کی طاقت نے ان غریب عربوں کے دل سے ان کی کمزوری کا احساس بالکل نکال دیا تھا۔ ایران کے دربار میں جب انکے سفیر گئے تو انکی تلواروں پر چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے، اور گھوڑے پستہ قامت تھے، مگر ان کا ایمان شعلہ زن تھا، اور اسی کی طاقت ساری طاقتوں پر غالب تھی، یہی طاقت تھی جس سے سپہ سالار ایران رستم بھی لرزاں تھا، اور ایران کے سارے درباری بھی اپنی اپنی فکر میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کی اسی قوت نے انھیں اس قدر جری اور نڈر بنا دیا تھا کہ ان درباروں میں قالینوں پر گھوڑوں کو

لئے ہوئے چلے جاتے، اور تخت پر نیزہ گاڑ دیتے تھے۔

اسی ایمان کا فرق تھا کہ حضورؐ کی بعثت کے وقت اگر نمازیں تھیں بھی، تو خشوع و خضوع نہ تھا، اور اگر حج تھا تو اسکی رُوح نہ تھی۔ لیکن جو لوگ حضورؐ کی دعوت پر ایمان لے آئے اُن میں آپؐ نے ایسا ایمان پیدا فرما دیا کہ حج و نماز کے وقت کے علاوہ بھی وہ اُن پر چھایا رہتا تھا، اور گویا ہر دم خدا اور آخرت کو اپنی آنکھوں کے سامنے پاتے تھے، اسی دنیا میں جنت کی خوشبوئیں تک محسوس کر لیتے تھے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ میدانِ جنگ میں اپنے ایک صحابی کے متعلق ایک دوسرے صحابی سے حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ ذرا فلاں کا پتہ چلاؤ، کس حال میں ہیں (یعنی صحیح سلامت ہیں، یا خدانخواستہ زخمی پڑے ہیں، یا جان بحق ہو گئے) اُنھوں نے ایک جگہ دیکھا زخمی پڑے ہوئے ہیں اور تقریباً وقت آخر ہو رہا ہے، کہا حضورؐ نے حال دریافت فرمایا ہے، جواب دیا جاؤ میرا اسلام عرض کرنا، اور عرض کر دینا کہ حضورؐ جنت کی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا واقعہ ہے کہ وہ مرض الوفات کی سخت تکلیف میں مبتلا تھے، بیوی قریب بیٹھی تھیں، تکلیف کی شدت دیکھ کر ان کے منھ سے نکلا "واکرباہ!" حضرت ابو ہریرہؓ کی جب ذرا طبیعت سنبھلی، فوراً بولے کیا کہتی ہو واکرباہ؟ نہیں! واطرباہ! واطرباہ! غداً نلقی الاحبۃ محمداً وحزبہ (واہ کیا خوشی کا موقع ہے، کیا نشاط کا عالم ہے، کل ہم دوستوں سے ملیں گے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کی جماعت سے ملیں گے)۔

غرض صحابۂ کرامؓ کو دین کی حقیقتوں پر ایسا یقین تھا کہ ہمیں محسوسات و مشاہدات پر بھی ویسا یقین نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا ایمان نیا اور تازہ تھا، اور ہر نئی اور تازہ چیز میں ایک قوت اور شادابی ہوتی ہے۔

حضرت ابو ذر غفاریؓ جب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے، تو اس کا جوش پیدا ہوا کہ حق کا اعلان اور اظہار کروں (حالانکہ دشمنانِ اسلام کی نظر میں وہ ایک جرم کا اظہار تھا) آپ نے بیچ حرم میں جا کر بلند آواز سے کلمہ پڑھا، کفار چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور خوب زد و کوب کیا، مگر ان کو وہ لذت ملی کہ دوسرے دن پھر جا کر یہی پٹنے کا کام کیا، اور پھر پیٹے گئے۔ یہ دراصل ان کے ایمان کی تازگی تھی، ان کا نیا اور تازہ ایمان دین کی راہ میں دنیا کی ہر تکلیف کو حلاوت و لذت سے بدل دیتا تھا۔

حضرت عبداللہ ذوالبجادین اسلام لانے سے قبل اپنے والد کے فوت ہو جانے کی وجہ سے اپنے چچا کے پاس رہا کرتے تھے، اور انھیں کا کام کاج کیا کرتے تھے، ان کی بکریاں وغیرہ چرانے لے جاتے تھے، کانوں میں اسلام کی آواز پہونچ چکی تھی، ایک دن تہیہ کر لیا کہ آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں جا کر اسلام لے آنا ہے۔ چچا کے پاس آئے، بکریوں کے ریوڑ چچا کے حوالہ کیا، اور کہا، میں اب اس ذمہ داری سے سُبکدوش ہونا چاہتا ہوں، اسلام قبول کرنے جا رہا ہوں، چچا نے کہا بدن پر جو کپڑے ہیں اُتارتے جاؤ، ظالم نے بالکل برہنہ کر کے چلتا کر دیا، کیسے نہ کیسے والدہ کے پاس پہونچے، اور پہننے کے لئے

کپڑا مانگا، اُنھوں نے ایک کمّل دیا، جس کے دو ٹکڑے کرکے ایک باندھا اور ایک اوڑھا اور حضورؐ کی خدمت میں پہونچے، اور پھر بقیہ زندگی آپ کے قدموں میں گذار دی، ذوالبجادین کا لقب آپ نے انکی دو کملیوں کی وجہ سے دیا تھا۔

بزرگو اور دوستو! نیا اور تازہ ایمان اس زندگی کو بالکل بے وقعت بنا دیتا ہے، اور اس کو قبول کرنے والا فوراً داعی و مجاہد بن جاتا ہے۔ ایک جنگ کے موقع پر رومیوں کی صف سے ایک بہادر نکلا اور اس نے حضرت خالدؓ کو پکارا، آپ گئے، اُس نے بجائے لڑنے کے اسلام کے متعلق کچھ سوالات شروع کر دیئے اور آخر میں دریافت کیا کہ تمھارے دین میں داخل ہونے کا طریقہ کیا ہے، آپ نے سب سوالات کے جوابات دیئے، اور اپنے خیمہ میں لے آئے، وہاں اُسے غسل کرایا، کلمہ پڑھایا، اُس نے دو رکعت نماز پڑھی، اور پھر میدان جنگ میں واپس آیا، اور اللہ کی راہ میں بڑی بہادری اور بے جگری سے لڑکر شہید ہوگیا۔ دیکھا آپ نے نئے اور تازہ ایمان میں کتنی کشش ہے کہ حضرت خالدؓ بیچ میدان جنگ میں سے ایک دشمن کو اسلام کا خادم بنا کے لے آئے، اور اس نے اسلام قبول کرتے ہی اپنی زندگی اس پر نثار کر دی۔

دوستو! ہماری دعوت دراصل ایمان کی اسی اصل طاقت کو حاصل کرنے کی دعوت ہے، اور ایسا ایمان پیدا کرنے کی دعوت ہے جس سے ہمارے متعلقین اور ہمارے احباب بھی ایک خوشبو محسوس کریں۔ پھول میں اگر خوشبو ہوتی ہے تو ضرور محسوس ہوتی ہے، آگ میں جب گرمی ہوتی ہے تو ضرور محسوس ہوتی ہے، اسی طرح اگر ہمارے ایمان میں خوشبو ہو، گرمی ہو، تو اس سے دوسرے ضرور متاثر ہوں گے، ورنہ دوسروں کی شکایت اور غیروں کے شکوے بیکار ہیں۔

حمص میں مسلمانوں کا غلبہ ہوا، اور وہاں جزیہ وصول کیا گیا، مگر تھوڑے ہی دن بعد خلیفۂ وقت کے حکم سے اس جگہ کو چھوڑ کر جانا پڑا، تو جزیہ کی ایک ایک پائی کا حساب کرکے واپس کیا گیا، یہ ان کے ایمان کا اثر تھا، حمص کے یہودیوں اور عیسائیوں نے اس سے ان کے ایمان کی خوشبو محسوس کی، چنانچہ جب مسلمان رخصت ہو رہے تھے تو وہ لوگ روتے تھے، اور دُعائیں کرتے تھے کہ اللہ تم کو پھر واپس لائے۔ اسی طرح اگر ہمارے اندر کوئی ایمانی طاقت، کوئی اندرونی قوت، اور اخلاقی برتری ہو، تو ناممکن ہے کہ دوسرے انسان اس کو محسوس نہ کریں۔

مسلمانوں کے پاس سرمایہ اور علم تمدّن اور دوسری دولتوں کی کمی نہیں، اصل میں جو کمی ہے اور جس سے لوگوں کی نگاہیں گئیں اور مسلمان دنیا کی نظروں سے گر گئے، وہ ایمان کی تر و تازگی اور شادابی کی کمی ہے، اس کمی کا اثر آج ہی نہیں، اُسی وقت ظاہر ہوگیا تھا جب مسلمان صاحب اقتدار و حکومت بھی تھے، بنی امیہ کے عہد میں حکومت کی طرف سے ایک غیر مسلم باجگذار ریاست میں جزیہ کی رقم وصول کرنے کے لئے محصّل گئے، یہ پہلا موقع تھا جب اسلامی حکومت کے محصّل حکومتی کرّ و فر کے ساتھ وہاں گئے تھے، تو والیِ ریاست نے کہا کہ وہ اللہ کے بندے کہاں ہیں جو پہلے آیا کرتے تھے، جو گھانس کے چپّل پہنے ہوئے تھے، جن کے چہروں سے فاقہ کشی اور کپڑوں سے غربت ٹپکتی تھی؟ اُس کو بتلایا گیا کہ وہ تو اگلے زمانہ کے مسلمان تھے، اب وہ کہاں ہیں۔ تو اس نے کہا کہ اب ہم ایک پیسہ خراج کا نہیں دیں گے، کیونکہ ہم نے اب تک ان سے مرعوب ہو کر خراج دیا تھا۔ وہ جس وقت کہتے تھے کہ اللہ کے بندے اللہ کا مطالبہ دے،

توہم ان کی بات کو رد نہیں کر سکتے تھے، لیکن تم سے مرعوب ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، تمہارا جو جی چاہے کرلو!۔

دنیا کو آج اس تروتازہ ایمان کی شدید ضرورت ہے جو آدمی کی پوری زندگی کو اپنے تابع کرے، مگر یہی ضروری چیز ہے جو دنیا سے ناپید ہوگئی۔ آج یورپ کے کارخانوں نے دنیا کی ہر ضروری بلکہ غیر ضروری بھی چیز بنا ڈالی ہے، اور ہر ضرورتمند بازار سے خرید سکتا ہے، مگر وہ چیز جس کو پیدا کرنے سے یورپ کے کارخانے بھی عاجز ہیں یہی خالدؓ و بوذرؓ کا ایمان ہے، اور اسی بنا پر یورپ کو اس بات کا پورا پورا اعتراف ہے کہ وہ دنیا کو برائیوں اور جرائم سے پاک کر دینے سے قاصر ہے۔ بڑے بڑے ماہرین اخلاقیات و نفسیات اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یورپ کا ایک ماہر نفسیات و اخلاقیات جو ہر سال اپنی خدمات قبول کرانے کے لئے حکومت کے سامنے سفارش پیش کیا کرتا تھا، ایک بار ایک عورت کے گلے سے ہار چراتے ہوئے پکڑا گیا۔

یہ چرچل و ٹرومین جو دنیا کے امن کے چوکیدار بنے بیٹھے ہیں، اگر موقع ملے تو شخصی یا قومی اقتدار حاصل کرنے یا قائم رکھنے کے لئے ایٹم بم گرا کر دنیا کو تباہ و برباد کر دیں، جیسا کہ گذشتہ جنگ میں جاپان کے دو معصوم صنعتی شہروں کے ساتھ کیا۔

دوستو! ہم کسی نئے دین کے داعی نہیں، لیکن ایک نئے ایمان کے ضرور داعی ہیں، ہم ضرور کہتے ہیں کہ اپنے ایمان کو تازہ کرو، خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

"یا ایھا الذین آمنوا آمنوا"

(اے وہ لوگو! جو ایمان لاچکے ہو ایمان لاؤ)

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں:۔

"جددوا ایمانکم"

(اپنے ایمانوں کو نیا کرتے رہو)

اور

یہی ہماری دعوت ہے!

ہم کھل کر کہتے ہیں کہ ہم اور ہمارے بزرگ، بڑے اور چھوٹے، ہمارے گھر والے اور ہمارے ساتھی، اس کے محتاج ہیں کہ ہمارا ایمان تازہ ہو، اور وہی ایمان پیدا ہو جو ہمارے اسلاف کا تھا۔ اس ہندوستان میں جو بزرگ اپنے اپنے وقت میں ایمان کے داعی اور مجدد گذرے ہیں انھوں نے بھی اُس وقت باوجودیکہ دین اور ایمان موجود تھا، اور عالم دین موجود تھے، ایمان کی تجدید کی دعوت دی، اور امت کے اندر ایک نئی ایمانی زندگی پیدا کر دی۔ پھر ان قدیم الاسلام، نومسلموں سے وہ باتیں ظہور میں آئیں جنھوں نے قرن اوّل کی یاد تازہ کر دی، اور ثابت کر دیا کہ ایمان میں بڑی طاقت ہے، اور اس طاقت کو ہر زمانہ میں زندہ کیا جاسکتا ہے۔ آج بھی اس طاقت سے دنیا میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے اسلاف کی روایات تازہ ہو جاتی ہیں۔ مصر میں "اخوان المسلمین" کے نوجوانوں نے جب اپنے اندر نیا ایمان پیدا کیا تو انھوں نے دین کے لئے ایسی قربانیاں پیش کیں جن کی

اس زمانہ میں مثال نہیں ملتی۔

اس وقت ساری اسلامی دنیا میں ایمان کی طرف ایک بازگشت ہو رہی ہے۔ ترکی، مصر، اور حجاز میں اپنے اپنے طرز پر ایمان کو بڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہر ملک کی طرح، اور شاید اور ملکوں سے زیادہ ہمارے اس ملک میں ضرورت ہے کہ نیا ایمان حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، اور اس کی دعوت عام کی جائے۔

ہمارا افسردہ اور بوسیدہ ایمان مشکلات کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، معمولی حالات کا مقابلہ معمولی اور کمزور ایمان کر سکتا ہے، لیکن غیر معمولی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے غیر معمولی طاقت کا ایمان درکار ہے۔ آج دنیا میں مسلمانوں کو غیر معمولی حالات کا سامنا ہے، اسلئے ہمیں اپنے ایمان میں غیر معمولی تازگی، اور اپنی زندگی میں غیر معمولی تغیر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ان اجتماعات کی دعوت

اور

ہماری حقیر کوششوں کا مقصد

یہی ہے، کہ

ہم میں از سر نو حقیقی ایمان

اور

ابتداء اسلام کے نو مسلموں کا سا جوش اور ذوق پیدا ہو!

حالات کے بدلنے میں صرف اتنی ہی بات کی دیر ہے ——————

نیا ایمان کیا ہے؟ اور کِس طرح وہ پیدا ہوتا ہے

"دعوتِ اصلاح و تبلیغ کے دوسرے عام اجتماع میں جو ۲۷ر نومبر کو جناب ڈاکٹر عبدالحمید صاحب کی کوٹھی (واقع نادان محل روڈ لکھنؤ) کے وسیع میدان میں ہوا تھا، مولانا محمد منظور نعمانی نے مندرجۂ ذیل تقریر فرمائی:"

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ۔ لقد جاءت رسل ربنا بالحق صلوات اللہ تعالیٰ علیھم وعلیٰ کل من اتبعھم باحسان الیٰ یوم الدین:۔

بزرگو اور دینی بھائیو!

آپ میں سے جو حضرات کل کے اجتماع میں شریک تھے انھیں یاد ہوگا کل یہ کہا گیا تھا کہ اسوقت مسلمانانِ عالم کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انھیں اپنے دین میں کسی ترمیم یا نظرثانی کی ضرورت ہے! دین تو کامل و مکمل ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی کمی کسر باقی نہیں ہے، خود اس کے نازل کرنے والے علیم و خبیر کا ارشاد ہے "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی" اور وہ دین پوری طرح محفوظ بھی ہے، اس کا بنیادی دستور قرآن حکیم محفوظ ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنّت اور آپ کا اسوۂ حسنہ جو قرآن مجید کی گویا عملی تشریح ہے وہ بھی محفوظ ہے، بلکہ آپ کی دعوت پر لبیک کہنے والی اور براہِ راست آپ سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے والی پہلی جماعت یعنی صحابۂ کرام کا طرزِ عمل بھی محفوظ ہے، اسلئے اس طرف سے تو بالکل اطمینان ہے ـــــ البتہ مسئلہ ہے اس دین پر ایمان کی تجدید کا، اور اس سے از سرِ نو وفادارانہ تعلق پیدا کرنے کا، یعنی ہماری ضرورت نئے اور تر و تازہ ایمان کی ہے، نہ کہ

نئے دین کی ـــــ کل جو کچھ آپ حضرات سے کہا گیا تھا اس کا یہی مدعا تھا، آج مجھے اسی کی کچھ اور تشریح کرنی ہے یعنی یہ بتلانا ہے کہ اس نئے ایمان سے ہمارا مطلب کیا ہے، اور اس کے پیدا کرنے اور حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے۔

اس سلسلہ میں پہلے ایک اصولی بات آپ یہ سمجھ لیجئے کہ یوں تو ایمان کے درجے گنتی میں اہل ایمان سے کم نہ ہوں گے یعنی جس طرح ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک صورت ملی ہے جو دنیا کے کسی دوسرے آدمی سے پوری طرح نہیں ملتی، بلکہ کچھ نہ کچھ فرق ضرور رہتا ہے اسی طرح میرے خیال میں دو ایمان والوں کا ایمان بھی بالکل ایک درجہ کا کبھی نہیں ہوتا، اسلئے ایمان کے اتنے ہی درجے ہیں جتنے دنیا میں ایمان والے ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ اصولی طور پر ایمان کے دو درجے ہیں۔

ایک درجہ تو یہ ہے کہ آدمی اللہ و رسول کی تکذیب نہیں کرتا، بلکہ تصدیق کرتا ہے، انکار نہیں کرتا، بلکہ اقرار کرتا ہے، اور اپنے کو ایمان والوں کی جماعت میں سمجھتا ہے لیکن اللہ و رسول کی باتوں پر اُسے ایسا یقین نہیں جیسا یقین اپنی دیکھی بھالی اور آزمائی ہوئی چیزوں پر آدمی کو ہوتا ہے، اور اسلئے اللہ و رسول کی تبلائی ہوئی باتوں کے یقین کا اثر اسکی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا جیسا کہ ان یقینوں کا ہوتا ہے جو اس کو اپنی آنکھ کان اور اپنے روزمرہ کے تجربے سے حاصل ہوئے ہوں ـــــ آپ غور کریں! جن چیزوں کا ہمیں اپنے مشاہدہ سے یا تجربہ سے یقین ہو گیا ہے ہماری زندگی اُس یقین کی بالکل غلام ہے۔ مثلاً ہمیں آگ کے متعلق یہ یقین ہو گیا ہے کہ وہ جلاتی ہے تو ہم آگ سے بچتے ہیں، پانی کے متعلق ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ اُس سے پیاس بجھتی ہے تو پیاس کے وقت ہم بیتابی کے ساتھ پانی کی طرف دوڑتے ہیں، نوکری کرنے والے کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ مہینہ بھر کام کرنے پر اس کو تنخواہ مل جائے گی، یہی یقین اُس سے مہینہ بھر محنت کرا لیتا ہے۔ ریلوے اسٹیشنوں کے قلی جن سے ہماری کوئی جان پہچان نہیں ہوتی، بس زبان سے ہمارے کہہ دینے سے ہمارا منوں سامان اپنے سر پر لاد لیتے ہیں، صرف اسلئے کہ روزمرہ کے تجربہ سے انھیں اس کا یقین ہے کہ ہم ان کو مزدوری کے پیسے دیدیں گے ـــــ بہرحال یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ آدمی کو اگر کسی بات کا پورا اور صحیح قسم کا یقین ہو تو اس کی زندگی میں اس کا اثر ضرور ہو گا ـــــ

تو جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ و رسول کی اور ان کی باتوں کی دل سے یا زبان سے تکذیب تو نہ کرتے ہوں بلکہ تصدیق کرتے ہوں، لیکن ان کی زندگی میں اس تصدیق کے آثار نظر نہ آئیں تو یہی سمجھا جائے گا کہ اللہ و رسول کی باتوں کا اگرچہ وہ انکار نہیں کر رہے ہیں لیکن ان کے بارے میں ان کو ایسا یقین حاصل نہیں ہے جیسا کہ اپنی دیکھی بھالی اور اپنی آزمائی ہوئی چیزوں کا انھیں یقین ہے ـــــ الغرض ایک درجہ تو یہ ہے کہ اللہ و رسول کی باتوں پر آدمی کا ایمان اتنا کمزور اور اس قدر بے جان ہو کہ زندگی پر اس کا کوئی خاص اثر نہ ہو، نہ وہ اس سے بری عادتیں چھڑا سکے، نہ اللہ کے اُن احکام پر عمل کرا سکے جو اس کی طبیعت اور اس کی نفسانی خواہشات کے خلاف ہوں، نہ اس سے کوئی محنت اور قربانی کرا سکے ـــــ تو ایک درجہ تو یہ ہے جس کے متعلق میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ اس کو ایمان کا درجہ قرار دینے کا مطلب صرف یہ ہے کہ

یہ کفر نہیں ہے، اور یہ حالت بھی بہر حال کفر سے یقیناً بہتر ہے۔

دوسرا درجہ ایمان کا یہ ہے کہ آدمی کو اللہ و رسول کی باتوں پر، ان کے وعدوں اور ان کی وعیدوں پر ویسا ہی یا اُس سے بھی بڑھ کر یقین ہو جیسا کہ ہم کو اپنی دیکھی بھالی اور اپنی آزمائی ہوئی چیزوں پر ہوتا ہے۔ پھر اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس یقین کے آثار زندگی کے ہر گوشہ میں نظر آئیں گے، اللہ و رسول نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہوگا وہ آدمی ان کو کرے گا جن کے چھوڑنے کا حکم دیا ہوگا ان سے بچے گا اور دور دور رہے گا، اور اگر کبھی غفلت سے اللہ و رسول کے کسی حکم کی خلاف ورزی اس سے ہو جائے گی تو اس کے برے انجام کا خیال کر کے وہ اس سے فکر مند ہوگا اور جس طرح بھی اُس سے بن پڑے گا اُس کے داغ دھبّہ کو دھو ڈالنے کی وہ کوشش کرے گا۔

بہر حال دوسرا درجہ ایمان کا یہ ہے اور یہی دراصل حقیقی ایمان ہے جس کا ہم سے اللہ و رسول نے مطالبہ کیا ہے اور اسی ایمان پر دنیا اور آخرت کی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے کئے گئے ہیں۔

صحابۂ کرامؓ کے دور میں ایمان کا یہ درجہ بالکل عام تھا یعنی ان میں اس ایمان کی صفت میں اگرچہ فرق مراتب تھا لیکن اتنی بات سب کو حاصل تھی کہ اللہ و رسول کی ہر بات پر ان کو اپنی دیکھی بھالی چیزوں کی طرح یا اس سے بھی زیادہ کر یقین تھا۔ چنانچہ ایک تابعی کا ارشاد ہے: کانهم رای عین "یعنی صحابۂ کرام کو اللہ و رسول کی بتلائی ہوئی ان دیکھی حقیقتوں پر بالکل ایسا یقین تھا کہ گویا انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے ——— ایک اور بزرگ ارشاد فرماتے ہیں کہ بعد والوں پر صحابۂ کرام کی فضیلت اور فوقیت نماز روزہ وغیرہ عبادات کی کثرت کی وجہ سے نہیں ہے "ولكن بشيء وقر في قلوبهم" (بلکہ ان کے دلوں میں یقین کی جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی بس وہ ان کا امتیاز ہے) کتابوں میں بعض اکابر صحابہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے "لو كشف الغطاء ما ازددت يقينا" یعنی اگر پردہ اٹھا دیا جائے اور اللہ و رسول نے غیب کی جو چیزیں تبلائی ہیں وہ کسی پردہ کے بغیر ہماری نظروں کے سامنے آ جائیں تو اس مشاہدہ سے ہمارے یقین میں کوئی اضافہ نہ ہوگا ———

بہر حال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت و تربیت سے اہل ایمان کی جو جماعت تیار ہوئی تھی اس پوری جماعت میں ایمان کا یہی درجہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے ایمان والوں کے لئے ان ہی کے ایمان کو نمونہ اور مثال قرار دیا ہے:۔ فان آمنوا بمثل ما آمنتم به فقد اهتدوا۔

ایمان کے اس درجہ کو آپ صحابۂ کرام کی چند جزئی مثالوں سے شاید زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔

معراج کے سلسلہ میں حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کا یہ واقعہ عام طور سے مشہور ہے اور آپ میں سے بہت سوں نے کبھی پہلے بھی غالباً سنا ہوگا کہ معراج کی صبح کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب اپنے اس آسمانی سفر کی سرگذشت لوگوں کو سنائی اور اس سلسلہ میں مکہ معظمہ سے بیت المقدس اور پھر وہاں سے آسمانوں پر اپنا جانا بیان فرمایا تو ابو جہل دوڑا ہوا حضرت ابو بکرؓ کے پاس آیا، اُسے یہ خیال تھا کہ ابو بکر اپنی معقولیت پسندی کی وجہ سے ایسی "دور از قیاس" بات ماننے کیلئے

تیار نہ ہوں گے، اور آج میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ان کا ساتھ چھڑوا دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا، چنانچہ وہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے گھر پہونچا، وہ چونکہ ابھی تک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے تھے، اسلئے انھیں معراج کے بارہ میں کچھ خبر نہیں تھی، ابوجہل نے جاکر ان سے کہا، کچھ سنا تم نے! تمھارے پیغمبر صاحب آج کیا بیان کر رہے ہیں اب دیکھنا ہے تم کہاں تک اُن کا ساتھ دوگے، آج انھوں نے بہت سے آدمیوں کے سامنے بیان کیا ہے کہ میں رات مکہ سے بیت المقدس پہونچا اور وہاں سے آسمانوں پر گیا اور زمین و آسمان کا یہ لمبا سفر کر کے رات ہی میں واپس بھی آگیا، تو کیا اس کے بعد بھی تم انھیں سچا ہی سمجھو گے؟ ــــــ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بغیر کسی تامل اور تکلف کے جواب دیا کہ وہ جو کچھ فرماتے ہیں صحیح فرماتے ہیں، اور میں تو روزانہ اس سے بھی عجیب بات میں ان کی تصدیق کرتا ہوں، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور وہ فرماتے ہیں کہ اللہ کا فرشتہ ابھی یہ پیام مجھے پہنچا کر چلا گیا، میں فرشتہ کو نہ آتے ہوئے دیکھتا ہوں نہ جاتے ہوئے، لیکن ان کے فرمانے کے بعد مجھے اس میں ذرا بھی شک شبہ نہیں ہوتا اور میں یقین کر لیتا ہوں کہ بیشک فرشتہ آیا اور ان کو ان کے رب کا پیام پہنچا کر چلا گیا، تو جب میں روزانہ ایسی باتوں کی تصدیق کرتا ہوں تو اگر آج رات اللہ نے ان کو کوئی ایسا سفر کرایا ہو، اور انھوں نے اس کو بیان فرمایا ہو تو مجھے اس میں شک شبہ کیوں ہوگا۔

یہ واقعہ بہت مشہور ہے اور جیسا کہ میں نے کہا تھا آپ میں سے بہت سوں نے اس سے پہلے بھی اس کو سنا ہوگا، یا کتابوں میں دیکھا ہوگا، لیکن شاید اس بات کی طرف آپ کا دھیان نہ گیا ہو کہ اس سے ایمان کی اصل حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔

صحابۂ کرام کے حالات میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں، صرف ایک واقعہ اور نقل کرتا ہوں۔

ابوذر غفاریؓ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مشہور صحابی ہیں، بعض خاص مصلحتوں سے حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) نے اپنے زمانۂ خلافت میں ان کے متعلق یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ یہ دوسرے لوگوں سے الگ کسی جگہ قیام فرمائیں، چنانچہ ربذہ کے مقام پر ایک جنگل میں انھوں نے اپنا اکیلا جھونپڑا ڈال لیا تھا، اور وہیں وفات پائی۔ جس واقعہ کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ ان کی وفات ہی کا واقعہ ہے۔

جب ان کی حالت نازک ہوئی اور ان کی بیوی کو (جو اس جنگل بیابان میں تنہا ان کی رفیقہ تھیں) موت کے آثار محسوس ہوئے تو وہ فکرمند اور پریشان ہوئیں، اور ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، حضرت ابوذرؓ نے ان کی اس حالت کو دیکھا تو پوچھا کیوں اتنی پریشان ہو اور کیوں روتی ہو؟ انھوں نے کہا آپ کی یہ حالت ہے اور میں یہاں بالکل اکیلی ہوں۔ (اُنکا مطلب یہ تھا کہ اگر حکم الٰہی آگیا تو میں عورت ذات اکیلی کس طرح آپ کے کفن دفن کا انتظام کرسکوں گی)۔

حضرت ابوذرؓ نے کہا، فکر نہ کرو اور پریشان نہ ہو مجھے یقین ہے کہ اللہ کے کچھ بندے میرے کفن دفن کے لئے ضرور پہنچیں گے، جب اللہ کا فرشتہ میری روح قبض کرلے، تو تم چادر سے مجھے ڈھانک کر قریب سے گذرنے والی سڑک پر چلی جانا،

وہاں سے مسلمانوں کا کوئی قافلہ گذرتا ہوا تمھیں انشاء اللہ نظر آئے گا، تم اُن سے کہہ دینا کہ ابوذرؓ کا یہاں انتقال ہو گیا ہے، وہ تم کو سلام کہہ گیا ہے، اور تم ہی کو اس کی تجہیز و تکفین اور دفن کا کام کرنا ہے ــــــــ یہ قریب سے گذرنے والی سڑک کوفہ سے مکہ معظمہ جانے والی سڑک تھی، اور چونکہ حج کا زمانہ بالکل قریب تھا، اور حج کے لئے مکہ جانے والے قافلے جا چکے تھے، اور اب سڑک کئی دن سے سنسان پڑی تھی، شاید اسلئے ان کی بیوی کو اس میں تردد اور تعجب ہوا اور انھوں نے پوچھا کہ آپ یہ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں؟

حضرت ابوذرؓ نے فرمایا، بات یہ ہے کہ ایک دن ہم چند آدمی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر تھے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں ایک آدمی وہ ہے جو آبادیوں سے دور ایک جنگل میں انتقال کرے گا، اور اللہ اپنے کچھ بندوں کو بھیجے گا جو وہاں پہنچکر اس کے کفن دفن کا انتظام کریں گے۔" (حضرت ابوذرؓ نے فرمایا) کہ اُس مجلس میں میرے سوا جتنے بھی میرے دوست تھے وہ سب کسی نہ کسی شہر میں انتقال کر چکے ہیں، اُن میں سے اب صرف میں ہی باقی ہوں، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات یقیناً صحیح ہونے والی ہے، اور اب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وقت آگیا ہے، اسلئے مجھے بالکل یقین ہے کہ اللہ کے کچھ بندے جن کی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خبر دی ہے ضرور پہونچیں گے، اور میری قبر تیار کرنے اور دفن کرنے کا کام تمھیں انجام دینا نہیں پڑے گا، اللہ [illegible] کی وجہ سے فکر مند نہ ہو، بلکہ تیاریاں کرو، میرا وقت قریب ہے، روح قبض کرنے کے لئے اللہ کے فرشتے آنے والے ہیں، فرشتوں کو خوشبو مرغوب ہے، لہذا وہ جو ذرا سا مشک کہیں رکھا ہوا ہے پانی میں گھول کے اُس کو خیمہ پہ چھڑک دو، اور اللہ کے جو بندے مجھے دفن کرنے کے لئے پہونچیں گے اُن کی مہمانی کے لئے بکری کا بچہ ذبح کر کے گوشت چولہے پر چڑھا دو، انھیں میری طرف سے کہہ دینا کہ وہ کھانا کھا کر جائیں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، حضرت ابوذرؓ کی روح جب ملاء اعلیٰ کی طرف چلی گئی تو جیسا کہ انھوں نے حکم دیا تھا جسم پر چادر ڈھانک کر ان کی بیوی سڑک پر جا بیٹھیں، تھوڑی ہی دیر کے بعد کچھ غبار سا اُڑتا نظر آیا، یہ ایک قافلہ تھا جو نہایت تیز رفتار اونٹنیوں پر کوفہ سے بھاگم بھاگ چلا آ رہا تھا (اس قافلے میں فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے چند ساتھی تھے)[1] جب قافلہ قریب آیا تو حضرت ابوذرؓ کی بیوی نے ان کو [illegible] کا، اور حضرت ابوذرؓ کے انتقال کی اطلاع دی، اور ان کا پیام پہنچایا، یہ حضرات انا للہ پڑھتے ہوئے فوراً اونٹنیوں سے اُتر گئے، پھر حضرت ابوذرؓ کو انھوں نے ہی غسل دیا۔ اسی قافلے کے ایک انصاری نوجوان نے کفن کے لئے دو چادریں دیں جو اپنے احرام کے لئے وہ گھر سے لے کر چلے تھے (ابوذرؓ نے اپنے لئے کفن بھی نہیں چھوڑا تھا) ان ہی

---

[1] حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو حضرت عثمانؓ کا حکم کوفہ میں پہونچا تھا کہ فوراً مکہ معظمہ آکر مجھ سے ملو، وقت چونکہ نہایت تنگ تھا اسلئے یہ قافلہ غیر معمولی تیز رفتاری سے مکہ معظمہ کی طرف جا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا درصل یہ انتظام فرمایا تھا۔

حضرات نے قبر تیار کر کے دفن کیا، اور وصیت کے مطابق کھانا کھا کے واپس ہوئے (اور جیسا کہ روایات میں ہے حضرت ابوذرؓ کے گھر والوں کو بھی اپنے ساتھ مکہ معظمہ لے گئے)۔

حضرات! مجھے اس واقعہ کے جس جز کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانی ہے وہ حضرت ابوذرؓ کا یقین ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کسی مجلس میں فرمایا تھا، کہ تم میں سے ایک شخص اس طرح جنگل میں انتقال کرے گا، اور اُس کو دفن کرنے کے لئے اہل ایمان کی جماعت عین وقت پہنچیں گے۔ چونکہ حضرت ابوذرؓ کے سوا اس مجلس کے سب حاضرین شہروں اور بستیوں میں انتقال کر چکے تھے اسلئے انھیں کامل یقین تھا کہ اب میرے ساتھ یہ واقعہ ضرور پیش آئے گا۔

اور اگرچہ حج میں تھوڑا وقت رہ جانے کی وجہ سے قافلوں کی آمد و رفت اُس وقت اُس راستے سے نہیں ہو رہی تھی اور اسلئے کسی قافلہ کا ادھر سے گذرنا بظاہر خلاف قیاس سا تھا، لیکن اس کے باوجود انھیں پورا پورا یقین تھا، ایسا یقین کہ آنے والوں کے لئے وہ کھانا تیار کرنے کا بھی حکم دیتے ہیں، اور بکری کا بچہ ذبح کرا کے چولھے پر چڑھوا دیتے ہیں۔

ایمان دراصل اللہ و رسول کی باتوں پر اسی قسم کے یقین کا نام ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ صحابہ کرامؓ کے حالات میں اس قسم کے واقعات بڑی کثرت سے ملتے ہیں، میں نے تو صرف اپنی بات سمجھانے کے لئے بطور مثال کے یہ دو واقعے نقل کر دیئے ہیں۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں ایک صحابیؓ کے چند شعر ہیں، ان میں کا ایک شعر ہے۔ ؎

أرانا الهدى بعد العمى فقلوبنا

به موقنات أن ما قال واقع

یعنی ہم گمراہ تھے، آپؐ نے ہمیں راہِ ہدایت دکھائی، اب ہمارے دلوں کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ جو کچھ آپؐ نے فرمایا ہے، وہ سب ہونے والا ہے۔

تو صحابہ کرام کا یہ عام حال تھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بتلائی ہوئی ہر بات پر ان کے دلوں کو پورا پورا یقین تھا، ایسا ہی یقین جیسا کہ اپنی آنکھوں دیکھی چیزوں پر ہوتا ہے، بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔

اسی یقین اور اسی ایمان کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کی زندگیوں کا نقشہ بالکل بدل گیا تھا ——— شراب جس کے وہ عمر بھر کے عادی تھے، بلکہ جو گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، جب اُس کے حرام ہونے کا حکم آیا، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے اس کا اعلان کیا گیا تو مدینہ کی پوری آبادی میں کوئی ایک شراب پینے والا نہیں رہا، شراب کے بھرے برتن اوندھا دیئے گئے بلکہ توڑ ڈالے گئے، گھر گھر شراب کی بھٹیاں بنی ہوئی تھیں سب توڑ پھوڑ کے اسی وقت برابر کر دی گئیں، یہ سب دراصل اسی اصلی یقین اور اصلی ایمان کا کرشمہ تھا۔

بعض صحابہؓ سے کبھی کبھی گناہ بھی ہوئے ہیں، لیکن بعد میں ان گناہوں کا جو ردّ عمل ہوا ہے، اور جس طرح انھوں نے

اس کی تلافی کرنی چاہی اُس سے پتہ چلتا ہے کہ ان گناہ کرنے والے صحابہ میں بھی اللہ و رسول کی باتوں پر ایمان و یقین کس درجہ کا تھا۔

ماعز اسلمی ایک صحابی ہیں، ان سے ایک دفعہ ایک بہت بڑا گناہ ہو گیا، یعنی وہ بے چارے زنا کے مرتکب ہو گئے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے زنا کے عذاب کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اس پر انھیں ایسا یقین تھا جس نے ان کے لئے جینا ناممکن کر دیا، یہ شادی شدہ تھے اور انھیں معلوم تھا کہ شادی شدہ آدمی سے اگر زنا کا گناہ ہو جائے تو شریعت کے قانون میں اس کی سزا سنگساری ہے یعنی اُس شخص کو پتھر مار کے ختم کر دیا جاتا ہے، اس کے باوجود ان کے ایمان و یقین نے انھیں مجبور کیا، اور انھوں نے خود آ کر اپنے اس گناہ کی اطلاع حضورؐ کو دے کر اپنے کو سنگسار کرانے کی درخواست کی، اور وہ سنگسار کئے گئے۔

اسی طرح مدینہ کے قریب کے کسی دیہات کی رہنے والی ایک صحابی عورت کا واقعہ حدیثوں میں نقل کیا گیا ہے، کہ اُس بیچاری سے بھی ایک دفعہ یہی بڑا گناہ ہو گیا جس کی کسی کو کچھ بھی خبر نہ تھی۔ لیکن زناکاروں کے عذاب کے متعلق اُس نے جو کچھ سُنا تھا اُس پر اسے ایسا یقین تھا کہ اُس نے بھی اپنے گناہ کی خود ہی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اطلاع دے کر آپ سے سنگسار کرانے کی درخواست کی، تاکہ دنیا میں یہ سزا پاکر وہ آخرت کے سخت عذاب سے بچ جائے، اور پھر جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اُس کے ہی بیان سے یہ معلوم ہوا کہ وہ حمل کی حالت میں ہے، اور آپ نے یہ کہہ کر اُس کو اس وقت واپس کر دیا کہ اس حالت میں سزا نہیں دی جا سکتی، جب ولادت سے فارغ ہو جاؤ تب تم آنا۔ تو وہ اللہ کی بندی اس وقت تو چلی گئی، لیکن بچہ پیدا ہونے کے بعد فوراً خود بخود پھر سنگسار ہونے کے لئے حاضر ہو گئی، لیکن اس دفعہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُسے یہ فرما کر واپس کر دیا کہ ابھی بچے کو تمھارے دودھ کی ضرورت ہے، اسلئے اتنے دنوں تک اس کو پرورش کرو کہ تمھارے دودھ کی اسے ضرورت نہ رہے، اور روٹی ٹکڑا کچھ کھانے لگے۔ جب ایسا ہو جائے تب آنا۔ وہ پھر چلی گئی، اور کافی مدت کے بعد جب وہ بچہ روٹی ٹکڑا کھانے کے قابل ہو گیا تو پھر خود بخود حاضر ہوئی اور دیکھنے والے صحابی نقل کرتے ہیں کہ وہ خدا کی بندی اس حال میں حاضر ہوئی کہ اپنے بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا دے رکھا تھا جس کو وہ کھا رہا تھا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا کہ حضور آپ دیکھ لیجئے اب یہ روٹی کھانے کے قابل ہو گیا ہے، اب اسے میرے دودھ کی ضرورت نہیں رہی ہے، لہٰذا اب مجھے سنگسار کرا ہی دیا جائے، تاکہ دنیا میں اپنے گناہ کی یہ سزا پاکر میں آخرت کے عذاب سے بچ سکوں۔

حضرات! یہ واقعات ہیں واقعات! افسانے نہیں ہیں۔ دراصل ایمان و یقین میں یہی طاقت ہے، آج اگر اس قسم کے واقعات ہماری دنیا میں نہیں ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس اصلی ایمان و یقین سے خالی ہیں، اور پھر اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ایمان والوں سے جو بڑے بڑے وعدے کئے گئے تھے، اور جو بڑی بڑی بشارتیں سنائی گئی تھیں ان کا آج

کہیں ظہور نہیں ہو رہا ہے۔

اگر ہم ان وعدوں کی امید پر آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تو یہ ہماری بہت بڑی غلطی ہے، ہمیں اپنے اندر کی طرف دیکھنا چاہیئے!۔

قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ وعدے ہیں، ہر جگہ ایمان کی صفت اور ایمان والی زندگی کی شرط کے ساتھ ہیں یعنی یہ وعدے کسی ایسی قوم کے حق میں نہیں ہیں جو اپنے کو مسلمان تو کہے لیکن اصلی ایمان ویقین اور ایمان ویقین والی زندگی سے وہ خالی ہو، بلکہ اُس جماعت اور اس گروہ کے لئے ہیں جس میں ایمان کی یہ صفت موجود ہو، اور جس نے ایمان ہی کو اپنی زندگی کی بنیاد بنالیا ہو ——— "ان اللہ یدافع عن الذین آمنوا" ——— "کان حقاً علینا نصر المومنین" ——— "انتم الاعلون ان کنتم مومنین" ——— اس طرح کی سب آیتوں میں ایمان کی شرط کے ساتھ نصرت وحمایت اور سرفرازی اور سربلندی عطا کرنے کے وعدے فرمائے گئے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ اس وقت مسلمان کہلانے والی اور ایمان کا دعوی کرنے والی کروڑوں کی اس امت میں لاکھوں کی تعداد میں، بلکہ شاید ہزاروں کی تعداد میں بھی اصلی ایمان رکھنے والے موجود نہیں ہیں۔

ہمارے محترم مولانا علی میاں نے جیسا کہ کل فرمایا تھا، واقعہ یہی ہے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کا ایمان بس کچھ اسی طرح کا اور اسی درجہ کا ہے جیسا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کے وقت اگلے پیغمبروں کی امتوں میں خاص کر بنی اسرائیل میں رہ گیا تھا، جو نہ تو اُن سے بے ایمانی چھڑا سکتا تھا نہ حرامخواری، نہ فریب کاری، نہ جھوٹ، نہ رشوت، نہ ظلم، نہ بے انصافی، کہنے کو وہ اپنے اپنے پیغمبروں، اور اپنے اپنے مذہب کی کتابوں پر ایمان کے مدعی تھے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ آج کل کے ہم مسلمانوں ہی کی طرح زبانی اقرار کے علاوہ وہ دل سے بھی اپنے پیغمبروں اور اپنی کتابوں اور اپنے مذہبی احکام کو سچا اور صحیح ہی سمجھتے تھے، لیکن ان کا یہ ایمان ویقین اتنا بوسیدہ اور اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ عام طور سے زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ان میں بہت سے ایسے تھے کہ چار پیسے کے نفع کے لئے جھوٹ بولنے سے بھی ان کا ایمان ان کو نہیں روک سکتا تھا، ان کے عام علماء اور ان کے مذہبی درویش تک اصلی ایمان اور ایمان والی زندگی سے خالی تھے، اور بس معدودے چند تھے جنکی ایمانی اور دینی حالت بہتر تھی[1] ——— قرآن مجید میں جا بجا ذکر کیا گیا ہے کہ ان کی اسی حالت کی وجہ سے اللہ نے اپنی نعمتوں سے ان کو محروم کردیا، اور مقبول ہونے کے بعد وہ اللہ کے یہاں سے مردود ہو گئے۔

ان سب باتوں کو سامنے رکھ کر ہمیں آپ کو سنجیدگی سے اپنے بارے میں سوچنا چاہیئے، تو جیسا کہ کل مولانا علی میاں نے

---

[1] بعثت نبوی کے زمانہ کے متعلق صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے: "ان اللہ نظر الی اھل الارض فمقتھم عربھم وعجمھم الا بقایا من بنی اسرائیل - وفی روایۃ الا بقایا من اھل الکتاب - ۱۲-

فرمایا تھا، اور آج میں نے عرض کیا، ہمارے نزدیک مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اصلی ایمان و یقین جو ان کا اصل سرمایہ تھا اور جس کی وجہ سے اللہ کا بھی ان کے ساتھ خاص معاملہ تھا اس کو پھر سے پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

شاید آپ کے دل میں سوال پیدا ہو کہ کیا اس زمانہ میں بھی ایسا ایمان پیدا ہو سکتا ہے؟ میں کہتا ہوں جی ہاں! پیدا ہو سکتا ہے، اور یقیناً ہو سکتا ہے، لیکن میرا مطلب اس سے یہ نہیں ہے کہ ہم سب میں صدیق اکبرؓ کے درجہ کا ایمان پیدا ہو سکتا ہے۔ صدیق اکبرؓ کے درجہ کا ایمان تو سب صحابہ میں بھی نہیں تھا، بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اوروں کا کیا ذکر حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، اور حضرت علیؓ میں بھی نہیں تھا ——— بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اللہ و رسولؐ کی باتوں پر ایسا یقین جیسا اپنی دیکھی بھالی اور آزمائی ہوئی چیزوں پر ہوتا ہے اور جو زندگی کو اپنے اثر میں لے لیتا ہے، بس یہ یقین انشاء اللہ ہر اُس شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جو دیانت داری کے ساتھ اس کو حاصل کرنا چاہے ——— لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہر چیز کے حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے، اور اگر اُس طریقے سے کوشش کی جائے تو وہ چیز حاصل ہو جاتی ہے، یہی حال ایمان و یقین کا بھی ہے، اور الحمد للہ ہمارے سامنے اس کے پیدا کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

یہ دینی دعوت اور دینی تحریک جس کو آپ لوگ تبلیغی تحریک اور تبلیغی جماعت کہا کرتے ہیں، اُس کے سامنے یہی مسئلہ اور یہی مقصد ہے، اور اس کے لئے اس کا ایک خاص پروگرام ہے۔ اور آج کل آپ کے شہر میں جو یہ اجتماعات ہو رہے ہیں، یہ اُسی سلسلہ کے دعوتی اجتماعات ہیں۔ اور ہم لوگ جو آپ کے دینی بھائی اور خادم ہیں، اور آپ میں سے بہت سے ہم کو ذاتی طور پر بھی جانتے ہیں ہم ایمان داری سے اس تحریک کو اور اس کے پروگرام کو صحیح سمجھتے ہیں، اور ہمیں پورا یقین ہے کہ اگر اُمت نے اس تحریک کو قبول کیا، اور اس کو اپنایا، تو انشاء اللہ وہ ایمان و یقین، اور ایمان و یقین والی زندگی اپنے سب آثار اور لوازم کیساتھ امت میں عام ہو سکتی ہے۔

میرے بزرگو اور بھائیو! ہم آپ سے چندہ نہیں مانگتے، ہم آپ سے یہ بھی نہیں کہتے کہ آپ ہماری کسی انجمن یا جماعت کے رکن یا ممبر بن جایئے، ہم نے رکنوں اور ممبروں والی اور چندہ والی کوئی انجمن یا جماعت نہیں بنائی ہے، ہم آپ سے یہ بھی نہیں کہتے کہ آپ فلاں بزرگ سے یا فلاں سلسلہ میں بیعت ہو جایئے، بلکہ ہم آپ سے صرف اتنا چاہتے ہیں کہ آپ یہ فیصلہ کر لیجئے کہ آپ خود اپنے اندر اور اپنے دوسرے بھائیوں میں اصلی ایمانی اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے کی اس کوشش میں اپنے حالات کے مطابق حصہ لیا کریں گے۔ آپ کو ہماری بس یہی دعوت ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کے شہر میں (ندوہ کی مسجد میں ہر جمعرات کو) اس سلسلہ کا ہفتہ وار اجتماع ہوتا ہے، اور جماعتیں دین و ایمان کی اس دعوت کو لیکر مختلف شہروں اور دیہاتوں کی طرف برابر جایا کرتی ہیں۔ بس ان دونوں کاموں میں آپ کی شرکت ہی ایمان پیدا کرنے والی کوشش میں آپ کی شرکت ہوگی۔

اس سلسلہ کے ہمارے ہفتہ وار اجتماع میں کیا ہوتا ہے، اور باہر جانے والی جماعتیں کس طرح اپنا کام کرتی ہیں، اور

ان کا کیا پروگرام ہوتا ہے۔ یہ تفصیلی باتیں ہیں اگر عرض بھی کروں تو آپ کے لئے زیادہ مفید نہ ہوں گی اسلئے میں یہی عرض کروں گا کہ آپ اپنے ان بھائیوں پر اعتماد کر کے جن کے متعلق کم از کم اتنا ضرور آپ کو تجربہ ہے کہ وہ آپ سے کسی ذاتی نفع کے طالب نہیں ہیں، اور نہ وہ آپ کی مدد سے کوئی عہدہ اور عزت کا کوئی مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں، نہ اس قسم کا کوئی اور ذاتی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

بہرحال آپ اپنے اُن دینی بھائیوں پر اعتماد کر کے جنھوں نے آپ کو کبھی دھوکہ نہیں دیا ہے، اور کبھی آپ سے کوئی ناجائز فائدہ حاصل نہیں کیا ہے، پہلے تجربہ اور دیکھ بھال ہی کے لئے شریک ہوں، اور جب آپ کو یہ اطمینان ہو جائے کہ ہاں اس راستے سے اپنی اور اپنے دوسرے بھائیوں کی دینی اور ایمانی حالت انشاء اللہ ضرور کچھ بہتر ہو سکتی ہے، تو اُس وقت آپ ساتھ دینے کا مستقل فیصلہ فرمائیں۔

آپ ہماری یہ بات مان کر انشاء اللہ اپنا کچھ کھوئیں گے نہیں، بلکہ پائیں گے، اور خدا نے چاہا تو دیکھ لیں گے کہ آپ نے کیا پایا۔

بزرگو اور بھائیو!

ہم آپ کو اس کام کی طرف بلاتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کا خاص کام تھا، اور آج بھی اس میں اپنی قوتوں کو صرف کرنا، اللہ کو راضی کرنے کا اور انبیاء علیہم السلام کی ارواحِ طیبہ کو خوش کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اور اس میں خود آپ کی بھی حیات اور نجات ہے۔ یا ایھا الذین اٰمنوا استجیبوا للّٰہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم واعلموا ان اللّٰہ یحول بین المرء وقلبہ وانہ الیہ تحشرون ۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین ؏

نفس پرستی یا خدا پرستی؟

"مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی وہ تقریر جو دعوت اصلاح و تبلیغ کے تیسرے عام اجتماع میں ۲۸ نومبر کی شب کو امین الدولہ پارک میں کی گئی، اس اجتماع میں ہر مذہب و خیال کے لوگ موجود تھے، بڑی تعداد میں غیر مسلم بھی شریک تھے حاضرین کا اندازہ دس بارہ ہزار کا کیا جاتا ہے۔ اس تقریر کا خلاصہ متعدد اخبارات میں شائع ہو چکا ہے، یہاں مفصل تقریر درج کی جاتی ہے ——————— (ادارہ)

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ———————

آ میسر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے!
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے رہے نہ رہے

دوستو!

میں اس وقت آپ سے کچھ دل کی باتیں کہنا چاہتا ہوں، اور اس طرح کہنا چاہتا ہوں جیسے میں آپ میں سے ہر ایک کے ساتھ تنہا بیٹھا ہوا گفتگو کر رہا ہوں۔ فی الواقع اگر اس کا کوئی امکان ہوتا کہ آپ میں سے ہر دوست سے الگ ہی الگ اپنے دل کی بات کہہ سکتا تو میں ضرور ایسا ہی کرتا، تاکہ آپ اُسے تقریر سمجھ کر نہیں، بلکہ ایک دوست کا دردِ دل سمجھ کر سُنتے، مگر کیا کروں ایسا ممکن نہیں ہے۔ اگر یہ چیز ممکن ہوتی تو الیکشن میں کھڑے ہونے والے اُمیدوار ضرور اس پر عمل کرتے، اور وہ اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں جلسے منعقد نہ کرتے، اسلئے کہ انھیں تو ان جلسوں میں وہ باتیں کہنا ہوتی ہیں جو تنہائیوں میں لے جا کر کسی کے کان میں بھی کہنا گراں ہوتی ہیں، یعنے اپنی تعریف، اپنی اہلیت کا اظہار، اور اپنی شان میں اپنے آپ ہی قصیدہ خوانی۔ اسلئے میں بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ سے یہ درخواست کروں کہ براہِ کرم میری گذارشات کو اسٹیج کی نہیں، بلکہ دل کی باتیں سمجھ کر سُنئے۔

دوستو، اور بزرگو!

دنیا میں زندگی کے بہت سے طرز رائج ہیں اور اسکی بہت سی قسمیں سمجھی جاتی ہیں، مشرقی زندگی، مغربی زندگی، جدید طرزِ زندگی، قدیم

طرزِ زندگی وغیرہ وغیرہ، لیکن حقیقت میں زندگی کی بنیادی قسمیں صرف دو ہیں۔ ایک نفس پرستانہ زندگی، دوسری خدا پرستانہ زندگی، باقی جتنی قسمیں جتنے مختلف ناموں سے مشہور ہیں وہ سب ان ہی دو کی شاخیں ہیں۔

پہلی قسم کی زندگی یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ایک شتر بے مہار سمجھ کر زندگی گذارے، اور جو من میں آئے وہ کر گزرے، اس کو من مانی زندگی بھی کہہ سکتے ہیں، دوسری قسم کی زندگی ایک ایسے آدمی کی زندگی ہے جو یقین رکھتا ہے کہ اُسے کسی نے پیدا کیا ہے وہ پیدا کرنے والا ہی اسکی زندگی کا مالک اور حاکم ہے، وہ اسکی ضرورتوں اور مصلحتوں کو سب سے زیادہ جانتا ہے، اس کی طرف سے زندگی گذارنے کے کچھ ضابطے اور قاعدے ہیں جن کی پابندی کرنا ضروری ہے۔

ہندوستان میں مہابھارت ایک بہت بڑی تاریخی لڑائی ہوئی ہے، مجھے اسکی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں ہے مگر اس دنیا میں ایک دوسری مہابھارت بھی پائی جاتی ہے، یہ ہندوستان کی مشہور مہابھارت سے زیادہ قدیم ہے، یہ وہ لڑائی ہے جو خدا پرستی اور نفس پرستی کے درمیان ہمیشہ سے جاری ہے، یہ لڑائی کسی ایک ملک ہی تک محدود نہیں رہی ہے، بلکہ دنیا کے ہر ہر ملک میں پہونچی، اور نہ یہ جنگ کے میدانوں ہی تک محدود رہی، بلکہ اسکے معرکے گھروں کے اندر بھی ہوئے ہیں، یہ زندگی کے دو اصول ہیں جو ہمیشہ ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ حضرات پیغمبران نے اپنے اپنے وقتوں میں ہر جگہ خدا پرستانہ زندگی کی دعوت دی ہے، اور انکی کامیابی کے دور میں اسی قسم کی زندگی کا دور دورہ رہا، لیکن نفس پرستی ہمیشہ کے لئے کبھی فنا نہیں ہوئی، بلکہ اُسے جب بھی موقع ملا وہ زندگی پر قابض ہو گئی۔ بدقسمتی سے ہمارا زمانہ وہ ہے جس میں نفس پرستی زندگی پر پوری طرح مسلّط ہے، زندگی کا ہر شعبہ اور ہر میدان اسکی گرفت میں آیا ہوا ہے، گھروں میں نفس پرستی، بازاروں میں نفس پرستی، دفتروں میں نفس پرستی، کارخانوں میں نفس پرستی، —— گویا ایک سمندر ہے جو خشکی میں پورے زور شور سے بہہ رہا ہے، اور ہم اس میں گلے گلے اُترے ہوئے ہیں۔ یہ نفس پرستی اب مستقل ایک مذہب بن چکا ہے۔ نہیں! بلکہ ہمیشہ سے اسکی یہ نوعیت رہی ہے اور عموماً اسی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد سب سے زیادہ رہتی ہے، ہر چند کہ مذاہب کی فہرست میں اس نام کا کوئی مذہب نہیں بتلایا جاتا، اور نہ اس نام سے کسی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد کا شمار کیا جاتا ہے، مگر یہ اپنی جگہ بالکل حقیقت ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے، اور اسکے ماننے والے سب سے زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ آپ کے سامنے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے اعداد شمار آتے ہیں کہ عیسائی مذہب کے پیرو اتنے، اسلام کے پیرو اتنے، اور ہندو دھرم کے ماننے والے اتنے، مگر ان میں سے ہر ایک میں ایک بڑی تعداد اُن لوگوں کی ہے جو کہلاتے تو ہیں مذہباً عیسائی، ہندو، اور مسلمان، لیکن ہیں درحقیقت اسی مذہب نفس پرستی کے پیرو!۔

نفس پرستی کی زندگی کا رواج، اور اس مذہب کی مقبولیت صرف اِسو جہ سے ہے کہ آدمی کو اس میں مزہ بہت آتا ہے، مانا کہ نفس پرستی کی زندگی بڑے مزے کی اور بڑے لُطف کی زندگی ہے، اور ہر آدمی کی طبعی خواہش لُطف اندوزی ہوتی ہے، لیکن اگر دنیا کے تمام انسانوں کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو پھر اس قسم کی زندگی دنیا کیلئے ایک لعنت ہے، اور اسکی ساری مصیبتیں اُ

سارے دکھ اسی نفس پرستی کا نتیجہ ہیں، اور دنیا کی ساری تباہیوں، تمام قحطوں اور ناانصافیوں کی ذمہ داری انھیں لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو اس منحوس مذہب کے پیرو ہیں۔

اس دنیا میں اس مذہب کی گنجائش صرف اس صورت میں نکل سکتی ہے کہ پوری دنیا میں صرف ایک انسان کا وجود ہو، اسی صورت میں وہ اپنے نفس کی مانگوں کو من مانے طور پر پورا کرنے کا حقدار ہوسکتا ہے، لیکن واقعہ یوں نہیں ہے، اس دنیا کے پیدا کرنے والے نے اس میں کروروں اور اربوں انسانوں کو بسایا ہے، اور اُن میں سے ہر ایک کے ساتھ نفس، خواہشاتِ نفس، اور ضروریاتِ نفس لگی ہوئی ہیں۔ ایسی صورت میں جو شخص بھی من مانی زندگی گذارنے کی کوشش کرتا ہے وہ گویا اس واقعہ سے آنکھ بند کرتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کے اور بھی ہمجنس رہتے ہیں۔ لیکن واقعہ سے آنکھیں بند کرنے سے واقعہ غلط نہیں ہوجاتا، وہ اپنی جگہ پر رہتا ہے، اسلئے کچھ لوگوں کی نفس پرستی کا نتیجہ لامحالہ دوسروں کی مشکلات اور مصائب کی شکل میں نکلے گا۔

نفس پرستی کی زندگی گذارنے والا من کا راجہ ہوتا ہے، من کا راجہ وہ راجہ ہے کہ اگر ساری کائنات میں بھی اسکی خواہشات کا سکہ چلے، تو اس کا پیٹ اتنے میں بھی نہیں بھر سکتا، وہ اس سے اور زیادہ کا خواہش مند رہے گا ـــــ غور فرمائیے جب ساری کائنات بھی ایک من کے راجہ کی تسکین کیلئے ناکافی ہے تو آج جو ایک ایک گھر کی محدود سی دنیا میں کئی کئی من کے راجہ پائے جاتے ہیں تو وہ کیونکر تسکین اور چین پاسکتے ہیں۔ اس نفس پرستی کے مرض نے ایک ایک گھر میں چار چار من کے راجہ پیدا کردیئے ہیں، باپ بھی راجہ، ماں بھی رانی، بیٹا بھی راجہ، اور بیٹی بھی اپنے من کی رانی، تو کیونکر گھروں میں چین اور سکون رہ سکتا ہے؟ یہ نفس پرستی کی زندگی جسکو ہر شخص گذارکر مزہ حاصل کرنا چاہتا ہے ایک آگ بنی ہوئی ہے جس میں ایک گھر کے افراد بھی جل رہے ہیں، ایک ملک کی قوم بھی جل رہی ہے اور دنیا کی پوری آبادی جھلس رہی ہے۔

دوستو! دنیا کی مصیبتوں کی جڑ یہی ہے کہ ہر شخص اپنے نفس کی اطاعت کرنا چاہتا ہے، اور ان مصیبتوں کا علاج یہ ہے کہ من کا کہا ماننے کے بجائے خدا کی اطاعت کرو۔ یہ دنیا کروروں کی تو کیا، دو آدمیوں کی بھی من مانی زندگی کی گنجائش اپنے اندر نہیں رکھتی، اسلئے من مانی زندگی گذارنے کے خیال کو چھوڑ دو، اور اس طرح زندگی گذارنے کی کوشش کرو جس کا پیغام اللہ کے پیغمبروں نے دیا تھا یعنی خدا پرستی کی زندگی۔ اس دنیا کے پیدا کرنے والے نے ہر زمانہ میں اس زندگی کے پیغامبر پیدا کئے، کیونکہ اسی طرزِ زندگی سے دنیا کا نظام ٹھکانے سے چل سکتا تھا، ان پیغمبروں نے پوری طاقت سے اس طرز زندگی کی دعوت دی، اور نفس پرستی کا زور توڑنے کی اپنی طاقت بھر پوری کوشش کی، لیکن جیسا کہ میں شروع میں عرض کرچکا ہوں پھر بھی نفس پرستی کا رواج دنیا سے مٹا نہیں، اور جب بھی خدا پرستی کی دعوت کمزور پڑی نفس پرستی کا رواج بڑھ گیا، اور اس کا سیلاب آتے ہی دنیا کے عام لوگوں کی مصیبتیں بھی بڑھ گئیں، اور ناقابل برداشت حد تک پہونچ گئیں۔ مثال کے طور پر چھٹی صدی عیسوی کا زمانہ دیکھئے، اس صدی میں نفس پرستی کی زندگی کا رواج انتہائی عروج کو پہونچ گیا تھا، ملک ملک اس کا دور دورہ تھا، یہ ایک بہتا ہوا دریا تھا جسکے دھارے پر ہر چھوٹا بڑا بہہ رہا تھا، بادشاہ اپنی نفس پرستی میں مبتلا تھے، رعایا انکی نقل میں نفس پرستی کا شکار تھی۔ مثال کے طور پر ایران کا حال

بیان کرتا ہوں:۔ وہاں قوم کا ہر طبقہ نفس پرستی کا بیمار تھا۔ شاہ ایران کی نفس پرستی کا حال یہ تھا کہ اُسکی بیویوں کی تعداد بارہ ہزار تھی، جب مسلمانوں نے اُس ملک کو اس مصیبت سے نجات دلانے کیلئے حملہ کیا، اور ایران کا بادشاہ تخت چھوڑ کر بھاگا تو ایسے نازک وقت میں بھی یہ حال تھا کہ اُسکے ہمراہ ایک ہزار باورچی تھے، ایک ہزار گویئے تھے، اور ایک ہزار باز اور شکرے کے محافظ و منتظم تھے، مگر اس پر بھی اُسکو افسوس تھا کہ بڑی بے سروسامانی میں نکلنا ہوا ہے۔ اُس زمانہ کے جنرل اور سپہ سالار ایک ایک لاکھ کی ٹوپی، اور ایک ایک لاکھ کا پٹکا لگاتے تھے، اونچی سوسائٹی میں معمولی کپڑا پہننا گویا جرم تھا، لیکن اس طبقہ کی نفس پرستی نے عوام کو کن مشکلات میں مبتلا کر دیا اسکا اندازہ اس سے کیجئے کہ کسانوں کا حال یہ تھا کہ وہ لگان بھی نہیں دے سکتے تھے، اور زمینیں چھوڑ چھوڑ کر خانقاہوں اور عبادت گاہوں میں جا بیٹھتے تھے۔ متوسط طبقہ کے لوگ اُمراء کی ریس میں دیوالیہ ہوئے جا رہے تھے، چنانچہ معاشی لوٹ کھسوٹ برپا تھی، غرض زندگی کیا تھی، ایک ریس کا میدان تھی، ظلم و زیادتی عام تھی، ہر بڑا اپنے چھوٹے کو، اور حاکم اپنے محکوم کو لوٹنے، اور اُس کا خون چوسنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا، اور پوری سوسائٹی میں ایک سڑاہند پھیلی ہوئی تھی۔ آپ سمجھتے ہیں کہ ایسی سوسائٹی میں عقائد، اخلاق، اور کیریکٹر کیسے پنپ سکتا ہے، اور کس کو آخرت کی فکر اور اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس رہ سکتا ہے؟ ان تمام اعلیٰ چیزوں کو تو وہ نفس پرستی کا سیلاب بہائے لئے چلا جا رہا تھا، لیکن کوئی نہ تھا جو اس سیلاب پر بند باندھتا، اور اس دھارے کو روکتا۔ علماء، ادبا، اور فلاسفہ سب اسی کے رُخ پر تنکوں کی طرح بہہ رہے تھے۔ کسی میں ہمت نہ تھی جو دھارے کے رُخ کے خلاف پیر کر دکھاتا، اور دھارا بھی کون سا؟ پانی کا نہیں، عام رواج کا دھارا! اسکی ہمت ایک شیر دل انسان ہی کر سکتا ہے۔ اللہ کو منظور تھا کہ اس دھارے کا رُخ موڑا جائے، اس کام کیلئے اُس نے عرب میں ایک انسان کو پیدا کیا اور اُس کو نبوت عطا کی، جس کو ہم محمد رسول اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں، (صلی اللہ علیہ وسلم) انھوں نے دھارے کے خلاف صرف پیر کر ہی نہیں، بلکہ اس کا رُخ موڑ کر دکھا دیا —— اُس وقت کسی ایسے آدمی سے کام نہیں چل سکتا تھا جو دھارے کا رخ تو نہ موڑ سکے، بلکہ اُس میں بہنے والی چیزوں کو نکال لائے اسلئے کہ اُس وقت کوئی ایسا محفوظ مقام نہ تھا، جہاں اس سیلاب کا دھارا نہ چل رہا ہو۔ عبادت گاہوں اور کلیساؤں تک کو تو اس سیلاب نے اپنی زد میں لے رکھا تھا، اس سمندر میں کوئی ٹاپو نہ تھا، اور اگر تھا تو وہ بھی آن خطرے کی زد میں تھا۔ ایمان، اخلاق، شرافت، تہذیب، اور مختصر الفاظ میں انسانیت کی رُوح کو اس سیلاب سے بچانے کا کام اگر کوئی شخص کر سکتا تھا تو وہی شخص کر سکتا تھا جس میں دھارے کا رُخ موڑ دینے کی ہمت ہو۔ ایسی ہستی اُس وقت صرف اللہ کے اسی آخری پیغمبر کی ہستی تھی جس نے رواجِ عام کے اُس دھارے کو جو ایک طوفانی انداز میں نفس پرستی کی سمت میں بہہ رہا تھا چند سال کی کوشش سے خدا پرستی کی طرف پھیر دیا۔ ہمیں جو چھٹی صدی عیسوی کی دنیا کی تاریخ میں ایک دم سے ایک حیرت انگیز انقلاب نظر آتا ہے جسنے ساری زندگی کو اور بالآخر ساری دنیا کو متأثر کیا، اور اب بھی جو کچھ انسانیت اور خدا پرستی کا بچا کھچا سرمایہ ہے، وہ سب انھیں کی محنت کا فیض ہے۔ ؎

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے ۔۔۔ یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

ممکن ہے آپ میں سے کسی کو یہ شبہ گزرے کہ یہ کہنا تو صحیح نہیں ہے کہ اُس زمانے میں عام طور پر لوگ صرف نفس پرست تھے، کیونکہ وہاں

بہت سی دوسری "پرستیاں" بھی موجود تھیں۔ کچھ لوگ سورج پرست تھے، کچھ آگ کو پوجتے تھے، کچھ صلیب کو پوجتے تھے، کچھ درختوں کو پوجتے تھے، اور کچھ پتھروں کی پرستش کرتے تھے، ٹھیک ہے! یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے، مگر یہ تمام "پرستیاں" اسی ایک پرستی کی قسمیں تھیں جس کے عام رواج کا میں دعویٰ کر رہا ہوں۔ یہ ساری پرستیاں اسی لئے کھپاتی تھیں کہ یہ نفس پرستی کے مخالف نہ تھیں، یہ "پرستیاں" من مانی زندگی گذارنے میں رکاوٹ نہیں ڈالتی تھیں۔ آگ، پیڑ، پتھر، سورج وغیرہ ان سے نہ کہتے تھے کہ یہ کام کرو، اور یہ مت کرو، اسلئے وہ انکی پرستش کے پہلو بہ پہلو اپنے نفس کی اطاعت بھی کرتے رہتے تھے، اور دونوں میں کوئی تناقض نہیں پاتے تھے ——— بہرحال ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سیلاب سے لڑنے اور اس کا رُخ موڑ دینے کا بیڑا اٹھایا، اور پوری سوسائٹی سے لڑائی مول لی، حالانکہ آپ اپنی اس سوسائٹی میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز تھے، صادق و امین کے معزز لقب سے یاد کئے جاتے تھے، اور اسلئے آپ کو ترقی کے بڑے سے بڑے مواقع حاصل تھے، آپ کو اپنی قوم کا اتنا اعتماد حاصل تھا کہ ترقی کا کوئی اونچے سے اونچا مقام نہ تھا جو آپ کو مل نہ سکتا، مگر یہ سب کچھ جبھی ممکن تھا جب آپ انکی زندگی کے رُخ کو غلط نہ کہتے، اور اس کو ایک دوسرے رخ پر موڑ دینے کے عزم وارادہ کا اظہار نہ فرماتے، مگر آپ کو تو اللہ نے کھڑا ہی اسلئے کیا تھا کہ بہاؤ کے رُخ پر نہ خود بہیں اور نہ کسی کو بہنے دیں۔ اسلئے سب سے پہلے تو آپ نے اپنی زندگی کو خدا پرستی کی زندگی کا نمونہ بنا کر پیش کیا، اور بالفاظ دگر دھارے کے خلاف پَیر کر دکھا دیا، اور پھر پوری سوسائٹی کے رُخ کو نفس پرستی سے ہٹا کر خدا پرستی کی طرف موڑ دینے کی کوشش شروع کی، اس کوشش کو کامیاب بنانے کیلئے آپ نے تین بنیادی چیزیں لوگوں کے سامنے پیش کیں ——— ۱۔ یہ یقین کرو کہ تمہارا اور اس ساری دنیا کا پیدا کرنے والا، اور اس پر حکومت کرنے والا، ایک ہے۔ ۲۔ یہ یقین کرو کہ اس زندگی کے ختم ہونے کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جسمیں اس زندگی کا حساب وکتاب دینا ہے۔ ۳۔ یہ یقین کرو کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا (پیغمبر) ہوں، اس نے اس زندگی کے متعلق احکام دیکر مجھے بھیجا ہے، جن احکام پر مجھے بھی چلنا ہے اور تمہیں بھی ——— آپ نے جب ان چیزوں کا اعلان فرمایا تو سوسائٹی میں ایک ہلچل مچ گئی، مخالفتیں اُٹھ کھڑی ہوئیں، اسلئے کہ یہ نعرہ انکی زندگی کے آرام میں خلل ڈالنے والا تھا، سارا زمانہ جس رُخ پر بہہ رہا تھا، اُس کو چھوڑ کر دوسرا رُخ اختیار کرنا آخر کوئی آسان کام تو تھا نہیں۔ زندگی کی کشتی بہاؤ پر بلا دقت کے چلی جارہی تھی، انھیں کیا پڑی تھی کہ بہاؤ کے خلاف اپنی کشتی چلا کر دقتیں اور خطرات مول لیں، اسلئے انھوں نے چاہا کہ یہ آواز دب جائے، کچھ لوگوں نے آپ کی نیت ہی پر شبہ کیا، انکی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دیکھنے میں ایک انھیں جیسا انسان اتنا صاحب عزم بھی ہوسکتا ہے کہ زندگی کے اُس طوفانی دھارے کا رُخ موڑنے کی ٹھانے جسمیں صرف ہم ہی نہیں دنیا کی ساری قومیں، انکے علماء اور حکما، انکے احبار ورہبان، انکے ائمۂ تہذیب وسیاست، انکے عقاید واخلاق، انکے علوم وفلسفے، اور ادب وسیاست خس وخاشاک کی طرح بہے چلے جارہے ہیں ——— وہ اس دعوے میں کسی شخص کو مخلص ماننے سے قطعاً عاجز تھے، اسلئے انھوں نے سمجھا کہ اس دال میں کچھ کالا ضرور ہے، ہونہ ہو اس بلند بانگ دعوے کے پیچھے کچھ اور مقصد اور کوئی اور خواہش کام کر رہی ہے، اسلئے انھوں نے ایک وفد رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بھیجا جس نے اپنے خیال کے مطابق تین بڑی چیزیں آپ کے سامنے پیش کیں، اُس نے کہا کہ اگر آپ کا مقصد

اس قسم کی باتوں سے یہ ہو کہ ہم آپ کو اپنا سردار تسلیم کرلیں تو چھوڑیئے ان باتوں کو ہمیں یہ منظور ہے، یا اگر آپ بہت سے مال و دولت کے طالب ہوں تو ہمیں یہ بھی منظور ہے، اور یا اگر آپ کسی حسین عورت کے خواہش مند ہوں تو ہمیں یہ بھی منظور ہے، ہم ملک کی سب سے حسین عورت آپ کو پیش کریں گے، آپ نے جو یہ نئی بات اٹھائی شروع کی ہے اس سے دستبردار ہو جائیے! مگر اللہ کے اس سچے رسولؐ اور خدا پرستی کے سب سے بڑے علمبردار نے نہایت بے نیازی سے جواب دیا کہ میں تم سے کچھ لینا نہیں چاہتا تمھیں کچھ دینا چاہتا ہوں، اور وہ میری یہی تینؔ باتیں ہیں جنکی میں تمھیں دعوت دے رہا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ تمھیں موت کے بعد والی زندگی میں راحت ملے، اور وہ میری ان تین باتوں کے قبول کرنے پر موقوف ہے۔ آپ کی زبان ہی نہیں بلکہ آپ کی پوری زندگی نے اُن لوگوں کے اس خیال کی تردید کی، کہ آپ دنیا کی کسی چیز کے خواہش مند ہیں، مخالفت نے اتنی شدت اختیار کی کہ آپ کو مکہ چھوڑ کر مدینہ جانا پڑا، مگر خدا پرستی کی دعوت کو نہیں چھوڑا۔ مخالفین کو اندازہ نہیں تھا کہ آپ نفس پرستی سے کتنی دُور تھے، اور اس دھارے کے مخالف سمت میں تیرنے کی آپ میں کتنی طاقت تھی اور کتنا عزم تھا۔ آپ نفس پرستی سے اتنی دُور تھے کہ جب مکہ چھوڑنے کے کچھ سال بعد آپ پھر مکہ میں آئے، اور فاتحانہ حیثیت سے آئے، اپنے مخالفوں کو مغلوب کر کے آئے، تب بھی آپ کی خدا پرستانہ شان میں ذرا تغیر نہ ہوا، فتح کا نشہ آپ پر ذرا بھی نہیں چڑھا، مکہ میں آپ کا فاتحانہ داخلہ اس شان سے ہوا کہ اونٹ پر سوار تھے، بدن پر غریبانہ لباس تھا، اور زبان پر خدا کا شکر، اور اپنی عاجزی کا اظہار تھا۔ اس موقع پر ایک آدمی آپ کے سامنے آیا اور رعب سے کانپنے لگا، آپ نے فرمایا گھبراؤ نہیں، میں قریش کی اُس غریب عورت کا بیٹا ہوں، جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔ سوچیئے! کیا کوئی فاتح ایسے وقت میں ایسی بات کہہ سکتا ہے، جس سے اُس کا رعب لوگوں پر سے اُٹھ جائے؟ ایسے وقت میں تو کوشش کیجاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ رعب ڈالا جائے ——— آپ آج بھی دیکھتے ہیں اور آج سے پہلے کا حال تاریخ میں پڑھ سکتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت اور اقتدار آجاتا ہے، اُنکی آل اولاد اُس سے کتنا نفع اُٹھاتے ہیں، اور اُسکے بل پر کیسے کیسے عیش و آرام کے مزے لوٹتے ہیں، مگر خدا پرستی کے سب سے بڑے علمبردار کا حال اس معاملہ میں بھی دنیا سے مختلف تھا، آپ کی صاحبزادی اپنے گھر کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں، جسکی وجہ سے آپکے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے تھے، اور جسم پر مشکیزہ اٹھانے کے نشانات ہو گئے تھے، ایک دن اُنھوں نے سنا کہ میدانِ جنگ سے کچھ غلام اور کنیزیں اباجان کی خدمت میں لائی گئی ہیں، خیال کیا کہ میں بھی اپنے لئے ایک آدھ غلام یا کنیز مانگ لاؤں، تشریف لیگئیں، اپنی پریشانی کا حال بیان کیا، ہاتھوں کے گھٹے دکھائے، حضورؐ نے فرمایا:- بیٹی! میں تمھیں غلام اور باندی سے اچھی چیز دیتا ہوں، غلام اور باندی اور مسلمانوں کے حصے میں جانے دو، تم سوتے وقت تینتیس ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس ۳۳ مرتبہ الحمد للہ، اور چونتیس ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو!- بے نفسی اور خدا پرستی کی کیسی عجیب مثال ہے، بیشک آپ خدا پرستوں کے سردار تھے، کیا کوئی پھر بھی آپ کی بے نفسی پر حرف لا سکتا ہے، دوسروں کے حق میں یہ فیاضی اور اپنے، اور اپنی اولاد کے لئے فقر و غربت کو ترجیح دینا پیغمبر ہی کی شان ہے۔ ؎

عدیل ہمت ساقیست فطرت عرفی — کہ حاتم دگراں و گدائے خویشتن است

آج ایسے لوگ آپ کے سامنے ہیں جنھوں نے پچھلے کچھ دنوں میں چند روز یا چند سال جیلیں کاٹ لی ہیں تو آج اقتدار حاصل ہونے پر اُن تکلیفوں کا سارا حساب مع سود کے چکا لینے کے درپے ہیں ——— جب کسی شخص کو اقتدار اور قانون کی طاقت ملجاتی ہے تو عموماً وہ اپنے اعزا، اور اپنی اولاد کو قانون کی گرفت سے بچانے کی سعی کرتا ہے، مگر خدا پرستوں کے سردار کی شان اس معاملہ میں بھی بالکل نرالی تھی۔ ایک عورت پر چوری کا جرم ثابت ہوا، آپ نے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دیدیا، لوگوں نے حضورؐ کے ایک مقرب اور بہت محبوب صحابی سے سفارش کرائی کہ معاف فرما دیا جائے، حضورؐ کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا، اور فرمایا:- خدا کی قسم! اگر خود محمدؐ کی (لاڈلی) بیٹی فاطمہؓ سے بھی یہ جرم سرزد ہو جائے، تو محمدؐ اس کا بھی ہاتھ کاٹے گا۔"

اپنے آخری حج کے موقع پر مسلمانوں کے عظیم ترین اجتماع میں آپ نے کچھ قوانین اور احکام کا اعلان عام فرمایا تو ان کو سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں اور اپنے خاندان پر جاری کیا۔ آپ نے مجمع عام میں کھڑے ہو کر اعلان فرمایا کہ جاہلیت کے تمام دستور ختم کئے جاتے ہیں، منجملہ ان کے سودی لین دین

آج سے ختم، اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباسؓ کے سودی قرضے کو باطل قرار دیتا ہوں، اب اُن کا سود کسی پر واجب نہیں، اب وہ سود کا روپیہ کسی سے وصول نہیں کر سکتے۔ یہ تھی خدا پرستی! ورنہ آج کل کے قانون بنانے والے ہوں تو اپنے رشتہ داروں اور ملنے والوں سے پہلے سے کہدیں کہ فلاں قانون آنے والا ہے، ذرا جلدی جلدی اپنی فکر کر لو۔ زمینداری کے خاتمہ کا قانون پاس ہونے والا ہے، جتنی زمین نکال سکتے ہو نکال لو، یا بیچنا چاہو تو بیچ دو۔ ایسے ہی اس موقع پر آپ نے اعلان فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت (یعنی قبل اسلام) کے تمام خون باطل کئے جاتے ہیں، اب اُنکا انتقام نہیں لیا جا سکتا۔ اور اس کے ماتحت میں سب سے پہلے (اپنے خاندان کا خون) ربیعہ بن الحارث کا خون باطل قرار دیتا ہوں ——— ہمارے حضورؐ اس بے مثال خدا پرستی کیساتھ (جسکی صرف چند مثالیں میں نے بیان کیں ہیں) نفس پرستی کے اُس سیلاب سے لڑتے رہے جو دنیا کی ساری قوموں کو بہائے لئے چلا جا رہا تھا، اور آخر کار اُس کو روکنے میں کامیاب ہوئے، اور لوگ مجبور ہوئے کہ آپ کی بات پر کان دھریں، اور مانیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے آپ کی ان تین بنیادی باتوں کو کما حقہٗ قبول کر لیا جو خدا پرستی کی زندگی کی بنیاد ہیں، تو پھر ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کا رُخ ایک دم ایسا بدلا، کہ آج کی دنیا میں یقین آنا مشکل ہے، کہ کیا ایسے بھی انسان ہو سکتے ہیں! میں مثال کے طور پر اُن میں سے چند کا ذکر کرتا ہوں:-

آپ کی دعوت قبول کرنے والوں میں سے ایک ابو بکر صدیقؓ بھی تھے، جو آپ کی وفات کے بعد آپ کے پہلے جانشین، اور اسلامی حکومت کے ذمہ دار بھی ہوئے۔ آپ کی بے نفسی کا حال یہ تھا کہ گو اسلامی سلطنت کے سب سے بڑے عہدیدار تھے، مگر زندگی اس طرح گذارتے تھے کہ آپکے گھر والے منہ میٹھا تک کرنے کے لئے ترستے تھے۔ ایک دن اہلیہ نے عرض کیا کہ بچوں کا جی کچھ میٹھا کھانے کو چاہتا ہے، تو فرمایا کہ سرکاری خزانہ تو ہمارا منہ میٹھا کرنے کا ذمہ دار نہیں ہے، ہاں! جو کچھ وہاں سے ہمیں روزانہ ملتا ہے اُسی میں سے اگر تم کچھ بچا سکو تو بچا لو! اور کچھ میٹھی چیز پکا لو۔ چنانچہ انھوں نے روزانہ کے خرچہ میں سے روزانہ تھوڑا تھوڑا بچا کر تھوڑے سے پیسے جمع کر لئے اور ایک دن حضرت ابو بکرؓ کو دیئے کہ اس کا کچھ سامان لا دیجئے تاکہ آج کچھ میٹھی چیز پکا لوں۔ آپ وہ پیسے لئے ہوئے خزانچی کے پاس چلے گئے، اور وہ پیسے بیت المال کو واپس کر دیئے، اور فرمایا، کہ یہ اسی خرچ میں سے، جو ہمیں بیت المال سے ملتا ہے اتنے دنوں میں بچایا ہوا ہے، معلوم ہوا کہ ہمارا کام اس سے کم میں چل سکتا ہے، لہٰذا اب ہمیں اتنا کم کر کے دیا جایا کرے۔

خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں جب مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا، اور حضرت عمرؓ وہاں تشریف لے گئے، ساتھ میں ایک غلام تھا، لیکن اسلامی حکومت کے اُس سب سے بڑے شخص کے پاس سواری صرف ایک تھی، تھوڑی دور خود سوار ہوتے تھے تھوڑی دور غلام کو سوار کر کے خود پیدل چلتے تھے، جس وقت بیت المقدس میں داخل ہو رہے تھے غلام سواری پر تھا اور خود پیدل، اور کپڑوں میں کئی ایک پیوند۔ آپ ہی کے زمانہ میں ایک دفعہ سخت قحط پڑا، تو آپ وہ کھانا کھانا اپنے لئے جائز نہ سمجھتے تھے، جو قحط کی وجہ سے عام رعایا کو میسر نہ تھا۔

حضرت خالدؓ جو مسلمان فوجوں کے کمانڈر انچیف تھے، اور خود حضور نے ان کو سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا اعزازی خطاب عنایت فرمایا تھا، ایسے بے نفس اور نفس پرستی سے اس قدر آزاد تھے کہ ایک مرتبہ ان کی کسی غلطی کی بنا پر عین میدان جنگ میں اُنکے پاس حضرت عمرؓ کی طرف سے معزولی کا پروانہ پہونچا تو ماتھے پر شکن تک نہ آئی اور کہا، کہ اگر میں ابتک عمرؓ کی خوشنودی کیلئے یا اپنی ناموری کے لئے لڑتا تھا تو اب نہ لڑوں گا، لیکن اگر میں اللہ کے لئے لڑتا تھا تو سپہ سالار کے بجائے ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے بھی بدستور لڑتا رہوں گا۔ اسکے برعکس اس زمانہ کی ایک تازہ مثال آپکے سامنے میک آرتھر کی ہے جنھیں ٹرومین نے کوریا میں لڑنے والی افواج کی سپہ سالاری سے معزول کر دیا تو وہ سخت ناراض ہوئے، اور ٹرومین کی صدارت کے درپے ہو گئے۔

اور صرف یہی چند افراد نہیں، بلکہ آپ نے پوری قوم اور سوسائٹی کی اسی اصول پر تربیت کی تھی کہ وہ ایک خدا پرست سوسائٹی ہو

آپ کا ایک اصول یہ تھا کہ جو کسی عہدے کا طالب ہو اور خواہش مند ہو اس کو عہدہ نہیں دیتے تھے، ایسی سوسائٹی میں عہدے کے امیدوار بننے اپنی تعریف و توصیف کرنے، اور حکومت کے لئے ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کی کیا گنجائش تھی، جس جماعت کے سامنے ہر وقت قرآن مجید کی یہ آیت رہتی ہو :-

تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علوا في الارض ولا فسادا والعاقبة للمتقين ۝

یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کیلئے مخصوص رکھیں گے جو زمین میں اپنی بلندی نہیں چاہتے، اور نہ فساد پھیلانا چاہتے ہیں، اور انجام خدا سے ڈرنے والوں کا ہے۔

جس جماعت کا اس حقیقت پر ایمان ہو، وہ کیا اپنی سربلندی اور فتنہ و فساد کے جرم کا ارتکاب کر سکتی ہے؟ -

دوستو اور بزرگو! یہ خدا پرستی کی دعوت تھی جو حضورؐ نے دنیا میں پیش کی تھی، اور نتائج کے لحاظ سے یہ دنیا کی سب سے زیادہ نفع بخش کوشش ہے، کوئی شخص دنیا کی کسی اور دعوت کا نام لیکر نہیں بتلا سکتا کہ اس نے دنیا کو اتنا فائدہ پہونچایا۔ حالانکہ اس دعوت کے حصہ میں انسانوں کی اتنی کوششیں اور اتنے وسائل نہیں آئے جو عصر حاضر کی معاشی اقتصادی اور سیاسی تحریکوں کے حصے میں آئے ہیں، مگر پھر بھی ان تمام تحریکوں کے فائدے مل کر بھی اس ایک دعوت کے فائدوں کا دسواں حصہ بھی نہ ہو سکے۔ آج بھی دنیا سے معاشی اور سیاسی ظلم اور اخلاقی برائیاں جبھی دور ہو سکتی ہیں جب دنیا اس دعوت کو قبول کرلے، لیکن اور کسی کے متعلق کیا کہا جائے جب کہ خود اس دعوت کے علمبردار ہی نفس پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ نفس پرستی تو چوٹ کھائے ہوئے بیٹھی تھی اُس نے موقع پا کر خدا پرستی کے علمبرداروں سے خوب انتقام لیا، جنہے اُسے شکست دی تھی، اور وہ مسلمان جس کا امتیاز تھا کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنکر افسوس! آج اس نفس پرستی کا خود شکار ہے۔

مسلمانو! تم نے بڑا ظلم کیا ہے، تمہارا کام تو خدا پرستی کا نمونہ بننا تھا، اور ساری دنیا کو اسکی دعوت دینا تھی، تم نے نفس پرستی کو اختیار کر کے اپنا بھی نقصان کیا، اور ساری دنیا کو بھی مشکلات میں پھنسا دیا۔ اگر تم اپنا فرض ادا کرتے رہتے، تو نہ یہ نفس پرستی دنیا میں دوبارہ غالب ہوتی، اور نہ دنیا کا یہ حشر بنتا۔ آج دنیا کی سب سے بڑی مصیبت نفس پرستی ہے، دنیا کے بڑے بڑے لیڈر اور امن کے علمبردار (ٹرومین، چرچل، اور اسٹالن) سب سے بڑے نفس پرست ہیں، یہ اپنی نفس پرستی میں، اور قومی غرور میں (جو نفس پرستی کی ایک ترقی یافتہ اور وسیع شکل ہے) دنیا کو خاک سیاہ کرنے کیلئے ہر وقت تیار ہیں، ایٹم بم سے زیادہ خطرناک نفس پرستی ہے جس نے دنیا کو تباہ کر دیا، لوگوں کو ایٹم بم پر غصہ آتا ہے کہ قیامت برپا کر دے گا، میں کہتا ہوں ایٹم بم کا کیا قصور، اصل مجرم تو اس کا بنانے والا ہے، اور اس سے بھی پہلے وہ درسگاہیں اور وہ تہذیب ہے جو اس ایٹم بم کو وجود میں لائی ہے، اور اس سب کی جڑ وہ نفس پرستی ہے جس نے اس تہذیب کو جنم دیا ہے۔

دوستو! ہماری دعوت اور ہماری تحریک بس یہی ہے، اور اسی مقصد کیلئے ہے کہ نفس پرستی کے خلاف محاذ قائم کیا جائے، خدا پرستی کی زندگی کا طریقہ دنیا میں عام کیا جائے۔ ہم نے اسی مقصد کیلئے یہ خاص اجتماعات کئے ہیں، اور محض اسی مقصد کیلئے ہفتہ وار اجتماع کرتے ہیں، جہاں ہم قوم کے ہر طبقہ کو جمع ہونے کی دعوت دیتے ہیں، اور ان کے سامنے خدا پرستی کی دعوت کے سب سے بڑے علمبردار حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات، ان کے حالات زندگی، اور ان کے ساتھیوں کے واقعات پیش کرتے ہیں جو سچی خدا پرستی کا راستہ دکھانے والے ہیں، اور ہمارے یقین کے مطابق انھیں میں انسانیت کی نجات، اور دنیا کی مشکلات کا حل ہے —— ہمارا کام، اور ہماری دعوت ایک کھلی ہوئی کتاب ہے، جس کا جی چاہے پڑھ لے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ۝

تبلیغی جماعتوں سے خاص خطاب

ذیل میں مولانا محمد منظور نعمانی کی وہ تقریر درج کی جا رہی ہے جو موصوف نے ۲۹ر نومبر کی صبح کو تعلیمی پروگرام کے ختم ہونے کے بعد مقامی اور بیرونی تبلیغی رفقا کے سامنے کی تھی۔ یہ تقریر جیسا کہ ناظرین کرام خود محسوس کریں گے دعوتی نہیں تھی، بلکہ تعلیمی اور تربیتی تھی ——— مولانا نے حمد و صلوٰۃ کے بعد فرمایا:۔

دینی بھائیو اور راہ خدا کے رفیقو! حق تعالیٰ مجھے اور آپ کو اپنی سیدھی راہ پر چلائے اور ان کاموں اور ان باتوں سے بچائے جو اس سے اور اس کی رحمت سے دور کرنے والے ہیں۔

پچھلی تین راتوں میں جو تقریریں مولانا علی میاں نے یا میں نے کی ہیں ان میں ہمارا خطاب ان لوگوں سے تھا جو دین کے اس کام میں اور اس کوشش میں ابھی لگے نہیں ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں اور آپ کو کسی درجہ میں لگا دیا ہے۔ بلکہ رات کی تقریر میں تو ہمارے مخاطب غیر مسلم بھی تھے اور اسی لیے ہم نے اس میں ایسی باتیں کہیں جن سے اگرچہ ہمیں تو غیر مسلم بھی پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں ——— لیکن اس وقت مجھے خاص طور سے آپ بھائیوں سے کچھ باتیں کہنی ہیں۔ یعنی اس وقت کی میری گفتگو کی خصوصی مخاطب وہ تبلیغی جماعتیں ہیں جو مختلف مقامات سے آئی ہوئی ہیں آپ حضرات میری ان باتوں کو غور اور توجہ سے سنیں۔

اس تبلیغی سلسلہ کی تقریروں میں آپ نے بار بار سنا ہوگا کہ یہ تحریک مسلمانوں میں اصلی ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے کی کوشش ہے اور اس مقصد کے لیے ہم لوگ عام مسلمانوں کو دو چیزوں کی خصوصیت کے ساتھ دعوت دیتے ہیں، ایک شہروں اور قصبوں میں مقامی ہفتہ وار تبلیغی اجتماعات قائم کرنے اور ان میں برابر شرکت کرنے کی۔ اور دوسرے دعوت و تربیت کے لیے تبلیغی جماعتوں کے ساتھ اپنے وطن سے سفر اور عارضی ہجرت کی، اور واقعہ یہ

ہو کہ ہماری نظر میں ان دونوں چیزوں کی اہمیت اتنی ہی ہے جتنی کہ ہم بیان کرتے رہتے ہیں۔ گویا یہی ہماری تحریک کے دو بازو ہیں ——— لیکن اس وقت مجھے آپ حضرات سے یہ عرض کرنا ہے کہ ہماری اس بات سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے اجتماعات میں یا ہماری جماعتوں کے سفروں میں کرامت یا جادو کی قسم کی کوئی خفیہ تاثیر ہے کہ جو آئے گا وہ ضرور آپ سے آپ مومن صالح بن جائے گا ——— اصل بات یہ ہے کہ دل میں ایمان کا پیدا ہو جانا اور زندگی کا ایمان والی زندگی بن جانا اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ آدمی خود اس کا ارادہ اور فیصلہ کرے اور اس کی سچی طلب اور فکر اس کے اندر پیدا ہو جائے۔ اجتماعات کا خاص فائدہ بس یہ ہے کہ اس سے اس ارادہ اور فیصلہ کی تحریک ہوتی ہے اور دل میں طلب اور فکر پیدا ہوتی ہے اور پھر اس کو ہر ہفتہ غذا ملتی رہتی ہے اور طاقت پہنچتی رہتی ہے۔ اس کے بعد جماعتوں کے ساتھ سفر سے اس کو اور زیادہ تقویت پہنچتی ہے۔ اس کے علاوہ تبلیغی سفروں میں جماعتی ماحول کی وجہ سے وہ تبدیلیاں بھی آدمی کے لیے آسان ہو جاتی ہیں جو اپنے گھر پر اور اپنے روزمرہ کے مشاغل اور ماحول میں سب کے لیے مشکل ہوتی ہیں۔ اسکے سوا اجتماعات کی شرکت اور جماعتوں کے ساتھ سفر میں جانا اور بھی بعض پہلوؤں سے ایمان اور ایمان والی زندگی کے پیدا ہونے میں مفید اور مددگار ہوتا ہے لیکن اس کا اصل دار و مدار جیسا کہ میں نے عرض کیا اپنے ارادہ اور اپنے فیصلہ پر اور اپنی کوشش پر ہی ہے۔ اس لیے مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ آپ اس کے لیے اپنے مقامی ہفتہ وار اجتماعات کی شرکت اور جماعتوں کے ساتھ کبھی کبھار چلے جانے کو کافی نہ سمجھیں بلکہ ایمان اور ایمان والی زندگی حاصل کرنے کو اپنی مستقل فکر بنائیں اور کبھی اس سے غافل نہ ہوں ——— اس کے لیے میں اس وقت آپ کو چند چیزوں کی طرف خصوصیت سے توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ ہماری زندگی کا ایک تعلق اپنے خالق سے ہے اور ایک اس کی مخلوق سے، بس ان دونوں تعلقوں کو صحیح کر لینا ہی دینی زندگی ہے اور انبیاء علیہم السلام بس ان دونوں تعلقوں کی تصحیح اور درستی ہی کے لیے آتے رہے ہیں ——— اور یہ دونوں تعلق نہ ہفتہ وار ہیں، نہ ماہوار، نہ سالانہ، بلکہ اپنی پوری عمر کے ایک ایک لمحہ میں ہم ان دونوں تعلقوں میں بندھے ہوئے ہیں اس لیے ہماری زندگی دینی زندگی جب بن سکتی ہے جب کہ ہم ہمیشہ اس کا خیال اور اس کی فکر رکھیں، چاہے گھر پر ہوں چاہے سفر میں، چاہے بازار میں ہوں چاہے کارخانہ میں۔ تو ہمارا اصل کام ہے اللہ کے ساتھ عبدیت کا اپنا تعلق صحیح کرنا اور اس کی مخلوق کے ساتھ اس کے حکم کے مطابق اچھا برتاؤ کرنا۔

اللہ کے ساتھ تعلق صحیح ہونے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم توحید پر قائم ہوں اور عقیدہ اور عمل کے ہر قسم کے شرک سے محفوظ رہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی امتوں کو شیطان نے زیادہ تر شرک ہی میں مبتلا کر کے

گمراہ اور برباد کیا ہے۔ پھر شیطان مردود کا طریقہ یہ ہے کہ وہ آدمیوں کو اور قوموں کو توحید سے ہٹا کر شرک میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن ان کو کچھ ایسی تاویلیں سمجھا دیتا ہے کہ وہ خود اپنے کو مشرک نہیں سمجھتے اور صریح شرک کرنے کے باوجود یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ توحید کا دامن ہمارے ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے آپ تثلیث پرست عیسائیوں سے پوچھیے وہ کبھی بھی اپنے مشرک ہونے کا اقرار نہیں کریں گے، قرآن شریف میں عرب کے مشرکوں کا یہ قول نقل فرمایا گیا ہو کہ "مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ" ——— (کہ ہم تو اپنے ان دیوتاؤں کی پوجا بس اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے وسیلہ سے ہمیں خدا کا تقرب حاصل ہو جائے ——— اور "هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ" (ان دیوتاؤں کو تو ہم اللہ کے دربار میں بس اپنا سفارشی سمجھتے ہیں) تو قرآن شریف کے اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے مشرک بھی اپنے شرک کی تاویلیں کرتے تھے اور اس کو توحید کے خلاف نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح مسلمانوں کے جن جاہل طبقوں میں صریح شرک آگیا ہے وہ بھی نادانی سے یہی سمجھتے ہیں کہ ہم توحید پر قائم ہیں ——— اس لیے ضروری ہو کہ آپ توحید اور شرک کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں اور عقیدہ اور عمل کے ہر شرک سے اپنے کو برابر بچائے رکھیں۔

یاد رکھیے عرب کے مشرک جس شرک میں مبتلا تھے وہ یہ تھا کہ خدا کے سوا کچھ ہستیوں کے متعلق ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان میں ایسی طاقت اور قدرت ہے کہ یہ ہماری بنی کو بگاڑ سکتے ہیں اور بگڑی کو بنا سکتے ہیں اور ہماری حاجتیں پوری کر سکتے ہیں اور اسی عقیدہ کی بنا پر وہ اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں ان سے دعائیں کرتے تھے ان کی دہائی دیتے تھے اور ان سے مدد مانگتے تھے اور انھیں راضی اور خوش رکھنے کے لیے وہ کام کیا کرتے تھے جو خدا کو راضی اور خوش رکھنے کے لیے کیے جاتے ہیں جیسے سجدہ کرنا، اس کے نام کا وظیفہ پڑھنا، اکی نذر ماننا، اسکے لیے قربانیاں کرنا ——— بس یہی ان کا شرک تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ خدا کے برابر کے چند خدا مانتے ہوں، بلکہ وہ اپنے دیوتاؤں کو خدا کی مخلوق ہی سمجھتے تھے اور دنیا کی جن قوموں میں بھی شرک آیا ہے عموماً ان میں یہی عبادت اور استعانت والا شرک آیا ہے۔ شیطان نے بیچارے بہت سے مسلمان کہلانے والے جاہلوں کو بھی آج اسی شرک میں مبتلا کر رکھا ہے وہ بزرگانِ دین اور ان کی قبروں کے متعلق کچھ ایسے ہی عقیدے رکھتے ہیں اور صریح مشرکانہ اعمال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں اس گندگی سے نجات دے اور حقیقی توحید نصیب فرمائے۔

تو سب سے پہلی اور سب سے اہم بات تو مجھے آپ سے یہی کہنا ہے کہ عقیدہ اور عمل میں صحیح توحید ایمان و اسلام کی پہلی شرط ہو، اگر خدا نخواستہ توحید صحیح نہیں ہے تو پھر اگر کوئی رات بھر نوافل پڑھے اور اللہ کا ذکر کرے اور بارہ مہینے دن میں روزہ رکھے اور ساری عمر تبلیغی جماعتوں میں پھرتا رہے تو خدا کی قسم جنت کی ہوا بھی نہ پا سکے گا اور دور سے بھی جنت کی خوشبو نہیں سونگھ سکے گا ——— قرآن مجید میں صاف صاف اعلان ہے

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ"

میں نے اس وقت توحید کے بارہ میں یہ بالکل ابتدائی اور بنیادی بات کہی ہے، کامل توحید کا درجہ اس سے بہت آگے ہے۔ مجھے چونکہ اور بھی کئی ضروری ضروری باتیں اس وقت کہنا ہیں اس لیے میں توحید کے بارہ میں اس سے زیادہ اس صحبت میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اگر کوئی صاحب توحید کے متعلق اس سے آگے کی باتیں جاننا چاہیں تو "کلمہ طیبہ کی حقیقت" کے نام سے میرا ایک رسالہ ہے اس میں دیکھ لیں۔

توحید کے بعد دوسری چیز جس کی طرف میں آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ اپنی نمازوں کو بہتر سے بہتر بنانے اور ترقی دیتے رہنے کی مسلسل کوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو بڑھانے اور ایمانی کیفیات اور ایمانی زندگی پیدا کرنے میں نماز کو بڑا دخل ہے بشرطیکہ نماز نماز ہو، ہماری نمازیں جو نہ اللہ کے تعلق میں کوئی اضافہ کرتی ہیں نہ ایمانی کیفیات اور ایمانی زندگی پیدا کرنے میں کوئی مدد دیتی ہیں، یہ صورۃً تو نماز ہیں لیکن حقیقۃً نماز نہیں، اگرچہ نماز نہ پڑھنے سے ایسی نماز پڑھنا بھی ہزاروں درجہ بہتر ہے، لیکن ہمارے لیے ضروری ہے کہ ان بے جان نمازوں پر مطمئن اور قانع نہ رہیں اور حضور، و خشوع اور خشیت و محبت کی کیفیات اپنی نمازوں میں پیدا کرنے اور ان کو بڑھانے کی مسلسل کوشش کرتے رہیں۔ فرضوں اور سنتوں کے علاوہ نوافل کا بھی ذوق و شوق اپنے اندر پیدا کریں، خاص کر تہجد پڑھنے کا ضرور اہتمام کریں۔

اللہ کی یاد اور اللہ کے ذکر کی کثرت رکھیں اور ہر حال میں اللہ کا خیال اور لحاظ رکھنے کی مشق کریں۔

روزانہ کم از کم ایک دفعہ دوسرے تمام خیالات سے یکسو ہو کر کہیں تنہائی میں بیٹھ کر موت اور قبر اور قیامت اور میدان حشر اور وہاں کے حساب کتاب اور پھر آخری انجام کا ضرور دھیان کیا کریں اور اپنے اعمال اور احوال کا جائزہ لے کے روزانہ توبہ و استغفار کیا کریں ــــــ میرا مطلب یہ ہے کہ اس مراقبہ کو روزانہ کا اپنا وظیفہ بنا لیں یہ بڑی اکسیر چیز ہے۔

یہ چیزیں ان شاء اللہ نیکیوں کے کرنے میں اور گناہوں سے بچنے میں بہت مدد دیں گی، لیکن بعض بڑے بڑے گناہ ہمارے ماحول میں اتنے عام ہو گیے ہیں کہ جب تک ان کی برائی اور ناپاکی کو سمجھ کر ہم آپ خود ان کے چھوڑنے کی ہمت نہ کریں گے ان سے پیچھا چھوٹنا بہت مشکل ہے، اس لیے بڑی ضرورت ہو کہ ان گناہوں سے اپنے کو بچانے کی اور محفوظ رکھنے کی ہم اور آپ خاص فکر اور کوشش کریں ــــــ میرا خیال ہے کہ شراب زنا اور چوری جیسے گناہوں سے بچنا خدا کے فضل سے ہمارے آپکے لیے آسان ہے، بلکہ اللہ کے کرم سے مجھے امید ہے کہ کئی سو کے اس مجمع میں ایک بھی ان شاء اللہ ایسا نہ ہو گا جو ان ذلیل گناہوں کا عادی ہو۔ لیکن جھوٹ، غیبت، بدنظری، سینما بینی، مسلمانوں کی توہین و تحقیر اور دل آزاری یہ بلائیں آج کل ہم مسلمانوں میں اتنی عام ہو گئی ہیں کہ خود ہم جیسوں کو ان سے اتنی نفرت نہیں جتنی کہ چوری سے اور شراب سے اور زنا سے ہے۔ تو اس قسم کے گناہوں سے ہم اپنے کو جب ہی بچا سکتے ہیں جبکہ

اس کا خاص اہتمام کریں۔

شروع میں میں نے آپ حضرات سے عرض کیا تھا کہ ہماری زندگی کا ایک تعلق اللہ کی مخلوق سے اور اس کے بندوں بھی ہے اور ہماری زندگی اس وقت تک صحیح معنی میں دینی زندگی نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ تعلق بھی درست نہ ہو ــــ دین کے اس پہلو کی اہمیت کا پورا اندازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ہوتا ہے جس کو امام ابو داؤد نے سنن ابی داؤد کتاب الادب میں روایت کیا ہے، حدیث یہ ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ارشاد فرمایا "الا انبئکم بافضل من درجۃ الصلوٰۃ والصیام والصدقۃ؟ قالوا بلیٰ یا رسول اللہ، قال اصلاح ذات البین" یعنی ایک دن حضور نے صحابہ سے فرمایا کیا میں تمھیں ایک ایسی چیز نہ تبلاؤں جس کا درجہ نماز اور روزہ اور صدقہ خیرات سے بھی بڑا ہے ــــ صحابہ نے عرض کیا، ضرور بتائیے، آپ نے فرمایا آپس کے تعلقات کی درستی، اس سے معلوم ہوا کہ اس کی اہمیت نماز روزہ وغیرہ عبادات سے بھی زیادہ ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ حضور نے فرمایا۔ "فساد ذات البین ھی الحالقۃ لا اقول تحلق الشعر ولکن تحلق الدین" (یعنی آپس کے تعلقات کی خرابی (حضور نے فرمایا) مونڈ دینے والا اُسترا ہے، (پھر خود ہی فرمایا کہ) میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بالوں کو مونڈتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ دین کو مونڈ دیتا ہے اور بالکل جڑ سے اس کا صفایا کر دیتا ہے۔) گویا دین کے اگر اس پہلو کی درستی کی فکر نہیں کی گئی تو پھر دین کے دوسرے پہلو کی یعنی ذکر و عبادت وغیرہ کی بھی خیر نہیں ہے۔ تو جس طرح ہم آپ اللہ تعالیٰ کے فضل کرم سے ذکر و عبادت کا اہتمام کرتے ہیں۔ اتنا ہی اہتمام ہمیں اس کا کرنا چاہئے کہ اللہ کے بندوں کے ساتھ ہمارا معاملہ اور ہمارا برتاؤ صحیح اور درست ہو، اگر یہ نہ ہوا تو صرف ذکر و عبادت سے ہماری کشتی پار نہیں لگ سکتی اور ہماری زندگی ایمان والی زندگی نہیں بن سکتی۔ میرا خیال ہے کہ اپنے گھر کے چھوٹے بڑوں کے ساتھ اور دوسرے عزیزوں قریبوں کے ساتھ اسی طرح پڑوسیوں وغیرہ کے ساتھ تعلق اور برتاؤ کے متعلق اللہ و رسول کی جو ہدایتیں ہیں انشاء اللہ آپ حضرات اُن سے ناواقف نہیں ہوں گے لیکن دو چیزوں کی طرف میں اس وقت آپ حضرات کو خصوصیت سے توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں ــــ ایک یہ کہ اللہ کے جو بندے دین کی خدمت کسی عنوان سے کر رہے ہوں اُن کے متعلق ہمیشہ اچھا گمان قائم کیا جائے، دل میں ان کی محبت اور عزت پیدا کرنے کی کوشش کیجائے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ دین کی خدمت صرف اپنے ہی کام کو نہ سمجھیں اور اس غلطی میں مبتلا نہ ہوں کہ دین کے خادم صرف آپ اور آپکے ساتھی ہیں اور جو آپ کے ساتھ ہو کر دین کی خدمت اس خاص طریقہ پر نہیں کر رہا ہے اس کے دل میں گویا دین کا درد ہی نہیں ہو۔

تو اللہ کے جو بندے بھی دین کی خدمت کسی شکل میں کر رہے ہیں ان کو ہم اپنی جگہ پر مخلص سمجھیں، خاص کر اپنے اپنے مقام کے علماء اور صلحا کی ویسی ہی عزت کریں جیسا کہ آپ حضرات کا معاملہ میرے اور مولانا علی میاں کے ساتھ ہے، خواہ ہمارے اس تبلیغی کام سے ان کا کچھ بھی تعلق نہ ہو ـــــ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی جن چند باتوں کو ہم نے بہت ہی بلند پایا ان میں سے ایک یہ خاص چیز تھی کہ ایک طرف تو ان کو اس کام کے ساتھ عشق کا تعلق تھا اور ایسا درد تھا کہ ہم نے اپنی زندگی میں کسی میں نہیں دیکھا اور اس لیے ان کی بڑی تڑپ یہ تھی کہ اللہ کے سب بندے خصوصاً علماء اور صلحا سب کے سب اسی کام میں لگ جائیں (جو لوگ مرض وفات میں مولانا کے قریب رہے انھوں نے بار بار دیکھا ہے کہ بستر مرگ پر تڑپ تڑپ کے بعض وقت ایک عجیب درد کے ساتھ کہتے تھے "ہائے اللہ کیا کروں علماء متوجہ نہیں ہوتے) لیکن اس کے باوجود ان علماء اور صلحا کا بھی جنھوں نے اس تبلیغی کام کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ایسا احترام کرتے تھے کہ ہم اپنے اساتذہ اور مشائخ کا اس سے زیادہ نہیں کرتے اور تبلیغی کام کرنے والوں کو اور خاص کر اپنے سے محبت رکھنے والوں کو سخت تاکید فرماتے تھے کہ ان حضرات سے محبت کریں اور حدیثوں میں علماء اور صلحا کی زیارت کے جو فضائل آئے ہیں ان کو یاد کر کے اور ان کا استحضار کر کے ان کی خدمتوں میں حاضر ہوا کریں اگر کبھی کوئی خادم کسی عالم یا بزرگ کے متعلق شکایت یا اعتراض کرتا کہ وہ اس کام میں ہماری مدد نہیں کرتے تو مولانا بہت سختی سے ڈانٹتے اور ان کی طرف سے خود عذر بیان کرتے۔ کبھی فرماتے کہ وہ حضرات دین کے جن کاموں میں لگے ہوئے ہیں ان کے نافع ہونے پر انھیں اطمینان ہے اور ہمارے اس کام کا انھوں نے تجربہ نہیں کیا ہے اس لیے اس پر انھیں اطمینان نہیں اس لیے عند اللہ وہ معذور ہیں۔ کبھی فرماتے کہ تمھارے اندر اور تمھارے کام میں کوتاہیاں ہیں جن کی وجہ سے اہل دین مطمئن نہیں ہوتے اس لیے ان کی شکایت نہ کرو اپنی اصلاح کرو ـــــ بہرحال پہلی چیز جس کی طرف میں اس سلسلہ میں آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جو حضرات کسی شکل میں دین کی خدمت کر رہے ہیں اور خصوصاً علماء اور صلحا اُن کے متعلق ہمارا خیال اور گمان ہمیشہ نیک ہو اور ہمارا برتاؤ عزت اور احترام کا ہو اور ایسی باتوں سے بچنے کی ہم پوری کوشش کریں جن سے کسی کو اس کا شبہ بھی ہو سکتا ہو کہ ہم اپنے کو اُن سے بہتر اور بالاتر سمجھتے ہیں اور بس اپنے ہی کام کو دینی کام سمجھتے ہیں۔

تو خلق اللہ کے ساتھ برتاؤ کے سلسلہ میں جن دو باتوں کی طرف مجھے اس وقت آپ کو توجہ دلانی تھی ان میں سے ایک تو یہ تھی جو میں نے عرض کی ـــــ دوسری بات یہ ہے کہ غریبوں اور کمزوروں اور اپنے سے کم حیثیت لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک اور اچھا معاملہ اور ان کی خدمت اور مدد کرنے کے متعلق اسلام میں جو احکام ہیں ہم ان پر عمل کرنے کے بالکل عادی نہیں رہے ہیں حالاں کہ قرآن مجید ہی کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہو کہ

دین میں اس کی کتنی اہمیت ہے، تو مجھے اپنے نفس سے بھی اور آپ حضرات سے بھی اس سلسلہ میں دوسری بات یہ کہنی ہے کہ ہم اپنے اندر اس کو پیدا کرنے کی کوشش کریں ـــــــ بعض عارفوں کا ارشاد ہے کہ طاعت اور عبادت کے بدلہ میں جنت ملے گی اور اللہ کے قابلِ خدمت بندوں کی خدمت کے بدلہ میں خود اللہ کی رضا ملے گی۔ میں نے یہ مضمون پہلے بعض بزرگوں کے کلام میں دیکھا تھا لیکن بعد میں بعض حدیثوں میں بھی اس کے اشارے مجھے ملے ـــــ الغرض یہ واقعہ ہے کہ اللہ کے کمزور بندوں کی خدمت اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ اور اچھا سلوک اللہ تعالیٰ کو بے حد راضی کرنے والا اور اس کی رحمت کو بہت کھینچنے والا عمل ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ اس بارہ میں مسلم اور غیر مسلم میں فرق نہیں کیا گیا ہے، یعنی مسلمانوں کی طرح غیر مسلم غریبوں اور کمزوروں اور مصیبت زدوں کی خدمت اور مدد کرنے کا اور ان کے ساتھ احسان کرنے کا بھی ہمیں حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر بھی بڑے بڑے اجر و ثواب کا وعدہ ہے ـــ بلکہ انسانوں سے گزر کر جانوروں تک کے ساتھ حسن سلوک کا ہمیں حکم دیا گیا ہے اور اس پر ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے "ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء" (یعنی تم زمینی مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کرو، آسمان والا تم پر رحمت کرے گا) بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ بعض لوگ صرف اس عمل پر بخشے جائیں گے کہ انھوں نے کسی پیاسے جانور کو پانی دے کر موت سے بچا لیا تھا ـــــــ

اسلام میں غریبوں اور بھوکوں کی خبر گیری کا حکم اتنا سخت اور تاکیدی حکم ہے کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی فاقہ سے سوئے تو وہ مسلمان ہی نہیں ہے، اور حضور نے اس حدیث میں بھی مسلمان اور غیر مسلمان کا کوئی فرق نہیں کیا ہے ـــــــ الغرض ہمیں آپ کو جن باتوں کو اپنے اندر پیدا کرنے اور جن عادتوں کو اپنی زندگی کا جزء بنانے کی خاص طور سے کوشش کرنی ہے ان میں سے ایک غریبوں اور کمزوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور ان کی خدمت کرنا ہے ـــــ اللہ تعالیٰ کے یہاں آخرت میں اس کا جو اجر ملنے والا ہے وہ تو ملے گا ہی اور وہی اصل اجر ہے لیکن آپ ذرا غور کر کے سمجھ سکتے ہیں کہ ہم ہندستانی مسلمانوں کے لیے دنیوی نقطۂ نگاہ سے بھی یہ چیز کس قدر مفید ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو سمجھ دے۔ آج ہماری ساری دوڑ دھوپ صرف اس کام کے لیے ہے کہ فلاں پارٹی برسر اقتدار آجائے اور فلاں لیڈر کی حمایت ہمیں حاصل ہو جائے ـــــ حالاں کہ یہ چیزیں بالکل وقتی ہوتی ہیں اور ان کا کوئی بھروسہ نہیں، حالات کے درست ہونے کی اصل کنجی تو خود اپنا درست ہونا ہے ـــــ آپ جانتے ہیں ملک میں ہر مذہب کے ماننے والوں میں بڑی اکثریت غریبوں کی ہے، اگر غریبوں کے ساتھ ہمارا رویہ وہ ہو جو اللہ و رسول نے ہمیں بتلایا ہے اور جس کی طرف میں اس وقت آپ کو توجہ دلا رہا ہوں تو اس ملک میں آپ کو وہ مقام حاصل ہو سکتا ہے جس کا اب کسی کو کوئی امکان نظر نہیں آرہا ہے۔

حضرات! میں نے آپ سے اب تک جو باتیں کہیں ان کا سب کا تعلق اپنی اصلاح سے اور اپنی درستی سے ہے یعنی یہ سب چیزیں وہ ہیں جن کو اپنے اندر پیدا کرنے کی اور جن کو اختیار کرنے کی ہمیں خود ضرورت ہے اب میں دو ایک باتیں آپ سے دوسروں میں کام کرنے کے بارہ میں بھی کہنا چاہتا ہوں ـــــ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ دوسروں میں کام صرف باہر جانے کو اور مقامی گشت ہی کو نہ سمجھیں، یہ دونوں شکلیں تو در اصل اجتماعی دینی کوشش کی شکلیں ہیں اور اپنی جگہ پر بہت ضروری اور نہایت اہم ہیں لیکن دین کی کوشش ان ہی پر ختم نہیں ہو جاتی، ہمارے آپ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے ان جماعتی گشتوں اور سفروں کے علاوہ بھی لوگوں سے دینی باتیں کرنے کو اور دین کی طرف دعوت دینے کو ہم اپنی زندگی کا جزو بنا لیں اور اس کو اپنی خاص فکر بنا لیں، یہاں تک کہ اپنے کار و بار میں اور عزیزوں دوستوں سے ملاقاتوں میں بھی اس سے غافل نہ ہوں اور اپنے جس عزیز سے یا جس دوست اور جس بھائی سے جب آپ کو دینی باتیں کرنے کا اور دین کی طرف دعوت دینے کا موقع ملے تو آپ ضرور اس موقع پر اپنا کام کریں۔ اور اس کی بھی عادت ڈالیں کہ اس سلسلہ میں بات کرنے سے پہلے اپنی نیت کو درست کر لیا کریں یعنی اس دینی بات کرنے سے آپ کا مقصد بس اللہ کی رضا اور آخرت کا ثواب اور اس بھائی کی خیر خواہی ہو اور اس کی بھی عادت ڈالیں کہ بات شروع کرنے سے پہلے اپنی بے بسی اور اپنی صلاحیت کی کمی اور اپنے نکمے پن کا خیال کر کے پہلے اللہ تعالیٰ سے دعا ضرور کر لیا کریں کہ اللہ مجھے اپنی بات اچھی طرح کہنے کی توفیق دے اور اس بھائی کے دل کو اپنے دین کی طرف پھیر دے۔

دعا کے سلسلہ میں چند باتیں مجھے آپ سے اور بھی کہنی ہیں اور بس اسی پر میں اپنی گفتگو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور ہم پر اس کا شکر واجب ہے ہم برابر دیکھتے ہیں کہ اس دینی کام میں لگنے سے کچھ اور ہو یا نہ ہو، لیکن ذکر و عبادت کا شوق اور دعا کا ذوق تو کچھ نہ کچھ ضرور پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہے، دعا کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ بندہ دعا اپنی ضرورت سے اور اپنی غرض سے کرتا ہے اور پھر اس پر وہ اعلیٰ درجہ کی عبادت کے ثواب کا بھی مستحق ہوتا ہے، حدیث شریف میں ہے " الدعاء مخ العبادۃ " یعنی دعا عبادت کا مغز اور جوہر ہے تو جس بندہ کو دعا کا ذوق نصیب ہو جائے وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے، حدیث شریف میں ہے " من فتحت لہ ابواب الدعاء فتحت لہ ابواب الرحمۃ " یعنی جس کے لیے دعا کے دروازے کھل گئے یعنی دعا کا ذوق اور دعا کی کیفیت جسے اللہ کی طرف سے نصیب ہو گئی اس کے لیے اللہ کی رحمت کے دروازے کھل گئے۔

دعا کے لیے تین یقین ضروری ہیں اور جب یہ تینوں یقین دعا کے وقت جمع ہو جائیں تو سمجھنا چاہیئے کہ

اس مرتبہ حقیقی دعا نصیب ہوگئی۔ ایک اس بات کا یقین کہ میں عاجز اور بے بس ہوں دوسرا اس بات کا یقین کہ اللہ تعالیٰ میں پوری قدرت ہے اور جو کچھ میں مانگنا چاہتا ہوں وہ بالکل ان کے قبضہ میں اور اختیار میں ہے تیسرا اس بات کا یقین کہ وہ کریم ہے اور پکارنے والوں کی سنتا ہے اور مانگنے والوں کو دیتا ہے ـــــ جب یہ تین باتیں جمع ہو جائیں گی تو انشاء اللہ الحاح نصیب ہو جائے گا اور حقیقی دعا وہی ہے جس میں الحاح ہو۔

دعا کے متعلق ایک خاص بات آپ حضرات سے یہ بھی کہنی ہے کہ دعا میں اصل اور افضل آہستہ دعا کرنا ہے اگر ساتھ میں ایسے لوگ ہوں جن کے متعلق ہمارا یہ اندازہ ہو کہ ہمارے باآواز دعا کرنے سے دعا کے مضمون میں ان کو مدد مل جائے گی تو پھر اس غرض سے آواز سے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں اور ہم لوگ اجتماعات وغیرہ میں جو ایسا کرتے ہیں تو وہ اسی وجہ سے کرتے ہیں۔ بہرحال آپ یہ ضرور یاد رکھیں کہ دعا میں اصل اور افضل آہستہ ہی دعا کرنا ہے ـــ کسی خاص ضرورت اور مصلحت کے بغیر زور سے دعا نہیں کرنی چاہیئے۔

آخری بات مجھے دعا ہی کے متعلق یہ عرض کرنی ہے کہ ہمیں دعا کی عادت زیادہ سے زیادہ ڈالنی چاہیئے ـــ اور ہر چھوٹی بڑی ضرورت میں پہلے ہمیں دعا کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے ـــ آج کل کا حال یہ ہے کہ ہماری دعاؤں کے وقت اور موقعے مقرر ہیں جیسے نمازوں کے بعد، اجتماعات کے بعد، یا کسی بڑی مصیبت کے وقت ـــ مومن کا حال یہ ہونا چاہیئے کہ ہر چھوٹی بڑی ضرورت کے لیے وہ اللہ سے سوال کرے اور اس سے مانگتا ہی رہے۔ اگر کوئی شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا بہت غور سے مطالعہ کرے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ آپ کی زندگی میں سب سے زیادہ غالب کیا چیز تھی تو اُسے یہی نظر آئے گا کہ دعا سب چیزوں پر غالب تھی تو دعا کی کثرت اور دعا کا ذوق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص نسبت اور خاص الخاص میراث ہو۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی نصیب فرمائے اور آپ سب حضرات کو بھی ـــــــ آمین

مندرجہ بالا تقریر ۲۹ نومبر بروز پنجشنبہ صبح کے وقت "دعوت اصلاح و تبلیغ لکھنؤ" کے مرکز (واقع کچہری روڈ) میں مقامی اور باہر سے آئے ہوئے تبلیغی رفقا کے سامنے کی گئی تھی۔ اس کے بعد شام کو حسب معمول بعد نماز مغرب ندوہ کی مسجد میں اجتماع ہوا اس میں جو تقریریں ہوئیں اور جماعتوں کی باہر روانگی کے سلسلہ میں جو کام ہوا اس کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں ہدیہ ناظرین ہوگی ـــ "دعوت اصلاح و تبلیغ" کے طریق کار اور پروگرام کی وضاحت اس آخری اجتماع کی تقریروں میں ہی کی گئی تھی۔

میری غلطیاں

از محمد منظور نعمانی

ذیقعدہ کے الفرقان میں "جماعت اسلامی اور اس کے خلاف فتوے" کے عنوان سے اس عاجز کا جو مضمون شایع ہوا تھا۔ ماہ صفر کے "ترجمان القرآن" میں میرے محترم دوست مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے قلم سے اسکا جواب شایع ہوا ہے۔ اگرچہ میں پہلے ہی سے یہ فیصلہ کیے ہوئے تھا کہ جماعت اسلامی کے حامیین یا مخالفین کیطرف سے میری ان گزارشات کے جواب میں اگر کچھ لکھا گیا تو اس کا جواب میں نہیں دوں گا۔ اور اسی مضمون کے آخر میں اس کا ذکر بھی کر دیا تھا لیکن اگر بالفرض پہلے سے یہ فیصلہ نہ بھی ہوتا تب بھی مولانا امین احسن صاحب کے اس جواب کے بعد یہی فیصلہ کرنا پڑتا ——— میں مولانا کے اس جواب سے اپنی چند غلطیوں پر بھی مطلع ہوا ہوں اُن میں سب سے بڑی اور بنیادی غلطی میری یہ ہے کہ اپنی نادانی اور سادہ لوحی سے میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ہمارے درمیان اگرچہ رائے اور راہ کا کچھ اختلاف ہے لیکن باہم اعتماد اور حسن ظن اور سچی محبت و مودت اور خیر خواہی و خیر اندیشی کا بالکل وہی تعلق باقی اور محفوظ ہے جو کبھی پہلے تھا ——— اب میں نہیں کہہ سکتا کہ میں ہمیشہ ہی سے اس بارہ میں غلط فہمی میں تھا یا اِدھر ۵-۶ برس میں (جب سے کہ ہم ایسے الگ ہوئے کہ پھر مل نہ سکے) مولانا کو میرے متعلق کچھ ایسی چیزیں پہنچیں جنھوں نے مولانا کے دل میں اتنا فرق ڈالا۔ میں چونکہ اپنے اندر بال برابر بھی فرق نہیں پاتا تھا اس لیے ان حضرات کے متعلق بھی میرا اندازہ اور گمان یہی تھا۔ اگر یہ مغالطہ نہ ہوتا تو جو کچھ میں نے لکھا تھا کم از کم اپنے لیے تو اس کا لکھنا میں بالکل صحیح نہ سمجھتا۔ کیونکہ میرے نزدیک یہ باتیں تب ہی مفید اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہیں جب کہ باہم پورا اعتماد اور حسن ظن موجود ہو۔

مولانا کا جوابی مضمون پڑھ کر مجھے افسوس اور افسوس سے بھی زیادہ اس پر تعجب ہوا کہ مولانا میرے بارہ میں ایک نہیں چند در چند سخت قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا ہیں، حد یہ ہے کہ وہ یہ خیال فرما رہے ہیں کہ "تبلیغی جماعت" سے[۱] چونکہ اس عاجز کا تعلق ہے اور تبلیغی جماعت مولانا کے خیال میں جماعت اسلامی کی کوئی حریف یا رقیب جماعت ہے اس لیے

[۱] جو لوگ تبلیغی جماعت اور اسکی نوعیت سے ذرا بھی واقف ہیں وہی جان سکتے ہیں کہ مولانا امین احسن صاحب کا یہ خیال حقیقت سے کتنا دور ہے۔ تبلیغی جماعت میں کوئی اور خوبی ہو یا نہ ہو لیکن مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور مختلف حلقوں کے ساتھ حسن ظن اور ہر ایک کے محاسن کی قدر شناسی اور اکرام و احترام پر جتنا زور یہاں دیا جاتا ہے میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ باہر کے حضرات جتھہ بندی کے اس زمانہ میں اس کا اندازہ بلکہ غالباً تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مولانا امین احسن صاحب کو اب میں کیسے یقین دلا سکتا ہوں کہ میرے جس مضمون کا انھیں جواب لکھنا پڑا اگر میں تبلیغی جماعت کے اصول اور تقاضے پر پورا عمل کرتا تو یہ مضمون لکھا ہی نہ جاتا۔ جب کبھی سینوں کے راز ظاہر ہوں گے اس وقت مولانا کو معلوم ہو گا کہ یہ مضمون مجھ سے تبلیغی جماعت کے تعلق نے نہیں، بلکہ "جماعت اسلامی" اور اس کے ذمہ داروں کے ساتھ تعلق نے لکھوایا تھا۔ ۱۲

اس رقیبانہ بدخواہی کے تحت ہی گویا میں نے وہ مضمون لکھا ہے ـــــــ اس کے علاوہ وہ مجھے گروہی عصبیت کا مریض بھی سمجھ رہے ہیں اور میری اس بیماری کو بھی اس مضمون کے لکھنے میں دخیل اور محرک خیال فرما رہے ہیں ـــــــ نیز انھوں نے اپنا یہ خیال بھی ظاہر فرمایا ہے کہ میں جاسوسانہ ذرائع سے جماعت اسلامی کے متعلق خاص معلومات حاصل کرتا رہا ہوں اور اس سے پہلے "وسوسہ اندازیاں" بھی کرتا رہا ہوں۔ اور خلق خدا کو دھوکا دینے کے لیے میں نے اس مضمون میں خوب مغالطے بھی دیے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے متعلق میں نے یہ مضمون مولانا امین احسن کے نزدیک اس لیے لکھا ہے کہ "اس کو پڑھنے کے بعد تبلیغی جماعت کے ارکان جماعت اسلامی کے خلاف پوری تیاری کے ساتھ ہر جگہ خطبہ دے سکیں" انا للہ و انا الیہ راجعون

مجھے مولانا کی ان باتوں سے قدرتی طور پر تکلیف بھی ہوئی اور تکلیف سے زیادہ حیرت ہوئی، اور میرا خیال ہے کہ میرے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات کو یہ حیرت ہوئی ہوگی۔ ایک تو میرے بعض ان مخدوم بزرگوں کو جن سے میں خلوتوں میں اور جلوتوں میں اور تحریری مراسلات تک میں جماعت اسلامی کی طرف سے پوری شدت سے لڑتا رہا ہوں اور بعض اوقات نوبت سخت آزردگی تک پہنچی ہے اور یہ ان بزرگوں کے ساتھ ہوا ہے جن کو میں نے عمر بھر میں کبھی کسی اور مسئلہ پر آزردہ نہیں کیا تھا۔ اسی طرح میرا خیال ہے کہ "جماعت اسلامی ہند" کے ان بزرگوں کو بھی مولانا کے ان خیالات سے تعجب ہوا ہوگا جن سے یہ عاجز برابر ملتا رہتا ہے اور بے تکلفی سے اپنے خیالات ظاہر کرتا رہا ہے، بشرطیکہ میرا یہ گمان صحیح ہو کہ ان حضرات نے میری ملاقاتوں کو کبھی منافقانہ اور متجسسانہ نہیں سمجھا ہو، (اگرچہ مولانا امین احسن صاحب کے اس تجربہ کے بعد مجھے اپنی اس قسم کی خوش گمانیوں پر اب زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہیے)

کیا عرض کروں، جماعت اسلامی کے حضرات میں سے اگر کوئی اور میرے ساتھ ایسی بے انصافی کرتا اور میں کسی سے ان صاحب کی شکایت کرنا مفید یا ضروری سمجھتا تو مولانا امین احسن صاحب سے ہی شکایت کرتا، لیکن جب وہ خود ہی میرے متعلق ان بدگمانیوں کا بے تکلف اظہار فرما رہے ہیں تو اب "کس سے شکوہ کرے کوئی"۔

پھر بعض باتوں کو میری طرف منسوب کرنے میں اور بعض میری گزارشات کا مطلب سمجھنے میں مولانا سے جو حیرت انگیز اور میرے لیے تکلیف دہ غلطیاں ہوئی ہیں، چونکہ وہ سب ان بدگمانیوں ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں اس لیے ان کے بارے میں بڑی حد تک میں ان کو معذور سمجھتا ہوں۔ آدمی جب کسی کو بدنیت اور بد باطن سمجھ لے تو پھر ذہن اس کے بارہ میں بالکل دوسری طرح کام کرنے لگتا ہے۔ البتہ ان میں سے خاصکر دو تین غلطیاں مولانا سے ایسی ہوئی ہیں کہ ان کے بارہ میں کم از کم اپنی شدید قلبی تکلیف کا ان سے اظہار کر دینا میرے لیے ضروری ہے۔ ایک میرے لفظ "اکرام مسلم" کے جو عجیب و غریب معنی میری طرف انھوں نے منسوب کیے اور پھر پورے ۴-۵ صفحے میں جس طرح اس کا رد فرمایا ہے۔ اس سے مجھے بہت اذیت ہوئی۔ گویا مولانا کی بدگمانی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اب میں اتنا

جاہل اور احمق بھی ہوگیا ہوں کہ "اکرام مسلم" کے نام سے میں انکو اس طرز عمل کا مشورہ دے رہا ہوں جس کا مشورہ کوئی اعلیٰ درجہ کا دین سے جاہل اور احمق ہی دے سکتا ہے۔ حالاں کہ "الاخوان المسلمون" کے طرز عمل کا میں نے جو حوالہ اس سلسلہ میں دیا تھا مولانا اگر چاہتے تو میرا مطلب سمجھنے میں اس سے بھی کچھ مدد لے سکتے تھے۔

دوسرے دیوبند کے ایک رسالہ کے ایک مضمون کا حوالہ دے کر جو کچھ میں نے لکھا تھا اس کو مولانا نے اتنے غلط معنی پہنائے ہیں کہ مولانا کا مضمون دیکھنے سے پہلے میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اللہ کا کوئی بندہ میرا مطلب یہ سمجھے گا۔ اس معاملہ میں میری جماعت اسلامی ہند کے ایک ذمہ دار بزرگ سے بھی مختصر مراسلت ہوئی تھی چوں کہ وہ مولانا امین احسن صاحب کی طرح میرے ساتھ بدگمان نہ تھے اس لیے ان کا جواب اور ردعمل مولانا امین احسن صاحب سے بہت مختلف تھا۔

مولانا امین احسن کی تیسری بات جس سے مجھے بہت تکلیف ہوئی یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے لٹریچر پر نظر ثانی کے متعلق میں نے جو مشورہ دیا تھا اور یہ کام دو صاحبوں کے سپرد کرنے کے لیے جو عرض کیا تھا اس کا مطلب مولانا نے یہ سمجھا اور اپنے ناظرین کو سمجھایا کہ دوسرا آدمی میں جماعت کے ان مخالفین کا نمائندہ چاہتا ہوں جنھوں نے حال میں جماعت کے خلاف فتوے صادر فرمائے ہیں اور اس طرح گویا میرا مخلصانہ مشورہ نہیں بلکہ شاطرانہ مطالبہ ایک ایسی کمیٹی کے لیے ہے جس میں ۵۰ فیصدی نمایندگی جماعت اسلامی کے مخالفین کی ہو۔

اللہ اکبر! بدگمانی کی حیرت انگیز کارفرمائی کی یہ عجیب وغریب مثال ہے کہ کوئی اور نہیں مولانا امین احسن میری طرف ایک ایسی تجویز کو منسوب کر رہے ہیں جس کو کوئی انتہائی درجہ کا احمق یا نہایت شریر قسم کا آدمی ہی پیش کر سکتا ہے، اللہ کے بندو! میں نے جماعت کے مخالفین کا اس جگہ کہاں ذکر کیا تھا، آخر آپ کا ذہن اس طرف کس قرینہ سے گیا؟ ——— کھلی ہوئی بات ہے کہ جماعت کے مخالفین کے نمائندہ کے ساتھ مل کر کبھی یہ کام نہیں ہو سکتا میرا مطلب تو ان اہل علم سے تھا جو نظام جماعت سے باہر ہونے کے باوجود جماعت اور ذمہ داران جماعت کے ساتھ اعتماد اور حسن ظن کا تعلق رکھتے ہیں اور تعاون کر سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ کام صرف ان ہی سے لیا جا سکتا ہے اور میں پاکستان میں ایسے بہت سے حضرات کو جانتا ہوں اور کوئی پوچھے تو نام بتا سکتا ہوں۔

بہر حال یہ تین باتیں تو ایسی تھیں جن سے مجھے بے حد تکلیف ہوئی اور میں ان پر سکوت نہیں کر سکا۔ ان کے علاوہ جو اور غلطیاں میرے معاملہ میں پورے ۶۴ صفحے کے اس مضمون میں مولانا سے ہوئی ہیں اگر اللہ کا کوئی بندہ انھیں بھی معلوم کر کے میرے ساتھ انصاف کرنا چاہے تو ان شاء اللہ اتنا ہی کافی ہوگا کہ وہ میرا اصل مضمون سامنے رکھ کر مولانا کا جواب پڑھے۔

تاہم میں ان ساری غلطیوں کی بنیاد جیسا کہ میں نے عرض کیا، مولانا کی ان بدگمانیوں ہی کو سمجھتا ہوں جو وہ اپنے اس

نیاز مند کے متعلق قائم کیے ہوئے ہیں، بدگمانی اچھے خاصے معقول اور ذہین و فہیم آدمیوں سے بھی بڑی سے بڑی اس قسم کی غلطیاں کرا دیتی ہے ——

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مولانا کے جواب کو پڑھ کر مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں مجھ سے سب سے بڑی اور بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ہمارے درمیان وہ اعتماد و تعلق باقی ہے جو ان باتوں کے مفید ہونے کے لیے ضروری ہے —— مگر میں عرض کروں گا کہ میری اس غلط فہمی کی ذمہ داری میری نادانی اور سادہ لوحی کے علاوہ کچھ مولانا امین احسن صاحب کی ذات گرامی پر بھی ہے مولانا نے اپنے جوابی مضمون میں میرے جس خط کا کئی جگہ ذکر کیا ہے (جو میں نے اس مضمون سے کافی مدت پہلے ان کی خدمت میں لکھا تھا) اس میں میں نے اپنی اس غلط فہمی کو پوری طرح ظاہر کر دیا تھا اور اسی بنیاد پر بے تکلف اس کا بھی اظہار کر دیا تھا کہ میں عنقریب جماعت اسلامی کے متعلق ایک مضمون بھی لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں جس میں ان چیزوں کے متعلق اپنے خیالات اور اپنی معروضات آپ حضرات کے سامنے پیش کروں گا جن کو میں جماعت کے سلسلہ میں قابل اصلاح سمجھتا ہوں — مگر مولانا نے اس کے جواب میں مجھے اشارۃً بھی اس پر مطلع نہیں کیا کہ باہمی تعلق اور اعتماد کے بارہ میں میں کسی غلط فہمی میں ہوں، اگر کسی خفی سے خفی اشارہ سے بھی میں یہ سمجھ لیتا یا مولانا ازراہ کرم اس کا ہی کوئی اشارہ کر دیتے کہ یہ وقت اس کام کے لیے ان کے نزدیک مناسب نہ ہو گا تو اس مضمون کا لکھنا میں ہرگز مفید نہ سمجھتا[ل] میں تو یہ سمجھا تھا کہ اس وقت جب کہ جماعت اور مولانا مودودی کے خلاف فتووں کا ایک طوفان برپا ہے جن کے لکھنے والوں میں میرے بعض بزرگ بھی ہیں، جب میں ان فتووں سے اپنے ایماندارانہ اختلاف کو صاف صاف ظاہر کروں گا اور اسی کے ساتھ جماعت کے کام میں میرے نزدیک جو چیزیں اصلاح طلب ہیں ان کے بارہ میں بھی اپنے خیالات عرض کروں گا تو صرف میرے واقفین اور دوست ہی نہیں بلکہ جماعت کا سارا حلقہ میری گزارشات کو مخالفانہ اعتراض و تنقید کے بجائے مخلصانہ رائے اور خیر خواہانہ مشورہ تصور کر کے ان پر غور کرے گا! الغرض میں نے اسی خیال سے اس مضمون کے لیے اس وقت کو اور اس طریقہ کو مناسب سمجھا تھا اور اپنے خط میں اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ لیکن اب مولانا امین احسن صاحب کے مضمون سے معلوم ہوا کہ یہ میری انتہائی غلط فہمی تھی بجائے اس کے ان حضرات نے اس مضمون کے لکھنے کے لیے اس وقت کے میرے انتخاب کو ایک قسم کی بدنیتی اور شرارت نفس کا نتیجہ سمجھا ہے —— ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

[ل] بلکہ اس خط کے وصول ہونے پر مولانا نے جو مختصر سا خط رسید کے طور پر مجھے لکھوایا تھا اس سے بھی میں یہی سمجھا تھا کہ ہمارے درمیان اعتماد و محبت کا جو تعلق تھا وہ موجود اور محفوظ ہے۔ ۱۲

بہرحال اس سلسلہ میں اس قسم کی مجھے جو جو غلط فہمیاں ہوئیں جن پر مولانا امین احسن صاحب کے اس مضمون نے مطلع کیا ہے مجھے ان سب کا اعتراف ہے۔ اسی طرح مولانا کا مضمون پڑھ کر میرے دل نے یہ بھی اعتراف کر لیا کہ مجھے اپنا وہ مضمون جس طرح لکھنا چاہیئے تھا اس طرح لکھنے میں میں کامیاب نہ ہو سکا اور میرے قلم سے بعض طنزیہ الفاظ بھی نکلے جن کی مولانا نے نشاندہی کی ہے (اگرچہ خدا جانتا ہے کہ میں اپنے ارادہ اور شعور کی حد تک اس غلطی سے بچنے کی بہت کوشش کرتا ہوں) مولانا نے میری اس غلطی کی جو سزا دی ہے میں ایمانداری سے اس کو ہلکی سمجھتا ہوں۔

اسی طرح مولانا کے جوابی مضمون سے میں اپنی ایک اس غلطی پر بھی مطلع ہوا کہ اپنے مضمون میں "غیر اسلامی نظام سے تعلق" کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے "تعاون" کا لفظ اس جگہ غلط استعمال کیا ہے۔ بجائے اس کے وہاں "تعلق" کا یا اسی قسم کا کوئی لفظ استعمال ہونا چاہیئے تھا ——— لیکن اصل مسئلہ کی تنقیح چونکہ بجائے خود میرے نزدیک ضروری ہے اس لیے انشاء اللہ نفس مسئلہ پر کسی وقت تفصیل سے اور مستقلاً کچھ عرض کروں گا اور اسی وقت تبلاؤں گا .... کہ اس بارہ میں میرا جو نقطۂ نظر ہے اس کا ذکر اس زمانہ کی تحریروں میں بھی کہیں محفوظ ہے یا نہیں ——— بلکہ میرے خیال میں مولانا امین احسن صاحب کے اس جواب نے تو مسئلہ کو اور زیادہ آسان کر دیا ہے اور جہاں تک میں سمجھا ہوں ان کی توضیح نے میرا مقصد بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔

آخر میں صرف ایک چیز اور عرض کرنی ہے ——— مولانا امین احسن صاحب نے اپنے جوابی مضمون میں میرے ایک خط کا کئی جگہ ذکر فرمایا ہے اور اس کے متعلق صفحے کے صفحے لکھے ہیں، جو کچھ انھوں نے میرے مضمون کے متعلق تحریر فرمایا ہے اگر اللہ کا کوئی بندہ اس پر غور کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہے تو ذیقعدہ کے الفرقان میں میرا اصل مضمون پڑھ کر غور کر سکتا ہے لیکن جو کچھ انھوں نے میرے خط کے بارہ میں تحریر فرمایا ہے، وہ خط چونکہ شایع نہیں ہوا ہے اس لیے اس کے بارہ میں ناظرین کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے ہیں میں نے مولانا کو جب وہ خط لکھا تھا تو ساتھ ہی اشاعت کی اجازت بھی لکھدی تھی، اگر وہ اس پر کچھ لکھنا چاہتے تھے تو میرے خیال میں اس کو شایع کر دینا چاہیئے تھا ——— بہرحال اب اس کا وہ حصہ ذیل میں شایع کیا جا رہا ہے، جس کا تذکرہ مولانا نے اپنے جواب میں فرمایا ہے۔ ترجمان القرآن کے ناظرین میں سے جن حضرات کی نظر سے خط کا یہ اقتباس گزرے گا وہ اندازہ کر سکیں گے کہ مولانا امین احسن صاحب نے اس خط کے مضمون کا جس طرح ذکر فرمایا ہے وہ اس کے مقصد اور اس کی روح سے کتنا مطابق ہے؟

راقم سطور نے یہ خط غالباً شروع شوال میں مولانا کو لکھا تھا، ابتدائی حصہ ان فتووں پر اظہار افسوس و رنج سے متعلق تھا جو ان دنوں میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے خلاف مختلف حلقوں سے شایع ہوئے

تھے اور دوسرا حصہ خود مولانا امین احسن صاحب کے ایک مضمون سے متعلق تھا مولانا موصوف نے اپنے مضمون میں اسی کا ذکر فرمایا ہے اس سلسلہ میں جو کچھ اس عاجز نے لکھا تھا وہ بلفظہ درج ذیل ہے:۔

"حال کا ترجمان مولانا ابو اللیث صاحب نے ہی کہیں سے پڑھنے کے لیے میرے پاس بھجوایا تھا جو پڑھ کر واپس بھی کر دیا اس میں آپ نے حکیم عبد الرشید محمود صاحب کے جواب میں تصور شیخ پر کلام کرتے ہوئے حضرات نقشبندیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر افسوس ہی نہیں ہوا بلکہ بڑی تکلیف بھی ہوئی۔ کاش آپ کا قلم اس قدر بے احتیاط ہو کر نہ چلتا۔ جو شخص تصور شیخ کی حقیقت جانتا ہو اس کے لیے آپ کا یہ فتویٰ ان فتووں سے زیادہ غلط اور تکلیف دہ ہوگا جو ہندستان اور پاکستان میں آپ حضرات کے خلاف لکھے گئے ہیں خود آپ کی تحریر بتلا رہی ہے کہ آپ نے تصور شیخ کی حقیقت معلوم کرنے کی بالکل کوشش نہیں کی ہے بلکہ آپ کے ذہن اور دماغ میں اس کا ایک تصور اور تخیل ہے (جو واقعۃً شرک ہی ہوگا) آپ نے اسی کو اہل سلوک کا معمول تصور شیخ سمجھ کر سارے نقشبندیہ کو شرک کے گھاٹ اتار دیا اور "اجعل لنا الٰھاً کما لھم اٰلھۃ" کے مجرموں کے ساتھ باندھ کر ان کی سزا (قتل برنائے ارتداد) کا مستحق ان کو بھی قرار دے دیا۔ ممکن ہے آپ کی نیت یہاں تک نہ ہو لیکن خدارا سوچیے کہ عام ناظرین اس سے اس کے سوا اور کیا سمجھیں گے۔ میرے نزدیک یہ وہی نفسی بیماری ہے جس میں آپ حضرات کے خلاف فتوے دینے والے بزرگ مبتلا ہیں انھوں نے پہلے ہی سے کچھ بدگمانیوں کی بنا پر آپ حضرات کو گمراہ اور گمراہ کن سمجھ رکھا ہے اور اسی لیے سخت سے سخت ناروا الفاظ آپ کے متعلق لکھتے وقت ان کا ضمیر ان کو نہیں ٹوکتا کہ تحقیق کا حق ادا کیے بغیر کسی کے متعلق اتنی سنگین بات تم کیوں کہہ رہے ہو میرا خیال ہوتا ہے کہ اسی طرح آپ نے غریب اہل تصوف و سلوک کے متعلق ایک خیال قائم کر رکھا ہے کہ شرک و بدعت کے سارے کیڑے ان میں موجود ہیں، اس لیے اتنی بڑی اور اتنی دور رس بات کہتے وقت آپ کے ضمیر نے آپ کا قلم نہیں روکا اور کچھ نہیں تو یہ تو سوچا ہوتا کہ کم از کم حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ توحید و حقیقت توحید و حقیقت شرک سے اتنے جاہل نہیں ہوسکتے کہ ایک خالص مشرکانہ عمل کو (جس کی سزا قتل ہے) وصول الی اللہ کا ذریعہ قرار دے جائیں [1]۔ معلوم نہیں آپ واقف ہیں

---

[1] اس سلسلہ میں مولانا امین احسن صاحب نے اپنے جوابی مضمون میں ایک عجیب غلط بحث کیا ہے جو ان جیسے حضرات کی شان سے بہت بعید ہے۔ ناظرین کے سامنے میری اصل عبارت موجود ہے وہ دیکھ سکتے ہیں کہ میں نے یہاں حضرت مجدد اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کا نام یہی بتلانے کے لیے لیا ہے کہ جب یہ حضرات عملی تصور شیخ کے مجوز ہیں تو اس سے اتنا تو ضرور سمجھا جا سکتا ہے کہ "تصور شیخ" کی جو اصل حقیقت ہے وہ

(باقی صفحہ ۹۰ پر)

یا نہیں کہ یہ دونوں حضرات بھی تصورِ شیخ کے استعمال اور تجویز کے مجرم نقشبندیوں ہی میں ہیں اور خود
ان کے تذکروں اور ان کی کتابوں میں اس شغل کا ذکر موجود ہے۔ حضرت مجدد کے مکتوبات میں بھی
اور اشغال تصوف سے متعلق شاہ صاحب کے رسائل میں بھی "شغل رابطہ" اور "شغل برزخ"

(بقیہ ۸۹)

جو نقشبندیہ کا معمول ہے وہ شرک نہیں ہے۔ کیوں کہ مولانا امین احسن صاحب جیسے حضرات کے نزدیک بھی یہ مسلم ہے کہ یہ حضرات حقیقتِ توحید اور حقیقتِ شرک سے اتنے جاہل نہیں ہو سکتے کہ ایک مشرکانہ عمل کو وصول الی اللہ کا ذریعہ قرار دے جائیں ـــــ یہ تو میرا مطلب اور میرے الفاظ ہیں لیکن اس سلسلہ میں مولانا نے اس کے بالکل برعکس جو کچھ میرے سر تھوپا ہے اس کو ان کے جوابی مضمون میں دیکھا جائے۔ اگر میں بھی ان کے متعلق اتنا بدگمان ہو چکا ہوتا جتنا کہ وہ میرے متعلق ہو چکے ہیں تو میں ان کے مضمون کی اس قسم کی باتوں کو تسامح اور غلط فہمی نہیں بلکہ کرتب سمجھتا۔

مولانا کے جوابی مضمون سے میں نے یہ بھی سمجھا ہے کہ وہ میرے اس طرز فکر اور طرز بحث کو بہت غلط سمجھتے ہیں کہ میں اس قسم کے مباحث اور مسائل میں حضرت مجدد اور شاہ ولی اللہ جیسی شخصیتوں کو بیچ میں لے آتا ہوں ـــــ مولانا کا نقطۂ نظر یہی ہوگا لیکن میں تو یہ سمجھتا ہوں اور میرا عمر بھر کا تجربہ ہے کہ یہ طریقہ بہت صحیح ہے اور بسا اوقات یہ بڑے سے بڑے غلط رو اور غیر منصف آدمی کو بھی حقیقت پسند بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر عرض کروں فرض کیجیے ایک شخص جو حضرت مجدد اور شاہ ولی اللہ کو مجدد اور دین کا معتمد شارح اور امام تسلیم کرتا ہو، کسی غلط فہمی کی وجہ سے یہ کہتا ہو کہ تصورِ شیخ جو نقشبندیوں کے معمولات میں سے ہے قطعاً شرک ہے اور اس کے عامل قطعاً مشرک ہیں۔ تو میرے نزدیک اس کو سمجھانے اور اس غلط روی سے اس کو روکنے کا سب سے آسان اور مختصر راستہ یہی ہے کہ میں اس کو یہ دکھلا دوں کہ حضرت مجدد اور شاہ ولی اللہ بھی ان نقشبندیوں ہی میں سے ہیں اور وہ بھی اس تصورِ شیخ کے قائل اور مجوز ہیں ـــ اس کے بعد وہ اس پر مجبور ہوگا کہ تصورِ شیخ کے خود کوئی ایسے معنی ڈھونڈے جو اس کے نزدیک بھی شرک نہ ہوں اور جو دین کی امامت کے ساتھ بھی جوڑ کھا سکیں اور پھر خود کہے گا کہ یہ حضرات "اس تصورِ شیخ" کے قائل اور مجوز ہوں گے۔ اور اس طرح جھگڑا بڑی آسانی سے چکُ جائے گا۔

بہرحال یہ عاجز ان بزرگوں کا نام اس قسم کے مسائل اور مباحث میں اس لیے نہیں لیتا کہ ان کا قول یا عمل کوئی حجت شرعی ہے یا یہ حضرات معصوم عن الخطا ہیں، بلکہ اس لیے لیتا ہوں کہ ان کے متعلق مولانا امین احسن صاحب جیسے حضرات کو بھی یہ مسلم ہے کہ یہ نہ مشرک تھے نہ دین میں فساد پیدا کرنے والے اور نہ گمراہیوں کو اس میں گھسانے والے بلکہ آئمہ ہدیٰ میں سے تھے اور جو شخص ان حضرات کی اس واقعی حیثیت کو تسلیم کرے اسے عقلاً و نقلاً یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ ان بزرگوں نے جن چیزوں کی مسلمانوں کو دعوت اور تعلیم دی وہ نہ شرک و کفر ہو نہ گمراہی۔ الغرض میں صرف اتنی ہی بات منوانے کے لیے ان حضرات کا نام کبھی کبھی تصوف اور اس کے متعلقہ مسائل میں لیتا ہوں اس کے جواب میں یہ کہنا کہ یہ حضرات معصوم نہیں تھے اور اس پر صفحے کے صفحے لکھنا غلط بحث کی ایسی مثال ہے جو اہل علم اور اہل دیانت کے لیے ہرگز زیبا نہیں۔

کے نام سے اس شغل کا تذکرہ بہت سی جگہ آپ کو مل سکتا ہے۔ اہل سلوک کے یہاں اس کے معروف عنوانات یہی ہیں۔

بہرحال آپ کی اس بے احتیاطی بلکہ تکلیف دہ زیادتی سے بڑی تکلیف ہوئی اگر لکھتے وقت میں آپکے پاس ہوتا اور یہ اندازہ کرتا کہ محبت و اخوت کا وہ حق میرے لیے اب بھی آپ مانتے ہیں جس میں میرے نزدیک کبھی کوئی فرق نہیں آیا ہے تو میں آپ کا ہاتھ پکڑ لیتا قلم چھین لیتا اور کاغذ پھاڑ دیتا اب اتنی دور سے کیا کروں اور کس طرح آپ پر اپنے دل کا رنج اور دکھ ظاہر کروں۔ تصور شیخ جو صوفیا کی خاص اصلاح اور ان کے بعض سلاسل کا خاص معمول ہے اس میں شرک کا تو شائبہ بھی نہیں محتاطین نے جو اس کو ترک اور منع کیا ہے (اور یہ عاجز بھی ترک و منع ہی کے حق میں ہے) تو وہ دوسرے خطرات کی وجہ سے ـــــ بہرحال تصور شیخ کا جو تصور آپکے ذہن میں ہے (جو غالباً شرک ہی ہوگا) اس کو حضرات نقشبندیہ کی طرف منسوب کر کے ان کے خلاف اتنا سخت لکھ دینا اس کے سوا کیا عرض کروں کہ اللہ کے ہزاروں مقبول بندوں کو اپنے حق میں مدعی بنا لینا ہو۔

آپ یقین فرمائیں کہ میں صرف اپنی قلبی تکلیف ہی کی وجہ سے آپ سے یہ باتیں اس طرح نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ خدا جانتا ہے کہ آپ کا اپنے پر حق سمجھ کر بھی عرض کر رہا ہوں اگر میری بات کسی درجہ میں قابل شنوائی و پذیرائی ہو اور مجھے کوئی ایسی بات عرض کرنے کا حقدار سمجھا جائے جو خاص تعلق و اعتماد ہی کی بنا پر کہی جا سکتی ہو تو میں آپسے عرض کروں گا کہ اس سنگین غلطی سے بلا تامل رجوع فرما کر اپنی ذمہ داری کا حق ادا کرنے کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی اپنی غلطیوں سے رجوع کرنے کے لیے اچھی مثال قائم فرمائیے![1] کلکم خطاؤن وخیر الخطائین التوابون۔

---

[1] اس موقع پر ناظرین کرام سے اتنا عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہو کہ حکیم عبدالرشید محمود صاحب کے مضمون کا جواب دیتے ہوئے مولانا امین احسن صاحب نے جو کچھ لکھا تھا میں اس سے یہ سمجھا تھا کہ (الف) صوفیہ کا اصطلاحی "تصور شیخ" ان کے نزدیک بالکل شرک ہو "شرک دون شرک" والا شرک نہیں بلکہ شرک حقیقی و جلی. گویا بت پرستی کے درجہ کا شرک

(ب) اور ان کے ذہن میں اس کا کوئی ایسا تصور رہے جو واقعۃً بھی غالباً شرک ہی ہوگا۔

(ج) اور اسی بنا پر وہ یہ مان کر کہ نقشبندیہ تصور شیخ کے عامل ہیں ان کو مشرک اور گردن زدنی قرار دے رہے ہیں۔

بہرحال میں نے ان کے مضمون سے یہی سمجھا تھا اور اسی بنا پر اپنے کو ان کا ایک بے تکلف اور مخلص دوست سمجھ کر یہ ساری خامہ فرسائی کی تھی لیکن اب انھوں نے میرے مضمون کے جواب میں جو کچھ اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس سے انکار ہے کہ حضرت مجدد و شاہ ولی اللہ وغیرہ نقشبندی بزرگان دین تصور شیخ کی کسی ایسی صورت کے قائل اور مجوز ہوں جو شرک ہو" ـــــ الحمد للہ "چشم ما روشن دل ما شاد" ـــــ میرے لیے یہ مان لینا بحمد اللہ بڑا آسان ہو کہ ان کی پہلی عبارت سے جو کچھ میں نے سمجھا تھا وہ غلط سمجھا ہوگا۔ اگر اور لوگوں نے بھی وہی سمجھا ہو اور ان کے لیے بھی اپنی ہی غلط فہمی مان لینا ایسا آسان ہو تو وہ بھی یہی مان لیں۔

آج جب بات چل پڑی ہو تو نفس تصوف کے متعلق بھی اتنا عرض کر دوں کہ کسی اور کے لیے تصوف ضروری ہو یا نہ ہو مگر جس کام کو لے کر آپ حضرات کھڑے ہوئے ہیں اس کے علمبرداروں کے لیے تو تصوف بالکل ناگزیر ہے آج کی دنیا میں تحریکیں ہر طرح کے آدمی چلا سکتے ہیں۔ الکشنوں کی دوڑ بھاگ میں دیوانے ہو کر بھوک پیاس برداشت کرنا، چھالوں بھرے پاؤں سے دوڑتے رہنا اور موقع آجانے پر گولیاں کھانا، پھانسی کے پھندے کو چوم کر گلے میں خود ڈال لینا اب تو یہ ساری باتیں فسق اور خدا کے انکار کے ساتھ بھی ہوتی ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام کے مقصد کے لیے جد و جہد جس عبادتی ذوق اور جس یقین وعشق (جنون) اور ابتغاء وجہ اللہ اور شوق جنت کی جن کیفیات کے ساتھ ہونی چاہیئے جو صحابہ کرام کا امتیاز تھا اور جو حضرت سید شہید کے رفقا میں نظر آتا ہے اور تلاش کرنے والوں کو اب بھی کہیں کہیں اس کے نمونے مل سکتے ہیں، اس مادیت کے دور میں اس کے پیدا کرنے کا کوئی راستہ تصوّف کے سوا اب تک تو نکلا نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں آپ حضرات نے مختلف موقعوں پر جو کہا اور لکھا ہے جتنا میرے مطالعہ میں آیا ہے اس سے تو میں یہی سمجھ رہا ہوں کہ اس مقصد کے لیے ابھی تک آپ نے کسی دوسرے راستہ کا تجربہ نہیں کیا ہے، صرف ذہن، زبان اور قلم ہی سے سوچا، لکھا اور کہا جا رہا ہے۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں کہ حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے آخری دور حیات میں جب ان کے قریب رہنا ہوا تو میں نے اس شخص کے وجود میں اس حقیقت کو گویا اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کیا عرض کروں اب کوئی ایسا مرد خدا اپنی نظر میں کبھی نہیں[1] ورنہ ایک دفعہ تو آپ دونوں

---

[1] مولانا امین احسن صاحب کے تازہ جوابی مضمون سے معلوم ہوا کہ انھوں نے میرے ان الفاظ کا مطلب یہ سمجھا ہو کہ میری نظر میں اب کوئی اللہ کا بندہ ایسا موجود نہیں جس میں تصوف کے ان اچھے نتائج کو دیکھا جا سکے جن کے حصول کے لیے تصوف کی ضرورت بتلائی جاتی ہے ——— الحمدللہ میں اللہ کے ایسے متعدد بندوں کو جانتا ہوں اور وہ اس دنیا میں موجود ہیں. ہاں مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے بعد میری نظر نے کوئی ایسا شخص ابھی تک نہیں دیکھا جس نے اپنی زندگی اور اپنی ساری طاقتوں کو ان کی طرح انبیاء علیہم السلام کے مقصد کے واسطے جد وجہد کی نذر کر دیا ہو اور اس کا حال یہ ہو کہ ہم جیسوں کی نظریں بھی صاف دیکھ سکیں کہ یہ جو کچھ کرتا ہے کیسے عبادتی ذوق سے اور یقین وعشق اور ابتغاء وجہ اللہ اور شوق جنت کی کیسی کیفیات کے ساتھ کرتا ہے مولانا امین احسن اور مولانا مودودی جیسے حضرات کے متعلق چونکہ میرا یہ اندازہ ہے کہ وہ کسی ایسی ہی شخصیت سے متاثر ہو سکتے ہیں جس میں دین کی جدّوجہد کے ساتھ یہ چیزیں موجود ہوں اس لیے اس موقع پر حسرت کے ساتھ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر قلم کی زبان پر آ گیا تھا، ورنہ جہاں تک نفس تصوّف کے نتائج کے اچھے نمونوں کا تعلق ہے، یہ جنس کمیاب تو ضرور ہے لیکن الحمدللہ نایاب ابھی تک نہیں ہے۔

حضرات کا ہاتھ بلکہ پاؤں پکڑ لیتا کہ چند دن اس کے پاس رہ کر دیکھو پھر معلوم ہو جاتا کہ اصل تصوف کیا چیز ہے اور اس کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اور دین میں اس کا درجہ اور اسکی حیثیت کیا ہے۔ آپ جیسے اصحاب فکر و مالکان زبان و قلم کو کوئی دوسرا باتوں اور دلیلوں سے نہیں منوا سکتا، اچھی باتیں کرنے اور اچھا لکھنے کا سلیقہ آپ کا ساکسے ہو؟ ــــ بے تکلفی میں لذت معلوم ہوئی اس لیے استعمال کرلی گئی، معافی کا خواستگار ہوں۔"

....

والسلام

مولانا ابن احسن صاحب نے اس عاجز کے متعلق جن شدید بدگمانیوں کا اپنے جواب میں اظہار فرمایا ہے میں نے ان کو دور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے اور نہ اس قسم کی کوششیں مفید ہو سکتی ہیں۔ صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ اگر اس زندگی میں نہیں تو آنے والی زندگی میں انشاء اللہ ضرور مولانا کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سراسر ان کی غلط گمانیاں تھیں بشرطیکہ ہم دونوں کا خاتمہ ایمان پر ہوا اور اس گنہگار کو اللہ کی رحمت سے دونوں کے بارہ میں یہی امید ہے۔

"ملفوظات"

حضرت مولانا محمد الیاس رح

مرتبہ

(مولانا محمد منظور نعمانی)

آج مولانا مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن اگر کوئی انھیں جاننا اور ان کی باتیں اگر براہ راست سننا چاہیے تو حضرت مرحوم کے اس مجموعہ

"ملفوظات"

کا مطالعہ کرلے، جو دین کے حقائق و معارف کا عجیب و غریب گنجینہ ہے اس سے مولانا مرحوم کی دینی دعوت کی روح و حقیقت، اس کے اصول و مقاصد اور آداب و لوازم، اور اس کی گہرائیاں بھی معلوم ہونگی اور یہ بھی اندازہ ہو جائیگا کہ تفقہ فی الدین اور معرفت و یقین میں مولانا کا مقام کتنا بلند تھا اور اللہ تعالیٰ نے دین کے کیسے حقائق و معارف ان کے قلب پر منکشف فرما دیئے تھے اور امت مسلمہ کے امراض کی مولانا نے کیسی صحیح تشخیص کی تھی حقیقت شناسوں کی نظر میں اس مجموعہ کا ایک ایک ملفوظ ایسا ہے جس پر ضخیم کتابیں قربان کی جا سکتی ہیں ۔ قیمت مجلد عـہ

اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں

خدا کا ایک وفادار بندہ

حضرت شاہ ولی اللہ

(از مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

شاہ ولی اللہ رح کا دور اسلامی ہند کا سخت طوفانی دور تھا مغلیہ سلطنت کا زوال و انحطاط، ہندستان میں انگریزی اقتدار کا آغاز، سکھ اور مرہٹہ تحریکوں کا زور اور ان کے غارتگرانہ ہنگامے، نادر شاہ کا خونی سیلاب اور احمد شاہ ابدالی کی تاریخی جنگ، یہ سارے واقعات شاہ صاحب رح ہی کے زمانے میں ہوئے، اور خود شاہ صاحب رح ان سے غیر متعلق بھی نہ تھے

اس لیئے

اس مقالہ میں ان تمام واقعات اور ان کے اسباب و اثرات کا ذکر بھی اچھی خاصی تفصیل سے آگیا ہے، پھر بتلایا گیا ہے کہ شاہ صاحب رح نے فتنوں کے اس طوفانی دور میں اسلام کی خدمت کیا اور کس طرح کی؟ اور ان کے طرز عمل سے موجودہ حالات میں ہمیں کیا روشنی ملتی ہے۔

کاغذ سفید چکنا ــــ قیمت :- عـمر

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ

اور انکی دینی دعوت

(تالیف :- مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ــــ ندوی)

اس دور کے مشہور مصلح اور عارف حضرت مولانا محمد الیاس کے نام سے ہمارے ملک کے باخبر حضرات عام طور سے واقف ہیں کتاب در اصل مولانا ممدوح کی سوانح حیات ہے جس میں ان کے ذاتی حالات اور سوانح کے علاوہ انکی مشہور دینی و اصلاحی دعوت کو بھی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے جو بلاشبہ اس دور کی نہایت وسیع اور گہری دینی و اصلاحی تحریک ہے اس دعوت و تحریک کے پس منظر اسکے بنیادی اصول اور اسکی ارتقائی منزلوں کو جس تحقیق و تنقیح کے ساتھ بہترین علمی و تصنیفی زبان میں اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ اسکے محترم مؤلف ہی کا حصہ ہے ــــ شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کا مبسوط مقدمہ ہے جس میں کتاب و سنت کی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کے اصول دعوت کی تشریح کرکے دکھلایا گیا ہے کہ اس دینی تحریک کو اسوۂ انبیاء ع سے کس درجہ مطابقت ہے ــــ

کاغذ نفیس، صفحات ۳۲۸ ــ کتابت طباعت اعلیٰ۔ قیمت :- عـمہ

امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

اور ان کا فلسفہ

(از حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رح)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف اور انکے فلسفہ پر یہ نہایت گہر علمی مقالہ بلاشبہ نوادر میں سے ہے، اور ان کی علمی خصوصیات اور ان کے فلسفہ کی بنیادوں کو سمجھنے کے لیے یہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے،

اس میں

پانچ باب ہیں ــــ پہلے باب میں شاہ صاحب رح کی تعلیم و تربیت اور ہندوستان کے اساتذہ و مشائخ سے استفادہ و تحصیل کا بیان ہے دوسرے اور تیسرے باب میں علوم قرآن و حدیث میں انکی تجدیدات و خاص نظریات کی تشریح کی گئی ہے، اور چوتھے و پانچویں باب میں علی الترتیب فقہ اور تصوف کے بارے میں ان کے خاص مجتہدانہ نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے

لیکن صرف اہل علم اور عربی داں حضرات کے مطالعہ کے لائق ہے

کاغذ سفید چکنا ــ قیمت :- عہ

جلد ۱۹ | بابتہ ماہ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ مطابق فروری ۱۹۵۲ء | نمبر ۴

سُرخ پنسل کا نشان! اس بات کی علامت ھے کہ جناب کی مُدّتِ خریداری اِس شمارہ پر ختم ہوگئی ھے لہٰذا اپنا چندہ برائے ایک سال مبلغ (۵ر) بذریعہ منی آرڈر ارسال فرماکر مشکور فرمائیے اگر ۲۵؍ فروری ۱۹۵۲ء تک جناب کا چندہ وصول نہ ہوا، اور نہ کوئی اطلاع آئی تو اگلا پرچہ وی، پی بھیجا جائے گا، جس کا وصول کرنا جناب کا اخلاقی فریضہ ہوگا ــــــ پاکستان کے حضرات اپنا چندہ حسبِ معمول "جناب حاجی عبدالجبار صاحب ایس، جے، اینڈ جی فضل الٰہی کمپنی ساؤتھ نیپیر روڈ کراچی پاکستان" کے پتہ پر ارسال فرماکر رسید ہمارے پاس ارسال فرمادیں۔ اگر آپ کے چندہ کی اطلاع ۲۵؍ فروری تک موصول نہیں ہوئی، تو "ادارۂ اصلاح و تبلیغ۔ لاہور" سے آپ کی خدمت میں "الفرقان" بذریعہ وی، پی ارسال کیا جائیگا۔ والسّلام ــــــ ناظم۔ الفرقان۔ لکھنؤ۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

باسمہٖ سبحانہٗ　　　　　　　　　　　　　　　　　　حمداً وسلاماً

نگاہِ اوّلیں!

"الفرقان کی گذشتہ اشاعت کے ان ہی صفحات میں تبلیغی تحریک کے بعض خاص پہلوؤں پر کچھ عرض کرتے ہوئے حضرت مولٰنا محمد الیاسؒ کی بعض خاص ہدایات کا اس عاجز نے ذکر کیا تھا، اُمید ہے کہ ناظرین کرام کے حافظہ میں وہ باتیں محفوظ ہوں گی —— آج بھی اسی سلسلہ میں چند اور چیزیں عرض کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ الفرقان کے ناظرین کرام کو عموماً اور تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے دوستوں کو خصوصاً ان سے فائدہ اُٹھانے کی توفیق دے"

ہماری اس دنیا میں اختلاف اور نزاع کے موقع پر ہر شخص اپنے کو بری اور بے قصور ثابت کرنے کی اور سارا الزام دوسرے ہی فریق پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے، یہی اس دنیا کا عام رواج ہے (اور یہ واقعہ ہے کہ ان سطروں کا لکھنے والا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے) لیکن مولٰنا محمد الیاسؒ اپنی اصلاحی و تبلیغی جد وجہد کے سلسلہ میں اس پر انتہائی زور دیتے تھے کہ ایسے مواقع پر اپنی غلطی اور دوسرے کا عذر اور اس کے طرزِ عمل کی کوئی مناسب توجیہ معلوم کرنے پر اپنی فکری قوت کو صرف کیا جائے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم "ظنوا المومنین خیرًا" اور "اتهموا انفسكم" مولٰنا کے قلب و رُوح پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ آج کسی کو اس کا اندازہ کرانا بھی مشکل ہے —— اور یہ چیز ان کی کوئی مبنی بر مصلحت پالیسی اور حکمت عملی نہیں تھی، بلکہ وہ اس کو قربت و عبادت سمجھتے تھے اور اس کے فضائل بیان فرماتے تھے۔

اسی طرح مولٰنا مرحوم ایک اس چیز کی بڑی تاکید فرماتے تھے کہ گفتگو میں غالب آنے کی اور اپنی بات کو اونچا رکھنے کی کوشش کبھی نہ کی جائے، بلکہ جہاں تک ہو سکے اپنے ہی کو جھکانے اور نیچا رکھنے کی کوشش کی جائے —— ایک دن اس عاجز ہی سے فرمایا:- اگر کوئی اعتراض کرے اور اس کا اعتراض غلط ہو تو بھی اُس کا جواب اس طرح نہ دو جس میں وہ اپنی ہار سمجھے، بلکہ اپنے کو ہراتے ہوئے اور اس کو جتاتے ہوئے جواب دو۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ تمھیں ہرانے کے لئے پھر وہ اور نئے نئے اعتراض اور حربے تلاش نہیں کرے گا، اور تمھارا اور اُس بیچارہ کا وقت ضائع ہونے سے بچ جائے گا، —— اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اُس کا دل تمھاری بات کو سمجھنے کے لئے کھل جائے گا۔ جبتک آدمی کو دوسرے کے متعلق یہ شبہ رہتا ہے کہ یہ مجھے ہرانا چاہتا ہے وہ اس کی کسی بات کو ماننا نہیں چاہتا، اسلئے اس کا ہمیشہ لحاظ رکھا جائے کہ گفتگو میں جیتنے کی اور اپنے کو غالب کرنے کی کوشش بالکل نہ ہو، اللہ تعالیٰ متواضعین ہی کی مدد کرتا ہے۔

اسی طرح مولانا مرحوم الزام اور اعتراض و تنقید کے بالکل قائل نہ تھے اور اُس میں کوئی خیر نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس کو گناہ سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ فرمایا: "اعتراض حرام ہے، اور اصلاح فرض ہے" ـــــ اُن کا یقین تھا کہ الزام اور اعتراض دوسرے کو نیچا دکھانے اور اپنے کو اونچا کرنے کے لئے اور حظ نفس حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے، اور اس کا محرک علو کی خواہش یا انتقام اور عداوت کا جذبہ ہوتا ہے۔ اور اصلاح کے لئے اٹھانے اور اس کی راہ میں محنت کرانے کا محرک حکم الٰہی کا دباؤ یا دل کا درد و سوز اور محبت و خیر خواہی کا جوش ہوتا ہے، اور یہی انبیاء علیہم السلام کی، خصوصاً خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) کی میراث ہے ـــــ لعلک باخع نفسک ان لا یکونوا مومنین ۔

مولانا مرحوم کے اسی طرح کے خاص اصولوں میں سے ایک یہ تھا جس کی وہ اپنے لوگوں کو بڑی تاکید فرماتے تھے کہ ہمیشہ "ماعلیکم" پر نظر رکھو، اور "مالکم" کو خدا کے حوالہ کرو، یعنی تم صرف اس پر نظر رکھو کہ دوسروں کے ساتھ تمھیں کیا کرنا چاہئے، اور اُن کے کیا حقوق ہیں جن کو تمھیں ادا کرنا چاہئے، اس کو بالکل مت دیکھو کہ دوسروں کا معاملہ تمھارے ساتھ کیا ہے اور وہ تمھارے حقوق ادا کر رہے ہیں یا نہیں، یہ دیکھنا اُن کا کام ہے ـــــ فرماتے تھے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جو شخص کسی معاملہ کو لیکر آتا آپ اس کو ہمیشہ "ماعلیہ" ہی کی تاکید فرماتے تھے، اور "مالہ" کے بارہ میں صبر او رعفو کی تلقین فرماتے تھے ـــــ پھر احادیث سے اگر کبھی اسکی مثالیں اور نظیریں بیان فرماتے تو بعض اوقات گھنٹے گذر جاتے۔

مولانا مرحوم کی اس قسم کی گفتگوئیں سُنکر کتنی ہی دفعہ اس ظلوم وجہول کو اس کا احساس ہوا کہ یہ حدیثیں ہم نے بھی بار بار پڑھی اور پڑھائی ہیں، لیکن وائے جہالت و محرومی کہ کبھی ہم نے ان سے یہ سبق نہیں لیا جو مولانا کی اس گفتگو سے آج حاصل ہوا، حالانکہ یہی دراصل ان حدیثوں کا مغز ہے۔

اسی قسم کے مولانا مرحوم کے خاص نظریات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اگر کسی کو کسی غلطی میں اور گناہ میں مبتلا دیکھا جائے تو فوراً اس کو ٹوکا نہ جائے، بلکہ پہلے خوب سوچا جائے کہ کس طریقہ سے اس اللہ کے بندہ کو اس برائی سے بچایا جاسکتا ہے، پھر جو طریقہ کارگر معلوم ہو اس کے مطابق کوشش کی جائے۔

ایک دن راقم سطور ہی نے عرض کیا کہ منکر پر نکیر کرنا اور ٹوکنا تو واجب ہے اگر ہم خاموشی اختیار کرینگے تو گنہگار ہونگے ـــــ مولانا نے فرمایا، کہ :- ٹوکنے کا اور اسی وقت نکیر کرنے کا حکم کس نص میں ہے؟

میں نے عرض کیا کہ یہ چونکہ شریعت کا مشہور مسلّم مسئلہ ہے، اسلئے اس کے ماخذ کے بارہ میں کبھی خاص طور سے غور تو نہیں کیا، لیکن اگر کوئی اور دلیل نہ بھی ہو تو بھی حضرت ابو سعید خدریؓ والی صحیحین کی مشہور حدیث کافی ہے۔ یعنی ـــــ "من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه وذالك اضعف الايمان"

مولانا نے فرمایا ——— اس کا ترجمہ تو کیجئے!۔

میں نے ترجمہ اس طرح کرنا شروع کیا ——— "تم میں سے جو شخص کوئی منکر دیکھے تو چاہئے کہ اس کو بدلنے کی کوشش کرے، اپنے ہاتھ سے، اگر ایسا نہ کر سکے تو اپنی زبان سے، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو پھر اپنے دل ہی سے، اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے"

فرمایا ——— "ٹھیک ہے، لیکن اس میں تو اس منکر کو بدلنے کا یا بدلنے کی کوشش کرنے کا حکم ہوا، آپ نے ٹوکنا اور زبان سے نکیر کر دینا کہاں سے نکالا" ——— میں نے عرض کیا: "میں سمجھ گیا"

پھر فرمایا:۔ حدیث میں منکر کو بدلنے کی کوشش کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اور مطلب یہ تھا کہ جب تم کسی اللہ کے بندہ کو منکر میں مبتلا دیکھو تو اس کو منکر سے ہٹا کے معروف پر لگانے کی جو کوشش ہاتھ سے، زبان سے، یا مجبوری کے درجہ میں دل ہی سے کر سکتے ہو وہ کرو، اور اس کو بدلنے کی ٹھان لو، مگر یہ کام پتہ مارنے کا اور مشکل تھا، اور وقت اور محنت چاہتا تھا، اسلئے آپ لوگوں نے حدیث کا مطلب یہ کر ڈالا کہ بس اس کو ٹوک دو اور نکیر کے دو لفظ زبان سے نکال کے اپنے اوپر سے بوجھ اتار دو۔ بھائی اس سے تبدیلی تو نہیں ہوگی، ہاں! اُس بے چارہ کو ذلیل اور شرمندہ کر کے شاید تمھارا جی خوش ہو جائے۔

مولانا کو اس کا بڑا یقین تھا کہ امت میں اصلاح کا کام پردہ پوشی اور چشم پوشی ہی کو اصول بنا کر ہو سکتا ہے، اور مولانا اسی کو دینی حکمت اور دین کی تعلیم سمجھتے تھے۔

دوسرے مسلمانوں کو ذلت اور شرمندگی سے بچانے کے مولانا کس حد تک قائل تھے اور اپنی نجی زندگی میں بھی اُن کا طرزِ عمل اس بارہ میں کیا تھا، اس کا کچھ اندازہ ذیل کے ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔

وفات سے ایک سال پہلے کا واقعہ ہے مولانا اپنی ایک جماعت کے ساتھ یُوپی کے ایک شہر میں فروکش تھے، یہ عاجز بھی اس سفر میں ہمرکاب تھا، اور جہاں تک یاد پڑتا ہے کسی تبلیغی جماعت کے ساتھ یہ اس عاجز کا پہلا سفر تھا، وہاں کے ایک بڑے عالمِ دین اور محترم بزرگ نے (جن سے اس عاجز کو پہلے سے نیاز حاصل تھا) مولانا کی دعوت کرنا چاہی، مولانا نے اپنے خاص اصولوں کے تحت دعوت قبول فرمالی (راقم سطور اس پوری گفتگو میں شریک تھا) اُن بزرگ کے جو نمائندے دعوت کے لئے تشریف لائے تھے، آخر میں جب اُن سے وقت دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا، کل ۱۱، اور ۱۲ کے درمیان، چنانچہ اگلے دن ۱۱ بجے کے بعد حضرت مولانا اپنے چند رفیقوں کے ساتھ (جن میں ایک اِن سطور کا راقم بھی تھا) اُن بزرگ کے ہاں پہنچ گئے۔ اُن محترم بزرگ نے بڑی مخلصانہ ناگواری اور دلی افسوس کے اظہار کے ساتھ فرمایا کہ آپ حضرات نے بڑی دیر کر دی، میں نے تو آپ کے ساتھ شہر کے بہت سے ایسے حضرات کو بھی مدعو کیا تھا جنھیں ۱۱ بجے تک اپنے دفاتر اور اپنے کاموں پر جانا تھا، اسی لئے میں نے ۹ بجے کا وقت رکھا تھا، میں نے سوچا تھا کہ ۹ بجے تک سب حضرات آجائیں گے تو کچھ دیر سب مدعو حضرات سے آپ اپنی بات بھی

(باقی ص ۱۹ پر)

معارف الاحادیث

قیامت:-

(۵۹) عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعثت انا والساعۃ کھاتین (بخاری ومسلم)

(ترجمہ) حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا، کہ:- "میں، اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ہیں۔"

(تشریح) یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کلمۂ شہادت والی انگلی اور اُس کے برابر والی بیچ کی انگلی ملا کر فرمایا، کہ میری بعثت میں اور قیامت میں اتنا قرب اور اتصال ہے جتنا کہ ان دو انگلیوں میں۔ اس سے غالباً آپ کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے جتنے دور مقرر کئے تھے وہ سب ختم ہو گئے، اب یہ دور اس کا آخری دور ہے جو میری بعثت سے شروع ہوا ہے اور قیامت پر ختم ہو گا، میرے اور قیامت کے درمیان کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، نہ کوئی نئی اُمت پیدا ہو گی، اسلئے اس کو بہت دُور سمجھ کر، اس کی طرف سے بے فکر اور بے پروا نہ ہونا چاہئے۔

(۶۰) عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مثل ھٰذہ الدنیا مثل ثوب شق من اولہ الی اٰخرہ فبقی متعلقاً بخیط فی اٰخرہ فیوشک ذالک الخیط ان ینقطع۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) حضرت انسؓ سے مروی ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا، کہ:- "اس دنیا کی مثال اُس کپڑے کی سی ہے، جو اول سے آخر تک پھاڑ دیا گیا، اور بس سرے پر ایک دھاگے سے وہ جڑا رہ گیا، اور یہ آخری دھاگا بھی بس عنقریب ٹوٹنا ہی چاہتا ہے۔"

(تشریح) پہلی حدیث کی طرح اس حدیث میں بھی قیامت کا قریب ہونا بیان فرمایا گیا ہے، اور مقصد یہی ہے کہ قیامت کو بہت دور سمجھ کے اس کی طرف سے غفلت نہ کی جائے، بلکہ اس کو بہت قریب اور ناگہانی پیش آنے والا ایک عظیم حادثہ

یقین کرتے ہوئے ہر وقت اس کی فکر اور اس کے لئے تیاری کی جائے۔

(۶۱) عن جابر قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول قبل ان یموت بشھر تسألونی عن الساعۃ وانما علمھا عند اللہ واقسم باللہ ما علی الارض من نفس منفوسۃ یاتی علیھا مائۃ سنۃ وھی حیۃ یومئذٍ۔ (مسلم)

(ترجمہ) حضرت جابرؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا، آپ اپنی وفات شریف سے ایک مہینہ پہلے فرماتے تھے، کہ: "تم لوگ مجھ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہو، اور اس کا (یعنی اس کے معین وقت کا) علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے، اور میں اللہ کی قسم کھا کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ روئے زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں ہے کہ اُس پر سو سال گذریں اور وہ اُس وقت تک زندہ باقی رہے"

(تشریح) قرآن پاک سے بھی معلوم ہوتا ہے اور حدیثوں سے بھی کہ بہت سے لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے قیامت کے متعلق دریافت کرتے تھے کہ وہ کب آئے گی؟ آپ ہمیشہ اُس کے جواب میں وہی فرماتے تھے جو اس حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا، یعنی یہ کہ اس کے مقررہ وقت کا علم اللہ ہی کو ہے، یعنی وہی جانتا ہے کہ کس سن کے کس مہینہ کی کس تاریخ کو آئے گی، اس کا علم اس نے کسی اور کو نہیں دیا ہے۔

اس حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس جواب کے علاوہ اور اصل سوال سے زائد ایک بات یہ بھی فرمائی ہے کہ اس وقت جو لوگ روئے زمین پر زندہ ہیں وہ سب سو سال کے اندر اندر ختم ہو جائیں گے ——— مطلب یہ ہے کہ قیامتِ کبریٰ جس میں یہ سارا عالم ختم ہو جائے گا، اُس کا معین وقت تو مجھے معلوم نہیں، بس اللہ ہی کو اس کا علم ہے، ہاں اللہ نے مجھے اس کی اطلاع دی ہے کہ اس نسل اور اس قرن کا خاتمہ سو سال تک ہو جائے گا، اور جو لوگ اس وقت زندہ ہیں وہ سو سال پورے ہونے تک ختم ہو جائیں گے، اسلئے یوں سمجھو کہ تمہاری قیامت تو اس صدی کے اندر ہی اندر آجائے گی۔

(۶۲) عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تقوم الساعۃ حتی لا یقال فی الارض اللہ اللہ ——— وفی روایۃ لا تقوم الساعۃ علی احد یقول اللہ اللہ۔ (مسلم)

(ترجمہ) حضرت انسؓ سے مروی ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا، کہ: "قیامت نہیں آئیگی جبتک کہ (ایسا بُرا وقت نہ آجائے کہ) بالکل نہ کہا جائے دنیا میں اللہ اللہ" ——— اور اسی حدیث کو بعض راویوں نے اس طرح نقل کیا ہے، کہ قیامت نہیں قائم ہوگی کسی ایسے شخص پر جو کہتا ہو اللہ اللہ۔[1]

---

[1] بعض علماء کرام نے اس حدیث سے ذکر اسم ذات کی صحت اور اُس کے ماثور ہونے پر استدلال کیا ہے، اور بلاشبہ یہ استدلال بہت صاف اور صحیح ہے۔ اللہ کی رحمت ہو حافظ ابن تیمیہ پر، اس مسئلہ پر غور کرتے وقت اُن کی نظر غالباً اس حدیث کی طرف گئی نہیں۔ ۱۲

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ قیامت اُس وقت آئے گی جبکہ دنیا اللہ کی یاد سے اور اللہ کی یاد کرنے والوں سے بالکل ہی خالی ہوجائے گی، اور اللہ کی عبادت اور فرمانبرداری اور اللہ کے ساتھ بندگی کے صحیح تعلق کا دنیا سے بالکل خاتمہ ہوجائے گا۔ جب ایسا وقت آئے گا اُس وقت یہ پورا عالم فنا کردیا جائے گا، گویا اللہ کا ذکر اور اللہ کے ساتھ بندگی کا صحیح تعلق اس عالم کی رُوح اور اس کے باقی رہنے کے لئے وجہ جواز ہے، جس دن ہماری یہ دنیا اُس سے بالکل خالی ہوجائے گی اُسی دن اپنے پیدا کرنے والے اور چلانے والے کے حکم سے توڑ پھوڑ کے برابر کردی جائے گی۔

(۶۳) عن عبد اللہ بن مسعودؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تقوم الساعۃ الا علی شرار الخلق۔ (مسلم)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا، کہ: "قیامت نہیں قائم ہوگی، مگر بدترین آدمیوں پر"

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اللہ سے تعلق رکھنے والے اچھے لوگ جب سب ختم ہوجائیں گے، اور یہ دنیا جب صرف بدکرداروں اور خدا فراموشوں ہی کی دنیا رہ جائے گی، تب اللہ کے حکم سے قیامت آجائے گی۔

(۶۴) عن عبد اللہ بن عمروؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخرج الدجال فیمکث اربعین لا ادری اربعین یوماً او شہراً او عاماً فیبعث اللہ عیسی بن مریم کانہ عروۃ بن مسعود فیطلبہ ثم یمکث فی الناس سبع سنین لیس بین اثنین عداوۃ ثم یرسل اللہ ریحاً باردۃً من الشام فلا یبقی علی وجہ الارض احد فی قلبہ مثقال ذرۃ من خیر او ایمان الا قبضتہ حتی لو ان احدکم دخل فی کبد جبل لدخلتہ علیہ حتی تقبضہ قال فیبقی شرار الناس فی خفۃ الطیر واحلام السباع لا یعرفون معروفاً ولا ینکرون منکراً فیتمثل لہم الشیطان فیقول الا تستجیبون فیقولون فما تامرنا فیامرہم بعبادۃ الاوثان وہم فی ذالک دارٌ رزقہم حسنٌ عیشہم ثم ینفخ فی الصور فلا یسمعہ احد الا اصغی لیتاً ورفع لیتاً قال واول من یسمعہ رجل یلوط حوض ابلہ فیصعق ویصعق الناس ثم یرسل اللہ مطراً کانہ الطل فینبت منہ اجساد الناس ثم ینفخ فیہ اخری فاذا ہم قیام ینظرون ثم یقال یا ایہا الناس ہلمّ الی ربکم قفوہم انہم مسئولون فیقال اخرجو بعث النار فیقال من کم کم؟ فیقال من کل الف تسعمائۃ وتسعۃ وتسعین، قال فذالک یوم یجعل الولدان شیباً۔ وذالک یوم یکشف عن ساق۔ (مسلم)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:- (قیامت سے پہلے) دجال کا خروج ہوگا، اور وہ ٹھہرے گا چالیس تک ــــــ اس حدیث کو روایت کرنے والے صحابی عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ حضورؐ کا مطلب چالیس سے چالیس دن تھے یا چالیس مہینے یا چالیس سال ــــــ آگے حدیث بیان کرتے ہیں کہ ــــــ پھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم کو (اس دنیا میں) بھیجیں گے، گویا کہ وہ عروہ بن مسعود ہیں (یعنی اُن کی شکل وصورت عروہ بن مسعود ثقفی سے بہت ملتی جلتی ہوگی) وہ دجال کو تلاش کریں گے (اور اُس کا تعاقب کریں گے، اور اُس کو پاکر) اُس کا خاتمہ کردیں گے پھر (دجال کا خاتمہ کردینے کے بعد) سات سال تک وہ اس دنیا کے لوگوں میں اور اُن کے ساتھ رہیں گے، اور (اُن کی برکت سے لوگوں میں ایسا اتحاد واتفاق ہوجائے گا کہ) دو آدمی بھی ایسے نہیں رہیں گے جن میں باہم عداوت اور دشمنی ہو، پھر اللہ تعالیٰ شام کی طرف سے ایک (خاص قسم کی) ٹھنڈی ہوا چلائے گا، جس کا اثر یہ ہوگا کہ روئے زمین پر کوئی ایسا شخص باقی نہیں رہے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی نیکی ہو ــــــ یا فرمایا کہ ذرہ برابر ایمان ہو ــــــ (بہر حال اُس ہوا سے تمام اہل ایمان اور اہلِ خیر ختم ہوجائیں گے)[1] یہاں تک کہ اگر تم میں سے کوئی شخص کسی پہاڑ کے اندر چلا جائے گا، تو یہ ہوا وہیں پہونچ کے اس کا خاتمہ کرے گی ــــــ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا، کہ ــــــ اس کے بعد صرف خراب آدمی ہی دنیا میں رہ جائیں گے (جن کے دل ایمان اور نیکی سے بالکل خالی ہوں گے) ان میں پرندوں والی تیزی اور پھرتی اور درندوں والا ذہن جمع ہوگا (اس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ ان میں ظلم اور سفاکی تو درندوں کی سی ہوگی، اور اپنے ظالمانہ مقاصد اور اپنی ناپاک خواہشات کے پورا کرنے میں وہ ہلکے پھلکے برق رفتار پرندوں کی طرح تیز رو، اور پھرتیلے ہوں گے) نیکی اور بھلائی سے وہ مانوس نہ ہوں گے، اور برائی کو وہ برائی نہ سمجھیں گے (نہ اُس کی مذمت کریں گے) پس شیطان ایک شکل بناکر اُن کے سامنے آئے گا اور اُن سے کہے گا، کیا تم شرم وحیا نہیں کروگے، وہ کہیں گے تم ہم کو کیا حکم دیتے ہو؟ (یعنی تم جو کہو وہ ہم کریں) پس شیطان انھیں بتوں کی پرستش کا حکم دے گا (اور وہ اس کا اتباع کریں گے)۔ اور وہ اس حال میں ہوں گے کہ رزق کی افراط اور بارش ہوگی، اور دنیوی زندگی (بظاہر) بڑی اچھی (عیش ونشاط والی زندگی) ہوگی ــ پھر صور پھونکا جائے گا، پس جو کوئی اس کو سنے گا، اس کی جانب گردن ایک طرف کو جھک جائے گی اور ایک طرف کو اُٹھ جائے گی (یعنی سر جسم پر سیدھا قائم نہ رہے گا، بلکہ ادھر یا اُدھر کو لٹک جائے گا، جیسا کہ اُس شخص کا حال ہوجاتا ہے جس پر اچانک کوئی ایسا دورہ پڑے جس سے اُس کے رگ پٹھے بے کار اور بے جان ہوجائیں) اور سب سے پہلے جو شخص صور کی آواز کو سنے گا (اور جس پر سب سے پہلے اس کا اثر پڑے گا) وہ ایک آدمی ہوگا جو اپنے اونٹ کے حوض کو مٹی سے درست کر رہا ہوگا، پس وہ بیہوش اور بے جان ہوکر گر جائے گا (یعنی مر جائے گا) اور دوسرے سب لوگ بھی اسی طرح

---

[1] یہ ہوا اہلِ ایمان کے لئے رحمت کی ہوا ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلئے بھیجی جائیگی کہ سب اچھے بندوں کو قیامت سے پہلے اُٹھا لیا جائے تاکہ وہ قیامت کے شدائد سے محفوظ رہیں۔ ۱۲

بے جان ہوکر گر جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ (ایک ہلکی سی) بارش بھیجے گا، گویا کہ وہ شبنم ہے، اُس کے اثر سے انسانوں کے جسموں میں روئیدگی آجائے گی ——— پھر دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو ایک دم سب کے سب کھڑے ہوں گے، دیکھتے ہوں گے پھر کہا جائے گا کہ اے لوگو! اپنے مالک اور رب کی طرف چلو (اور فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) انھیں (حساب کے میدان میں) کھڑا کرو، ان سے پوچھا جائے گا (اور ان کے اعمال کا حساب کتاب ہوگا) پھر حکم ہوگا کہ ان میں سے دوزخ کی فوج نکالو، عرض کیا جائیگا کہ کتنے میں سے کتنے؟ حکم ہوگا کہ ہزار میں سے نو سو ننانوے ——— رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ یہ ہوگا وہ دن جو بچوں کو بوڑھا کردے گا، اور یہی ہے دن سخت مصیبت اور مشقت کا۔

(تشریح) اس حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خروج دجال سے لیکر حشر تک کے، بلکہ میدانِ حساب میں جمع ہونے تک کے بعض واقعات کا تذکرہ فرمایا ہے، اس طرح کی اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں جن میں قیامت سے پہلے ہونے والے بعض اہم واقعات کا اور قیامت اور اس کے بعد کی منزلوں کا بیان اس سے بھی زیادہ اجمال کے ساتھ یا اس سے کچھ زیادہ تفصیل سے کیا گیا ہے، ان سب حدیثوں کے متعلق یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ سیکڑوں ہزاروں سال کی مدت میں ہونے والے واقعات کا بہت ہی مجمل بیان ان میں کیا گیا ہے۔ جو لوگ اس نکتہ کو ملحوظ رکھیں گے انشاء اللہ وہ ان حدیثوں کے بارہ میں بہت سے شبہات اور وساوس سے محفوظ ہو جائیں گے۔

حدیث کے آخر میں ذکر کیا گیا ہے کہ فرشتوں کو بتلایا جائے گا کہ ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے جہنم والے ہیں دنیا میں مومنین اور غیر مومنین کا جو تناسب ہے اور جو اکثر زمانوں میں رہا ہے اُس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اہلِ جہنم کی یہ تعداد $\frac{999}{1000}$ مستبعد نہیں معلوم ہوتی۔ تاہم بعض شارحین نے لکھا ہے کہ ان ۹۹۹ فی ہزار میں سے بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوگی، جو اگرچہ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے دوزخ کے قابل ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مغفرت سے یا شافعین کی سفارش سے آخر میں وہ نجات پا جائینگے۔ اللھم ان مغفرتك اوسع من ذنوبنا ورحمتك ارجى عندنا من اعمالنا۔

(۶۵) عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کیف انعم وصاحب الصور قد التقمہ واصغی سمعہ وحنی جبھتہ ینتظر متی یومر بالنفخ فقالوا یارسول اللہ فما تامرنا؟ قال قولوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ (ترمذی)

(ترجمہ) حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا، "میں کیونکر خوش اور بے غم ہو کر رہ سکتا ہوں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ صور والا فرشتہ صور کو اپنے منھ میں لئے ہوئے ہے، اور اپنا کان اُس نے لگا رکھا ہے اور اس کی پیشانی خمیدہ اور جھکی ہوئی ہے، وہ انتظار کر رہا ہے کہ کب اُس کو صور کے پھونکدینے کا حکم ہو، اور وہ پھونک دے۔ (یعنی جب مجھے اس واقعہ کا علم ہے تو میں کیسے اس دنیا میں اطمینان اور خوشی سے رہ سکتا ہوں)" صحابہؓ نے عرض کیا:- یارسول اللہ! تو ہمیں آپ کا کیا حکم ہے (اُن کا مطلب یہ تھا کہ جب معاملہ اتنا خطرناک ہے تو ہماری رہنمائی فرمایئے کہ قیامت کی

پھولنا گیوں اور سختیوں سے بچنے کے لئے ہم کیا کریں؟) ۔ آپ نے ارشاد فرمایا، کہتے رہا کرو حسبنا اللہ ونعم الوکیل ۔"

(۶۶) عن ابی رزین العقیلی قال قلت یا رسول اللہ کیف یعید اللہ الخلق وما آیۃ ذالک فی خلقہ قال اما مررت بوادی قومک جدبًا ثم مررت بہ یھتز خضرًا قلت نعم قال فتلک آیۃ اللہ فی خلقہ کذالک یحیی اللہ الموتی ۔ (رزین)

(ترجمہ) ابو رزین عقیلی سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ میں نے (ایک دفعہ) عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ مخلوق کو دوبارہ کیسے پیدا کرے گا، اور (اس عالم میں) اس کی مخلوق میں اس کی کیا نشانی ہے (اور کیا دلیل اور مثال ہے) آپ نے فرمایا:۔ کیا تمھارے لئے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تم اپنی قوم کی وادی پر ایسی حالت میں گذرے ہو جبکہ وہ (پانی نہ برسنے کی وجہ سے) سبزہ سے خالی اور خشک ہو، اور پھر کبھی ایسی حالت میں گذرے ہو کہ (پانی برس جانے کی وجہ سے) وہ ہری لہلہا رہی ہو۔۔۔ (ابو رزین کہتے ہیں) میں نے عرض کیا، ہاں (ایسا ہوا ہے، اور میں نے یہ دونوں منظر دیکھے ہیں) ۔ آپ نے فرمایا: بس (حیات بعد الموت کو سمجھنے کے لئے) یہی اللہ کی نشانی ہے اس کی مخلوق میں، ایسے ہی زندہ کرے گا اللہ مردوں کو۔

(۶۷) عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) من سرہ ان ینظر الی یوم القیٰمۃ کانہ رای عین فلیقرء اذا الشمس کورت واذا السماء انفطرت واذا السماء انشقت ۔ (احمد وترمذی)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:۔" جس شخص کی یہ خوشی ہو یعنی جو یہ چاہے کہ قیامت کا منظر وہ اس طرح دیکھے کہ گویا سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے تو وہ قرآن مجید کی سورۃ اذا الشمس کورت، اذا السماء انفطرت، اور اذا السماء انشقت پڑھے۔"

(۶۸) عن ابی ھریرۃ قال قرء رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ھٰذہ الآیۃ یومئذٍ تحدث اخبارھا قال اتدرون ما اخبارھا قالوا اللہ ورسولہ اعلم قال فان اخبارھا ان تشھد علی کل عبد وامۃ بما عمل علی ظھرھا ان تقول عمل علیّ کذا وکذا یوم کذا وکذا قال فھٰذہ اخبارھا ۔ (احمد وترمذی)

(ترجمہ) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سورۂ زلزال کی یہ آیت تلاوت فرمائی:۔ "یومئذٍ تحدث اخبارھا" (جس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن زمین اپنی سب خبریں بیان کرے گی) پھر حاضرین سے فرمایا:۔ کیا تم جانتے ہو کہ زمین کی خبریں کیا ہیں؟ ۔ انھوں نے عرض کیا، اللہ اور اس کے رسول ہی کو زیادہ علم ہے ۔ آپ نے فرمایا اس کی خبریں یہ ہیں کہ وہ ہر بندہ اور ہر بندی کے متعلق شہادت دے گی کہ اس نے فلاں دن میرے اوپر فلاں کام کیا تھا اور فلاں دن فلاں عمل کیا تھا، پس یہ ہیں زمین کی خبریں (جو قیامت کے دن وہ بیان کرے گی) ۔

(تشریح) گویا انسان جو عمل زمین کے جس حصے پر کرتا ہے، زمین کا وہ حصہ اُس کو محفوظ رکھتا ہے، اور قیامت تک محفوظ رکھے گا، اور اللہ کے سامنے اُس کی شہادت ادا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اُس دن اور اُس وقت کی رسوائیوں سے حفاظت فرمائے۔

اس قسم کی چیزوں پر یقین لانا ایمان والوں کے لئے تو پہلے بھی مشکل نہ تھا، لیکن اب توریکاڈ وغیرہ کی ایجادوں نے ان باتوں کا سمجھنا اور ان پر یقین کرنا سب کے لئے آسان کر دیا ہے۔ صدق اللہ عزوجل سنریھم ایاتنا فی الآفاق وفی انفسھم۔

(۶۹) عن المقداد قال سمعت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یقول تدنی الشمس یوم القیٰمۃ من الخلق حتی تکون منھم کمقدار میل فیکون الناس علی قدر اعمالھم فی العرق فمنھم من یکون الی کعبیہ ومنھم من یکون الی رکبتیہ ومنھم من یکون الی حقویہ ومنھم من یلجمھم العرق الجاماً واشار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بیدہ الی فیہ۔ (مسلم)

(ترجمہ) حضرت مقداد سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا، آپ ارشاد فرماتے تھے:۔ قیامت کے دن سورج مخلوق سے بہت قریب ہو جائے گا، یہاں تک کہ اُن سے صرف ایک میل کے بقدر رہ جائے گا اور (اس کی گرمی سے) لوگ بقدر اپنے اعمال کے پسینہ پسینہ ہو جائیں گے (یعنی جس کے اعمال جتنے بُرے ہوں گے اُسی قدر اُس کو پسینہ زیادہ چھوٹے گا) پس بعض وہ ہوں گے جن کا پسینہ ان کے ٹخنوں تک آئے گا، اور بعض کا پسینہ ان کے گھٹنوں تک ہوگا اور بعض کا ان کے کولھوں کے اوپر تک (یعنی کمر تک) اور بعض وہ ہوں گے جن کا پسینہ ان کے منھ میں جا رہا ہوگا، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے دہن مُبارک کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے دکھایا (کہ اُن کا پسینہ یہاں تک پہونچ رہا ہوگا، اور اُن کے اِس منھ میں جا رہا ہوگا)۔

(۷۰) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ما من احد یموت الا ندم قالوا وما ندامتہ یارسول اللہ قال ان کان محسناً ندم ان لا یکون ازداد وان کان مسیئاً ندم ان لا یکون نزع۔ (ترمذی)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:۔ جو شخص بھی مرے گا اس کو (مرنے کے بعد اپنی زندگی پر) ندامت اور پشیمانی ضرور ہوگی، عرض کیا گیا کہ حضرت! اُس کو ندامت کیوں ہوگی، اور اس کا کیا سبب ہوگا۔ آپ نے فرمایا، اگر وہ مرنے والا نیکوکار ہوگا تو اسے تو اس کی ندامت اور حسرت ہوگی کہ اس نے نیکوکاری میں اور زیادہ ترقی کیوں نہیں کی (اور جو حسنات وہ کما کے لایا ہے اس سے زیادہ کیوں نہیں کما کے لایا) اور اگر وہ بدکار ہوگا تو اسے اس کی ندامت اور حسرت ہوگی کہ وہ بدکاری سے باز کیوں نہیں رہا۔

(۱۷) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یحشر الناس یوم القیٰمۃ ثلٰثۃ اصناف صنفًا مشاۃ وصنفًا رکبانًا وصنفًا علی وجوھھم، قیل یا رسول اللہ کیف یمشون علی وجوھھم؟ قال ان الذی امشاھم علی اقدامھم قادر علی ان یمشیھم علی وجوھھم اما انھم یتقون بوجوھھم کل حدب وشوک۔ (ترمذی)

(ترجمہ) حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا، کہ:۔ قیامت کے دن سب آدمی تین قسموں اور تین گروہوں میں اٹھائے جائیں گے، ایک قسم پیدل چلنے والے، ایک قسم سوار، اور ایک قسم منھ کے بل چلنے والے ـــــ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! یہ (تیسرے گروہ والے) منھ کے بل کس طرح چل سکیں گے؟ آپ نے فرمایا جس اللہ نے انھیں پاؤں کے بل چلایا ہے وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ اُن کو منھ کے بل چلائے۔ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ لوگ اپنے منھ کے ذریعہ ہی زمین کے ہر ٹیلے ٹھیرے اور ہر کانٹے سے بچیں گے۔

(تشریح) حدیث میں جن تین گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے شارحین حدیث نے ان کی تفصیل اس طرح کی ہے کہ پیدل چلنے والا گروہ عام اہلِ ایمان کا ہو گا، اور دوسرا گروہ جو سواریوں پر ہوگا وہ خاص مقربین اور عباد صالحین کا گروہ ہو گا، جن کا وہاں شروع ہی سے اعزاز و اکرام ہوگا، اور سر کے بل اور منھ کے بل چلنے والے وہ بدنصیب ہوں گے جنھوں نے اس دنیوی زندگی میں انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور ہدایت کے مطابق سیدھا چلنا قبول نہیں کیا، اور مرتے دم تک وہ اُلٹے ہی چلتے رہے، قیامت کے دن اس کی پہلی سزا انھیں یہ ملے گی کہ سیدھے پاؤں پر چلنے کے بجائے وہاں وہ اُلٹے منھ کے اور سر کے بل چلائے جائیں گے، یہاں تک کہ جس طرح اس دنیا میں چلنے والے راستے کی اونچ نیچ سے اور جھاڑیوں اور کانٹوں سے اپنے پاؤں کے ذریعہ بچ کر نکلتے ہیں اسی طرح قیامت میں یہ سر کے بل چلنے والے وہاں کے راستے کی اونچ نیچ سے اور وہاں کے کانٹوں سے اپنے سروں اور چہروں ہی کے ذریعہ بچ کر نکلیں گے، یعنی یہاں جو کام پاؤں سے کئے جاتے ہیں وہاں وہ سب کام خدا کے ان مجرموں کو سر سے اور منھ سے کرنے پڑیں گے۔ اللھم لا تجعلنا منھم۔

(باقی آئندہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دجّالی فتنہ اور سورۂ کہف

(مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

(۱۹)

مذکورۂ بالا علامات اور نشانیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے، آئیے اور قرآن ہی کے ایک اور اشارے پر غور کیجئے۔ مطلب یہ ہے کہ نفخ صور (یعنی صور پھونکے جانے) سے پہلے اور کھول دیے جانے کے بعد درمیانی وقفہ میں یاجوج و ماجوج والوں کے متعلق ایک اور اشارہ سورۃ الانبیاء کی اس مشہور آیت میں ملتا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے

"اور حرام ہے اس آبادی کے لیے جسے ہم نے ہلاک کر دیا یہ کہ نہ واپس لوٹیں وہ تا اینکہ جب کھول دیے جائیں یاجوج و ماجوج اور حدب سے تیز چلتے ہوئے وہ نکل پڑیں"

پڑھیے سورۂ الانبیاء کی آیت وحرام علی قریۃ اھلکناھا انھم لایرجعون، حتی اذا فتحت یاجوج وماجوج وھم من کل حدب ینسلون، آیت کا آخری حصہ یعنی یاجوج و ماجوج کے کھول دیے جانے کا ذکر جس میں کیا گیا ہے، یہ پہلے بھی گذر چکا، لیکن اسی آیت کا پہلا جز یعنی جو آبادیاں ہلاک کی گئی ہیں ان کے واپس نہ لوٹنے پر حرمت کا حکم اس وقت تک کے لیے جو لگایا گیا ہے، جب یاجوج و ماجوج کھول دیے جائیں گے، اس کا مطلب کیا ہے؟

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ یاجوج و ماجوج کے خروج یا فتح یعنی دنیا کے مستقبل کی تاریخ میں ان کے نکل پڑنے کا ذکر عام مذاہب و ادیان کی یادداشتوں میں تلفظ کے معمولی ردّ و بدل سے پایا جاتا ہے۔ گاگ و میگاگ یا گوگ و ماگوگ، غوغ و ماغوغ، کے سوا اسی کے قریب قریب ہندوستان کی بعض قدیم کتابوں میں یہی لفظ کوک و کوک کی شکل میں بھی بعضوں کو ملا ہے، لیکن مذاہب کی ان پیش گوئیوں کے متعلق یہ عام دشواری تقریباً مشترک ہے، کہ واقعہ جب تک سامنے نہ آجائے، پیشگوئی کے الفاظ سے واقعہ کے تمام صحیح خط و خال سامنے نہیں آتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ آئندہ پیش آنے والے واقعات کے بڑے ذخیرے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو امین بنایا تھا، عہد صحابہ میں جب اس نوعیت کی

کوئی بات دریافت طلب ہوتی، تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک ان ہی سے پوچھا کرتے تھے، بہر حال ان ہی حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بخاری اور مسلم وغیرہ صحاح کی کتابوں میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کے متعلق جن کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے سنا تھا، ایک بڑے پتے کی بات نقل کی گئی ہے، حاصل جس کا یہی ہے کہ واقعہ جب پیش آ لمہے، تب فرماتے کہ مجھے یاد آ جاتا ہو کہ یہ تو وہی بات ہے، جس کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کیا تھا، پیش گوئیوں کے اس خاص پہلو کو مثال سے سمجھاتے ہوئے وہی یہ بھی فرماتے تھے کہ حالت یہ ہوتی ہے کہ

کما یذکر الرجل وجہ الرجل اذا غاب عنہ ثم اذا رآہ عرفہ۔ (از مشکوٰۃ)

جیسے کسی ایسے آدمی کے چہرے کا جو غائب ہو، کوئی خیال کرے پھر جب اس کو دیکھے تو اس کو پہچان لے۔

جس کا بظاہر مطلب یہی ہے کہ کسی شخص کے حلیہ اور اس کے چہرے کے خصوصیات کا ذکر کسی نے سُنا ہو، اور وہی آدمی جب اس کے سامنے آ جائے تو پہچان لے، پیش آنے سے پہلے پیشگوئیوں کی کچھ یہی نوعیت ہوتی ہو۔ اسی لیے پیش گوئیوں کی تعبیر جن الفاظ میں کی جاتی ہو، ان سے اصل حقیقت کی تعیین اس وقت تک دشوار ہوتی ہو جب تک واقعیت کا قالب اختیار کر کے واقعہ خود سامنے نہ آ جائے[۵]۔

---

[۵] اور پیش گوئیاں تو خیر پیش گوئیاں ہی ہوتی ہیں، اپنا ذاتی تجربہ تو یہ ہو کہ الفاظ سے یوں بھی مشاہدہ سے پہلے کسی خبر کی اصل حقیقت کے متعلق صحیح رائے قائم کرنا آسان نہیں ہو، خاکسار بچپن سے صفا اور مروہ کا ذکر سنتا چلا آتا تھا۔ پھر خدا ہی جانتا ہو کہ کتنی کتابوں میں مجھے پڑھایا گیا کہ حج میں دوسرے افعال کے ساتھ صفا اور مروہ پہاڑیوں کی درمیانی وادی میں حاجیوں کو دوڑنا پڑتا ہے۔ خیال یہی تھا کہ دو پہاڑیوں کے بیچ میں کوئی میدان ہوگا۔ جس میں حجاج دوڑتے ہیں، لیکن جب خود حج کی سعادت حاصل ہوئی اور مطوف صاحب کعبہ کا طواف کرانے کے بعد صفا اور مروہ کی طرف مجھے لے چلے تو حرم کی مسجد سے نکلنے کے ساتھ ہی ہم حرم کے دروازے کے متصل بازار میں پہونچے جو اوپر سے مسقف تھا اور دو رویہ ہر طرح کی چیزوں کی دکانوں سے بازار پٹا ہوا تھا۔ پٹرومیکس لیمپ دوکانوں پر جگمگا رہے تھے۔ دوسری چیزوں کے ساتھ کھانے پینے کی دوکانوں کا بھی سلسلہ تھا جس میں بیٹھ کر لوگ کھا پی رہے تھے۔ حرم کے اسی بازار میں پہونچ کر مطوف صاحب چلنے لگے جیسے بازار میں کوئی ٹہل رہا ہو، مجھے غصہ آ گیا اور مطوف سے کہنے لگا کہ بھائی یہ بازار کے سیر کا وقت ہو، مجھے تم صفا مروہ کی طرف لے چلو! تب مطوف ہنسا، اور بولا کہ آپ ہیں کہاں؟۔ میں نے کہا کیا یہی صفا اور مروہ کے درمیان کی وادی ہو۔ بولے پھر اور یہ کیا ہو۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ برسوں کا پروردہ تصورتہ و بالا ہوگیا۔ شاد مرحوم کا شعر عموماً اسی موقع پر یاد آ جاتا ہو ؎

تری گلی میں جو پہونچے تو سب غلط پایا
دیا گیا تھا مکرر جہاں جہاں کا پتہ

آپ دیکھیے یاجوج و ماجوج کے کھل جانے کی گویا ایک علامت قرآن میں یہ بنائی گئی ہو کہ ہلاک شدہ آبادیوں کو واپس پلٹنے کا موقع اس وقت تک نہ ملے گا، جب تک کہ یاجوج و ماجوج کھول نہ دیے جائیں۔ حاصل جس کا یہی ہوا کہ یاجوج و ماجوج کے کھل جانے کے بعد یہ روک جو ہلاک شدہ آبادیوں پر قدرت کی طرف سے لگی ہوئی ہو، اُٹھ جائے گی، اس روک کے اُٹھ جانے کے بعد پھر کیا ہوگا؟ کیا ساری ہلاک شدہ آبادیوں کو واپس پلٹنے کا موقع ملے گا، یا بعضوں کو ملے گا اور بعضوں کو نہ ملے گا، اس سوال کے جواب کو ہم قرآنی الفاظ سے نہیں نکال سکتے، ان سے بس اسی قدر معلوم ہوتا ہو کہ واپس نہ لوٹنے کی حرمت اور روک ختم ہو جائے گی، یہ تو حاصل ہو مذکورۂ بالا آیت کا، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ

انھم لا یرجعون ہلاک شدہ آبادیاں نہ واپس پلٹیں گی

ان الفاظ کا مطلب کیا ہو؟ اور یہی نہیں "حرام" کا لفظ اس آیت میں جو استعمال کیا گیا ہو، خود اس سے کیا مراد ہو؟ اور یہ کہ "اھلکناھا" (ہلاک کر دیا ہم نے) کے الفاظ سے جس ہلاکت کی خبر دی گئی ہو اس ہلاکت سے کیا مقصود ہو۔ اور اسی کے ساتھ "یرجعون" سے پہلے حرف نفی لا کا جو پایا جاتا ہو عربی محاورے کی رو سے اس کی نوعیت اس مقام پر کیا ہو،

تفسیر کی کتابیں اٹھا کر دیکھیے ان میں سے ہر سوال پر مفسرین کے جھونپڑے پڑے ہوئے ہیں، اور اپنے اپنے رجحان کے مطابق لوگوں نے خیالات ظاہر کیے ہیں۔

علامۂ شوکانی نے مشہور مفسر النحاس کے حوالے سے اسی لیے نقل کیا ہو،

ذا الآیۃ مشکلۃ یعنی مذکورۂ بالا آیت مطلب کے لحاظ سے کافی دشوار ہو۔
(ج ۳ صفہ ۴۱۲)

دشواری کی بڑی وجہ یہ بھی ہو کہ ارباب تفسیر کو کوئی ایسی صحیح روایت نہیں مل سکی، جس کی روشنی میں کسی پہلو کو وہ متعین کر سکتے ہوں، اسی لیے قرائن و قیاسات سے مدد لے کر مختلف بزرگوں نے کسی خاص پہلو کو متعین کرنا چاہا ہو، اس سلسلہ میں ابوعبیدہ، ابوعلی فارسی، الزجاج لغت اور عربیت کے جلیل آئمہ کا نام لیا جاتا ہو۔ میرے لیے نہ یہ ممکن ہو اور نہ ضرورت ہو کہ سوال وجواب کے اس تمام سلسلے کا یہاں ذکر کر کے ہر ایک کی تنقید کرتے ہوئے اپنے ذاتی احساس کو پیش کروں، کیونکہ اس طولِ عمل کے بعد بھی میری رائے اور میرے خیال کی حیثیت بھی منجملہ دوسرے احتمالات کے ایک احتمال ہی کی رہے گی، میں خود قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ جس پہلو کی طرف میرا ذہن منتقل ہوا ہو اس کی نوعیت کیا ہو۔ بالکل ممکن ہو کہ اس مسئلہ میں بھی میرے احساس کا حشر وہی ہو جو صفا اور مروہ والے غریب احساس کا انجام اصل حقیقت کے سامنے آنے کے

بعد ہوا، جس کا تذکرہ میں نے نوٹ میں کیا ہے۔

کچھ بھی ہو، قرائن اور قیاسات ہی کی مدد سے میرا ذہن بھی ایک نتیجہ تک پہونچا ہے، اسی کو پیش کردیتا ہوں، اس باب میں خود قرآن مجید کے عام طریقۂ تعبیر ہی سے کم از کم اپنے نزدیک میں اپنے آپ کو متاثر پاتا ہوں، آپ قرآن کی تلاوت شروع کیجئے، دیکھیے گا کہ یہودیوں کی وہ نسل جو نزولِ قرآن کے زمانے میں پائی جاتی تھی، ان ہی کو خطاب کرکرکے ان کی طرف ان کی گذشتہ نسلوں کے اچھے اور برے کارناموں اور کرتوتوں کو منسوب کرتا چلا جاتا ہے، اور جن نعمتوں اور نوازشوں سے ہزارہا ہزار سال پہلے ان کے آباؤ اجداد سرفراز ہوئے تھے، ان کو بھی نزول قرآن کے وقت پائے جانے والے بنی اسرائیل کی طرف منسوب کرکے احسان جتلایا گیا ہے۔

قرآنی تعبیر کی یہ ایسی خصوصیت ہے، جس کے لیے مثالوں کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں، جس کا جی چاہے قرآن کھول لے، تیسرے چوتھے ورق سے خطاب کا یہ خاص طریقہ مسلسل اس کے سامنے گذرتا چلا جائے گا۔ طریقۂ خطاب و تعبیر کے اس خاص اسلوب کا حاصل یہی تو ہے کہ بجائے انفرادی شخصیتوں کے اجتماعی وحدت کو سامنے رکھ کر افعال و اعمال صفات و حالات کو منسوب کرنا قرآن کا عام پیرایہ بیان ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسری بات جو بنی اسرائیل ہی کی متعلقہ آیتوں سے سمجھ میں آتی ہے، مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں بنی اسرائیل ہی کو خطاب کرکے

ان عدتم عدنا　　　　اگر تم واپس ہو جاؤ، تو ہم بھی واپس ہوں،

جو فرمایا گیا ہے عود اور واپسی کے اس عام قانون کا ذکر کرتے ہوئے اسی قوم کے ساتھ یہ تاریخی حادثہ جو پیش آیا تھا کہ بعض زور آور (اولی باس شدید) قوموں نے ان کو برباد و ہلاک کردیا تھا۔ اور پھر یہودیوں کو دوبارہ سنبھالا لینے کا موقع عطا کیا گیا جس کے آثار و نتائج کو بتاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ

امددناکم باموال و بنین وجعلناکم اکثر نفیرا۔　　　　ہم نے مال و دولت اور اولاد ذریہ سے تمھاری مدد کی اور تم کو بنادیا ہم نے بڑی تعداد والی قوم۔

ظاہر ہے کہ زور آور قوموں سے تباہ و برباد ہونے والی اسرائیلی نسل کا وہ طبقہ اس طبقہ سے یقیناً مختلف تھا جن کو اپنی پرانی عظمت و شوکت، دولت و امارت، قوت و طاقت کی طرف واپس ہونے کا موقع ملا تھا۔ لیکن قرآن نے بربادی اور تباہی کو جن کی طرف منسوب کیا، ان ہی کی طرف عظمت رفتہ کی واپسی کو بھی اس نے منسوب کیا ہے۔

ان دو تمہیدی مقدمات کے بعد اگر یہ سمجھا جائے کہ یاجوج و ماجوج سے تعلق رکھنے والی مذکورۂ بالا

آیت میں جو یہ فرمایا گیا ہو کہ ہلاک شدہ آبادی کو واپس پلٹنے کا موقع اس وقت تک حاصل نہ ہوگا، جب تک یاجوج و ماجوج نہ کھول دیے جائیں، اس کا اگر یہ مطلب سمجھا جائے کہ یاجوج و ماجوج کے کھلنے سے پہلے برباد، تباہ ہونے والی آبادیوں کو پھر دوبارہ سر اٹھانے اور عروج و ترقی حاصل کرنے کا موقع یاجوج و ماجوج کے کھول دیے جانے کے بعد ہی مل سکتا ہو، تو میں نہیں سمجھتا کہ قرآنی طریقۂ تعبیر اور طرز خطاب سے جو مانوس ہیں، ان کے لیے یہ کوئی اچنبھے کی ایسی بات ہو، جسے خواہ مخواہ دور از کار شاعرانہ تاویل قرار دے کر ناقابل لحاظ ٹھہرا دیا جائے۔

بلکہ یوحنا کے یاجوج و ماجوج والے جس مکاشفے کا میں نے ذکر کیا تھا، اس میں بھی الصادق الامین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہزار سال تک شیطان کے قید ہو جانے کا تذکرہ کرتے ہوئے اور یہ بتاتے ہوئے کہ ہزار سال جب پورے ہو جائیں تو

اس کے بعد ضرور ہو کہ تھوڑے عرصہ کے لیے
وہ (شیطان) کھولا جائے"

آگے اسی سلسلہ میں اسی مکاشفہ میں چند سطریں پائی جاتی ہیں، جن میں اب تو "یسوع" اور "مسیح" کا نام ملتا ہو، لیکن قرینہ بتاتا ہو کہ اسی مکاشفہ کے "الصادق الامین" کے الفاظ پر جیسا کہ عام دستور ہو تحریف کی قینچی چل گئی ہو، ورنہ پہلے سے جب "الصادق الامین" کا ذکر چلا آ رہا تھا، تو اچانک "یسوع" اور "مسیح" کے تذکرہ کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں، کچھ بھی ہو، آگے جو کچھ بیان کیا گیا ہو، اس کا حاصل میرے نزدیک یہی ہو کہ "الصادق الامین" یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی۔

"وہ زندہ ہو کر ہزار برس تک "مسیح" کے ساتھ بادشاہی کرتے رہے"۔
(مکاشفہ یوحنا ۲۰)

یہاں مسیح کے لفظ کی جگہ "الصادق الامین" پڑھتے ہوئے یہی سمجھ میں آتا ہو کہ یہ اشارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہو: ہزار سال تک دنیا کی سیاسی باگ جن کے ہاتھوں میں رہی، اس کے بعد سے

"اور جب تک ہزار برس پورے نہ ہو لیے باقی مُردے زندہ نہ ہوئے" (مکاشفہ باب ۲۰)

---

۵ مسیح کا ماخذ سیاحت ہو، یہ توجیہ عامیانہ توجیہ ہو لیکن ارباب تحقیق کے نزدیک اس لفظ کا عبرانی تلفظ "ماشیح" دراصل ایک اصطلاحی لفظ ہو اور اس سے مراد خدا کا برگزیدہ بندہ ہو، اس کے سر پہ خدا کی خوشنودی کا تیل مشح کیا گیا، چپڑا گیا۔ الاستاذ الامام الکشمیری نے شرح بخاری میں بھی یہ قول نقل کیا ہو کہ ماشیح "سے بعض مواقع میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مراد ہیں۔ دیکھو فیض الباری صفحہ ۲۷ ج ۴۔

تقریباً اس فقرے کا آل بھی وہی ہے جو سورۂ الانبیاء کی مذکورۂ بالا یاجوج و ماجوج والی آیت کا ہے، خود اسی مکاشفہ کے حوالے سے نقل کر چکا ہوں کہ

"جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا
اور ان قوموں کو جو زمین کے چاروں طرف ہوں گی یعنی یاجوج و ماجوج کو
گمراہ کر کے لڑائی کے لیے جمع کرنے کو نکلے گا۔" (باب ۲۰، ۷-۸)

حاصل یہی تو نکلا کہ یاجوج و ماجوج کے کھولے جانے کے بعد ان مردوں کو زندہ ہونے کا موقع ملے گا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر ہزار برس والے زمانہ میں زندگی نہ حاصل کر سکے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے اسے ادا بھی کر سکا یا نہیں، لیکن مطلب میرا یہی ہے کہ یوحنا کے اس مکاشفہ میں قدرے رسمی تحریف کے ساتھ جو کچھ پایا جاتا ہے اسی کا اعادہ قرآن میں کیا گیا ہے، اور خلاصہ دونوں کا یہی ہے کہ یاجوج و ماجوج کے کھل جانے کے بعد دنیا کی ان قوموں کو سر اٹھانے کا موقع ملے گا جو اسلام لا کر زندہ قوموں میں شریک نہ ہو سکی تھیں۔

اور یہ بھی یاجوج و ماجوج نامی اقوام کے پہچاننے کی منجملہ دوسری نشانیوں کے ایک ایسی نشانی ہے جس کا مطالعہ ہم تاریخ کے اوراق کے سوا اپنی موجودہ دنیا کے اسٹیج پر بھی کر سکتے ہیں، اور ان قوموں کو ہم پہچان سکتے ہیں جو "اسلامی دولت" کے ایام میں تو مردہ رہیں لیکن مسلمانوں کا دور جب ختم ہوا تو زندگی کی نئی ہلچل ان ہی مردہ قوموں کی آبادیوں میں شروع ہوئی اور یکے بعد دیگرے زندہ ہو ہو کر دنیا کے سامنے نمایاں ہو رہی ہیں۔

اور اب پھر پڑھیے مذکورۂ بالا معروضات کی روشنی میں اس قرآنی آیت کو

وحرام علی قریۃ اھلکناھا	اور روک لگی ہوئی ہے اس آبادی پر جسے
انھم لا یرجعون حتی	ہم نے ہلاک کیا کہ وہ نہ واپس لوٹیں گے
اذا فتحت یاجوج وماجوج	تا اینکہ جب کھول دیے جائیں یاجوج و ماجوج
وھم من کل حدب	اور ہر ڈھلاؤ (حدب) سے وہ تیز رفتاری
ینسلون	کے ساتھ چل نکلیں۔

اور غور کیجیے کہ فقیر کا ذہن جس پہلو کی طرف منتقل ہوا ہے دوسرے قرائن و قیاسات اور قرآن کے خاص طریقۂ تعبیر و طرز ادا سے اس کی کس حد تک تائید ہوتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم و علمہ اتم و احکم۔

تاہم باوجود ان تمام صفاتی نشانیوں کے مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ قرآنی آیات کی روشنی میں ہم نام اور

رسمی تعین کے ساتھ ان قوموں کو متعین نہیں کرسکتے، جن کو قرآن نے یاجوج وماجوج کی بھیڑ میں داخل کیا ہو، مذکورہ بالا قرآنی آیتوں کو باہم پیوند کرکے دیکھنے کے بعد بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ ایک ٹوپی ضرور تیار ہوگئی ہو، اب یہ آپ کا اور ہمارا کام ہو کہ قوموں کے سروں پر رکھ رکھ کر دیکھیں کہ یہ ٹوپی ٹھیک کن کے سروں پر بیٹھ جاتی ہو۔ اس سلسلہ میں غیر قرآنی چیزوں سے کچھ مدد بھی اگر لی گئی ہو تو ان کی حیثیت مغزی اور گوٹ کی ہو، لیکن جوہری ٹکڑے صرف قرآن سے حاصل کیے گئے ہیں۔

بقیہ نگاہ اوّلیں

کرسکیں گے، وہ سب حضرات تو ۹ ہی بجے آگئے تھے، کچھ دیر انتظار کے بعد آخر اُن کو کھانا کھلا دیا گیا، اور اب وہ سب چلے گئے۔

میں حضرت مولانا مرحوم کے بالکل برابر میں بیٹھا تھا، جب میں نے دیکھا کہ مولانا اس کے جواب میں بالکل خاموش ہیں، اور ہم سب خوامخواہ قصوروار بن رہے ہیں، تو میں نے اصل حقیقت ظاہر کردینے کا ارادہ کیا، (یعنی یہ کہ کل آپ کے جو فلاں صاحب دعوت کی گفتگو کے لئے تشریف لائے تھے، انھوں نے ہم لوگوں کو صراحتہً ۱۱، ۱۲ کے درمیان کا وقت بتلایا تھا، اسلئے یہ غلطی دراصل اُن سے ہوئی) مولانا مرحوم نے میرے اس ارادہ کو تاڑلیا، اور میرے کان میں فرمایا: "ہرگز نہیں، اُن کے آدمی پر بات نہ آئے، اپنے ہی اوپر لو" —— سچی بات یہ ہے کہ میں دم بخود رہ گیا —— کھانے سے فراغت کے بعد جب واپسی ہونے لگی تو مولانا نے بڑی ندامت کے اظہار اور قصور کے اعتراف کے ساتھ ان بزرگ سے معذرت کی، اور اصل بات کی کسی کو ہوا نہ لگنے دی۔

اُس وقت تو میں نے اس چیز کو مولانا مرحوم کی بے نفسی اور اخلاقی بلندی اور عالی حوصلگی ہی سمجھا، لیکن عرصہ کے بعد جب یہ حدیث ایک دفعہ نظر سے گذری، کہ:-

"اللہ کا جو بندہ قدرت کے باوجود دوسرے مسلمان بھائی کو جواب دینے سے صرف اسلئے زبان روک لے کہ وہ بھائی قائل اور شرمندہ نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ قیامت میں اُس کے سر پر کرامت کا تاج رکھے گا"

تو معلوم ہوا کہ مولانا مرحوم کا یہ طرز عمل دراصل اس بنیاد پر اور اس اجر موعود کی طمع میں تھا۔

بہرحال مولانا مرحوم اپنی اصلاحی اور تبلیغی جدوجہد میں، اور اپنی نجی زندگی میں بھی، ان اصولوں کے اس درجہ میں پابند تھے۔ اپنے لوگوں کو اسی کی تعلیم دیتے تھے، اسی کی تاکید کرتے تھے، اور چاہتے تھے کہ اللہ کے سب بندے ان اصولوں کی قدر و قیمت سمجھیں، اور ان کو اپنی زندگی کے اصول بنائیں۔

اللہ باقی

محمد نیاز

نے انجم و خور، نے ماہ باقی — نے کوہ باقی، نے کاہ باقی
درویش باقی، نے شاہ باقی — باقی گدا، نے ذیجاہ باقی
اللہ باقی، اللہ باقی

سازِ طرب کا ہر تار فانی — رنج و الم کا بازار فانی
بے جان فانی، جاندار فانی — فانی رعایا، سرکار فانی
اللہ باقی، اللہ باقی

لمحات فانی، کیا رات کیا دن — ہر ذات فانی، انساں ہو یا جن
فانی ٹرومن، فانی سٹالن — فانی من و تو، اے دوست لیکن
اللہ باقی، اللہ باقی

ہر خطہ فانی، بستی ہو یا بن — شہر و بیاباں، صحرا و گلشن
اے دوست! فانی، فانی یقیناً! — بام بکھنگم، قصرِ کریملن
اللہ باقی، اللہ باقی

نیلا سا خیمہ جو یوں تنا ہے — پھر اس کے نیچے جو کچھ بنا ہے
گوشِ یقیں سے میں نے سنا ہے — سب کو فنا ہے، سب کو فنا ہے
اللہ باقی، اللہ باقی

نورِ حرا کی روشنی میں

دُنیا کے پیچیدہ مسائل کا حل

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کی ایک تقریر کا ترجمہ جو ربیع الاوّل ھ
میں سعودی ریڈیو اسٹیشن (جدہ) سے نشر کی گئی تھی۔

(از، عتیق الرحمٰن سنبھلی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں جبلِ نور پر چڑھا اور اس کے غار پر جو غارِ حرا کے نام سے مشہور ہے جا کھڑا ہوا یہاں پہونچ کر میں نے اپنے دل میں کہا — یہی جگہ ہے جہاں خداوند کریم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبری کا شرف عطا فرمایا اور پہلی مرتبہ وحی نازل فرمائی، پس (یہ کہنا حق ہے کہ) یہیں سے وہ آفتاب طلوع ہوا جس کی کرنوں نے دنیا پر نور برسایا اور اسے ایک نئی زندگی بخشی۔

یہ عالم ہر دن ایک نئی صبح کو خوش آمدید کہتا ہے لیکن اکثر و بیشتر نہ اس صبح میں کوئی نیا پن ہوتا ہے نہ کوئی ندرت اور نہ ہر صبح صبحِ سعادت۔ ان صبحوں کی آمد سے انسان تو جاگ جاتے ہیں مگر انسانیت سوتی ہی رہتی ہے، جسم بیدار ہو جاتے ہیں مگر دلوں کی نیند میں ذرا فرق نہیں آتا اور روحوں کی بستی یونہی خوابِ غفلت میں پڑی رہتی ہے — کیا شمار ہے ایسے تاریک دنوں کا اور ایسی جھوٹی صبحوں کا۔ البتہ اس غار سے ایک سچی صبح نمودار ہوئی تھی جس کے نور نے ہر چیز کو چمکایا اور اس کی آمد نے ہر شے کو جگایا اور اسی صبح سے تاریخ کا رُخ مڑا اور زمانہ کا رنگ بدلا۔

اس صبح سے پہلے انسانی زندگی کا فطری بہاؤ رکا ہوا تھا اس کے ہر دروازہ پر بھاری بھاری قفل چڑھے ہوئے تھے اور وہ گویا چند مقفل دروازوں اور کچھ بند تالوں کا مجموعہ بنی ہوئی تھی۔ عقل پر قفل چڑھے ہوئے تھے جن کے کھولنے سے حکماء اور فلاسفہ عاجز تھے، ضمیرِ انسانی مقفل تھا جس کو آزادی دلانے سے واعظین اور مصلحین عاجز تھے، قلوبِ انسانی مقفل تھے جن کے قفل توڑنے میں قدرت کی نشانیاں اور زمانہ کے عبرت انگیز حوادث ناکام ہو چکے تھے۔ صلاحیتیں مقفل تھیں جن کو بروئے کار لانے سے تعلیم و تربیت کا نظام اور ماحول اور سوسائٹی کے اثرات قاصر تھے۔ درسگاہوں کا وجود لا حاصل تھا جن کو کارآمد اور نتیجہ خیز بنانے میں اہلِ علم اور مدرسین بے بس تھے، عدالتیں اپنے فرائض کے حق میں مقفل تھیں جن سے انصاف حاصل کرنے کے لئے مظلوموں اور محکوموں کی فریادیں بے اثر تھیں، خاندانی مسائل الجھے ہوئے تھے جن کے سلجھانے سے مصلحین و مفکرین عاجز تھے،

قصر ہائے سلطنت مقفل تھے جن میں راہ پانے سے محنت کش کسان، پسے ہوئے مزدور اور مظلوم رعایا محروم تھی، دولتمندوں اور امیروں کے خزانے مقفل تھے جن کے قفل کھولنے سے ناداروں کی بھوک ان کی عورتوں کی برہنگی اور ان کے دودھ پیتے بچوں کی گریہ وزاری عاجز تھی۔ بڑے بڑے اصلاحی عزائم کے ساتھ لوگ میدان میں آئے، بڑے بڑے قانون ساز کمر بستہ ہوئے لیکن ان ہشیار قفلوں میں سے کوئی ایک قفل بھی کھولنے میں کامیاب نہ ہوسکے اسلئے کہ ان تالوں کی اصل کنجی ان کے ہاتھ میں نہ تھی وہ کنجی گم ہوچکی تھی اور تالا بغیر اپنی کنجی کے کبھی کھل نہیں سکتا، انھوں نے اپنی بنائی ہوئی کنجیوں سے کام لینا چاہا لیکن وہ ان تالوں کو نہ لگیں اور ایک تالا بھی نہ کھول سکیں اور بعض نے ان تالوں کو کھولنے کے بجائے توڑنے کی کوشش کی مگر الٹے اس کوشش میں ان کے اوزار ٹوٹ گئے اور ہاتھ بھی زخمی ہوگئے۔

ایسے وقت میں متمدن دنیا سے الگ تھلگ ایک چھوٹے سے خشک پہاڑ کے اوپر اس گمنام اور ظاہری اعتبار سے بے حیثیت مقام (غار حراء) میں دنیا کا وہ عقدہ لاینحل حل ہوا جو نہ بڑی بڑی حکومتوں کی راجدھانیوں میں حل ہوسکا نہ عظیم الشان درسگاہوں میں حل ہوسکا اور نہ علم وادب کے پرشکوہ ایوانوں میں حل ہوسکا۔ یہاں پر درگاہ عالم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی صورت میں عالم انسانیت پر ایک احسان عظیم کا دروازہ کھولا اور صدیوں کی گم شدہ کنجی پھر سے انسانیت کو مل گئی۔ یہ کنجی ہے ایمان ــــ اللہ پر، اس کے رسول پر اور یوم آخرت پر ــــ اس کنجی سے آپ نے صدیوں کے ان بند قفلوں کو ایک ایک کرکے کھول ڈالا جس کے نتیجے میں حیات انسانی کے ہر ہر شعبہ کے دروازے چوپٹ کھل گئے۔ آپ نے جب نبوت کی اس کنجی کو عقل کے قفل پر رکھا تو اس کی ساری گرہیں کھل گئیں۔ اس کی سلوٹیں اور اس کے پیچ وخم دور ہوگئے۔ اسے نشاط فکر حاصل ہوگیا اور وہ اس قابل ہوگئی کہ انفس وآفاق میں پھیلی ہوئی خدا کی نشانیوں سے نفع اندوز ہوسکے، اس کائنات میں غور کرکے اس کے خالق کو پاسکے کثرت کے پردوں کو چیر کر وحدت کا جلوہ دیکھ سکے اور شرک وبت پرستی اور اوہام وخرافات کی لغویت کو محسوس کرسکے۔ حالانکہ اس سے پیشتر یہ عقل ان باتوں میں دخل دینے کی مجاز نہ تھی اور صدیوں سے اپنے منصب سے معزول تھی۔ اسی کنجی سے آپ نے انسان کے ضمیر کا قفل کھولا، سویا ہوا ضمیر جاگ اٹھا اور اس کے مردہ شعور واحساس میں حرکت اور زندگی پیدا ہوئی ضمیر کی روک تھام سے آزاد ہوکر نفس انسانی جو صدیوں سے نفس امّارہ بنا ہوا تھا اب یہی نفس نفس لوّامہ میں تبدیل ہوا اور نفس لوّامہ دیکھتے ہی دیکھتے نفس مطمئنہ بن گیا جس کے بعد اس میں کسی باطل کے گھسنے کی گنجائش نہ رہی اور گناہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگیا۔ اس حد تک کہ گنہگار، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جاکر از خود اپنے گناہ کا اظہار واقرار کرکے اپنے لیے سخت ترین سزا کی درخواست کرتا ہے۔ ایک گنہگار عورت اپنے لیے سنگساری کی سزا کی درخواست کرتی ہے حضور عذر شرعی کی وجہ سے سزا کو کچھ دن کے لیے موخر فرماتے ہیں وہ اپنے دیہات کو واپس چلی جاتی ہے نہ اسکی نگرانی کے لیے سی، آئی، ڈی متعین ہوتی ہے نہ مجرمہ کو وقت پر دوبارہ حاضر کرنے کے لیے پولیس متعین ہوتی ہے لیکن وہ بروقت پھر مدینہ پہونچتی ہے اور خود کو اس سزا کے لیے بخوشی اور باصرار پیش کرتی ہے جو یقیناً قتل سے بھی زیادہ سخت ہے (یعنی سنگساری)۔ فتح ایران کے وقت ایک غریب فوجی کے ہاتھ کسریٰ کا تاج زریں آتا ہے وہ اس کو کپڑوں میں

چھپالیتا ہے اور خفیہ طور سے اپنے امیر کی خدمت میں لے جا کر پیش کر دیتا ہو تاکہ ادائے امانت تو ہو لیکن امانتداری کی نمائش نہ ہو۔

انسانوں کے وہ دل جو اس طرح مقفل پڑے ہوئے تھے کہ نہ ان میں عبرت پذیری تھی، نہ خوف خدا تھا اور نہ رقت اور نرمی تھی یہ کنجی جب ان دلوں پر لگائی گئی تو کیسر کایا پلٹی ہوئی نظر آئی، اب وہ خدا کے خوف سے ہر دم لرزاں و ترساں تھے، حوادث و واقعات سے عبرت حاصل کرتے تھے، انفس و آفاق میں چھپی ہوئی نشانیوں کا وجود اب ان کے لیے نفع بخش تھا، مظلوموں کا حال زار دیکھ کر تڑپ جاتے تھے اور غریبوں اور بیکسوں کے ساتھ نفرت و حقارت کا برتاؤ کرنے کے بجائے محبت و شفقت کا برتاؤ کرنے لگے۔ اسی طرح نبوت کی اس کنجی نے جب انسانوں کی ان فطری صلاحیتوں اور قوتوں کو کھولا جو عرصہ سے ٹھٹھری پڑی تھیں اور نفع مند ہونے کے بجائے نقصان دہ ثابت ہو رہی تھیں تو وہ شعلوں کی طرح بھڑک اٹھیں اور سیلاب کی طرح موجیں مارتی ہوئی ابل پڑیں اور صحیح رخ پر لگ گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع نہ ملنے کی وجہ سے جو لوگ بکریوں کی گلہ بانی میں ضایع ہو رہے تھے وہ اب بہترین طور سے قوموں کی نگہبانی اور عالم کی فرمانروائی کی نازک ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے لگے اور جو شخص کل تک صرف کسی ایک قبیلے یا ایک شہر کا نامور شہسوار شمار کیا جاتا تھا وہ اب بڑی بڑی سلطنتوں اور ایسے ایسے ملکوں کا فاتح ثابت ہوا جو قوت و شوکت میں یکتا تھے۔ اسی کنجی سے آپ نے درسگاہوں کے قفل کھولے اور ان میں از سر نو چہل پہل اور رونق پیدا کی حالاں کہ علم کی کسادبازاری اور معلمین کی کس مپرسی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ نہ معلمین کو دلچسپی رہی تھی اور نہ متعلمین کو ــــــ آپ نے علم کی قدر و قیمت یاد دلائی اہل علم کا مرتبہ بتلایا اور علم و دین کا باہمی تعلق سمجھایا چنانچہ لوگ درسگاہوں کی ترقی کے لیے دامے درمے قدمے کوشاں ہو گیے مسلمان کا ہر ہر گھر اور ہر ہر مسجد بجائے خود ایک مدرسہ بن گئی، ہر مسلمان اپنے حق میں متعلم اور دوسرے کے حق میں معلم بن گیا کیونکہ انکا دین ہی خود طلب علم کے لیے سب سے بڑا محرک تھا۔ آپ نے اسی کنجی سے عدالت کا تعطل ختم کیا، اب تو قانون داں اس قابل تھا کہ اس پر ایک منصف جج کی حیثیت سے اعتماد کیا جا سکے اور ہر مسلمان حاکم اعلیٰ درجہ کا عدل شعار حاکم تھا اور یہ سچے مسلمان سب کے سب محض اللہ کے لیے سچی شہادتیں دینے والے تھے جب اللہ اور آخرت کے حساب و کتاب پر ایمان استوار ہوا تو عدل و انصاف کی فراوانی ہوئی، بے انصافیاں اور بدمعاملگیاں کم سے کم تر ہو گئیں اور جھوٹی شہادتیں اور ظالمانہ فیصلے ناپید ہو گیے۔ خاندانی معاملات جو اس قدر ابتر ہو گیے تھے کہ باپ بیٹے کے درمیان بھائی بھائی کے درمیان، شوہر اور بیوی کے درمیان کشاکش اور چھین جھپٹ کا میدان گرم تھا پھر یہ بیماری خاندانوں کے محدود میدان سے نکل کر معاشرہ کے وسیع میدان میں بھی پہونچ گئی تھی۔ یہی کشاکش نوکر اور مالک کے تعلقات میں بھی برپا تھی حاکم اور رعیت کے تعلقات میں بھی برپا تھی، بڑے اور چھوٹے کے تعلقات میں بھی برپا تھی۔ ہر ایک کا یہ حال تھا کہ اپنا حق کسی طرح چھوڑنا نہ چاہتا تھا اور دوسرے کا حق کسی طرح دینا نہ چاہتا تھا خود اگر کوئی چیز خریدتا تو ناپ تول میں ذرا ذرا سی اونچ نیچ پر باریک بینی سے نظر رکھتا لیکن اگر دوسرے کے ہاتھ کچھ بیچتا تو کم سے کم ناپنے اور تولنے میں پوری پوری مہارت بہم پہونچاتا (اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون)۔ آپ نے اس خاندانی اور معاشرتی نظام کے عقدوں کا حل بھی اسی کنجی سے کیا۔ خاندان اور معاشرہ میں ایمان کا بیج بویا لوگوں کو اللہ کی ناراضی سے ڈرایا اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنایا۔

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ه

اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا (اس طرح کہ) اس کا ایک جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں (کی نسل) سے پھیلا دیئے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں۔ اور اس اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم مانگتے ہو اور قرابتوں کا خیال رکھو بیشک اللہ تعالیٰ تم پر نگراں ہے۔

اور خاندان اور معاشرہ کے افراد میں سے ہر ایک پر کچھ ذمہ داریاں ڈالیں اور اسی طرح از سر نو خاندانی نظام کو بھی عدل محبت اور راستی کی بنیادوں پر قائم [illegible] ور معاشرہ کو بھی اعلیٰ درجہ کا عدل شعار بنایا۔ معاشرہ کے ہر ہر عضو میں امانتداری کا ایسا گہرا شعور اور خدا ترسی کا ایسا شدید [illegible] س بیدار کر دیا کہ اس معاشرہ کے امراء اور عہدیداران تک پرہیزگاری اور سادہ زندگی کے نمونے بن گئے قوم کے سردار اپنے تئیں قوم کے خادم سمجھنے لگے۔ والیان سلطنت اپنی حیثیت یتیموں کے سرپرست سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے کہ اگر اپنی ذاتی ملکیت کچھ ہے تو سلطنت کے مال و د[illegible] سے کوئی مطلب نہیں اگر نہیں ہے تو بقدر ضرورت لینے پر قناعت ہے۔ اسی ایمان کی بدولت آپ نے دولتمندوں اور تاجروں میں د[illegible] ے بے رغبتی اور آخرت سے دلچسپی پیدا کی، انھیں بتلایا کہ مال اصل میں اللہ کا ہے تمھیں اس نے اس کے تصرف میں اپنا نائب [illegible]

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ۔

اور خرچ کرو اس (مال و دولت) میں سے جس میں اللہ نے تمھیں اپنا نائب بنایا ہے۔

وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِىْ اٰتٰىكُمْ۔

اور دو ان کو (ضرورت مندوں کو) اس مال میں سے جو اللہ نے تمھیں دے رکھا ہے۔

انھیں تجوریوں میں بند کر کے رکھنے اور راہ خدا میں خرچ نہ کرنے سے یہ کہہ کر ڈرایا۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ۔

اور وہ لوگ جو سونے چاندی کے خزانے جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے آپ انھیں بشارت دیدیجئے دردناک عذاب کی اس دن جبکہ ان کے خزانوں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائیگا پھر اس سے ان کی پیشانیاں، کروٹیں اور پشتیں داغی جائینگی۔ لو یہ ہے تمھارا جمع کیا ہوا اب چکھو اس کا مزہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیغام اور اپنی دعوت کے ذریعہ سے جس فرد کو تیار کر کے کارگہ حیات میں اتارا تھا

وہ اللہ پر سچا ایمان رکھنے والا، نیک تقویٰ کو پسند کرنے والا، اللہ کے خوف سے ڈرنے اور لرزنے والا، امانت کا پاس کرنے والا، دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والا، مادہ کو حقیر سمجھنے والا اور اپنی روحانیت سے مادیت پر غالب آنے والا تھا۔ وہ اس بات پر دل سے یقین رکھتا تھا کہ دنیا تو میرے لیے بنائی گئی ہے لیکن میں آخرت کے لیے پیدا کیا گیا ہوں پس یہ فرد اگر تجارت کے میدان میں اترتا تو نہایت سچا اور ایماندار ثابت ہوتا، اگر مزدوری کا پیشہ اختیار کرتا تو نہایت محنتی اور بہی خواہ مزدور ثابت ہوتا۔ اگر مالدار ہو جاتا تو ایک رحم دل اور فیاض دولتمند ثابت ہوتا۔ اگر غریب ہوتا تو شرافت کو قائم رکھتے ہوئے مصیبتوں کو جھیلتا۔ اگر کرسی عدالت پر بٹھا دیا جاتا تو نہایت سمجھ دار اور منصف جج ثابت ہوتا۔ اگر صاحب سلطنت ہوتا تو ایک مخلص اور بے غرض حکمراں ثابت ہوتا، اگر آقا ہوتا تو رحم دل اور منکسر المزاج آقا ہوتا، اگر نوکر ہوتا تو نہایت چست اور فرمانبردار نوکر ہوتا اور اگر قوم کا مال و دولت اس کی تحویل میں آ جاتا تو حیرت انگیز بیداری اور باخبری سے اس کی نگرانی کرتا ——— یہ تھیں وہ اینٹیں جن سے اسلامی سوسائٹی کی تعمیر کی گئی اور جن پر اسلامی حکومت کی عمارت کھڑی کی گئی۔ اسی بنا پر یہ سوسائٹی اور یہ حکومت ایک بڑے پیمانہ پر افراد کے اخلاق ان کی نفسیات اور ان کے طرز حیات کا مظہر تھی۔ افراد میں جو جو چیزیں تھیں وہ سب کی سب معاشرے میں جمع ہو گئی تھیں، اس کے تاجر کی سچائی اور ایمانداری اس میں تھی اس کے غریب کی خودداری اور شفقت، کوشی اس میں تھی، اسکے مزدور کی محنت کشی اور بہی خواہی اس میں تھی، اسکے دولتمند کی فیاضی اور غمخواری اس میں تھی، اس کے جج کی فراست اور عدالت اس میں تھی، اسکے حکمراں کا خلوص اور دیانتداری اس میں تھی، اس کے آقا کا انکسار اور رحمدلی اس میں تھی، اس کے خادم کی جفاکشی اور چستی اس میں تھی اور اس کے خزانچی کی نگرانی اور بیداری بھی اس میں پوری پوری موجود تھی۔ اسلامی سوسائٹی جس طرح اپنے افراد کی خوبیوں کی مظہر اتم تھی اسی طرح اسلامی حکومت بھی تمام خوبیوں کی جامع بلکہ ان کا قوی محرک بن گئی تھی۔ یہ حکومت راست رو تھی، عقیدوں اور اصولوں کو منافع اور مصالح پر ترجیح دیتی تھی، عوام کے مال کو لوٹنے کے بجائے ان کے اخلاق اور عقاید کو بنانے اور سنوارنے کی دلسوزی سے کوشش کرتی تھی۔ سوسائٹی اور حکومت کے اثرات کا نتیجہ یہ تھا کہ انفرادی اور اجتماعی پرائیویٹ اور پبلک زندگی کا ہر سر گوشہ ایمان دل صدق و خلوص، محنت و کوشش اور عدل و انصاف سے سجا ہوا اور ان سدا بہار پھولوں کی خوشبو سے مہکا ہوا تھا۔

غار حرا پر کھڑا کھڑا میں یہ تمام باتیں اپنے دل میں سوچ رہا تھا۔ میں اپنے ان خیالات اور عہد رفتہ کی یاد میں اتنا غرق ہو گیا کہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے وجود سے بالکل بے خبر ہو گیا۔ میرا تصور مجھے اپنے ماحول اور اپنے زمانہ سے اڑا کر الگ لے گیا۔ میری نگاہوں میں اس عہد رفتہ کی عمومی اسلامی زندگی کی تصویر پھرنے لگی میں اس کا رخ جمال اور ایک ایک خط و خال دیکھنے لگا اور بالکل ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہی زندگی میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور میں اس کی روح نواز فضاؤں میں سانس لے رہا ہوں۔ اسی عالم تصور میں مجھے اپنے اس زمانہ کا خیال آیا جس کی فضا میں واقعی میں سانس لے رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ آج بھی زندگی کی کامیابی اور خوش گواری کے دروازوں پر کچھ نئے قسم کے تالے پڑے نظر آ رہے ہیں۔

مسائل میں پھیلاؤ اور تنوع کی کوئی حد نہیں رہی ہو اور اسی نسبت سے الجھاؤ اور پیچیدگیاں بھی بڑھ گئی ہیں تو کیا اس حالت میں بھی اسی پرانی کنجی سے یہ نئے قفل کھل سکتے ہیں؟

یہ سوال میرے دل میں پیدا ہوا مگر میں نے کہا کہ جب تک میں ان تالوں کو اچھی طرح دیکھ بھال کے ان کی حقیقت نہ معلوم کر لوں مجھے کوئی جواب نہ دینا چاہیئے! چناں چہ میں نے جو ان تالوں کو ہاتھ لگایا تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ تالے نئے نہیں ہیں وہی پرانے ہیں صرف رنگ روغن نیا ہے اور نہ ہی پیچیدگیاں اور الجھنیں کچھ ایسی نئی ہیں بلکہ ان کی جڑ تو ہو بہو پرانی ہے۔ آج بھی اصل مسئلہ فرد کا مسئلہ ہے جو سارے دوسرے مسائل کا سرا ہے اور یہی ہمیشہ انسانی زندگی کا اصل مسئلہ رہا ہے۔ کیوں کہ فرد وہ اینٹ ہے جس سے سوسائٹی اور حکومت بنتی ہے اور اس کا حال آج یہ ہو گیا ہے کہ مادہ اور قوت کے سوا کسی چیز کو ماننے کے لیے یہ تیار نہیں ہے۔ اپنی ذات اور خواہشات کے ماسوا اسے کسی چیز سے مطلب نہیں ہے، اس دنیا کی قدر و قیمت اس کی نظر میں حقیقت سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ لذت اور خواہشات کی بندگی حد سے گزر گئی ہے اور اپنے پروردگار سے، انبیاء کی رسالت سے اور عقیدۂ آخرت سے رشتہ بالکل ٹوٹ چکا ہے بس یہی فرد کا بگاڑ ہے جو سوسائٹی کے بگاڑ کا سرچشمہ اور تہذیب کی بدبختی کا ذمہ دار ہے۔ یہ فرد اگر تجارت کرتا ہے تو لالچ اور ذخیرہ اندوزی کا بدترین مظاہرہ کرتا ہے۔ ارزانی کے وقت مال روک لیتا ہے اور گرانی کے زمانہ میں نکالتا ہے اور اس طرح لوگوں کی بھوک اور پریشانی کا سبب بنتا ہے۔ یہ فرد اگر مفلس ہوتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ اپنی مفلسی کو دور کرنے کے لیے خود کچھ نہ کرے اور دوسروں کی محنتوں کا پھل مفت میں کھالے۔ اگر مزدوری کرتا ہے تو اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے لیکن مزدوری پوری لینا چاہتا ہے۔ اگر دولت مند ہوتا ہے تو اعلیٰ درجہ کا کنجوس اور سنگ دل ہوتا ہے۔ اگر صاحب اقتدار ہوتا ہے تو لٹیرا اور بددیانت ثابت ہوتا ہے، اگر مالک ہوتا ہے تو ایک ظالم اور خود غرض مالک ثابت ہوتا ہے جو اپنے فائدے اور اپنے آرام کے سوا کچھ دیکھنا نہیں جانتا۔ اگر نوکر ہوتا ہے تو کام چور اور بے ایمان، اگر خزانچی بنا دیا جاتا ہے تو غبن کرتا ہے اگر حکومت کا وزیر یا جمہوریہ کا صدر ہو جاتا ہے تو شکم پرور، روح سے بے خبر اور بندہ نفس ثابت ہوتا ہے جو صرف اپنی ذات اور اپنی پارٹی کے فائدے کو دیکھتا ہے، اگر لیڈر بن جاتا ہے اور بہت ہی ترقی پسندی کا مظاہرہ کرتا ہے تو بھی اپنی قوم اور اپنے وطن کے حدود سے باہر اس کا خلوص نہیں نکلتا اور اپنے وطن اور قوم کی عزت بڑھانے کے لیے دوسری قوموں اور دوسرے ملکوں کی عزت و آبرو خاک میں ملانے سے کسی وقت بھی گریز نہیں کرتا۔ اگر قانون سازی کا اختیار ہاتھ میں آجاتا ہے تو ظلم کے قانون اور بڑے بڑے ٹیکس مسلط کر دیتا ہے۔ اگر اس کے دماغ میں ایجاد و اکتشاف کی صلاحیت ہوتی ہے تو ہلاکت برسانے والے اور تباہی پھیلانے والے آلات ایجاد کرنے لگتا ہے، زہریلی گیسیں ایجاد کرتا ہے جو نوع انسانی کو ہلاک کر دیں، بمبار طیارے اور ٹینک بناتا ہے جو بستیوں کو کھنڈر اور راکھ کا ڈھیر بنا ڈالیں ایٹم بم

بنا تا ہے جس کی ہلاکت خیزیوں سے نہ انسان بچ سکتے ہیں نہ حیوان، نہ کھیت اور باغات۔ اور جب اس فرد کو ان ایجادات کے استعمال کرنے کی قوت بھی مل جاتی ہے تو بستیاں کی بستیاں اندھا دھند نشانے پر رکھ لیتا ہے اور آن کی آن میں زندوں کے شہر، شہر خموشاں بنا ڈالتا ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ جب اچھے افراد سے مرکب ہونے والا معاشرہ اور ان سے تیار ہونے والی حکومت ان افراد کی تمام خوبیوں کی آئینہ دار ہوتی ہے تو برے افراد سے تیار ہونے والا معاشرہ اور حکومت دونوں لامحالہ ان افراد کی تمام برائیوں اور بیماریوں کی حامل ہوگی۔ اس میں تاجروں کی ذخیرہ اندوزی بھی ہوگی نفع کا لالچ بھی ہوگا تنگدستوں کی سرکشی بھی ہوگی، مزدور کی کم محنت اور زیادہ اُجرت کی بری عادت بھی ہوگی۔ دولت مند کی ہوس کے جراثیم بھی اُڑ کر اُسے لگیں گے، اپنے حکمراں کی بدنیتی اور عیاری بھی اس میں پھیلے گی، مالکوں کا جور و ستم بھی اس کی عادت میں داخل ہوگا، نوکر کی خیانت اور خازن کا غبن بھی اس میں سرایت کرے گا، وزراء کی نفع پرستی اور لیڈروں کی وطن پرستی بھی اس میں آئے گی، قانون سازوں کے اندھیر اور سائنس دانوں کی بے راہ روی بھی اس میں جمع ہوگی، اور زر پرداروں کی سنگ دلی بھی اس پورے معاشرہ اور پوری حکومت کی خصوصیت بنے گی ——— یہ ہے وہ اصل مادہ فساد جس کے بطن سے وہ تمام بیماریاں، وہ تمام اُلجھنیں اور وہ تمام پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں جن سے انسانیت پریشان اور زار و نزار ہے۔ اس مادہ فساد کا نام ہے مادہ پرستی کا ذوق، یا مادہ اور اس کے مظاہر ہی کو سب کچھ سمجھنے کا عقیدہ! بلیک مارکٹنگ اسی کا نتیجہ ہے، رشوت ستانی اسی کا نتیجہ ہے، ہوشربا گرانی اور مہنگائی اسی کا نتیجہ ہے، ذخیرہ اندوزی اسی کا نتیجہ ہے، افراط زر اسی کا نتیجہ ہے۔ آج کے مفکرین اور مقننین آج تک ان مشکلات کا کوئی کامیاب حل نہیں ڈھونڈھ کر لا سکے، ایک مشکل کو حل کرتے ہیں تو دوسری نئی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں ایک گرہ کھلتی ہے تو کئی اور نئی لگ جاتی ہیں۔ بلکہ اب تو یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ ان کی عقدہ کشائی بجائے خود نئے نئے عقدوں کو جنم دے رہی ہے۔ جیسے اناڑی ڈاکٹر کے علاج سے صحت کے بجائے کچھ نئے نئے مرض اور پیدا ہو جائیں ——— یہ اس مریض پر روز نئے تجربے کر رہے ہیں۔ انھوں نے سمجھا کہ شخصی حکومت ان تمام امراض کا سبب ہے لہذا اسے ختم کر کے جمہوری طرز حکومت کی بنیاد ڈالی۔ مگر اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہوا تو بعض نے پھر آمریت اور ڈکٹیٹر یٹ کو اختیار کیا، اس سے اور خرابیاں بڑھتی دیکھیں تو پھر جمہوریت کی طرف رجوع کیا۔ ایسے ہی کبھی نظام سرمایہ داری کو اختیار کیا اس سے اور گرہیں بڑھیں تو اشتراکیت اور سوشلزم کو اپنے درد کا درماں سمجھ لیا مگر معاملہ کی نوعیت ذرا نہ بدلی اور مشکلات جوں کی توں یا پہلے سے کچھ سوا ہو گئیں۔ کیوں ——— ؟ اس لئے کہ یہ ساری تبدیلیاں اور سارا ردوبدل اوپر اوپر ہوتا رہا اور مشکلات کی جو جڑ اور بنیاد ہے یعنی فرد اور اس کا بگاڑ! اس کو ہاتھ نہیں لگایا گیا اس میں کسی اصلاح و تغیر کی کوشش نہیں کی گئی اور قصداً یا بلا قصد اس حقیقت سے غفلت برتی گئی کہ اصل فساد اور ٹیڑھ فرد میں ہے جس کی بدولت معاشرہ اور حکومت میں بھی ٹیڑھ پیدا ہو گئی ہے لیکن

میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر یہ اس حقیقت کو خوب سمجھ بھی لیتے اور برائیوں کی اس جڑ کو پا بھی لیتے تب بھی اس کا علاج ان کے بس کی بات نہ تھی۔ مانا کہ ان کے پاس اشاعت علم کے مؤثر ذرائع ہیں اور یہ دور ہی تعلیم و تربیت کی ترقی کا دور ہے مگر ان کے ہاتھ میں وہ طاقت تو نہیں ہے جس سے فرد کا رخ شر سے خیر کی طرف اور تخریب سے تعمیر کی طرف موڑ دیں۔ کیوں کہ یہ روحانیت بلکہ روح کی دولت ہی سے عاری اور ایمان سے خالی ہیں، ان کے پاس دل کو غذا دینے اور اس میں ایمان کا پودا لگانے کا سامان نہیں ہے۔ ان کے ہاتھوں سے وہ چیز نکل چکی ہے جو عبد اور معبود کے درمیان رشتہ جوڑے، اس زندگی کے ساتھ دوسری زندگی کا تعلق قائم کرے اور روح و مادہ کے درمیان توافق پیدا کرے اور علم کو اخلاق سے وابستہ کرے۔ ان کے روحانی افلاس، اندھی مادیت اور غرورِ عقل نے تو ان کو اب اس حد تک پہونچا دیا ہے کہ تخریب دنیا ہی کے اس آخری تیر سے بھی اپنے ترکش کو خالی کر لینا چاہتے ہیں جس کی ہلاکت خیزیوں سے انسانیت کا پورا کنبہ نیست و نابود، اور پورا کرۂ ارض اجاڑ اور ویران ہو سکتا ہے۔ خدا نخواستہ اگر اس وقت دنیا کی متحارب طاقتوں نے ان خوفناک ہتھیاروں کے ساتھ جنگ کا میدان گرم کیا تو یقیناً ان کے یہ نو ایجاد آلات تہذیب و انسانیت کا خاتمہ کر دیں گے۔

رسولِ اکرم کی سیاسی زندگی

مصنفہ (ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ایم اے، پی ایچ، ڈی)

رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا میں ایک انقلابی دین اور ایک اجتماعی نظام حیات دیکر بھیجے گئے تھے جب عرب میں یہ نظام حیات کامیاب ہوا اور اس کے نتیجے میں ایک اسلامی ریاست ظہور میں آئی تو حضور نبی کریم نے اس نئی اسلامی مملکت کے داخلی اور خارجی معاملات کس طرح انجام دیئے؟ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی اس تازہ ترین تصنیف کا موضوع ہے۔ یہ کتاب اسلامی مملکت کے ابتدائی دور کے سیاسی طرز عمل کی ایک مستند تاریخ ہے، ایک صحیح فکر اور مستند محقق کی تحقیقات کا نچوڑ ہے، اور ہر قسم کی غیر اسلامی آلائشوں سے پاک ہے۔ اس کتاب میں غیر مسلم مملکتوں سے اسلامی مملکت کے معاہدات اور دیگر بین الاقوامی مسائل میں حضور نبی کریم کے بعض اہم مکاتیب کے فوٹو بھی شایع کیے گئے ہیں، اسی کے ساتھ پہلی اسلامی مملکت کا ایک مستند نقشہ بھی اس کتاب کی زینت ہے۔

صفحات ۴۸۰ — قیمت [illegible]

حضرت سید احمد شہید

(از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی)

یہ کتاب صرف سید صاحب کی تاریخ نہیں ہے بلکہ ایک پوری جماعت کی تاریخ ہے جس نے ہندستان میں ڈیڑھ سو برس پہلے نیا ایمان پیدا کر دیا تھا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ نیا ایمان کیا ہوتا ہے، اس کی کیا طاقت ہے، وہ آدمی کو کیا بنا دیتا ہے؟ اور جس جماعت میں پیدا ہو جاتا ہے، وہ دنیا کی کیسی ممتاز جماعت ہو جاتی ہے۔

جلد اول ——— للعہ، مجلد للعہ

جلد دوم ——— زیر طبع

بسلسلۂ روداد اجتماعات دعوت اصلاح و تبلیغ
منعقدہ ۲۶ تا ۲۹ نومبر

ہماری دعوت اور اُس کا طریق کار

"نومبر کے آخری ہفتہ میں "دعوت اصلاح و تبلیغ" کے سلسلہ میں جو اجتماعات لکھنؤ میں ہوئے تھے اُن کے آخری اجتماع میں (جو ۲۹ نومبر کو دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں منعقد ہوا تھا) پہلی تقریر مولانا محمد منظور نعمانی نے فرمائی تھی جو درج ذیل ہے:-

---

الحمد للّٰہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللّٰہ
لقد جاءت رسل ربنا بالحق صلوات اللّٰہ تعالیٰ علیھم وعلیٰ کل من اتبعھم
باحسان الیٰ یوم الدین۔

حضرات! آج جمعرات ہے اور آپ میں سے اکثر حضرات کو بلکہ قریباً سب ہی کو معلوم ہوگا کہ "دار العلوم ندوۃ العلماء" کی اس مسجد میں ہر جمعرات کو اسی وقت یہ اجتماع ہوا کرتا ہے یعنی آج کا یہ اجتماع اس طرح کا اتفاقی اور وقتی اجتماع نہیں ہے جس طرح کے اجتماعات تین چار دن سے برابر شہر میں ہمارے ہو رہے تھے، بلکہ یہ ہمارا مستقل ہفتہ وار اجتماع ہے ——
ہمارے اس اجتماع کا مستقل نظام یہ ہے کہ ہم لوگ ہمیشہ جمعرات کو مغرب کی نماز یہیں آکے پڑھتے ہیں، نماز سے فارغ ہونے کے بعد پہلے مختصر کتابی درس ہوتا ہے جس میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے صحابۂ کرامؓ کے ایمان اور ایمانی جذبات پیدا کرنے والے حالات اور واقعات اور دین کی ضروری اور بنیادی تعلیمات کا کچھ حصہ مناسب اور منتخب کتابوں سے پڑھ کر سنایا جاتا ہے جیسا کہ آپ نے اس وقت دیکھا اور سنا، اس کے بعد حاضرین کے سامنے وہ دعوت پیش کی جاتی ہے جو اس اجتماع کی اور اس

تحریک کی اصل دعوت ہے، یعنی یہ کہ ایمان اور ایمان والی زندگی خود حاصل کرنے کے لئے اور دوسرے اپنے بھائیوں میں بھی اس کو پیدا کرنے کے لئے جدوجہد کا فیصلہ کیا جائے، اور اس کام کو اپنی زندگی کا جزو بنایا جائے، اس کے لئے محنت اور قربانی پر اپنے کو آمادہ کیا جائے ——— اور جب ضرورت سمجھی جاتی ہے تو اس کام کے طریقے اور پروگرام کی بھی وضاحت کی جاتی ہے ——— آج چونکہ بہت بڑی تعداد میں ایسے نئے حضرات بھی ہیں جو گذشتہ تین راتوں کے اجتماعات میں ہماری تقریریں سُنکر ہمارے خیال میں پہلی دفعہ یہاں تشریف لائے ہیں، اور ہماری اس دینی دعوت سے اور اس کے طریقے اور پروگرام سے وہ واقف نہیں ہیں اسلئے اس وقت میں اسی موضوع پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں :-

کل اور پرسوں اور اُس سے پہلے دن کے اجتماعات میں جو تقریریں آپ حضرات کے سامنے کی گئی تھیں اُن میں ہم نے اپنی اس دعوت اور تحریک کا صرف مقصد واضح کیا تھا، یا یوں کہنا چاہئے کہ ضرورت ظاہر کی تھی ——— اُن تقریروں سے آپ نے یہ تو سمجھ ہی لیا ہوگا کہ ہمارے سامنے اصلی مسئلہ مسلمانوں میں اصلی ایمان اور ایمانی زندگی پیدا کرنے کا ہے، اور یہی ہماری اس دعوت یا تحریک کا اصل مقصد ہے ——— اب آج میں ذرا تفصیل سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس مقصد کے لئے ہم کس طریقے پر کام کر رہے ہیں، اور ہمارا کیا پروگرام ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہمارے ایک بنیادی نظریے کو سمجھ لینا چاہئے ——— ابتک کے ہمارے تجربہ نے اور ہمارے غور و فکر نے ہمارے اس یقین کو بہت پختہ کر دیا ہے کہ خاصکر ہمارے اس زمانہ میں مسلمانوں میں حقیقی ایمان اور ایمانی زندگی کے پیدا کرنے میں دو چیزیں بہت زیادہ مؤثر ہوتی ہیں، ایک کسی ایسے ماحول میں کچھ وقت گذارنا جہاں ایمان کی فضا ہو اور ایمان کی اور ایمانی زندگی کی دعوت دی جاتی ہو ——— اور دوسرے خود ایمان کا داعی بن جانا اور اُس کی راہ میں ٹھوکریں کھانا، اور تکلیفیں اُٹھانا ——— آپ حضرات میں سے جن کو اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں میں غور و فکر کے قابل بنایا ہے وہ اگر غور کریں گے تو خود بھی اسی نتیجہ پر پہونچیں گے، اور جو حضرات ہمارے غور و فکر اور ہمارے تجربے پر اعتماد کریں تو ہم کہتے ہیں کہ الحمدللہ ہم پوری بصیرت کے ساتھ اس پر یقین رکھتے ہیں اور ہمارے پروگرام کی بنیاد ہمارے اسی یقین اور اسی نظریہ پر ہے ——— اسلئے ہم مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے مقامات پر ایسے دینی مرکز قائم کریں، جہاں ہفتہ کی کسی ایک رات کو عام اجتماع ہوا کرے، اور وہاں ایمان کی اور ایمانی زندگی کی دعوت دی جایا کرے، اور اُس رات کو لوگ وہیں قیام کیا کریں، اور اس کی پوری کوشش کی جائے کہ وہاں کی فضا ایمان کی فضا ہو۔

یعنی وہاں کا نقشہ جس قدر بھی ہو سکتا ہو اُس نقشہ کے مطابق ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے، اور جو آپ کی تیار کی ہوئی جماعت یعنی صحابۂ کرامؓ کی زندگی کا نقشہ تھا ——— جس میں اللہ کا ذکر تھا، آخرت کا فکر تھا، دین کا درد تھا، دین کی طلب تھی، دین کا سیکھنا تھا، دین کا سکھانا تھا، دین کی دعوت تھی، دین کے لئے مشورے تھے، دین کے لئے فیصلے تھے، آپس میں محبت تھی، اخوت تھی، خدمت تھی، ہمدردی تھی، غمخواری تھی، بہرحال ہم چاہتے ہیں کہ شہر بہ شہر ایسے دینی مرکز

قائم ہوں جہاں ہفتہ کی ایک رات کو اس طرح کا اجتماع ہوا کرے، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا اُس رات کو قیام بھی وہیں کیا جائے تو ہمارے کام کا ایک جز تو ہیں اس قسم کے اجتماعات ـــــــ اور دوسرا جز جس کی ہم مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں یہ ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں تک ایمان کی دعوت پہونچانے کے لئے اور ایمانی کیفیات اور ایمانی زندگی خود اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے اور اسکی ترقی اور تربیت کے لئے جماعتیں بنا بنا کر نکلا کریں، اور جیسا موقع ہو دُور کے یا قریب کے مقامات پر جایا کریں، اور ان جماعتوں کی فضا بھی ایمان والی اور ایمانی زندگی اور ایمانی کیفیات والی فضا ہو، یعنی مقامی طور پر ہفتہ وار اجتماع کی رات کا جو نقشہ ہونا چاہئے وہی ان جماعتوں کا مستقل نقشہ ہو، گویا یہ جماعتیں اسی قسم کے چلتے پھرتے اجتماعات ہوں۔

یہ جہاں جائیں اپنا دن کا وقت دین کے سیکھنے سکھانے میں اور وہاں کے لوگوں سے ملنے ملانے میں گذاریں حقیقی ایمان کی اور ایمانی زندگی کی وہاں کے اپنے بھائیوں کو دعوت دیں، آپس میں میل محبت سے رہنے کی، اور ایک دوسرے کی خدمت کرنے کی مشق کریں اور اس کی عادت ڈالیں، جہاں اُن کو رات گذارنا ہو وہاں اللہ کے ذاکر اور عابد بندوں والی رات گذاریں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں دین کی خدمت اور دعوت کے لئے جو لوگ اور جو قافلے جاتے تھے اُن کی زندگی کا نظام اور نقشہ یہی ہوتا تھا، اور اسی طرح اُن کی زندگی اسلامی زندگی بنتی تھی ـــــــ تو ہمارے اس کام کے یہی دو حصے ہیں، ایک مقامی ہفتہ وار اجتماعات، اور دوسرے اپنی دینی ترقی اور تربیت کے لئے اور دوسروں تک دین کی یہ دعوت پہونچانے کے لئے جماعتیں بنا بنا کر دُور اور قریب کے مقامات پر جانا ـــــــ تو مسلمانوں کو ہماری دعوت یہ ہے کہ وہ ان دو چیزوں کو اپنی زندگی کے پروگرام کا جز بنائیں، اپنے اپنے مقامات پر اس کام کے لئے دینی مرکز قائم کئے جائیں، اور وہاں کے مسلمانوں کو دعوت دی جائے کہ وہ ہفتہ کی ایک رات (جو رات بھی مشورہ سے مقرر ہو جائے) اپنے اس دینی مرکز میں گذارا کریں، اور ہر مہینہ کم از کم ایک دفعہ دین کی خدمت اور دعوت کے لئے اور خود اپنی ترقی اور تربیت کیلئے جماعتی نظام کے ساتھ سفر کیا کریں ـــــــ ہم بس ان ہی دو چیزوں کی دعوت دیتے ہیں۔

اس کے بعد میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اپنے ان اجتماعات میں اور اپنی جماعتوں کے ذریعہ ہم دین کی کن باتوں کی مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں ـــــــ آپ جانتے ہیں کہ دین ایک وسیع سمندر ہے، اس میں عقائد بھی ہیں اور اعمال بھی، اور اخلاق بھی، پھر ایک ایک شعبہ سے متعلق حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات سیکڑوں اور ہزاروں ہیں، اور اُن میں سے ہر بات بلاشبہ دین کی بات ہے ـــــــ تو ہم نے ان سب باتوں کی تفصیلی تبلیغ اور تعلیم اپنے ذمہ نہیں لی ہے ـــــــ یعنی ہمارا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے اجتماعات میں یا سفروں میں دین کے سب احکام کی تبلیغ کرتے ہوں اور تمام اصول و فروع کی اور فرائض و واجبات اور محرمات اور مکروہات کی فہرست بتلاتے ہوں ـــ نہ تو ہم میں سے ہر ایک کے پاس دین کا اتنا علم ہے اور نہ ہم عوامی اصلاح کے لئے اس طریقے کو صحیح اور مفید سمجھتے ہیں، اسلئے ہم نے بس چند بنیادی اور اصولی باتیں لے لی ہیں، ہم متعین طور سے دین کی تعلیمات میں سے بس ان ہی دو چار باتوں کی دعوت دیتے ہیں، اور اُن ہی کا اپنے مسلمان بھائیوں سے مطالبہ کرتے ہیں۔

ان میں سب سے پہلی بات ہم مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے مسلمان ہونے کی حیثیت کو سمجھیں اور جس کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے یعنی "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" اس کو، اور اس کے معنی مطلب کو، اور اس کی حقیقت اور اس کے فیصلہ کو سمجھ کر وہ اس پر اپنا ایمان تازہ کریں، اور اس کو اپنی زندگی کی بنیاد بنائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس کلمہ کے ماننے والوں اور پڑھنے والوں میں بہت کم ہیں جن کو اس کی حقیقت اور عظمت کا کچھ پتہ ہوگا۔ اس کلمہ کا پڑھنے والا دراصل دو بڑی اہم حقیقتوں کا اور اپنے متعلق دو بڑے معرکہ کے فیصلوں کا اقرار اور اعلان کرتا ہے۔

ایک یہ کہ اللہ کے سوا میں کسی کو معبود اور مالک نہیں مانتا، بس صرف اسی کو عبادت اور بندگی کے لائق سمجھتا ہوں، اسلئے اب میں صرف اسی کی عبادت اور بندگی کروں گا، اسی کے حکموں پر چلوں گا، اسی کو راضی رکھنے کی فکر رکھوں گا، اور اسی کے لئے جیوں گا اور مروں گا۔

اور دوسرے یہ کہ میں نے مان لیا اور یقین کر لیا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے سچے پیغمبر ہیں، اُن کا لایا ہوا دین، اللہ کا اُتارا ہوا دین ہے، اور ان کی لائی ہوئی شریعت اللہ کی مقرر کی ہوئی شریعت ہے، اور اب نجات اور اللہ کی رضامندی صرف ان کی پیروی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، لہٰذا میں نے ان کے لائے ہوئے دین کو اور انکی شریعت کو قبول کر لیا، اب میں ان کی شریعت پر چلوں گا، ان ہی کے طریقے پر جیوں گا، اور ان ہی کے طریقے پر مروں گا۔

تو دراصل اس مختصر سے کلمہ کے ذریعہ ان دو بڑی حقیقتوں کا اقرار اور فیصلہ کیا جاتا ہے، اور یہی اقرار اور فیصلہ ہمارے دین کی بنیاد ہے۔

تو مسلمانوں میں ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کے سلسلہ میں پہلی بات ہم اُن سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اس کلمہ کی حقیقت اور عظمت اور اہمیت کو سمجھ کر ایمان تازہ کرنے کی نیت سے کثرت سے اس کو پڑھا کریں، اور اسی کو اپنی زندگی کا بنیادی اصول بنائیں۔ یہاں تک کہ اس کلمہ کی حقیقت ان کے دل میں بس جائے اور ان کا حال بن جائے۔

اس کے بعد دوسری متعین چیز جس کی ہم مسلمانوں کو اس سلسلہ میں دعوت دیتے ہیں، وہ "اقامت صلوٰۃ" ہے، یعنی اللہ و رسول کے حکم کے مطابق نماز کا خاص اہتمام کرنا، یعنی صرف نماز پڑھنا ہی نہیں، بلکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم کے مطابق نماز کو صحیح طور سے اور بہتر سے بہتر ادا کرنے کی کوشش کرنا —— نماز کلمہ کے بعد دین کی دوسرے درجہ کی بنیاد ہے، بلکہ میں کبھی کبھی کہا کرتا ہوں کہ نماز گویا بڑا اور عملی کلمہ ہے، یعنی کلمہ کے ذریعہ مختصر لفظوں میں جس حقیقت کا اقرار اور اعلان کیا جاتا ہے اور اللہ کی بندگی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی والی جس زندگی کا فیصلہ کیا جاتا ہے، نماز اُسی کی ایک تفصیلی اور عملی شکل ہے۔ نماز میں شروع سے لیکر آخر تک جو کچھ پڑھا جاتا ہے، اور جو کچھ کیا جاتا ہے، اگر آپ اُس سب پر اور اس کی خاص ترتیب پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ نماز کی نوعیت بالکل یہی ہے کہ وہ کلمہ کی تفصیل ہے

اور کلمہ والی زندگی کا ایک نمونہ ہے، یا یوں کہنا چاہیئے کہ اس کی مشق کا ایک مقررہ نصاب ہے۔

بندہ جب نماز کی نیت کرکے کھڑا ہوجاتا ہے تو اُس وقت وہ اللہ کی بندگی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی مکمل تصویر بن جاتا ہے، اُس کا کھڑا ہونا اور بیٹھنا اللہ و رسول کے حکم سے ہوتا ہے، اُس کا جھکنا اور زمین پر گرجانا اللہ ورسول کے حکم سے ہوتا ہے، جس حالت میں اُسے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہونے کا حکم ہے اُس حالت میں وہ ہاتھ باندھ کے ہی کھڑا ہوتا ہے، اور جس حالت میں اسے ہاتھ چھوڑنے کا حکم ہے اُس وقت وہ ہاتھ چھوڑ کے ہی کھڑا ہوتا ہے، ایک رکعت میں ایک رکوع کا حکم ہے تو اگر اُس کا جی بھی دو رکوع کرنے چاہے تو نہیں کرتا، اسی طرح سجدہ میں اُسے اگر زیادہ لذت ملے اور وہ بجائے دو کے ایک رکعت میں ۳، یا ۴ سجدے کرنا چاہے تو نہیں کرتا، اور نہیں کرسکتا۔ حتیٰ کہ نماز کے آخر میں جب اللہ کا اس کو حکم ہوتا ہے کہ اب اللہ سے مخاطب ہونے کے بجائے وہ اللہ کے بندوں کی طرف مخاطب ہو، اور اللہ کی تسبیح وتحمید اور دُرود کی بجائے وہ دائیں بائیں والے اپنے ساتھیوں کو سلام کرے، تو وہ بے چون وچرا اس کی بھی اطاعت کرتا ہے۔ اسی طرح جب تک حکم ہوتا ہے کہ اپنے رُخ کو قبلہ ہی کی طرف رکھو، اور دائیں بائیں کچھ نہ دیکھو، تو وہ اس کی پوری پابندی کرتا ہے لیکن جب سلام کے وقت حکم ہوتا ہے کہ اب اپنے چہرہ کو قبلہ کی طرف سے موڑ کر دائیں طرف اور بائیں طرف پھیرو، تو وہ بے چون وچرا اس کی بھی تعمیل کرتا ہے۔

الغرض نماز اللہ کی بندگی والی اور رسول اللہ کی پیروی والی اُس زندگی کا پورا پورا نمونہ ہے جس کا اقرار اور اعلان کلمہ میں کیا جاتا ہے۔ گویا نماز ہمیں یہ سکھاتی ہے، اور اس کے ذریعہ دن میں کم از کم پانچ وقت اس کی تربیت دی جاتی ہے کہ ہم اس دنیوی زندگی کو اس طرح گذاریں کہ ہمارا اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، دیکھنا سننا، سوچنا سمجھنا، بولنا چالنا، حتیٰ کہ مرنا جینا سب اللہ و رسول کے حکم اور قانون کے مطابق ہو۔

تو ایمان اور ایمان والی زندگی کو پیدا کرنے کے لئے اور اس کو ترقی دینے کے لئے کلمہ طیبہ کے بعد دوسری جس چیز کی ہم دعوت دیتے ہیں وہ اقامت صلوٰۃ ہے، یعنی نماز ہے، اور دین کے ارکان میں سے تعین کے ساتھ نماز کی دعوت ہم اس کی اسی خصوصیت کی وجہ سے دیتے ہیں کہ کلمہ کی طرح وہ بھی ایمان اور ایمان والی زندگی کی خاص بنیاد ہے، اور جیسا کہ میں نے بتلایا، وہ گویا کلمہ کی تفصیلی اور عملی شکل ہے، اور کلمہ والی ایمانی زندگی پیدا کرنے کا ایک خاص نصاب اور ذریعہ ہے۔

ان دو چیزوں کے بعد تیسری بات ہم مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے کلمہ پڑھ کے جس زندگی کو قبول کیا ہے، اور جس کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے، یعنی اللہ کی بندگی والی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی والی زندگی، وہ اس کے سیکھنے کو اپنی زندگی کا جزو بنائیں، اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنانے کی کوشش کریں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندگی کا جو طریقہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے تھے، اور جس پر چلنے کا فیصلہ کلمہ پڑھ کے کیا جاتا ہے، اور دراصل زندگی کے اُسی طریقے کا نام اسلام ہے، وہ صرف مسلمان گھر میں پیدا ہوجانے سے آپ سے آپ

نہیں آجاتا، وہ تو جب ہی آتا ہے جب اُس کو جانا جائے، سیکھا جائے، اور اس کے مطابق چلا جائے۔

تو ہر مسلمان کو ہم تیسری اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ دین سیکھنے کو وہ اپنے لئے ضروری سمجھے، اور کھانے پینے کی طرح یا دوا علاج کی طرح اس کو بھی اپنی زندگی کی خاص ضرورت جانے، اور اسی کو اپنی زندگی بنانے کی فکر کرے۔

اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر شخص کسی عربی مدرسہ کا باقاعدہ طالب علم بن کر، اور دس بارہ سال اس میں پڑھ کر پورا عالم فاضل بنے، بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کا، اور حلال حرام کا اتنا علم ضرور حاصل کرے جس کی روشنی میں وہ اسلام والی زندگی گذار سکے۔ خواہ یہ علم مدرسہ میں پڑھ کر حاصل کیا جائے، خواہ کتابوں کے مطالعہ سے اس میں مدد لی جائے، خواہ دین جاننے والوں کے ساتھ رہ کر اُن کی صحبت سے اور اُن کی باتوں سے حاصل ہو جائے۔ اور سب سے آسان اور عمومی طریقہ یہی آخری طریقہ ہے، یعنی یہ کہ دین جاننے والوں اور دین پر چلنے والوں کے ساتھ رہ کر دین سیکھا جائے، اس طریقہ سے ہر شخص بڑی آسانی سے دین سیکھ لیتا ہے، اور یہاں علم عمل کے ساتھ آتا ہے، اور اسی لئے بڑا پائیدار ہوتا ہے۔ ہماری تبلیغی جماعتوں میں دین سیکھنے سکھانے کا جو کام ہوتا ہے وہ زیادہ تر اسی طریقے سے ہوتا ہے، اگرچہ جماعتوں میں کچھ کتابی درس بھی ہوتا ہے، لیکن ہم اصلی تعلیم اسی کو سمجھتے ہیں جو عمل سے دی جاتی ہے، اور صحبت سے حاصل ہوتی ہے۔

ہمارے علم میں ایسے بہت سے اللہ کے بندے ہیں جنھوں نے دین کا علم کسی مدرسہ میں پڑھ کر حاصل نہیں کیا، نہ وہ مطالعہ والے آدمی ہیں، بلکہ مزدور طبقہ کے ہمارے بھائی ہیں، بس کبھی کبھی تبلیغی جماعتوں کے ساتھ سفروں میں جاتے رہتے ہیں اور اس کو انھوں نے اپنی زندگی کے پروگرام میں داخل کر لیا ہے، اسی سے اُن کو اپنی ضرورت کے قابل دین آگیا ہے، پہلے اُنھیں اگر نماز پڑھنا نہیں آتا تھا تو اب آگیا ہے، اگر اُن کی نمازوں میں غلطیاں تھیں تو انھوں نے اُن کی اصلاح کر لی ہے، اسی طرح دین کی دوسری ضروری باتیں جو پہلے انھیں معلوم نہیں تھیں اب تبلیغی جماعتوں میں مسلسل جاتے رہنے سے اور اس سلسلہ کے اجتماعات میں آمد رفت سے الحمد للہ اُنھیں کچھ معلوم ہو گئی ہیں۔

اور اس راستے سے یعنی صحبت اور اجتماع و اختلاط کے ذریعہ سے جو دین سیکھا جاتا ہے اُس میں یہی نہیں ہوتا کہ بس مسئلہ معلوم ہو گیا، بلکہ اس میں علم عمل کے ساتھ آتا ہے، بلکہ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ عمل کی کیفیات بھی ساتھ ہی آتی ہیں ——— اس کو مثال سے یوں سمجھئے کہ کسی اچھے نماز پڑھنے والے بندہ کی صحبت سے جو شخص نماز سیکھے گا تو اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوگا کہ اُس کو نماز پڑھنے کا طریقہ آجائے گا، بلکہ وہ نماز پڑھنے لگے گا، اور اچھی نماز پڑھنے لگے گا۔ صحابۂ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی آسان اور فطری طریقہ سے دین سیکھا تھا، اسی وجہ سے اُن کا علم عمل کے ساتھ تھا، اور اُن کے اعمال میں حضورؐ کے اعمال کی کیفیات بھی آگئی تھیں ——— پھر یہ طریقہ بڑا سستا ہے، بلکہ کہنا چاہیئے کہ بالکل بے خرچ ہے، اس میں نہ فیس دینی پڑتی ہے، نہ کتابوں کی قیمت کی فکر کرنی پڑتی ہے، نہ مدرسوں کے لئے عمارتیں بنوانی پڑتی ہیں، نہ اسٹاف کی تنخواہ کا سوال ہے، اور وقت بھی مستقل نہیں دینا پڑتا۔ اگر مسلمان ہماری بات مان لیں، اور تبلیغی جماعتوں کے پروگرام اور طریقہ کے مطابق کچھ وقت گذارنا وہ اپنی

زندگی کے پروگرام میں داخل کرلیں، تو بغیر کسی بڑے خرچ کے، اور بغیر کسی وسیع تعلیمی انتظام کے، انشاء اللہ عام مسلمانوں کو دین آسکتا ہے، اور اُن کی زندگی دینی زندگی بن سکتی ہے۔

بہرحال کلمہ اور نماز کے بعد تیسری بات ہم مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اس کا فیصلہ کریں کہ انھیں دین سیکھنا اور دین پر چلنا ہے، اور اپنی زندگی کو کلمہ والی زندگی اور نماز کے نمونہ کی زندگی بنانا ہے۔ اور میں بتلا چکا ہوں کہ ہمارے نزدیک اس کا آسان اور عمومی طریقہ یہ ہے کہ دین سیکھنے سکھانے کے لئے، اور دین کی دعوت پھیلانے اور اس کی تربیت حاصل کرنے کیلئے جماعتوں کی اور قافلوں کی شکل میں پھرنے کا رواج مسلمانوں میں عام ہو جائے۔

(اس کام میں، یعنی اپنی زندگی کو دینی زندگی بنانے میں جن چیزوں سے خاص مدد ملتی ہے اُن میں ایک اللہ کے ذکر کی کثرت بھی ہے، اسلئے ہم اس سلسلہ میں اس کا بھی مشورہ دیتے ہیں۔)

چوتھی بات ہم مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ وہ ہماری ان تین باتوں کو قبول کرنے کے علاوہ اس کا بھی فیصلہ کریں کہ ان باتوں کو مسلمانوں میں عام کرنے کی کوشش کو بھی اُنھیں اپنی زندگی کا جزو بنانا ہے، اور اس کے لئے اُنھیں محنتیں اور قربانیاں کرنا ہیں ——— پھر اس کوشش کی دو صورتیں ہیں، ایک انفرادی، دوسرے اجتماعی، پھر اس اجتماعی کی بھی دو شکلیں ہیں، ایک اس مقصد کے لئے ہمارے اس اجتماع کے قسم کے دعوتی اجتماعات کا قائم کرنا، اور لوگوں کو ان اجتماعات میں لانے کی کوشش کرنا، جہاں انھیں تفصیل سے اس دعوت کو اور اس کے پروگرام کو سننے اور سمجھنے کا موقع ملے، اور دوسرے جماعتیں بنا بنا کر اس مقصد کے لئے سفر کرنا، اور لوگوں کے پاس پہنچ پہنچ کے ان کو دین کی اور دین کے لئے کوشش کی دعوت دینا ——— یہ دونوں شکلیں اجتماعی کوشش کی ہیں۔ اور ہماری اس اجتماعی جدوجہد کے جس کو آپ حضرات تبلیغی تحریک کہتے ہیں، یہی دو بازو ہیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ دین کی دعوت اور کوشش کی بس یہی دو صورتیں ہیں، یہ تو دراصل اجتماعی جدوجہد کی صورتیں ہیں، اور ان کا مقصد اس دینی جدوجہد کا امت میں ایک نظام قائم کرنا ہے۔ انفرادی کوششوں کا خانہ ان کے علاوہ ہے اور اس کا کوئی متعین ضابطہ اور پروگرام نہیں ہے، اس کے لئے تو ہم ہر اُس مسلمان بھائی سے جو ہماری اس دینی دعوت کو ٹھیک سمجھتا ہے، بس یہ کہتے ہیں کہ وہ اس کو اپنی ذاتی دعوت بنالے، اور حکمت کیساتھ انفرادی طور پر بھی دین کی طرف دعوت کا کام کرتا رہے، اور اللہ کے بندوں کو دین کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں سرگرم رہے۔ گھر میں، محلہ میں، دفتر میں، کارخانہ میں، دُکان پر، ہوٹل میں، غرض جہاں بھی اُس کا وقت گذرے، اور جب بھی اُسے مناسب موقع نظر آئے، وہ اپنے مسلمان بھائیوں میں دین کے لئے کوشش کرے۔

الغرض پہلی تین باتوں کے بعد چوتھی بات ہم مسلمانوں سے یہی کہتے ہیں کہ دوسرے مسلمان بھائیوں میں دین کی ان بنیادی باتوں کی تبلیغ کے لئے اور اُن میں دینی زندگی کو عام کرنے کے لئے اور دین کی اس جدوجہد پر اُن کو بھی لگانے کے لئے وہ اُن میں چل پھر کر کوشش کریں، جماعتوں کی شکل میں اور اجتماعات کی شکل میں اجتماعی کوشش بھی کریں، اور اپنے طور پر انفرادی

کوشش بھی کریں، اور اس کوشش کو اپنی زندگی کا جز بنا لیں۔

دین کی جدوجہد اس اُمت کی رُوحِ حیات ہے، جب سے اُمت میں سے دین کے لئے جدوجہد کا رواج ختم ہوا اُسوقت سے امت کا عموم گویا ایک بے رُوح جسم ہو کر رہ گیا ہے۔ ہمیں اس کا پورا پورا یقین ہے کہ موجودہ حالات میں دین کی جدوجہد کے عام ہونے سے ہی اس امت میں نئی زندگی اور نئی رُوح آسکتی ہے، اسلئے ہم اس پر ہر چیز سے زیادہ زور دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ زمانہ عوامی دعوتوں اور تحریکوں کا ہے، اور اس دور میں وہ نظریے اور زندگی کے وہ طریقے باقی نہیں رہ سکتے جن کے لئے کوئی دعوت اور عمومی جدوجہد نہ ہو، اسلئے دین کی دعوت، اور دینی زندگی کی جدوجہد کو ایک عمومی تحریک بنائے بغیر ہم اپنی موجودہ اسلامیت کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔

مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ دینی تحریکوں کے اس طوفانی زمانہ میں ہمارا اور ہماری نسلوں کا اسلام پر قائم رہنا اب بظاہر اسباب اسی پر موقوف ہے کہ دین کی دعوت اور جدوجہد کو ایک عوامی تحریک کی طرح مسلمانوں میں عام کر دیا جائے، اور ہر شخص کو دین کا داعی بنانے کی کوشش کی جائے، ہم بس یہی کرنا چاہتے ہیں، اور اس کے لئے ہمارے پاس یہی پروگرام ہے جو میں نے آپ حضرات کے سامنے پیش کیا۔

ہم مسلمانوں سے یہ نہیں کہتے کہ وہ ہمارے جھنڈے کے نیچے آجائیں، یا ہماری تنظیم میں داخل ہو جائیں، ہمارا کوئی جھنڈا اور کوئی نشان نہیں ہے، اور ہم نے کوئی جماعت منظم نہیں کی ہے، ہماری دعوت بس یہ ہے کہ حقیقی ایمان اپنے اندر پیدا کرو، دین کو اپنی زندگی بناؤ، اور دوسروں میں اس کے لئے جدوجہد کرو، اور اس راہ میں نقصانات اور تکلیفیں اُٹھانے کے اور قربانیاں کرنے کے انبیاء علیہم السلام کے طریقے کو پھر سے زندہ کرو۔ اللہ تعالیٰ اسی زندگی سے خوش ہے، اور اسی زندگی پر اُس کی طرف سے رحمت کے اور دنیا اور آخرت میں سرخروئی اور سرفرازی کے وعدے ہیں۔

دین کے واسطے جدوجہد کی ہماری اس دعوت کو اللہ کے جو بندے قبول کرلیں ہم اُن سے دو تین باتیں اور بھی کہتے ہیں۔

ایک یہ کہ دوسروں میں دین کی کوشش خواہ اجتماعی ہو یا انفرادی، وہ ہمیشہ اس نیت سے اور اس یقین کیساتھ کریں کہ یہ خود ان کی اپنی ضرورت ہے، اور اس میں خود ان کی دینی ترقی اور تربیت ہے، اور یہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اور اگر قبول ہو جائے تو اس راستے کے ایک ایک قدم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے حساب ثواب ملنے والا ہے ——— اس کے کہنے کی ضرورت ایک تو اس لئے ہے کہ ہماری اس دنیا میں خالص مادی اور دنیوی تحریکوں کے رواج اور غلبہ کی وجہ سے خود ہمارے ذہن اس قدر مسخ ہو گئے ہیں کہ اس قسم کے کاموں میں اللہ کی رضا اور آخرت کے ثواب کے تصور کے بھی ہم عادی نہیں رہے، اور دوسرے یہ کہ دعوت و تبلیغ جیسے کاموں میں جاہ طلبی اور بڑا بننے کی خواہش کا بڑا خطرہ ہے۔ بہرحال اسلئے اس کی ضرورت ہے کہ اس کام کے کرنے والے اپنی نیت کو درست رکھنے کا اور اپنے اندر اخلاص پیدا کرنے کا خاص اہتمام کریں، اور اپنے دل کی نگرانی کرتے رہیں ——— اللہ تعالیٰ کے یہاں

قبول ہونے کے لئے ہر کام میں اخلاص شرط ہے۔

تو دینی جد و جہد کی ہماری دعوت کو قبول کرنے والے اپنے بھائیوں سے ایک بات تو ہم یہ کہتے ہیں ——— اور دوسری بات اُن سے یہ کہتے ہیں کہ اس کام کی وجہ سے اُن کے اندر ہرگز ہرگز اپنی بڑائی اور بالا تری کا احساس نہ پیدا ہو اور دوسرے بندوں کی تحقیر نہ ہو، نہ دل سے، نہ برتاؤ میں، ہر مسلمان کو ہم اپنا بھائی سمجھیں، اُس کی خیر خواہی اور ہمدردی، اور اُس کے ساتھ نیک گمانی اور خیر اندیشی کو اُس کا اپنے پر حق سمجھیں۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جس میں کچھ بُرائیاں اور کچھ خوبیاں نہ ہوں، ہمیں اپنی زندگی کا اصول یہ بنانا چاہئے کہ اپنی تو بُرائیوں کو ہم زیادہ دیکھیں، اور دوسروں میں ہم خوبیوں کی تلاش کریں، اور اُن کی قدر کریں۔

آج کل کی ہماری مصیبتوں میں سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی [illegible] خوبیوں کو دیکھنے کا عادی ہے، اور دوسروں میں اُس کو صرف برائیاں اور کمزوریاں نظر آتی ہیں، خود ہمارا حال یہ ہے کہ ہر معاملہ میں ہم اپنے کو بے قصور اور دوسروں ہی کو قصوروار ثابت کرنا چاہتے ہیں، ہم کبھی اپنے پر الزام لینے کے لئے تیار [illegible] سارا الزام دوسروں ہی پر رکھنا چاہتے ہیں، اور اپنے وقار کی حفاظت کے لئے بسا اوقات دوسروں کو ذلیل کرنے سے ہم نہیں چوکتے، بلکہ دوسروں کی تحقیر اور تذلیل میں، اور اُن کی برائیوں کی تشہیر میں ہمیں لذّت ملتی ہے ——— یہ چیز بڑی مہلک اور تباہ کن ہے، اور دین کی جس جد و جہد کی ہم آپ کو دعوت دے رہے ہیں اُس کے لئے تو یہ زہر ہے زہر! ——— اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی یہ چیز سخت مبغوض ہے۔ حدیث شریف میں ہے:۔

> "حسب امرء من الشر ان یحقر اخاه المسلم التقوی ههنا التقوی ههنا التقوی ههنا واشار الی صدره ثلاثا" (یعنی کسی آدمی کے لئے یہ برائی بہت کافی اور بہت بڑی ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کی تحقیر کرے یا اس کو حقیر سمجھے، تقویٰ (جس کی وجہ سے آدمی اللہ کے نزدیک مکرم اور محترم ہوتا ہے) وہ یہاں سینہ میں، دل میں چھپا ہوتا ہے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ آخری بات تین دفعہ ارشاد فرمائی، اور ہر دفعہ اپنے سینۂ مبارک کی طرف اشارہ فرمایا ——— حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مطلب یہ تھا کہ کسی شخص کو تقوے سے خالی سمجھ کر اس کی تحقیر کا تمھیں کوئی حق نہیں، کیونکہ تقویٰ سینہ کے اور دل کے اندر کی چیز ہے ——— ایک دوسری حدیث میں ہے، کہ:۔

> "مسلمان کی آبرو ایسی ہی احترام کے قابل ہے جیسے کہ اللہ کا شہر مکّہ، اور حج کا مقدس مہینہ، اور خاص حج کا مُبارک اور محترم دن"۔

بہر حال اللہ کے جو بندے دین کی یہ خدمت کریں اور دینی جد و جہد کی ہماری دعوت کو قبول کریں، اُن سے خصوصیت کے ساتھ ہماری گذارش یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ نیک گمانی، خیر خواہی، اور اکرام و احترام کو اور اُن کی تحقیر اور تذلیل سے بچنے کو

اپنا اصول بنائیں، دوسرے مسلمانوں کی عزت و آبرو کو اپنی عزت و آبرو کی طرح عزیز سمجھیں، اور اس کو اپنی مستقل عادت بنائیں دوسرے مسلمانوں کی تحقیر و تذلیل سے ہمیں ویسی ہی تکلیف ہونی چاہئے جیسی کہ اپنی تحقیر اور تذلیل سے ہوتی ہے ــــــ میں بغیر کسی انکساری کے کہتا ہوں کہ یہ باتیں خود مجھے بھی پوری طرح حاصل نہیں ہیں، لیکن مجھے اور آپ کو یہ باتیں اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں، اور ان کے لئے کوشش کرنی چاہئے، اور ان کے لحاظ سے جو کمی ہے اُس پر رونا چاہئے، اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرنی چاہئیں۔

اور سب سے آخری بات یہ ہے کہ اس دعوت اور اس جدوجہد کی مشکلات کے سلسلہ میں ہمیں اللہ کے ذکر کی اور دُعا کی کثرت سے طاقت اور مدد حاصل کرنا چاہئے۔ اللہ کا ذکر رُوح کی اور دل کی طاقت ہے، اور دعا مومن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اگر ہم نے ذکر اور دعا کی اہمیت کو کبھی نظر انداز کیا اور خدانخواستہ ہمارا یہ پہلو کمزور رہا تو ہماری یہ تحریک اور خود ہم اللہ کی نظر سے گر جائیں گے۔ قل ما یعبأ بکم ربی لولا دعاءکم۔

حضرات! بس یہ ہے ہماری دعوت، اور یہ ہیں ہمارے اس کام کے اصول اور یہ ہے ہماری اس تحریک کا پروگرام اور طریقۂ کار ــــــ میں عرض کر چکا ہوں کہ ہم نے اس کام کے لئے کوئی جماعت یا انجمن قائم نہیں کی ہے، اس کام کے ساتھ خود ہمارے تعلق کی نوعیت بھی یہی ہے کہ اللہ کے کچھ بندوں کو ہم نے دیکھا کہ وہ اس کام کو کر رہے ہیں اور دوسروں سے بھی کہتے ہیں کہ تم بھی اس کام کو اپنا کام بنالو اور اپنی زندگی کے پروگرام میں اس کو داخل کرلو، ہم نے اُن کی دعوت پر اس کام کو دیکھا، اس کے نتائج کو دیکھا، پھر خود کر کے دیکھا اور ہمیں اطمینان ہوگیا کہ یہ کام کرنے کا ہے اور اللہ و رسُول کی مرضی کے مطابق ہے، اور اس کی راہ میں محنت اور قربانی کرنا اپنی زندگی کا اور ہماری قوتوں کا سب سے اچھا مصرف ہے، بس اللہ کی توفیق سے ہم نے یہ فیصلہ کرلیا اور جیسا کچھ ٹوٹا پھوٹا ہو رہا ہے کر رہے ہیں ــــــ آپ سے بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ اس کام کو دیکھئے، سمجھئے، تجربہ کیجئے، اور اگر اللہ تعالیٰ آپ کا دل کھول دے تو اپنا کام سمجھ کے اپنے طور پر کیجئے، ہمارے ساتھ دامن باندھنے کی ضرورت نہیں۔ ہماری حیثیت بس اُس مؤذن کی ہے جو اذان دے کر اپنی طرف نہیں بلاتا، بلکہ اللہ کی طرف اور نماز کی طرف بُلاتا ہے ــــــ ہاں ہمیں اسکی حرص ضرور ہے کہ اللہ کے زیادہ سے زیادہ بندے ہماری اس دعوت کو اور ہمارے اس مشورہ کو قبول کرلیں، اور جہاں تک ہو سکتا ہے ہم اس کی کوشش بھی کرتے ہیں، لیکن یہ اسلئے نہیں کہ ہم اپنا جتھہ بڑھانا چاہتے ہیں۔ میں بتلا چکا ہوں کہ ہم نے کوئی جتھہ بنایا ہی نہیں ہے، اور کوئی جماعت قائم ہی نہیں کی ہے، بلکہ ہماری یہ حرص اور کوشش صرف اسلئے ہے کہ ہم دیانتداری سے یہ سمجھتے ہیں کہ رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت میں ایمان اور ایمانی زندگی پیدا کرنے اور عام کرنے کا اس وقت یہی سہل اور عوامی راستہ ہے، اور جتنے اللہ کے بندوں کو ہم اپنی کوششوں سے اس طرف لگا سکیں گے، اور پھر اس سلسلہ میں اللہ کو راضی کرنیوالے وہ جو کام کریں گے اور دین کے لئے جو جدوجہد کریں گے اُس کے اجر کے حصہ سے اللہ تعالیٰ ہم کو بھی محروم نہ رکھیں گے ــــــ

سچی بات یہ ہے کہ اپنی ذات کے متعلق تو میں بالکل ایمانداری سے بغیر کسی انکسار کے کہتا ہوں کہ میرے اعمال بالکل بھروسہ کے

قابل نہیں ہیں، اسلئے اس کی کوشش کرتا ہوں کہ اللہ کے دوسرے بندوں کو دین کی طرف اور دین کی خدمت کی طرف متوجہ کردوں وہ جب اس طرف متوجہ ہوں گے تو اُن کے اعمال انشاء اللہ مجھ سے بہتر ہوں گے اور قابلِ قبول ہوں گے، اور انشاء اللہ اُن کے طفیل میں اس گنہگار کا بیڑا بھی پار ہو جائے گا ——— بس یہ خود غرضی ہے جو ہم سے اور ہمارے دوستوں سے یہ کوشش کراتی ہے، اور اس راستہ میں کبھی کبھی ہم اپنے دوستوں سے اصرار بھی کر بیٹھتے ہیں جس سے ہمارے بہت سے احباب ہم نے سنا ہو کہ کبھی کبھی آزردہ بھی ہو جاتے ہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ میری اس وقت کی اس گذارش سے آپ حضرات نے ہمارے کام اور ہماری دعوت کو، اور اس سلسلہ میں ہماری پوزیشن کو بھی کسی حد تک سمجھ لیا ہوگا۔ اور اب اس کا حق یہ ہے کہ آپ حضرات اس کام کے کرنے کا اور اس کو جزوِ زندگی بنانے کا فیصلہ فرمائیں۔ دین کی دعوت صرف سُننے کے لئے نہیں ہوتی، اور وہ لوگ دین کی بڑی ناقدری اور خود اپنے پر بڑا ظلم کرتے ہیں جو دین کی باتوں کو صرف سُن لیتے ہیں اور اُن کا حق ادا کرنے کا فیصلہ نہیں کرتے۔

قرآن پاک میں اُن خوش نصیب بندوں کو بشارت دی گئی ہے جو اچھی بات سُن کر اس کو قبول کرتے ہیں، اور اپنا لیتے ہیں۔ ارشاد ہے: فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک الذین ھداھم اللہ واولئک ھم اولوا الالباب ٥۔

رُوحانیت!

از
(شفیق صدیقی جونپوری)

جبیں چمکے جو سجدوں کے نشاں سے — جھکیں قدموں پہ تارے آسماں سے
نگاہِ مردِ مومن کے اشارے — پلٹ دیتے ہیں تقدیروں کے پانسے
طلوعِ صبحِ نو کا منتظر ہوں — سمجھ لوں گا زمین و آسماں سے
مہ و خورشید سے اکتا گیا ہوں — نئی شام و سحر لاؤں کہاں سے
مرتب کرلے آزادی کے لمحے — شہیدوں کی حیاتِ جاوداں سے
مجاہد کی دعائیں اللہ اللہ — اُتر آتی ہیں خود جبیں آسماں سے
وہ دل کی روشنی از فرش تا عرش — حجابات اُٹھ گئے تھے درمیاں سے
جنوں کی سرفرازی کہاں تک — قلندر کام لے قلبِ تپاں سے
ذرا پھر اٹھ کے بے نیازی کے جھونکے — گلے مل جائیں گردِ کارواں سے
بہادر بی بیاں اللہ اکبر — مسلح حُسن بھی تیر و کماں سے
کہیں سلمیٰ کہیں عذرا کی محمل[1]! — وہ منزل کے تقاضے ساربان سے
وہ چلنا لیکے مشکیزہ سر دوش — زمیں گلشن جبینِ خوں چکاں سے
زہے بے شمع خیموں کی تجلّی — اُجالا آتشِ سوزِ نہاں سے

خوشا وقتیکہ پھر ایسی ہو محفل
سبھی ہو خوش نگاہانِ جہاں سے

---

[1] محمل کو میں مؤنث استعمال کرتا ہوں، کیونکہ اس لفظ میں نسوانیت زیادہ ہے۔ ۱۲ (شفیق)

تعارف و تبصرہ

(از- مولانا محمد اسحٰق صاحب سندیلوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

"اسلام کے معاشی نظریے"

از:- جناب یوسف الدین صاحب ایم اے (پی، ایچ، ڈی)

سائز ۲۰×۲۶/۸ دو ضخیم جلدیں- قیمت:- غیر مجلد لعہ ر- مجلد عہ ر

کتابت و طباعت غنیمت

ملنے کا پتہ:- مہتمم دفتر ہفتہ وار "الہدیٰ" نظام شاہی روڈ- حیدر آباد دکن

عالم پر ایک دور "عقل معاد" کی ترقی کا گذرا ہے، اُس دور میں زندگی کی قیمت "معادی" نقطۂ نظر سے لگائی جاتی تھی، اس کے لئے راستہ منتخب کیا جاتا تھا، جو "آخرت" کی بھلائی تک پہونچائے، انتخاب میں غلطی ہونا دوسری بات ہے، لیکن مجموعی طور پر نوع انسانی کی ذہنیت یہی تھی، اور مذاہب و ادیان کو پرکھنے کے لئے یہی کسوٹی تھی- زمانہ بدلا "عقل معاد" بوڑھی ہوئی اور "عقل معاش" نے دورِ شباب میں قدم رکھا، اور ظالم نے اس ناتواں کو اس طرح پامال کیا، کہ غریب کا ٹھکانا صرف اُن "غرباء" کے دماغوں میں رہ گیا جو دنیا میں بہت قلیل اور اس کے ساتھ بالکل اجنبی، پست اور پسماندہ سمجھے جاتے ہیں-

عقل معاش کے اس دور میں دین و مذہب کا معیار ہی بدل گیا، پہلے کسی دین کے حق و باطل ہونے کا فیصلہ اس کے بنیادی عقائد و اصول کی بناء پر کیا جاتا تھا، اب سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ انسان کے معاشی و اجتماعی مشکلات کا کیا حل پیش کرتا ہے یہ معیار نہ عقلاً صحیح ہے اور نہ اسلامی تعلیمات اسے صحیح قرار دیتی ہیں، لیکن بہرکیف یہ ایک واقعہ ہے، خواہ کتنا ہی مضحکہ خیز واقعہ کیوں نہ ہو-

اللہ تعالیٰ سے انسان کا تعلق کمزور کرنے میں غالباً یہود کا حصہ غالب رہا ہے، اسلئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انسانی ذہنیت کی اس پستی میں اسی مغضوب اُمت کا اثر ہو، جس نے "من و سلویٰ" کی آسمانی غذا چھوڑ کر غلہ و ترکاری وغیرہ ارضی و زراعتی غذاؤں کی تمنا کی تھی، اُن کی اس پست ذہنیت کے جراثیم یورپ پہونچے، اور اس کے ذریعہ سے یہ مرض سارے عالم میں پھیل گیا-

اس مرض کا علاج یہ ہے کہ اس معیار کی غلطی واضح کی جائے اور مذاہب کے اس نئے پیمانہ کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیا جائے، مگر مرض کا مادہ اس قدر گہرائی میں پہونچ چکا ہے کہ انسانوں کی غالب اکثریت اس آپریشن کی تاب نہیں لا سکتی، اب دو ہی راستے ہیں پہلا یہ ہے کہ انسانیت کی اس ذہنی بیماری سے چشم پوشی کی جائے اور اس کی دائمی ہلاکت کا تماشہ محض ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھا جائے، اور دوسرا یہ ہے کہ اس کا کوئی اور علاج دریافت کیا جائے۔

عقل عاجز کا ذکر ہی فضول ہے، علاج مل سکتا ہے تو اللہ کے دین ہی میں مل سکتا ہے، وہ اللہ جو حکیم و علیم ہے، جو ارحم الراحمین ہے، جو مایوسی کو اُمید، ناکامی کو کامیابی اور موت کو زندگی سے بدلنے والا ہے، اس کا آخری دین جو قیامت تک کے لئے ہے، اور جو ہر مرض روحانی کا علاج شافی اور ہر زہر کا تریاق ہے اس بیماری کے علاج سے کس طرح پہلوتہی کر سکتا ہے؟۔

ادیانِ عالم میں اسلام ہی وہ دین ہے جس نے "معاش" کو بھی حُسنِ معاد کا ذریعہ بنا دیا ہے، جو کانٹوں کو پھول، لوہے کو سونا، پتھر کو ہیرا، حجاب کو آئینہ اور ظلمت کو روشنی بنا دیتا ہے، اس کی شان یہ ہے۔ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

اسلام کا مقصد بندے کو اللہ سے ملانا اور اسے دائمی و ابدی راحت و آسائش دلانا ہے، مگر اس عالمِ کلفت میں بھی وہ انسان کی راحت کا سامان کر دیتا ہے، اور اس کی اس قدر رعایت کرتا ہے کہ وہ خود نہیں کر سکتا، وہ انسان پر خود انسان سے زیادہ شفیق ہے، اور کیوں نہ ہو آخر ارحم الراحمین کا بھیجا ہوا، اور رحمۃ للعالمین کا لایا ہوا دین ہے، اسکی شان یہی ہونا چاہئے۔

تن اور پیٹ کے مطالبات، مصائبِ عالم کی بنیاد اور مشاہدۂ حق کے لئے آہنی حجابات ہیں، لیکن شریعتِ اسلامیہ کا اعجاز دیکھو کہ اس نے ایسے طریقوں کی تعلیم دی ہے جن پر عمل کرنے سے یہ مصیبتیں مبدل بہ راحت ہو سکتی ہیں، اور یہی حجابات مشاہدۂ حق کے لئے آئینے بن جاتے ہیں، اور اگر عقل و شعور سے ذرا بھی کام لیا جائے تو ایک "عبدالبطن" بھی اس راستہ سے "عبداللہ" بن سکتا ہے۔

اسلام میں سب کچھ موجود ہے، لیکن یہ فریضہ تو اس کے حلقہ بگوشوں کا ہے کہ اسے دنیا کے سامنے پیش کریں "بطنیت" کے اس دور میں اس کی بڑی سخت ضرورت ہے کہ اسلام کے اس پہلو کو بے نقاب کیا جائے "گرفتار بطن" دنیا کو اس راستے سے "باطن" کی طرف بُلایا جائے، اور انھیں بتایا جائے کہ تمہارے معاشی مصائب و مشکلات کا مکمل حل بھی اسی "معادی" راستے پر چلنے سے ہو سکتا ہے جس کا نام اسلام ہے۔

زیرِ نظر کتاب اسی فریضے کو ادا کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے، اگرچہ اس موضوع پر اس سے پیشتر بھی لکھا جا چکا ہے لیکن جہاں تک راقم الحروف کو علم ہے، کم از کم اُردو میں اب تک جتنی کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں یہ کتاب اُن سب سے بہتر اور

بلند پایہ ہے، اور اس کا یہ درجہ محض اضافی ہی نہیں ہے بلکہ فی نفسہٖ بھی یہ اس کی مستحق ہے کہ ایک بلند پایہ، محققانہ، اور اعلیٰ درجہ کی تصنیف کہی جائے۔

کتاب دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں ۳۶۳ صفحات ہیں، اور دوسری جلد میں ۵۶۷ صفحے۔ کاغذ بھی عمدہ ہے، اور لکھائی چھپائی بھی غنیمت ہے۔

پہلی جلد میں مؤلف بعثت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پیشتر عرب کی معاشی و معاشرتی حالت کا ایک تفصیلی خاکہ پیش کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ آج دنیا جن معاشی مسائل سے دوچار ہے وہ سب اُس وقت بھی موجود تھے، اور جاہلی فہم نے اُسوقت بھی ان کو قریب قریب انھیں طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کی تھی جن طریقوں سے آج کی "جاہلی فہم" انھیں حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

زر، سود، تجارت بین الاقوام، اُجرت، سکہ، صنعت و حرفت، لگان، محاصل، مسئلہ قیمت، مسئلہ آبادی، ہنڈی، شراکت، مضاربت، بینک، اور اسی قسم کے دوسرے معاشی معاملات و مسائل، ان پر تاریخی و شرعی نقطۂ نظر سے مفصل روشنی ڈال کر مؤلف نے ملحدین کے اس مغالطہ کے تار و پود بکھیر دیئے ہیں کہ موجودہ دور میں جن معاشی مسائل میں دنیا الجھی ہوئی ہے وہ آغازِ اسلام کے وقت کہاں موجود تھے؟ اسلئے اسلام سے ان کا حل دریافت کرنا (معاذ اللہ) فعلِ عبث ہے۔ کتاب کا یہ حصہ پڑھنے کے بعد یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ آج کے پیچیدہ مسائل جو ہمیں نئے اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں، درحقیقت جزئیات اور مرکبات ہیں، ان کے اُمہات اور بنیادی اصول و بسائط سب کے سب اُس دور میں موجود تھے، جب اسلام کا نور وادیٔ غیر ذی زرع کے مطلع سے ظاہر ہوا تھا۔

آج کا کوئی معاشی مسئلہ درحقیقت نیا نہیں ہے، نہ کوئی ایسا مسئلہ ہے جس کا حل اسلام نے نہ پیش کیا ہو، محض شکل بدل جانے سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدل جاتی، اور حقیقت شناس کے لئے محض شکل کی تبدیلی پریشان کن نہیں ہوسکتی ——— حساب کا کون سا سوال ایسا ہے جو جمع تفریق وضرب و تقسیم کے قاعدوں سے نہ حل ہوسکے؟

فاضل مؤلف نے جو تفصیل کی ہے اس سے صرف اتنا ہی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ معاش کے اُمہات مسائل اس دور میں موجود تھے بلکہ انھوں نے دکھایا ہے کہ اکثر مسائل بالکل اسی شکل و لباس میں پائے جاتے تھے جس میں وہ آج نظر آرہے ہیں۔ پھر انھوں نے تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ اسلام نے انھیں کس طرح حل کیا۔

اسی جلد میں موصوف نے اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب مثلاً یہودیت، نصرانیت، ہندویت، بودھ مت وغیرہ کے معاشی نقطہائے نظر کو بھی اجمالاً پیش کیا ہے تاکہ اسلامی معاشیات کے خط و خال زیادہ نمایاں اور ممتاز ہوسکیں، اور اسلامی نقطۂ نظر کو تقابلی انداز سے نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اسی جلد سے اسلامی نظامِ معاشی کی تفصیل شروع ہوگئی ہے، اور دوسری جلد بھی اسی پر مشتمل ہے۔ معاشیات کے

عام طریق پر فاضل مؤلف نے اسی پوری تفصیل کو فن کے مشہور عنوانات پیدائش دولت، تقسیم، تبادلہ، تنظیم، صرف، مالیات کے ماتحت بیان کیا ہے، ہر باب نہایت مفصل مدلل محققانہ اور قابلِ دید ہے۔

ہر باب میں فاضل مؤلف نے علم کلام اور فقہ دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے، اور جہاں ایک طرف ایک منصف مزاج غیر مسلم جویائے حکمت کے لئے کشش و تاثر کا سامان مہیا کیا ہے وہاں دوسری طرف ایک مسلم تشنۂ علم احکام کے لئے مسائل معاش کا بھی وافر ذخیرہ فراہم کر دیا ہے، اور وہ مسائل و احکام جن کی تلاش و جستجو میں نہ جانے کتنی کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے فاضل مؤلف کی عنایت سے یکجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ گویا کتاب دوا بھی ہے غذا بھی، اور "رنگ و بو" دونوں کی جامع ہونے کے لحاظ سے اس شعر کی مصداق ہے۔ ؎

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ می دارد
برنگ ارباب صورت را بہو ارباب معنی را

ہاں "نسیان" خاصہ انسان ہے، اس کا صدور جناب مؤلف سے اس آیت کی تفسیر میں ہوا ہے:۔

ولا تنس نصیبك من الدنیا　　　اور اپنا حصہ دنیا سے (لینا) نہ بھول۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا سے آخرت کے لئے جو حصہ لینا چاہیئے اُسے نہ بھول، یعنی دنیا کو مزرعۃ الآخرۃ بنا، اور اسے مقصود نہ سمجھ۔ لیکن فاضل مؤلف نے اس کا یہ مفہوم سمجھا ہے کہ آیت میں دنیا کمانے کی ترغیب دیگئی ہے، یہ مطلب سیاق و سباق آیت کے بالکل خلاف ہے۔

اسی طرح فاضل مؤلف کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے، کہ:۔

"لیکن قرآن پاک جس مذہب کو پیش کرتا ہے وہ کھلے لفظوں میں اپنے ماننے والوں پر یہ فریضہ عائد کرتا ہے کہ زمین اور زمین میں جو کچھ ہے جب تک اس کی ہر ہر چیز کے متعلق یہ نہ ثابت کرلیں، کہ وہ انسان کی کس ضرورت میں کام آتی ہے اُن کی آسمانی کتاب کی تفسیر مکمل نہیں ہو سکتی۔"

قرآن مجید کی تفسیر ہرگز اس چیز پر موقوف نہیں ہے کہ اشیاء کے خواص و منافع کو معلوم کیا جائے، اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ صحابۂ کرامؓ نے قرآن مجید کو سمجھا ہی نہیں، حالانکہ یقیناً گروہِ صحابہ اعلم امۃ بکتاب اللہ تھا۔

علاوہ بریں قرآن مجید اور اس کے لائے ہوئے دین کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ انسان کو دنیا کمانے میں لگا دے، اس نے دنیاوی منافع حاصل کرنے کی اجازت ضرور دی ہے، بلکہ بعض صورتوں میں انھیں واجب بھی قرار دیا ہے، لیکن اس کا اصل مقصد ان کی تعلیم و ترغیب نہیں ہے، بلکہ وہ تخلیق انسانی کا اصل مقصد عبادتِ الٰہی کو قرار دیتا ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون　　　میں نے انسانوں اور جنوں کو محض اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے!

ضمناً وہ انسان کے لئے دنیاوی منافع کا سامان بھی مہیا کر دیتا ہے، اگرچہ یہ ضمنی سامان بھی ایسا ہے جس کا عشر عشیر بھی وہ لوگ نہیں حاصل کر سکتے جنھوں نے اس دنیاوی زندگی اور اس کی منفعتوں و لذتوں ہی کو اپنا مقصود نظر بنا لیا ہے۔ مگر کسی حال میں بھی اسلام انھیں مقصود نہیں قرار دیتا ہے، بلکہ ان میں انہماک سے باصرار منع کرتا ہے۔

اسی طرح جلد دوم کے صفحہ ۳۸۷ پر منقولہ احادیث سے جناب مؤلف نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ان احادیث سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ مزدور کو اُجرت کے علاوہ منافع میں بھی شریک کرنا بہتر ہے، لیکن یہ نہیں نکلتا، کہ:۔

"مزدور کو اُجرت دینے کے علاوہ منافع میں بھی شریک کرنا چاہئے"

لفظ "چاہئے" سے بظاہر قانونی وجوب سمجھ میں آتا ہے، لیکن اگر استحباب و فضیلت کا درجہ مراد ہو تو جناب مؤلف کا قول بالکل صحیح ہے۔

جلد ۲ صفحہ ۲۱۴ پر جناب مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا نظریہ "مبادلہ میں قربانی" معاشی نقطہ نظر سے محل نظر ہے، یہاں تک کہ جناب ممدوح کی پیش کردہ مثالوں پر بھی منطبق نہیں ہے۔ عموماً اس قسم کے معاوضات مطالبات فرسودگی شامل ہوتے ہیں۔

لیکن اس قسم کی چند فروگذاشتیں کتاب کی بلند پائگی اور افادیت پر کوئی اثر نہیں ڈالتی ہیں۔ کتاب اعلیٰ درجہ کی محققانہ علمی تالیف ہے، اور ہم علماء کرام سے بھی اس کے مطالعہ کی سفارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔
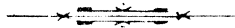
(صفحہ ۴۴ کا بقیہ) میرا حال یہ ہے (جس کو میرے حالات سے واقفیت رکھنے والے سب دوست جانتے ہیں) کہ جماعت اسلامی کے مخالف حلقوں میں جب اس موضوع پر بات کرنے کی نوبت آتی ہے، اور جماعت کے بارہ میں انکی غلط فہمیوں کا ازالہ یا تعدیوں اور بے انصافیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے (جس کو میں دیانتہً اپنے پر حق سمجھتا ہوں) تو وہ حضرات مجھے جماعت اسلامی کا وکیل سمجھتے ہیں۔ اور معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے بعض کے نزدیک تو میں "۵۰ فیصدی سے زیادہ مودودیا" ہوں۔ اور جب میں جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے کسی ایسے صاحب سے گفتگو کرتا ہوں جن کے رویہ میں مجھے غلو محسوس ہوتا ہے تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مجھے جماعت کے "خاص مخالفین" میں سے، اور زیادہ خطرناک دشمن سمجھتے ہیں ——— بعض اوقات اپنے اس حال پر مشہور محدث حافظ عبدالرحمن بن بطہ کی سرگذشت یاد آجاتی ہے جو علامہ شاطبی نے "الاعتصام" کے مقدمہ میں ان ہی کے الفاظ میں نقل کی ہے ——— نیز کبھی کبھی ایسے موقعوں پر حضرت مجدد الف ثانی کا یہ ارشاد بھی زبان پر آجاتا ہے ——— "چہ کنم ایشاں چنانند و ما چنینم یا رب!" والحمد للہ علی کل حال ———

والسلام

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۱۸ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ
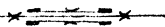
مولانا امین احسن اصلاحی

بنام محمد منظور نعمانی

"پچھلے مہینہ کے الفرقان میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے مضمون کے متعلق جو کچھ اس عاجز نے لکھا تھا مولانا موصوف نے اُس کو ملاحظہ فرما کر ایک خط اس ناچیز کے نام لکھا، میرے اور مولانا کے بہت سے دوستوں کا، بلکہ الفرقان کے عام ناظرین کا بھی حق ہے کہ مولانا کا وہ عنایت نامہ اور اُس کے جواب میں میرا عریضہ اُن کے بھی علم میں آجائے، اسی لئے دونوں خط ذیل میں بالترتیب شائع کئے جا رہے ہیں ——— اُس اللہ کا شکر ہے جس نے "نَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ" کی نعمت سے اس دنیا میں بھی نوازا۔"

برادرِ مکرّم و معظّم! السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

ابھی ابھی ایک دوست نے "الفرقان" کا تازہ پرچہ لاکے دیا، آپ نے میرے جواب پر جو نوٹ لکھا ہے میں نے اُس کو پڑھا، اور اُس میں آپنے جو شکوہ کیا ہے اُس سے بہت متاثر ہوا۔

میں اس کے متعلق اپنے خیالات آپ کو تفصیل سے لکھتا، لیکن اس وقت میں سفر کے لئے بالکل پا بہ رکاب ہوں اور کوئی تفصیلی خط لکھنے یا لکھانے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اس رواروی میں صرف اس قدر عرض کر سکتا ہوں کہ مجھے آپ سے جتنی کچھ بھی بدگمانی ہوئی ہے وہ اُس مضمون کے بعد سے ہوئی ہے جو آپنے فتووں کے سلسلے میں لکھا ہے۔ اُس سے پہلے میرے دل میں آپکے خلاف کوئی بدگمانی نہیں تھی، اور یہ بدگمانی بھی جو ہوئی تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپکے مضمون کے سبب ہوئی۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے آپکے مضمون کو سمجھا نہیں، یا یہ کہ آپنے اپنا مضمون صحیح طور پر لکھا نہیں۔ بہر حال اب میں آپکے اس تازہ مضمون کے بعد اس بات کو کسی طرح سے جائز نہیں سمجھتا کہ آپ سے بدگمان رہوں، اسلئے میں آپ پر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اب میرا دل آپ سے بحمد اللہ صاف ہے، اور میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ بھی میرے تمام الفاظ کی تلخیوں کو فراموش اور مجھے معاف کر کے مجھ سے اپنے دل کو صاف کر لیں۔ اب میرے اور آپکے درمیان جو اختلاف ہے وہ محض اصولی ہے۔ براہِ کرم آپ اپنے اور میرے دونوں کے مضمون کو دوبارہ پڑھ کر تفصیل کیساتھ یہ بتائیں کہ آپنے جو باتیں لکھی ہیں اُن کا اصلی مطلب کیا ہے؟ اور میں نے اُن کے مضمرات کھولنے میں کیا غلطی کی ہے؟ میں یہ اسلئے لکھ رہا ہوں کہ میں آپکے مشوروں کا مطلب سمجھنا چاہتا ہوں۔ یوں تو میں ایک ایک چیز کے متعلق آپ کی صحیح توجیہ معلوم کرنا چاہتا ہوں لیکن خصوصیت کیساتھ اُن باتوں کی توضیح و وضاحت فرمائیے جن کی نسبت آپنے خاص طور پر شکایت کی ہے کہ میں نے اُن کا مطلب آپکے منشاء کے بالکل خلاف

سمجھا ہے، یعنی — (۱) اکرام مسلم سے آپ کی کیا مراد ہے؟ ۔ (۲) مولنا مودودی کی تصنیفات اور جماعت اسلامی کے لٹریچر کی نظر ثانی سے متعلق آپ کی تجویز کا اصل منشاء کیا ہے؟ ۔ (۳) "تجلی" کے مضمون کی کن باتوں سے متعلق جماعت کے ذمہ داروں کی پوزیشن کی آپ وضاحت چاہتے ہیں؟ ۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ یہ اور اس طرح کے دوسرے تمام مسائل کو جو میرے اور آپکے درمیان زیر بحث آئے ہیں (اور آپ کا خیال ہے کہ میں نے اُن کے بارے میں آپ کا منشاء سمجھنے میں غلطیاں کی ہیں) از سر نو واضح کرنے کی کوشش کریں گے ۔ ہمارا مقصود صرف اس طویل مضمون کے لکھنے سے بحث کو اس طرح سے ختم کر دینا نہیں تھا، بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ اگر کوئی مفید مشورہ ملے تو ہم اُس سے فائدہ اٹھائیں ۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔ والسلام

امین احسن اصلاحی

بقلم: خلیل حامدی — ۷ رجنوری ۱۹۵۲ء

محمد منظور نعمانی :— بخدمت مولنا امین احسن اصلاحی

محترم بھائی! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

گرامی نامہ موصول ہوا، اُس اللہ کا شکر ہے جس نے آپکے دل کو میری طرف سے صاف کیا، واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس سے بڑا رنج اور دکھ تھا کہ ایک دوسرے کو اتنا جاننے کے باوجود نیت اور ارادہ کے بارے میں ہم باہم اتنے بدگمان ہو جائیں — اللہ آپ کو ہر رنج و کلفت سے محفوظ رکھے، آپنے یہ خط لکھ کر میرے دل کی بڑی تکلیف دُور کر دی — میں تو یہ خیال کر بیٹھا تھا کہ اتنی سخت قسم کی بدگمانیاں آسانی سے اور جلدی دُور نہ ہو سکیں گی، اسی لئے اس سلسلہ میں میں نے آپ کو کوئی نجی خط نہیں لکھا، ہاں یہ ارادہ تھا کہ جب یہ قضیہ اس طرح ختم ہو جائے گا کہ نہ آپ کو میرے کسی "جواب" کا انتظار رہے گا اور نہ مجھے آپکے کسی "جواب الجواب" کا، اس وقت میں آپسے کچھ نجی طور پر بھی عرض کرونگا لیکن الحمدللہ آپکے اس عنایت نامہ نے میرے اس اندازہ کو غلط کر دیا، اور مجھے خوشی ہے کہ وہ غلط ہو گیا ۔

اب میں اس سلسلہ کے بعض احساسات بے تکلف عرض کرنا چاہتا ہوں — "ترجمان" میں آپ کا جواب پڑھ کر اپنے مضمون کے متعلق میری رائے صرف یہ ہوئی تھی کہ مجھے اپنی بات آپ حضرات سے جس طرح کہنی چاہئے تھی اُس طرح میں کہہ نہیں سکا، اسلئے اس کا جو ردِ عمل ہوا، اور آپنے جس انداز میں اس کا جواب دیا اس کی بہت کچھ ذمہ داری میری اس تقصیر پر بھی ہے — لیکن پچھلے ہفتہ "زندگی" میں اپنے مضمون پر جب مولنا ابو اللیث صاحب کا تبصرہ پڑھا تو میری رائے یہ ہو گئی کہ سرے سے اس مضمون کا لکھنا ہی غلط ہوا، جب کبھی بھی موقع میسر ہوتا یہ باتیں آپ حضرات سے مجھے زبانی ہی عرض کرنی چاہئے تھیں — اس واقعہ سے پھر اس کا تازہ تجربہ ہوا کہ قلم سے لکھے ہوئے الفاظ آدمی کی پوری قائمقامی اور اُس کے دل کی صحیح ترجمانی خاص کر اس قسم کے نازک مقاصد میں نہیں کر سکتے ۔ مجھے

اب بھی یقین ہے کہ اگر میں یہی باتیں اسی انداز میں آپ حضرات سے زبانی عرض کرتا تو اس کا ردعمل ہرگز یہ نہ ہوتا، اور اپنے مقصد میں میں اس طرح سو فیصدی ناکام نہ رہتا ——— تحریر بیچاری (اور وہ بھی مجھ جیسے اناڑی کی تحریر) صرف الفاظ ہی پہنچا سکتی ہے، لیکن محبت یا عداوت اور خیر خواہی یا بدخواہی کا جو جذبہ ان الفاظ کو لکھواتا ہے وہ تحریر میں نہیں پڑھا جا سکتا، مگر بات کرتے وقت آنکھوں کے ڈوروں میں اور پیشانی کی لکیروں میں وہ خوب پڑھ لیا جاتا ہے، اور آواز میں بھی اس کی شیرینی یا تلخی محسوس کر لی جاتی ہے ——— پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ محبّت اور خیر خواہی کے تحت اس قسم کی چیزیں لکھنے کا چونکہ رواج نہیں ہے اور عام طور سے مخالفت اور بدخواہی کے تحت ہی اس دنیا میں کسی کی غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے (خاصکر مضامین کی شکل میں) اسلئے بھی اگر میرے اس مضمون کو جماعت اسلامی کی مخالفت میں لکھے جانے والے مضامین کے سلسلہ ہی کی ایک کڑی سمجھ لیا گیا تو اب میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس کا ذمہ دار مجھے اپنے ہی کو گردانا چاہئے۔ اسلئے اب میرا احساس اور تاثر یہ ہے کہ سرے سے اس مضمون کا لکھنا ہی ایک غلط کام ہوا، اور جس غرض سے وہ لکھا گیا تھا اُس مقصد کو شاید اس سے اور زیادہ نقصان پہونچ گیا ——— اشاعت کے بعد مضامین کی واپسی کی اگر کوئی ایسی تدبیر ہوتی جس سے اُس کے اثرات ذہنوں سے دھل جایا کرتے تو میں ضرور اس موقع پر اس کو استعمال کرتا ——— بہرحال اب میں نے یہ طے کیا ہے کہ اس سلسلہ میں آپ کو کاغذ پر میں کچھ نہیں لکھوں گا، اللہ تعالیٰ جب بھی ملاقات میسر فرمائے گا انشاء اللہ زبانی ہی عرض کروں گا، اسی لئے اُن امور کے متعلق بھی اب میں کوئی حرف لکھنا نہیں چاہتا جن کی آپ نے مجھ سے وضاحت چاہی ہے ——— بعض خاص ضرورتوں سے چند روز کے لئے عنقریب ہی اُدھر آنے کا ارادہ بھی کر رہا ہوں، اگر کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی تو اُمید ہے کہ انشاء اللہ اسی مہینے یا اگلے مہینے یہ سفر کر سکوں گا[ع] اور جو کچھ عرض کرنا ہوگا اب اُسی وقت عرض کروں گا ——— ہاں ایک بات اور بھی صاف کر دوں، مولانا ابو اللیث صاحب نے نہ معلوم کس غلط فہمی کی بناء پر میرے متعلق یہ لکھ دیا ہے کہ میں اس سے پہلے کسی وقت پاکستان گیا تھا، میرا خیال ہے کہ آپ جیسے دوستوں نے اگر اُسے پڑھا ہوگا تو دل میں ضرور یہ خیال گذرا ہوگا کہ میں وہاں گیا اور آپ حضرات سے ملنا درکنار اپنی آمد کی خبر تک آپ کو نہ دی، اور اس کو آپ نے بے تعلقی اور کشیدگی پر محمول کیا ہوگا، اسلئے میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا موصوف کو اس بارہ میں کوئی خاص غلط فہمی ہو گئی ہے، ورنہ میں نے تو قیام پاکستان سے بہت پہلے سے بھی اُدھر کا کوئی سفر نہیں کیا ہے، یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ میں اُدھر آتا اور آپ حضرات سے ملنے کی کوشش نہ کرتا۔

آخر میں دو باتیں اور بے تکلف عرض کرنا چاہتا ہوں:۔

دل میں آپ کی، مولانا کی، مولانا مسعود عالم کی، غازی صاحب کی، اور اسی طرح آپ کے اکثر دوسرے متعارف رفقاء کی بالکل وہی جگہ ہے جو کبھی پہلے تھی، آپ کے مضمون کے بعد بھی اس میں کوئی فرق نہیں آسکا ہے۔

جماعت کے کام اور آپ حضرات کے طرز عمل کے متعلق اپنی اس رائے کے باوجود کہ اس میں کچھ چیزیں اصلاح طلب ہیں، میں جماعت کی دعوت اور اس کے کام کو دینی دعوت و خدمت سمجھتا ہوں اور موجودہ حال میں بھی اس میں خیر کو غالب یقین کرتا ہوں اور خیر ہی کے غلبہ کی مستقبل کے بارہ میں بھی توقع رکھتا ہوں، اسلئے اس کی مخالفت اور بدخواہی اور اس کو نقصان پہونچانے والی کوئی کارروائی اپنے لئے بالکل جائز نہیں سمجھتا۔

(بقیہ ص ۴۵ پر)

ع انشاء اللہ ۱۳ فروری تک کراچی پہونچ جاؤنگا ۱۲

ہندوستان اور پاکستان سے
سالانہ چندہ :- ۵ر
فی کاپی :- ۸ر

جلد (۱۹) بابتہ ماہ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۷۱ ہجری نمبر (۵)

سُرخ پنسل کا نشان! اِس بات کی علامت ہے کہ جناب کی مُدّتِ خریداری اِس شمارہ پر ختم ہوگئی ہے، لہٰذا اپنا چندہ برائے ایک سال مبلغ (۵ر) بذریعۂ منی آرڈر ارسال فرماکر مشکور فرمائیے، اگر ۵ر اپریل سنہ ۱۹۵۲ء تک جناب کا چندہ وصول نہ ہوا، اور نہ کوئی اطلاع آئی، تو اگلا پرچہ وی، پی بھیجا جائے گا، جس کا وصول کرنا جناب کا اخلاقی فریضہ ہوگا ——— پاکستان کے حضرات اپنا چندہ حسبِ معمول "جناب حاجی عبد الجبار صاحب ایس، جے، اینڈ جی فضل الٰہی کمپنی ساؤتھ نیپیر روڈ کراچی پاکستان" کے پتہ پر ارسال فرماکر رسید ہمارے پاس ارسال فرمادیں، اگر آپ کے چندہ کی اطلاع ۵ر مارچ سنہ ۱۹۵۲ء تک موصول نہیں ہوئی، تو "ادارہ اصلاح و تبلیغ۔ لاہور" سے آپکی خدمت میں "**الفرقان**" بذریعہ وی، پی ارسال کیا جائے گا۔ والسلام۔

ناظم۔ الفرقان۔ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

باسمہٖ سبحانہٗ　　　　حامداً و مسلماً

نگاہِ اوّلیں

ہمارے صوبہ کے وزیر تعلیم سمپورنا نندجی نے حالیہ انتخابات کے سلسلے میں مسلمانانِ ہند کے رویہ کے متعلق جو بیان دیا ہے اُس پر مسلم پریس کا تبصرہ آپ پڑھ چکے ہیں، اُس تبصرے میں پُر زور طریقے پر اس بیان کو غلط اور ایک سفید جھوٹ قرار دیا گیا ہے، اور دلائل کی روشنی میں اس حقیقت کو ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے عام طور پر کانگریس کا ساتھ دیا ہے اور اس کے اُمیدواروں کو کامیاب بنانے میں بڑا حصہ انھیں کا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ پر بالکل سچ اور واجب التسلیم ہے، لیکن ہم اسی بات کو دُہرانے کے بجائے اِن صفحات میں ایک دوسرے انداز سے اس بیان کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

سمپورنا نندجی پہلے تو اس بات پر اظہار ناراضی فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے بہت سی جگہوں پر کانگریس کے بجائے کمیونسٹوں کی مدد کی، لیکن پھر اگلا ہی جملہ ایسا کہتے ہیں کہ جس سے اُن کا یہ اعتراض بالکل مہمل اور لغو ٹھہرتا ہے یعنی ان کا یہ فرمانا کہ "اُن کو اظہار رائے کی آزادی ہے" چنانچہ اپنی اس غلطی کو محسوس کر کے وہ پینترا بدلتے ہیں اور فرماتے ہیں:-

"لیکن جہاں اُنھوں نے ایک طرف کانگریس کو نیچے گرانے کا کام کیا ہے وہاں دوسری طرف انھوں نے مسلمان اُمیدواروں کی مدد کی، اس سے اُن کے رویہ پر شک ہونا ایک قدرتی بات ہے، مدراس کی مسلم لیگ کے کارناموں نے اس شک کو اور بھی بڑھا دیا ہے، یہ شک ہی نہیں بلکہ کافی خطرے کی بات ہے، اور مسلمانوں کے بارے میں جو بے اعتمادی سو سی گئی تھی وہ جگہ جگہ پھر سے جاگ گئی ہے"

وہ فرماتے ہیں: "دوسری طرف انھوں نے مسلمان اُمیدواروں کی مدد کی" مگر کیا اُن سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ کون سے مسلمان اُمیدواروں کی مدد کی، آزاد اُمیدواروں، سوشلسٹ پارٹی، یا کے ایم پی پی کے اُمیدواروں کی، یا کانگریس کے اُمیدواروں کی؟ - یُوپی، و بہار جیسے صوبے جن میں مسلمانوں کے ووٹ کوئی فیصلہ کن اثر ڈال سکتے تھے، ان صوبوں میں کتنے آزاد مسلمان اُمیدوار کامیاب ہوئے، کتنے کانگریس کی مخالف پارٹیوں کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے اور کتنے کانگریس کے ٹکٹ پر -؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ان سوالات کی روشنی میں کامیاب اُمیدواروں کی لسٹ دیکھنے پر

سمپورنانند جی کی گردن اپنی غلط بیانی پر شرم سے جھک جانی چاہیئے ۔

کانگریس کے حریف مسلم اُمیدواروں کی سو فی صدی ناکامی کا سبب اگر یہ نہیں ہے کہ خود مسلمانوں نے ہی اُن کو ووٹ بہت کم دیئے، تو پھر کیا کوئی "شعبدہ بازی" یا "جادوگری" یا "ہاتھ کی صفائی" ہے۔ ظاہر ہے کہ خود ان کے صوبۂ یُو، پی میں تو کم از کم کانگریس غیر مسلم ووٹروں کی مدد سے جیتی نہیں ہے، پھر اگر یہ بھی تسلیم نہ کیا جائے کہ یہ شاندار کامیابی کانگریس کو مسلم ووٹروں کی مدد سے ہوئی ہے تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ یہ کامیابی کسی "زندہ کرامات" کی رہینِ منت ہے، جسے ہو اس نظر بندی اور ہاتھ کی صفائی کی ـــ! خیر! ہمیں تو اس سلسلہ میں کہنا یہ تھا کہ بالفرض اگر مسلمانوں نے مسلم اُمیدواروں کو معتدبہ تعداد میں ووٹ دیئے بھی، تو یہ بات قابلِ اعتراض کیونکر ہے؟ جب آپ ہی لوگوں نے یہ اجازت دی کہ جس کا جی چاہے الیکشن میں کھڑا ہو جائے، اور جس کا جس کو جی چاہے ووٹ دے، پھر آپ کسی کو ٹوکنے کا کیا حق رکھتے ہیں کہ تم نے فلاں کو ووٹ کیوں دیا، اور فلاں کو ووٹ کیوں نہیں دیا۔ ایسی صورت میں تو مسلمان مسلمان کو ووٹ دے تب کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں، اور ہندو ہندو کو ووٹ دے تب کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ ہاں ہندوستان کے خاص حالات کے ماتحت اس بات میں ایک شکل قابلِ اعتراض ہونے کی نکل سکتی ہے، وہ یہ کہ مسلم ووٹرس کسی ایسی پارٹی کے اُمیدوار کو ووٹ دیں جو فرقہ وارانہ نظریات رکھتی ہو، انھیں نظریات کے اعلان کے ساتھ الیکشن کے میدان میں اُتری ہو، اور انھیں نظریات پر ووٹ مانگتی ہو، یا اسی قسم کے آزاد اُمیدوار کو ووٹ دیں، یا اسی طرح ہندو ووٹرس اگر اسی قسم کی پارٹی، یا اسی قسم کے آزاد اُمیدوار کو سپورٹ کریں، تب ان کے رویہ پر اعتراض کیا جا سکتا ہے، اور اسے وطن دشمنی یا وطن کے مفاد سے غداری پر محمول کیا جا سکتا ہے، اسکے علاوہ اور کوئی صورت نہیں ہے ۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں نے "کانگریس کی مخالفت" کے ساتھ ساتھ اس جرم کا بھی ارتکاب کیا ہے یا نہیں؟ سو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی کوئی فرقہ وارانہ تنظیم مدراس کے سوا ہندوستان بھر میں کہیں ہے ہی نہیں، الیکشن میں حصہ لینا تو بعد کی بات ہے، اب رہ گیا سوال اس قماش کے آزاد اُمیدواروں کا، تو مناسب یہ ہے کہ انکے متعلق خود سمپورنانند جی ہی سے دریافت کر لیا جائے کہ ایسے مسلم اُمیدواروں کی تعداد کیا تھی، اور اُن غریبوں کو ووٹ کتنے ملے؟ ـــ

یہ تو ہے اُن مسلمانوں کی پوزیشن جن کے بارے میں سمپورنانند جی کی سوئی ہوئی بے اعتمادی پھر سے جاگ اٹھی ہے، اب اگر امان جاں ملے تو غیر مسلم ووٹروں کی پوزیشن کو بھی اسی طرح بے پردہ کرنے کی گستاخی کی جائے، کیونکہ سمپورنانند جی کے یکطرفہ بیان سے ہمیں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ انھوں نے "مچھر چھاننے اور اونٹ نگلنے" کی معصوم حرکت کا ارتکاب فرمایا ہے ۔

اس سلسلہ میں ہمیں غیر مسلم آزاد اُمیدواروں تک جانے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ خیر سے غیر مسلموں کی متعدد فرقہ پرست پارٹیوں نے الیکشن میں حصہ لیا ہے، اور اپنے فرقہ پرستانہ نظریات و مقاصد کے اعلان کیساتھ لیا ہے، ان میں سب سے زیادہ نمایاں جن سنگھ تھی، بیشک وہ ہار گئی اور یوپی میں تو بہت ہی بُری طرح ہاری، مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ عام طور پر ہندوؤں نے اُسے اوپر اٹھانے اور کانگریس کو نیچے گرانے کی کوشش میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی، چنانچہ جن سنگھ کی ضمانتیں بہت کم ضبط ہوئیں، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، اگر مسلمان اپنا وزن کانگریس کے پلڑے میں نہ ڈال دیتے تو جن سنگھ کو یقیناً ایسی شکست کا منھ دیکھنا نہ پڑتا۔ ؎

ہم الزام اُنکو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

بات بلاارادہ طویل ہوگئی، اور کچھ باتیں جن سے ہمیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی سمپورنا نند جی کی دھاندلی کی وجہ سے بیساختہ قلم پر آگئیں، ورنہ ہمیں جو بات کہنی تھی وہ تو صرف اتنی تھی کہ جب یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا عام رجحان الیکشن میں غیر فرقہ وارانہ رہا ہے تو پھر چاہے انھوں نے کانگریس کو ایک ووٹ بھی نہ دیا ہو، اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرنا اور ان کی ملکی وفاداری پر حرفِ بے اعتمادی لانا ان کے خلاف ایک بہت ہی اچھے قسم کا حربہ ہے، جس کو کوئی وطن دوست نہیں خالص مسلم دشمن ذہن ہی تراش سکتا ہے، اور بالفرض اس بیان میں کوئی سچائی اگر ہو بھی تب بھی ایک ایسے شخص کو تو کسی کی آنکھ کے تنکے کی طرف اشارہ کرنے کا حق بھی نہیں ہے، جسے خود اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہ آتا ہو۔

ہمیں تو کچھ ایسا خیال ہو رہا ہے کہ بات وات کچھ نہیں ہے، شاید بنارس کے مسلمان سمپورنا نند جی کی مخالفت کی "غلطی" کر بیٹھے ہیں، بس یہ اُنکی "غلطی" کی سزا ہے جو سارے مسلمانوں کو دی جارہی ہے، دیکھئے اُن کے بیان کا پہلا ہی جملہ یعنی (بہت سی جگھوں پر مسلمانوں نے ..... کمیونسٹ پارٹی جیسے قومیت دشمن گروہ کی حمایت کی) ہمارے خیال کا جائز قرینہ ہے یا نہیں؟ کیونکہ یہ بات تو عام طور پر معلوم ہی ہے کہ سمپورنا نند جی کا حریف اُمیدوار کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتا تھا، لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے کہ اس جملہ کے لکھنے کے بعد سمپورنا نند جی کو محسوس ہوا کہ اس الزام میں کوئی وزن نہیں ہے، کیونکہ اظہار رائے کی آزادی کا حق تو ان کے لئے بھی ہم مان چکے ہیں، پھر کیا ہو۔؟ یہ "خطا" تو ایسی نہیں ہے جس پر بلا سزا چھوڑ دیا ہے! اچھا تو پھر کوئی اور بہانہ تلاش کیا جائے! اس ذہنی ردو قدح کے بعد ان کا ذہن "مدراس مسلم لیگ کے کارناموں" کی طرف منتقل ہوا، بس پھر کیا تھا اس علمہ لنگ کا سہارا لیکر نہایت اطمینان سے مسلمانوں کی ملکی وفاداری پر "بے اعتمادی" کا تیر چلا دیا، اور اس طرح اپنے غصہ کو تسکین دے لی۔

معارف الاحادیث

اللہ کے حضور میں پیشی اور اعمال کی جانچ

(۷۲) عن عدی بن حاتم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مامنکم من احد الا سیکلمہ ربہ لیس بینہ وبینہ ترجمان ولا حجاب یحجبہ فینظر ایمن منہ فلا یری الا ما قدم من عملہ وینظر اشام منہ فلا یری الا ما قدم وینظر بین یدیہ فلا یری الا النار تلقاء وجہہ فاتقوا النار ولو بشق تمرۃ۔ (بخاری ومسلم)

(ترجمہ) عدی بن حاتم سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (قیامت میں) تم میں سے ہر شخص سے اس کا پروردگار اس طرح بلا واسطہ اور دو بدو کلام فرمائے گا کہ نہ درمیان میں کوئی ترجمان ہوگا نہ کوئی پردہ حائل ہوگا (اس وقت بندہ کی یہ کیفیت ہوگی کہ وہ حیرت اور بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھے گا) پس جب نظر کرے گا اپنی داہنی جانب تو سوائے اپنے اعمال کے کچھ نہ دیکھے گا۔ اور ایسے ہی جب نظر کرے گا بائیں جانب تو سوائے اپنے اعمال کے کچھ اس کو نظر نہ آئے گا۔ اور جب سامنے نظر دوڑائے گا تو اپنے روبرو آگ ہی آگ دیکھے گا۔ پس اے لوگو دوزخ کی اس آگ سے بچو، اگرچہ خشک کھجور کے ایک ٹکڑے ہی کے ذریعہ اس سے بچنے کی فکر کرو۔ (یعنی آتش دوزخ سے بچنے کے لیے صدقہ کرو، اور اگر کھجور کے ایک خشک ٹکڑے کے سوا تمھیں کچھ میسر نہ ہو تو راہ خدا میں وہی دے کر دوزخ سے بچنے کی فکر کرو)

(تشریح) قرآن مجید میں اور احادیث میں بھی جہاں جہاں قیامت کے حساب کتاب اور وہاں کے ہولناک منظروں کا اور دوزخ کے لرزہ خیز عذابوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس لیے ہے کہ بندے اس سے خبردار ہوکر اپنے کو اس سے بچانے کی فکر کریں۔ اس حدیث میں تو آخر میں صراحت کے ساتھ اس مقصد کو بیان بھی فرمادیا گیا ہے، لیکن جن حدیثوں میں اس مقصد کی تصریح نہ بھی کی گئی ہو ان کا مقصد بھی یہی سمجھنا چاہیے، اور اس

کیا ہوگا وہ اس دن روسیاہ ہوں گے اور وہاں کسی کی مکاری اور عیاری بالکل پردہ پوشی نہ کرسکے گی۔

---

(۷۴) عن ابن عمر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اللّٰہ یدنی المومن فیضع علیہ کنفہ ویسترہ فیقول أتعرف ذنب کذا أتعرف ذنب کذا فیقول نعم اے رب! حتیٰ قررہ بذنوبہ ورای فی نفسہ انّہ قد ھلک قال سترتھا لک فی الدنیا وانا اغفرھا لک الیوم فیعطیٰ کتاب حسناتہ واما الکفار والمنافقون فینادیٰ بھم علیٰ رؤس الخلائق ھٰؤلاء الذین کذبوا علیٰ ربھم الا لعنۃ اللّٰہ علی الظٰلمین۔

(بخاری ومسلم)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ ابن عمر سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قیامت میں اللہ تعالیٰ ایمان والے اپنے بندے کو (اپنی رحمت سے) قریب کرے گا اور اس پر اپنا خاص پردہ ڈالے گا اور دوسروں سے اس کو پردہ میں کرلے گا۔ پھر اس سے پوچھے گا کیا تو پہچانتا ہے فلاں گناہ، فلاں گناہ! (یعنی کیا تجھے یاد ہے کہ تو نے یہ یہ گناہ کیے تھے؟) وہ عرض کرے گا ہاں اے پروردگار مجھے یاد ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے سارے گناہوں کا اس سے اقرار کرالے گا، اور وہ اپنے جی میں خیال کرے گا کہ بس تو ہلاک ہوا (یعنی اس کو خیال ہوگا کہ جب اتنے میرے گناہ ہیں تو اب میں کیسے چھٹکارا پاسکوں گا) پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے دنیا میں تیرے ان گناہوں کو چھپایا تھا اور آج میں ان کو بخشتا ہوں اور معافی دیتا ہوں، پھر اس کا نیکیوں والا اعمال نامہ اس کے حوالے کردیا جائے گا۔ (یعنی اہل محشر کے سامنے صرف نیکیوں والا ہی اعمال نامہ آئے گا۔ اور گناہوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ پردہ ہی پردہ میں ختم کردے گا) لیکن اہل کفر اور منافقین کا معاملہ یہ ہوگا کہ ان کے متعلق برسر عام پکارا جائے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے اللہ پر جھوٹی جھوٹی باتیں باندھیں (یعنی غلط اور بے اصل خیالات کو اللہ کی طرف نسبت دے کر اپنا دین و مذہب بنایا) خبردار اللہ کی لعنت ہو ایسے ظالموں پر۔

(۷۵) عن عائشۃ انھا ذکرت النار فبکت فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما یبکیک قالت ذکرت النار فبکیت فھل تذکرون اھلیکم یوم القیٰمۃ؟ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اما فی ثلٰثۃ مواطن فلا یذکر احدٌ احداً عند المیزان حتیٰ یعلم ایخف میزانہ ام یثقل وعند الکتاب حتیٰ یقال ھاؤم اقرؤا کتابیہ حتیٰ یعلم این یقع کتابہٗ فی یمینہ ام فی شمالہ من وراءِ ظھرہ وعند الصراط اذا وضع بین ظھری جھنم۔ (ابوداؤد)

(ترجمہ) حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے روایت ہے کہ انھیں ایک دفعہ دوزخ کا خیال آیا اور وہ رونے لگیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تمھیں کس چیز نے رلایا؟ عرض کیا مجھے دوزخ یاد آئی اور اسی کے خوف نے مجھے رلایا ہے، تو کیا آپ قیامت کے دن اپنے گھر والوں کو یاد رکھیں گے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین جگہ تو کوئی کسی کو یاد نہیں کرے گا (اور کسی کی خبر نہیں لے گا) ایکؔ وزن اعمال کے وقت جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو جائے کہ اس کے اعمال کا وزن ہلکا ہو یا بھاری، اور دوسرے اعمالناموں کے ملنے کے وقت جبکہ مرد مومن داہنے ہاتھ میں اعمالنامہ پاکر خوشی خوشی دوسرے سے کہے گا کہ پڑھو میرا اعمالنامہ یہاں تک کہ معلوم ہو جائے کہ کس ہاتھ میں دیا جاتا ہے اس کا اعمالنامہ آیا داہنے ہاتھ میں یا بائیں ہاتھ میں پیچھے کی جانب سے۔ اور تیسرے پل صراط پر جبکہ وہ رکھی جائے گی جہنم کے اوپر (اور حکم دیا جائے گا سب کو اس پر سے گزرنے کا)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ یہ تین وقت ایسے نفسی نفسی کے ہوں گے کہ ہر ایک کو صرف اپنی فکر ہوگی اور کوئی کسی دوسرے کی مدد نہ کر سکے گا۔ ایکؔ وزن اعمال کے وقت جب تک کہ نتیجہ معلوم نہ ہو جائے گا، اور دوسرے وہ وقت جب لوگ اپنے اپنے اعمالناموں کے منتظر ہوں گے اور ہر ایک اس فکر میں غرق ہوگا کہ اس کا اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں دیا جاتا ہے یا بائیں ہاتھ میں دیا جاتا ہے وہ مغفرت اور رحمت کا مستحق قرار پاتا ہے یا لعنت اور عذاب کا ــــ اور تیسرے اس وقت جبکہ صراط کا پل جہنم پر لگا دیا جائے گا اور اس پر سے گزرنے کا حکم ہوگا ــــ تو یہ تین وقت ایسے نفسی نفسی کے ہوں گے کہ ہر ایک اپنی ہی فکر میں ڈوبا ہوگا۔

اس حدیث کی روح اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا منشا بس یہی ہے کہ ہر شخص آخرت کی فکر کرے اور کوئی کسی دوسرے کے بھروسہ نہ رہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیوانی زندگی اور ایمانی زندگی

(مدیر الفرقان کی ایک تقریر جو ۱۴ر فروری کو کراچی (پاکستان) کے ایک تبلیغی اجتماع میں کی گئی)

الحمد للہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقد جاءت رسل ربنا بالحق۔ صلوات اللہ تعالیٰ علیھم وعلیٰ کل من اتبعھم باحسان الیٰ یوم الدین

بزرگو، دوستو اور دینی بھائیو!

انسانوں کے لیے زندگی گزارنے کے دو راستے ہیں یا یوں کہیے کہ زندگی کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ صرف دنیا کی لذتوں کو اور یہاں کی منفعتوں اور مصلحتوں کو سامنے رکھا جائے اور جس کام میں دنیوی منفعت نظر آئے اور جس کام کے کرنے میں لذت اور خوشی حاصل ہو اس کو کیا جائے اور آخرت کی یعنی مرنے کے بعد کے نتائج کی کوئی فکر نہ کی جائے، یہ زندگی کا حیوانی طریقہ ہو، بلکہ اس کا نام ہی آپ "حیوانی زندگی" رکھ لیجیے۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہو کہ اس دنیا کے بعد آخرت کے بارے میں اور انسانی اعمال کے اخروی نتائج کے متعلق انبیاء علیہم السلام نے جو کچھ بتلایا ہو اس پر ایمان لاتے ہوئے اور اس کو ایک اٹل حقیقت سمجھتے ہوئے اور اس کی فکر کرتے ہوئے زندگی گزاری جائے۔ یعنی جو کام اور جو چیزیں آخرت کی زندگی کو برباد کرنے والی اور آدمی کو دوزخ میں پہونچانے والی معلوم ہوئی ہیں ان سے بچا جائے۔ اور جن چیزوں کے متعلق انبیاء علیہم السلام نے بتلایا ہو کہ یہ اللہ کو راضی کرنے والی اور انسان کو جنت میں پہونچانے والی ہیں ان کو کیا جائے اور اپنی زندگی کا جزو بنایا جائے، اس دوسری قسم کی زندگی کا نام آپ "ایمانی زندگی" رکھ لیجیے ——— بہرحال زندگی کی یہی دو قسمیں ہیں۔ ایک حیوانی زندگی، دوسری ایمانی زندگی۔

حیوانی زندگی گزارنے والے انسان اپنے کو اللہ کے احکامات کا پابند نہیں بناتے بلکہ جس کام میں انکو ذاتی فائدہ نظر آئے اور جس چیز میں ان کے نفس کو لذت ملے وہ اس کو بے دریغ کرتے ہیں۔ نہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ مرنے کے بعد والی زندگی میں اس کا انجام کیا ہوگا اور نہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے اس طرز عمل کا اللہ

کی دوسری مخلوق پر کیا اثر پڑے گا۔ انھیں دوسرے انسانوں کو مٹا کر اپنی زندگی بنانے میں کوئی دریغ نہیں ہوتا
اس کے برخلاف ایمانی زندگی گزارنے والوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے بتلائے ہوئے
آخرتی نتیجوں کو سامنے رکھ کر اپنی لذتوں اور خواہشوں کو چھوڑ کر اللہ کے احکام پر چلتے ہیں اور ہر ایسا کام کرنے
سے بچتے ہیں جس میں اللہ کے دوسرے بندوں کا نقصان ہو اور ان کو کوئی تکلیف پہونچے۔ یعنی وہ دوسروں
کو تکلیفوں اور نقصانوں سے بچانے کے لیے خود تکلیفیں اٹھاتے ہیں اور نقصانات برداشت کرتے ہیں۔

پھر چونکہ انسان کی طبیعت ہی لذتوں اور خواہشوں سے بھری ہوئی ہے اور انسان سے باہر کا ماحول بھی عام طور سے
ایسا ہی ہوتا ہے جو آدمی کو لذتوں اور منفعت کی طرف کھینچتا ہے اور آخرت کے مسئلے کو بھلا کر اس سے بے فکر بناتا ہے
اس لیے عام طور سے انسان ہر زمانہ میں حیوانی زندگی ہی کی طرف دوڑتے ہیں۔ یعنی انسان کے اندر حیوانی زندگی
کی طرف اس کو کھینچنے والی نہایت طاقتور طرح طرح کی خواہشات بھری ہوئی ہیں۔ اچھا کھانے کی خواہش، اچھا
پہننے کی خواہش، اچھی سواری کی خواہش، اچھے اور عالیشان مکان کی خواہش اور جنسی لذت کی خواہش (یعنی
نفسانی شہوت) تو یہ سب چیزیں تو انسان کے اندر ہیں اور اس کی طبیعت میں موجود ہیں جو اس کو حیوانی
زندگی کی طرف کھینچتی ہیں اور انسان کے باہر میں حیوانی زندگی گزارنے والوں کے ٹھاٹ باٹھ اور خاص کر آجکل
کی فضا میں سینما، قدم قدم پر فحش اور عریاں تصویریں، شہوت کو حرکت میں لانے والے گانے، اور اسی طرح کے دوسرے
مناظر، یہ سب چیزیں انسان کے باہر میں ایسی موجود ہیں کہ قدم قدم پر حیوانی زندگی کے لیے اس کو اکساتی ہیں اور
حیوانی طرز زندگی اختیار کرنے کے لیے اس کا دامن کھینچتی ہیں اس لیے حیوانی زندگی کو انسانوں میں مقبول بنانے
کے لیے نہ کسی دعوت کی ضرورت ہے اور نہ کسی تحریک کی وہ آپ سے آپ دنیا میں ہمیشہ پھیلتی اور فروغ پاتی رہی
ہے۔ خاص کر جب سے مغربی قوموں نے دنیا میں عروج پایا ہے تو ان کی تعلیم نے، ان کی سیاست نے اور ان کی
صنعتی ترقیوں نے حیوانی زندگی کو اتنی ترقی دی ہے اور دنیا میں اس کو اتنا پھیلایا اور مقبول بنایا ہے کہ اس کے
اصل علم بردار شیطان کو گویا بالکل فارغ کر دیا ہے اور اسی لیے حیوانی زندگی کا عروج ہمارے اس زمانہ میں
کمال کو پہونچ چکا ہے۔ اور اس کے برعکس ایمانی زندگی چونکہ نفس کشی کی زندگی ہے اور اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ
کر احکام الٰہی کے مطابق چلنے کی زندگی ہے اور دوسروں کے بھلے کے لیے اپنے کو مٹانے کی زندگی ہے اس لیے
ظاہر بات ہے کہ وہ انسان کو طبعاً مرغوب نہیں ہو سکتی اور اسی طرح انسان کی باہر کی فضا بھی اس کے بالکل خلاف
رہتی ہے اس لیے اس کا وجود میں آنا کسی زمانہ میں بھی بغیر دعوت کے اور بغیر کوشش اور قربانی کے نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اور انسانیت پر بڑا کرم فرمایا کہ حیوانی زندگی کی تباہ کاریوں سے انسانوں کو بچانے
کے لیے اور ایمانی زندگی کی برکتوں سے ان کو بہرہ ور کرنے کے لیے اور اپنی رضا کے مقام اور جنت تک ان کو پہونچانے

کے لیے نبوت کا ایک مستقل سلسلہ اسی وقت سے جاری فرمایا جب سے کہ اس دنیا میں انسانوں کو پیدا کیا، سب پیغمبر اپنے اپنے وقت پر اسی لیے آئے کہ انسانوں کو حیوانی زندگی کے بُرے نتیجوں سے اور اس کی بربادیوں سے خبردار کرکے اس سے ان کو بچائیں اور ایمانی زندگی کی اس شاہ راہ پر چلائیں جو جنت تک پہونچاتی ہو۔ وہ جنت جس میں اس دنیا سے لاکھوں کروروں گنا زیادہ لذتوں اور مسرتوں کے سامان ہیں اور جس میں پہونچ جانے کے بعد پھر کبھی فنا نہیں، لیکن چونکہ حیوانی زندگی کے تقاضے اور اس کے محرکات... جیسا کہ میں نے عرض کیا انسان کے اندر اور باہر کثرت سے موجود ہیں اس لیے انسانوں کو حیوانی زندگی سے ہٹا کر ایمانی زندگی کے راستہ پر چلانا بہت مشکل ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ اس مشکل کام کو آسان کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام کو اپنے بندوں کا درد اور خیر خواہی کا جذبہ اور پھر اس کام سے عشق اور اس کا عزم بھرپور عطا فرماتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنی ہر چیز کو اس راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں اور جان کی بازی لگا کر انسانوں کو حیوانی زندگی سے کھینچ کر ایمانی زندگی میں لانے کے لیے کام کرتے ہیں۔ اللہ کے سب پیغمبر جیسا کہ میں نے عرض کیا اسی کام کے لیے آئے اور انھوں نے اپنے اپنے وقت میں اس کے لیے کوششیں فرمائیں، یہاں تک کہ سیدنا حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین بنا کر بھیجا اور آپ کو بتلا دیا بلکہ آپ ہی سے اس کا اعلان بھی کرا دیا کہ اب قیامت تک آپ ہی کا دور ہے، آپ کے بعد ہم اب کسی نئے نبی کو نہیں بھیجیں گے اس لیے آپ کو یہ کام قیامت تک کے لیے کرنا ہو اس واسطے حضور کا کام دوسرے تمام نبیوں سے بہت زیادہ اور بہت مشکل تھا۔ آپ سے پہلے ہر پیغمبر کو اپنی زندگی کے بعد کی زیادہ فکر کرنی نہیں پڑتی تھی کیونکہ نبوت کا سلسلہ جاری تھا۔ کسی قوم میں جب زیادہ فساد اور بگاڑ آتا تھا تو اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح اور ہدایت کے لیے نئے پیغمبر کو بھیج دیتے تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتمیت کا مقام عطا ہو جانے کی وجہ سے نئی نبوتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اور آپ کے زمانے سے لے کر قیامت تک کے ہزاروں برس کا کام آپ ہی کے سپرد کر دیا گیا۔ اور اس کے لیے آپ کو قیامت تک کی عمر نہیں بخشی گئی۔ بلکہ اس کی صورت یہ تجویز ہوئی کہ آپ اپنی امت کو اس پر تیار کریں اور اس پر اٹھائیں کہ انسانوں میں ایمانی زندگی کی جد وجہد اور کوشش کو قیامت تک کے لیے وہ اپنے ذمے لے اور اس کو اپنی زندگی بنائے یعنی جس طرح تمام انبیاء علیہم السلام انسانوں کو ایمانی زندگی کے راستے پر چلانے کے لیے اور جنت میں ان کو پہونچانے کے لیے تکلیفیں اٹھاتے رہے اور قربانیاں کرتے رہے اسی طرح آئندہ یہ اُمت قربانیاں کرے اور اس جد وجہد کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے ــــــ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ آپ لوگوں کو حیوانی زندگی کی بربادیوں سے بچا کر ایمانی زندگی کی برکتوں میں لے آئیں اور ایمانی زندگی اختیار کرنے والی ایک اُمت بنائیں بلکہ آپ کو ایک ایسی اُمت

تیار کرنی تھی جو ایمانی زندگی کو خود بھی اختیار کرے اور نبیوں کے طرز پر ایمانی زندگی کی دعوت اور جد وجہد کو اور اس کے لیے محنت و قربانی کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے اور اس راہ میں اپنے کو اور اپنی ہر چیز کو مٹا دینے کا اس میں جذبہ اور حوصلہ ہو۔ چنانچہ آپ نے ایسی امت بنائی۔ اللہ کے جن ہزاروں بندوں نے آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر حیوانی زندگی سے توبہ کرکے ایمانی زندگی کے اصولوں کو قبول کیا ان سب نے اپنے اپنے حق میں یہ بھی فیصلہ کیا کہ ہم اس ایمانی زندگی کو اللہ کے دوسرے بندوں میں پھیلانے کے لیے اور اللہ کے بندوں کو دوزخ کے راستہ سے بچا کر جنت تک پہونچانے کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دیں گے۔ جن لوگوں نے عہد نبوی کے حالات کا مطالعہ کیا ہے اور جن کے سامنے صحابۂ کرام کی تاریخ ہو وہ خوب جانتے ہیں کہ صحابۂ کرام نے اپنے قول اور اقرار ہی سے نہیں بلکہ عمل سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلا دیا تھا کہ آپ کے لائے ہوئے دین کے لیے یعنی اللہ کے بندوں کو حیوانی زندگی کی نجاستوں اور غلاظتوں سے نکال کر ایمانی زندگی کی پاک نورانی فضاؤں میں لانے کے لیے ہم برابر جد وجہد کرتے رہیں گے اور اس راہ میں جان و مال کی کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت و تبلیغ کے ۲۰ سال گزار کے جب اس دنیا سے رخصت ہونے لگے تو اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ کر آپ مطمئن تھے کہ ۲۰۔۲۱ سال پہلے ایمانی زندگی کی دعوت و جد وجہد کا جو کام میں نے اکیلے نے شروع کیا تھا اور جس کے لیے میں اکیلا ہی اس وقت فکر کرنے والا، تکلیفیں اٹھانے والا اور قربانی کرنے والا تھا اور ابوبکر کے ساتھ ہو جانے کے بعد اس کی فکر کرنے والے اس کے لیے تکلیفیں اٹھانے والے اور قربانی دینے والے ہم دو ہو گئے تھے، اب الحمد للہ لاکھ سے اوپر اس کام کو اپنا کام بنا لینے والے اس کی فکر کرنے والے اور اس کے لیے تکلیفیں اٹھانے والے اور قربانیاں دینے والے پیدا ہو گئے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے عموم کو اس پر اٹھایا تھا یعنی اس کام کو پوری امت کا کام قرار دیا تھا اور قرآن پاک نے بھی اس کام کی ذمہ داری پوری امت پر ڈالی تھی، فرمایا گیا تھا "کنتم خیر اُمّۃٍ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر" امت میں عہد نبوی میں بھی مختلف سطح کے اور مختلف حیثیتوں کے لوگ تھے۔ تجارت کرنے والے سوداگر بھی تھے اور کھیتوں اور باغوں میں مشغول رہنے والے زمیندار بھی، غریب بھی تھے اور امیر بھی، پڑھے لکھے اولوا لعلم اور فقہا بھی تھے اور بالکل اَن پڑھ عوام بھی، لیکن اپنے اپنے کاموں اور اپنی حیثیتوں میں اس فرق کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والے کام میں یعنی ایمانی زندگی کے پھیلانے کے کام میں اور اس کی فکر میں سب شریک تھے۔ اگرچہ اس کام میں سب کا درجہ اور سب کا عمل یکساں نہیں تھا، لیکن کچھ نہ کچھ حصہ ہر ایک کا تھا، بالکل الگ اور بے تعلق اور یکسو

رہنے والا یہاں تک میں سمجھتا ہوں کوئی بھی نہ تھا، ہر شخص کو اس کی فکر تھی کہ میں خود بھی ایمانی زندگی اختیار کر وں اور حیوانی زندگی سے اللہ کے بندوں کو بچانے کے لیے اور ایمانی زندگی کی نعمت ان تک پہونچانے کے لیے جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہو وہ کروں۔ ان کی اس جد وجہد کے دو شعبے تھے۔ ایک ایمانی زندگی کی دعوت اور اس کی راہ میں جان و مال کی قربانی اور دوسرا ایمانی زندگی کی دعوت اور اس کے اصول کو قبول کرنے والوں کی یعنی اسلام لانے والوں کی تعلیم و تربیت اور اللہ کے ساتھ اور دین کے ساتھ ان کا تعلق بڑھانے کی یعنی ایمانی روح ان کے اندر پیدا کرنے کی کوشش اور اس کے لیے محنت و مشقت۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی کچھ مدت تک اُمت کی زندگی کا نقشہ یہی رہا۔ سب اہل ایمان حضورؐ کے اس کام کو اپنا ذاتی کام، بلکہ اپنے سارے کاموں سے مقدم سمجھتے تھے اور اپنے ذاتی کاموں سے زیادہ اس کی فکر رکھتے تھے اور اس راہ میں مٹ جانا اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھوکھا کی تعداد رکھنے والی پوری اُمت میں ایمانی دعوت اور جد وجہد کی اور دینی تعلیم و تربیت کی ایسی عمومی فضا قائم ہوگئی کہ دنیا میں ایمانی زندگی کا رواج بہت تیزی سے پھیلنے لگا اور قومیں کی قومیں اور ملک کے ملک ایمانی دعوت کو قبول کر کے اس ایمان والی امت میں شامل ہونے لگے۔

قرن اول کے ایمان والوں کی اس عمومی ایمانی جد وجہد اور ان کے ایمانی طرز عمل کے نتیجہ میں جس تیز رفتاری سے قومیں ایمانی زندگی کے اصول کو قبول کرنے لگی تھیں اس کا اندازہ آپ اس واقعہ سے کر سکتے ہیں جس کو ہمارے بہت سے مورخین نے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور خلافت میں غالباً افریقہ کے عامل نے (یعنی اس ملک کے ذمہ دار حاکم نے) دار الخلافت کو یہ لکھا کہ یہاں کے لوگ اتنی تیز رفتاری سے اسلام قبول کر رہے ہیں کہ اگر چند روز یہی رفتار رہی تو جزیہ کی مد سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ بالکل ختم ہو جائے گی ـــــ گویا ان کا منشاء یہ تھا کہ کسی شخص کو سرکاری طور پر مسلمان تسلیم کیے جانے کے لیے کچھ شرائط مقرر کیے جائیں تاکہ اسلام ظاہر کر کے جزیہ کے ٹیکس سے مستثنیٰ ہو جانا ہر شخص کے لیے اتنا آسان نہ رہے اور پھر صرف وہی لوگ اسلام لا کر یہ فائدہ حاصل کر سکیں جو ان شرائط کو پورا کر کے اپنے مخلص مومن ہونے کے ثبوت دے سکیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی قبر مبارک پر قیامت تک رحمت کی بارشیں برسائے انھوں نے اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے مقصد اور اس امت کے نصب العین کی بڑی ایمان افروز ترجمانی فرمائی۔ انھوں نے لکھا۔

"ویحك ان محمدا صلى الله عليه وسلم انما بعث هادياً ولم يبعث جابياً"، اس کا مطلب یہ ہے کہ افسوس ہو تجھ پر اور بُرا ہو تیرا ہمارا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی خدمت کرنا اور جس کام کو لے کر آپ آئے تھے اس کو تکمیل تک پہونچانا ہے اور آپ خلق اللہ کی ہدایت کے لیے آئے تھے، اللہ کے بندوں سے

ٹیکس وصول کرکے خزانے بھرنے نہیں آئے تھے، لہٰذا اگر اللہ کے بندے حضورؐ کی ایمانی دعوت کو قبول کرکے حیوانی زندگی کا طریقہ چھوڑ کر ایمانی زندگی کے اصول کو اختیار کر رہے ہیں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد، یہی تو اصل مقصد اور اصل کام ہے۔ اگر اس کی وجہ سے خزانہ خالی ہوتا ہے اور ہمیں زیادہ سے زیادہ مالی خسارہ ہوتا ہے تو پڑا ہو! دولت وخزانہ مقصود نہیں بلکہ اللہ کے بندوں کو جنت کے قابل بنانا مقصود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی لیے آئے تھے اور یہی ہمارا مقصد اور نصب العین ہے۔

تو اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس امت کے پہلے دور میں جب ایمانی زندگی کے لیے دعوت اور جدوجہد کا عمومی نظام قائم تھا اور جب ہر ایمان رکھنے والا اس میں حصہ لے رہا تھا تو دنیا کا رُخ کیا ہو گیا تھا اور قومیں اور ملک کس طرح ایمانی زندگی کی طرف دوڑے چلے آ رہے تھے۔ پھر بعد میں جو لوگ اس فضا میں پیدا ہوئے اور انھوں نے ایمانی زندگی کو دنیا میں اتنا سرسبز اور اس قدر مقبول ہوتا ہوا دیکھا تو وہ جدوجہد کی ضرورت سے بے پروا ہو گئے اور امت میں ایمانی زندگی کے لیے کوشش اور قربانی کا وہ نظام قائم نہیں رہا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا۔ اس کی مثال آپ یوں سمجھیے کہ ایک محنتی شخص تجارت کرتا ہے اور اپنی سخت محنت سے اعلیٰ درجے کا کامیاب دولت مند تاجر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی اولاد بھی اسی طرح جان لگا کر محنت کرتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ گھرانا بہت دولت مند ہو جاتا ہے اس کی دوکانیں چلتی ہوئی دکھلائی دیتی ہیں، ان کے پاس بہت بڑی جائداد ہوتی ہے جس سے لاکھوں روپیہ وصول ہوتا ہے اور کروروں روپیہ بنکوں میں جمع ہوتا ہے اس کی اولاد کی اولاد جو اس ترقی اور خوش حالی ہی کے زمانے میں پیدا ہوتی اور بڑھتی ہے۔ قدرتی طور پر اس میں سستی اور آرام طلبی آ جاتی ہے، وہ باپ دادا کا اندوختہ یعنی جمع کیا ہوا خرچ تو کرتی ہے مگر ان کی طرح خود محنت کرکے اس میں اضافہ نہیں کرتی۔ بس بالکل ایسا ہی معاملہ ایمانی زندگی کے ساتھ ہوا۔ پہلے دور کے ایمان والوں نے اس کی راہ میں جو بے پناہ محنتیں اور مشقتیں کی تھیں اور اس کے لیے جو جانی اور مالی بے حساب قربانیاں دی تھیں ان کی وجہ سے ایمانی زندگی دنیا میں اتنی چمکی اور اس کو ایسا فروغ ہوا کہ بعد میں پیدا ہونے والے مسلمانوں نے پھر اس کے لیے کسی قربانی اور جدوجہد کی ضرورت نہیں سمجھی، نہ اس کی دعوت کی عام فکر رہی اور نہ تعلیم وتربیت کی، الغرض دینی جدوجہد کے ان دونوں شعبوں میں عموم نہیں رہا۔ بس یہیں سے بجائے ترقی کے تنزل شروع ہو گیا، ایمانی زندگی کی دنیا میں جو مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی وہ بھی نہیں رہی اور تعلیم وتربیت سے افراد میں جو ایمانی زندگی پیدا ہوتی تھی اس میں بھی بہت کمی آ گئی اور یہ انحطاط اور تنزل اس وقت سے برابر ہو رہا ہے آج یہ امت جو اس حالت میں ہے کہ اس کی بہت بڑی تعداد ایمان کی حقیقت سے بھی محروم ہے۔ اور اسلام کے ارکان تک سے بیگانہ ہے (آگے کی چیزوں کا کیا ذکر) یہ سب اسی کا نتیجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی تعلیم وتربیت دین کی جدوجہد اور دین کی فکر

کا جو عمومی نظام قائم فرمایا تھا اور اپنے ہر امتی کو جو اس کا ذمہ دار بنایا تھا وہ نظام باقی نہیں ۔ حضرات یہ تبلیغی تحریک جس کے سلسلہ میں ہر جمعرات کو یہاں یہ اجتماع ہوتا ہے ۔ دراصل دینی جدوجہد کے اسی عمومی نظام کو پھر سے قائم کرنے اور زندہ کرنے کی کوشش ہے، ہمارے بہت سے بھائی پوری واقفیت نہ رکھنے کی وجہ سے ایسا خیال کرتے ہیں کہ کلمہ نماز نہ جاننے والوں کو بس کلمہ اور نماز سے واقف کرنے کی یہ تحریک ہے ۔ اور اس کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ جو لوگ کلمہ نہیں جانتے ہیں انھیں کلمہ آجائے اور جو نماز نہیں پڑھتے ہیں وہ نماز پڑھنے لگیں یا زیادہ سے زیادہ کچھ ذکر شغل کرنے لگیں، بلکہ میرا اندازہ ہے کہ بعض جگہ کے اس کام کے بعض کرنے والے بھی شاید کچھ ایسا ہی سمجھتے ہیں لیکن اصل یہ نہیں ہے تحریک کا مرکزی مقصد جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا یہ ہے کہ ایمانی زندگی اور اس کی فکر اور اس کے لیے جدوجہد اور قربانی کا وہ عمومی نظام پھر سے قائم ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا ــــ ہاں اس وقت بدقسمتی سے جب کہ ہمارا دینی انحطاط اس حد تک پہنچ چکا ہے اور ہم اتنے گر چکے ہیں کہ اپنے کو مسلمان کہلانے والوں میں بہت بڑی تعداد میں ایسے بندے بھی ملتے ہیں جو بیچارے اسلام کا کلمہ بھی نہیں جانتے اور جو نماز جیسے رکن سے بھی بے تعلق ہیں تو ظاہر بات ہے کہ ان سے سب سے پہلے کلمہ اور نماز ہی کی بات کہی جائے گی، لیکن جو حضرات ہماری اس دینی دعوت اور اس جدوجہد سے کچھ واقف ہیں ۔ اور جنھیں اللہ نے ان باتوں کے سمجھنے کے قابل بنایا ہے ان کو یہ ضرور جاننا چاہیے کہ اس دعوت کا اصل مرکزی نقطہ ہر مسلمان کو دین کے لیے فکر مند کر کے دینی کوشش پر لگانا ہے اور اس کا پروگرام ایسا رکھا گیا ہے کہ اس میں دین کی دعوت اور کوشش کے ساتھ ساتھ خود اپنی اصلاح اور اپنی تعلیم و تربیت اور ایمانی ترقی بھی ہوتی رہتی ہے بلکہ ہم میں سے ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ایمانی تکمیل کو اور اپنی اصلاح کو اپنا اصلی اور اولین مقصد بنائے اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اس کے بعد ہی مقصود و مطلوب ہے ۔

حضرات! میں نے اس وقت اس تحریک کے صرف مقصد کی کچھ وضاحت کی ہے، اس کے طریق کار کے بارے میں کچھ عرض نہیں کیا ہے آپ میں اکثر حضرات تو وہ ہوں گے جو کام میں شریک ہیں اور جانتے ہیں، اور جو حضرات نئے ہوں اُن سے میں یہ عرض کروں گا کہ ہمارے اس کام کا طریق کار جاننے کا بہترین رستہ یہ ہے کہ اس کام کی کرنے والی جماعتوں کے ساتھ کچھ وقت گزارا جائے ۔ ہمارا طریق کار چونکہ آج کل کے دوسرے اجتماعی کاموں اور اس دور کی دوسری تحریکوں کے طریق کار سے بہت مختلف ہے اس لیے کچھ کہنے سننے سے وہ پوری طرح ذہن کی گرفت میں نہیں آتا ۔ میں دوسروں کو کیا کہوں خود میرا اپنا معاملہ یہ ہے کہ کسی بزرگ کے بتلانے اور سمجھانے سے میں بھی اس کو نہیں سمجھ سکا تھا بلکہ اب سے تقریباً آٹھ نو سال پہلے حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی حیات میں ایک جماعت کے ساتھ چند روز گزار کر میں اس کو کچھ سمجھ سکا تھا اور اسی کے بعد میں نے اس کام پر اپنا وقت صرف کرنے کا فیصلہ کیا تھا ۔

حضرات! آخر میں صرف ایک بات اور عرض کرکے اس وقت اپنی بات کو ختم کرتا ہوں میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم و تربیت سے جو امت تیار فرمائی تھی اس کا نقشہ یہ تھا کہ اس کا ہر فرد ایمانی زندگی کے رنگ میں خود بھی رنگا ہوا تھا۔ اور اللہ کے دوسرے بندوں کو اسی رنگ میں رنگنے کے لیے کوشش کرنا بھی اپنے لیے ضروری سمجھتا تھا پوری امت کا حال یہ تھا کہ اس کے ہر فرد میں ایمان تھا، ہر گھر میں ایمان کی فضا قائم تھی، ایمان اور ایمانی زندگی کی فکر ساری فکروں پر غالب تھی، تاجروں کی تجارتیں اور کاشت کاروں زمینداروں کے کھیتی باڑی کے مشغلے اور اسی طرح کسی طبقہ کے مشاغل اور معاشی کام دھندے اس کام اور اس مقصد سے اور اس کی فکر سے انھیں غافل نہیں کر سکتے تھے۔ امیر غریب، جوان اور بوڑھے، عورتیں اور مرد سب میں یہ درد اور یہ فکر عام تھا، لیکن اب ذرا ایک نظر موجودہ امت پر ڈالیے اور سوچیے کہ ہم میں کتنے فیصدی یا کتنے فی ہزار ہیں۔ جن میں ایمانی زندگی اور ایمانی زندگی کی فکر موجود ہو اور جو اس راہ میں قربانیاں دے رہے ہیں اور محنتیں اور مشقتیں کر رہے ہیں، بازاروں میں گھوم کر دیکھیے فی صدی ایک تاجر بھی آپ کو نہیں ملے گا جس کا یہ حال ہو۔ اسی طرح دفتروں میں، اسکولوں اور کالجوں میں، حاکموں اور اعلیٰ عہدہ داروں میں ایک فی صدی بھی ایسا نہیں ہوگا جس کو ایمانی زندگی اپنے اندر پیدا کرنے کی فکر ہو اور جو اس راہ میں کچھ قربانی دے رہا ہو ـــ الغرض اس وقت امت تو ایک ایک ملک میں کئی کئی کروڑ کی تعداد میں موجود ہو لیکن ایمانی زندگی رکھنے والے اور ایمانی زندگی کی فکر کرنے والے اور اس کی راہ میں قربانیاں دینے والے ان کروڑوں میں ایک فی صد کے حساب سے اتنے لاکھ بھی موجود نہیں ہیں بلکہ غالباً ایک فی ہزار کے حساب سے بھی نہ ہوں گے ـــ اسی کا نتیجہ ہو کہ امت کے ساتھ اللہ کا معاملہ وہ نہیں رہا جس کا وعدہ ایمانی زندگی رکھنے والی اور اس کے لیے جد و جہد کرنے والی امت کے لیے جا بجا قرآن مجید میں کیا گیا تھا۔ اور صحابۂ کرام نے ہر میدان میں جس کا تجربہ کیا تھا اور جس کو ہم تاریخ میں پڑھ کر آج تک سر دھنتے ہیں اور سر دھنتے رہیں گے۔

حضرات! اس وقت ہماری حالت کچھ ان بنی اسرائیل کی سی ہو کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا میں موجود تھے، یہودی موسیٰ علیہ السلام پر اور ان کی لائی ہوئی کتاب تورات پر ایمان لانے کے مدعی تھے مگر ان کی زندگی ایمانی زندگی نہیں رہی تھی، اسی طرح عیسائی عیسیٰ علیہ السلام پر اور ان کی لائی ہوئی کتاب انجیل پر ایمان کے دعویدار تھے .... مگر ان کی زندگی وہ نہیں تھی جو عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت میں تعلیم و تربیت کے ذریعہ پیدا کی تھی بلکہ ان سب نے عملاً حیوانی زندگی کو اپنا لیا تھا، بجائے احکام الٰہی کے یہ اپنی خواہشوں پر چلتے تھے اور اللہ کے مقابلہ میں اپنے ذاتی فائدوں اور ذاتی مصلحتوں کو ترجیح دیتے تھے۔ اس لیے یہ قومیں جو کسی زمانہ میں اللہ کی منظور نظر قومیں تھیں اور جن کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے بھرپور نوازا تھا، اللہ کی نظر سے گر چکی تھیں اور اللہ کے فرشتوں کو اور اللہ کی دوسری مخلوق کو ان سے کوئی ہمدردی نہیں رہی تھی۔

(صفحہ ۳۲ پر)

دینی دعوت و تحریک کے ذمہ داروں کی خدمت میں!

قارئین الفرقان "الاخوان المسلمون" کے نام سے ناآشنا نہیں ہیں، جو شرق اوسط کی سب سے زیادہ ہمہ گیر اور موثر دعوت اور جماعت ہے، اس جماعت کی شاخیں اور اس کے مراکز اگرچہ پورے عالم عربی میں پھیلے ہوئے ہیں، مگر اس کی طاقت کا سرچشمہ اور عالمی مرکز مصر ہے جو داعیِ اوّل شیخ حسن البناء مرحوم کا وطن اور اُن کی جد و جہد کا مرکز ہے۔ گذشتہ سال جب مصر میں قیام اور وہاں کی دینی زندگی اور اسلامی تحریکات کے مطالعہ کا موقع ملا، تو الاخوان" کی دینی سرگرمیوں اور زندگی پر ان کے اثر و نفوذ کا اندازہ ہوا، ان کی دعوت اور جد و جہد کے متعدد پہلو واجب الاعتراف اور مستحق تحسین ہیں، اور بعض پہلو مزید توجہ کے محتاج ہیں، ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اخوان عالم اسلامی کی دوسری دینی دعوتوں اور تحریکات کے تجربوں اور معلومات سے استفادہ کرنے میں بڑے فراخ دل اور تنقید سننے میں بہت عالی ظرف واقع ہوئے ہیں، اپنی مجلس انتظامی کے ایک خصوصی اجلاس میں انھوں نے ہمیں اس کا موقع دیا کہ ہم ان کی دعوت و تحریک پر بے تکلف تبصرہ کریں اور اسلامی دعوت کے مزاج و شرائط، داعیوں اور کارکنوں کے صفات و اخلاق کے متعلق اپنا نقطۂ نظر اور اپنے خیالات و تجربات پیش کریں، اس ناچیز نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس مجلس میں ایک مضمون پڑھا جس میں ان کی دعوت کی طاقت، داعی کی شخصیت اور عالم عربی میں اسکے جو انقلاب انگیز نتائج ظاہر ہوئے ہیں ان کا کھلے دل سے اعتراف تھا (اور یہ اعتراف مشورہ پیش کرنے والے کے لئے ضروری ہے) پھر ان خصوصیات وصفات کا تذکرہ تھا جو خالص دینی و اسلامی دعوت اور اس کے کارکنوں اور ذمہ داروں میں پائی جانی چاہئیں جو نبوت کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر اُمت میں انقلاب پھر اس کے ذریعہ سے عالم میں انقلاب کرنا چاہتے ہیں، اس موقع پر اخوان کا جوہر موجود تھا، حاضرین بہت متاثر تھے، اور بعض آبدیدہ، مضمون پڑھنے کے بعد استاد عبدالحکیم عابدین نے اس کے اشاعت کی اجازت چاہی، اور وہ ادارہ ہی کی طرف سے مشہور اخوانی مصنف شیخ محمد الغزالی کے پیش لفظ کیساتھ "أريد أن أتحدث إلى الاخوان" کے عنوان سے شائع ہو گیا ——— ذیل میں اُس کا ترجمہ

جو مولوی محمد رابع حسنی ندوی کا کیا ہوا ہے، شائع کیا جا رہا ہے۔ (ابوالحسن علی)

محترم بھائیو!

میری دیرینہ تمنا اور شیریں خواب یہ تھا کہ مصر میں "اخوان المسلمین" کے قائد شیخ حسن البناء سے ملاقات کرتا، لیکن بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے مصر کو میرا سفر ملتوی ہوتا رہا، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت نے اس عرصہ میں اُن کو اپنے آغوش میں لے لیا، اور ان کے لئے آخرت کی منزل سازگار ہوگئی، میرے لئے اب صرف یہی وجہ تسکین ہے کہ میں آپ سے ملاقات کروں، اور آپ سے اپنے دل کی باتیں کروں، میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کی خدمت میں وہی تسلیمات پیش کروں جو شہیدِ اسلام کی خدمت میں پیش کرتا، اور اس طرح کچھ اپنے دل کے غم کو ہلکا کروں، اور وہ سب افکار، تخیلات، آرزوئیں اور خلشیں آپ کے سامنے رکھ دوں جو دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہیں، اور وہ عزت و احترام، محبت و اخلاص بھی جو اس عظیم المرتبت دعوتِ دین کے لئے میرے دل کے اندر ہے، اُمید و مسرت بھی جو میرے دل کو گدگداتی ہے، اور وہ بے اطمینانی و خوف بھی جو کبھی کبھی میرے دل میں چٹکیاں لیتی ہیں، میں آپ سے اُمید کرتا ہوں کہ اپنے مخلص بھائی کو کچھ تفصیل کا موقع دیں گے، اور اپنے قیمتی وقت کا کچھ حصہ مرحمت فرمائینگے۔

میرے محترم بھائیو!

آپ کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ میں آپ کے سامنے عالمِ اسلامی کا نقشہ کھینچوں، اور ان تمام سیاسی اقتصادی اور اخلاقی تحریکات و رجحانات کی نشاندہی کروں جنھوں نے عالمِ اسلام کو بازیچۂ اطفال بنا رکھا ہے اور ان خطرات کا تذکرہ کروں جو مسلمانوں کے سروں پر منڈلا رہے ہیں، ان حالات سے آپ سے زیادہ کون واقف ہوگا لیکن جو بات میں آپ سے درحقیقت کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ عالمِ اسلامی ایک عالمِ حیرت اور سخت کشمکش میں مبتلا ہے، وہ متناقض طاقتوں اور متضاد قوتوں کی رسہ کشی کا شکار ہو رہا ہے۔

عالمِ اسلامی اس وقت ایک عجیب کشمکش میں ہے، ایک طرف وہ دین ہے جس کی پابندی کرنے اور اس کے مطالبات پورے کرنے سے اس کی سابقہ عادتیں، غلط تعلیم و تربیت اور خواہشاتِ نفس مانع ہیں، ان میں سے کوئی چیز اس کے عقیدہ و ایمان سے موافقت نہیں رکھتی، دوسری طرف وہ جاہلیت ہے جس کے لئے اس کا سینہ ابھی کشادہ اسلئے نہیں ہوسکا ہے کہ اس میں ایمان کے کچھ آثار باقی ہیں، اور اس کے پاس ایک ایسی قومیت ہے جو اسلام کے ساتھ گندھ چکی ہے، اور وہ تمدن ہے جو دین کے ساتھ پروان چڑھا ہے۔

عالمِ اسلامی کی دوسری کشمکش یہ ہے کہ ایک جانب سادہ دل مسلمان قومیں ہیں، دوسری جانب ایسی ہوشیار مسلمان حکومتیں ہیں جن کے اربابِ اقتدار کے سینے اس دین کے لئے ابتک منشرح نہیں ہوسکے، اور اُن کے دل

اس پر عمل کرنے پر تیار نہیں ہیں، لیکن ان کو اس بات پر بھی اصرار ہے کہ دین پر ایمان رکھنے والی قوم پر حکومت بھی کریں، ان کی زندگی اور عزت اسی میں ہے کہ ان کی اقتدار کی کرسی محفوظ رہے، ان کو حکومت اور قیادت کے سوا کہیں اپنی جگہ بھی نظر نہیں آتی، اور نہ اس مسلمان سوسائٹی کے سوا جس میں وہ پیدا ہوئے اور پلے، بڑھے، ان کی کہیں گنجائش ہے، نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان اُن سے عاجز و پریشان ہیں، اور وہ مسلمانوں سے زچ ہیں۔

عالم اسلامی کی تیسری کشمکش یہ ہے، کہ ایک طرف اس کی فطرت اس کو دین کی طرف کھینچتی ہے، اسکی تاریخ اس میں ایمان وجہاد کا ولولہ پیدا کرتی ہے، اس کا آسمانی صحیفہ اس کو آخرت کی طرف متوجہ کرتا ہے، اور بگڑے ہوئے معاشرے اور غیر اسلامی زندگی کے خلاف بغاوت پر اُکساتا ہے، دوسری طرف عصری تربیت ہے جو مادیت کو اس کے سامنے سنوار کر پیش کرتی ہے، اس کی طبیعت کو بزدلی اور کمزوری کا عادی بناتی ہے، اور وہ لیڈر شپ ہے جو غیر کے سامنے سپر اندازی اور دشمن پر اعتماد اور میدان سے پسپا ہو جانے کی تعلیم دیتی ہے۔

عالم اسلامی کی چوتھی کشمکش یہ ہے کہ اسکے پاس ایک طرف بے چین طبیعت نوجوان ہیں، اُبلتا ہوا خون، بھڑکتا ہوا ذہن، اور ایسے شگوفے جو کھلنے کے لئے بیقرار ہیں، دوسری طرف بوڑھی قیادت ہے جو فکر و حیات کے میدان میں بے بضاعت، ایجاد و قوتِ اجتہاد سے محروم ہے، اور جس میں جرأت و اقدام اور نئے تجربوں کی طاقت نہیں ہے۔

عالم اسلامی کی پانچویں کشمکش یہ ہے کہ اس کے قبضہ میں وہ خام دولت ہے جو دنیا کا صالح ترین کچا مال ہے ایمان، طاقت و شجاعت کا نہایت قیمتی سرمایہ ہے، اور دوسری طرف ایسے مستری اور کاریگر ہیں جو اس مسالہ کی قیمت سے ناواقف اور اس کے مواقع استعمال سے بے خبر ہیں۔

یہ ہے وہ عالم اسلام جس میں اس وقت کی دنیا کو اپنی دوا نظر نہیں آتی، اور نہ اس کو مدد کی گنجائش، اور نہ اس کی گود میں کچھ آسائش معلوم ہوتی ہے، عالم انسانی کو اس عالم اسلامی میں دنیا کے منظم ڈاکوؤں اور انسانی درندوں سے کوئی پناہ نظر نہیں آتی، جو اس وقت انسانیت کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔

اب اس عربی دنیا کا جائزہ لیجئے جس میں آپ لوگ بستے ہیں، یہ عالم اسلامی کا کمزور ترین عضو ہے، چاہئے تو یہ تھا کہ یہ عالم اسلامی کا سب سے زیادہ صحت مند اور طاقت ور عضو ہوتا، اور عالم اسلامی میں اس کا وہ مقام ہوتا جو انسان کے دل میں قلب و دماغ کا ہے، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، یہ چند تخریبی عوامل کا شکار رہے، جنھوں نے اس میں مختلف امراض اور کمزوریاں پیدا کر دی ہیں، ترکی حکومت کی کمزوری اور قوم کی تعلیم و تربیت سے غفلت نے، بیجا اخراجات اور بے محل احترام و تعظیم، اور کبھی کبھی حد سے بڑھے ہوئے تشدد نے عربی ممالک میں کم ہمتی، عام جہالت پیدا کی۔ دوسری طرف یورپ کے نو آبادیاتی ہتھکنڈوں کے نتیجہ میں عام بد اخلاقی، دینی آزادی، مادہ پرستی، اندھا دھند خواہشات پروری پیدا ہو گئی ہے، شخصی حکومتوں نے خوشامد، حد سے بڑھے ہوئے تکلفات، نفاق، طاقت و مادیت

کے سامنے سپر افگندگی کا عادی بنا دیا، اس کے علاوہ یورپ سے قرب حاصل تھا، تمدن کی جس قدر موجیں اٹھیں، جو نت نئے افکار ونظریات ظاہر ہوئے، اور جو صنعتیں اور ایجادات نکلیں، وہ سب عالم عربی کے سر پر سے گذر کر مشرقِ بعید تک پہونچیں۔

علاوہ ازیں اس کو اس کے جغرافیائی جائے وقوع اور سیاسی وفوجی اہمیت سے بھی کچھ کم مضرت نہیں پہونچی، مغرب نے اس پر ڈورے ڈالے، اور مغربی طاقتوں نے اس سے سودا کرنا شروع کیا، اور اس کو فوجی اڈہ بنا لیا مشرقی تہذیب، جاگیردارانہ نظام، اور شخصی حکومت نے تعیش، تن آسانی، اور طبقات میں معاشی تفاوت کا ترکہ ان ممالک کے سپرد کیا۔ علاوہ ازیں عالم عربی میں دینی دعوت کی آواز ایک عرصہ سے کمزور پڑ چکی تھی، وہ لوگ اُٹھ گئے، جو مادیت کا مقابلہ کرتے، اور اس میں اعتدال پیدا کرتے، اور اس کے زور کو اپنی دعوتِ الی اللہ اور دعوتِ آخرت وقناعت واعتدال، اور ضبطِ نفس کی دعوتوں سے کم کرتے تھے، اور شعلۂ ایمان کو بھڑکاتے تھے۔

علماء اور حاملین دین نے مغربی طوفان اور عصری طاقت کے سامنے سپر ڈال دی، انھوں نے مغربی تمدن سے بغیر لڑے شکست مان لی، پھر شہوانی اَدب اور ناپاک صحافت کا گندہ چشمہ اُبل پڑا، طبیعتوں کی گرہیں کھلتی گئیں، اور خواہشات کا بازار گرم ہوتا چلا گیا ——— یہ سب مفاسد جمع ہوتے گئے، حتیٰ کہ عالم عربی ایک بوسیدہ عمارت بن کر رہ گیا، جس کے گرجانے کا ہر وقت خطرہ ہے۔

انہی جیسے نازک موقعوں اور گہری گھٹاؤں میں اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو بھیجا کرتا تھا، لیکن محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کا آفتاب اب بھی درخشاں ہے، آپ کا دین اسی طرح زندہ ہے، اور آپ کی لائی ہوئی کتاب اسی طرح محفوظ ہے، اور آپ کی اُمت بھی جو آپ کے ساتھ حق کی پیغامبری اور دعوت کی اشاعت کیلئے مبعوث کیگئی تھی، اسی زمین پر موجود ہے، اور اس کی زندگی اب بھی قائم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنا محفوظ دین اور اپنی بار بار پڑھی جانے والی کتاب مرحمت فرما کر اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کی برکات سے نواز کر ہمارے لئے اس کی ہرگز ضرورت باقی نہیں رکھی کہ ہم کسی نئی رسالت کا انتظار کریں، اور کسی نئے رسُول کی حاجت محسوس کریں۔

لیکن ایک عام وسیع تجدید کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اور ایک طاقت ور دعوت اور سخت ترین مقابلے کی اہمیت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی جو جاہلیت کے اس نقشہ کو تبدیل کر دے جس میں عالم اسلامی بری طرح گرفتار ہو گیا ہے، اور عالم عربی بڑی حد تک اس میں جکڑ گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے اور رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خبر دی ہے کہ اسلام کی تاریخ میں اس اسلامی دعوت کا سلسلہ قائم رہے گا اور دین کی تجدید ہوتی رہے گی اور جاہلیت کے خلاف کوشش اور

بہاؤ بھی جاری رہے گا، وہ جاہلیت جو کچھ کچھ عرصہ کے بعد سر اٹھاتی، اور تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد پاؤں پھیلاتی رہتی ہے، لیکن عالم اسلامی کی مصیبت، مسلمانوں کے حالات کا بگاڑ، اسلام کی صحیح راہ سے ان کا انحراف، اور مادیت کا طوفان اس مرحلے سے آگے نکل چکا ہے کہ اس کو انفرادی کوششوں سے، مسجد کے مواعظ، چند دینی درسوں، رسائل و مطبوعات، فقہی مباحثات، جزئی مسائل اور افراد و اشخاص کی مخالفت سے اُس کا رُخ پھیرا جائے، سیلاب کو اسی طرح کے سیلاب، اور بہاؤ کو اس سے زیادہ طاقت ور بہاؤ ہی سے تھاما جا سکتا ہے، اسی لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ طاقت ور روک اور سخت ترین مقابلہ سامنے آئے جو زمانے کے بہاؤ اور زندگی کے دھارے کو ادھر سے اُدھر کر دے، اور معاشرے و زندگی میں ذوقیات اور رجحانات میں اور اشیاء کے اقدار و اوزان میں ایک عام انقلاب برپا کر دے۔

یہاں ہماری مسرت کا اندازہ کیجئے جبکہ ہم نے عالم عربی کے افق پر ایک نئی روشنی دیکھی، اخوان کی دعوت اس مصر سے جو کہ عالم عربی کا قائد اور مشرق ادنیٰ کا مصدر خیر و شر ہے نمایاں ہوئی تو اسلام کے مستقبل کے لئے اُمیدیں تازہ ہو گئیں، اور ہم نے یہ خیال کیا کہ یہی وہ دعوت ہے جس کا احیاء مسلمین کے واسطے انتظار تھا اور یہی ہے جو مصلحین کی آرزوؤں اور اُمیدوں کو پورا کرے گی، اور اس گرتی ہوئی دنیا کو سنبھالے اور روکے گی۔

تھوڑا ہی وقت گذرا تھا کہ یہ تحریک ایک طاقت ور سیلاب میں تبدیل ہو گئی، اس نے اخلاقی ابتری و لاقانونی زندگی، الحاد اور بے دینی کے دھاروں کو تھاما، اور مغربیت کے ان دھاروں کو روکا جو غیرتِ اسلامی اور دینی زندگی کے بچے کھچے سرمایہ کو بہالے جانے کی فکر میں تھے، اس نے ملک میں ایسا طاقت ور اثر و رسوخ حاصل کر لیا جس کے ساتھ یہ آسان ہو گیا تھا کہ پورے ملک کے رُخ اور رجحان کو بدل دے، درحقیقت اس تحریک میں وہ بہت سی خصوصیات جمع ہو گئی تھیں جو ہمارے علم میں بڑی مدت سے اس ملک میں کسی دینی اور اصلاحی تحریک میں جمع نہ ہو سکی تھیں۔

ا۔ ان خصوصیات میں سے ایک اس جماعت کے داعی اول شیخ حسن البناء (رحمۃ اللہ علیہ) کی شخصیت ہے، جہاں تک ہمارے معلومات کا تعلق ہے وہ اپنے طرز کی منفرد شخصیت تھے، ان کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس اہم کام کے لئے تیار کیا تھا، اور اس کی مخصوص صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں، اسلام کا وسیع فہم، دین کی غیرت اور اس کی سچی تڑپ، اسلام کی ترقی کے لئے مسلسل جد و جہد، جادو بیانی، دل آویز شخصیت، اپنے ساتھیوں اور کام کرنے والوں پر گہرا اخلاقی اثر اور محبوبیت، ان کی جامع شخصیت کے نمایاں اوصاف تھے، یا اقبال کے الفاظ میں:—

"یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم"

ان کی زندگی کی تصویر تھی ـــــ مسلمان قائد اور دعوتِ دین کے علمبردار کو انھیں صفات کا جامع ہونا چاہئے۔

۲۔ اس تحریک کے لئے وہ چیزیں اکٹھا ہوگئیں جو دینی تحریکات کو اجتماعی طور پر کم میسر آتی ہیں یعنی قوتِ ایمان وعمل، عصری علوم، جدید طریق تنظیم، ادب وصحافت، صناعت وتجارت، ایسی چیزیں تھیں جنھوں نے اس تحریک کو عوامی عصری اور ایک عام تحریک بنایا جس میں عالم دین، نئے تعلیم یافتہ، کامیاب تاجر، معمولی مزدور، ادیب، مصنف، اخبار نویس، کاریگر، کسان، طالب علم، استاد اور ذمہ داران حکومت، ماہر ڈاکٹر، قانون داں، اور تجربہ کار سیاستداں دوش بدوش نظر آتے ہیں، ان مختلف عناصر اور طبائع کو جوڑنے والی چیز جماعتی رشتہ اور داعی کی ہمہ گیر شخصیت تھی۔

۳۔ صاحبِ دعوت کی تربیت، تحریک سے ان کے تعلق وانہماک اور اباحیت واخلاقی ابتری کے خلاف ردِ عمل نے رفقاء میں اخلاقی طاقت، ضبطِ نفس اور استقلال پیدا کردیا، اور جو قوم ـــــ اخوان کے ایک ذمہ دار کے الفاظ میں ـــــ نرم ونازک تھی، اس میں ایسے نوجوان پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی شجاعت وجانبازی کا ثبوت فلسطین کی جنگ میں بھی پیش کیا، اور جنھوں نے جہادِ اسلامی کی تاریخ دہرائی، اور شدائد ومحن کے دور میں مردانگی اور پامردی کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔

۴۔ تحریک کے داعیِ اول نے اسلامی اقدار کو بے باکانہ پیش کیا، اور دین کے فرائض ادا کرنے میں اور ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے نمودار ہونے میں ان کو کوئی جھجک پیش نہ آئی، جن دینی فرائض وشعائر کے اظہار میں لوگ شرم اور حقارت محسوس کرتے تھے انھوں نے علانیہ ان کا اظہار کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینداری کوئی شرم کی چیز نہیں رہی، لوگ قہوہ خانوں، کلب گھروں، دعوتوں میں اور چوراہوں پر بلا تکلف نماز پڑھنے لگے، اور اس میں کوئی شرم کی بات نہیں رہی، اس کے علاوہ مقررین اور اہلِ قلم بھی دستورِ اسلامی اور احکام اسلامی کے نفاذ کا علانیہ مطالبہ کرنے لگے، اور دینی مباحث ومسائل کو بھی دائرہ بحث میں لانے لگے۔ حالانکہ اس سے قبل یہ چیزیں ایک محدود دیندار طبقہ کے لئے مخصوص سمجھی جاتی تھیں، اور علمی تحقیق ومطالعہ کے دائرہ سے باہر نہیں آسکتی تھیں، اس میں شک نہیں کہ یہ سب ایک عوامی اسلامی تحریک کا نتیجہ ہے۔

یہ سب ہوا، اور اگر مرشدِ عام[1] (شیخ حسن البنّاءؒ) کی زندگی وفا کرتی، اور دھارا اپنے رخ پر چلتا رہتا تو اس سے زیادہ ہوتا، ملک کا اخلاقی اور اجتماعی ڈھنگ بدل گیا ہوتا، بہت سی بدعتیں مٹ جاتیں، اور بہت سی سنتیں زندہ ہوچکی ہوتیں، شراب خانے ویران اور مسجدیں آباد ہوجاتیں، بد اخلاقی اور بےنظمی کے داعی روپوش ہوگئے ہوتے، بازاری ادب، بے حیا رسالے، ضمیر فروش صحافت کا بازار سرد ہوجاتا، حد سے بڑھی ہوئی بے پردگی، مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط، اور صدہا معاشرتی خرابیوں پر اس کا اثر پڑتا۔

---

[1] اخوان ان کو اسی لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ۱۲

لیکن ملک اس بیداری کی قیمت کو اچھی طرح نہ سمجھ سکا، جس طرح کہ بیمار اور ضعیف معدہ صالح اور مقوی غذا کا متحمل نہیں ہو سکتا اور اُس کو بدہضمی کی شکایت ہو جاتی ہے، اسی طرح قوم اپنی بے استعدادی کی وجہ سے اس صالح انقلاب کی متحمل نہ ہو سکی۔ شیخ کی شہادت اسلام کے لئے ایک سانحہ تھا جس میں صرف اخوان نے ہی نقصان نہیں اٹھایا، بلکہ اسلام اور عالم اسلامی کو بھی اس خسارہ میں شریک ہونا پڑا۔

لیکن میرے محترم بزرگو! میں یہ سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کو اس دعوت کے ساتھ خیر ہی منظور تھی کہ اُس نے اس دعوت کو آپ حضرات کی مرضی کے بغیر پہلی منزل کی طرف واپس کر دیا تاکہ یہ دعوت اور بھی پختہ ہو لے، اور اس کے رفقاء تربیت و بصیرت میں چند قدم اور آگے بڑھ جائیں اور اس کے اصول اور بھی راسخ اور قوی تر ہو جائیں، اس نے اس تحریک کے کارکنوں اور ذمہ داروں کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ اس تحریک کے مستقبل پر از سرِ نو غور کریں، سوچ سمجھ کر راہ متعین کریں، اور اس کے نقشہ کو زیادہ سے زیادہ مکمل اور مرتب کریں۔

دینی تحریک اور اسلامی تجدید کا مسئلہ میرے مکرم دوستو! معمولی مسئلہ نہیں ہے، اس کا مقصد اور اس کی مہم صرف یہ نہیں ہے کہ کسی نظامِ حکومت کو بدل دیا جائے، یا کسی سیاسی نقشے کے بجائے دوسرا سیاسی نقشہ لے آیا جائے، یا کسی اقتصادی نظام کی جگہ پر دوسرا اقتصادی نظام قائم کیا جائے، نہ تنہا علم و تہذیب کی نشر و اشاعت ہی اس کا مقصد و منہاج ہے، اور نہ جہالت و کم علمی کے خلاف جد و جہد یا بے کاری و بے روزگاری کا مقابلہ یا کچھ اجتماعی یا اخلاقی خرابیوں کا علاج اس کا منتہائے نظر ہے، اور اس کے علاوہ وہ تمام باتیں جن کو مختلف تحریکوں کے قائد یورپ اور مشرق میں لیکر کھڑے ہوتے ہیں، وہ تو اسلام کی ایسی دعوت ہے جو کہ عقیدہ و اخلاق، عمل، سیاست و عبادت اور انفرادی اور اجتماعی تعلقات پر حاوی ہے، اس کا تعلق قلب و عقل، رُوح و جسم سب سے ہے، وہ قلب و نفسیات عقیدہ و تخیلات میں یکساں طور پر ایک عمیق تغیر چاہتی ہے، وہ پہلے دل سے اُبلتی ہے پھر کسی قلم یا کاغذ یا اسٹیج پر نمودار ہوتی ہے، وہ محرک کے جسم اور زندگی پر پہلے نافذ ہوتی ہے اُس کے بعد وہ معاشرہ یا قوم پر اُسکے نفاذ کا مطالبہ کرتا ہے۔

اس دعوت کے شایانِ شان درحقیقت انبیاءؑ، اُن کے کمالات اور اُن کی طاقتیں، اُن کا پیغام اور اُن کا ایمان و یقین، اُن کی جد و جہد اور اُن کی ثابت قدمی، اُن کی حکمت و بصیرت اور اُن کا اخلاص ہے لیکن یہ انبیاء کیساتھ مخصوص نہیں، بلکہ یہ اُن کے جانشینوں اور ان کے متبعین کی بھی، اور ہر زمان و مکان کی دعوت ہے بلکہ پوری انسانیت اور تمام زمانوں کی ضرورت ہے، اسلئے ضروری ہے کہ ہر زمانے اور ہر ماحول میں اس کی تجدید کی جائے، اور انھیں کی بنیاد پر اس کی عمارت قائم ہو، اور وہ ان کے نہج کے مطابق ہو، انھیں کے چراغ سے اس کا دیا جلایا گیا ہو —— آیئے! اب ہم اس سرچشمہ کو ذرا دیکھیں اور اس کا دقیق مطالعہ کریں۔

(باقی آئندہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دجّالی فتنہ اور سورۂ کہف

(مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

۲۰
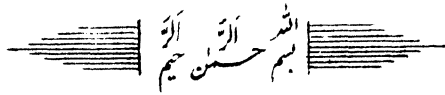
پچھلے دنوں بعضوں کی طرف سے "یاجوج و ماجوج" کے مسئلہ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی نکو ہیدہ کوششوں میں غیر معمولی سرگرمیاں عمل میں آئیں، اور "یاجوج و ماجوج" اور "المسیح الدجال" کے قصوں کو اچھال اچھال کر خواہ مخواہ یہ ہنگامہ برپا کر دیا گیا کہ مہدی اور مسیح بن مریم کی جستجو کا وقت آگیا ہے، اسی ہنگامہ میں اس دعوے کا اعلان کر دیا گیا کہ مسلمانوں کا مہدی اور عیسائیوں کا مسیح بن مریم آ بھی گیا، سادہ لوحوں کا ایک طبقہ اس عجیب و غریب دعویٰ کی طرف متوجہ بھی ہو گیا، اور انتظار کرنے لگا ان کارناموں کے ظہور کا جن کے بغیر نہ مہدی مہدی اور نہ مسیح بن مریم مسیح بن مریم بن سکتے ہیں، لیکن انتظار کرنے والے غریب انتظار ہی کرتے رہے، اور مہدی و مسیح بنا کر اپنے آپ کو پیش کرنے والے صاحب دنیا سے تشریف بھی لے گئے، لیکن واقعات ان کے سامنے بھی اور آگر ان کے چلے جانے کے بعد بھی مہدی اور مسیح کے کارناموں کے برعکس قطعاً برعکس ہی پیش آتے رہے اور پیش آتے چلے جا رہے ہیں، انتظار کرنے والوں کا یہ مسکین طبقہ اب حیران ہو، کہ جس مغالطہ کا شکار ان کو بنا لیا گیا تھا، اس کی توجیہ کیا کرے، حالاں کہ مستقبل کی تاریخ میں پیش آنے والے جن حوادث و واقعات کا ذکر دینی وثائق میں بطور آثار قیامت کیا گیا ہے کاش ان کے متعلق یہ بنیادی بات ان کی سمجھ میں آجاتی کہ یہ سارے واقعات ایک ساتھ زمانہ کے کسی محدود حصہ میں اچانک پیش آئیں گے، یہ فیصلہ قطعاً عاجلانہ اور عامیانہ فیصلہ ہے، اور اصل حقیقت وہی ہے، جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیدنا الاستاذ الامام مولانا انور شاہ الکشمیریؒ فرمایا کرتے تھے ان کی املائی شرح فیض الباری میں بھی ہے۔

الا تری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم عدّ من اشراط الساعۃ	کیا تم نہیں دیکھتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی وفات کو بھی قیامت کے شرائط

قبضه من وجه الارض، وفتح بيت المقدس وفتح القسطنطنيه فهل تراها متصلة او بينها فاصلة متفاصله ص ۲۳ ج ۴ (فیض الباری شرح بخاری)

میں شمار فرمایا ہے، اور ان ہی شرائط قیامت میں بیت المقدس اور قسطنطنیہ کی فتح کے واقعات بھی ہیں پھر کیا یہ سارے واقعات باہم ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، یا ان کے درمیان غیر معمولی فاصلے ہیں۔

بہرحال یاجوج و ماجوج کے کھل جانے کے ساتھ ہی خواہ مخواہ مہدی اور مسیح کی تلاش کا جذبہ عوام میں جو بھڑکا دیا گیا، سچ پوچھیے تو ایک "بڑی حقیقت" شورش اور ہنگامہ کے اس طوفانی گرد وغبار میں دب کر رہ گئی، ورنہ بقول الاستاذ الامام الکشمیری واقعہ کی اصل صورت یاجوج و ماجوج کے متعلق یہ تھی کہ

لهم خروج مرة بعد مرة وقد خرجوا قبل ذلك ايضا وافسدوا في الارض بما يستعاذ منه نعم يكون لهم خروج الموعود في آخر الزمان وذلك اشدها۔

(اچانک ایک دفعہ وہ چل پڑیں گے ایسا نہیں ہے بلکہ) بار بار نکلتے رہیں گے، آخر پہلے بھی تو وہ نکلے، اور زمین میں وہ گڑ بڑ مچائی کہ اللہ اپنی پناہ میں اس سے رکھے۔ ہاں! آخر زمانہ میں بھی ان کے نکلنے کا وعدہ کیا گیا ہے اور ان کا یہ خروج سب سے زیادہ سخت ہوگا۔

اور دنیا کے آخری ایام میں بھی ان کے خروج کی مدت یعنی نکلنے کے بعد کب تک دنیا میں وہ گڑبڑ مچاتے رہیں گے، اس کو کون متعین کر سکتا ہے، البتہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خروج کے بعد بالآخر ان کو تہس نہس کرنے اور ان کے مفسدانہ مصائب سے نجات دینے کے لیے قدرت کی طرف سے خاص انتظام ہوگا، اور مقابلہ کے لیے غیر معمولی برگزیدہ ہستیاں سامنے آئیں گی، ہمارے یہاں کی روایتوں میں بھی اس آخری کش مکش کا ذکر پایا جاتا ہے۔ جن میں رطب ویابس ہر طرح کی چیزیں شریک ہیں اور عوام میں وہی زیادہ مشہور ہوگئی ہیں اور "یاجوج و ماجوج" کے نام کے سنتے ہی ان باتوں کی طرف لوگوں کا ذہن منتقل ہو جاتا ہے حالانکہ تنقید روایات کے عام ائمہ اور ارباب تحقیق کا یہ فیصلہ کتابوں میں نقل بھی کیا جاتا ہے کہ

انه قد اختلف في عددهم وصفاتهم ولم يصح في ذلك شي (فیض الباری بحوالہ البحر ص ۲۶ ج ۴)

یاجوج و ماجوج کے شمار اور ان کے خصوصیات میں اختلاف ہے اور اس سلسلہ میں کوئی بات صحیح روایت سے ثابت نہیں۔

مگر پھر بھی ان ہی روایات کی بنیاد پر ایسی باتیں عوام میں پھیل گئی ہیں کہ " یاجوج ماجوج والوں میں بعض لوگوں کا قد غیر معمولی طور پر دراز ہوگا، اور ان ہی میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کا قد چار ہاتھ لانبا اور چوڑائی بھی ان کی چار ہاتھ ہی ہوگی، اور ایک طبقہ ان ہی میں ایسا بھی ہوگا جن کا قد بالشت دو بالشت سے زیادہ نہ ہوگا۔ اور یہ کہ کچھ لوگ ان ہی میں ایسے بھی ہوں گے، جو اپنے ایک کان کو اوڑھیں گے اور ایک کو بچھائیں گے، ان کی کثرت تعداد کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے، اور یہ کہ عورتوں کے استعمال میں بھی کسی خاص آئین و قانون کے پابند نہ ہوں گے، یہی حال کھانے پینے میں بھی ان کا ہوگا کہ کسی قسم کا جانور ہو، ہاتھی ہو، سور ہو، اونٹ ہو، جنگلی ہو، اہلی ہو، سب ہی ہی کو چٹ کر جاتے ہیں[۱]۔"

عجیب بات ہے کہ یاجوج و ماجوج کے متعلق یہ اور اسی قسم کی روایاتی باتوں کا چرچا تو عوام و خواص سب ہی میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن ان ہی روایتوں میں ہم ایسی چیزیں بھی جو پاتے ہیں، مثلاً البیہقی کی کتاب البعث کے حوالہ سے مشہور صحابی ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت تفسیر کی کتابوں میں پائی جاتی ہے جس میں ہے کہ ابن عمر فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ

من وراءھم ثلاث امم تاویل و تاریس و منسک	یعنی یاجوج و ماجوج کے پیچھے تین قومیں ہیں تاویل و تاریس و منسک۔

ج ۴ ص ۲۵

امام بیہقی کے علاوہ سیوطی نے لکھا ہے کہ طبرانی، ابن المنذر وغیرہ حدیث کے چوتھے درجے کی کتابوں میں بھی یہی روایت پائی جاتی ہے، اور علاوہ ابن عمر کے دوسرے صحابی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف بھی یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ انھوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی سنا تھا۔ دیکھو در منثور ج ۴ ص ۲۴۹

اور اب ملائیے ابن عمر اور ابن مسعود کی اس روایت کو بائبل کی اس کتاب کی عبارت سے جو حزقیل نامی نبی اسرائیل کے کسی بزرگ کی طرف منسوب کر کے عہد عتیق کے مجموعہ میں شریک ہے۔ ڈھائی ہزار سال سے کم مدت کا یہ تاریخی وثیقہ نہیں ہے[۲]۔ بہرحال اسی کتاب میں حزقیل نبی کی طرف یہ یا اسی کے قریب قریب الفاظ منسوب کرتے

---

[۱] تفسیر کی روایاتی کتابوں میں یہ روایتیں مل جائیں گی سیوطی نے اپنی تفسیر در منثور میں کافی ذخیرہ جمع کر دیا ہے لیکن عموماً یہ روایتیں غیر معتبر کتابوں سے ماخوذ ہیں اور تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر نومسلم یہودیوں اور عیسائیوں کے اقوال ہی ان میں زیادہ شریک ہیں تاہم یاجوج و ماجوج کی عددی اکثریت کے متعلق امام کشمیری کا خیال ہے کہ "قد صح فی کثرۃ عددھم احادیث" (ان کی عددی اکثریت کے متعلق بعض روایتیں صحیح ہیں) اس سلسلہ میں حیدرآباد کے امیر نگاہ نواب ظہیر یار جنگ کے سفرنامہ کا خیال آتا ہے، انھوں نے یورپ امریکہ کا سفر کیا تھا ان کا بیان ہے کہ غالباً ہالینڈ میں ان کو اتفاقاً ایک دو آدمی نہیں بلکہ مستقل آبادی ہی دکھائی گئی تھی جس کے باشندے حد زیادہ پستہ قد تھے پوری آبادی بونوں ہی بونوں سے بھری ہوئی تھی جن میں مرد عورت بچے سب ہی تھے۔ ۱۲ [۲] حزقیل علیہ السلام کے متعلق یہی سمجھا جاتا ہے کہ جب بخت نصر یہودیوں کو فلسطین سے اسیر کر کے لے گیا تو اس زمانہ میں وہ موجود تھے حاصل یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچسو سال پہلے حزقیل کا زمانہ ہے اس لیے ڈھائی ہزار سال سے کم کی یہ پیش گوئی نہیں ہے۔ ۱۲

ہوئے کہ

"خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا"

بہت سے آئندہ پیش آنے والے واقعات کا ذکر پایا جاتا ہے جن میں ایک جگہ یہ بھی ہے کہ

اور خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد
جوج کی طرف جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور
روس اور مسک اور توبل کا فرماں روا ہے
متوجہ ہو، اور اس کے خلاف نبوت کر اور کہہ
خداوند خدا یوں فرماتا ہے، کہ دیکھ! اے
جوج روس مسک اور توبل کے فرماں روا (حزقیل ۳۸ ۱ تا ۳)

پھر باب ۳۹ میں بھی ہے

پس اے آدم زاد تو جوج کے خلاف نبوت کر اور کہہ خداوند
خدا یوں فرماتا ہے کہ دیکھ! اے جوج روس، اور مسک
اور توبل کے فرماں روا میں تیرا مخالف ہوں۔"

اور اسی کے ساتھ جغرافیہ کی عام ابتدائی کتابوں میں "ایشیائی روس" کے زیر عنوان جو تفصیلات دیے گئے ہیں ان کو پڑھیے، جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے رقبہ سے چوگنا بڑا علاقہ سائیبریا کے نام سے روس ہی کے قبضے میں ہے جس میں اسٹیپز اور ٹونڈرا کے عریض و وسیع خطے شریک ہیں، اور ٹوبال سک منسک نامی شہر بھی ولادی واسٹاک اور کمسک وغیرہ نامی آبادیوں کے ساتھ اسی علاقے میں پائے جاتے ہیں۔

ان تفصیلات کو اپنے علم میں شریک کرتے ہوئے بتایا جائے کہ حضرت الاستاد الامام الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے اس دعویٰ پر کون تعجب کر سکتا ہے، کہ

(اما الروس فھم من ذریۃ یاجوج ص ۲۳ ج ۳)	روس والے یاجوج کی نسل میں ہیں۔

اسی کے ساتھ بعض مواقع پر شاہ صاحب یہ بھی فرماتے تھے:۔

ان یاجوج وماجوج لا یبعد ان یکونوا اھل روسیا وبرطانیا ص ۲۳ ج ۴ فیض الباری	یاجوج و ماجوج اگر روس اور برطانیہ والے ہوں تو اس دعوے کو بعید از واقعات نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے،

دوسرا جز یعنی روس کے علاوہ برطانیہ والوں کا بھی یاجوج وماجوج والوں ہی میں سے ہونا، چوں کہ یہ ایک تاریخی مسئلہ ہے، اور شروع ہی سے عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ اصولاً اپنے اس مضمون میں کسی ایسے مسئلہ کا حتی الوسع میں ذکر نہیں کروں گا جس کی حیثیت صرف تاریخی ہو، یہ کام ارباب تاریخ کا ہے، اور اپنے معلومات کی روشنی میں چاہیں تو اس مسئلہ کی تحقیق وہ کرسکتے ہیں۔[1]

اور سچ تو یہ ہے کہ جیسے "المسیح الدجال" کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ بجائے ذات کے اصل ضرورت اس کی ہے کہ ان "دجالی صفات" کا پتہ چلایا جائے، جن کی وجہ سے "دجال" دجال بن جائے گا۔ اسی طرح یہ ڈھونڈھنا کہ دنیا کی کن قوموں کو "یاجوج وماجوج" قرار دینا چاہیے ایک غیر ضروری تاریخی مسئلہ سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ اس سلسلہ میں بھی بجائے ذات کے ہمیں ان صفات ہی پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیئے جس کی وجہ سے مذاہب و ادیان میں یاجوج وماجوج سے چوکنا رہنے پر اصرار کیا گیا ہے۔

اسی نقطۂ نظر سے آپ پھر سورہ کہف کو اٹھا لیجئے، اس کا تذکرہ کرنے کے بعد کہ جب صور پھونک دیا جائے گا تو "یاجوج وماجوج" کو ہم اکٹھا کریں گے، یعنی فرمایا گیا ہے کہ "ونفخ فی الصور فجمعناهم جمعاً" اس کے بعد آخر سورہ تک جو آیتیں پائی جاتی ہیں، ان کو پڑھتے جائیے، میں بالترتیب ان آیتوں کو ترجمہ کے ساتھ اور جو کچھ اپنے ناقص خیال میں آیتوں سے میری سمجھ میں آیا ہے اسے پیش کردیتا ہوں۔

(۱)

پہلی آیت اس سلسلہ کی یہ ہے یعنی یہ فرماتے ہوئے کہ

وعرضنا جهنم يومئذ للكافرين عرضا	اس دن (یعنی نفخ صور سے اکٹھے ہونے کے بعد) جہنم ان ہی کافروں پر ہم پیش کریں گے، خاص طور پر پیش کرنے کی شکل میں۔

---

[1] یورپ کی قوموں کے نسب ناموں اور بے شمار نام کے قبائل ان میں جو پائے جاتے تھے ان سے واقفیت کے سوا اس سلسلہ میں ایسی باتیں کہ انگلستان میں میگاگ ہل (یعنی کوہ ماجوج نامی کوئی پہاڑی پائی جاتی ہے، یا ہر سال انگلستان میں "گاگ میگاگ" یعنی یاجوج وماجوج کا میلہ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے جما چلا آتا ہو، یا شہر لندن میں گلڈ ہال نامی جو عمارت ہے، شاید لندن کارپوریشن کا صدر دفتر اسی عمارت میں، اس کے دروازے پر "گاگ ومیگاگ" یعنی جوج وماجوج کی برنجی مورتیں آمنے سامنے جو کھڑی کی گئی ہیں، یہ کس راز کی طرف اشارہ ہے، یہ اور اسی قسم کے بیسیوں دلچسپ مسائل کو تاریخ کے علماء اپنی بحث اور تلاش وجستجو کا موضوع بنا کر نتیجے تک پہونچ سکتے ہیں، اس مضمون کی حد تک میرے لیے اتنے چند اشارے بھی کافی ہیں ۔۔۔ ۱۲

آگے ان ہی " الکافرین " کے صفات کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے،

الذین کانت اعینھم فی غطاء عن ذکری وکانوا لا یستطیعون سمعاً	یعنی وہ لوگ جن کی آنکھیں میری یاد سے پردے میں رہیں اور وہ سننا بھی (میرے ذکر) کا برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

ظاہر ہے کہ پہلا جز یعنی جہنم کے پیش ہونے کی کیا صورت ہوگی، اس کی حقیقت کا انکشاف تو اسی دن ہوگا اور ان ہی کو ہوگا جن پر جہنم اپنے خاص رنگ میں پیش ہوگی، لیکن دوسرے جز کے لیے قیامت کے قائم ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اسی دنیا کی بات ہے ڈھونڈھیے اس بات کو کہ کن قوموں میں یہ صفات اور خصوصیات پائے جاتے ہیں، مشرکین اور بت پرست، یا ان کے سوا مختلف ملل و دیانات کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے والی قوموں کے لیے مفید ہو یا غیر مفید لیکن خالق کے ذکر سے قطعاً بے تعلق رہنے کا دعویٰ ان کے متعلق نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ دوسرے معبودوں ہی کے ساتھ سہی لیکن بہرحال عالم کے خالق کی یاد سے کوئی قوم خالی نظر نہیں آتی، پھر اسی ادعا کا یہ حصہ یعنی " اور وہ سننا بھی (میرے ذکر کا) برداشت نہیں کر سکتے تھے "۔

دیکھ لیجیے، کہ ذکر اللہ کے سننے کو بھی آج جو برداشت نہیں کر سکتے، وہ کون لوگ ہیں، ان کی تقریروں میں، تحریروں میں تلاش کیجیے، ہر چیز کے ذکر کے ساتھ جس کے ذکر سے وہ خالی نظر آئیں گی، یہ اپنے پیدا کرنے والے خالق کردگار ہی کا ذکر ہوگا، اس بات میں ان کی نفرت کا درجہ استھزاء، سخریہ، کے حدود تک کن لوگوں میں پہونچ چکا ہے کیا اس کے لیے کسی ریسرچ اور جستجو کی ضرورت ہے

رپٹ لکھوائی ہے یاروں نے جا جا کے یہ تھانے میں
کہ اکبر یاد کرتا ہے خدا کو اس زمانے میں

اکبر مرحوم کا یہ شعر آج جو زبان زد عوام بنا ہوا ہے، کیا یہ کوئی اتفاقی بات ہے یا ان کی اس ظرافت میں کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں ہے؟

ایں سخن را چہ جواب ست تو ہم می دانی

(۲)

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے،

افحسب الذین کفروا ان یتخذوا عبادی من دونی اولیاء انا اعتدنا جھنم للکافرین نزلا	کیا وہی لوگ جنھوں نے انکار کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ بنالیں میرے بندوں کو میرے سوا اپنے پشت پناہ ہم نے تیار کر رکھی ہے جہنم ان کی مہمان نوازی کے لیے

خالق عالم حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی یاد اور ذکر سے کلی انحراف اور بغاوت کے بعد فطرت انسانی کے ایک خاص رجحان کی طرف ایک خاص قسم کا اشارہ سوچنے سے آپ کو اس آیت میں مل سکتا ہے، کم از کم خاکسار کا ناچیز احساس یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے خالق کی عائد کی ہوئی آئینی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے یا نکل بھاگنے کا زندگی کے موجودہ ابتلائی دعبوری دور میں یہ ایک آسان طریقہ ہے کہ اپنے خالق سے اپنا رشتہ توڑ لیا جائے اور

"خدا کو کیا پڑی، میرے تمہارے درمیان کیوں ہو"

کہتے ہوئے، جو جی میں آئے آدمی کرتا چلا جائے۔ عموماً الحادی زندگی کے نیچے کچھ اسی قسم کی شعوری یا غیر شعوری ذہنی چالاکیاں اور بے باکیاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ الحاد اور بے دینی کی زندگی کا ایک پہلو تو یہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہی انسان جو سراسر احتیاج، اور اپنے خاص حالات کے لحاظ سے صرف فقرا در کھئے تو کہہ سکتے ہیں کہ مجسم بھیک اور صرف سوال ہی سوال کے سوا وہ اور کچھ نہیں ہے، اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی بیرونی امداد کے بغیر وہ بسر نہیں کرسکتا، کھانے پینے، پہننے حتیٰ کہ سانس تک لینے میں غیر کی محتاجی، غریب آدمی کی زندگی کا ایسا کھلا ہوا خاصہ ہے جس سے قطع نظر کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں، وہ بیمار پڑتا ہے جس علاقہ میں رہتا ہے وہاں عموماً وبائیں پھوٹتی رہتی ہیں، قحط اور خشک سالی کے حملے ہوتے رہتے ہیں جنگوں کا خلفشار مچتا رہتا ہے، بے آئینی اور بدامنی کا دور و دورہ شروع ہوجاتا ہے، یہ اور اسی قسم کے پیش آنے والے حوادث وواقعات کے مقابلہ میں کیا کیا جائے؟ ایک سوال ہے جو تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے بنی آدم کے دل و دماغ میں ہلچل مچائے ہوئے ہے۔ خالق عالم کی طرف توجہ کی جائے اور اس کی پشت پناہی یا دلائت میں اپنی زندگی کو ڈال دیا جائے، یہ حل تو اس سوال کا بظاہر آسان نظر آتا ہے لیکن اسی کے ساتھ انسان کو جس نصب العین کی تکمیل کے لیے پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے، اس کی ذمہ داریاں اس راہ میں قدرتاً عائد ہوجاتی ہیں، قرآن میں اس کا اعلان کرتے ہوئے کہ

اذا سئلک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان	میرے بندے جب پوچھیں میرے متعلق تو کہہ دو کہ میں قریب اور پاس ہی رہتا ہوں اور پکارنے والوں کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

آگے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

فلیستجیبوا لی ولیومنوا بی لعلھم یرشدون	بس چاہیئے کہ وہ بھی مجھے جواب دیں، اور مجھے مانیں، تاکہ وہ سیدھی راہ پر چل پڑیں۔

اس میں کارروائی کے اسی دوطرفہ پہلو کی طرف راہ نمائی فرمائی گئی ہے، حاصل یہی ہے کہ مجھ سے کچھ لینا چاہتے ہو تو جو کچھ تم سے میں چاہتا ہوں اسے تم بھی پیش کرتے رہو "لعلھم یرشدون" تاکہ وہ سیدھی راہ پر

چڑھ جائیں کا مطلب یہی ہے راہ یابی کا فطری طریقہ یہی ہے لیکن جو خود تو سب کچھ لینا چاہتے ہوں مگر خود کسی قسم کی ذمہ داری اپنے اوپر اپنے پیدا کرنے والے کی لینا نہیں چاہتے، ان میں ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے، جنھوں نے خالق عالم اور اپنے درمیان آلہہ یعنی دیوتاؤں اور مخلوق معبودوں کا ایک سلسلہ فرض کرلیا۔ شعور اس کا ان کو ہو، یا نہ ہو، لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس تدبیر سے اپنی کار برآریوں کی ایک ایسی راہ اپنے خیال میں بہ زعم خیال میں انھوں نے نکال لی ہے، جس میں ان کے زعم یا وہم کے مطابق ان کی ضرورتوں کی تکمیل کا تو انتظام ہو جاتا ہے، مگر خود ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ لیکن ان درمیانی وسائط اور مخلوق معبودوں کے متعلق ان کا احساس ہوتا یہی ہے کہ نذر و نیاز وغیرہ چڑھاوے کی وقتی پیش کشوں سے خوش ہو کر ہماری حاجتوں کو ہمارے ہی آلہہ یا دیوتا پوری کرا دیتے ہیں، لیکن ان کے معبودوں کی طرف سے کسی قسم کا کوئی آئینی مطالبہ ان پر عائد نہیں ہوتا، اور غرض ان کی ہوتی بھی یہی ہے کہ آئینی ذمہ داری کے بغیر ان کی ضرورت پوری ہوتی رہے، اپنے ان معبودوں کی نذر و نیاز کے سلسلے میں بیش قرار رقوم صرف کر دینا ان کو اس سے زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آپ پر اور اپنے نفس کی خواہشوں پر پابندیاں عائد کریں۔ یہ مشاہدہ کی بات ہے کہ مشرکانہ کاروبار کرنے والوں میں کسی قسم کی ایسی اخلاقی اور آئینی ذمہ داری جو ان کے دیوتاؤں کی طرف سے ان پر عائد کی گئی ہو اس کا احساس نہیں پایا جاتا۔ خواہ ان معبودوں کی پوجا پاٹ میں ان کا جتنا بھی خرچ ہو جائے، گویا خدا کی ذمہ داریوں کے احساس کو دبانے کی یہ ترکیب اس طبقہ نے تراش لی ہے کہ خدا کے سامنے انھیں آنا ہی نہ پڑے، بلکہ خود تو وہ اپنے خود تراشیدہ معبودوں کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان کے معبودوں سے چونکہ خدا راضی ہے۔ اس لیے اللہ میاں سے ان کی ضرورتوں کی تکمیل وہ کرالیں گے۔

اسی طریقہ کے مقابلہ میں ایک دوسری تدبیر یہ بھی ہے کہ خدا کے سامنے سے تو اپنے آپ کو مطلق العنان اور آزاد رکھنے کے لیے وہ بھاگ جاتے ہیں، بھول کر بھی نہ خدا کا نام لینا چاہتے ہیں، اور نہ ان کو وہ یاد ہی آتا ہے، باقی زندگی کی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے مشرکوں کے نادیدہ و خود تراشیدہ اور ان کے خیال کے مطابق خدا رسیدہ معبودوں کی جگہ انھوں نے ہر ضرورت اور حاجت کے لیے فنی حذاق یا ٹیکنیکل اکسپرٹوں کا طبقہ کھڑا کر لیا ہے، جس کی تعلیم و تربیت پر اس سے زیادہ توجہ اور زیادہ خرچ کرتے ہیں، جتنی توجہ اور جتنے مصارف کا بار مشرکانہ کاروبار والے اپنے معبودوں کو راضی رکھنے کے لیے برداشت کرتے ہیں اور ہر پیش آنے والی ضرورت کے لیے وہ ان ہی حذاق اور اکسپرٹوں کی طرف رجوع ہوتے ہیں، ان ہی کی ولایت اور پشت پناہی میں ان کی ساری زندگی بسر ہوتی ہے، کسی ایسی جگہ قیام ان کے لیے دوبھر بلکہ شاید ناقابل تصور ہوتا ہے جہاں اپنے ان اولیاء یا پشت پناہوں کے دستیاب ہونے میں کسی قسم کی دشواری کا خطرہ

رہو، ان ہی انسپکٹروں کے ساتھ ساتھ ایک طبقہ ان میں لیڈروں اور قائدوں کا بھی ہوتا ہے، اور عموماً اجتماعی حاجات میں ان ہی پر بھروسہ کیا جاتا ہے، الغرض خدا کی ذمہ داریوں سے بچتے ہوئے ضرورتوں اور حاجتوں کی تکمیل میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیش آئے۔ اس کے لیے انہی مذکورہ بالا دو طریقوں میں سے کسی ایک یا دونوں کو ساتھ ساتھ اختیار کرنے والوں نے اختیار کر رکھا ہے، قرآن میں مشرکانہ کاروبار والوں کے طرز عمل کی تعبیر کے سلسلے میں عموماً اس قسم کے الفاظ پائے جاتے ہیں مثلاً

اتخذوا من دونہ آلھۃ — انھوں نے میرے سوا معبود بنا لیے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ انہی ضرورتوں اور حاجتوں میں جن پر مشرکین بھروسہ کیا کرتے تھے اور جس کی طرف اس راہ میں رجوع ہوتے تھے ان کو آپ دیکھیں گے، عموماً "آلھۃ" کے نام سے قرآن ان کو موسوم کرتا ہے، لیکن سورۂ کہف کی مذکورۂ بالا آیت میں بجائے اس کے ہم "عبادی من دونی اولیاء" کے الفاظ پاتے ہیں یعنی یہاں بجائے الٰھۃ کے "اولیاء" کا لفظ استعمال کیا گیا ہو اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مشرکوں کے عام معبودوں اور آلہہ کے متعلق قرآن میں جتلایا گیا ہو کہ عموماً وہ نام ہی نام ہوتے ہیں لیکن ان ناموں اور اسمار کو مسمّے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بایں معنی کہ درحقیقت ان ناموں سے جن چیزوں کی تعبیر کرتے ہیں، وہ معدوم اور کچھ نہیں ہوتیں، زیادہ تر مشرکوں کے معبودوں کی عام نوعیت یہی ہوتی ہے کہ وہ صرف مفروضہ اسماء اور نام ہی نام ہوتے ہیں، اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ جن کمالات و تصرفات کو ان معبودوں کی طرف اپنے خیال میں مشرکین منسوب کرتے ہیں، ان سے قطعاً ان کو کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، گویا پتھر کا نام جیسے پانی رکھ لیا جائے اور نام رکھ کر توقع دلائی جائے کہ پانی کا کام اس پتھر سے لیا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بھی فرضی نام یا اسم بے مسمیٰ ہی کی ایک شکل ہے، اور مشرکوں کے معبودوں پر قرآنی تنقید کے یہ الفاظ یعنی

ان ھی الا اسماء سمیتموھا — نہیں ہیں وہ لیکن صرف چند نام جو رکھ لیے

انتم وآباءکم — ہیں خود تم نے یا تمھارے باپ دادوں نے۔

ہر حال میں صادق آتے ہیں،

لیکن اس کے مقابلہ میں حق تعالیٰ کی عائد کی ہوئی آئینی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے والوں نے پشت پناہوں اور اولیاء کا جو طبقہ انسپکٹرس (خلّاق) اور لیڈرس (قوّاد) وغیرہ ناموں سے بنا لیا ہے، ظاہر ہے کہ اس کی نوعیت مشرکوں کے معبودوں سے اس باب میں مختلف ہوتی ہے یعنی خلاق و قواد کا یہ گروہ اسی طرح خدا کے واقعی بندے اور مخلوقات میں، جیسے ان پر بھروسہ کرنے والے خدا کے بندوں اور مخلوقات میں شامل ہیں، اور جن ضرورتوں اور حاجتوں میں ان پر اعتماد کیا جاتا ہے ان سے ان کی بے تعلقی کا حال بھی وہ نہیں ہوتا، جو مشرکوں کے معبودوں کا ہے، بلکہ قدرتی قوانین کا علم حاصل کر کے اسی علم کے مطابق عملی نتائج حاصل کرنے کا طریقہ

ان فنی ماہرین کو سکھایا جاتا ہے، اور خواہ ہر حال میں ان سے متوقعہ ضرورتیں پوری ہوں یا نہ ہوں، لیکن ان ضرورتوں سے مشرکوں کے خود تراشیدہ معبودوں کی طرح ان کو قطعاً بے تعلق بھی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

بہرحال جہاں تک میرا خیال ہے مذکورہ بالا آئت میں بجائے "آلھۃ من دونی" کے "ان یتخذوا عبادی من دونی اولیاء" (یعنی میرے بندوں کو میرے سوا یا مجھے چھوڑ کر انھوں نے اپنے اولیاء اور پشت پناہ بنا جو رکھا ہے) یہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں، ان میں بظاہر حق تعالیٰ کی آئینی ذمہ داری سے آزاد رہنے کی جیسا کہ میرا ناچیز خیال ہے اسی دوسری تدبیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں بجائے خود تراشیدہ نام نہاد آلہہ اور معبودوں کے، اکسپرٹوں، اور لیڈروں کو بنانے والے اپنا پشتیبان، اور اولیا، بنا لیتے ہیں اور یوں اپنے پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل ومجدہ سے بے تعلق وقطعاً بے تعلق رہ کر زندگی بسر کرنے کی ایک راہ انھوں نے جو نکال لی ہے، تو فرمایا گیا ہے کہ

انا اعتدنا جھنم	بلاشبہ ہم نے تیار کر رکھا ہے ان ہی انکار کرنے
للکافرین نزلا	والے کافروں کیلئے جہنم مہماں نوازی کے واسطے۔

مطلب یہی ہے کہ زندگی کا موجودہ عبوری دور جو بہرحال گزر ہی جاتا ہے، سب ہی کی گزر جاتی ہے، ان سے پہلے مشرکانہ کاروبار والوں نے خدائی ذمہ داریوں سے بچنے کی جو صورت نکال لی تھی بُرے بھلے وہ بھی اپنی زندگی کے دن پورے کر کے دنیا سے گیے، اور تم نے جو نئی راہ جسے سائنٹفک راہ زندگی گذارنے کی تم نے باور کرلیا ہے، یہ بھی گذرے گی لیکن تم ہو، یا وہ ہوں، بہرحال قدرت کے مقرر کردہ نتیجے اور انجام سے بچ کر نکل نہیں سکتے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ پیدا کرنے والے نے جس مقصد کے لیے اور جس نصب العین کی تکمیل کے لیے تمھیں پیدا کیا تھا، تم اس مقصد اور نصب العین کو لاحاصل قرار دے کر اپنے کرتوت کے خمیازہ کو نہ بھگتو، بلکہ نتیجہ کا دن جب آئے گا تو قدرت کی طرف سے ان کے آگے زندگی کا وہ دردناک قالب پیش ہو گا جس کا اصطلاحی نام جہنم ہے۔

بہرحال مشرکانہ کاروبار کی تعبیر جن خاص الفاظ میں عموماً قرآن کرنے کا عادی نظر آتا ہے، بجائے ان الفاظ کے یہاں الفاظ میں رد وبدل جہاں تک میرا خیال ہے بلاوجہ نہیں کیا گیا ہے۔ دوسروں سے بھی یہی عرض کروں گا، کہ قرآن کے طریقۂ بیان کی خصوصیتوں پر توجہ دیں گے، تو تجربہ ان کو خود بتائے گا کہ ان تبدیلیوں میں کوئی خاص اور اہم نکتہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ کچھ طول بیانی سے کام تو ضرور لینا پڑا لیکن کیا کیا جائے۔ پہلے سے سوچی سمجھی باتیں ہوتیں۔ تو مختصر اشارے بھی کافی ہوسکتے تھے۔ لیکن اچانک نئے پہلوؤں کی طرف توجہ دلانی پڑتی ہے

۵ نوبت کہنہ فروشاں درگذشت　٭　نو فروشانیم ایں بازار است

یہ تو خیر بڑوں کی باتیں ہیں مولانا روم جیسی اجتباعی ہستیوں کے قلم سے ایسی باتیں نکل سکتی ہیں اور ان ہی کا فرمایا ہوا یہ شعر ہے ہم جیسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچھ ابن تیمیہ کے متعلق

از، مولانا محمد ادریس صاحب ندوی نگرامی

الفرقان میں ابن تیمیہ کے متعلق اس سے پہلے اس کے دو مضمون نکلے ہیں ان دونوں مضمونوں میں صراحت تھی کہ

ابن تیمیہ اور ابن قیم باایں ہمہ جلالت قدر و رفعت شان بہرحال غیر معصوم انسان تھے جس طرح دوسروں کی رائے غلط ہو سکتی ہے اسی طرح وہ بھی غلطی کر سکتے ہیں اور ان کا اختلاف مسئلہ کے سقم کی نشانی نہیں ہے ——— (الفرقان ستمبر ۱۹۵۱ء)

ہم ابن تیمیہ کو معصوم نہیں مانتے ہیں اور بے شبہ غلطیوں سے معصوم کے سوا دوسرے کو نجات نہیں ——— (الفرقان دسمبر ۱۹۵۱ء)

یہ الفاظ ہم نے قصداً اس لیے لکھے تھے کہ سلف صالحین اور جمہور امت کا دامن ہم کسی طرح نہیں چھوڑنا چاہتے ہیں اور محض حسن ظن اور عقیدت کی وجہ سے نہیں بلکہ بحمد اللہ سیکڑوں صفحات کے مطالعہ اور اہل علم کے حالات پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ سلف صالحین کے اتباع سے زیادہ پرامن دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے! گو جمہور سے اختلاف کتاب و سنت سے ارتداد کے مرادف نہیں اور نہ ہر غلطی کفر و ضلالت کہی جا سکتی ہے مگر عقائد کا تفرد معمولی چیز بھی نہیں ہے بلکہ یہ مہلک اور مضرت رساں ہے اسی طرح اگر عملی تفرد اور فرعی اختلاف بھی تمام ائمہ حق سے کنارہ کشی پیدا کرتا ہو تو وہ بھی ادنیٰ درجہ نہیں رکھتا ہے! [1]

---

[1] اس موقعہ پر حضرۃ الاستاذ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کی ایک نصیحت بار بار یاد پڑتی ہے دار المصنفین کے زمانہ قیام میں ایک دن مجھ سے ارشاد فرمایا کہ میں اپنے پچاس سالہ تصنیفی تجربہ کے بعد آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ کسی (باقی صـ۳۶ پر)

ابن تیمیہ کا معاملہ یہ ہے کہ احکام فرعیہ میں انھوں نے جا بجا ائمہ اربعہ سے اختلاف کیا ہے، مسائل اعتقادیہ میں بھی ان کی طرف بعض تفردات منسوب ہیں گو ان تفردات کی نسبت ابن تیمیہ کی طرف بحث طلب ہے۔ مخالفین ان کو ان جرائم کے مجرم قرار دیتے ہیں اور موافقین ان کی برأت کرتے ہیں اور عقائد کے باب میں ان کو محدثین اور حنابلہ کے طریق پر مانتے ہیں!

اس صورت حال کے پیش نظر ابن تیمیہ کے مناقب کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ہم نے دونوں مضمونوں میں ان کی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا تھا مگر منقبت عمومی کے سامنے یہ اشارات واضح نہ ہو سکے اور ضرورت محسوس ہوئی کہ ناظرین الفرقان پر یہ حقیقت کھول دی جائے کہ ابن تیمیہ کے علم و فضل کے اظہار و اعتراف کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں ہیں کہ کلیتہً ان کی ہر رائے صحیح اور قابل تقلید ہے! ہم کو ابن تیمیہ کے تبحر علمی، وسعت نظر، نصرت حق اور حمایت دین کے جوش و ولولہ کا اعتراف ہے۔ مگر یہ بھی یقین ہے کہ بشری کمزوریوں سے وہ خالی نہ تھے اور کیا عجب ہے کہ یہی کمزوریاں ان کو بار بار زنداں خانہ کی طرف لے گئی ہوں، اور مجالس مناظرات کا باعث بنی ہوں، حاسدین اور اعداء سے کوئی امام اور عظیم القدر خالی نہیں رہا خود ابن تیمیہ کے زمانہ میں بڑے بڑے اشخاص ان کے اساتذہ اور شرکاء درس رہے ہیں مگر کسی کو ایسے سخت حالات نہیں پیش آئے ان کی یقیناً کوئی وجہ ضرور ہے۔

بہرحال ان حالات کے اسباب جو بھی ہوں یہاں اس کے فیصلہ کا موقع نہیں ہے ہم کو اجمالاً یہ کہنے میں کوئی تردد نہیں ہے کہ مسائل اعتقادیہ یا احکام فرعیہ میں اگر ابن تیمیہ سلف صالحین سے کہیں منفرد ہیں تو اس تفرد میں ہم ان کے ساتھ نہیں ہیں، اسی طرح اگر کہیں ارباب طریقت پر انھوں نے بیجا تنقید کی ہے تو اس کے بھی ہم مؤید نہیں ہیں، اور جو شخص ان کے اصلی یا فرعی تفردات سے یا ارباب تصوف کی نامناسب جرح سے نفع اٹھا کر امت میں انتشار اور تفرق کا باعث بنتا ہے ہم اس کو ابن تیمیہ کا نادان دوست سمجھتے ہیں۔ "خذ ما صفا ودع ما کدر" کا اصول ہمارے پیش نظر ہونا چاہیئے، ابن تیمیہ کے عہد اور ان کے بعد کے جلیل القدر اہل علم کا ان کے بارے میں یہی خیال رہا ہے چنانچہ علامہ ذہبی ابن تیمیہ کے کمالات حفظ و علم کے اقرار کے باوجود فرماتے ہیں

میں ابن تیمیہ کی ہر بات کو نہیں مانتا ہوں وہ انسان تھے ان سے غلطیاں ہوئی ہیں۔

(السعی المشکور صفحہ ۵۸)

(بقیہ صفحہ سابقہ) مسئلہ میں جمہور امت سے الگ نہ ہونا چاہیئے اور سلف صالحین کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیئے، اہل علم کے کچھ تفردات ہوتے ہیں مگر ان تفردات میں اور مفاسد سے قطع نظر ایک بڑا مفسدہ یہ ہے کہ نظم ملت میں خلل پڑتا ہے! یہ تفردات امت میں حسن قبول تو پاتے نہیں ہیں البتہ تفرقہ ضرور پیدا کرتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی درر کامنہ ج اول ص۱۵۱ میں۔ علامہ ذہبی سے نقل کرتے ہیں

میں ابن تیمیہ کو معصوم نہیں مانتا ہوں، بعض اصولی اور فروعی مسائل میں ان کا میں مخالف ہوں، کثرت علم کے باوجود ان کے مزاج میں گرمی تھی، غصہ تھا جس کی وجہ سے مخالف کے دل میں ان کی عداوت بیٹھ جاتی تھی۔

محدث ابن کثیر جو ابن تیمیہ کے خاص مداحوں میں ہیں وہ بھی کہتے ہیں کہ

ابن تیمیہ سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں (القول الجلی ص۸)

حافظ ابن حجر عسقلانی کا ارشاد ہے:۔

ابن تیمیہ انسان تھے غلطی بھی کرتے تھے اور جن چیزوں میں انھوں نے غلطی کی ہے اس میں ان کی پیروی نہ کی جائے گی، مثلاً مسئلہ زیارت اور طلاق۔ (القول الجلی ص۸)

حافظ عسقلانی نے مزید کہا کہ

صاحب علم و عقل کو چاہیئے کہ ابن تیمیہ کی تصانیف میں جو منکرات ہیں ان کو آگاہ کر دے اور اس سے لوگوں کو بچایا جائے اور جو فضائل ہیں ان کا اقرار کیا جائے (القول الجلی ص۹)

ملا علی قاری جو ابن تیمیہ کو نہ صرف اہل السنۃ والجماعۃ میں سے بلکہ اولیائے امت میں سے جانتے ہیں وہ ایک مسئلہ کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ

ابن تیمیہ نے بہت تفریط کی ہے (السعی المشکور ص۹) القول الجلی میں صراحت کے ساتھ مسطور ہے کہ

مسئلہ طلاق میں ابن تیمیہ سے سخت غلطی ہوئی (ص۷) مسئلہ زیارت میں ابن تیمیہ سخت خاطی ہیں (ص۴۹) ابن تیمیہ کی غلطی معلوم ہے (ص۵۳) ابن تیمیہ کی طرف فروع میں جو مخالفتیں منسوب ہیں یا بعض سادات صوفیہ پر جو طعن ان سے منقول ہے ہم اس میں ان کی بات نہیں مانتے ہیں (ص۵۳)

ذیل تذکرۃ الحفاظ کے حاشیہ ص۳۲ میں زیر ترجمہ امام ابن ناصر الدین محمد بن ابی بکر قیسی الدمشقی درج ہے کہ

علمار کی ایک جماعت ابن تیمیہ کے علم کا اعتراف کرتی ہے مگر ان کے شاذ مسائل میں ان کی پیروی نہیں کرتی ہے۔

جناب مولانا عبد الحئی صاحب فرنگی محلی، اپنی کتاب النافع الکبیر کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

ہمارے زمانہ میں ابن تیمیہ کے متعلق دو جماعتیں ہیں، ایک جماعت ان کے تمام اقوال کو وحی آسمانی سمجھتی ہے اور اس کی پابندی کرتی ہے خواہ جمہور سے مخالف ہوں، دوسری جماعت نے ان تفردات کی وجہ سے جو ان سے منقول ہیں ان کو اہل السنة والجماعة سے خارج کر دیا ہے،

اور میں درمیانی مسلک رکھتا ہوں اور وہی کہتا ہوں جو ذہبی نے کہا ہے کہ ابن تیمیہ علم کے سمندر ہیں مگر انسان ہیں ان سے غلطیاں ہوئی ہیں، بس ان باتوں کو دیکھا جائے جو صحیح ہیں ان کو قبول کیا جائے اور غلط باتوں کو رد کر دیا جائے صـ۱۴۱

سطور بالا کا حاصل یہی ہے کہ مخالفت اور موافقت دونوں کو حدود کا پابند ہونا چاہیئے یہ نہ ہونا چاہیئے کہ ایک مسئلہ میں اگر کسی سے غلطی ہوئی ہے تو اس کے بقیہ تمام مباحث کو رد کر دیا جائے یا موافقت کی صورت میں موافق کے ناحق مسائل کی بھی تائید کی جائے بلکہ حق و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہا جائے!

یہ اصول ابن تیمیہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ عام طور سے علماء امت کے ساتھ اہل تحقیق کا یہی معاملہ رہا ہے اور محققین کی تحریریں اس پر شاہد عادل ہیں!

اللهم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه
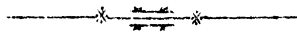
خط و کتابت اور ترسیل زر کے وقت خریداری نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے -

"منیجر"

انتخاب

از ———————— ادارہ

سچی باتیں "غلہ اور اگاؤ" کی مہم آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہندستان کی ایک ایک اسٹیٹ میں وزرائے نامدار سے لیکر دوسرے حکام والا مقام تک کتنا زور اس گاڑی کے آگے بڑھانے میں لگا چکے ہیں! اور اب یہ خبر آئی ہے کہ ایک سرکاری کمیٹی اس تحقیق کے لیے مقرر ہوئی ہے کہ آخر سرکاری اور نیم سرکاری ذریعوں کے ایڑی چوٹی کے زور صرف ہو جانے کے باوجود غلہ کیوں نہیں زیادہ اُگتا، اور خوراک کی مقدار ملک میں کیوں نہیں بڑھتی؟ ———— کمیٹی اور کمیشن کا تقرر مبارک ہو، لیکن ابھی پچھلے ہی سال تو رزرو بنک علاقہ بمبئی میں یہ تحقیق کرا چکا، اور یہ نتیجہ شایع کر چکا ہے کہ

اس مہم سے مقدار خوراک میں کچھ بھی دیرپا اضافہ نہیں ہوا ہے اور اس پر خرچ جتنا ہو گیا، اسے عملی نتیجہ سے کوئی مناسبت ہی نہیں"۔

اسٹیٹس مین (۱۲ فروری) کا اڈیٹوریل "خوراک کم اگنے" پر ہے اور اس میں یہ اطلاع اور یہ اعداد درج ہیں کہ پچھلے دو برس کے جو اعداد حاصل ہوئے ہیں ان سے یہ صاف طور پر نظر آجاتا ہے کہ اگرچہ زمین کا رقبہ اب زیادہ زیر کاشت ہے لیکن غلہ کی مقدار بجائے بڑھنے کے گھٹ رہی ہے، چنانچہ ۴۹ء سے ۵۱ء تک کل رقبہ زیر کاشت بہ قدر ۷ ہزار ایکڑوں کے بڑھ گیا لیکن غلہ کا رقبہ پیداوار بجائے بڑھنے کے بہ قدر ۳۱ ½ لاکھ ایکڑوں کے گھٹ کر رہا!!

انسان کے دعویٰ "رزاقیت و ربوبیت" کی کل کائنات آپنے دیکھ لی؟ رزاقی کی سرتوڑ کوششوں کا حاصل آپکے سامنے آگیا؟ یقیناً اس میں دخل ہندستانی حکومت کی ناتجربہ کاری اور نوآموزی اور بعض افسروں اور اہلکاروں کی نااہلی اور بددیانتی کو بھی ہے۔ لیکن خود "صاحب بہادر" کے دیس برطانیہ کا کیا حال ہے؟ کیا وہاں کی غذائی پریشانیاں کچھ کم ہیں؟ اور دنیا میں کتنی بڑی تعداد ایسوں کی ہے جو ابھی کل تک پیٹ بھرے تھے اور آج مجبور ہیں کہ "راشن" یا راتب پر اپنی زندگی بسر کریں! ——— بندہ کے لیے عافیت تو شاید صرف بندگی ہی

میں ہے۔ اور خدائی کی راہ جب وہ اختیار کرنا چاہتا ہے تو اپنا رہا سہا سکھ اور چین بھی کھو ہی بیٹھتا ہے۔

غیر معصوم ائمہ دین

فاضل گرامی مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کے قلم سے :۔

"خطیب نے تاریخ بغداد میں نقل کیا ہے کہ اپنے استاد امام مالکؒ کے حلقۂ درس سے فارغ ہو کر جب امام شافعی عباسیوں کے دار السلطنت بغداد میں تشریف لائے اور وہاں کی جامع مسجد میں اہل علم کی درسگاہوں کا تجربہ ہوا تو دیکھا کہ ۴۰، ۵۰ کے قریب حلقے قائم ہیں، لیکن جس حلقہ میں بھی پہنچتے وہاں نہ قال اللہ کا ذکر ہوتا نہ قال الرسول کا بلکہ فرماتے تھے کہ ان میں ہر ایک یہی کہتا کہ ہمارے اصحاب یعنی اساتذہ نے یہ کہا ہے .... اس سلسلہ میں امام شافعیؒ میں فرض کا احساس شدت پذیر ہوتے ہوئے اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ اس راہ میں اپنے استاد حضرت امام مالکؒ کے بھی احترام کی انھیں پروا نہ ہوئی۔ بیہقی کا بیان ہے کہ امام شافعی کو جب اس کی اطلاع ملی کہ امام مالکؒ کے تلامذہ بجائے یہ کہنے کے اللہ نے یہ فرمایا ہے، یا رسول اللہ کا یہ ارشاد ہے، عموماً اپنے حلقوں میں کہتے ہیں کہ امام مالکؒ کا یہ قول ہے۔ تو میں نے ایک سال تک استخارہ کیا اور اس کے بعد میں نے اعلان کیا کہ امام مالک جو کچھ بھی ہوں بہرحال آدمی تھے۔ اور آدمی سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ (رسالہ دار العلوم فروری صہ ۳۰)

بات ہر مسلمان کے لیے بالکل صاف اور سیدھی ہے۔ لیکن اب اس غلو اور رجال پرستی کے عالمگیر مرض کا علاج ہی کیا ہے کہ جہاں کسی اچھے انسان، خصوصاً زندہ انسان سے عقیدت پیدا ہوئی اور اس سے تعلق ارادت کا قائم ہوا، بس ذہن معاً اسے معصوم عن الخطاء سمجھنے لگتا اور عملاً رسول ہی کے درجہ پر رکھنے لگتا ہے، خواہ زبان سے کچھ ہی کہا جاتا رہے۔ خدا جانے کتنی اصطلاحیں اس کے لیے ایجاد کرلی گئی ہیں۔ خلاصہ ان سب کا یہی نکلتا ہے کہ رسول اور اس بزرگ کے درمیان فرق صرف لفظی باقی رہ جائے۔ عملاً کچھ بھی نہ رہے۔

دہریت کی پسپائی

ماہنامہ معارف (اعظم گڈھ) کے فلسفی مقالہ نگار خان بہادر ظفر حسین خاں بی ۔اے سابق پرنسپل شیعہ کالج لکھنؤ کے قلم سے معارف کے تازہ نمبر میں :۔

"چوں کہ تمام عالم یکسر حرکت وعمل تسلیم کرلیا گیا ہے۔ اس لیے اب سربرآوردہ محققین سائنس مثلاً اڈنگٹن اور جینس کا خیال ہے کہ وہ کسی محرک یا عامل کا محتاج بھی ہے۔ چناں چہ موجودہ سائنس مادیت کے مرکز سے ہٹ کر اب اس راہ پر آرہی ہے جس کے راہبر افلاطون، ارسطاطالس، گیلیلو، نیوٹن، کانٹ اور ہیگل تھے"

یہ لیجیے۔ دہریت اور خدا بیزاری کی عمر کل اتنی ہی نکلی! ہمارے "روشن خیال" شاعروں اور "ترقی پسند" رومان نگاروں کے ارمان ابھی نکلنے نہ پائے تھے کہ ادھر سے رجعت خود دہریت کی خدا پرستی کی طرف شروع ہوگئی ـــــ اور آہ۔ وہ غریب شاعر اور ترقی پسند، جن کو یہ بھی اندازہ نہیں کہ اڈنگٹن اور جینس ہیں کس پایہ کے شخص!

سچی باتیں

نقل است کہ روزے بعضے از مریدان شیخ نظام الدین اولیا مجلسے داشتند واز دف زناں سرودے می شنیدند۔ شیخ نصیر الدین محمود در مجلس بود برخاست تا برآید۔
(اخبار الاخیار مطبع محمدی دہلی صفحہ)

ایک دن شیخ نظام الدین اولیاء کے مریدوں نے مجلس منعقد کی، اور دف کے باجے کے ساتھ گانا سننا شروع کیا۔ شیخ نصیر الدین محمود بھی مجلس میں موجود تھے اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ مجلس سے باہر چلے جائیں۔

یہ شیخ نصیر الدین محمود کون تھے؟ کوئی 'وہابی' قسم کے ملا تھے؟ حضرت نظام الدین اولیاء دہلوی محبوب الہی کے خلیفہ ہی نہیں خلیفۂ اعظم و خلیفۂ اجل تھے، اور آج تک "چراغ دہلی" کے لقب سے سلسلہ نظامیہ چشتیہ کا نام روشن کیے ہوئے ہیں۔ اور محفل سماع غیروں اور بیگانوں کی نہیں، اپنوں ہی کی، اپنے ہی یاران طریقت کی تھی اس پر بھی ادھر باجے پر تھاپ پڑی کہ آپ رفیقوں، عزیزوں کو چھوڑ اٹھ کھڑے ہوئے! لوگوں کو حیرت ہوگئی زبردستی بٹھانا چاہا،

یاران تکلیف نشستن کردند گفت خلاف سنت ست۔

دوستوں نے بہ اصرار بٹھانا چاہا۔ آپنے فرمایا یہ (سماع) خلاف سنت رسول ہے۔

یاران طریقت اس پر کب پیچھا چھوڑنے والے تھے۔ بولے یہ کیا غضب کر دیا۔

گفتند از سماع منکر شدی۔ و از مشرب پیر برگشتی۔

سماع کے منکر ہو کر مسلک شیخ سے مرتد ہو رہے ہو!

شیخ کا ذوق سماع سب کو معلوم تھا۔ جواب میں فرمایا۔

حجت نہ می شود، دلیل از کتاب و حدیث می باید۔

یہ (عمل شیخ) کوئی دلیل نہ ہوئی۔ دلیل تو کتاب و سنت ہی سے ہونا چاہیئے۔

شیخ زندہ تھے۔ پہنچانے والوں نے خبر ان تک پہنچائی۔ پھر شیخ نے کیا کہا؟ اپنے حلقۂ بیعت و ارادت سے نکال دیا؟ خلافت سلب کر لی؟ مردود الطریقت قرار دے دیا؟ سنیئے اور مؤلف کتاب۔ شیخ عبد الحق دہلوی کی زبان سے سنیئے۔ جو خود شیخ المشائخ کا مرتبہ سلسلہ قادریہ میں رکھتے ہیں:-

شیخ را صدق معاملہ او معلوم بود فرمود راست می گوید، حق آن ست کہ او می گوید۔

شیخ کو مرید کی راست روی کا علم تھا فرمایا کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ درحق وہی ہے جو وہ کہہ رہے ہیں۔

اب فرمایئے۔ آج کل کے لہو پسند و فسق نواز گویّوں، موسیقاروں، میوزک ماسٹروں کو کوئی ادنیٰ گنجائش بھی اعمال "بزرگان طریقت" سے استناد و استدلال کی باقی رہی؟

اور آخر میں سیر الاولیاء کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ

در مجلس شیخ نظام الدین مزامیر نبودے تصفیق نہ گردند۔ واگر کسے از یاران خبرے بخدمت اُو می رسانید کہ مزامیر می شنود، منع می کرد و می گفت کہ خوب نہ می کنند۔

حضرت نظام الدین کی محفل میں باجا نہیں ہوتا تھا، بلکہ تالی تک نہیں بجنے پاتی تھی اور اگر آپ کو اپنے مریدوں سے متعلق خبر باجے کی پہنچ جاتی تھی تو آپ انھیں روکتے اور فرماتے کہ یہ اچھا نہیں کر رہے ہیں۔

آج کے سوفی صدی فاسقانہ فلمی گانے بجانے کے لیے جنھوں نے بعض مشائخ چشتیہ کے ناموں کو آڑ بنانا چاہا ہے۔ انھوں نے کیسا کھلا ہوا ظلم اگر اپنی دیانت پر نہیں تو اپنی بصیرت پر تو بہرحال کیا ہو۔

جواری بادشا

امریکا کا مشہور ہفتہ وار لایف، کچھ روز کا پرانا ۱۹۵۰ء کی جلد کا پیش نظر ہے۔ ایک پورے صفحہ پر نصف حصہ میں صفحہ کے لمبان بھر ایک مادہ انسان کی تصویر درج ہے (عورت کہنا عورت کی توہین ہے۔ اتنی کھلی ہوئی بے غیرتی کے بعد صحیح لفظ صرف حیوان ناطق کی مادہ ہے) تصویر حالت رقص کی ہے۔ داہنا ہاتھ اٹھا ہوا بغل سے لے کر پورے عریاں سینہ پر برائے نام سا لباس۔ اس کے بعد شکم سارے کا سارا برہنہ۔ برہنگی کے حدود ناف تک نہیں، ناف کے نیچے کئی انگل تک صاف و نمایاں طور پر پھیلے ہوئے! ——— آگے یہ تفصیل سن کر اپنی قسمت کو رویئے کہ تصویر کسی فرنگن کی نہیں، ہماری آپ کی بہن ایک مصری رقاصہ سامیہ جمال کی ہے! اہل فرنگ سے اڑائی ہوئی بے حیائی چشم بد دور اتنی تو ہو کہ خود فرنگنیں پسینہ پسینہ ہو جائیں!

اسی صفحہ پر مقابل میں تصویر ایک شاہ جم جاہ کی ہے۔ ننگے سر اور سوٹ میں ملبوس فرانس کے مشہور قمار خانہ ڈیویل کیسینیوں میں پانچ مسلسل راتیں قمار بازی کی نذر کر کے، اور ۷۳ ہزار ڈالر کی رقم جیت کر قمار خانہ سے باہر تشریف لا رہے ہیں، وہ مصری رقاصہ (جو بقول اسی اخبار لایف کے بحر اوقیانوس کے مشرق میں حسین ترین شکم رکھنے والی ہے) انھیں تاجدار کے دل بہلاؤ کے لیے رقص "عروس نیل" دکھانے کو طلب ہوئی تھی! ——— ان خسرو ذی جاہ کا نام آپ سنیں گے؟ دل پر پتھر کی سل رکھ کر سنیئے۔ یہ ہمارے فاروق اعظم کے ہم لقب شاہ فاروق والی مصر ہیں! ——— زندگی اگر ہے تو دیکھیے ابھی اور کیا کیا دیکھنا اور سننا باقی ہے۔ 　قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور! 　(انتخاب از صدق جدید)

تعارف و تبصرہ

تجلیات کعبہ مصنفہ مولانا محمد احتشام الحسن صاحب کاندھلوی۔
ضخامت ۲۱۲ صفحات کاغذ اور لکھائی چھپائی بہترین۔ مضبوط جلد قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو ہند جامع مسجد اردو بازار، دھلی۔

کتاب کو از اول تا آخر دیکھنے کا موقع تو مل نہ سکا البتہ جستہ جستہ مقامات کافی دیکھنے میں آئے۔ اتنا دیکھ کر کتاب کے ایک عام رنگ کا اندازہ ہو گیا۔ مجموعی طور پر کتاب مفید معلوم ہوتی ہے۔ ناشر کے لحاظ سے بھی اور حجاج کو مختلف قسم کی معلومات بہم پہونچانے کے لحاظ سے بھی۔

کتاب کا خاص موضوع جو اتنا کچھ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ حج کے اسرار و حکم اس کے آثار و منافع اور آداب کا بیان ہے اور انداز بیان بڑی حد تک صوفیانہ ہے۔ مناسک وغیرہ بھی تفصیل سے مذکور ہیں ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کا بیان بھی بہت تفصیل کے ساتھ آگیا ہے۔ صفحہ ۴۶ کا یہ جملہ کہ "بندگی کی تزئین گھر کے گوشہ میں ہوتی ہے" کچھ کھٹکتا ہے ممکن ہے کسی قاری کے لیے غلط فہمی کا موجب بنے اور وہ بندگی کا پورا حق ادا کرنے کے لیے شرح صدر کے ساتھ فقط سجادہ و تسبیح پر قانع ہو جائے۔

ارواح ثلثہ مرتبہ مولانا ظہور الحسن صاحب کسولوی۔ ضخامت ۴۳۲ صفحات کتابت طباعت اور کاغذ بہتر۔ مجلد قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ مکتبہ امداد الغربا۔ سہارن پور

یہ کتاب ہندوستان کے بعض مشہور جلیل القدر علماء، صلحا و صوفیائے کرام سے لیکر بہت سے گمنام و غیر معروف صوفیاء، سالکین و مجذوبین کے قصص و حکایات کا مجموعہ ہے جن کے راوی حضرت امیر شاہ خاں صاحب مرحوم ہیں جن کی روایات مستند و معتمد مانی جاتی ہیں اس مجموعہ کی بیشتر حکایات دینی نقطہ نظر سے مفید اور معنیٰ خیز نظر آتی ہیں اور ایسی ہی حکایات کو اس مجموعہ میں جگہ ملنی چاہیئے تھی مگر

موقع پر صفحہ ۳۹ کی چند سطریں کھٹکتی ہیں جن کی طرف شفیق صاحب کو توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔
وہ سطریں یہ ہیں۔

آنحضور سے پہلے ہزاروں پیغمبران خدا مصلحین قوم پیدا ہوئے لیکن کسی نے "لا نبی بعدی" نہیں کہا، ظاہر ہے کہ اتنا پر وقار اور خود دارانہ اعلان وہی کر سکتا ہے جسے اپنی قوت ادراک اور اپنی ذات و نظر و فکر پر پورا اعتماد حاصل ہو، جس کو اپنے پیش کردہ نظریات پر خوب اطمینان ہو۔

یہ عبارت بجا طور پر اس غلط فہمی کا موجب بن سکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "لا نبی بعدی" کا اعلان اپنی طرف سے فرمایا تھا اور دوسرے انبیاء علیہم السلام اپنے متعلق اس وجہ سے یہ اعلان نہیں فرما سکے کہ ان کو اپنی فکر و نظر اپنی بصیرت ادراک اور اپنی پیش کردہ تعلیمات پر پورا اعتماد حاصل نہ تھا حالانکہ واقعہ بالکل یہ نہیں ہے اور ایسا خیال ایک سنگین غلط فہمی ہے۔ بلکہ حضور کا یہ اعلان محض من جانب اللہ تھا۔ حضور کو یہ حکم دیا گیا آپ نے اعلان فرما دیا دوسرے انبیاء کو ایسا حکم نہیں ملا انھوں نے یہ اعلان نہیں فرمایا۔ ورنہ جہاں تک اپنی بصیرت اور تعلیمات پر اعتماد کا تعلق ہے وہ یقیناً سب کو حاصل تھا کیونکہ ان کی تعلیمات بھی خود تراشیدہ نہ تھیں جن کے بارے میں ان کے دل میں کچھ دغدغہ ہوتا اور ان کی بصیرت بھی وہبی تھی جس کی طرف سے بے اطمینانی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس عبارت میں مناسب ترمیم کر دی جائے۔

اب آیئے اصل کلام پر ایک نظر ڈالیں۔

اس مجموعے میں غزلیں، نظمیں، قطعات اور رباعیات سب ہی موجود ہیں۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعہ پاکیزہ ادبی ذوق کی تسکین کا اچھا سامان ہے۔ غزلوں میں بھی رنگینی، شگفتگی جمالیاتی چاشنی ذکر مئے و مینا و مطرب سا قی اگرچہ بھرپور ہے مگر بوالہوسی اور شاہد پرستی شاید نام کو بھی نہیں بلکہ اس کے برعکس جا بجا اخلاق اور انسانیت کی پاکیزہ قدروں کو ابھارنے اور ان کو وقیع بنانے کی مبارک کوشش کا ترشح ہوتا ہے مگر شعر کی رنگینی وعظ کی خشکی سے نہیں بدلنے پاتی مثلاً ایک شعر ہے۔

نوازا ہے کسی نے جس کو خواب ناز سے برسوں
ابھی باقی ہے اس بستر میں بو دامان عصمت کی

اسی طرح شفیق صاحب کے کلام میں بلند خیالی اور خود داری کی تبلیغ بھی ملتی ہے۔ مغربی تہذیب پر تنقید بھی ہے، افراد اور سماج کی خرابیوں پر ہلکے اور گہرے طنز بھی ہیں مختصر یہ کہ لفاظیت سے زیادہ معنویت ہے مگر ان تمام خوبیوں کیساتھ ساتھ

ایک کمی بھی ہم نے بڑی شدت سے محسوس کی۔ وہ یہ کہ افکار میں یکسانی اور یکرنگی نہیں ہے۔ تضاد فکری اور اسلامی افکار کے ساتھ غیر اسلامی افکار کی آمیزش متعدد اشعار میں نمایاں ہے۔ مثلاً ص۵۹ پر ایک شعر ہے۔

یہ لوح و گنبد بنانے والے حیات کو جاوداں بنائیں
کہ بجھ گئی شمع زندگانی تو پھر چراغ مزار کب تک

یہ شعر ٹھیٹ اسلامی فکر کا پرتو ہے مگر تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ شفیق صاحب ایک کمیونسٹ شاعر کی نظم "تاج محل" کا جواب دیتے وقت اپنے اس فکر سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور اس مشہور زمانہ مقبرہ کے "لوح و گنبد" کی تعمیر کو بالکل حق بجانب ثابت کرنے لگتے ہیں۔ انصاف اور فکری پختگی و یکرنگی کا تقاضہ تو یہ تھا کہ شاہجہاں کے اس فعل کو اسلام ہی کے معیار حسن و قبح سے جانچا جاتا اور اگر ایسا کیا جاتا تو یقیناً اس کی وکالت و حمایت نہیں کی جا سکتی تھی، ہاں زیادہ سے زیادہ وہ الزامی جواب دیا جا سکتا تھا کہ

ایک نظر خواجگہ لینن و اسٹالن پر
قصر ایواں ہے کہ مزدور کے چھپر کی مثال

اسی طرح ص۱۰۵ اور ص۱۱۱ کے دو شعروں کا تضاد ملاحظہ ہو ص۱۰۵ پر ایک قطعہ ہے۔

پھیلاؤ شفیق اپنی ہی تہذیب جہاں میں
یہ کم نظری ہے کہ نظام دگر آئے

اسکے مقابلہ میں ص۱۱۱ کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

اگر صداقت کے ساتھ آئے تو نظم نو سے مجھے خوشی ہے
کہ میری تہذیب زندگی کے ہر ایک سانچے میں ڈھل گئی ہے

اسی طرح کئی مقامات پر تضاد فکری اور اسلامی افکار کے دوش بدوش غیر اسلامی (قوم پرستانہ) افکار شعار میں قابل اغماض حد تک محسوس ہوتے ہیں ــــــ ایک اور چیز جو ہمیں بہت محسوس ہوئی اور بڑی کثرت سے اس مجموعہ میں پائی جاتی ہے وہ شاعر کی خود ستائی اور خود پسندی ہے۔ مانا کہ شاعری کی یہ عام رسم ہے اور مذموم نہیں سمجھی جاتی مگر ہم شاعرانہ نگاہ سے اس مجموعۂ کلام کا جائزہ لینے نہیں بیٹھے ہیں (اور نہ محض شاعرانہ نگاہ سے کسی کلام کا جائزہ لینے کی الفرقان جیسے خشک دینی رسالے میں گنجائش ہی نکل سکتی ہے) بلکہ ہمیں کلام کی شعری حیثیت سے زیادہ اس کی اسلامی حیثیت سے دلچسپی ہے اور اسلام کی نگاہ میں یقیناً خود ستائی کی اس رسم کا جواز نہیں ہے۔ ان ایک دو باتوں سے قطع نظر مجموعی طور پر یہ مجموعہ ہمیں پسند آیا اور اہلِ ذوق سے ہم اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۷)

بزرگو اور دوستو! بات اگرچہ ہمارے لیے کیسی ہی تلخ اور ناگوار ہو لیکن ہو بالکل سچی حقیقت کہ ہم عملی طور پر حیوانی زندگی کے طرز کو اختیار کرکے اور ایمانی زندگی کو اور اس کے لیے جد وجہد کو چھوڑ کے انہی اگلی اُمتوں کی طرح اللہ کی نظر کرم سے گر چکے ہیں، فرشتوں کو ہمارے ساتھ اب وہ ہمدردی نہیں رہی جو ایمانی زندگی رکھنے والی اور ایمانی زندگی کی راہ میں جد وجہد کرنے والی امت کے ساتھ کبھی تھی۔ اگر خدانخواستہ ہم اپنی اس حالت پر راضی اور مطمئن ہیں تو اس کے سوا کیا عرض کیا جائے کہ اس کا وہ آخری انجام بھی دنیا اور آخرت میں سامنے آجانے والا ہو جو انبیاء کی امانتوں کو ضائع کرنے والی امتوں کا ہوا کرتا ہو۔ لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ہم مستحق ہوں، فرشتوں کی اور اللہ کی دوسری مخلوق کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہوں تو اس کی صورت یہی ہو کہ ایمانی زندگی خود حاصل کرنے کے لیے اُمت کے جو طبقے اس سے دور اور بالکل محروم ہو چکے ہیں اُن میں پھر نئے سرے سے اس کو پیدا کرنے کے لیے ہم آپ اٹھیں، اپنے کاموں کا حرج کریں اور اپنی کمائی کے پیسے اس راہ میں خرچ کریں۔ اپنی راحت اور اپنے آرام میں خلل ڈالیں اور ایمانی زندگی اور اس کی جد وجہد امت میں عام کرنے کو اپنی زندگی کا اصل مقصد اور مصرف بنائیں۔ اس دنیا میں محنت و قربانی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا اور محنت و قربانی سے سب کچھ ہوتا ہو، اس راستہ میں ہم جو کچھ تکلیفیں اُٹھائیں گے اس کے عوض دوزخ کی سخت تکلیفوں اور عذاب الیم سے بچا دیے جائیں گے، اور اپنی جن راحتوں اور لذتوں کو قربان کریں گے اس کے بدلے جنت کی ابدی زندگی میں ان سے لاکھوں گنی اور ہر قسم کی دائمی لذتیں اور راحتیں پائیں گے۔ اور اس سے پہلے دنیاوی زندگی میں بھی اللہ کی وہ مدد اور خاص عنایت جس کے ہم محتاج اور منتظر ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق دے کہ آخرت کی ابدی زندگی بنانے کے لیے اپنی اس چند روزہ زندگی کی تھوڑی سی چیزیں قربان کرنے کا ہم فیصلہ کر سکیں۔ اللہ کے وعدے بالکل یقینی ہیں۔ اللہ نے اور اللہ کے رسول نے آخرت کے عذاب و ثواب کے بارے میں اور جنت و دوزخ کے متعلق جو کچھ فرمایا اور بتایا ہو یقیناً بلا شبہ مرنے کے بعد وہ سب آنکھوں کے سامنے آجانے والا ہو ـــــ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین و سلام علی المرسلین

ماہنامہ **الفرقان** لکھنؤ

ہندوستان سے
سالانہ چندہ :- صہ
فی کاپی :- ۸ر

پاکستان سے
سالانہ :- للعہ (پاکستانی سکہ)
دیگر ممالک سے
سالانہ :- (۱۲ شلنگ)

جلد (۱۹) | بابتہ ماہ جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۷۱ھ | نمبر (۶)

سُرخ پنسل کا نشان! اس بات کی علامت ہے کہ جناب کی مدتِ خریداری اس شمارہ پر ختم ہو گئی ہے، لہٰذا اپنا چندہ برائے ایک سال مبلغ (پانچ روپیہ) بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما کر مشکور فرمائیے۔ اگر ۳۰ اپریل ۱۹۵۲ء تک جناب کا چندہ وصول نہ ہوا، اور نہ کوئی اطلاع آئی، تو اگلا پرچہ وی پی بھیجا جائے گا، جس کا وصول کرنا جناب کا اخلاقی فریضہ ہوگا ـــــ

پاکستان کے حضرات اب اپنا چندہ سکریٹری صاحب "ادارۂ اصلاح و تبلیغ" آسٹریلین بلڈنگس لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں اور ایک کارڈ کے ذریعہ ہم کو اس کی اطلاع ضرور دیدیں، اور قدیم خریدار صاحبان اس اطلاع کے ساتھ اپنا نمبر خریداری بھی ضرور لکھیں۔ اگر آپکے چندہ کی اطلاع ۳۰ اپریل ۱۹۵۲ء تک موصول نہیں ہوئی، تو "ادارۂ اصلاح و تبلیغ۔ لاہور" سے آپ کی خدمت میں "الفرقان" بذریعہ وی پی ارسال کیا جائے گا ـــــ دیگر ممالک کے حضرات اپنا چندہ ۱۲ شلنگ بذریعہ پوسٹل آرڈر دفتر "الفرقان" لکھنؤ کو ارسال فرمائیں۔ والسلام

ناظم :- الفرقان لکھنؤ۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ناظرین کرام کو الفرقان کی گذشتہ اشاعت سے اس عاجز کے سفر پاکستان کا علم ہو چکا ہے۔ ۱۱ر فروری کو میں کراچی پہونچا تھا، اور ۲۵ر مارچ کو وہاں سے واپسی ہوئی ہے، ڈیڑھ مہینہ کی اس مدت میں مجموعی طور پر ۲۵ دن میرا قیام کراچی ہا اور ۲۰ دن پاکستان کے بعض دوسرے شہروں میں، کل ۲۷ر مارچ کی صبح کو میں لکھنؤ پہونچا ہوں ——— اس سفر کے کچھ واقعات اور کچھ تاثرات واحساسات میں نے ناظرین الفرقان کے لئے قلمبند بھی کئے تھے، لیکن یہ شمارہ (جو اسوقت آپکے ہاتھ میں ہے) میرے لکھنؤ پہونچنے سے پہلے مکمل ہو چکا ہے، اور اس میں اس کے لئے گنجائش باقی نہیں رہی، صرف "نگاہ اولیں" کے ۳ صفحے باقی ہیں، بس اتنی ہی محدود گنجائش کو پیش نظر رکھ کر اپنے پاکستانی بھائیوں سے صرف دو ضروری باتیں اس صحبت میں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں ——— دوران سفر میں جو مستقل مضمون لکھا تھا وہ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں ہدیۂ ناظرین ہو سکے گا، اور احباب کرام سفر کے حالات اور میرے جن تاثرات واحساسات کے منتظر ہوں گے، وہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ انشاء اللہ اس سے ان کو معلوم ہو سکیں گے۔

دنیا کے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کی طرح پاکستانی مسلمانوں میں بھی ایک تعداد تو اُن بیچارے پسماندہ عوام کی ہے جن کے سامنے اپنی ذاتی حیوانی ضرورتوں کے سوا زندگی کا کوئی مسئلہ سرے سے ہی ہے نہیں ——— اور بہت تھوڑی تعداد (غالباً ایک دو فی ہزار سے بھی کم) ایسے لوگوں کی ہوگی جو مغرب زدگی کی وجہ سے دین سے بیزار، یا بے تعلق اور بے فکر ہو چکے ہیں ——— بس ان دو طبقوں کو مستثنیٰ کر کے باقی تمام طبقوں کے متعلق یہ اندازہ ہے (جو انشاء اللہ صحیح ہے) کہ وہ دل سے اس کے خواہش مند ہیں کہ پاکستان میں دین سرسبز ہو، ایمانی تقاضے پورے ہوں، اور زندگی کا پورا نقشہ وہ ہو جو اُمتِ مسلمہ کے لئے اللہ و رسول نے متعین فرمایا ہے ——— لیکن افسوس ہے کہ جو راستہ اس منزل تک پہنچانے والا ہے اس کی صحیح تشخیص کرنے والے اور اپنی طاقتوں کو اس پر لگانے والے ان میں سے غالباً دو چار فی ہزار بھی نہیں ہیں ——— پہلے بھی یقین تھا، اور پاکستان کے اس سفر کے بعد یہ یقین الحمد للہ اور پختہ ہو کر حق الیقین کے درجہ تک پہونچ گیا، کہ

ان ایمانی آرزوؤں کے وجود میں آنے کی اس وقت صرف ایک ہی صورت ہے، اور اس منزل تک پہونچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اور وہ یہ کہ اللہ کے جو بندے سچے دل سے دین کی سرسبزی کے خواہش مند ہیں وہ امّت کے افراد میں (جن میں وہ خود بھی شامل ہیں) وہ ایمان و یقین پیدا کرنے کی جدوجہد کریں جس سے اسلامی زندگی وجود میں آتی ہے، اللہ نے اگر بصیرت دی ہو تو یہ حقیقت بالکل بدیہی ہے کہ زندگی اور اس کے شعبوں کے احکام خداوندی کے پابند ہونے کے لئے افراد و طبقات میں جس یقین و ایمان کا ہونا ضروری ہے وہ اس وقت ہمارے معاشرہ میں موجود نہیں ہے ——— اور جو شکست خوردہ ٹوٹا پھوٹا بے جان عقیدہ اس وقت کی مسلمان قوم میں موجود ہے، وہ اسلامی زندگی کو وجود میں لانا تو درکنار، اُس کا بوجھ اٹھانے کے بھی قابل نہیں ہے۔ اسلئے اس مسئلہ کی کلید صرف یہی ہے کہ اللہ کے جو بندے اس سلسلہ میں اپنا فرض ادا کرکے اپنے اللہ کو راضی کرنا چاہتے ہیں وہ خود اپنے اندر اور امت کے دیگر افراد و طبقات میں ایمان و یقین پیدا کرنے کے لئے جدوجہد کریں، اور اللہ کی دی ہوئی اپنی ساری طاقتوں کو اس راہ پر لگا دیں، یہی دین و ایمان کی تجدید کا اصلی اور بنیادی کام ہے ——— اس کے علاوہ سوچنے والے جو کچھ سوچ رہے ہیں اور کرنے والے جو کچھ کر رہے ہیں (اللہ ان کی نیک نیتی اور نیک عملی کا انھیں پورا اجر دے) اپنا یقین تو یہی ہے کہ وہ یا تو سرد لوہے کو پیٹنے میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں صرف فرما رہے ہیں، یا تالے کو اس کنجی سے کھولنے پر زور لگا رہے ہیں جو اس کی کنجی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو اپنے اُن بندوں پر منکشف فرمائے جو اُس کے نزدیک اس کے اہل ہوں، اور جو اس کا حق ادا کرنے والے ہوں۔

پاکستان میں، خصوصاً کراچی میں لاکھوں مہاجرین جس سخت تکلیف میں اور جس بُرے حال میں ہیں وہاں جانے سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، ان بیچاروں کو خاصکر مکان نہ ہونے سے جو تکلیفیں ہیں، زیادہ دنوں تک جانور بھی ان تکلیفوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔

اس صورتِ حال کے دیر تک قائم رہنے سے جو پیچیدگیاں اور جو خطرے پیدا ہو سکتے ہیں اُن کو تو پاکستان کے اربابِ حکومت اور عقل و خرد رکھنے والے وہاں کے شہری خود سوچیں، یہ عاجز تو خالص دینی اور انسانی نقطۂ نظر سے دینی اخوت ہی کی بنا پر عرض کرتا ہے کہ پاکستان کی حکومت اور عوام دونوں کا نہایت اہم فرض ہے کہ پوری فکرمندی اور فیاضی اور پورے ایثار سے کام لے کر، اور پورے صدقدلانہ تعاون کے ساتھ وہ اس مسئلہ کو حل کرنیکی کوشش کریں، اور اس مسئلہ کو وہی درجہ دیں جو بڑی سے بڑی قومی مہمات کو دیا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ اتنا وسیع ہے کہ عوام کے مخلصانہ اور رضاکارانہ تعاون کے بغیر صرف حکومت اس کو حل نہیں کر سکتی، اس قسم کے مسائل کی ذمہ داری سب پر ہے۔ ضرورت ہے کہ کچھ مخلص اور درد مند شہری (جن کے دل کے کسی گوشہ میں بھی حکومتی اقتدار حاصل کرنے کی ہوس نہ ہو، اور جو

لیڈری کی طمع سے بالکل فارغ الذہن ہوں) اللہ کے دکھی بندوں کا درد دل میں لے کر اٹھیں، اور اس مسئلہ کو حل کرنے کیلئے اُس قسم کی مخلصانہ کوشش کریں جس طرح کی کوشش ہندوستان میں زمین کے مسئلہ کو حل کرنے کیلئے ونوبھا دے جی کر رہے ہیں — اگر اس مسئلہ کو حل نہیں کیا گیا، اور کراچی کی زندگی کا نقشہ دیر تک یہی رہا کہ اہلِ حکومت و ثروت تو اپنے عالیشان محلوں میں آرام سے رہتے رہے، اور اللہ کے لاکھوں بندے بارش اور دھوپ سے بچا سکنے والی جھونپڑیوں سے بھی محروم رہے تو ایسا شہر اور ایسا ملک (خدانخواستہ خدانکردہ) اللہ کی رحمت سے محروم کر دیا جائے گا، اور پھر جو ہونا ہوگا، وہ سامنے آجائے گا۔ حدیث نبویؐ ہے :-

مَنْ لَا يَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ — جو دوسروں پر رحم نہیں کھاتے وہ رحمت سے محروم کئے جائیں گے

ایک ملک کے شہری کو دوسرے ملک کے کسی مسئلہ میں اس طرح مشورہ دینا رواج عام کے مطابق مناسب ہو یا نامناسب، لیکن اس عاجز نے تو اپنے اس تاثر کو پوری صراحت اور پورے خلوص کے ساتھ عرض کر دینا اپنا دینی فرض سمجھا۔ الدین النصیحۃ للہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین وعامتھم۔

قریباً دو ڈھائی برس سے "الفرقان" کے ہر شمارہ میں آپ پڑھتے ہوں گے کہ پاکستانی احبابِ "الفرقان" کا چندہ جناب حاجی عبدالجبار صاحب کی خدمت میں کراچی بھیجیں — موصوف اس دور کے ایک مردِ مومن اور اس عاجز کے مخلص ترین دوست تھے — ۱۵ اور ۱۶ مارچ کی درمیانی شب میں اچانک چند منٹ کے اندر اندر کراچی ہی میں اپنے مکان پر (غالباً قلب کی شکایت سے) موصوف کے انتقال کا حادثہ واقع ہوا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

تبلیغ کے نام سے احیاءِ دین کی جو کوشش ہو رہی ہے، اب سے قریباً دس سال پہلے آپ ہی کے ذریعہ اس کا سلسلہ سب سے پہلے سندھ میں شروع ہوا تھا، اور پھر حجاز مقدس میں اس کا سلسلہ قائم ہونے میں جن بندگانِ خدا کا خاص حصہ تھا، اُن میں ایک آپ بھی تھے — انتقال بھی اس حال میں ہوا کہ اسی دینی دعوت کے سلسلہ میں عمرہ کی نیت کر کے ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ دو ہی چار دن میں حجاز مقدس روانہ ہونے والے تھے، ٹیکہ لگ چکا تھا، پاسپورٹ بھی بن چکا تھا، بس روانگی باقی تھی — بہرحال مکہ والے اللہ کے گھر جانے کی نیت تھی، لیکن اللہ پاک نے اچانک اپنے آخرت والے گھر کی طرف بُلا لیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین —

ناظرین کرام مغفرت و رحمت اور رفع درجات کی دُعا فرمائیں، براہِ راست اس عاجز پر احسان ہوگا

محمد منظور نعمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معارف الاحادیث

قیامت میں حقوق العباد کا انصاف

(۷۶) عن عائشۃ قالت جاء رجل فقعد بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ ان لی مملوکین یکذبوننی ویخونوننی ویعصوننی واشتمھم واضربھم فکیف انا منھم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان یوم القیٰمۃ یُحسَبُ ما خانوک وعصوک وکذبوک وعقابک ایّاھم فان کان عقابک ایّاھم بقدر ذنوبھم کان کفافاً لا لک ولا علیک وان کان عقابک ایّاھم دون ذنبھم کان فضلاً لک وان کان عقابک ایّاھم فوق ذنوبھم اقتصّ لھم منک الفضل فتنحّیٰ الرجل وجعل یھتف ویبکی فقال لہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم اما تقرءَ قول اللہ تعالیٰ ونضع الموازین القسط لیوم القیٰمۃ فلا تظلم نفسٌ شیئاً وان کان مثقال حبّۃٍ من خردل اتینا بھا وکفیٰ بنا حاسبین . فقال الرجل ما اجدلی ولھٰؤلاء شیئاً خیراً من مفارقتھم اُشْھِدُک انھم کلّھم احرارٌ۔ (ترمذی)

(ترجمہ) حضرت عائشہ صدیقہ رض سے مروی ہو کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا. پھر عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس کچھ غلام ہیں (جن کی حالت یہ ہو کہ بسا اوقات) وہ مجھ سے جھوٹ بولتے ہیں، میری چیزوں میں خیانتیں بھی کرتے ہیں، میری نافرمانی بھی کرتے ہیں، اور میں (ان کی ان حرکتوں پر) کبھی انھیں گالیاں دیتا ہوں اور کبھی مارتا بھی ہوں، پس کیا حال ہوگا میرا قیامت کے دن ان کی وجہ سے (یعنی اللہ تعالیٰ میرا اور ان کا فیصلہ کس طرح فرمائے گا)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تمھارے ان غلاموں نے تمھاری جو خیانت اور

نافرمانی کی ہوگی اور تم سے جو جو جھوٹ بولے ہوں گے اور پھر تم نے ان کو جو سزائیں دی ہوں گی قیامت کے دن ان سب کا پورا پورا حساب کیا جائے گا۔ پس اگر تمہاری سزا ان کے قصوروں کے بقدر ہی ہوگی تو معاملہ برابر ختم ہو جائے گا، نہ تم کو کچھ ملے گا اور نہ تمہیں کچھ دینا پڑے گا اور اگر تمہاری سزا ان کے قصوروں سے کم ثابت ہوگی تو تمہارا فاضل حق تمہیں وہاں ملے گا اور اگر تمہاری سزا ان کے قصوروں سے زیادہ ثابت ہوگی تو تم سے اس کا بدلہ اور قصاص ان کو دلوایا جائے گا۔ (جب اس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب سنا) تو آپ کے پاس سے ایک طرف کو ہٹ کر رونے اور چلّانے لگا (یعنی قیامت کے اس محاسبہ اور پھر وہاں کے عذاب کے خوف سے جب اس پر گریہ غالب ہوا تو وہ ادب کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے اُٹھ گیا اور ایک طرف کو ہٹ کر بے اختیار رونے اور چلّانے لگا)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اس سے فرمایا کیا تم قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں پڑھتے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۚ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۚ وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ

اور ہم قائم کریں گے قیامت کے دن انصاف کی میزانیں، پس نہیں ظلم ہوگا کسی نفس پر کچھ بھی، اور اگر ہوگا کسی کا عمل یا حق رائی کے ایک دانہ کے برابر حاضر کریں گے ہم اس کو بھی اور کافی ہیں ہم حساب کرنے والے۔

اُس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ (یہ سب کچھ سننے کے بعد) میں اپنے لیے اور اُن کے لیے اس سے بہتر کچھ نہیں سمجھتا کہ (لوجہ اللہ آزاد کرکے) ان کو اپنے سے الگ کر دوں، میں آپ کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے ان کو آزاد کر دیا، اب وہ آزاد ہیں۔

(ف) ایمان کی یہی شان ہے اور سچے ایمان والوں کا طرزِ عمل یہی ہونا چاہیے کہ جس چیز میں آخرت کا خطرہ نظر آئے اس سے بچا جائے، اگرچہ دنیوی نقطۂ نظر سے اس میں [illegible]

میزانِ اعمال میں اللہ کے نام کا وزن:۔

(۷۷) عن عبد اللّٰه بن عمرو قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ان اللّٰه سيخلص رجلاً من امتى على رؤس الخلائق يوم القيمة فينشر عليه تسعة وتسعين سجلاً كل سجل مثل مد البصر ثم يقول اتنكر من هذا شيئاً أظلمك كتبتى الحافظون فيقول لا يارب فيقول افلك عذر قال لا يارب فيقول بلى ان لك

عندنا حسنة وانه لا ظلم عليك اليوم فتخرج بطاقة فيها اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً عبده ورسوله فيقول احضر وزنك فيقول يارب ما هذه البطاقة مع هذه السجلات فيقول انك لا تظلم قال فتوضع السجلات فی كفة والبطاقة فی كفة فطاشت السجلات وثقلت البطاقة فلا يثقل مع اسم الله شئ۔ (ترمذی ۔ ابن ماجہ)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میری اُمت میں سے ایک شخص کو ساری مخلوق کے روبرو الگ نکالے گا اور اس کے سامنے ۹۹ دفتر کھولے جائیں گے جن میں سے ہر دفتر کی لمبائی گویا حد نظر تک ہوگی (یہ دفتر اس کے اعمال نامے ہوں گے) پھر اس سے فرمایا جائے گا کہ (تیرے جو اعمال ان دفتروں میں لکھے ہوئے ہیں) کیا ان میں سے کسی کا تجھے انکار ہو؟ کیا تیرے اعمال کی نگرانی کرنے والے اور لکھنے والے میرے فرشتوں نے تجھ پر ظلم کیا ہو (اور غلط طور پر کوئی گناہ تیرے اعمال نامہ میں لکھ دیا ہو) وہ عرض کرے گا نہیں پروردگار! (مجھ پر کسی نے ظلم نہیں کیا ہو، بلکہ یہ سب میرے کیے ہوئے اعمال ہیں) اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو کیا تیرے پاس کوئی عذر ہو، وہ عرض کرے گا خداوندا میرے پاس کوئی عذر بھی نہیں (یہاں تک کے سوال وجواب سے خود اس شخص کو اور دوسرے لوگوں کو بھی خیال ہوگا کہ یہ بندہ اب گرفت اور عذاب سے کہاں بچ سکے گا، لیکن ارحم الراحمین کی رحمت کا اس طرح ظہور ہوگا کہ) اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے ہاں ہمارے پاس تیری ایک خاص نیکی بھی ہو، اور آج تیرے ساتھ کوئی ظلم نہیں ہوگا (اور اس نیکی کے فائدہ سے تجھے محروم نہیں کیا جائے) — یہ فرماکر کاغذ کا ایک پُرزہ نکالا جائے گا، اس میں لکھا ہوگا "اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً عبده ورسوله" اور اس بندہ سے کہا جائے گا کہ اپنے اعمال کے وزن کے پاس حاضر ہو (یعنی چل کر اپنے سامنے وزن کرا) وہ عرض کرے گا خداوندا ان دفتروں کے سامنے اس پرزہ کی کیا حقیقت ہو اور اُن سے اس کو کیا نسبت ہو (یعنی میں وہاں جاکر کیا دیکھوں گا اور کیا کروں گا، نتیجہ تو معلوم ہی ہو، کہاں اتنے بڑے بڑے ۹۹ دفتر اور کہاں یہ ذرا سا پُرزہ) اللہ تعالیٰ فرمائے گا، نہیں تجھ پر ظلم نہیں کیا جائے گا (بلکہ پورا پورا انصاف کیا جائے گا، جس پُرزہ کو تو معمولی اور بے وزن سمجھ رہا ہو تیرے سامنے اس کا بھی وزن کیا جائے گا اور آج اس کا اور اس میں لکھے ہوئے ایمانی کلمہ کا وزن ظاہر ہوگا اور اس کا تجھے پورا پورا فائدہ پہونچایا جائے گا اس لیے مایوس نہ ہو اور میزان کے پاس جاکر وزن کو دیکھ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کے بعد وہ ۹۹ دفتر ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے اور کاغذ کا وہ پرزہ ایک پلڑے میں، بس ہلکے ثابت ہوں گے وہ دفتر

اور بھاری رہے گا وہ پرزہ اور کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی اللہ کے نام کے مقابلہ میں"
(تشریح) بعض شارحین نے اس حدیث کی توجیہ میں لکھا ہو کہ یہ شہادت کا وہ کلمہ ہوگا جو کفر و شرک سے نکلنے کے لیے اور ایمان و اسلام میں آنے کے لیے پہلی دفعہ دل و زبان سے پڑھا گیا ہوگا۔ قیامت میں وزن اعمال کے وقت اس کا یہ اثر ظاہر ہوگا کہ ساری عمر کے پہلے گناہ اس کے اثر سے بے وزن اور بے اثر ہو جائیں گے ایک دوسری حدیث میں بھی ہو "ان الاسلام یهدم ماکان قبلہ" یعنی اسلام قبول کرنے سے وہ سارے گناہ ختم ہو جاتے ہیں جو پہلی زندگی میں آدمی نے کیے ہوں ـــــ اور ایک دوسری توجیہ اس حدیث کی یہ بھی کی گئی ہو کہ یہ معاملہ اس شخص کا ہوگا جو مدت دراز تک غفلت اور بے پروائی سے گناہ پر گناہ کرتا رہا اور دفتر کے دفتر لکھے جاتے رہے ـــــ پھر اللہ نے اسے توفیق دی اور اس نے دل کی گہرائی سے اور پورے اخلاص سے اس کلمۂ شہادت اور کلمۂ ایمان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی ایمانی نسبت کو درست کرلیا اور اسی پر اس کو موت آگئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

آسان حساب :-

(۷۸) عن عائشۃ قالت سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی بعض صلوٰتہ اللّٰھم حاسبنی حساباً یسیراً قلت یانبی اللہ ما الحساب الیسیر قال ان ینظر فی کتابه فیتجاوز عنه انه من نوقش الحساب یومئذ یاعائشۃ هلك۔ (احمد)

(ترجمہ) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہو کہ میں نے بعض نمازوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا کرتے سنا "اللّٰھم حاسبنی حساباً یسیراً" (اے اللہ میرا حساب آسان فرما) میں نے عرض کیا حضرت آسان حساب کا کیا مطلب ہو، آپ نے فرمایا آسان حساب یہ ہو کہ بندہ کے اعمال نامہ پر نظر ڈالی جائے اور اس سے درگزر کی جائے (یعنی کوئی پوچھ گچھ جرح نہ کی جائے) بات یہ ہو کہ جس کے حساب میں اُس دن جرح کی جائے گی اے عائشہ (اس کی خیر نہیں) وہ ہلاک ہو جائے گا۔

ایمان والوں کیلئے قیامت کا دن کیسا ہلکا اور مختصر ہوگا :-

(۷۹) عن ابی سعید الخدری انه اتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال اخبرنی من یقوی علی القیام یوم القیمۃ الذی قال اللہ عزوجل "یوم یقوم الناس لرب العٰلمین" فقال یخفف علی المومن حتی یکون علیه کالصلوٰۃ

المکتوبہ　　　(البیہقی فی البعث والنشور)

(ترجمہ) حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مجھے بتائیے کہ قیامت کے دن جس کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ "اس دن لوگ کھڑے ہوں گے رب العالمین کے حضور میں" تو اس دن کس کو کھڑے رہنے کی طاقت اور قدرت ہوگی (اور کون اس پورے دن کھڑا رہ سکے گا جس کے متعلق قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچے ایمان والوں کے حق میں یہ کھڑا ہونا بہت ہلکا اور خفیف کر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ ان کے لیے ایک فرض نماز کی طرح ہو جائے گا۔

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ابوسعید خدری کو جو جواب دیا اس کا اشارہ قرآن مجید میں بھی موجود ہے، سورۂ مدثر میں فرمایا گیا ہے۔

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ ۝

تو جب صور پھونک دیا جائے گا تو وہ دن بڑا سخت ہوگا، ایمان نہ لانے والوں کے لیے آسان نہ ہوگا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سخت اور بھاری دن ایمان والوں کے حق میں سخت اور بھاری نہ ہوگا، بلکہ آسان اور ہلکا کر دیا جائے گا۔

راتوں کو اللہ کیلئے جاگنے والوں کا جنت میں بے حساب داخلہ:-

(۸۰) عن اسماء بنت یزید عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال یحشر الناس فی صعید واحد یوم القیمۃ فینادی مناد فیقول این الذین کانت تتجافی جنوبہم عن المضاجع فیقومون وھم قلیل فیدخلون الجنۃ بغیر حساب ثم یومر سائر الناس الی الحساب۔　　　(البیہقی فی شعب الایمان)

(ترجمہ) اسماء بنت یزید سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن سب لوگ (زندہ کیے جانے کے بعد) ایک وسیع اور ہموار میدان میں جمع کیے جائیں گے (یعنی سب میدان حشر میں جمع ہو جائیں گے) پھر اللہ کا منادی پکارے گا کہ کہاں ہیں وہ بندے جن کے پہلو راتوں کو بستروں سے الگ رہتے تھے (یعنی اپنے بستر چھوڑ کر جو راتوں کو تہجد پڑھتے تھے) پس وہ اس پکار پر کھڑے ہو جائیں گے اور ان کی تعداد زیادہ نہ ہوگی۔ پھر وہ اللہ کے حکم سے بغیر حساب کتاب کے جنت میں چلے جائیں گے۔ اس کے بعد باقی تمام لوگوں کے لیے حکم ہوگا کہ وہ حساب کے لیے حاضر ہوں۔

اُمت محمدیہ کی بہت بڑی تعداد کا حساب کے بغیر جنت میں داخلہ:۔

(۸۱) عن ابی امامہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول وعدنی ربی ان یدخل الجنۃ من امتی سبعین الفاً لاحساب علیھم ولاعذاب مع کل الف سبعون الفاً وثلث حثیات من حثیات ربی۔

(احمد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)

(ترجمہ) حضرت ابو امامہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ میرے پروردگار نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میری اُمت میں سے ستر ہزار کو وہ بغیر حساب اور بغیر عذاب کے جنت میں بھیجے گا اور ان میں سے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہی ہزار اور ہوں گے ۔۔۔ اور تین حثیے اور میرے پروردگار کے حثیات میں سے (میری امت میں سے بغیر حساب اور بغیر عذاب کے جنت میں بھیجے جائیں گے)

(تشریح) جب دونوں ہاتھ بھر کر کسی کو کوئی چیز دی جائے تو عربی میں اس کو حثیہ کہتے ہیں جس کو اردو اور ہندی میں لپ بھر کے دینا کہتے ہیں۔ تو حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ستر ہزار کو بلا حساب اور بلا عذاب جنت میں داخل کرے گا، اور پھر ان میں سے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار ہی اور اسی طرح بلا حساب و عذاب جنت میں جائیں گے اور اس سب کے علاوہ اللہ تعالیٰ اپنی خاص شان رحمت سے اس امت کی بہت بڑی تعداد کو تین دفعہ کر کے اور جنت میں بھیجے گا۔ اور یہ سب وہی ہوں گے جو بغیر حساب اور بغیر عذاب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ سبحانك وبحمدك یا ارحم الراحمین۔

اس قسم کی حدیثوں کی پوری حقیقت اسی وقت کھلے گی جب یہ سب باتیں عملی طور پر سامنے آئیں گی۔ اس دنیا میں تو ہمارا علم و ادراک اتنا ناقص ہے کہ بہت سے اُن واقعات کو صحیح طور پر سمجھنے سے بھی ہم قاصر رہتے ہیں۔ جن کی خبریں ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں مگر اس قسم کے واقعات کا کبھی ہم نے تجربہ اور مشاہدہ کیا ہوا نہیں ہوتا۔ صدق ربّنا عزوجل ــ "وما اوتیتم من العلم الاّ قلیلاً ہ"

انبیاء علیہم السلام کی دعوت

اور

ہماری حالت

(مدیر الفرقان کی ایک تقریر جو کراچی کے ایک تبلیغی اجتماع میں کی گئی)

الحمد للّٰہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللّٰہ
لقد جاءت رسل ربنا بالحق صلوات اللّٰہ تعالیٰ علیھم و
علیٰ کل من اتبعھم باحسان الیٰ یوم الدین

بزرگو، دوستو اور دینی بھائیو!

ہم آپ سب جانتے ہیں کہ انسان کو اس دنیا میں آنے سے پہلے کچھ مدت اپنی ماں کے پیٹ میں رہنا ہوتا ہے اور جب تک وہ ماں کے پیٹ میں رہتا ہے اسی کو وہ اپنی دنیا سمجھتا ہے، وہ بیچارہ اس وقت بالکل نہیں جانتا کہ اصل دنیا کوئی اور ہے جہاں مجھے جانا ہے۔ بلکہ اگر کوئی ایسا آلہ ایجاد ہو جائے جس کے ذریعے پیٹ کے اندر کے بچہ سے بات کی جا سکے اور اس کے ذریعہ اس کو یہ تبلایا جائے کہ نادان بچے! اصل دنیا اور ہے جو ابھی تو نے دیکھی ہی نہیں ہے اور تو عنقریب اس دنیا میں پہنچنے والا ہے اور وہ لاکھوں میل کی لمبی چوڑی دنیا ہے اور اس میں زمین و آسمان ہیں سمندر اور پہاڑ ہیں کروڑوں بلکہ اربوں رہنے بسنے والے انسان ہیں، ریلیں دوڑ رہی ہیں، جہاز چل رہے ہیں، ہوائی جہاز اڑ رہے ہیں، روز سورج نکلتا ہے اور ڈوبتا ہے، موسم آتے ہیں اور جاتے ہیں ——— الغرض اگر کسی ذریعہ سے ماں کے پیٹ میں قیام کرنے والے بچہ کو کوئی شخص یہ باتیں تبلائے تو نہ تو وہ ان باتوں کو سمجھ سکے گا اور اگر کسی طرح سمجھانے میں کامیابی حاصل کر لی جائے تو وہ ماننے پر تیار نہ ہوگا۔ اس کے نزدیک تو ساری دنیا بس اس کی ماں کا بالشت بھر سے بھی کم کا پیٹ ہے اس کے سوا جو کچھ اسے کوئی تبلاتا ہے وہ اس کے مشاہدہ کے خلاف ہے، لیکن

ہم آپ جب اس منزل کو طے کر کے یہاں اس دنیا میں آ گئے اور ان سب چیزوں کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں تو یہ سب چیزیں ہمارے لیے یقینی اور بدیہی ہو گئیں بلکہ اب ہم نے اور آپ نے یہ بھی جان لیا کہ ماں کے پیٹ میں ہمارا جو قیام کچھ دنوں رہا وہ کوئی مستقل قیام نہ تھا بلکہ اس دنیا میں لانے کے لیے ہی ہمیں چند مہینے وہاں رکھا گیا تھا۔

بہرحال یہ وہ حقیقت ہے جس کا ہم سب تجربہ کر چکے ہیں اور اس سے ہم یہ سبق لے سکتے ہیں بلکہ ہمیں یہ سبق لینا چاہیے کہ ہمارا علم اور ہمارا مشاہدہ بہت ناقص ہے اور کسی چیز کے نہ جاننے اور نہ دیکھنے کی وجہ سے اس کا انکار کرنا بڑی غلطی اور نادانی ہے ـــــ حقیقتوں کا پورا علم بس اللہ تعالیٰ کو ہے اور اس کے پیغمبر، اس کے تبلانے سے اور اس کی طرف سے جو کچھ تبلاتے ہیں وہ بالکل حق اور صحیح ہے اور اپنے اپنے وقت پر سب سامنے آ جانے والا ہے۔

انبیاء علیہم السلام انسانوں کے لیے جو خاص الخاص علم اللہ کی معرفت اور اس کی توحید کے علاوہ لے کے آئے ہیں جس کے ماننے یا نہ ماننے پر انسانوں کی کامیابی یا نامرادی کا اور ان کی نجات یا ہلاکت کا دارومدار ہے وہ یہ ہے کہ اس دنیا کے بعد انسانوں کو ایک اور عالم میں پہنچنا ہے اور وہ عالم، اس دنیا کے مقابلے میں ہر حیثیت سے لاکھوں کروڑوں گنا اسی طرح بڑا ہوگا جس طرح ماں کے پیٹ کے مقابلہ میں ہماری یہ دنیا بڑی ہے۔ اور وہی دراصل مستقل عالم ہے اور یہ دنیا اس کے مقابلہ میں اسی طرح عارضی ہے جس طرح اس دنیا کے مقابلہ میں ماں کے پیٹ والا عالم عارضی تھا۔ پھر انبیاء علیہم السلام نے پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ یہ بھی تبلایا کہ جس طرح اس دنیا میں مصیبتیں اور راحتیں ہیں اور تکلیفیں اور لذتیں ہیں اسی طرح آخرت کے آنے والے عالم میں بھی یہ دونوں رُخ ہیں، بلکہ اصلی تکلیفیں اور مصیبتیں اور اصلی لذتیں اور راحتیں وہیں ہیں یہاں تو ہر چیز کا بہت ہی ناقص نمونہ ہے۔ مثلاً یہاں جو آگ ہے دوزخ کی آگ میں اس کے مقابلہ میں ہزاروں لاکھوں گنا زیادہ گرمی اور جلن ہے اور یہاں کی بھوک پیاس سے جو تکلیف ہوتی ہے آخرت میں اس سے ہزاروں گنا زیادہ تکلیف والی بھوک پیاس ہے اور یہاں بچھو جیسے زہریلے جانوروں کے کاٹنے سے جتنی تکلیف ہوتی ہے دوزخ کے زہریلے جانوروں کے کاٹنے سے اس سے ہزاروں لاکھوں گنی زیادہ تکلیف ہوگی، اسی طرح یہاں کے کھانوں میں اور پھلوں میں جو لذت اور ذائقہ ہے جنت کے کھانوں اور پھلوں میں اس سے ہزارہا درجہ زیادہ لذت اور ذائقہ ہے اور یہاں بہتر سے بہتر جو خوشبوئیں ہیں وہاں ان سے ہزاروں درجہ زیادہ بہتر خوشبوئیں ہیں اور یہاں جو حُسن ہے اس سے لاکھوں درجہ زیادہ آخرت میں حُسن ہے، پھر یہ کہ یہاں جو تکلیف یا مصیبت ہے اور جو لذّت اور راحت ہے وہ عارضی اور فانی ہے اور آخرت

میں ہر چیز مستقل دائمی اور غیر فانی ہے ——— انبیاء علیہم السلام نے یہ بھی تبلایا کہ انسان کا اصل ٹھکانا اور دائمی وطن آخرت ہی ہے خواہ دوزخ ہو یا جنت، اور اللہ نے گویا اسے آخرت ہی کے لیے بنایا ہے اور اس دنیا میں چند سالوں کے لیے اس کو صرف اس لیے رکھا جاتا ہے کہ یہاں رہ کر آخرت کی تیاری کرے اور جنت یا دوزخ کے قابل بنے، جس طرح ہر انسان چند مہینے اپنے ماں کے پیٹ میں صرف اس لیے رکھا جاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں آنے کے قابل ہوسکے۔

پھر انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا علم بھی لائے کہ آخرت کے اس مستقل وطن میں اور کبھی نہ ختم ہونے والی اس زندگی میں تکلیفوں اور مصیبتوں سے بچنے کا اور لذتیں اور راحتیں حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے، انھوں نے تبلایا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے یہ چاہتا ہے کہ وہ چند سچی حقیقتوں پر ایمان لاکر اس دنیا میں زندگی اس طریقہ پر گزاریں جس سے اللہ کا منشا اور وہ مقصد پورا ہو جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اگر وہ ایسا کریں گے تو آخرت کی زندگی میں کامیاب اور خوش و خرم رہیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ وہ لذتیں اور راحتیں پائیں گے جن کا یہاں کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا اور جو انسان اس کے خلاف طرز عمل اختیار کریں گے اور اللہ کی منشا کے خلاف چلیں گے وہ آخرت میں ایسی سخت تکلیفوں اور مصیبتوں میں ڈالے جائیں گے جن کی یہاں کوئی مثال موجود نہیں ہے ———

دوستو اور بزرگو!

اللہ کے سارے پیغمبر یہی پیغام لے کے آئے اور اسی مقصد کے لیے آئے کہ انسان ان باتوں کو مان کر اپنے لیے زندگی کا وہی طریقہ اختیار کرے جو اس کو آخرت کی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی میں جہنم کے عذاب سے بچادے اور صدا بہار جنت کی لذتوں اور راحتوں میں پہنچا دے ——— آدم علیہ السلام سے لے عیسیٰ علیہ السلام تک اللہ کے ہزاروں پیغمبر آئے اور سب نے اپنے اپنے وقت کے انسانوں کو یہی پیام دیا اور صرف پیام ہی نہیں دیا بلکہ انتہائی ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ بندوں کو اللہ کی رحمت میں لانے کی بلکہ اس کی طرف کھینچنے کی کوشش کی ——— پھر جن میں نیکی کا اور سعادت کا کوئی ذرہ بھی تھا انھوں نے ان کی بات مان لی اور اللہ کے متعلق اور آخرت کے متعلق ان کی باتوں پر یقین کرکے اور ایمان لاکے اللہ کی منشا کے مطابق زندگی گزارنے کے اصول کو انھوں نے قبول کرلیا۔ یہ سب اپنے اپنے زمانہ کے مومن اور مسلم تھے اور یہ سب آخرت والی زندگی میں جنت پائیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ اور جن لوگوں میں خالی شرارت ہی شرارت تھی اور خیر اور سعادت کا کوئی ذرہ بھی ان کے اندر نہیں رہا تھا انھوں نے پیغمبروں کی ان باتوں کے ماننے سے انکار کردیا۔ اللہ کے پیغمبروں نے اپنے امکان بھر اس کی پوری کوشش کی کہ یہ کسی طرح مان لیں اور اللہ کی رحمت سے محروم

نہ رہیں لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہے اور انکار پر یعنی کفر پر اڑے رہے ــــــ پھر سب سے آخر میں خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لیے یعنی سب قوموں اور سب ملکوں کے لیے اور قیامت تک کے لیے اللہ کے رسول بنکر آئے جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی بناکر بھیجا اس وقت پوری دنیا غلط راستہ پر چل رہی تھی، لوگ اللہ کے احکام سے اور اپنے انجام سے بے فکر ہو کر من مانی زندگی گزار رہے تھے۔ نبوت کے بعد آپ قریباً تیئس ۲۳ سال دنیا میں رہے اور اللہ کے بندوں میں آخرت کی فکر پیدا کرنے کے لیے اور اللہ سے ان کا رشتہ جوڑنے کے لیے اور ان کو دوزخ سے بچاکر جنت میں پہنچانے کے لیے آپ نے ایسی کوشش اور ایسی جدوجہد کی اور اس راہ میں ایسی ایسی تکلیفیں اٹھائیں کہ دنیا میں کسی نے بھی اس مقصد کے لیے اتنی محنتیں نہیں کیں اور اتنی تکلیفیں نہیں اٹھائیں، خود فرماتے ہیں " ما اوذی فی اللہ احد مثل ما اوذیت" (اللہ کے راستہ میں کسی کو اتنی تکلیفیں اور اتنی ایذائیں نہیں پہنچیں جتنی کہ مجھے پہنچی ہیں۔)

آپ کو اللہ کے بندوں کا ایسا درد تھا اور ان کو اللہ کے عذاب سے اور دوزخ سے بچانے کی اتنی فکر تھی کہ اس فکر میں گویا گھلے جا رہے تھے یہاں تک کہ قرآن پاک میں کئی جگہ فرمایا گیا کہ کیا آپ ان لوگوں کے پیچھے اور ان کے ایمان نہ لانے کے غم میں اپنے کو ہلاک کر ڈالیں گے اور اپنی جان دے دیں گے۔" لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ٥" ــــــ اور سورہ کہف میں فرمایا گیا۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ٥

الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورے تیئس سال تک اس مقصد کے لیے محنتیں کرتے رہے اور اپنے راحت و آرام کو اور اپنی ہر چیز کو قربان کرتے رہے۔ اس کے نتیجہ میں اللہ کے بندوں کی ایک جماعت پیدا ہوئی جس نے آپ کی دعوت کو قبول کیا، اور اللہ کے متعلق اور آخرت کے متعلق یعنی قیامت اور جنت و دوزخ کے متعلق جو کچھ آپ فرماتے تھے اس نے اس پر پورا یقین کرکے اور ایمان لاکے اپنے متعلق یہ فیصلہ کیا کہ اس زندگی میں اللہ تعالیٰ ہم سے جو چاہتے ہیں ہم وہی کریں گے یعنی ہر معاملہ میں اللہ کے حکم پر چلیں گے۔ اور دنیا کو ماں کے پیٹ کی طرح کی ایک عارضی اور درمیانی منزل سمجھتے ہوئے اور آخرت ہی کو اصلی آخری اور ابدی منزل یقین کرتے ہوئے ہم دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر کریں گے ــــ قرآن مجید میں " ایمان باللہ " اور "ایمان بالیوم الآخر" کا لفظ جو جا بجا آتا ہے وہ در حقیقت ان ہی دو فیصلوں کا نام ہے۔ بعد والوں کے مقابلہ میں صحابہ کرام کا امتیاز دراصل اسی کیفیت میں اور ان ہی دو فیصلوں کی پختگی اور گہرائی میں ہے ــــ جو شخص صحابہ کرام کی زندگی کو غور سے دیکھے گا اس میں اس کو یہی دو چیزیں بہت نمایاں نظر آئیں گی یعنی ایک اپنی نفسانی خواہشات اور اپنی ذاتی اغراض اور اپنے ماحول کے ہر قسم کے تقاضوں کے مقابلہ میں اللہ کے

حکم کو غالب رکھنا اور حکم الٰہی کی تعمیل کے لیے ان میں سے ہر چیز کو قربان کر دینا ـــ اور دوسرے آخرت کی کامیابی کے لیے دنیا کی ہر دولت اور ہر لذت کو اور جان تک کو قربان کر دینے پر آمادہ رہنا۔

ان دو باتوں کے علاوہ ایک تیسری بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت نے اس جماعت کے اندر پیدا کی تھی اور وہ بھی اسی طرح ان کی زندگی میں بہت نمایاں تھی وہ ان کی یہ فکر تھی کہ جس دین کو یعنی زندگی کے جس اصول اور جس طریقہ کو ہم نے مان لیا ہے (یعنی اللہ کے حکموں پر نظر رکھتے ہوئے اور ان کی تعمیل کرتے ہوئے جینا اور آخرت کو اصل منزل سمجھتے ہوئے اور دنیا سے زیادہ وہاں کی فکر کرتے ہوئے زندگی گزارنا) اللہ کے اور بندے بھی اس دولت میں ہمارے شریک ہو جائیں اور ان کا بھی اللہ سے رشتہ جڑ جائے اور وہ بھی جنت میں پہنچ جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے علاوہ چونکہ خاتمیت کا مقام بھی عطا ہوا، یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسانوں کے لیے نبی قرار دیا۔ اور نبی کے ذمہ ہے کہ جن کے لیے وہ نبی بنایا گیا ہے ان کی ہدایت کی فکر کرے ' اور حضور کو عمر قیامت تک کی دی نہیں گئی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے اس کا انتظام یہ فرمایا کہ جن لوگوں نے آپ کی بات مان لی اور ایمان لا کے آپ کی پیروی قبول کر لی ان کو آپ نے اس پر آمادہ کیا اور ان کے ذمہ یہ کام کیا کہ جس طرح مجھ سے پہلے اللہ کے پیغمبر اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں کو دوزخ سے بچانے کی اور جنت کی طرف لانے کی کوششیں کرتے رہے ہیں اور جس طرح تم نے مجھے یہ کوشش کرتے دیکھا ہے اسی طرح تمھیں یہ کام کرنا ہے اور میری نیابت میں قیامت تک کرتے رہنا ہے ـــــــ صحابہ کرام نے تو اس کام کا پورا پورا حق ادا کیا یعنی ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر والی حضور کی لائی ہوئی زندگی کو اپنی زندگی بنا کر ملکوں ملکوں میں اس کا پیغام پہنچایا اور جس ملک میں اور جس قوم میں جس طرح پہنچا سکتے تھے اس طرح پہنچایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس راستہ میں اور اس کی کوششوں میں اپنی جان کو جس جس طرح بے قیمت کرتے ہوئے اور تکلیفیں اٹھاتے ہوئے انھوں نے دیکھا تھا اسی طرح انھوں نے بھی اپنی جان کو بالکل بے قیمت کر دیا اور ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں کے ساتھ یہ کام کرتے ہوئے وہ اپنے اللہ سے جا ملے ـــــــ پھر ان کی چمکتی ہوئی پاکیزہ زندگیوں نے اور ان کی ان کوششوں اور قربانیوں نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی کہ قومیں کی قومیں اور ملک کے ملک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایمانی دعوت کو خود بخود قبول کرنے لگے اور آپ کی لائی ہوئی ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر والی زندگی کے اصول اور طریقہ کو اپنانے لگے ـــــــ پھر بعد والے مسلمان جنھوں نے یہی فضا دیکھی اور جن کی آنکھوں نے دین کی دعوت

کو اس طرح خود بخود چلتے ہوئے اور قوموں کو اس کی طرف آپ سے آپ لپکتے ہوئے اور بڑھتے ہوئے دیکھا وہ اس مقصد کے لیے کوشش اور قربانی سے بے فکر ہو کر بیٹھ گیے ۔۔۔ ہاں کچھ خاص اللہ کے بندے تو ہر زمانہ اور ہر دور میں مختلف شکلوں میں دین کی خدمت اور اس کے لیے کوششیں کرتے رہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی فکر اور کوشش کو جس طرح پوری امت پر ڈالا تھا اور اس کا جو عمومی نظام آپ نے قائم فرمایا تھا صحابہ کرام سے بعد کے دور میں وہ اس طرح قائم نہیں رہا اور اس کی وجہ سے دو بہت بڑے نقصان ہوئے ایک یہ کہ انسانی دنیا کی بہت بڑی آبادی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اس ایمانی طریقہ زندگی سے بالکل محروم رہ گئی اور اس کے نتیجہ میں آخرت کی زندگی میں وہ جنت سے محروم رہ جائے گی ۔۔۔۔۔۔ اور دوسرا نقصان یہ ہوا کہ خود امت کی تعلیم و تربیت اور دینی ترقی کی فکر اور اس کے لیے کوشش کا جو عمومی نظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا کہ ہر شخص دوسروں کی دینی خبر گیری کا اور ان کے ایمان کی حفاظت اور ترقی کا ذمہ دار تھا، وہ درہم برہم ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج خود مسلمان کہلانے والوں میں بہت بڑی تعداد اس حال میں ہے کہ اس کا اسلام بس برائے نام ہے ۔ ان کی زندگی اللہ کے احکام سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت سے بالکل بے تعلق ہو چکی ہے اور ان کا حال قرآن مجید کے الفاظ میں بالکل یہ ہے کہ "هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ (یعنی آج وہ بہ نسبت ایمان کے کفر کی حالت سے زیادہ قریب ہیں) اور اسی طرح ان کے دل آخرت کی فکر سے اور دوزخ کے خوف اور جنت کے شوق سے بالکل فارغ ہو چکے ہیں اور ان کی حالت بالکل وہ ہو گئی ہے جو قرآن مجید نے کافروں کی بیان کی ہے کہ " إِنَّ هَٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا "

دوستو ہم رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت ہیں، اگر ہمارے دلوں میں حضور کی نسبتِ رحمت کا کوئی ذرہ بھی ہو تو ساری انسانیت کی اور خاص کر حضور کی امت کی اس حالت کو اور ایمان سے ان کی محرومی کو دیکھ کر ہمیں رونا اور تڑپنا چاہیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قیامت تک کے لیے ہے اور ہمیشہ کے لیے دنیا میں ہدایت پھیلانے اور ایمان پھیلانے کا کام آپ امت کے سپرد کر کے گیے تھے اور اس کا ایسا نظام قائم فرما گیے تھے کہ اگر اس کے مطابق کام ہوتا رہتا تو آج دنیا میں ایمان ہی کی فضا ہوتی ۔۔۔۔۔ تو اب ہمیں سوچنا یہ ہے کہ اس حالت کے بدلنے کے لیے یعنی خود اپنی زندگی کو ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر والی زندگی بنانے کے لیے اور اپنے دوسرے بھائیوں میں اس کی کوشش کے لیے ہم کچھ کرنا چاہتے ہیں یا نہیں ؟ ۔۔۔۔۔۔

اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو عالم اسباب بنایا ہے اور یہ عالم جس طرح دنیا کے بارہ میں عالم اسباب ہے اسی طرح دین کے معاملہ میں بھی یہ عالم اسباب ہے۔ یعنی جس طرح دنیا کا ہر کام یہاں کرنے سے ہوتا ہے اسی طرح دین کا کام بھی کرنے سے ہوتا ہے ۔۔۔ کرنے والے تو اللہ تعالیٰ ہیں، بندوں کے بس میں کچھ بھی نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ

کی سنت اور عادت یہ ہے کہ بندے جس کام کے لیے صحیح طریقہ پر کوشش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو پورا کر دیتے ہیں۔

یہ دینی دعوت اور یہ دینی تحریک جس کو آپ لوگ تبلیغی تحریک کہتے ہیں اور جس میں حصہ لینے والے تبلیغی جماعت کے نام سے مشہور ہو گئے ہیں دراصل یہ اسی کی کوشش اور اسی کی جد وجہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو طریقہ زندگی لائے تھے جسکا اصول تھا ہر معاملہ میں اللہ کے حکم پر چلنا، اللہ کے امر کے مقابلہ میں غیر اللہ کے کسی تقاضے کی اور کسی منفعت کی پروا نہ کرنا ـــــ اور آخرت کی فکر دنیا سے زیادہ کرنا، اس کو ہم خود اپنے اندر پیدا کریں اور اپنے دوسرے بھائیوں میں اس کی کوشش کریں اور دین کی فکر اور جد وجہد کا جو عمومی نظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا جس کے لیے خود حضور نے اور آپ کے صحابہ کرام نے اپنی جانوں کو بے قیمت کر رکھا تھا اس کو پھر سے رواج میں لانے کے لیے ہم بھی جد وجہد کریں اور اس راہ میں ہم بھی اپنی جانوں کو اور اپنی ہر چیز کو بے قیمت کرنا سیکھیں ـــــ بس یہ ہی ہے اس تحریک کا اصل مقصد، باقی جو چیزیں کبھی کبھی ہم ذکر کرتے ہیں ان کا تعلق یا تو طریقہ کار سے اور اس جد وجہد کی عملی تشکیلات سے ہے اور یا وہ ضمنی چیزیں ہیں۔

ہم پورے شرح صدر کے ساتھ اور صراحت اور صفائی کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہی اسوقت دین کا بنیادی اور اصلی کام ہے اور مسلمانوں کی تمام تر دینی اور دنیوی صلاح وفلاح اسی سے وابستہ ہے اور اسی پر منحصر ہے اور افراد کی زندگیوں میں دینی انقلاب برپا کرنے کے لیے اور ایمان سے خالی ہو جانے والے اپنے معاشرہ کو پھر سے ایمانی معاشرہ بنانے کے لیے اور مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کو اللہ کے حکم اور امر کے تحت لانے کے لیے یہی صحیح اور نبوی طریق کار ہے کہ لوگوں میں ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر کی روح اور حقیقت کو پیدا کرنے کے لیے جد وجہد کی جائے اور ایمان و احتساب کو (یعنی ہر معاملہ میں اللہ ہی کے حکم پر چلنے کے فیصلہ کو اور جنت کے شوق اور دوزخ کے خوف کو) ان کی زندگی کا سب سے بڑا محرک بنانے کے لیے اور دوسرے تمام جذبات پر اس جذبہ کو غالب کرنے کے لیے محنت کی جائے۔

انبیاء علیہم السلام کا عام طریقہ یہی ہے کہ وہ پہلے افراد میں اس چیز کو پیدا کرتے ہیں، اس چیز کے پیدا ہو جانے کے بعد صرف اتنا بتلا دینا کافی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے فلاں فلاں کام چاہتے ہیں اور فلاں فلاں چیزوں سے تم کو منع کرتے ہیں، فلاں کام جنت میں پہنچانے والا ہے اور فلاں کام دوزخ میں لیجانے والا ہے انبیاء علیہم السلام اسی طریقہ سے اخلاق کو درست کرتے ہیں، اسی طریقہ سے معاشرت کی خرابیوں کی اصلاح کرتے ہیں اسی طریقہ سے وہ تجارتوں کو اور کاروبار کی تمام صورتوں کو ٹھیک کر دیتے ہیں اور اسی طریقہ سے وہ سیاست اور حکومت کو اللہ کی منشا کے مطابق بنا دیتے ہیں۔ انھیں زندگی کے ہر شعبہ کی درستی کے لیے الگ الگ کوشش نہیں کرنی پڑتی۔

ہماری یہ دینی جدوجہد جس کو تبلیغی تحریک کہا جاتا ہے اس کی بنیاد اسی اصول پر ہو اور اس کے طریقہ کار کی بھی بنیاد یہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم مسلمانوں کی ساری خرابیوں کی جڑ بنیاد یہی ہے کہ ہم اللہ کے احکام پر چلنے کے بجائے اپنی اغراض اور اپنی خواہشات پر چلنے کے عادی ہو گئے ہیں اور جنت اور دوزخ سے زیادہ ہم اس دنیا کے نفع نقصان کی فکر کرنے کے خوگر بن گئے ہیں، یہی ہماری ساری بیماریوں کی جڑ ہے اور اس کا علاج اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی رضا کے لیے اور اس کے حکم کے لیے اپنی خواہشات اور اپنی اغراض کو قربان کرنے کی عادت ڈالیں اور دنیا کے نفع نقصان پر نظر کرنے کے بجائے آخرت کے نفع نقصان پر یعنی جنت کے ثواب اور دوزخ کے عذاب پر نظر رکھ کر کام کرنے کا اپنے کو عادی بنائیں۔

بزرگو اور دوستو! ——— اگر عادت کی اور حال کی یہ تبدیلی صرف ہماری تقریروں سے ہو سکتی تو ہم آپ پر کوئی بوجھ نہ ڈالتے اسی طرح اگر کوئی اور زیادہ آسان طریقہ ہمارے علم میں ہوتا تو اسی کو ہم استعمال کرتے لیکن خدا گواہ ہے کہ اس مقصد کے لیے ہمارے پاس اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں جس کو ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں اور آپ اس کو مشکل سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ وہ ایسا مشکل نہیں ہے اور اگر مشکل بھی ہو تو جب اس کے سوا کوئی اور طریقہ سامنے ہے ہی نہیں تو اسی کو اختیار کرنا پڑے گا۔ اور وہ یہ ہے کہ آپ اپنے حال کی اصلاح کے لیے اور اللہ کے بندوں میں دین کی کوشش کے لیے اپنے گھر اور اپنے گھر کی راحتوں کو چھوڑ چھوڑ کر اور اپنے کاموں کے نقصان گوارا کر کے جماعتوں کی شکل میں کچھ زمانہ کے لیے نکلا کریں اور یہ زمانہ ایک خاص پروگرام کے مطابق اپنی اصلاح و تربیت اور دوسروں میں دین کی کوشش کے ان کاموں میں گزارا کریں جو اللہ کے تعلق کو اور آخرت کی فکر کو بڑھانے والے ہیں، اور جن میں مسلسل مشغول رہنے سے غیر اللہ سے تعلق گھٹتا ہے اور اللہ سے تعلق بڑھتا ہے اور آخرت کی فکر بڑھتی ہے اور دنیا کی فکر گھٹتی ہے اور خود اپنی زندگی دینی اور ایمانی زندگی بنتی ہے اور اللہ کے دوسرے بندوں کے لیے بھی اس کے دروازے کھلتے ہیں ——— ہمیں امید ہے بلکہ یقین ہے کہ اللہ کے جو بندے اس پروگرام کے مطابق اپنے اوقات صرف کریں گے اور اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے اس راہ میں تکلیفیں اٹھائیں گے اور قربانی دیں گے انشاء اللہ ان کی حالت بدلے گی اور ان میں اور ان کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر والی اور اللہ کے لیے اور دین کے لیے قربانی والی وہ زندگی پھر آئے گی جو اس امت کی اصلی زندگی تھی اور جس کو کھو کر یہ امت اللہ کی نظر کرم سے گر گئی ہے اور اس کی خاص رحمت اور نصرت سے محروم ہو گئی ہے ———

آخر میں اتنی بات اور عرض کر کے اس وقت گفتگو کو ختم کرتا ہوں کہ چوں کہ ہمارے اس کام کا طریقہ

(بقیہ ص ۳۴)

دینی دعوت و تحریک کے ذمہ داروں کی خدمت میں

گذشتہ سے پیوستہ

برادران کرام! اگر ہم انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے سلسلہ میں ان کے طریقہ کار کا مطالعہ کریں تو اس میں ہم کو ایسے بہت سے پہلو نظر آئیں گے جن میں ان کی راہ عام انسانی تحریکات کے علمبرداروں سے الگ ہوگی۔ اور یہ پہلو ان کی دعوت میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طریقہ کار اور اس دعوت کے مزاج پر غور و خوض کرنے میں میں بھی آپ کا ایک ادنیٰ رفیق بننا چاہتا ہوں۔ اور آپ کی اجازت سے وہ اہم نقاط پیش کرتا ہوں جو میری کوتاہ نظر میں ان کی دعوت و طریقے اور عام قائدین و مصلحین کی دعوت و طریقے میں فرق پیدا کرتے ہیں۔

(۱) دعوت و جہاد کے تمام مراحل بلکہ زندگی کے تمام مراحل میں اللہ کی طرف رجوع اس کے آستانہ عالی پر ایک بے بس و شکستہ حال آدمی کی طرح سر رکھ دینا اور اس کی رحمت کی گود میں اس طرح اپنے کو ڈال دینا جس طرح چھوٹا بچہ اپنی ماں کی گود میں اپنے کو ڈال دیتا ہے۔ اور اس بات پر پختہ ایمان کہ وہی نافع و ضار ہے وہی مددگار ہے اسی کا اصل سہارا ہے۔ وہ اگر عطا کرنا چاہے تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا اور محروم رکھنا چاہے تو کوئی اس سے دلا نہیں سکتا اسکے یہاں سے آئی ہوئی مشکل کو کوئی آسان کرنیوالا اور رکی کھچی ہوئی بلا کو کوئی ٹالنے والا نہیں اسکی رحمت کو کوئی روکنے والا نہیں۔ آسان وہی ہے جس کو وہ آسان کرے۔ وہ سخت کو بھی سہل بنا دیتا ہے۔ طاقت ور کے مقابلہ میں کمزور کی اعانت فرماتا ہے اور زیادہ کے مقابلہ میں تھوڑے کی امداد فرماتا ہے۔ کمزور اس کی امداد سے طاقت ور ہے، تھوڑا اس کی رحمت سے بہت ہے۔ یہ ایمان ان میں دعا کی قوت اور جذبہ پیدا کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی چوکھٹ پر سر رکھ دیتے ہیں، اس کے دروازے پر پڑ جاتے ہیں اور عاجزانہ دعاؤں کی کثرت کرتے ہیں۔ یہ ایمان (خدا کی قدرت و رحمت کا یقین اور اپنے ضعف و احتیاج کا احساس) ان کے لیے عجیب و غریب حقائق کا دروازہ کھول دیتا ہے، ان کی زبان سے اثر میں ڈوبے ہوئے مضامین نکلنے لگتے ہیں،

ان کو اللہ سے مانگنے کے اور اپنے دل کی باتیں کرنے کے ایسے ایسے انداز آجاتے ہیں جو عام انسانوں کی حیثیت سے بلند ہیں۔ یہاں نمونہ کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو دعائیں پیش کی جاتی ہیں۔

اللھم انک تسمع کلامی وتریٰ مکانی وتعلم سری وعلانیتی لایخفیٰ علیک شئ من امری وانا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الوجل المشفق المقر المعترف بذنبی اسئلک مسئلۃ المسکین وابتھل الیک ابتھال المذنب الذلیل وادعوک دعاء الخائف الضریر ودعاء من خضعت لک رقبتہ وفاضت لک عبرتہ وذل لک جسمہ ورغم لک انفہ اللھم لاتجعلنی بدعائک شقیا وکن بی رؤفا رحیما۔ یاخیر المسئولین ویاخیر المعطین۔

اے اللہ تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے اور میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے۔ تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ میں مصیبت زدہ ہوں، محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں ترساں ہوں، ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا ہوں، اعتراف کرنے والا ہوں، تیرے آگے سوال کرتا ہوں جیسے بیکس سوال کرتے ہیں تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں جیسے گنہگار ذلیل وخوار گڑگڑاتا ہے اور تجھ سے طلب کرتا ہوں جیسے خوف زدہ آفت رسیدہ طلب کرتا ہے اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو اور اسکے آنسو بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کیے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو، اے اللہ تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے حق میں بڑا مہربان نہایت رحیم ہوجا! اے سب مانگے جانے والوں سے بہتر، اے سب دینے والوں سے بہتر،

اور طائف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اوپر معرض یاد کیجئے۔

اللھم الیک اشکو ضعف قوتی وقلۃ حیلتی وھوانی علی الناس۔ یاارحم الراحمین الیٰ من تکلنی الیٰ عدو یتجھمنی ام الیٰ قریب ملکتہ امری ان لم تکن ساخطا علیَّ فلا ابالی غیر ان عافیتک اوسع لی اعوذ

اے اللہ میں تجھی سے شکوہ کرتا ہوں ضعف قوت کا اور اپنی کم سامانی کا اور لوگوں کی نظر میں اپنی کم وقعتی کا، اے سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے؟ آیا کسی دشمن کے جو مجھے دبائے؟ یا کسی دوست کے قبضہ میں میرے سب کام دے رہا ہے؟ تو اگر مجھ سے ناخوش نہ ہو تو مجھے ان میں سے کسی چیز کی

بنور وجهك الذی اشرقت له الظلمات وصلح علیه امر الدنیا والآخرة۔ من ان یحل بی غضبك او ینزل علی سخطك لك العتبیٰ حتیٰ ترضیٰ ولا حول ولا قوة الا بك

پروا نہیں ہو پھر بھی تیرا دیا ہوا امن ہی میرے لیے زیادہ گنجائش رکھتا ہو میں تیری ذات پاک کے اس نور کی پناہ لیتا ہوں جسکی وجہ سے اندھیریاں روشن ہوتی ہیں اور جسکی بنا پر دنیا اور آخرت کا نظام ٹھیک چل رہا ہو اس بات سے کہ مجھ پر تیرا غضب ہو یا تو مجھ سے ناراض ہو اور تجھے منانا ہو یہاں کہ تو راضی ہو جائے اور خیر کی طاقت اور برائی سے حفاظت آپ کے بغیر نہیں۔

بدر کے واقعہ سے دعا کی اس کیفیت اور اپنی بیچارگی کے اسی احساس کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوں کو درست کیا پھر عریش (چھپر جو آپکے لیے ڈال دیا گیا تھا) کی طرف پلٹے اور اس میں داخل ہوئے آپکے ساتھ حضرت ابوبکر کے سوا کوئی نہ تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تبارک وتعالیٰ کو امداد کے وعدے کا واسطہ دے رہے تھے اور مناجات میں یہ فرما رہے تھے اے پروردگار اگر یہ چھوٹی سی جماعت ہلاک ہوگئی تو تیری عبادت دنیا میں نہ ہو سکے گی۔

یہی انبیاء علیہم السلام کی تیاری، قوت اور ان کی دعوت کی کلید تھی۔ ان کی دعوت اور جد وجہد کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں دعا اور اس کا اہتمام، خدا کے سامنے عجز ونیاز اور رقت ولجاجت مقدم ہے۔ دعا کیا ہے؟ انابت الی اللہ، اعتماد وتوکل کا ایک اظہار!

یہی روحانی اور ایمانی پہلو ان کی دعوت وجد وجہد کو مادی کوششوں اور تحریکوں سے ممتاز کرتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی فکر کی بات پیش آتی تھی تو آپ فوراً نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

واستعینوا بالصبر والصلوٰة (مدد لو صبر ونماز سے) درحقیقت دعوت کی مہم محض جسمانی قوت مادی سازوسامان اور ذہانت وقابلیت سے سر نہیں کی جا سکتی۔ روحانی قوت اور اللہ تعالیٰ کی امداد ونصرت کے بغیر کوئی بڑے سے بڑا آدمی اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ یہ زبردست چٹانیں اور سربفلک دیواریں جو دعوت کی راہ میں حائل ہوتی رہتی ہیں اور جس سے ٹکرا کر بڑے بڑے مخلص داعیوں کی کوششیں پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اس نصرت ہی سے پگھل سکتی ہیں اور اس نصرت کے حصول کا ذریعہ دعا والتجا ہے۔

(۲) انبیاء کی دعوت اور جد وجہد کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ وہ مادی منفعتوں اور عاجل فوائد

پر غور و فکر سے خالی الذہن ہوتے ہیں۔ دعوت وجد وجہد سے ان کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا، اس کے احکام کی بجاآوری اور اس کے پیغام کے پہنچانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ دنیا طلبی حصول جاہ وعزت اور اپنے متبعین کے لیے قوت پیدا کرنے یا حکومت حاصل کرنے سے ان کے ذہن بالکل فارغ ہوتے ہیں حتی کہ یہ چیز ان کے متبعین و رفقاء کے بھی خیال میں نہیں آتی۔ یہ حکومت جو اپنے وقت پر قائم ہوئی اور یہ طاقت جو ایک خاص منزل پر حاصل ہوئی تھی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے محض ایک انعام تھا اور دین کے مقاصد تک پہونچنے، اس کے احکام کے نفاذ، معاشرہ و زندگی کی تبدیلی کا ایک ذریعہ! جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین پر حکومت دیں تو وہ نماز کو قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے نیکی کا حکم کریں گے، برائی سے منع کریں گے" اور یہ حکومت کبھی بھی ان کا مقصد، منتہائے نظر نہ تھا نہ وہ اس کے خواب دیکھتے تھے، وہ ایک دعوت وجہاد کا فطری نتیجہ تھا جس طرح درخت کے نمو اور قوت پیدائش کا نتیجہ پھل ہوتا ہے اس موقع پر راقم سطور کے رسالے بین الھدایۃ والجبایۃ کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو اسی موضوع سے تعلق رکھتا ہے:-

"چھٹی صدی عیسوی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو مخاطبین کا وہ بہترین عنصر اس دعوت حق کی طرف کھنچ آیا جس نے اپنے زمانہ میں اپنے کو قرآن کی ان آیات کا بہترین مصداق ثابت کیا۔

فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُوَ مِنْ دُونِهِ إِلَٰهًا لَقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًا هَٰؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً لَوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ه

(ترجمہ:- وہ چند نوجوان تھے کہ اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے ہم نے انھیں ہدایت میں زیادہ مضبوط کردیا اور ان کے دلوں کی (صبر و استقامت میں) بندش کردی۔ وہ جب (راہ حق میں) کھڑے ہوئے تو انھوں نے (صاف صاف) کہہ دیا ہمارا پروردگار تو وہی ہے جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے، ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو پکارنے والے نہیں اگر ہم ایسا کریں تو یہ بڑی ہی بیجا بات ہوگی۔

یہ ہماری قوم کے لوگ ہیں جو اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کو پکڑے بیٹھے ہیں وہ اگر معبود ہیں تو کیوں اس کے لیے کوئی روشن دلیل پیش نہیں کرتے (ان کے پاس تو کوئی دلیل نہیں) پھر اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ کہہ کر بہتان باندھے۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت پر لبیک کہنا سوسائٹی کی نظر میں ان کا بہت بڑا جرم تھا جس کی پاداش میں یہ مردان باصفا جور وجفا اور قہر وبلا کے تیروں پر رکھ لیے گئے خوب خوب مشق ستم کی گئی اور پوری سنگدلی کے ساتھ ستائے گیے۔ مگر ان سے تو پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا آمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکَاذِبِیْنَ ہ

(کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انھیں صرف آمنّا کہنے پر چھوڑ دیا جائے گا اور ان کے اس دعوے کی آزمائش نہیں کی جائے گی حالاں کہ ہم نے ان کے اگلوں کو آزمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ضرور جان لے گا ان کو جو سچے ہیں اور ان کو جو جھوٹے ہیں)

اس لیے آزمائش کے کسی مرحلہ میں ان کے قدم ذرا نہ ڈگے اور پہاڑوں کی شان استقامت کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹے رہے انھوں نے پہچان لیا کہ یہ مصائب تو وہی ہیں جن کے ورود کی خبر اللہ اور اللہ کے رسول نے ہمیں پہلے ہی دیدی تھی۔ ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ ۔ وہ آزمائش وابتلاء کے ان کٹھن مراحل کو پورے صبر واستقامت کے ساتھ طے کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کا کھرا پن اور سچائی ظاہر ہوگئی اور اللہ نے ہجرت کی اجازت مرحمت فرمادی۔ اب ان کی دعوت کو نسبتاً کم دشوار گزار راستہ مل گیا پہلی سی مزاحمتوں کا سامنا نہ رہا اس لیے کامیابی کی رفتار تیز ہوگئی اور رفتہ رفتہ یہ جماعت اس پوزیشن میں آگئی کہ خلافت ارضی کی ذمہ داریاں سنبھال سکے پس مشیت الٰہی کا تقاضا ہوا کہ انھیں اقتدار حکومت بخشا جائے تاکہ یہ دنیا میں اعتدال قائم کریں، ظلم و بے انصافی کا استیصال کریں، انسانوں کو ظنون واوہام کی اندھیریوں سے نکال کر نور حقیقت سے آشنا کریں جن غلط اصولوں کی پابندی اور رسوم ورواج کی بندشوں نے ان پر زندگی تنگ کر رکھی ہے ان سے نجات دلا کر ان پر جینا آسان کریں اور ان کو ان ہی جیسے انسانوں کی غلامی سے آزاد کرا کر صرف خدائے وحدہ لا شریک کی غلامی اور بندگی کا سبق پڑھائیں ——— یہ ذمہ داریاں تھیں جو حکومت کے ساتھ ان پر عائد کی گئیں ——— تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے ان ذمہ داریوں کا حق ادا کر دکھایا اور وہی کام کیے جو "حکومت برائے ہدایت" کا طرۂ امتیاز ہے۔ نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کیا ہر برائی کی بندش کی ہر بھلائی کی پرورش کی۔

بہرحال دعوت اسلامی کا یہ شجر حکومت کا پھل لایا اور جن لوگوں نے اس پودے کے نشو ونما اور حفاظت وبقا کی خاطر اپنی جانوں کی بازیاں کھیلی تھیں انھوں نے اپنی قربانیوں کا پہلا صلہ عزت وشوکت اور اقتدار کی صورت میں پالیا۔"

بزرگو! اس مقصد ومنتہا کے درمیان جس کی فکر کی جاتی ہے اور اس قدرتی نتیجہ کے درمیان جو ایک خاص عمل سے ظہور میں آتا ہے، بڑا فرق ہے یہ فرق جد وجہد کرنے والے کی نفسیات میں نمایاں ہوتا ہے۔ جس کا مقصد حکومت ہوتا ہے جب وہ اس کے حصول میں ناکام رہتا ہے یا ناامید ہو جاتا ہے تو تھک کر بیٹھ رہتا ہے اور دعوت کو چھوڑ کر اسی مقصد میں الجھا رہتا ہے اور اگر وہ مقصد حاصل کر لیتا ہے تو اس میں سرکشی پیدا ہوتی ہے۔ اس جماعت کے لیے جس کا ذہنی نشو ونما حکومت کے تخیلات میں ہوا ہو اس کا بہت بڑا خطرہ ہے کہ وہ دعوت کی جد وجہد سے بیٹھ رہے یا راستہ سے بھٹک جائے۔ کیوں کہ حکومت تک پہونچنے کے طریقے دعوت کے اسالیب اور طریقوں سے جدا ہیں۔

ہم پر فرض ہے کہ ہم اپنے فکر وقلب کو دعوت کے لیے اور صرف دعوت کے لیے یکسو کرلیں۔ ہمارے پیش نظر محض خدمت، قربانی، ایثار ہو، ہم کو محض اس بات سے دلچسپی ہو کہ ہم لوگوں کو اندھیروں سے نور کی طرف، جاہلیت سے اسلام کی طرف، دنیا کی تنگی سے اس کی وسعتوں کی طرف محرّف ومبدّل مذاہب ظالمانہ غیر معتدل نظاموں اور فلسفوں سے چھڑا کر اسلام کے عدل اور اس کے سایہ میں پناہ دیں اور یہ سب رضائے الٰہی اور تعمیل حکم کے جذبہ سے ہو۔ ضروری ہے کہ کوشش وجد وجہد کے لیے ہمارا محرک اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری اور حصول جنت کے سوا کچھ اور نہ ہو۔ ہمیں ابھارنے والے اجر وثواب کے وہ وعدے ہوں جو اللہ نے دینی جد وجہد کرنے والوں کے لیے کیے ہیں۔ ہمارے اندر مخلوق خدا پر شفقت، مبتلائے عذاب انسانیت پر رحم اور انسان کی نجات کی حرص کے سوا کوئی اور جذبہ کارفرما نہو۔ اگر یہ دعوت کے کسی ایک مرحلے یا تاریخ کے کسی ایک دور میں ——— جب کہ داعیوں کے دلوں میں دعوت کے اصول بس چکے ہوں اور ان میں عقیدہ رچ گیا ہو ——— بغیر حکومت کے ناممکن ہو تو ہم اس کے لیے دعوت کی خاطر اسی طرح کوشش کریں گے جس طرح وضو کے لیے پانی کے حصول کی ہم کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کے لیے ہم اسی فکر وکردار اسی بے غرضی وبے لوثی، اسی صداقت وامانت، خوف خدا اور بے نفسی کے ساتھ جد وجہد کریں گے جیسی کہ ہم فرائض وارکانِ دین اور دوسری عبادات کے لیے کرتے ہیں۔ مومن کے لیے اگر اخلاص کا دامن ہاتھ سے نہ جائے اور نیت درست [illegible] اور عبادات میں ذرا فرق نہیں۔

[illegible] عبادت ہے جس سے

بندہ اللہ کا قرب حاصل کرتا ہے۔

(۳) تیسری چیز جو انبیاء علیہم السلام کی زندگی اور سیرت کو ممتاز کرتی ہے وہ ان کی دعوت پر ثابت قدمی اور صبر و تحمل ہے وہ اس اساسی مرحلے پر سے سرعت و عجلت اور رواداری کے ساتھ گزر نہیں جاتے اور اس سے کسی دوسرے مرحلے پر چھلانگ نہیں لگاتے بلکہ وہ اس میں سالہا سال گزارتے ہیں، اور نہ وہ اس دوران میں اس کے سوا کسی اور چیز سے اشتغال رکھتے ہیں اور نہ وہ آسانی سے اس بات پر اطمینان کر لیتے ہیں کہ ان کے معاصرین نے ان کی دعوت کو سمجھ لیا ہے اور ان کی بات ان کے گلے سے اتر گئی ہے، اور نہ ان کو داعیوں پر اطمینان ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنا پیغام پہونچا دیا اور اپنی مہم سر کر لی ہو اور نہ دلوں ہی پر کہ انھوں نے دعوت کو قبول کر لیا اور صحیح طور پر ہضم کر لیا ہے اور اس کو اپنی زندگی میں مناسب جگہ بھی دیدی ہے اور نہ اس بات پر کہ طبیعتیں اتباع احکام کی عادی اور اس کے لیے تیار اور ان کے مقابلہ میں سرانداز ہو گئی ہیں ان کو ان میں سے کسی چیز پر اس وقت تک اطمینان نہیں ہوتا جب تک وہ اس کو اچھی طرح جانچ پرکھ نہ لیں اور بار بار آزما نہ لیں وہ دھوکے میں مبتلا نہیں ہوتے اور نہ شاندار الفاظ سے ان کو غلط فہمی ہی ہوتی ہے۔ اس گہری تربیت اور طویل دعوت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے انجام کو پہونچتی ہے، اور کوئی ناتمام نتیجہ ظاہر نہیں کرتی اور حکومت جب قائم ہوتی ہے تو طاقت ور شانوں پر قائم ہوتی ہو ایسے لوگوں کے شانوں پر جن کا عقیدہ قوی جن کا کردار مضبوط جن کے اخلاق ناقابل شکست جن کی عبادت مخلصانہ جن کی تدبیر و سیاست آہنی ہوتی ہے جو دھارے کے ساتھ بہتے نہیں جن کو تمدن کھینچ نہیں لے جاتا اور جن کی طبیعتوں پر فقر کے بعد دولت، تنگی کے بعد کشائش، ضعف کے بعد طاقت سے کوئی اثر نہیں پڑتا جن کی حکومت اقربا نوازی، پاسداری، آشنا پروری، بے انصافی کے داغ سے پاک رہتی ہے جن کو لالچ اور فوائد اپنی راہ راست سے اور اپنے اصول و معیار سے سر مو ہٹا نہیں سکتے۔ یہ تھا خلافت راشدہ کا تصور، اور یہ تھی خلفائے راشدین کی سیرت، یہاں میں دوبارہ رسالہ (بین الجاہلیۃ والہدایہ) کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جس میں صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کی اسی خصوصیت کو بیان کیا گیا ہے۔

مملکت کے قیام کے بعد چند ہی سال کے عرصے میں جب اس کے مجاہدین نے شام و ایران کو فتح کر لیا اور قیصر و کسریٰ کے ہاتھوں سے اقتدار کی باگیں چھین لیں، اور ان دونوں مفتوح شہنشاہیتوں کے سارے خزانے اس نئی مملکت کے پایۂ تخت ۔ مدینہ منورہ ۔ میں لاکر ڈھیر کر دیے گئے بلکہ کہنا چاہیے کہ چاندی سونے کے دو دریا ان دو عظیم ترین سلطنتوں سے نکل کر مدینہ کی سمت بہنے لگے اور دونوں سلطنتوں کے وہ بہترین اموال اور ٹھاٹھ باٹھ کے وہ لاجواب

اسباب اس نئی مملکت کے سربراہ کاروں کے قدموں میں آ پڑے جنھیں انھوں نے اپنی پوری عمر میں بیداری میں تو کیا شاید خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ تو اس وقت اس کا پورا پورا موقع تھا کہ ان میں سے کوئی اگر چاہتا کہ کسریٰ کا تاجِ زرنگار اس کے سر پر رکھ دیا جائے یا قیصر کا بسترِ خاص اس کے نیچے بچھا دیا جائے تو بلا تکلف ایسا ہو جاتا، مگر ——— ہمیں حیرت ہو جاتی ہے جب ہم یہ سنتے ہیں کہ ——— اس ارادہ سے تو انھوں نے ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہ لگایا ——— پھر ہماری حیرت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب ہم اس پہلو پر بھی نظر کرتے ہیں کہ یہ موقع انھیں اس وقت حاصل ہوا تھا جبکہ انھیں زندگی کی تلخیاں برداشت کرتے، کھانے پینے اور پہننے میں تنگی اور تکلیف اٹھاتے ہوئے تقریباً ایک چوتھائی صدی گذر چکی تھی، اس مدت میں انھیں مشکل ہی سے اتنا کھانا اور کپڑا میسر ہوتا تھا جس سے پیٹ بھر جا سکے اور تن ڈھکا جا سکے ——— ایسے وقت میں دنیا کی دو عظیم ترین سلطنتیں مع اپنے ہر قسم کے مال و دولت کے ان کے قبضے میں آتی ہیں، اور یہ ان کے مال و دولت کو نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتے ——— بڑی بات تھی! ——— استغنا و استقامت کا حیرت انگیز مظاہرہ!! ———

بخدا ایسی استقامت! جس کی توقع پہاڑوں سے بھی نہیں کی جا سکتی، استغنا، کہ ایسے امتحان میں بڑے بڑے ضرب المثل کرداروں کو فیل ہوتے دیکھا ہے ——— مگر یہ کامیاب ہوئے ——— کیوں ——— ؟ اس لیے کہ انھوں نے اس مسئلہ کو سرسری نظر سے نہیں دیکھا، ان کے نزدیک یہاں سوال صرف یہ نہیں تھا کہ وہ تنگ دستی اور فاقہ مستی سے نجات پاکر خوش حالی اور کشائش اختیار کرنا چاہتے ہیں کہ نہیں؟ بلکہ اصل سوال ان کے خیال میں یہ تھا کہ کیا وہ آج اس مال و دولت، اس تاج و تخت، اور "زینت دنیا" پر ریجھ کر ہمیشہ کے لیے اپنے اصول، اپنے مقاصد، اپنی دعوت، راہِ حق کی رہبری اور اس کے تقاضوں کو خیرباد کہہ دینے کا فیصلہ کرتے ہیں، یا یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ سیم و زر کے اس سیلاب، اور سکوں کی جھنکار میں بھی دعوتِ نبوی کی اصل روح کو مضبوطی سے تھامے رہیں گے، اور جانشینانِ انبیاء و حاملانِ دعوتِ حق کے مثالی کردار پر حرصِ دنیا کا کوئی ہلکے سے ہلکا دھبہ بھی نہ لگنے دینگے۔

ان کے لیے بہترین موقع تھا کہ رومی و ایرانی شہنشاہیتوں کے سقوط کے بعد وہ ایک عظیم عربی شہنشاہیت کی بنیاد ڈال دیتے، اور انہی کے اربابِ اقتدار کی طرح عیش و عشرت میں ڈوب جاتے، اس لیے کہ یہ دونوں شہنشاہیاں بیک وقت ان کی مٹھی میں تھیں ——— کسریٰ اگر تنہا مملکت ایران کی دولت اور وسائل کے بل پر عیش و عشرت کے ریکارڈ قائم کر سکتا تھا ——— یا قیصر اگر تنہا رومی شہنشاہیت کی دولت اور وسائل پر ناز کر کے شان و شوکت کے متکبرانہ مظاہرے کر سکتا تھا ——— تو خطاب کے بیٹے عمر فاروقؓ کیلئے بھی یہ سب کچھ کرنے، بلکہ اس سے بہت زیادہ کرنے کا حق

حاصل تھا، کیوں کہ ان کا اقتدار بیک وقت روم و ایران دونوں پر تھا۔

بیشک عمرؓ اور ان کے رفقاء کرنے کو ایسا کر سکتے تھے۔۔۔۔ مگر وہ اس کو کیا کرتے کہ کانوں میں تو قرآن کی یہ تنبیہ ہر وقت گونج رہی تھی۔

"تلک الدار الآخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علواً فی الارض ولا فسادا والعاقبۃ للمتقین" (ترجمہ) "اس دار آخرت میں ہم اُن لوگوں کو عیش کا حق دیں گے جو دنیا میں نہ اپنی بڑائی کے خواہشمند ہیں، نہ (اس غرض کے لیے) فساد برپا کرتے ہیں،۔۔۔۔ اچھا انجام تو متقیوں ہی کا حق ہے"

اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد حافظہ کی تختیوں پر اُبھر اُبھر کر سامنے آرہا تھا، کہ:۔

"لا الفقر اخشی علیکم ولکن اخاف ان تبسط علیکم الدنیا کما بسطت علی من کان قبلکم فتھلککم کما اھلکتھم" (ترجمہ) مجھے تمھارے فقر وفاقہ سے خطرہ نہیں ہے، بلکہ مجھے خطرہ اس سے ہے کہ دنیا تم پر کشادہ ہوجائے، جیسے تم سے اگلوں پر ہوئی تھی، اور اس نے جیسے انھیں برباد کر دیا تھا تمھیں بھی کردے"

اس لیے وہ سب کے سب بیک آواز بول اٹھے:۔

"اللّٰھم لا عیش الا عیش الآخرۃ فاغفر الانصار والمھاجرۃ"

(ترجمہ) بشیک زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے، خدایا تو ہم سب انصار و مہاجرین کو بخش دے۔

الغرض انھوں نے ہر قیمت پر اپنی دعوتی روح اور اپنے دعوتی کردار کی حفاظت کی، حکومت کی مگر حاکمانہ انداز کے بجائے داعیانہ انداز سے، دنیا میں رہے مگر اہل دنیا کی طرح نہیں بلکہ طالب آخرت بن کر، انھوں نے اس سیل تند و تیز میں بھی اپنے اوپر پورا قابو رکھا جس میں ہزاروں حکومتیں سیکڑوں قومیں، ان کا تہذیب و تمدن، ان کے اصول و اخلاق، اور علوم و فنون خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ یہ قوت و اقتدار کا سیلاب تھا جس کے متعلق علامہ اقبالؔ نے کہا ہے:۔

تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے ۔۔۔ صاحب نظراں، نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے ۔۔۔ عقل و خرد و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

لوگ تاریخِ اسلام کے اس واقعہ کو انتہائی حیرت اور تعجب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ مجاہدینِ اسلام حضرت سعد بن وقاصؓ کی قیادت میں اپنے گھوڑوں سمیت دریائے دجلہ میں پھاند پڑے اور بغیر کسی جانی اور مالی نقصان کے اس کے پھاٹ کو پار کر کے دوسرے کنارے پر جا اترے ـــــ بیشک واقعہ اپنی جگہ پر تعجب خیز ضرور ہے اور اس پر زیادہ سے زیادہ تعجب کرنا بجا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ قابلِ تعجب بات یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے دور میں روم و ایران کو فتح کرنے والے مسلمان رومی و ایرانی تہذیب و تمدن کے تلاطم خیز سمندر میں گھسے اور اس کنارے سے اس کنارے تک جا نکلے مگر اس ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ کہ ان کے اخلاق و اطوار کا دامن ذرا بھی تر نہ ہونے پایا۔

عین فتوحات کے شباب کے زمانے میں ان کے بڑے سے بے کے چھوٹے تک ہر ایک نے اپنے تمدن کی زہد، سادگی، اور جفاکشی جیسی خصوصیات کو پوری طرح برقرار رکھا اور اپنی روح اور اپنے مزاج کو ان مفتوح اقوام کے عیش پرستانہ تمدن کی آلودگیوں سے بالکل پاک رکھا حالانکہ "قعرِ دریا" میں پہونچ کر تر دامنی سے بچے رہنے کو عقل آج تک محال سمجھتی رہی ہے!

انبیاء اور داعیین الی اللہ کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ دعوت کے لیے اپنا جسم و قلب اور وقت و قوت فارغ کر دیتے ہیں ان کا دستور اور عادت یہ ہے کہ وہ اپنی ساری جد و جہد اور اپنی تمام صلاحیتیں دعوت کے سپرد کر دیتے ہیں اور اپنے اوقات اور اپنی طاقتیں اس کی اشاعت اور اس کی راہ میں جد و جہد پر لگا دیتے ہیں وہ دعوت کے سلسلے میں کسی چیز میں بخل نہیں کرتے اور کسی چیز کو اٹھا نہیں رکھتے، اور نہ کسی مقصد کو اس پر ترجیح دیتے ہیں۔ وطن کو نہ اہل و عیال کو، نہ خاندان کو، نہ نفس کو نہ مال و دولت کو، اس سب کے بعد کہیں جا کر ان کی کوشش بار آور ہوتی ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کی زندگی اپنی کوششوں کا نتیجہ دیکھے بغیر ختم ہو جاتی ہو مگر اس کے بعد دعوت اپنا پھل دیتی ہے دیکھئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ یوں خطاب فرماتا ہو۔

وامانرینک بعض الذی نعدھم او نتوفینک فالینا مرجعھم ثم اللہ شھید علی ما یفعلون (یونس)

یا تو آپ کو ہم وہی دکھا دیں گے جس کا وعدہ ہے یا آپ کو وفات دیدیں گے اور ان سب کو ہماری ہی جانب پلٹنا ہے پھر اللہ ان کے اعمال کا شاہد ہے۔ (یونس)

انبیاء کرام نے دعوت کو اپنا سب کچھ حوالے کر دیا تب اس کے نتائج برآمد ہوئے ہم جب کہ اپنی زندگی کا جزوی حصہ ہی اسکو حوالے کرتے ہیں تو کن نتائج کے امیدوار ہو سکتے ہیں ان کا حال تو یہ تھا کہ دعوت ان کے عقل و شعور فکر و راحت پر چھا جاتی تھی اور ان کی زندگی اس میں گم ہو جاتی تھی دیکھئے قرآن شریف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بے چینی میں آپ کو یوں تسکین دیتا ہے۔

فلعلك باخع نفسك على آثارهم	ان لوگوں کے ایمان نہ لانے پر شاید
ان لم يومنوا بهذا الحديث	آپ ان کے غم میں اپنے کو ہلاک کر لیں
اسفا (سورۂ کہف)	گے۔ (کہف)

انبیاء علیہم السلام اور دعوت کے وہ علمبردار جو ان کے طریقہ کار کے متبع اور مقلد ہیں ان کا امتیاز یہ ہے کہ اللہ اور یوم آخرت کی دعوت ان کی زندگی میں اس طرح جاری و ساری رہتی ہے جس طرح پانی درخت کے ریشوں اور مساموں میں سرایت کر جاتا ہے یا لوہے کے تاروں میں بجلی دوڑ جاتی ہے اس کا ظہور ان کی زندگی کے تمام شعبوں میں ہوتا ہے، ان کا اخلاق ان کی عبادات اس کا مظہر بن جاتی ہیں ان کے قلب گداز اور تسلیم و انقیاد سے بھرپور ہوتے ہیں ان میں عبادات کا ذوق بندگی کا شغف اور اس کے حقوق کی ادائگی کی حرص پیدا ہو جاتی ہے حضرت مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور اس قدر قیام فرمایا کہ آپکے قدم مبارک میں ورم پیدا ہو گیا آپ سے عرض کیا گیا کہ حضور کے تو اگلے پچھلے سب گناہ اللہ نے معاف فرما دیے ہیں آپنے فرمایا کہ کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں (متفق علیہ) عبادت سے یہ دلچسپی اور شغف صحابہ کرام کے حصہ میں بھی آیا مشغول ترین اور انتہائی پریشانی اور انتشار کے اوقات میں بھی اسکی مثالیں ملتی ہیں حتیٰ کہ ان کے دشمن بھی ان چیزوں سے واقف تھے ایک رومی شخص نے ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا: اگر تم اپنے ساتھی سے کچھ کہو تو وہ تمھاری بات سمجھ نہ پائے گا کیونکہ قرآن و ذکر کی آواز سے ان کی مجلسیں گونجتی ہوتی ہیں۔

انبیاء کرام اور ان کے متبعین کا یہ خاصہ ہے کہ وہ دین میں عزیمت کو رخصت پر ترجیح دیتے ہیں اور رخصت کو اسی وقت اختیار کرتے ہیں جس وقت ان کو کسی شرعی حکم کی وضاحت کرنی ہو یا اللہ کے انعامات کی قدر و شکر کے اظہار کا موقع ہو یا کسی دشواری سے حفاظت کی راہ بتانی ہو وہ شخصی طور پر اپنے لیے گنجائش نہیں ڈھونڈتے اور نہ عبادات میں تساہل سے کام لیتے ہیں کیوں کہ عامۃ الناس دین کے فرائض کی پابندی اسی نسبت سے کرتے ہیں جس نسبت سے یہ ذمہ دار حضرات پابندی کرتے ہیں یہ حضرات اگر نوافل کی پابندی کرتے ہیں تو عامۃ الناس فرائض کی کرتے ہیں اور اگر یہ حضرات صرف فرائض ہی پر اکتفا کر لیں تو عوام سے فرائض بھی

ترک ہونے لگتے رہیں اور فرائض کی قیمت ان کی نظر میں کم ہو جاتی ہے اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور امت کے سر پرست حضرات عبادات کا پورا اہتمام فرماتے اور جماعتوں کی شدت سے پابندی کرتے چھوٹی چھوٹی سنتوں پر عمل کرتے اور ان کے آداب کا پورا خیال رکھتے تھے قلیل پر بس نہ کرتے اور نہ فرائض ادا کر کے اپنے کو سبکدوش سمجھ لیتے اسی وجہ سے دین موجودہ نسل تک بے کم و کاست پہونچ سکا اور اب یہ دین امت کی موجودہ نسل کے پاس امانت ہے دیکھیں یہ امت آئندہ نسلوں کو یہ دین کس طرح حوالہ کر کے جاتی ہے۔

انبیاء مرسلین اور مصنفین، حکماء و محققین کے درمیان ایک ما بہ الامتیاز چیز یہ ہے کہ انبیاء اپنے افراد کی تربیت کا پورا اہتمام فرماتے ہیں جو ان کے بعد ان کی دعوت کی ذمہ داری اٹھانے والے ہوتے ہیں اور جو ان کی تعلیمات و مقاصد کو علماً و عملاً جاری کرنے والے ہوتے ہیں اور کھلی حقیقت ہے کہ ان کی عظیم المرتبت دعوت کو ان ہی لوگوں کے شانے سنبھال سکتے ہیں جو صحیح و توانا ہوں جن کا ذہن یکسو ہو، جن کا دماغ الجھنوں سے صاف ہو چکا ہو، جن کو نیت کے خلوص، قلب و ذہن کی صفائی کی دولت حاصل ہو چکی ہو اور جو جاہلیت کے ذہنی و اخلاقی اثرات سے آزاد ہو چکے ہوں، جنھوں نے اسلام کی تعلیمات کو پی لیا ہو اور جاہلیت کے معمولی سے معمولی تعلق کو توڑ دیا ہو اسلام میں اس طرح داخل ہوئے ہوں گویا کہ انھوں نے پھر سے زندگی پائی اور نئی دنیا میں قدم رکھا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت میں ہم کو یہ حقیقت نمایاں ملتی ہے، بنی اسرائیل کا نشو ونما غلامی ذلت ظلم اور حقارت آمیز زندگی میں ہوا ان کی حمیت مردانہ اور خودداری مردہ ہو گئی تھی۔ احساس کمتری دوں ہمتی ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ طاقت و اقتدار کے سامنے جھکنے اور اس کے قدموں پر گر جانے کی عادت پڑ گئی تھی بزدلی ان کے خمیر میں پڑ چکی تھی زندگی سے ان کو بہت زائد محبت موت کے نام سے بھی ان کو دہشت ہوتی تھی حتیٰ کہ جب ان کے نبی نے ان سے کہا کہ

یاقوم ادخلوا الارض المقدسۃ	اے قوم اس ارض پاک میں داخل ہو جاؤ
التی کتب اللہ لکم ولا ترتدوا	جس کو اللہ نے تمھارے حصہ میں لکھ دیا ہے
علیٰ ادبارکم فتنقلبوا خاسرین ۝	اور پشت دیکر مت بھاگو ورنہ نقصان اٹھاؤ
قالوا یاموسیٰ ان فیھا قوما	گے تو انھوں نے جواب دیا اے موسیٰ وہاں تو بے
جبارین وانا لن ندخلھا حتیٰ	زبردست لوگ ہیں وہ لوگ جب تک وہاں
یخرجوا منھا فان یخرجوا منھا	سے نکل نہیں جاتے ہم تو کبھی بھی وہاں نہ داخل ہونگے ہاں
فانا داخلون ،	جب وہ وہاں سے نکل جائینگے تو ہم ضرور داخل ہو جائینگے

حضرت موسیٰ نے فرمایا تھا کہ اس زمین کو اللہ نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا ہے لیکن ان کی اس قول سے بھی ہمت افزائی نہ ہوئی حالانکہ یہ قول ان کی فتح و کامرانی کا وعدہ اور ضمانت تھی اور آخر میں تو انھوں نے نہایت بیباکی اور بے حیائی کے ساتھ کہا

یا موسیٰ انا لن ندخلھا ابدا مادا	اے موسیٰ وہ لوگ جبتک وہاں موجود ہیں
موا فیھا فاذھب انت وربک	ہم ہرگز ہرگز نہ جائیں گے تم جاؤ اور تمھارے
فقاتلا انا ھھنا قاعدون،	رب اور دونوں لڑو ہم یہاں بیٹھے ہیں

معلوم ہوا کہ ان کا سابق نشو و نما ان کو ہر طرح کے اقدام و جرات سے روکتا ہے وہ نہ کسی معرکہ آرائی کے لیے تیار ہیں اور نہ کسی امتحان میں پڑنے اور نہ اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالنے کے لیے ان میں سکت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس نسل کی صلاحیت سے مایوس ہو گیے انھوں نے فرمایا۔

رب انی لا املک الا نفسی واخی	اے میرے رب میرا قابو اپنے اور اپنے بھائی کے
فافرق بیننا وبین القوم الفاسقین	سوا کسی اور پر نہیں پس تو ہمارے اور ہماری اس قوم
	کے درمیان میں تو جدائی ڈال دے۔

اس وقت اللہ نے ان کو حکم دیا کہ وہ اس نااہل قوم کو لے کر جزیرہ نمائے سینا کے خطہ میں چلے جائیں جہاں جفاکشی اور مشقت کی زندگی گزارنی پڑے گی وہاں پہونچ کر یہ نسل ختم ہو جائے گی جس کا اٹھان بزدلی اور کمزوری پر ہوا تھا اور اسی پر وہ پختہ ہو گئی تھی، اور ایک نئی نسل پیدا ہوگی جو جفاکشی و مشقت اور زندگی کی سختیوں کی عادی ہوگی وہ اس الگ تھلگ اور تمدن کی خرابیوں سے دور زندگی میں نشو و نما پاکر مردانہ اوصاف اور جوانمردی کی صفات کی حامل ہوگی اور اس طرح پیغمبر کی دعوت اور اس کی تعلیمات کے نفاذ اور اس کے دین کے لیے جدوجہد کرنے کے لیے ایک تازہ دم، جواں ہمت، بلند حوصلہ نسل تیار ہو جائے گی۔

یہ ہجرت نبوی کی حکمتوں میں سے ایک حکمت ہے حضور نے اپنے اصحاب کے ساتھ جب مکہ کی تنگدامنی اور وہاں کے لوگوں کی چیرہ دستیوں سے بچنے کے لیے مدینہ منورہ کی وسعتوں کو اپنا مرکز بنایا تو آپکے لیے اسکے مواقع حاصل ہوئے کہ آپ اپنے اصحاب کی خاطر خواہ تربیت و اصلاح فرمائیں اور ایک نئی دعوتی قوم تیار کریں جو آپکے کام کو آپکے بعد سنبھال سکے۔

آپ نے اپنی قوم کی تربیت فرمائی اور حقیقتاً ایسی صالح قوم تیار فرمادی جس نے آپکے کام کو بخوبی سنبھالا اور اس کی ذمہ داری کو پورا کیا دعوت کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور اسلام کے اصول دنیا میں روشناس کرائے۔

اسلام کی یہ دعوت و تحریک جس کی ذمہ داری کیلئے آپ لوگوں نے اپنے کو پیش کیا ہے اور یہ جدوجہد اور

عمل جس کے بوجھ کو اپنے کاندھے پر آپ لوگوں نے اٹھایا ہو میرے دوستو یہ سب تقاضا کرتا ہے کہ آپ اسی طرح ایک اسلامی نسل تیار کریں جس میں تازہ اور پختہ ایمان ہو جس میں نیا جوش و اعتماد ہو جس کے فکر و فہم میں تازگی اور زندگی ہو جو نئی علمی صلاحیتوں اور ذہنی استعداد کی مالک ہو باور فرمائیے کہ آپ کو اس نسل کی تیاری میں جس قدر کامیابی ہو سکے گی اسی قدر آپ کی مہم بھی کامیاب ہو اور آپ اپنی دعوت و مقصد میں اسی درجہ کامیاب ہیں

آپ حضرات سے یہ بات مخفی نہیں کہ کسی جوان نسل کی تیاری یا موجودہ نسل کی تربیت و اصلاح جو صلاحیت اور نمو سے محروم نہ ہوئی ہو معمولی کام نہیں یہ اس قدر وزنی کام ہو جس کی ذمہ داری سنبھالنے کی ہمت بڑے بڑے جوانمرد نہیں رکھتے اس اہم مقصد کے لیے عظیم جد و جہد اور وسیع صلاحیتیں درکار ہیں اس کے لیے اپنی ساری جد و جہد اور قوتوں کو لگا دینے کی ضرورت ہو، یہ کام گہرے اور وسیع فکر کامل تعاون، اعلیٰ منصوبہ بندی، اور پہلے سے مکمل خاکہ کا طالب ہے اس کے لیے اصلاح و دعوت کے میدان میں علمی جد و جہد کے ساتھ حکیمانہ اور مؤثر تربیتی اسالیب لازمی ہیں جو گہرے اثرات رکھتے ہیں اس اہم کام میں مستقل لٹریچر کی ضرورت ہو اور اسکی ترتیب کے لیے اعلیٰ علمی صلاحیتوں اور دقت شناسی کی ضرورت ہو اس کام کے لیے جدید بنیاد پر تعلیم و مطالعہ کا ایک نصاب وضع کرنے کی احتیاج ہے اور کچھ مثالی اور نمونہ کے مدارس اور علمی مراکز کے قیام کی ضرورت ہو اس کام کے لیے اس بات کی ضرورت ہو کہ زمانہ کی جیتی جاگتی زبان میں اسلام کو اس وقت کے لوگوں کے لیے پیش کیا جائے ایسی کتابیں لکھی جائیں جو اسلام کے حقائق کی تشریح و تفسیر کرتی ہوں اس سلسلہ میں سیرت نبوی کی جدید تالیف تاریخ اسلامی کی نئی ترتیب علوم اسلامیہ کی جدید تدوین اور علوم طبیعی کی جدید تفسیر و توضیح ایک اہم ضرورت اور کام ہے جس میں تالیف و تصنیف کا نیا طرز اور صحافت، ادب شعر کا نیا ڈھنگ اور افسانوں اور قصوں تک کا نیا نمونہ درکار ہو۔

دوستو! آپ فکر و ادب کے ایک ملبے اور مال خام کے ایک ڈھیر کے روبرو کھڑے ہیں آپ کو اس بوسیدہ و شکستہ مواد سے ایک نیا محل تعمیر کرنا ہو بلکہ یہ جانیئے کہ ایک نئی کشتی بنانا ہے یہ کشتی حادثات اور موانع کی موجوں کے تھپیڑے سہتی ہوئی آگے بڑھے گی آپ لوگ ایک نئے کام کا آغاز اور ایک نئی جد و جہد کی ابتدا کر رہے جس میں آپ کا کافی وقت اور وسیع جد و جہد صرف ہو گی دوستو یہ کام اگرچہ طویل پر مشقت اکتا دینے والا اور بہت پھیلا ہوا ہو —— لیکن اس ناقابل انکار حقیقت کا آپ کو سامنا کرنا ہے اور رکاوٹوں اور دقتوں پر قابو پانا ہے یہی پیغمبرانہ دعوت اور انبیاء کے متبعین کی دعوت کے خصائص ہیں اور یہی خصائص آپ کی دعوت کو قومی تحریکات اجتماعی چیخ و پکار اور اقتصادی ہنگاموں سے ممتاز بناتے ہیں اور انہی سرچشموں سے آپ کی دعوت و جد و جہد غذاء اور طاقت حاصل کرتی ہے اور اللہ کی نصرت کی مستحق بنتی ہے ہم پر فرض ہے کہ جس طرح ہم شعائر و عقائد کی حفاظت اور پابندی کرتے ہیں اسی طرح ان کی بھی پابندی اور حفاظت کریں اور قوت زندگی کے برابر

ان کی اہمیت محسوس کریں۔

دوستو! آپکے پاس صداقت و ایمان محبت و اخلاص کی ایک گرانقدر دولت ہے جو بڑی بڑی حکومتوں اور عظیم الشان قوموں کو نصیب نہیں ہے آپکے پاس ایک نہایت مقدس امانت ہے ان دلوں کی امانت جو آپ کی محبت پر مجتمع ہوئے اور جو آپ کی قیادت و سرپرستی سے مطمئن ہیں وہ امانت جس کو مرحوم قائد آپکے لیے چھوڑ گیے ہیں اسکی ذمہ داری آپ کو پوری کرنی ہے اور اس بارے میں اپنے قائد کی نیابت کرنی ہے۔

تحریک کے موسس اور داعی اول کا سانحہ تحریک کے حق میں ایک زبردست سانحہ اور غیر معمولی خسارہ ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کے لیے ہر سانحہ معمولی اور ہر خسارہ حقیر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا حضور سے جو تعلق تھا اس کے پیش نظر آپکی رحلت کا سانحہ ایسا سانحہ تھا جو کسی فرد یا جماعت کو نہیں پہونچا اور اس حادثہ کے روز مسلمانوں پر ایسے مصائب اکٹھا ہو گیے تھے جو پہلے کبھی اکٹھا نہ ہوئے تھے اور نہ آئندہ انکے اس طرح مجتمع ہو جانے کی امید ہے ہم کو چاہیے کہ ہم دیکھیں صحابہ کرام نے ان مصائب اور شدائد کو کس طرح برداشت کیا۔

درحقیقت اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو اس آزمائشی مرحلے اور سخت ترین امتحان کے لیے پہلے ہی سے تیار کر دیا تھا جبکہ جنگ احد کے موقع پر لوگوں میں یہ افواہ اڑا دی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گیے تو مسلمانوں کے ہاتھ پاؤں پھول گیے ان کے قوی جواب دے گیے اور بیشتر میدان جہاد میں ٹھہر نہ سکے اور اس صدمہ کو برداشت نہ کر پائے پھر خبر غلط نکلی اور لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے درمیان میں موجود پایا آپکو دیکھکر صحابہ کے جان میں جان آئی انھوں نے پھر میدان جنگ میں جم کر مقابلہ کیا۔ اس واقعہ سے دراصل صحابہ کرام کو تیار کرنا مقصود تھا اور آنیوالے حادثہ کی تمہید تھی اور اس حقیقت کی توضیح تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک متعین اور محدود زندگی لیکر اس دنیا میں آئے ہیں اسلیے آپکے حادثۂ رحلت میں ہوش و حواس کو کھو نہ دینا چاہیے بلکہ نہایت تحمل اور صبر سے اس کو انگیز کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے ذریعہ صحابہ کرام کا دعوت دین سے رشتہ مضبوط کر دیا اور انکو اس بات سے آگاہ فرما دیا کہ داعی اول پر بھی اللہ تعالیٰ کی وہی سنت جاری و ساری ہو گی جو اسکے بندوں پر ہوتی ہے وہ بھی اس عالم سے دوسرے عالم کو سفر کریگا جسطرح ان سے قبل دوسرے انبیاء نے سفر کیا۔ فرمایا:-

ما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل	محمد بھی ایک رسول ہیں جیسے کہ ان سے قبل اور دوسرے
افان مات او قتل انقلبتم على اعقابكم ومن	رسول گزرے اگر وہ مر جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم
ينقلب على عقبيه فلن يضر الله شيئا و	الٹے پیر پلٹ جاؤ گے جو بھی الٹے پیر پلٹے گا اللہ کو ذرا مضرت
سيجزي الله الشاكرين (آل عمران)	نہ پہونچا سکے گا اللہ عنقریب ہی شکر گزاروں کو بدلہ دینے والا ہے۔

اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سانحہ وفات پیش آیا تو صحابہ کرام نے اپنے کو قابو میں رکھا، اس صبر و تحمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب حضرت ابوبکر صدیق صحابہ کرام کے پیش رو تھے انھوں نے نہ تو بے صبری دکھائی اور نہ ضعف و بزدلی کا اظہار کیا اور نہ انھوں نے اسلام کی مدد سے ہاتھ اٹھایا اور نہ وہ دعوت و تحریک سے بے دل ہوئے حالانکہ اس وقت اسلام پر اسطرح مصائب ٹوٹ پڑے تھے کہ نہ اس سے قبل ایسے مصائب

پڑے تھے اور نہ بعد میں ان کا امکان ہے۔ طبری کے بیان کے مطابق ہر قبیلے کے عرب عمومی اور خصوصی طور پر مرتد ہو چکے تھے نفاق پھوٹ نکلا تھا یہود و نصاریٰ نے پیر نکالنے شروع کر دیے تھے اور مسلمان ان بے چین حالات میں اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر موجودگی کی وجہ سے ان بھیڑوں کی طرح ہو گئے تھے جو جاڑے کی رات میں بھیگ کر اپنے باڑہ میں دبک جائیں، اسوقت روئے زمین پر تین مسجدوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کوئی مسجد باقی نہ رہ گئی تھی ایک تو مکہ مکرمہ کی مسجد الحرام دوسرے مدینہ منورہ کی مسجد نبوی تیسرے بحرین میں جواثی کے مقام پر مسجد عبد القیس نبوت کے دعویدار بڑھ گئے اور لوگوں نے زکات روک دی اور مرتدین نے مدینہ کی جانب یلغار کرنا چاہا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت پوری کرنے کے لیے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی زیر سرکردگی شام کی طرف مسلمانوں کا لشکر روانہ فرمانے کا تہیہ کر لیا حضرت عمر اور کبار صحابہ نے اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر سے گفتگو کی اور رائے دی کہ ان حالات میں لشکر کا روانہ کرنا کسی طرح مناسب نہیں مگر حضرت ابوبکر نے قبول نہیں کیا اور فرمایا اگر مجھ کو اس بات کا خطرہ بھی ہو کہ مجھ کو درندے اٹھا لے جائیں گے تب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب الحکم میں لشکر بھیجوں گا اور اگر قصبات میں میرے علاوہ کوئی باقی رہ بھی نہ جائے تب بھی میں اس کو روانہ کروں گا —

موقع کی اہمیت اور نزاکت پر نظر ڈالیے اور اسلام کی بے کسی اور مسلمانوں کے ضعف پر غور کیجیے درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلام کی دعوت خاتمہ کے کنارے جا لگی تھی مسلمانوں کو دو حادثوں سے سابقہ تھا ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت دوسرے قوم کا ارتداد۔ لیکن اس کے برعکس ان میں جہاد کا جذبہ متحرک ہو گیا اور ان میں قوت عمل کئی گنا بڑھ گئی۔ ان کی غیرت بھڑک اٹھی حضرت ابوبکر نے فرمایا کیا میری زندگی میں دین میں نقص پیدا کیا جائے گا مسلمانوں نے حادثات کے سامنے سر ڈالنے سے انکار کر دیا وہ دعوت اور اپنی جدوجہد سے دست بردار نہیں ہوئے انھوں نے اسلام کے ڈھانچہ اور اس کے رہے سہے سرمایہ ہی کی صرف محافظت نہیں کی بلکہ انھوں نے فارس و روم کی دونوں شہنشاہیتوں کو بھی زیر کر لیا جس میں اس وقت کی متمدن دنیا بٹی ہوئی تھی ان کو ان مسلمانوں نے اسلام کے قدموں پر ڈال دیا اور اسلامی سلطنت کا ایک جزو بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو وہ جزا دے جو اس کے انبیاء کے تابعین اور دعوت اسلامی کے امین اور طاقتور علمبرداروں کے شایان شان ہے۔ آخر میں آپ لوگ اس محب مخلص کی طرف سے مخلصانہ سلام اور محبت و خلوص کا تحفہ قبول فرمائیے جس کے اور آپ کے درمیان سمندر ہیں لیکن اسلامی عقیدہ اور دینی تخیل میں کوئی تفریق و انفصال نہیں آپ کے لیے توفیق اور درست کاری کی دعا ہے۔ آپ کے لیے اور آپ کے علاوہ ہر مخلص داعی اور مجاہد صادق کے لیے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ابو الحسن علی الحسنی الندوی لکھنؤ، الہند وارد حال قاہرہ ۹، ۲، ۷۰ھ

(بقیہ صفحہ ۱۰) آج کل کے عام مروج طریقوں سے بہت مختلف ہے اس لیے ہم زبان سے اس کے سمجھانے سے قاصر رہتے ہیں اور اسی واسطے میں نے طریق کار کی تفصیل اس وقت نہیں کی اگر آپ حضرات مجھ سے اپنے بھائیوں کو کسی درجہ میں اعتماد اور بھروسہ کے قابل سمجھیں تو میں آپ سے عرض کروں گا کہ خود عمل کر کے اس کا تجربہ فرمائیں انشاء اللہ آپ مطمئن ہوں گے اور محسوس کریں گے کہ آپ نے اپنا وقت صرف کر کے اور سفر وغیرہ کی تکلیفیں اٹھا کے کچھ نقصان نہیں اٹھایا بلکہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ پھر خود آپ کو اس کا داعی بنا دے گا۔ ہم اور ہماری مٹی کی زبانیں آپ کو مطمئن کرنے سے عاجز اور قاصر ہیں۔ آپ اگر کچھ تکلیفیں اٹھانے اور قربانی کرنے پر آمادہ ہو جائیں اور اللہ کے اس راستہ میں قدم اٹھا دیں تو حق تعالیٰ شانہ اطمینان اور انشراح صدر نصیب فرمائیں گے۔ ان کا وعدہ ہے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ

دجّالی فتنہ اور سورۂ کہف

(مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی)

آخری قسط نمبر (۲۱)

---

(۳)

آگے تیسری آیت جو ان تمام آیتوں میں سب سے زیادہ توجہ طلب ہونے کے ساتھ ہی مطلب کے لحاظ سے یا کم از کم میرے نقطۂ نظر کے حساب سے بہت زیادہ واضح ہے وہ یہ ہے، ارشاد ہوا ہے:۔

کہدو! کیا ہم آگاہ کریں ان لوگوں سے جو اپنے کاروبار	قل ھل انبئکم بالاخسرین اعمالا،
کے حساب سے بدترین خسارے کے شکار ہیں، یہ وہ لوگ ہیں	الذین ضل سعیھم فی الحیوۃ الدنیا
جن کی سعی اور کوشش کھو گئی، اسی حیات دنیا	وھم یحسبون انھم یحسنون
(پست زندگی) میں اور وہ خیال پکائے ہیں کہ کارستانی	صنعا۔
کے لحاظ سے وہ بہت اچھا کر رہے ہیں۔	

( )

"ضل سعیھم فی الحیوۃ الدنیا" (کھو گئی، کوشش ان کی اسی حیات دنیا (پست زندگی) میں) سب سے زیادہ فکر و تامل کی دعوت اس آیت کا یہی جز دے رہا ہے، دیکھ لیا جائے کہ "الآخرت" کی ابدی زندگی سے اپنی توانائیوں کے سارے ذخیرے کو موڑ کر قطعی طور پر موڑ کر اسی "الحیوۃ الدنیا" پست زندگی میں کون گم کر رہے ہیں، اور گم کرنے پر اصرار کر رہے ہیں، سب کچھ کر کے اور سب کو چھوڑ چھوڑ کے اس دنیا سے ان میں کا ہر ایک بایں طور روانہ ہو رہا ہے کہ پانے والے جو کچھ بھی پاتے ہیں کچھ بھی اپنے ساتھ نہیں لے جاتے ہیں، اور نہ لے جا سکتے ہیں، اور یوں اپنی ساری توانائیوں اور ان کے نتائج کو دن کی کھلی روشنی میں ہر ایک کے سامنے مسلسل ہر ایک کھوتا چلا جا رہا ہے، مگر بایں ہمہ اپنی کوششوں کی ان ہی ناکامیوں کے ساتھ مطمئن بھی ہیں، اور اسی کو صحیح اور کامیاب زندگی قرار دینے پر ان کی خود ستائیوں کا سلسلہ اس حد تک پہنچا ہوا ہے کہ

بنی آدم کے اکثر و بیشتر افراد پر اپنی اسی عجیب و غریب ناکام و نامراد زندگی کی پرچھائیوں کو ڈال ڈال کر عمومیت کو تقریباً اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ الآخرۃ کا خیال اور اس خیال کا دباؤ دماغوں سے نکل چکا ہے یا نکل جانے کے قریب پہونچ چکا ہے" وہ خیال پکار رہے ہیں کہ کارستانی کے لحاظ سے ہم بہت اچھا کر رہے ہیں" یعنی "وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا" کے الفاظ کا جو ترجمہ ہے، آج کون ہے جس کے کان کو اس خدا بیزار (GODLES) تمدن کی خود ستائیوں سے بہرا نہیں بنا دیا گیا ہے۔

سچ پوچھئے تو "یاجوجیت وماجوجیت" کی حقیقی روح ان ہی الفاظ میں پوشیدہ ہے، اور یہ اُن کی رونمائی کا ایسا آئینہ ہے جسے دیکھ کر ہر دیکھنے والی آنکھ ان کو پہچان سکتی ہے۔

لیکن لوگوں نے چوڑے چوڑے کانوں، چھوٹے چھوٹے بالشتی قدوں کی راہ نمائی میں ان کو پہچاننا چاہا جاننے والوں نے "تمسیح" (زبردستی کی مسیحیت) اور "تمہد" (زبردستی کی مہدویت) کے بے وقت اور بے ہنگام غل غپاڑوں کو دیکھ کر جو درحقیقت اسی خدا بےزار تمدن اور انسانیت آزار تہذیب کی آندھیوں سے برپا ہوئے تھے، بلکہ تمسیح و تمہد کا دعویٰ پیداوار ہی اسی تمدن و تہذیب کی دسیسہ کاریوں کا تھا، اور اسی کا وہ "خود کاشتہ پودا" تھا، دعوی کے مدعی کا یہ خود اعترافی اقرار ہے، کہیں حق کے کلمہ سے باطل کی تعبیر میں کام نہ لیا جائے، حق کے جاننے والوں نے بھی حق پوشی ہی کو احتیاط کا تقاضا قرار دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کم از کم سب سے پہلے دنیا کی جس امت کو حق کی گواہی ادا کرتے ہوئے قرآنی بینات کی روشنی میں "حق" کا اعلان کرنا چاہئے تھا صرف یہی نہیں کہ اس نے خاموشی سے کام لیا، بلکہ اس کو سمجھنا بھی نہ چاہا جو کچھ قرآن سمجھا رہا تھا، لوگ قرآن بھی پڑھتے رہے اور خود ستائیوں کی اس قوالی میں شریک ہو کر تالیاں پیٹ پیٹ کر حال و قال بھی لاتے رہے، دن کو رات ٹھہرایا گیا تو ماہ و پروین کی شہادت دینے والے قرآن کے پڑھنے والوں اور ماننے والوں میں سے بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

---

(۴)

جو کچھ کمایا جا رہا ہے سب کھویا چلا جا رہا ہے، ہر شخص کے سامنے واقعہ اپنی اس کھلی ہوئی واضح خصوصیت کے ساتھ موجود ہے مگر اسی ناکام و نامراد بے نتیجہ قطعی لاحاصل عبث اور شدنی زندگی کے ساتھ تقریباً انسانیت مطمئن ہو چکی ہے، اس عجیب و غریب ذہنیت کا استیلاء اپنے دائرے کو روز بروز بڑھاتا ہی چلا جا رہا ہے، آدمی جانور نہیں ہے، جو نتیجے سے بے تعلق ہو کر زندگی

لہ ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کے نام مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی کا جو مطبوعہ مکتوب ہے اُس میں ملکہ کے سامنے مرزا صاحب نے "ان ہی کے خود کاشتہ پودے" کے عنوان سے اپنے آپ کو روشناس کرایا ہے۔ ۱۲

بسر کرے، پھر عقل وتمیز کے ساتھ اسی ذہنیت کا دباؤ کیوں بڑھ رہا ہے، اسی سوال کے جواب کو جہاں تک میرا خیال ہے ہم آگے کی اس آئت میں پا سکتے ہیں، فرمایا گیا ہے:۔

اولٰئک الذین کفروا بایات ربھم ولقائہ۔

یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے پالنے والے کی نشانیوں کے بھی منکر ہو گئے ہیں، اور اس کا بھی انکار کر دیا ہے کہ اپنے اسی رب سے ان کی ملاقات ہوگی۔

جس مسئلہ کی طرف مذکورۂ بالا الفاظ میں توجہ دلائی گئی ہے، اس کے سمجھنے کے لئے ایک مثال کو پیش نظر رکھئے:۔

کشتی گیری اور پہلوانی کے کمالات کا دعویٰ کرکے ایک شخص آپ کے سامنے اس طرح اپنے آپ کو پیش کرتا ہے کہ کشتی گیری اور پہلوانی کے سارے ساز وسامان سے بھی وہ لیس ہے، گر دلے ہچٹ چڑھائے، دنگل میں اُتر کر اپنے جوڑ کے پہلوان کو پچھاڑ پچھاڑ کر بھی دکھا رہا ہے، دوسری طرف پہلوانی ہی کے مدعی بن کر ایک اور صاحب آتے ہیں، لکھنؤ کے بانکوں کے لباس میں جلوہ گر ہیں، پہلوانی کی کوئی علامت اور نشانی اپنے ساتھ نہیں رکھتے ہیں، لیکن مدعی ہیں ان ہی کمالات کے جو پہلوانی کے ساتھ مختص ہیں، بتائیے کہ پہلوانی کے لحاظ سے کس کا وجود آپ کے لئے دیکھا بھالا قرار دیئے جانے کا زیادہ مستحق ہے۔

اب اسی مثال کی روشنی میں دیکھئے، کائنات جن میں حجر، شجر، نباتات، جمادات، حیوانات، انسان، چاند، سورج، تارے، الغرض گوناگوں مخلوقات میں اپنی تخلیقی کارفرمائیوں کو نمایاں کرکے خالق عالم نے اپنے آپ کو ہمارے سامنے جو ظاہر کیا ہے، ظہور حق کی اس شکل کے مقابلے میں دلوں کا یہ تقاضا کہ موجودہ کائنات اور کائناتی کمالات کے بغیر خدا ہمارے سامنے آتا، ظہور کی ان دونوں شکلوں میں کیا وہی نسبت نہیں ہے جو ان دونوں پہلوانوں میں تھی، جن میں سے ایک پہلوانی کے سارے آثار اور نشانیوں کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہے، اور دوسرا پہلوانی کے کمالات کو اپنے اندر بس بتلاتے ہوئے صرف اپنی ذات کو پیش کرکے مطالبہ کر رہا ہے کہ مجھے پہلوان مان لو۔

پھر کیسی عجیب بات ہے کہ اپنی کارفرمائیوں کے کمالات کے ساتھ حق سبحانہ وتعالیٰ ہمارے سامنے موجود ہیں، اور چاہتے تھا کہ وہی کمالات جن کا قرآنی نام آیات اللہ، یا اللہ کے پتے اور نشانیاں ہیں، ان ہی آیات اور نشانیوں کے ساتھ ہم ان کو پائیں اور مانیں، لیکن کچھ لوگ یہ حیلہ تراش کرکے کہ کمالات سے معرّا اور خالی ہو کر چونکہ خدا ہمارے سامنے نہیں آیا، اس لئے ہم اس کو نہیں مان سکتے، بتلائیے کہ یہ بجز ایک شیطانی حیلہ کے اور بھی کچھ ہے، پہلوانی کے کمالات کے ساتھ پہلوان جب آپ کے سامنے آیا تو اس کے پہلوان ہونے سے آپ نے اسلئے انکار کر دیا کہ ہم تو اسی کو پہلوان مانیں گے جو پہلوانی کے سارے آثار وعلامتوں سے پاک ہو کر ہمارے سامنے آئے۔ آج خدا بے زاری کی عام ذہنیت میں آپ ٹٹولیں گے، تو اسی غیر منطقی طفلانہ مطالبہ کے جراثیم کے سوا یقین مانیے کہ آپ کو اور کچھ نظر نہ آئے گا، اسی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ۔

"یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کے آیات اور نشانیوں کا انکار کر دیا"
یعنی کمالات رب کی ان کھلی ہوئی نشانیوں سے انھوں نے طے کر لیا ہے کہ نہ ہم خود خدا کو پائیں اور مانیں گے، اور نہ دوسروں کو پانے اور ماننے دیں گے، اور اسی بنیاد پر انھوں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ زندگی میں خالق کائنات کی ملاقات کا خیال بھی صرف خیال ہی ہے، یہی خود بھی باور کئے بیٹھے ہیں اور دوسرے بھی یہی باور کر کے پختہ ہو کر بیٹھ جائیں، اسی رجحان کے پھیلانے اور عام کرنے میں وہ سرگرم ہیں۔

الغرض خدائی آئین کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے زبردستی کا یہ غیر منطقی فلسفہ انھوں نے تراش لیا ہے اور اپنی زندگی اور زندگی کے سارے کاروبار پر سے خدا اور خدا کے عقیدے کا دباؤ خود بھی اٹھا دیا ہے اور چاہتے ہیں کہ دوسروں سے بھی یہ دباؤ جس حد تک اٹھایا جا سکتا ہو اٹھا دیا جائے، حتیٰ کہ ان کاموں میں بھی جن کو جانتے ہیں کہ خدا ان سے خوش ہوتا ہے اُن کو بھی وہ یہ سوچ کر کرتے ہیں کہ ہم خدا کے لئے انھیں نہیں کرتے، بہرحال ان کا جو قدم بھی اُٹھتا ہے، خدا کے لئے نہیں اُٹھتا، اور نہ خدا کیلئے وہ کوئی قدم اُٹھانا چاہتے ہیں[1]۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں خدا کے پاس ان کی، اور ان کے اعمال کی اگر کوئی قیمت نہ ہو، تو اس کے سوا اور منطقی نتیجہ اس قسم کی خدا بے زار زندگی کے اعمال و افعال کا اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ آپ نے کروڑہا کروڑ صرف کر دیئے ہوں، ساری دولت لٹا دی ہو، یا ایک کوڑی ہی دی ہو، ہر حال میں دیکھا جائے گا کہ یہ، یا وہ جو کچھ بھی آپ نے کیا ہے، کس لئے کیا ہے، کوڑی بھی خدا کے لئے اگر دی ہے تو چاہئے کہ خدا سے اس کوڑی کے معاوضہ کی توقع کریں، لیکن کروڑوں روپئے اگر خدا کے لئے آپ نے نہیں، بلکہ کسی اور مقصد سے دیئے ہیں، تو خدا کے پاس خود سوچئے کہ معاوضہ کی اُمید کا حق آخر کس بنیاد پر آپ کو حاصل ہوتا ہے، یا حاصل ہو سکتا ہے، اور پھر قدرتی نتیجہ اس کا جب

حبطت اعمالھم — پس برباد ہو کر رہ گئے ان کے سارے اعمال اور کاروبار

کی صورت میں آپ کے سامنے آئے تو عقل بھی اس کے سوا خود ہی بتائیے کہ اور سوچ ہی کیا سکتی ہے، اور اسی کی اطلاع قرآن نے اپنے ان الفاظ سے دی ہے، پس واقعہ وہی ہے کہ بذاتِ خود عمل کی کوئی قیمت نہیں ہے، بلکہ قیمت کے لئے ہمیشہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ

---

[1] ان سے مسحور و متاثر ہونے والوں تک کی ذہنیت جب یہ ہو چکی تھی، کہ:-

"ہم اُس دن خوش ہوں گے جب کہ ہماری قوم نہ خدا کے واسطے نہ اپنے ثواب کیلئے، بلکہ صرف اپنی قوم کیلئے کوشش کرے گی اور کہے گی کہ اپنے ہاتھ، اپنے پاؤں، اپنی جان، اپنی محنت سے اپنے روپیہ کے بدلہ نہ خدا کو خریدنا چاہتا ہوں، نہ بہشت کو" (تہذیب الاخلاق ج ۲ ص ۵۲)۔

خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ ایک ہندی مسلمان سرسید مرحوم کے یہ الفاظ ہیں، اگرچہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بھی انھوں نے جو کچھ لکھا تھا خدا ہی کیلئے نہ لکھا تھا اب اپنے خدا کے پاس وہ جا چکے کل (امروز) مانوسی کا نتیجہ ان کے سامنے آ چکا ہوگا۔ غفراللہ لہ۔ ۱۲

کس لئے وہ عمل کیا گیا، مشہور ہی ہے کہ تربیت و تادیب کے لئے یتیم کو تھپیڑ ہی کیوں نہ مارا جائے، تو یہ کام تو ثواب کا ہے، اور مارنے والا یتیم کے خیر خواہوں میں گنا جائے گا، لیکن اسی یتیم کو آوارہ بنانے کیلئے کوئی کھلاتا پلاتا اور پہناتا ہی کیوں نہ ہو، وہ بدترین جرم کا مرتکب ہے، فحبطت اعمالھم کے بعد جو یہ ارشاد ہوا ہے، کہ:۔

پس نہ ٹھہرائیں گے ہم قیامت کے دن اُن لوگوں کا کوئی وزن فلا نقیم لھم یوم القیٰمۃ وزنا

ایک مطلب تو اس کا وہی ہے کہ خدا کے سامنے حاضر ہو جانے کے بعد ایسی ساری زندگیاں بے قیمت اور بے وزن ہو کر رہ جائینگی، جن میں خدائی نصب العین شریک نہ تھا، اور جی چاہے تو آپ موجودہ تحقیق کے رو سے "وزن" کی حقیقت کا پتہ چلائیں، دنیا میں بھاری یا ہلکی چیزیں کیوں ہو جاتی ہیں؟ اور پھر سوچئے کہ مرکزی وجود کے احاطہ سے باہر نکل کر وزنی سے وزنی چیزوں کا وزن کیا باقی رہتا ہے، یا رہ سکتا ہے[1]۔

اب آگے بڑھئے، آیت کے پیش ہونے سے پہلے اتنی بات سُن لیجئے:۔

واقعہ یہ ہے کہ صحیفۂ قدرت کے نوشتہ کمالات جن کا مشاہدہ ہم میں ہر ایک کر رہا ہے، ان کمالات کو کمالات والی ذات کے آیات یا عنوان اور پتوں کی حیثیت سے استعمال کرنے کا نقطۂ نظر جس کے سامنے سے ہٹ جائے یا قصداً ہٹا دیا جائے، ظاہر ہے کہ اس کے دل میں نہ اس ذات، قدسی سمات، کی جستجو اور تلاش کا جذبہ ہی زندہ رہ سکتا ہے، اور نہ اس کے منشا اور مرضی سے آگاہی کی تڑپ ہی اس میں باقی رہ سکتی ہے، کہ ان ساری بے چینیوں کے نتیجے پیچ پوچھئے تو کارفرما۔ ع

بہر نقشے کہ پیش آید در و نقاش می بینم

کا وہی آیاتی نقطۂ نظر ہے جس میں کمالات سے بھری ہوئی کائنات سے کمالات والی ذات کو پانے والے پا رہے ہیں، اور پا پا کر چلا رہے ہیں:۔ ع

نہ بیند چشم بدبیناں اگر من فاش می بینم

بہرحال اسی لاہوتی وجدان کے قدوسی احساس اور جستجو کی یافت سے جو محروم ہیں، یا محروم کر دیئے گئے ہیں، ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے جو یہ فرمایا گیا ہے، کہ:۔

وہ ہے ان کا بدلہ جہنم، بدلہ ہے اس بات کا کہ وہ کفر کے مرتکب ہوئے ذٰلک جزاءھم جھنم بما کفروا،

---

[1] بولنے میں عموماً لوگ بولتے ہیں کہ نیکی کا پلہ جس کے بھاری ہوگا وہ نجات یاب ہوگا، اور بدی کا پلہ جس کے کا جھک جائے گا وہ پکڑا جائے گا، لیکن قرآن میں التزاماً اس راز کا انکشاف کیا گیا ہے کہ وزن صرف اُن اعمال و افعال ہی میں پیدا ہوگا جو خالقِ عالم کی مرضی کے مطابق ہوں گے، اور مرضیِ حق کے مخالف اعمال بے وزن ہو جائیں گے فمن ثقلت موازینہ کے مقابلے میں فمن خفت موازینہ کے الفاظ آپ کو قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر ملیں گے۔ ۱۲

اور بنا لیا میری آیتوں اور میرے رسولوں (یعنی ان آیتوں کے پہونچانے والوں) کو ہنسی مذاق ۔ واتخذوا ایاتی ورسلی ھزوا

غور کرنا چاہئے کہ اس کے سوا ان کا انجام اور کیا ہوتا، یا کیا ہوسکتا تھا، بادشاہی کے سارے ساز و سامان تاج و تخت تیغ و نگیں، اورنگ و دیہیم، خدم و حشم کے ساتھ بادشاہ ہمارے سامنے جلوہ افروز ہے، لیکن یہ حیلہ تراش کرکے کہ شاہی ساز و سامان سے خالی ہوکر بادشاہ کی ذات چونکہ ہمارے سامنے نہیں آئی، اسلئے بادشاہ کے احکام و فرامین اور ان احکام و فرامین کے لانے والوں کا ہم انکار کرتے ہیں، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اسی حیلہ، صرف اسی حیلہ کی آڑ لے کر بغاوت کی راہ اختیار کرنے والے اگر شاہی دار و گیر کی مصیبتوں میں اپنے آپ کو مبتلا پائیں، تو اس کے سوا آخر اُن کو کس بات کی توقع کرنی چاہئے ۔

میں تو یہ سوچ کر حیران ہوجاتا ہوں کہ ایسا خوشنویس جب ہمارے سامنے آیا جو از سرتا پا ان اوراق اور وصلیوں میں لپٹا ہوا تھا جو اس کی خطاطی کے کمالات سے معمور اور رچے ہوئے تھے تو اس وقت اس سے زیادہ احمقانہ کہئے یا پاجیانہ مغالطہ اور کیا ہوسکتا ہے، اگر کہا جائے کہ ہمارے سامنے خوش نویس نہیں، بلکہ خوش نویس کی تو صرف خوش نویسی آئی ۔

بہرحال اپنے اس کرتوت کا قدرتی خمیازہ تو خود ان مغالطہ بازوں کے سامنے آئے گا، آکر رہے گا، اسی لئے اُن کے اس جہنمی انجام کو ان ہی کے حوالہ کرکے ہم جب اسی فقرے کے آخری جزء یعنی :۔

اور بنا لیا میری آیتوں اور میرے رسولوں کو ہنسی مذاق واتخذوا ایاتی ورسلی ھزوا

پر غور کرتے ہیں تو پھر ایک جدید علامت، اور نئی نشانی ہمارے سامنے آجاتی ہے، جس سے اس خاص گروہ کی شناخت میں ہمیں کافی مدد ملتی ہے ۔

مقصد یہ ہے کہ آیات کے لفظ کا ایک مطلب تو آپ کے سامنے گذر چکا، یعنی صحیفۂ قدرت، اور اوراق عالم پر اپنی کارفرمائیوں کے کمالات کو ظاہر کرکے حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی ذات قدسی سمات کا عنوان اور پتہ کائنات اور کائناتی آثار کو جو بنا دیا ہے آیات کے لفظ کا ایک قرآنی اطلاق تو یہ ہے، اسی کے ساتھ آیات ہی کے اسی لفظ کا اطلاق حق تعالیٰ ہی کے ان کلامی مظاہر پر بھی ہوتا ہے، جن کے لباس میں اپنی مرضی، اور اپنے منشاء کو خداوند قدوس جل مجدہٗ نے ظاہر فرمایا ہے، میں تو یہ دونوں اصطلاحیں اور محاورے قرآن ہی کے، لیکن اصل واقعہ وہی ہے کہ قدرتی صحیفہ، اور قرآنی صحیفہ دونوں ہی کے آیات، آیات ہی ہیں ۔

عرض کرچکا ہوں کہ صحیفۂ قدرت کے آیات کو آیات کی حیثیت سے استعمال کرنے کا نقطۂ نظر جنکے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اُن کے دل میں لقاء رب کی آرزو بھی بجھ کر رہ جاتی ہے، اور اسی کا لازمی نتیجہ ہے کہ اپنے پالنے والے رب قیوم کی مرضی و منشاء کی تلاش و جستجو کا جذبہ بھی ان سے چھین لیا جاتا ہے، جس کے بعد اُن کی نگاہوں میں نہ ان بزرگوں ہی کی کوئی قدر و قیمت باقی رہتی ہے جن کا انتخاب اپنے مرضیات سے آگاہ کرنے کے لئے قدرت کرتی رہی ہے، الرسل والانبیاء کے عنوانوں اور ناموں سے ہم جنھیں پہچانتے ہیں، (صلوات اللہ علیہم وسلامہ) اسی کے ساتھ اس پیغام اور کلام کی بھی اہمیت اُنکے دلوں سے نکل جاتی ہے

اور نکال دی جاتی ہے، جس کا مخاطب اپنے بندوں کو حضرات انبیاء و رسل (علیہم السلام) کے توسط سے ان کا پیدا کرنے والا خالق بنا تا ہے، ذہنی انحطاط، اور فکری پستی کی یہی ملعون نفسیاتی کیفیت، تیرہ درونی، اور شوریختی کے اس گستاخانہ منزل تک پہنچا دیتی ہے جس میں حکمت و دانائی، اور شرافت و کبریائی کا سب سے بڑا ابلیسی سرمایہ اللہ کی آیتوں کا استہزاء، اور ان آیتوں کے پہونچانے والے رسُولوں کا صرف ٹھٹھا اور تمسخر رہ جاتا ہے۔

کائنات کو اس کے پیدا کرنے والے خالق قیوم کی آیات اور نشانیوں کی حیثیت سے استعمال کرنے کے نقطۂ نظر سے محرومی کا یہی آخری انجام، اور انتہائی بلکہ شائد لازمی نتیجہ ہے، ایسا لازمی نتیجہ کہ مرنے سے پہلے اسی زندگی میں پھوٹ پھوٹ کر اسکی گندگی اور عفونت ان سے بہ نکلتی ہے، ہر گلی کوچے میں اسی کی بدبو سے وہ پہچانے جاتے ہیں، بلکہ اسی کی بھبک اور بھپارے سے اپنی شناخت وہ خود ہی کراتے پھرتے ہیں، یہی استہزاء ان کی منطق، اور یہی تمسخر ان کا فلسفہ بن جاتا ہے۔ ان کی تقریروں، تحریروں، رسالوں، اور اخباروں، قصوں اور کہانیوں حتیٰ کہ تھیٹروں اور سنیماؤں تک کا لازمی جزء دینی استہزاء کا یہی سٹڈاس بنا ہوا ہے اور یہی ان کی آخری علامت، اور امتیازی خصوصیت ہے، جس پر ان کے متعلقہ قرآنی اشارے ختم ہو جاتے ہیں۔

چاہئے کہ قرآن کے بتائے ہوئے ان ہی نشانات اور علامتوں سے ہم اُن لوگوں کو پہچانیں جن کو "یاجوج و ماجوج" یا قریب قریب کچھ اسی قسم کے ملتے جلتے ناموں سے موسوم کر کرکے مذاہب و ادیان میں چوکنا اور ہوشیار رہنے کا مطالبہ کیا گیا ہے، اور ذات سے زیادہ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ان لوگوں کے خاص امتیازی صفات ہی کو زیادہ اہمیت دینی چاہئے جنھیں دین کے بڑے فتنوں میں غیر معمولی بڑا فتنہ رسالات و نبوات کے وثائق میں قرار دیا گیا ہے، کم از کم قرآن کو خدا کی کتاب ماننے والی اُمت کیلئے تو حجت تمام ہو چکی ہے، قرآن کے مذکورۂ بالا بینات و تصریحات میں جو کچھ پایا جا رہا ہے اس کو پالینے کے بعد کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انسانی توانائیوں کی قدر و قیمت، ان فکری آندھیوں، اور ذہنی جھکڑوں کے گرد و غبار میں مجھ سے اوجھل ہو کر رہ گئی، جنھیں "یاجوجیت و ماجوجیت" کے فتنے نے اٹھایا تھا، یقیناً اس عذر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رکھی گئی ہے۔

بظاہر اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، قرآن اور قرآن کے لانے والے رسُول علیہ السلام پر ایمان لانے والوں، اور اسی ایمان کے مطابق اپنی عملی زندگی کے سنوارنے والوں کو یہ بشارت آخر میں سنائی گئی ہے، کہ :۔

قطعاً جن لوگوں نے مان لیا اور صالحات و سُلجھے ہوئے کام	ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات کانت
کئے ہوں گے اُن کے لئے فردوس کے باغات مہمان نوازی کیلئے	لھم جنّٰت الفردوس نزلا خالدین
ہمیشہ رہیں گے اُن ہی باغوں میں۔	فیھا۔

اگرچہ یہ بشارت، ایمان و عمل صالح والوں کے لئے قرآن کی عام بشارت ہے، قدم قدم پر اس کو دہرایا گیا ہے، یعنی چند روزہ خاکی زندگی کو کائنات کی مرکزی قوت، اور محوری وجود کے مطابق رکھنے کی کوشش، ہر کوشش کرنے والے کو اس ماحول تک پہونچا دیتی ہے جس میں اپنی ہر خواہش اور دل کے ہر تقاضے، ہر احساس کا ہم آہنگ عالم کی اسی مرکزی قوت اور محوری وجود کو

پایا جائے گا، وفاقی نتیجہ کی اسی زندگی کا نام فردوسی زندگی ہے، لیکن اس عام بشارت میں خاص اس موقع پر ایک خاص اضافہ کو بھی ہم پاتے ہیں۔ یہ

نہ چاہیں گے ان ہی باغوں سے منتقل ہونا — لا یبغون عنھا حولا۔

کا اضافہ ہے، میں اسی اضافہ کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں:۔

جیسا کہ معلوم ہے، وفاقی نتیجہ والی اس زندگی کے متعلق اس قسم کے خیالات کہ اس زندگی کے پانے والے انسان، انسان باقی نہ رہیں گے، بلکہ فرشتہ یا اس سے بھی بڑھ کر العیاذ باللہ بجائے مخلوق کے خالق کی ذات میں محو اور گم ہو کر ان میں ہر ایک خالق ہی بن جائے گا، اسی طرح مجازاۃ کی سزائی شکل میں باور کرایا جا رہا ہے کہ آدمی بجائے آدمی بننے کے گھوڑا، ہاتھی، بیل، چوپا وغیرہ بن جاتا ہے قرآن نے ان مالی خولیائی افکار اور خود تراشیدہ اوہام کے لئے اپنے اندر کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے، صاف صاف کھلے کھلے لفظوں میں ہر جگہ اسی حقیقت کا مسلسل اعلان اور اعادہ اس کتاب میں کیا گیا ہے، کہ جزائی اور سزائی، مکافات و مجازات کی دونوں حالتوں میں انسان، بہرحال انسان، اور اپنے سارے انسانی جذبات اور خصوصیات کے ساتھ نتیجہ کی آنے والی زندگی میں بھی باقی رہے گا۔

ایسی صورت میں انسانی فطرت کی اسی خصوصیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ لذیذ سی لذیذ شے کا مسلسل بار بار استعمال آدمی میں ملال یعنی اکتا جانے کی کیفیت کو پیدا کر دیتا ہے، بلند سے بلند ترین پیمانے پر راحت و آرام عیش و سکون ہی کا نظم کیوں نہ کر دیا جائے، لیکن ایک ہی حال کے دوام و استمرار سے راحت و آرام کی ایسی زندگی بھی آدمی کے لئے اجیرن ہی بنجاتی ہے، عموماً بورڈنگوں، اور اقامت خانوں کا کھانا طلبہ پر اسی لئے ناگوار اور دوبھر بن کر رہ جاتا ہے کہ چند گنے چنے خاص کھانے کے تسلسل سے دل اکتا جاتے ہیں، آدمی کی فطرت کا یہی جبلی قانون اور تقاضا ہے۔ وسوسہ یہی ہوتا ہے کہ خلود و دوام کے ساتھ آدمی کی فردوسی زندگی کی لذت و سرور کا تسلسل کیسے باقی رہ سکتا ہے، بظاہر یہاں نئی آگاہی

نہیں چاہیں گے ان باغوں سے منتقل ہونا — لا یبغون عنھا حولا

کے الفاظ سے جو بخشی گئی ہے، اس سے اسی وسوسہ کا ازالہ شاید مقصود ہے، اور اس کے بعد کی آیت یعنی:

کہدو! اگر ہو جائے سمندر روشنائی میرے رب کے کلمات کے (لکھنے)	قل لو کان البحر مدادا لکلمات ربی
کے لئے، تو ختم ہو جائے گا سمندر کا پانی قبل اس کے کہ ختم ہوں میرے	لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی
رب کے کلمات، اگرچہ لاتے ہی چلے جائیں اسی قسم کے سمندر (کے پانی)	ولو جئنا بمثلہ مددا۔
کو مدد کے لئے۔	(کہف)

لہ اس مسئلہ کی تحقیق کیلئے خاکسار کی کتاب "الدین القیم" کا مطالعہ کیا جائے جسے کئی سال ہوئے کتب خانہ "الفرقان" نے شائع کیا تھا۔ ۱۲

اس آیت کا دہلا اولی یا سرسری نظر میں اپنے ماسبق سے بظاہر تعلق محسوس نہیں ہوتا، لیکن اگر فکر معقول سے کام لیا جائے تو وہی وسوسہ یعنی فردوسی زندگی میں استمرار و دوام کی وجہ سے اکتا۔ اور گھبرا جانے کا خطرہ فطرتِ انسانی کے عام اقتضاء کے مطابق دلوں میں جو پیدا ہوتا ہے، اسی خطرے سے محفوظ ہونے کی ضمانت ان آیتوں میں ہم پاسکتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانی احساسات لذت وسرور کو جنت کی زندگی میں جن چیزوں سے حاصل کریں گے اُن کے متعلق یہ مفروضہ ہی صحیح نہیں ہے کہ ایک دفعہ جو کچھ دیا جائے گا، وہی ہمیشہ ملتا رہے گا۔ سورۂ بقرہ کی مشہور آئت ہے:

جب کبھی کوئی پھل جنت والوں کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے	کلما رزقوا منھا من ثمرۃ رزقا قالوا
یہ تو وہی ہے جو دیا گیا تھا ہمیں پہلے (حالانکہ یہ واقعہ نہ ہوگا بلکہ)	ھٰذا الذی رزقنا من قبل واتوا بہ
بخشی جائیں گی اُن کو ملتی جلتی چیزیں۔	متشابھا۔

اس میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب کبھی جس چیز کے متعلق یہ خیال پیدا ہوگا کہ وہی بجنسہ مکرر دی گئی ہے تو فوراً اس خیال کا ازالہ تجربہ سے ہو جائے گا، کہ صرف صورت میں مشابہت تھی، لیکن معنوی حیثیت سے کبھی جنت کی کوئی چیز دہرائی نہ جائے گی، جہاں کا یہ کلی قانون ہو، جو کلما کے لفظ کا اقتضاء ہے، وہاں تکرار و اعادہ کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے، حضرت ابن عباسؓ نے ایک دن سمجھاتے ہوئے فرمایا تھا:۔

نہیں ہے دنیا میں بہشت کی چیزوں سے لیکن صرف نام	لیس فی الدنیا مما فی الجنۃ شیء الا الاسماء
	(درمنثور وغیرہ)

گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ جنت میں جو سیب مثلاً ملے گا، ہوگا تو وہ بھی سیب ہی، لیکن ہر لحاظ سے جنت والا سیب دنیا والے سیب سے اتنا مختلف ہوگا کہ دونوں میں کہنا چاہئے صرف لفظ اور نام ہی کا اشتراک ہوگا، پھر فردوسی زندگی والے سیب کی ہر جہتی نوعیت کیا ہوگی۔ اسی کی طرف

نہ دیکھا کسی آنکھ نے، نہ سنا کسی کان نے، اور نہ خیال گذرا	ما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا
اس کا کسی دل میں۔	خطر علی قلب بشر

والی مشہور حدیث میں ایما کیا گیا ہے، سچ پوچھئے تو قرآنی آئت

پھر نہیں جانتا ہے کوئی جو آنکھوں کی خنکی اُن کے لئے	فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین
چھپا کر رکھی گئی ہے۔	(حم سجدہ)

کی یہ حدیث تفسیری توضیح ہے۔ اور یہ سب درحقیقت قرآن ہی کی آئت

جنھوں نے اچھے کام کئے اُن کے لئے اچھا معاوضہ ہے	للذین احسنوا الحسنی وزیادہ
اور "زیادہ"	(یونس)

کے اجمال کی تفصیل ہے، اس آیت کریمہ میں "زیادہ" کے جس لفظ کو پا رہے ہیں صحیح روایات و آثار میں اس کا جو مطلب بیان کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ فردوسی زندگی میں براہِ راست حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ کی ذات مبارک سے انسانی فطرت کا رشتہ قائم کر دیا جائے گا[1] وہی ذات مبارک جس کے اسماء و صفات، کمالات و شیونات کی نہ حد ہے اور نہ انتہا، پھر ان لامحدود کمالات کی باہمی ترکیب کے مظاہر جن کے مدارج کا کیفاً و کمّاً نہ اور ہے نہ چھور، اپنے ان ہی بے تھاہ معلومات کو کلمۂ "کن" سے حق تعالیٰ شہودی وجود عطا کرتے ہیں، معلومات کی لامحدودیت سے کُن کا یہی "کلمہ" لامحدود کلمات بنا ہوا ہے اور ان کی اسی لامحدودیت کی تعبیر جیسا کہ اربابِ تحقیق نے لکھا ہے، مذکورۂ بالا آئت میں اس طریقے سے کی گئی ہو کہ سمندر میں سمندر ہی کا اضافہ کیوں نہ کیا جائے، لیکن ربّ کے ان لامحدود کلمات کو لکھنے کے لئے وہ کافی نہیں ہو سکتے، وجہ ظاہر ہے کہ محدود لامحدود کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مسیح علیہ السلام کو قرآن میں کلمۃ اللہ جو فرمایا گیا ہے، تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ کلمۂ کُن سے براہِ راست اُن کی تخلیق ہوئی، بہشتی حقائق بھی چونکہ براہِ راست کلمۂ کُن سے پیدا ہوتے رہیں گے، اسی لئے وہ بھی کلمات ہی کے نام سے موسوم ہوئے، بہرحال اب سوچئے اس بات کو کہ براہِ راست جب اسی ذات بابرکات سے انسانی فطرت کا تعلق قائم ہو جائے گا جس کے کلمات کی حد و انتہا نہیں ہے، تو کسی خاص نقطہ تک پہونچ کر انجماد اور ٹھہراؤ کے خطرے کی گنجائش ہی کیا پیدا ہوتی ہے، ایک طرف ہماری فطرت کے طلب اور تشنگی کی وہ لامحدودیت ہو گی، جو کسی نوبت پر پہونچ کر بس کرنے پر راضی نہیں، آخرت ہی میں نہیں، دنیا کی اس زندگی میں بھی خوب سے خوب تر کی جستجو یہی ہماری جبلّت اور فطرت کا قدرتی تقاضا ہے، پیدا کرنے والے نے طلب و تلاش کی اسی لامحدودیت کے ساتھ ہمیں پیدا کیا ہے[2]، اور اس کے مقابلے میں لامحدود کمالات و صفات والی اپنی ذات ہی کو ہمارا فطری مطلوب بنا دیا ہے، اور یہی میرا مطلب تھا کہ مذکورۂ بالا آئت بظاہر اپنے ماسبق کی آئت سے غیر مربوط ہی کیوں نہ نظر آتی ہو، لیکن قرآن کا تتبع بتاتا ہے کہ سب سے زیادہ ربط اسی مقام میں ہوتا ہے، جہاں وہلۂ اولیٰ میں سرسری نظر والوں کو بے ربطی محسوس ہوتی ہو۔

---

[1] صحیح مسلم اور ترمذی وغیرہ کی مشہور روائت ہے کہ سب کچھ پالینے کے بعد اہلِ جنت کے لئے کشف الحجاب (یعنی پردہ اٹھا دیا جائے گا) اور حجاب کے بغیر بندے اور خدا میں رشتہ قائم ہو جائے گا۔ لفظ "زیادہ" کی تفسیر کتابوں میں پڑھئے۔ ۱۲

[2] ان الانسان خلق ھلوعا (بیشک پیدا کیا گیا ہے آدمی ھلوع) اس قرآنی آئت میں ھلوع کے لفظ کا مطلب یہی ہے، کہ ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بخاری و مسلم میں ہے کہ جہنم میں سزا پانے کے بعد ایک شخص گرتا پڑتا جہنم سے باہر نکلے گا، کچھ دیر اسی حال میں پڑا شکر کرے گا، مگر پھر آگے بڑھے گا، بڑھتے بڑھتے بالآخر جنت میں داخل ہو جائے گا، اربابِ تحقیق کے نزدیک فطرتِ انسانی کی بے صبری اور لامحدودیت کی یہ تفہیمی تمثیل ہے۔ ۱۲

خلاصہ یہ ہے کہ فردوسی زندگی میں جب تجدد اور نو بہ نو، تازہ بہ تازہ ہی کے قانون کو استمرار بخشا جائے گا ـــــ تو لا یبغون عنہا حولا (نہ چاہیں گے جنتی اس سے منتقل ہونا) کے سوا اور سوچا ہی کیا جا سکتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ فردوسی زندگی کی جب یہ نُزُل یعنی مہمان نوازی ہوگی تو جنت کے مستقل باشندے (DOMI CIL) ہو جانے کے بعد آگے کیا کچھ پیش آئے گا۔ صدق مولٰنا الکریم رضوان من اللہ اکبر۔

مرحوم ڈاکٹر اقبال کے ایک شعر کا خیال آتا ہے، نہیں کہہ سکتا کہ صحیح طور پر مجھے یاد بھی پڑ رہا ہے یا نہیں، تاہم اسی نہ ختم ہونے والے تجدّدِ دوام، اور تلذذ غیر مختتم و تام کی بڑی اچھی یہ تعبیر غالباً ان ہی کے الفاظ میں یہ محفوظ رہ گئی ہے۔

تپش ست زندگانی، تپش ست جاودانی

دل من مسافر من کہ خدائیش یار بادا

اسی حقیقت کی طرف مرحوم نے اپنے مشہور شعر یزداں بکمند آور الخ میں اشارہ کیا ہے۔

اور اب سمجھا جا سکتا ہے کہ اپنی سعی اور اپنی ساری توانائیوں کو ہر طرف سے پھیر کر اسی حیات دنیا اور پست زندگی میں جو ملیامیٹ کر رہے ہیں، وہ خود اپنے اوپر اور اپنے ساتھ انسانیت پر بھی کتنا بڑا ظلم توڑ رہے ہیں، ہا! مولٰنا روم کی چیخ پکار۔ ؎

منگر بہر گدائے کہ تو خاص ازاں پاکی

مفروش خویش ارزاں کہ تو بس گراں بہائی

تو ہنوز ناپدیدی کہ جمال خود ندیدی

سحرے چو آفتابے، ز درون خود برآئی

آج انسانیت کے امکانات کی دنیا مدفن اور مقبرہ بنتی چلی جا رہی ہے، لیکن سمجھنے والے سمجھ رہے ہیں کہ ان امکانات کے ظہور کا زمانہ یہی ہے جس سے ہم گذر رہے ہیں، جو مر رہے ہیں سمجھا جا رہا ہے کہ وہی جی رہے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ ابھی کُل تو نہیں، لیکن دجّالی استدراجات کی کچھ قسطیں پچھلی چند صدیوں میں اچانک ہمارے سامنے ضرور بے نقاب ہوئی ہیں، لیکن ان سے بھی کیا ثابت ہوتا ہے؟ تجربہ اور مشاہدہ بتا رہا ہے کہ تشفی اور سکون کی کیفیت سے انسانی فطرت کے طلب و تلاش کا لامحدود جذبہ اب بھی اسی طرح محروم ہے جیسے پہلے تھا۔ "ہماں ست کہ بود" کے سوا نہ اب تک کچھ دیکھا گیا ہے اور نہ آئندہ دیکھا جائے گا، بادشاہوں کو بھی جو سہولتیں زمین کے اس کرّے میں میسر نہ تھیں آج ہر ادنیٰ گنوار دیہاتی ان سے ضرور مستفید ہو رہا ہے، لیکن اجتماعی طور پر دیکھئے یا انفرادی حیثیت سے ہم میں سے ہر ایک اپنے دل کا جائزہ لے، اور سوچے کہ ہمارے اندر جو "خلاء" تھا، اس میں کسی قسم کی کوئی کمی ہوئی ہے، یقین کیجئے کہ اپنی ساری صلاحیتوں کو باہر نکال کر بھی موجودہ دنیا ہماری فطرتِ طلب کی وسعتوں میں اگر ڈال دی جائے، تو یہ سب کچھ بھی

اس میں اسی طرح گم ہو کر رہ جائے گا جیسے کسی صحرائے لق و دق میں رائی کا دانہ، آپ بجائے گوشت کے شیروں کے پیٹ کو نہ گھاس سے بھر ہی سکتے ہیں، اور نہ گھاس کی خوراک پر غریب شیر کو قانع بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، ہائے! آج وہ انسان مٹی پھانک رہا ہے، اور یہی اس کو پھنکوائی جا رہی ہے، جس کے متعلق کہنے والے نے کبھی کہا تھا، کہ ؎

پنجہ با پنجہ خدائے زدہ

ہر چہ او نیست پشت پائے زدہ

جو گرایا گیا ہے، اسی کو باور کرایا جا رہا ہے کہ وہ چڑھ رہا ہے، اور اسے چڑھایا جا رہا ہے۔

---

(۶)

آخری آئت جس پر سورۂ کہف ختم ہو جاتی ہے، وہ یہ ہے ارشاد ہوا ہے:۔

کہہ دو کہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ میں بھی آدمی تم ہی جیسا ہوں	قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ انما
مجھ پر یہ وحی نازل ہوتی ہے کہ تم لوگوں کا الہ (معبود) ایک ہے	الٰھکم الٰہ واحد فمن کان یرجو
پھر جو اُمید دار ہو اپنے رب کی ملاقات کا، تو اُسے چاہیئے کہ	لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحا ولا یشرک
کرے بھلے اور سلجھے ہوئے کام، اور ساجھی نہ بنائے اپنے رب	بعبادۃ ربہ احدا۔
کی عبادت میں کسی کو۔	(کہف)

جو کچھ اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے، بظاہر اس آیت کا بھی اس سے چنداں تعلق نظر نہیں آتا، لیکن غور کیجئے اپنے پیدا کرنیوالے کی آئینی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے بجائے مشرکانہ کاروبار کے اکسپرٹوں، اور لیڈروں کی ولائت اور پشت پناہی کا نظریہ جو تراشا گیا تھا، اور قرآن نے اس پر جو تنقید کی تھی، اس تنقید کو پیش نظر رکھتے ہوئے قدرتاً کیا یہ سوال نہیں پیدا ہوتا؟ یا نہیں ہو سکتا ہے، کہ دون اللہ (اللہ کے سوا) کسی دوسرے کو اولیاء بنانا، اور ان ہی کی پشت پناہی ڈھونڈھنی اگر جرم ہے، تو اسی جرم کے مجرم وہ بھی تو ہیں جو رسُولوں، اور پیغمبروں کو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ اور ایلچی مانتے ہیں، اور انکی ولائت اور پشت پناہی سے امداد حاصل کرتے ہیں۔ خود قرآن میں فرمایا گیا ہے، کہ:۔

تمہارا ولی (پشت پناہ) اللہ اور اللہ کے رسُول ہیں۔ انما ولیکم اللہ و رسُولہ (مائدہ)

یقیناً یہ ایک شبہ ہے، اور چاہیئے تھا کہ جو واقعہ ہے اس کو واشگاف کر دیا جائے، حقیقت یہ ہے کہ بندوں اور اُن کے خالق میں واسطہ کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے جس کی واقعیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، ہر ایک دیکھ رہا ہے کہ روشنی میں آفتاب کو، دودھ میں مثلاً گائے کو، بھینس کو، واسطہ بنایا گیا ہے، اسلئے بندوں اور خدا میں واسطہ نہیں ہے، اس کا دعوےٰ تو چشم دید بدیہی واقعہ کا انکار ہوگا، لیکن سوال اس واسطہ کے استعمال میں ہے، مشرکانہ کاروبار والوں کے طریقۂ عمل کی

جو خصوصیت ہے اس کی تفصیل گذر چکی یعنی خدائی ذمہ داریوں سے بھاگنے کی راہ انھوں نے یہ نکالی کہ ضرورتوں اور حاجتوں کیلئے وہ ان ہی درمیانی وسائط کو آگے بڑھا دیتے ہیں، اور خود ان ہی درمیانی واسطوں کو کچھ لے دے کر ان ہی کی اپنے خیال کے مطابق منت وسماجت کر کے فرض کر لیتے ہیں کہ ان کا کام نکل جائے گا۔

اور ان کے مقابلے میں ان ہی ذمہ داریوں سے گریز کی دوسری راہ یہ ہے کہ انسانوں ہی کو زندگی کے مختلف شعبوں میں ماہر اور حاذق بنا کر اپنی ساری ضرورتوں میں خدا سے قطعاً بے تعلق رہتے ہوئے ان ہی اکسپرٹوں اور لیڈروں کی ولائت پر بھروسہ کر لیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ دونوں صورتیں اپنے پیدا کرنے والے سے باغیانہ انحراف، اور اپنے وجود کے نصب العین کی تکمیل سے گریز ہے، اسلئے درمیانی وسائط کی ولائت کی ان شکلوں کو قرآن نے مسترد کر دیا ہے، اور ولائت کا وہ طریقہ جس میں اپنے خالق اور اُس کی مرضی کے پانے کی ضمانت پوشیدہ ہے، اور اپنی پیدائش کے قدرتی نصب العین تک جس ذریعہ سے آدمی پہونچ جاتا ہے، ولائت کا یہ طریقہ تو موجودہ ہبوطی زندگی کی ایک ایسی ناگزیر ضرورت ہے جس سے الگ ہو کر کامیابی تک انسانی زندگی پہونچ ہی نہیں سکتی، زمین کی طرف رخصت کرتے ہوئے انسانِ اول یعنی ہمارے پدر اوّل کو اسی لئے یہ وصیت کی گئی تھی :-

پھر آتے رہیں گے میری طرف سے تمہارے پاس راہ بتانے والے
ان راہ بتانے والوں کے پیچھے پیچھے جو چلیں گے، نہ اُن کو ڈر ہے
اور نہ وہ کبھی کڑھیں گے۔

فاما یأتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای
فلاخوف علیھم ولا ھم یحزنون۔
(البقرۃ)

بہرحال اسی حقیقت کا اظہار جہاں تک میرا خیال ہے سُورۂ کہف کی اس آخری آئت میں بھی کیا گیا ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ صاف صاف کھلے کھلے لفظوں میں کہدیجئے کہ میں بھی تم ہی جیسا ایک آدمی ہوں، جیسے تم ہو، قدرت نے صرف اپنے اس منشاء کے اظہار اور ترجمانی کے لئے میرا انتخاب فرمایا ہے، جس کی جوہری رُوح اور مرکزی عنصر یہ ہے کہ خالق کائنات ہی کو ساری انسانیت کا اِلٰہ اور ہر چھوٹی بڑی، دینی و دنیوی ضرورت کا مرجع و ماوٰی بنایا جائے، اور وہی سب کا آخری ٹھکانہ بن جائے، یہ تو

اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تمہارا اِلٰہ (معبود) ایک ہے۔ انما الھکم الٰہ واحد

کا مطلب اور خلاصہ ہوا، لیکن آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہے، کہ :-

پھر جو اُمیدوار ہو اپنے پالنے والے کی ملاقات کا، تو اُسے
چاہئے کہ کرے بھلے (اور سلجھے ہوئے) کام، اور ساجھی نہ بنائے
اپنے رب کی عبادت میں کسی کو۔

فمن کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملاً
صالحاً ولا یشرك بعبادۃ ربہ احداً
(   )

جہاں تک میرا خیال ہے خالقِ کائنات کو صحیح معنوں میں اپنا تنہا معبود اور واحد الٰہ بنانے کے عملی طریقہ کی طرف ان الفاظ سے

جو توجہ دلائی گئی ہے اس کا حاصل بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ذاتِ حق کے ساتھ براہِ راست رشتہ پیدا کرنے کی جن کے دلوں میں اُمنگ اور آرزو ہو، اُن کو اپنی دینی زندگی میں اس ترتیب کی پابندی پر اصرار کرنا چاہئے، کہ ان کی زندگی عمل صالح کی زندگی بن جائے، اگرچہ عمل صالح عام لفظ ہے، لیکن آگے خالق کی عبادت اور خالق کے ساتھ بندوں کو جو تعلق رکھنا چاہئے، اس کا ذکر چونکہ کیا گیا ہے، اسلئے مقابلۃً یہی سمجھنا چاہئے کہ مخلوقات کے ساتھ تعلقات کو سلجھاتے ہوئے خالق کی عبادت میں سرگرمی ہی صحیح نتیجے تک آدمی کو پہونچائے گی۔

گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ خالق کی عبادت (نماز و روزہ) وغیرہ میں جو چوکس نظر آتے ہیں، لیکن اسی کیساتھ مخلوقات کے تعلقات میں لاپرواہیوں سے کام لیتے ہیں، یا اسی کے برعکس مخلوقات یا حقوق العباد کو اہم قرار دیتے ہوئے خالق کیساتھ صحیح تعلق قائم کرنے کے ذوق سے جو محروم ہیں، یہ دونوں ہی طبقے انسانی سلوک کی صحیح فطری راہ سے ہٹے ہوئے ہیں، ٹھیک، سیدھے راستے پر وہی چل رہے ہیں، جن کی نگاہوں میں دونوں ہی کی اہمیت ہے۔

اسی کے ساتھ اگر اس نکتے پر بھی نظر رکھی جائے کہ عمل صالح کا ذکر عبادت رب سے پہلے کیا گیا ہے تو بظاہر اس سے یہ اشارہ بھی مل سکتا ہے کہ بین المخلوقاتی تعلقات کو الجھا کر خالق سے رشتے جوڑنے والے غیر طبعی طریقہ عمل میں مشغول ہیں۔

هٰذا والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

خاکسار:- مناظر احسن گیلانی

یوم الجمعہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء
عند اذان العصر - بہ مقام کہف الایمان المشہور بہ "گرہ"
سورۂ کہف کے متعلق ایک ظلوم وجہول کے واردات واحساسات پورے ہوئے

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم
ولا تواخذنا ان نسينا او اخطأنا ولا تحمل علينا اصراً
كما حملته على الذين من قبلنا ربنا ولا تحملنا ما لا طاقة
لنا به واعف عنا واغفر لنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا
على القوم الكافرين
سبحٰنك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العليم الحكيم واٰخر دعوانا
ان الحمد لله رب العٰلمين الذى بعزته وجلاله تتم الصالحات

ہندستان سے
سالانہ چندہ ص۵ر
فی کاپی آٹھ آنے

پاکستان سے
سکہ پاکستانی للعہ
دیگر ممالک سے ۱۲ شلنگ

جلد ۱۹ بابت ماہ رجب ۱۳۷۱ھ نمبر (۷)

سرخ پنسل کا نشان اس بات کی علامت ہے کہ جناب کی مدت خریداری اس شمارہ پر ختم ہو گئی۔ لہذا اپنا چندہ مبلغ (صہ) بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما کر مشکور فرمائیے۔ اگر ۲۰ مئی ۵۲ء تک جناب کا چندہ وصول نہ ہوا اور نہ کوئی اطلاع آئی تو اگلا پرچہ وی، پی بھیجا جائے گا جس کا وصول کرنا جناب کا اخلاقی فریضہ ہوگا۔ ـــــــ پاکستان کے حضرات اپنا چندہ سکریٹری صاحب ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کے پتہ ارسال فرما کر ایک کارڈ کے ذریعہ اسکی اطلاع ہم کو ضرور دیں۔ قدیم خریدار صاحبان اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔ دفتر الفرقان میں اگر جناب کے چندہ کی اطلاع ۲۰ مئی ۵۲ء تک نہ آئی تو حسب قاعدہ شعبان کا پرچہ بذریعہ وی، پی ادارۂ اصلاح و تبلیغ لاہور سے آپکی خدمت میں ارسال کیا جائیگا۔ دیگر ممالک کے حضرات اپنا چندہ ۱۲ شلنگ بذریعہ پوسٹل آرڈر ارسال فرمائیں

والسلام
منیجر۔ الفرقان

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے "نامی پریس" میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شایع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص الخاص رحمتیں اور برکتیں نازل فرمانے کے لیے سال کے بارہ مہینوں میں سے رمضان کا انتخاب کیا ہے، قرآن و حدیث کے نصوص و اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمتوں کا جتنا نزول اس ماہ مبارک میں ہوتا ہے اتنا سال کے باقی پورے گیارہ مہینوں میں بھی نہیں ہوتا ——— پھر احادیث سے کچھ ایسا بھی مفہوم ہوتا ہے کہ رحمت کی جو بارشیں رمضان میں آنے والی ہوتی ہیں ان کا کچھ سلسلہ شعبان ہی سے شروع ہو جاتا ہے، چنانچہ شعبان کی درمیانی رات (شب برات) کے بارہ میں صحیح مسلم اور مسند احمد، اور سنن ابن ماجہ اور بیہقی وغیرہ میں جو حدیثیں روایت کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رات میں اللہ کی رحمت و عنایت بندوں کی طرف کچھ اسی انداز میں متوجہ ہوتی ہے جس طرح کہ رمضان کی راتوں میں ———

بہرحال شعبان کا مہینہ رمضان کی رحمتوں کا گویا مقدمہ اور دیباچہ ہے اور رمضان میں برسنے والی بارشوں کی ہوائیں اسی مہینہ سے چلنا شروع ہو جاتی ہیں، اور غالباً اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ رمضان کے علاوہ تمام دوسرے مہینوں سے زیادہ روزے شعبان میں رکھتے تھے، یہاں تک کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:۔

کان یصوم شعبان کلّہ (مشکوٰۃ) (آپ شعبان کے پورے مہینہ کے روزے رکھتے تھے) علاوہ ازیں یہ بھی قرین قیاس ہے اور سمجھ میں آتا ہے کہ شعبان میں زیادہ روزے رکھنے سے آپ کا مقصد رمضان کی رحمتوں کے استقبال کے لیے اپنے کو زیادہ تیار کرنا اور ملاء اعلیٰ سے اپنی مناسبت اور تعلق کو بڑھانا بھی ہوگا۔

بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل اور اپنے ارشادات سے امت کو رہنمائی فرمائی تھی کہ

شعبان ہی کے مہینہ سے اللہ کی رضاجوئی کے لیے اور اس کی رحمت وعنایت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہ اپنی سعی وکوشش کی رفتار تیز کر دیا کریں اور طاعت ومجاہدہ کی مقدار کو بڑھائیں اور جو بد اعمالیاں بندہ کو اللہ سے دور اور اس کی رحمت سے قطعی محروم کر دیتی ہیں ان سے مکمل اجتناب اور ان کے بارہ میں اپنا پورا احتساب کریں۔[۱] گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا تھا کہ طاعت وانابت اور رضاء الٰہی کے لیے مجاہدہ والی فضا اسلامی معاشرہ میں شعبان ہی سے قائم ہونی چاہیئے! ــــــــ لیکن مسلمانوں کے لاکھوں گھرانوں نے آتش بازی وغیرہ جن خرافات اور جن شیطانی حرکات کے لیے اس مبارک مہینہ کا انتخاب کیا ہے اور وہ اس مہینہ میں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وہدایت اور آپ کے منشاء مبارک کی مخالفت کر کے شیطان کو خوش کرتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ ایمان کے دعووں کے ساتھ ان شیطانی حرکات کا کیا جوڑ ہے۔

ہرگزم باور نمے آید ز روئے اعتقاد

ایں ہمہ ہا کہ دل و دین ہمیں داشتن

ہولی کے دنوں میں جب ہم اپنے بہت سے برادران وطن کو وہ حرکتیں کرتے دیکھتے ہیں جو ہوش وحواس رکھنے والے کسی آدم زاد سے سرزد نہ ہونی چاہئیں تو انسانیت کو انتہائی پستی میں گرا دیکھ کر بڑا رنج ہوتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ اللہ کی ہدایت اور پیغمبروں کی تعلیم کو نہ ماننا آدمی کو کتنی پستی میں گرا دیتا ہے اور شیطان ایسے لوگوں کو کیسا اپنی سواری میں لے لیتا ہے ــــــــ لیکن شعبان کے مبارک مہینہ میں اور پھر خاصکر اس کی رحمت والی نورانی رات (شب برات) میں جب ہم بہت سے مسلمان کہلانے والوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اور ان کے بچے ــــــــ رنگ اور گوبر وکیچڑ سے ہولی کھیلنے والے ہمارے برادران وطن سے بھی سیکڑوں قدم آگے بڑھ کر شیطان کے اشاروں پر آگ کی ہولی کھیلتے ہیں اور اس دوزخی کھیل میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے ہیں تو انتہائی صدمہ ہوتا ہے اور دل خون روتا ہے اسے اللہ کے غضب اور اس کی پھٹکار کے سوا اور کیا کہا جائے کہ جب ان ایمان کا دعوی کرنیوالوں اور اپنے کو مسلمان کہلانے والوں نے اللہ کے احکام کی اطاعت والی ایمانی زندگی چھوڑ کے نفسانی خواہشات والی من مانی زندگی اختیار کرلی تو اللہ نے ان کو انسانی شرف سے اور برے بھلے کی تمیز سے بھی محروم کر کے لایعقل حیوان بنا دیا اور اب شیطان جس طرح چاہتا ہے اپنی ڈوری پر ان کو نچاتا ہے یہاں تک کہ ان آدم زادوں سے شب برات جیسی رحمتوں اور برکتوں والی رات میں وہ آگ کی ہولی کھلواتا ہے ــــــــ یہ بیچارے سمجھتے

---

[۱] شب برات کے بارہ میں احادیث میں آتا ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ بندوں پر رحمت کی خاص نظر فرماتا ہے اور ہر معافی وبخشش مانگنے والے کو معاف کرتا اور بخشتا ہے، لیکن چند گناہ ایسے ہیں (مثلاً شرک، کینہ، قطع رحمی، والدین کی نافرمانی شراب خوری) کہ ان کے کرنے والے اس رات کی مغفرت ورحمت سے بھی محروم رہتے ہیں تو ان حدیثوں کا تقاضا ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کی مغفرت ورحمت حاصل کرنے کے لیے اس رات میں دعا واستغفار کریں اور ان گناہوں سے بچیں ــ ۱۲

ہیں کہ ہم اور ہمارے بچے کھیل رہے ہیں لیکن درحقیقت شیطان نے ان کو اپنا کھلونا بنالیا ہو اور وہ ان سے کھیل رہا ہو۔

دین اور شریعت بجائے خود، کیا عام انسانی عقل اسکی اجازت دیتی ہے کہ آدم زاد آگ سے کھیلے! کوئی سال ایسا نہیں جاتا جسمیں مختلف شہروں میں اس آتش بازی کے طفیل بہت سے گھر نہ جلتے ہوں اور کچھ انسانی جانیں اس کی بھینٹ نہ چڑھتی ہوں ۔ اور پھر جو بے حساب روپیہ ہر سال آگ کے اس کھیل پر مسلمانوں کا برباد ہوتا ہو اس کا کچھ اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہو کہ اب سے چند برس پہلے ایک باخبر بزرگ سے خود راقم سطور نے سنا تھا کہ ہر سال شب برات کے لیے جو آتش بازی غیر ملکوں سے آتی ہو وہ ایک کروڑ سے زیادہ کی ہوتی ہے۔ اور اس میں کیا شک ہو کہ جو خود ملک کی تیار شدہ استعمال ہوتی ہو وہ کئی گنا زیادہ ہوتی ہے ۔ گویا ہر سال مسلمانوں کا کئی کروڑ روپیہ آگ کے اس کھیل پر اور اس دوزخی تفریح پر صرف ہوتا ہو۔ اور بعض مقامات پر تو آتش بازی کا یہ سلسلہ شب برائت سے بہت پہلے سے شروع ہو جاتا ہو۔ چنانچہ لکھنؤ میں ہم دیکھتے ہیں کہ شروع رجب سے ۔ یعنی شب برائت سے پورے ڈیڑھ مہینے پہلے سے ۔ آتش بازی کی دوکانیں سج جاتی ہیں اور ہزاروں بچے پورے ڈیڑھ مہینہ تک روزانہ اپنے گھروں سے پیسے لا لاکر آگ خریدتے اور اس سے کھیلتے ہیں۔ اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر اندازہ ہو کہ صرف ایک شہر لکھنؤ کے مسلمانوں کا کم از کم ۴۰ ـ ۵۰ ہزار روپیہ ہر سال اس آگ بازی پر صرف ہو جاتا ہوگا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد خیال ہوتا تھا کہ مسلمان کہلانے والوں کے جس خدا فراموش طبقہ سے خرافات کے اس بازار کی رونق ہے، زمانہ کی یہ تبدیلی شاید اسکو بھی بدل دیگی اور اب وہ شیطان کی بیعت توڑ کے اللہ و رسول سے اطاعت کا تعلق قائم کرے گا لیکن شقاوت و بدبختی کی انتہا ہے کہ اتنے بڑے انقلاب اور حالات کے اتنے عظیم تغیر نے بھی ان کے رویہ میں تبدیلی نہیں پیدا کی۔

ایمان کے دعوے اور اسلام سے نسبت رکھنے کے ساتھ جو لوگ اس قسم کی خرافات سے دلچسپی رکھتے ہیں یا جو اپنے بچوں کو آگ کی یہ ہولی کھلاتے ہیں وہ اپنی دنیا اور اپنا دین تو برباد کرتے ہی ہیں لیکن بڑے دکھ کی بات یہ ہے کہ اسلام کو نہ جاننے والی قومیں شب براءت کو مسلمانوں کا ایک مذہبی تیوہار سمجھنے کی وجہ سے اس آتش بازی اور آگ کی اس ہولی کو بھی وہ اسلامی چیز سمجھتی ہیں ۔ اسلام کے بڑے بڑے دشمن اپنی معاندانہ تدبیروں سے اسلام کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا کہ اسلام کے ان نام لیواؤں کی اس قسم کی حرکات سے پہنچتا ہے۔ کیا ایسی قوم فلاح پاسکتی ہے جو اسلام کا نام لیتے ہوئے اس پر اتنا بڑا ظلم کرتی ہو۔

بہرحال اسلام اپنے ان نام لیواؤں کی ان حرکتوں سے بری اور بیزار ہے بلکہ ان کے ظلم کا فریادی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور آپ کی تعلیم سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر توفیق ہو تو اللہ کی رحمت کے طالب بندے شعبان کے مہینہ میں روزے کثرت سے رکھیں۔ (باقی صفحہ پر ملاحظہ ہو)

معارف الاحادیث

حوض کوثر اور صراط :-

حدیثوں میں آخرت کی جن چیزوں کا تعین کیساتھ اور نام کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ان میں سے یہ دو چیزیں بھی ہیں ایک حوض کوثر اور دوسری صراط ۔ پھر کوثر کو بعض احادیث میں حوض کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہو اور بعض میں نہر کے لفظ سے ۔ پھر بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوثر جنت کے اندر واقع ہے اور اکثر احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا محل وقوع جنت سے باہر ہے اور اہل ایمان جنت میں جانے سے پہلے اسی حوض پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں باریاب ہو کر آپ کے دست کرم سے اس کا نہایت سفید و شفاف اور بے انتہا لذیذ و شیریں پانی نوش جان کریں گے ۔ اور تحقیق یہ ہے کہ کوثر کا اصل مرکزی چشمہ جنت کے اندر ہے اور جنت کے طول و عرض میں اس کی شاخیں نہروں کی شکل میں ہر طرف جاری ہیں اور جس کو حوض کوثر کہا جاتا ہے وہ سیکڑوں میل کے طول و عرض میں ایک نہایت حسین و جمیل تالاب ہو جو جنت سے باہر ہے لیکن اس کا تعلق اسی جنت کے اندر کے چشمہ سے ہے گویا اس میں جو پانی ہوگا وہ جنت ہی کے اس چشمہ سے نہروں کے ذریعہ آئے گا ——— آج کل کے تمام بڑے متمدن شہروں میں نلوں کا جو نظام ہے اس نے بھی کوثر کی اس نوعیت کا سمجھنا الحمد للہ سب کے لیے آسان کر دیا ہے ۔

یہاں ایک یہ چیز بھی قابل لحاظ ہے کہ حوض کے لفظ سے عموماً لوگوں کا ذہن اسی قسم کے حوضوں کی طرف جاتا ہے جس قسم کے حوض انھوں نے عموماً دنیا میں دیکھے ہوتے ہیں لیکن حوض کوثر اپنی معنوی کیفیات اور اپنی خوش منظری میں تو دنیا کے حوضوں سے اتنا ممتاز اور فائق ہوگا ہی جتنا کہ جنت کی کسی چیز کو دنیا کی چیزوں کے مقابلہ میں ہونا چاہیئے ، مگر اس کے علاوہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رقبہ اور علاقہ بھی اتنا ہوگا کہ ایک راہرو اس کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارے تک کی مسافت ایک مہینہ میں طے کر سکے گا اور ایک حدیث میں اس کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ تک کا فاصلہ عدن اور عمان کے فاصلہ کے برابر بتلایا گیا ہے ۔

بہرحال آخرت کی چیزوں کے متعلق احادیث میں جو کچھ ذکر کیا جاتا ہے اس کی روشنی میں بھی ان چیزوں کا صحیح تصور اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا۔ ان چیزوں کی جو واقعی نوعیت اور صورت ہے وہ صحیح طور پر تو سامنے آنے کے بعد ہی معلوم ہوگی۔

یہی بات صراط اور میزان وغیرہ کے بارہ میں بھی ملحوظ رہنی چاہیئے۔

---

(۸۲) عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بینا انا اسیر فی الجنۃ اذا انا بنھر حافتاہ قباب الدر المجوّف قلت ما ھٰذا یا جبرئیل ؟ قال ھٰذا الکوثر الذی اعطاک ربک فاذا طینہ مسکٌ اذفر (رواہ البخاری)

(ترجمہ) حضرت انس سے مروی ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس اثنا میں کہ میں جنت میں چلا جا رہا تھا میرا گزر ایک (عجیب وغریب) نہر پر ہوا اس کے دونوں جانب "درِّ مجوّف" سے (یعنی اندر سے خالی کیے ہوئے موتیوں سے) تیار کیے ہوئے قبے تھے۔ میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کیا ہے ؟ جبرئیل نے تبلایا کہ یہ وہ کوثر ہے جو آپ کے ربّ نے آپ کو عطا فرمایا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس کی مٹی (جو اس کی تہہ میں تھی) وہ نہایت مہکنے والے مشک کی طرح خوشبودار تھی۔

(تشریح) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت میں سیر کرتے ہوئے نہر کوثر پر گزرنے کا جو واقعہ ذکر فرمایا ہے غالباً یہ شب معراج کا ہے ——— اور حضرت جبرئیل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے جو یہ فرمایا کہ "یہ وہ کوثر ہے جو آپ کے ربّ نے آپ کو عطا کیا ہے" تو یہ قرآن مجید کی آیت "انا اعطینٰک الکوثر" کی طرف اشارہ ہے۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ "ہم نے آپ کو کوثر دیا" کوثر کے اصل معنی خیر کثیر کے ہیں اور اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیر کے جو خزانے عطا فرمائے مثلاً قرآن و شریعت اور اعلیٰ روحانی صفات اور دنیا اور آخرت میں آپ کی رفعت شان وغیرہ سو یہ سب بھی کوثر کے عموم میں اگرچہ داخل ہیں لیکن جنت کی یہ نہر اور اس سے متعلق وہ حوض جو میدان حشر میں ہوگا ——(جس سے اللہ کے بے شمار بندے سیراب ہوں گے) لفظ کوثر کا خاص مصداق ہیں۔ یا یوں سمجھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین وایمان کے سلسلہ کی جو بیش بہا نعمتیں عطا فرمائی تھیں جو آپ کے ذریعہ سے اللہ کے بے شمار بندوں تک پہنچیں، آخرت میں ان کا ظہور اس نہر کوثر اور حوض کوثر کی شکل میں ہوگا جن سے اللہ کے بے شمار بندے فیضیاب اور سیراب ہوں گے۔

---

(۸۳) عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حوضی مسیرۃ شھر وزوایاہ سواء ماءہ ابیض من اللبن وریحہ اطیب من المسک وکیزانہ کنجوم السماء من یشرب منھا فلا یظماء ابداً (متفق علیہ)

(ترجمہ) حضرت عبد اللہ بن عمرو سے مروی ہو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے حوض کی مسافت ایک مہینہ کی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے جو حوض کوثر مجھے عطا فرمایا ہے وہ اس قدر طویل وعریض ہے کہ اس کی ایک جانب سے دوسری جانب تک ایک مہینہ کی مسافت ہے) اور اس کے زاویے (یعنی گوشے) بالکل برابر ہیں (اس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ وہ مربع ہے اس کا طول وعرض یکساں ہے) اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید ہے اور اس کی خوشبو مشک سے بھی بہتر ہے اور اس کے کوزے آسمان کے تاروں کی طرح ہیں (غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمان کے ستارے جیسے حسین اور چمکدار ہیں اور ان کی کثرت کی وجہ سے جس طرح انھیں گنا نہیں جا سکتا اسی طرح میرے حوض کے کوزے بھی بے شمار اور حسین اور چمکدار ہیں) جو اس کا پانی پیے گا وہ کبھی پیاس میں مبتلا نہیں ہوگا۔ (بخاری مسلم)

(۸۴) عن سھل بن سعد قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انّی فرطکم علی الحوض من مرّ علیّ شرب ومن شرب لم یظماء ابداً سیردنّ علیّ اقوام اعرفھم ویعرفوننی ثم یحال بینی وبینھم فاقول انھم منّی فیقال انک لا تدری ما احدثوا بعدک فاقول سحقاً سحقاً لمن غیّر بعدی ـــــ (متفق علیہ)

(ترجمہ) حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں حوض کوثر پر تمھارا میر ساماں ہوں (اور تم سے آگے جا کے تمھاری پیاس کا انتظام کرنے والا ہوں) جو میرے پاس پہنچے گا وہ آبِ کوثر سے پیے گا اور جو اس کو پی لے گا پھر کبھی وہ پیاس میں مبتلا نہ ہو گا۔ اور وہاں کچھ لوگ، جن کو میں بھی پہچانوں گا اور وہ بھی مجھے پہچانیں گے میری طرف آئیں گے لیکن میرے اور ان کے درمیان رکاوٹ ڈالدی جائے گی (اور انھیں میرے پاس آنے سے روک دیا جائے گا) تو میں کہوں گا کہ یہ آدمی تو میرے ہیں، پس مجھے جواب دیا جائے گا کہ تمھیں معلوم نہیں ہے کہ انھوں نے تمھارے بعد کیا نئی نئی باتیں نکالیں (اور کیا کیا رخنے ڈالے) تو میں کہوں گا کہ بربادی اور دوری ہو ان کے لیے جنھوں نے میرے بعد دین میں فرق ڈالا اور اس کو گڑبڑ کیا ـــــ (بخاری ومسلم)

(تشریح) اس حدیث میں جن لوگوں کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ وہ حوض کوثر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے سے روک دیئے جائیں گے اس کی تعیین مشکل ہے کہ یہ کون اور کس طبقہ کے لوگ

ہوں گے۔ اور نہ اس کا معلوم کرنا ہمارے لیے ضروری ہے۔ اس حدیث کا خاص سبق ہمارے لیے تو بس یہ ہے کہ اگر ہم کوثر پر حضور کی خدمت میں حاضر ہونے کے آرزومند ہیں تو مضبوطی سے اس دین پر قائم رہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے لائے تھے اور اس میں اپنی طرف سے کوئی ایجاد اور کوئی رد و بدل نہ کریں۔

(۸۵) عن ثوبان عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال حوضی من عدن الی عمان البلقاء ماءہ اشد بیاضا من اللبن واحلیٰ من العسل واکوابہ عدد نجوم السماء من شرب منہ شربۃ لم یظمأ بعدھا ابدا اول الناس ورودا فقراء المہاجرین الشعث رؤسا الدنس ثیابا الذین لا ینکحون المتنعمات ولا یفتح لھم السدد (احمد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)

(ترجمہ) حضرت ثوبان سے مروی ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ میرے حوض کی مسافت (اتنی ہے جتنی کہ) عدن سے عمان بلقاء تک۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید ہے اور شہد سے زیادہ شیریں ہے اور اس کے گلاس گنتی میں آسمان کے ستاروں کی طرح (بے شمار) ہیں (اس کے پانی کی یہ صفت ہے کہ) جو اس میں سے ایک دفعہ پی لے گا اسے اس کے بعد کبھی پیاس کی تکلیف نہیں ہوگی۔ اس حوض پر سب لوگوں سے پہلے میرے پاس پہنچنے والے فقراء مہاجرین ہوں گے۔ پریشان و پراگندہ سروں والے، میلے کچیلے کپڑوں والے جن کا نکاح خوش حال و خوش عیش عورتوں سے نہیں ہو سکتا اور جن کے لیے دروازے نہیں کھولے جاتے (یعنی جن کو خوش آمدید نہیں کہا جاتا) ——— (احمد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)

(تشریح) عدن مشہور مقام ہے اور عمان بھی شام کے علاقہ کا مشہور شہر ہے۔ بلقاء عمان کے قریب ایک بستی تھی، بطور امتیاز اور نشانی کے اس حدیث میں عمان بلقاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں عدن اور بلقاء کے قریب والے عمان کے درمیان جتنا فاصلہ ہے آخرت میں حوض کوثر کی مسافت اتنی ہوگی ۔۔ اور واضح رہے کہ یہ کبھی کوئی ناپی ہوئی مسافت نہیں ہے کہ ٹھیک اتنے ہی میل اور اتنے ہی فرلانگ اور اتنے ہی فٹ ہوں، بلکہ حوض کی وسعت کو سمجھانے کے لیے عرف کے مطابق یہ ایک تقریبی بات کہی گئی ہے اور مطلب یہ ہے کہ حوض کی مسافت سیکڑوں میل کی ہوگی۔

آخر میں فرمایا گیا ہے کہ سب سے پہلے حوض پر پہنچنے والے اور اس سے سیراب ہونے والے وہ غریب مہاجرین ہوں گے جو اپنے فقر و تنگدستی اور دنیا کی بے رغبتی کی وجہ سے اس حال میں رہتے ہیں کہ ان کے سروں کے بال بنے سنورے نہیں رہتے بلکہ بکھرے ہوئے اور الجھے ہوئے رہتے ہیں، اور کپڑے بھی ان کے اچھے اجلے نہیں رہتے بلکہ میلے کچیلے رہتے ہیں۔ جو اگر نکاح کرنا چاہیں تو ان کی اس حالت کی وجہ سے خوش عیش اور خوش حال گھرانوں کی بیٹیاں اُن کے نکاحوں میں نہ دی جائیں اور وہ اگر کسی کے گھر پر جائیں تو ان کے میلے کچیلے کپڑے اور ان کے

شکل وصورت کی وجہ سے کوئی ان کے لیے اپنا دروازہ نہ کھولے اور ان کو خوش آمدید نہ کہے ۔۔۔

معلوم ہوا کہ اللہ کے جن بندوں کا حال یہ ہو کہ دنیا کی بے رغبتی اور دین میں انہماک اور فکر آخرت کے غلبہ کی وجہ سے جو اس دنیا میں غریب و تنگدست ہو کر رہیں، نہ اپنی صورتوں کے بناؤ سنوار کی فکر رکھیں نہ لباس و پوشاک کی، وہ اپنی غربت اور دنیوی عیش کی اس قربانی کی وجہ سے آخرت کے انعامات میں مقدم اور فائق رہیں گے ۔۔۔۔۔ ہمارے اس زمانہ کے جو حضرات اس طرز عمل کو کسی غلط فہمی کی وجہ سے "**تقشف**" اور "رہبانیت پسندی" اور "دین کے غلط تصور کا نتیجہ" سمجھتے ہیں چاہیئے کہ وہ اس قسم کی حدیثوں پر غور فرمائیں ۔۔۔۔۔

ہر زمانہ کے کچھ امراض ہوتے ہیں، جس طرح پہلے کسی زمانہ میں واقعی رہبانیت اور ترک دنیا کی غلط اور غیر اسلامی صورتوں کو اسلام کا پسندیدہ زہد بعض حلقوں میں سمجھا اور سمجھایا جاتا تھا اسی طرح ہمارے اس زمانہ میں (شاید اس کے ردعمل میں) بعض حلقوں کا مستقل رجحان یہ ہے کہ اسلام کو اور اس کی تعلیمات کو اس دور کے مادہ پرستانہ اور نفس پرستانہ تقاضوں کے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کیا جائے ۔۔۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

(۸۶) عن سمرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لکل نبی حوضا وانھم لیتباھون ایھم اکثر واردۃ وانی لارجو ان اکون اکثرھم واردۃ ۔۔۔۔۔ (رواہ الترمذی)

(ترجمہ) حضرت سمرہ سے مروی ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخرت میں ہر نبی کا ایک حوض ہوگا اور ان کے درمیان اس پر تفاخر ہوگا کہ اُن میں سے کس کے پاس پینے والے زیادہ آتے ہیں اور میں امید رکھتا ہوں کہ سب سے زیادہ لوگ پینے کے لیے میرے پاس آئیں گے (اور میرے حوض سے سیراب ہوں گے)

(۸۷) عن انس قال سألت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یشفع لی یوم القیامۃ فقال انا فاعل قلت یا رسول اللہ فاین اطلبک قال اطلبنی اول ما تطلبنی علی الصراط قلت فان لم القک علی الصراط قال فاطلبنی عند المیزان قلت فان لم القک عند المیزان قال فاطلبنی عند الحوض فانی لا اخطئ ھذہ الثلث المواطن۔

(رواہ الترمذی)

(ترجمہ) حضرت انس (خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سے مروی ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ قیامت کے روز آپ میری سفارش فرمائیے گا! آپ نے فرمایا کہ میں تمہارا یہ کام کروں گا۔ میں نے عرض کیا تو (قیامت کے روز) میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟ آپ نے فرمایا سب سے پہلے جب تمہیں میری تلاش ہو تو صراط پر مجھے دیکھنا۔ میں نے عرض کیا اگر میں آپ کو صراط پر نہ پا سکوں تو پھر کہاں تلاش کروں؟ آپ نے فرمایا تو پھر مجھے میزان کے پاس تلاش کرنا! میں نے عرض کیا اور اگر میں میزان کے پاس بھی آپ کو نہ پا سکوں تو پھر

کہاں تلاش کروں؟ آپ نے فرمایا تو پھر مجھے حوض کے پاس دیکھنا! کیوں کہ میں اسوقت ان تین مقامات سے دور کہیں نہ جاؤں گا۔ (ترمذی)

(ف) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آخرت کی شفاعت ایسی چیز ہے جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی جاسکتی ہے اور اگرچہ اس حدیث میں حضور نے اپنے ملنے کے مقامات حضرت انس کو تبلائے ہیں لیکن دراصل شفاعت کے سب حاجت مندوں کے لیے حضور نے اپنے ملنے کے یہ پتے تبلائے ہیں۔

اللھم توفنا علی ملتہ واسعدنا بشفاعتہ

(۸۸) عن المغیرۃ بن شعبۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شعار المومنین یوم القیمۃ علی الصراط رب سلّم سلّم!

(رواہ الترمذی)

(ترجمہ) حضرت مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن صراط پر اہل ایمان کا شعار (یعنی ان کا امتیازی وظیفہ) یہ دعائیہ کلمہ ہوگا ربّ سلّم سلّم اے ہمارے پروردگار ہمیں سلامت رکھ اور سلامتی کے ساتھ پار لگا۔

(بقیہ صفحہ ۴۲) خاص کر ایام بیض (یعنی تیرھویں، چودھویں، پندرھویں) کے تین روزے اگر ہو سکے تو رکھیں، ورنہ کم از کم پندرہویں کا روزہ رکھیں اور اس کی رات یعنی شب برات میں اپنے لیے اور دوسروں کے لیے اللہ سے مغفرت و رحمت کی خاص طور سے دعا کریں اور خوب الحاح سے دعا کریں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو تبلایا تھا کہ اللہ کے فرشتہ جبرئیل نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اس رات میں اللہ اپنے بندوں کی طرف خاص رحمت سے متوجہ ہوتا ہے اور بہت بڑی تعداد میں بندوں کی مغفرت فرماتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ اطلاع پاکر بستر سے اٹھ کر دعا و مناجات میں معروف ہوئے اور بہت دیر تک مشغول رہے اور اس سلسلہ میں ایک دفعہ اتنی دیر تک سجدہ میں رہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ مجھے وسوسہ گزرا کہ کہیں حضرت واصل بحق تو نہیں ہو گیے، چنانچہ میں نے گھبرا کے آپ کے پاؤں کے انگوٹھے کو ہلایا اور جب مجھے حرکت محسوس ہوئی تب اطمینان ہوا ــــ بس یہ ہے ایمان والوں کے لیے شب برات کا مشغلہ اور وظیفہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ!

"تجدید سیاسیات و معاشیات"

[حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی اصلاحات و تجدیدات پر جو ایک خاص تصنیفی سلسلہ ہمارے مخدوم و محترم جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی مدظلہ نے شروع فرمایا تھا اس سلسلہ کی تین مستقل کتابیں اب سے کافی پہلے شایع ہو کر علمی اور دینی حلقوں میں مقبول اور اللہ کے ان ہزاروں بندوں کے لیے نافع اور مفید ہو چکی ہیں جن میں اس قسم کی چیزوں سے فائدہ حاصل کرنے کی صلاحیت اور استعداد باقی ہو — اس سلسلہ کی چوتھی (اور شاید آخری) کتاب — "تجدید سیاسیات و معاشیات" ہے جو ابھی شایع نہیں ہوئی ہے۔ مولانا موصوف نے ناچیز کی استدعا پر اس کا مقدمہ "الفرقان" میں اشاعت کے لیے مرحمت فرمایا ہے جو ممدوح کے شکریہ کے ساتھ شایع کیا جا رہا ہے ——— مدیر]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"دیانات مقصود بالذات ہیں اور سیاسیات و جہاد مقصود اصلی نہیں، بلکہ اقامت دین کا وسیلہ ہیں یہی وجہ ہے کہ دیانت و احکام دیانت تو انبیاء علیہم السلام کو مشترک طور پر سب کو دیے گیے اور سیاسیات و جہاد سب کو نہیں دیا گیا بلکہ جہاں ضرورت و مصلحت سمجھی گئی دی گئی ورنہ نہیں۔ وسائل کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ بقدر ضرورت ہی دیے جاتے ہیں۔" (حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمۃ[1])

معاشیات و سیاسیات کی فنی و اصطلاحی تعریف و تحقیق میں نکتہ آفرینیاں جو کچھ بھی کی جاتی ہوں، مدعا معاشی فلاح و فراغ کا بہرحال اتنا ہی ہے کہ آدمی کی مادی یا جسمانی زندگی کی ضرورتیں تھوڑی بہت سہولت و راحت کے ساتھ پوری ہوتی رہیں۔ سیاست و حکومت کا مطلب بھی اسی قدر ہے کہ ان ضرورتوں کی تکمیل انفرادی و اجتماعی، قومی و

---

[1] خاتمۃ السوانح (حصہ ۲) یعنی حضرت مجدد وقت مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ کی سوانح مبارکہ موسومہ اشرف السوانح کا آخری (چوتھا) حصہ جو وفات کے بعد شایع ہوا۔

بین الاقوامی امن و عافیت اور عدل و انصاف کے ساتھ ہوتی رہے یعنی معاشیات و سیاسیات کے سارے مسائل و مباحث کا تعلق ہر پھر کر ہماری جسمانی یا حیوانی زندگی کے بقاء و تحفظ یا آرام و آسائش سے ہے جس کا حاصل دوسرے لفظوں میں یہی ہوا کہ یہ زندگی کے وسائل ہیں مقاصد نہیں۔

اب اگر اس زندگی کا کوئی اور مقصد یا مستقبل نہیں، تو لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ "خوردن برائے زیستن" کی منطق الٹ کر "زیستن برائے خوردن" ہوجائے۔ انسانی بستیوں کا چپہ چپہ جس روز افزوں انفرادی و اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی شور و شر اور فتنہ و فساد، جنگ و جدال سے دوچار اور باہم دست و گریباں ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہی الٹا سبق ہے کہ وسائل کو وسائل کے درجہ سے بڑھا کر مقاصد کا مقام دے دیا گیا ہے۔

یہ کوئی بڑی باریکی نہیں بالکل موٹی بات ہے کہ اس زندگی کا خالی جینے کے علاوہ کوئی بھی اور مقصود قرار دیا جائے اور خواہ وہ اسی مادی و دنیاوی زندگی تک ہی محدود ہو پھر بھی خود یہ زندگی یا اس کی حفاظت و راحت کے اسباب اصل مقصود کے وسائل ہی قرار پائیں گے چہ جائیکہ جب مستقبل کی ایک غیر فانی ــــ خیر و ابقی ــــ مستقل زندگی کا یقین و ایمان ہو تو پھر اسکے مقابلہ میں اس فانی زندگی کی تھوڑی بہت سانسوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے اور اس کے بقاء و تحفظ کے معاشی یا سیاسی وسائل کی نوعیت وسائل در وسائل سے زیادہ کیا ہوتی ہے۔ دنیوی معاشیات و سیاسیات کیا! اسلام کی نگاہ میں جب یہ دنیا اور اسکی زندگی خود ہی سرے سے مقصود نہیں بلکہ ایک بے انتہا وسیع و نامحدود زندگی کا محض راستہ ہے، تو راستہ کے ساتھ وہ منزل کا معاملہ کیسے گوارا کرسکتا ہے۔

بس یہی دوراہہ ہے جہاں سے اسلامی و غیر اسلامی یا دینی و لادینی معاشیات و سیاسیات کی راہیں پھٹ کر بالکل الگ الگ ہوجاتی ہیں۔

انقلاب فرانس کے بعد یورپ جس سراسر مادی تمدن و تعیش کی راہ پر پڑ چکا تھا۔ اس کا بالکل منطقی و نفسیاتی نتیجہ یہی ہوسکتا تھا کہ انقلاب روس تک آتے آتے عملاً ہی نہیں تو لاً بھی انسان کا ماضی و حال مستقبل و مآل سب کچھ پیٹ ہی پیٹ ہوکر رہ گیا اور اب تو سیاسیات کے بھی سارے دعوے بطنیات ہی کی گوناگوں دعوتوں (آئیڈیالوجیز) اشتراکیت واشتالیت وغیرہ پر مبنی کیے جانے لگے ہیں۔ یورپ کی ہمہ گیر گرفت و غلبہ کی بدولت معاشی و سیاسی تصور کا یہی بطنی ہیضہ ساری دنیا میں پھیل گیا دل کی آواز دب کر ہر جگہ اور ہر طرف شکم ہی کا بول بولا ہو رہا ہے۔

جو پوچھا دل نے اس جینے کا کچھ حاصل بھی ہے
شکم بولا کہ اسکی فکر کیا بندہ تو حاضر ہے

جن لوگوں کی نظر میں اس زندگی کا نہ کوئی آگا پیچھا ہے نہ انبیائی دین اور اس کے آخری پیغام کے لائے اور بتاتے ہوئے انسانی زندگی کے تصور کو انھوں نے قبول کیا ہے وہ اپنی زندگی کو بے معنی و بے مآل بنا کر حیوانی

معاشیات و سیاسیات کی جن وادیوں نام نہاد۔ آئیڈیالوجیوں۔ میں جا بھٹکے، بھٹک بھٹک کر مر جائیں۔ وہ کھا پی کر یا بہت سے بہت عیش و عشرت یا حکومت و سلطنت کے ساتھ کھا پی کر مر جانے سے آگے آخر ۔۔۔ سوچ ہی کیا سکتے ہیں۔ سوال ان سے ہے جنھوں نے حیوانیت و لطبیعت سے اونچے ہوکر "نفخت فیہ من روحی" کی روحانیت اور "انی جاعل فی الارض خلیفہ[1]" کی خلافت کے مقام کو اپنے لیے پسند کیا ہے اور اس ناسوتی یا مادی زندگی کو ایک اعلیٰ و ابدی منزل حیات کا مسافرانہ و امتحانی راستہ ہونا وحی و نبوت کی روشنی میں دیکھ لیا ہے ان کو راستہ کے ساتھ منزل یا وسائل کے ساتھ مقاصد کا معاملہ کرنے کا حق کیا حاصل ہے؟

مسافر بہرحال مسافر ہی ہو۔ تھرڈ کلاس کے مسافر خانہ میں پڑ رہے تب بھی جی منزل ہی میں دھرا ہے اور فرسٹ کلاس کے انتظار خانہ (ویٹنگ روم) میں ٹھہرے جب بھی منزل ہی کے انتظار میں گھڑیاں گن رہا ہو۔ غنی ہو تو بھی مسافر۔ فقیر ہے تو بھی مسافر۔ حاکم ہے جب بھی مسافر۔ محکوم ہے جب بھی مسافر۔ سرائے کے ساتھ وطن کا۔ راستہ کے ساتھ منزل کا یا وسیلہ کے ساتھ مقصد کا برتاؤ کرنے میں اپنی ساری جانی و مالی جسمی و ذہنی توانائیوں کو وہی رائیگاں کرے گا جس کے دماغ میں خلل ہو۔

> "سرائے میں کوئی یہ تمنا کرے کہ یہاں جھاڑ و فانوس سب لگا دئے جائیں اور پھر اپنی کمائی سے لگا بھی دے تو کتنی بڑی حماقت ہے۔ خاص کر جب یہ حکم بھی ہو کہ مثلاً چار دن سے زیادہ کوئی اس سرائے میں قیام نہیں کر سکے گا۔ اس وقت تو اپنی کمائی وہاں کی آرائش میں لگانا پورا خلل دماغ ہے۔ دنیا ایسی ہی محدود قیام کی سرائے ہے جس کے بعد بلا اختیار یہاں سے نکل جانا پڑے گا اول تو سرائے کا قیام اگر اختیاری بھی ہو تب بھی یہی ہونا چاہیئے کہ اس کے ساتھ گھر کا سا معاملہ نہ کرے اور جب اختیاری بھی نہ ہو تب تو ہرگز بھی اس سے دل نہ لگانا چاہیئے"۔ (مجدد تھانوی[2])

مسافرانہ و مقیمانہ ذہنیت کا یہ فرق دینی و لادینی یا اسلامی و غیر اسلامی معاشیات و سیاسیات ہی میں نہیں مادی یا دنیوی زندگی کے چھوٹے بڑے تمام معاملات میں ہوگا اور عقلاً و نقلاً ہر طرح ہونا چاہیئے، نہیں تو دین و اسلام کا دعویٰ نرا زبانی جمع خرچ ہے۔

فرض کرو کسی مسلمان فرد یا جماعت کو سیاسی یا معاشی دونوں اعتبار سے حاکمانہ اقتدار و سطوت اور امیرانہ عیش و عشرت، آرائش و زینت کے سارے سامان حاصل ہیں لیکن اسلامیت کا دعویٰ زبانی جمع خرچ سے زیادہ

---

[1] انسان و کائنات کے خود خالق کی اطلاع ہے کہ "انسان میں خود اپنی روح میں نے پھونکی ہے" اور "زمین پر اس کو اپنا جانشین بنا رہا ہوں"۔ [2] تجدید تصوف (جو اس سلسلہ تجدید دین کا دوسرا نمبر ہے) ص ۱۵۲ و ۱۵۳

نہیں نہ مسلمانوں کی شکل صورت نہ نماز روزہ کی عبادات نہ معاشرت ومعاملات، نہ اخلاق وعادات۔ دوسری طرف سیاسی اعتبار سے محکوم اور معاشی لحاظ سے مفلس کوئی مسلمان فرد یا جماعت ہے مگر آخرت کے ابدی مستقبل سے غافل نہیں مقدور بھر ظاہری وباطنی زندگی کتاب وسنت کے اعمال صالحہ سے معمور ہے خود ہی فیصلہ کرو، کہ اسلامی نقطہ نظر سے کونسی حالت زیادہ کامل اور قابل ترجیح ہوگی؟

بلاشبہ ایمان وعمل صالح کے ساتھ ساتھ اگر سیاسی وحاکمانہ اقتدار اور معاشی وسعت وذرائع بھی میسر ہو تو مقاصد دین کی حفاظت اور افلاس کی کمزوریوں سے بچنے میں اعانت وسہولت ضرور ہوگی۔ اس وسائلی یا ثانوی درجہ میں معاشیات وسیاسیات کی اہمیت سے نہ انکار نہ دین وشریعت ہی کی صحیح وجائز راہوں سے ان کے حصول کی جدوجہد کے مطلوب ومحمود ہونے میں کلام، بلکہ ایمان وعمل صالح کی اختیار بھر اسلامی زندگی خود ہی سیاسی اقتدار اور معاشی فلاح سب کی سب سے بڑی ضامن تدبیر ہے لہذا مسلمان کا مسلمان ہونے کی حیثیت سے سیاسی برتری اور معاشی خوشحالی سے پہلے اور بعد جہاں اور جس حال میں بھی ہو مقدم کام انفرادی واجتماعی ہر لحاظ سے بقدر استطاعت "مومن صالح" بننا اور بنانا ہے۔

کامل دین کی طرف سے ایسا ہی کامل نظام حیات عطا ہوا ہے جو حاکم ومحکوم، غنی وفقیر سب کو کمال انسانیت کی منزل پا لینے کی یکساں ضمانت دیتا ہے۔ یعنی اخروی زندگی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب کو جس طرح مالی وسعت کے ساتھ اور حکومت کے تخت پر بیٹھ کر حاصل کیا جا سکتا ہو۔ اسی طرح تنگ دستی اور محکومی کی خاک پر لوٹ کر بھی۔ بلکہ اکثر صورتوں میں زیادہ سہولت وسرعت کے ساتھ۔ دین کامل کا یہ بڑا کمال ہے کہ دینی یا انسانی کمالات کے اونچے سے اونچے مقامات کی راہیں شاہ وگدا، حاکم ومحکوم۔ تونگر وتنگ دست سب پر بلا تفریق وتمیز یکساں کھلی ہیں۔

اگر کوئی دین دنیا کے جاہ ومال، حکومت وثروت کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کو بھی نفس دین کے مقاصد یا اجزا کا درجہ دے دیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ پوری انسانیت کے پورے حالات کو محیط وکامل دین ہی سرے سے نہیں کہ اس نے ایسی غیر اختیاری چیزوں کو دین کا جزو یا مقصود قرار دے دیا جن کا حاصل کرنا نہ ہر وقت ہر فرد کے انفرادی طور پر قبضہ واختیار میں ہے نہ ہر جماعت کے اجتماعی طور پر اسلام نے تو اپنی ساری تشریعی تکلیفات کا اساسی اصول ہی یہ منصوص فرما دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا استثنا کسی کو بھی کوئی ایسی تکلیف نہیں دیتا جو اس کی اختیاری وسعت وطاقت سے باہر ہو" لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا"

غرض زندگی کی ایک راہ تو وہ ہے جس میں سیاسیات ومعاشیات یا دوسرے لفظوں میں جاہ ومال ہی کو زندگی کا سہارا مدعا ومآل ٹھہرا لیا گیا ہے اور جس کی دعوت کا خلاصہ تمامتر "جینا کھانے کے لیے" نہ کہ "کھانا جینے کے لیے" اور زندگی کی انفرادی واجتماعی ساری طاقتوں کو اس طرح اسی الٹی گنگا میں بہا دیا گیا ہے کہ اس سوال کا سرے سے

ہوش ہی نہیں رہ گیا کہ

اس جینے کا کچھ حاصل بھی ہے؟

اس سوال کے گم کردینے نے خود انسانیت کو گم کر دیا ہے نسوا اللہ فانساھم انفسھم ــــ اور سکھ چین امن و عافیت کے ساتھ مقصد انسانیت کی تکمیل میں معین و کارآمد ہونے کی جگہ موجودہ معاشیات و سیاسیات کی "ترکستانی راہ" نے بالآخر عصر حاضر کی پوری دنیا کو جہاں سوز و جہانگیر جنگ کے ایسے مقام پر لا کھڑا کر دیا ہے کہ "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن"۔ امن دامان صلح و آشتی کی راہ ڈھونڈے نہیں ملتی۔ ابھی پرسوں (۲۹ جولائی سنہ ۱۹۵۱ء) کسی صاحب فکر فلسفی کا "جوہری عہد کی حیرانیوں" کے عنوان سے ایک مضمون نکلا ہے جس کی ابتدا میں ہے کہ

> "ایسا وقت آ پڑا ہے کہ آدمی اپنے کو بڑی بے بسی کے مخمصہ میں پا رہا ہے۔ ہم اپنے کو ایسی جنگ کے منہ میں جاتا دیکھ رہے ہیں۔ جس کو بمشکل سے کوئی ایک شخص بھی پسند کرتا ہوگا۔ جس کی نسبت ہم جانتے ہیں کہ نوع انسان کے بڑے حصہ پر مصیبت نازل کر کے رہے گی ــ مگر ہمارا حال اس خرگوش کا سا ہو رہا ہے جس کو سانپ نے مسحور کر رکھا ہو کہ گو یہ بھیانک منظر ہم کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں مگر گریز کی راہ نہیں پاتے ایک دوسرے سے ہم ایٹم اور ہائیڈروجن بم کے دہشت ناک قصے بیان کرتے ہیں کہ شہر کے شہر نیست و نابود ہو جائیں گے۔ ہر جگہ قحط و درندگی کا دور دورہ ہوگا اور گو ہماری عقل کہتی ہے کہ ایسے منظر سے ہم کو لرزنا چاہیئے۔ لیکن خود ہمارے نفس ہی کے اندر ایک ایسا حصہ بھی ہے جو اس سے مزے لیتا ہے اور مصیبت سے نکلنے کا عزم پیدا نہیں ہونے دیتا اس طرح خود ہمارے اندر ہی صحیح العقل اور فاتر العقل کی ایک گہری تقسیم موجود ہے[۱]۔"

یعنی ہم بوقت واحد پاگل بھی ہیں اور ہوشیار بھی۔

غرض اسلام کا مطلوب آج کل کی مادی راہوں کی معاشیات و سیاسیات قطعی نہیں۔ نہ حکومت و ثروت نفس دین کا کوئی ایسا مقصدی یا داخلی و عنصری رکن ہے۔ جس کے بغیر آدمی زمان و مکان کے کسی حال و مقام میں دین و انسانیت کے حقیقی کمالات کے حصول سے کسی درجہ میں محروم رہیں گے ہر حال و ماحول میں انسان صرف اپنی اختیاری وسعت و طاقت بھر ہی مسئول و مکلف ہے۔ اسی وسعت و طاقت کے اندر رہ کر وہ انسانی یا دینی کمالات کے بلند سے بلند مطالب و مقاصد کو پا سکتا ہے مطلب وہی ہے کہ نفس دینی کمال و مقصد کی تکمیل کے لیے جاہ و مال ثروت و سلطنت کے خارج از وسعت و اختیار امور کو فرد و جماعت کسی کے لیے بھی اسلام نے دین کا جز و کیا اس طرح کی شرط بھی نہیں ٹھہرائی ہے جیسی کہ وضو یا تیمم نماز کے لیے۔

---

[۱] (PERPLEXTIES OF ATOMIC AGE) (پانیر سنڈے ایڈیشن)

اور یہی راز معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا اصلی رُخ سیاسیات و معاشیات کی کسی خاص دعوت کے بجائے ہمیشہ "معادیات" کی طرف بلانے کا رہا۔ کوئی سیاسی و معاشی آئیڈیالوجی بالذات یا براہ راست کبھی انبیائی پیغام نہیں بنی ضمناً و ذیلاً جو کچھ معاشی و سیاسی ہدایات و احکام ملتے ہیں وہ بھی اصلاً معادی مصالح کے تحت اور وسائل کی حیثیت سے۔

اب آگے معاشیات و سیاسیات پر الگ الگ کچھ تفصیلی معروضات سے پہلے ایک بات کا اور خیال میں رہنا ضروری ہے کہ معاشیات و سیاسیات ہی پر موقوف نہیں اسلام کسی علم و فن کی بھی خالص علمی و فنی حیثیت سے تعلیم و تربیت دینے نہیں آیا ہے سارے ایسے علوم و فنون جو بواسطہ یا بلا واسطہ کسی نہ کسی طرح ہماری مادی و ناسوتی زندگی کے بقاء و تحفظ اور اس کے اسباب و تدابیر سے بحث کرتے ہیں ان کی تحقیق و تکمیل کے لیے ہم کو ایک خاص درجہ کی شعوری عقل و فہم اسی طرح خلقۃً عطا کردی گئی ہے جس طرح ادنیٰ سے ادنیٰ حیوانات کیڑوں مکوڑوں تک کو اپنے بقاء و تحفظ کی غیر شعوری جبلتیں (INSTINCTS) مذہب خصوصاً اسلام کا موضوع بحث براہ راست نہ اس ناسوتی زندگی کا بقاء و تحفظ ہے نہ اس کے اسباب و وسائل کی تعلیم و تکمیل۔ مادی زندگی کی احتیاجات و تدابیر سے اسلامی احکام و ہدایات کو فقط اسی حد تک سروکار ہے جس حد تک ان کا دین ——— یعنی انسان کی اصلی انسانیت یا انسانی زندگی ——— کے بناؤ بگاڑ سے تعلق ہے۔

جو لوگ دینداری کے زعم میں اسلامی معاشیات و سیاسیات پر اسی رنگ میں مضامین یا کتابیں لکھتے ہیں کہ آجکل کی خالص دنیا دارانہ معاشیات و سیاسیات کے مباحث و مسائل سے نفیاً یا اثباتاً ملا دینا چاہتے ہیں۔ وہ دانستہ یا نادانستہ دین کو بھی دنیا ہی بنا کر اسلام کے حق میں صرف نادان دوست کی دوستی کا حق ادا فرماتے ہیں۔ اچھے اچھے اہل علم و نیک نیت حضرات تک کی تحریریں اس غلو سے مشکل پاک ہوتی ہیں انتہا یہ کہ سرتاسر دنیاوی یا لادینی معاشیات و سیاسیات ہی کی رنگ برنگ دعوتوں (آئیڈیالوجیوں) کے مقابلہ میں دینی یا اسلامی معاشیات و سیاسیات کی بھی مستقل دعوتیں گڑھ گڑھ کر پیش کی جا رہی ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم معادیات کے دوش بدوش معاشیات و سیاسیات کی بھی کوئی خاص و مستقل دعوت حضرات انبیاء خصوصاً نبی الاسلام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے مقاصد میں داخل ہے حالاں کہ مقصد کے درجہ میں دینی یا انبیائی دعوت کا رخ تمام تر معادیات یا آخرت کی ابدی زندگی کے بناؤ بگاڑ کی طرف ہوتا ہے۔ قرآن نے اپنے نزول کی اصلی غرض و غایت اسی ابدی زندگی کے بگاڑ سے ڈرانے اور اسی کے بناؤ کی بشارت کو تبلایا ہے[1] کہ اس کتاب میں حیات آخرت کے بناؤ بگاڑ کے اعتبار

---

[1] الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب ولم یجعل لہ عوجا قیما لینذر باسا شدیدا من لدنہ ویبشر المؤمنین الذین یعملون الصالحات ان لہم اجرا حسنا ماکثین فیہ ابدا۔

المیۂ فلسطین کے بنیادی اسباب

از:- مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی

مترجمہ:- عتیق الرحمٰن سنبھلی

پیش نظر تقریر دمشق کی یونی ورسٹی جامعۂ سوریہ کے ہال میں کی گئی تھی، یونی ورسٹی کے وائس چانسلر قسطنطین زریق نے (جو ایک مشہور شامی عیسائی فاضل ہیں) اس کے لئے خصوصی دعوت نامے جاری کئے تھے اور شامی ریڈیو نے اعلان کیا تھا، اس موقع پر دمشق کے ممتاز اہل علم، اہل سیاست اور مختلف اسلامی و قومی اداروں کے ذمہ دار موجود تھے جن میں ڈاکٹر معروف الدوالیبی صدر پارلیمنٹ، استاذ محمد المبارک (رکن پارلیمنٹ و سابق وزیر) استاذ حومد (سابق وزیر) عمر بہاء الامیری سفیر شام اور یونی ورسٹی کے متعدد اساتذہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تقریر سے پہلے مشہور شامی عالم و ادیب شیخ محمد بہجۃ البیطار پروفیسر جامعہ سوریہ و رکن مجمع علمی نے مقرر کا تعارف اور ہندستان کی علمی و دینی خدمات کا اعتراف کیا تقریر کے بعد شیخ مصطفےٰ السباعی نے تائیدی کلمات کہے اور مقرر کا شکریہ ادا کیا۔

اس تقریر میں قضیۂ فلسطین اور اسکی ناکامی کے اسباب کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے حقیقی اسباب سے بحث کی گئی ہے اور بعض ایسے حقائق ظاہر کئے گئے ہیں جو عرب ممالک کے اہل فکر کو چونکانے والے ہیں، چونکہ یہ اسباب و حالات کچھ فلسطین سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ تمام اسلامی ممالک کی ناکامی اور عام کمزوری کے بنیادی اسباب ہیں، اس لئے اس کا ترجمہ مناسب سمجھا گیا کہ اس آئینہ میں دوسری مسلمان قومیں اور ممالک بھی اپنی صورت دیکھ سکتے ہیں۔

ادارہ

معزز حاضرین! اتفاق سے بلاد عربیہ میں میرا آنا ایسے وقت ہوا ہے کہ فلسطین کا قضیہ بالکل تازہ ہے۔ ہر شخص کی زبان پر اسی کا ذکر ہے، دماغوں پر وہی چھایا ہوا ہے اور وہی ہر مجلس کا موضوع بنا ہوا ہے ــــ اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ قضیہ اس سے بھی زیادہ ذکر و فکر کا مستحق ہے ــــ اس لئے کہ یہ ہماری عزت

کرامت کا معاملہ ہے، یہ ہمارے ایمان و عقیدے کا معاملہ ہے، یہ ہماری موت اور زندگی کا معاملہ ہے۔ جس عظیم امت کو اس قضیہ میں شکست کا سامنا کرنا پڑا اس کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے میں مجبور تھا کہ اس شکست کے واقعی اور بنیادی اسباب کا کھوج لگانے میں حصہ لوں اور واقعہ پر غور کرتے ہوئے اس کی تہہ میں پہنچنے کی کوشش کروں ـــــ میں نے تاریخ کی طرف رجوع کیا اور پھر ایک نظر فلسطین کے اس تازہ واقعہ پر ڈالی اور ایک نظر اس امت کی گزشتہ تاریخ کے اُن نازک مواقع اور خطرناک لمحات پر ڈالی جن سے یہ مظفر و منصور ہو کر گزرتی چلی آئی۔ اور اس کے بعد میں نے سوچا کہ ماضی اور حال میں آخر اسقدر زبردست فرق کیونکر رونما ہو گیا؟ اس غور و فکر اور تلاش و جستجو کے نتیجہ میں جو کچھ میں سمجھا ہوں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس علمی اور سنجیدہ بحث و فکر کے لئے جامعہ سوریہ جیسی یونی ورسٹی سے زیادہ موزوں مقام کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، کیونکہ جو نئی نسل اس میں پروان چڑھ رہی ہے اُسے یہاں سے باہر قدم نکال کر اس مسئلہ سے ضرور دوچار ہونا ہے۔

حضرات! قبل اس کے کہ میں اپنی فکر و جستجو کے نتائج آپ کے سامنے رکھوں ایک بات یہ عرض کر دوں کہ میں جن نتائج پر پہنچا ہوں وہ بعض حضرات کے لئے باعث تعجب بن سکتے ہیں اور اس موضوع پر بحث و فکر کے سلسلہ میں ہم جس اسلوب بحث اور جس طرز فکر کے عادی ہو گئے ہیں یہ نتائج اس سے ہم آہنگ بھی نہیں ہیں، لیکن ایک تاریخی امانت ہونے کی حیثیت سے ان کا حق ہے کہ میں انھیں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں اور درخواست کروں کہ آپ ان پر غور فرمائیں اور اگر وہ صحیح معلوم ہوں تو پہلی فرصت میں ان کے علاج کی طرف متوجہ ہوں۔

محترم حضرات! میرا خیال یہ ہے کہ ہماری شکست و نکبت کے اسباب ان اسباب سے بہت زیادہ گہرے اور پُرانے ہیں جن کی طرف عام طور پر اس موضوع سے بحث کرنے والوں کی نظر جاتی ہے۔ یہ اسباب فلسطین کے قضیہ سے بہت پہلے پیدا ہو چکے تھے اور برابر اپنا کام کر رہے تھے اور ان کے اثرات بھی عرصۂ دراز سے اُمت کے اندر رونما ہو رہے تھے اور اب اس قضیہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اسباب اپنا کام پورا کر چکے۔ اور اسی بنا پر اس قسم کے واقعات میں اُس شخص کے لئے حیرت و استعجاب کا کوئی پہلو نہیں ہے جس کی نظر پہلے ہی سے ان کے عوامل و اسباب پر ہو۔

حضرات! میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس مختصر سی تمہید ہی میں آپ کے چہروں پر علامت استفہام اُبھر آئی ہے اس لئے اب میں بغیر کسی تاخیر کے کہنا چاہتا ہوں کہ یہ اسباب اجمالی طور پر میرے نزدیک صرف تین ہیں۔

(۱) امت کے افراد میں ان نفسیاتی اور اندرونی محرکات کی کمزوری جو عقیدے اور اصول کی راہ میں جان

دیدینے کو مرغوب اور موت کو محبوب بنا دیتے ہیں۔

(۲) جذبات قلب پر عقل کی مطلق العنان حکومت یعنی موت سے کھیلنے اور خطرات میں کود پڑنے سے احتیاط۔

(۳) کسی ایسی شخصیت کا فقدان جس کے دل و دماغ پر فلسطین کا مسئلہ مستولی ہو جائے اور اسکی فکر اسکا اوڑھنا بچھونا بن جائے۔

اب میں انھیں تین باتوں کو علی الترتیب کچھ تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) کائنات کے قانونِ کشش سے ہم سب کچھ نہ کچھ واقف ہیں۔ اس قانون کا تقاضہ یہ ہے کہ جو چیز بھی از قبیل اجسام ہو وہ اپنے مرکز یعنی نیچے کی طرف کھنچے۔ یہ قانون بجائے خود مسلّم ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض قوتیں اس قانون کے عمل کو روک دیتی ہیں اور اجسام کو ان کے مرکز سے جدا کر کے اوپر اٹھا دیتی ہیں مگر کیا یہ یونہی اتفاقاً ہو جاتا ہے؟ جی نہیں! ایسا صرف کسی عارض کی وجہ سے ہوتا ہے، پھر جوں ہی وہ عارض ہٹتا ہے اس قانون کا عمل بحال ہو جاتا ہے اور جسم اپنی فطرت کے مطابق اپنے مرکز پر آ رہتا ہے، حضرات! بالکل یہی حال نفوس انسانی کا ہے کہ ان کی فطرت اور جبلت میں تو زندگی اور راحت کی محبت بھری ہوئی ہے اور انھیں کوئی چیز زندگی اور راحت کی برابر عزیز نہیں ہے یہ ان دونوں چیزوں کی طرف اس سے بھی زیادہ تیزی سے لپکتے ہیں جتنی تیزی سے پانی نشیب کی طرف بہتا ہے۔ لیکن یہاں بھی اگر کوئی زبردست عارض بیچ میں آجاتا ہے اور انکا رخ اس طبعی سیلان سے موڑ دیتا ہے تو پھر وہ زندگی سے بلند تر شئی کو زندگی پر ترجیح دینے لگتے ہیں اور انکی راہ میں مصیبت اور مشقت کو راحت اور سہولت سے زیادہ عزیز جانتے ہیں۔

بقائے دوام کی خواہش انسان کی ایسی فطری خواہش ہے جو انسان سے کبھی جدا نہیں ہوتی بلکہ شاید یہ اسکی جبلی خواہشات میں سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ واضح خواہش ہے اور یہی اسکی وہ کمزور رگ ہے جس کو اس کے ازلی دشمن نے خوب بھانپ لیا تھا اور حضرت ابو البشر سے اپنی رسوائی کے انتقام کے لئے آلۂ کار بنایا تھا اس نے جونہی حضرت آدم علیہ السلام سے کہا هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (کیا میں تمھیں ہیشگی کی خاصیت کا درخت بتلا دوں اور ایسی بادشاہی جس میں کبھی ضعف نہ آئے)

حضرت آدم کی اسی بشری فطرت نے آپ کو اس مردود ازلی کے دام فریب میں پھنسا دیا۔ اور یہ جو بڑی بڑی عالیشان تاریخی عمارتیں اور تعمیری یادگاریں ہیں، یہ سب کیا ہیں؟ انسان کی اسی فطرت کا مظہر اور اس کے گوناگوں مطالبات کا جواب ہی تو ہیں، جیسا کہ حضرت ہود علیہ السلام کا یہ ارشاد بتاتا ہے اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝ (کیا تم ہر بلند جگہ پر اپنی نشانیاں قائم کرتے ہو

کیا بے کار کام کرتے ہو۔ اور کارخانے قائم کرنے میں اس طرح منہمک ہو جیسے کہ تم کو ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔)

حاضرین کرام! انسان کی پوری تاریخ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ حیات اور اسباب حیات کے لئے لگاتار تگ و دو کی! بقائے دوام سے محبت کی! تنعم اور خوش عیشی کے اسباب کی پیہم جستجو کی! اور راحت و خوشحالی کی مسلسل تلاش کی کہانی ـــــ یہ تاریخ ایک مسلسل تنازع اور کشمکش کی تاریخ ہے جو زندگی اور اسکی راحتوں کے لئے انسان اور انسان کے درمیان ہمیشہ سے بپا ہے۔ مگر ہاں بیچ بیچ میں کہیں کچھ طویل اور مختصر وقفے ایسے بھی ملتے ہیں جہاں انسان کچھ دوسرے قسم کے مقاصد کی طرف متوجہ، ان کا شیدا اور ان کی راہ میں ہنسی خوشی جان دیتا ہوا نظر آتا ہے بلکہ جس سرگرمی کے ساتھ اُسے عام زمانوں میں زندگی کے لئے سرگرداں دیکھا جاتا تھا، ان درمیانی وقفوں میں وہ اسی شوق اور ولولہ کے ساتھ موت کا جویا نظر آتا ہے۔ زندگی کے وہی حریص انسان ان وقفوں میں بلند مقاصد کی خاطر موت پر اس وارفتگی کے ساتھ گرتے نظر آتے ہیں جیسے پروانے روشنی کے عشق میں شمع پر! اور موت کے مواقع کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی ایسی کوشش کرتے نظر آتے ہیں، جیسے کبھی مال و اولاد میں بڑھنے کے لئے کیا کرتے ہیں۔

یہ کون سے زمانے ہیں؟ یہ وہ زمانے ہیں جن میں کچھ ایسی شخصیتیں پائی گئیں جنھوں نے کچھ اعلےٰ حقائق انسانوں کے سامنے پیش کئے اور انسان نے ان کو اسی طرح مان لیا جس طرح ان سے پہلے زندگی کو ایک حقیقت جان کر مان لیا تھا اور یہ حقائق بھی اسی طرح محبوب ہو گئے جیسے زندگی محبوب تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ محبوب ہو گئے کیونکہ یہ حقائق زندگی کے مقابلہ میں بدرجہا گرانقدر حقائق تھے، اسی وجہ سے انسان نے اپنی زندگی اور زندگی کا قیمتی ـــ یہ قیمتی سرمایہ ان حقائق کی راہ میں لٹا دیا اور بالکل بے وقعت پانی کی طرح بہا دیا ـــــ ورنہ کہاں انسان اور کہاں یہ ایثار؟ اسکی تو فطرت ہی یہ ہے کہ وہ کسی چیز کو جبھی ترک کر سکتا ہے جب اسکے مقابلہ میں دوسری چیز اس سے زیادہ محبوب اور زیادہ وقیع ہو۔ وہ اپنی زندگی کو جبھی مٹا سکتا ہے اور مال و اولاد کو جبھی قربان کر سکتا ہے جب جان سے زیادہ پیاری اور مال و اولاد سے زیادہ محبوب کوئی چیز اس کے سامنے آجائے۔

طبائع بشری میں اتنا بڑا انقلاب کر دینے والی یہ شخصیتیں انسان کی حب بقا اور حب دوام کی خواہش کو ایک دوسری دنیا کی طرف پھیر دیا کرتی ہیں جو اس جہان فانی سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور جس کی ابدی زندگی انسان کی فطرت حریص کے لئے اس دنیا کی محدود و مقید زندگی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ موزوں ہے۔ یہ عظیم المرتبت شخصیتیں روح اور غیب کے مجرد و مستور حقائق کو اپنے یقین اور انداز بیان سے اس طرح نگاہوں کے سامنے لا کھڑا کرتی ہیں کہ زندگی کی مدتوں پرانی قبضہ گیر طاقتیں یعنی جسمانی لذتیں اور جی کی چاہتیں اپنی جڑوں سے ہل جاتی ہیں اور آدمی کے نفس اور اسکی روح پر اصل تسلط ان غیبی اور روحانی حقیقتوں کا ہو جاتا ہے

علیٰ ہذا ان حقائق کے سامنے مادیات و محسوسات کا وجود بلکل ماند پڑ جاتا ہے اور ان ان دیکھے حقائق کا وجود آدمی کو ان مادیات و محسوسات سے زیادہ واضح او یقینی محسوس ہونے لگتا ہے، اس بنا پر ہزاروں بشری نفوس ایسے اعتقاد اور یقین کے ساتھ ان مستور حقائق پر جھک پڑتے ہیں جو مادیات و مشاہدات اور تجربات کے ایمان و یقین سے بدرجہا زیادہ پختہ اور گہرا ہوتا ہے اور غیبی حقائق کی راہ میں موت کی ایسی حرص ان مومنین میں نظر آنے لگتی ہے کہ شاید زندگی کے پرستار زندگی کے لئے کبھی ایسے حریص نہ ہوتے ہوں گے ــــــ یہ انقلابی شخصیات جن کا ذکر ہو رہا ہے حضرات انبیاء علیہم السلام کی شخصیات ہیں اور یہ وقفے انسانی تاریخ کے وہ لمحے ہیں جن میں نبوت آیا کی اور ایمان بالغیب پھیلایا گیا اور وہ روشنیاں ہیں جو تاریخ کے صفحات پر بکھری پڑی ہیں، آپ دیکھیں گے کہ ان کے چاروں طرف سیاہی کے بادل محیط ہیں، یہ وہ آگے پیچھے کی جاہلیتیں ہیں جن کے درمیان اُن کا نور چمکتا ہے۔

تاریخ کے ان وقفوں میں سب سے زیادہ طویل، سب سے زیادہ اثر انداز، سب سے زیادہ محیر العقول اور تاریخ پر سب سے گہرے نقوش چھوڑنے والا وہ وقفہ ہے جو سیدنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے وجود میں آیا، یہ وقفہ ایک تاریخی موڑ ہے جس نے انسانیت کے ذوق، اسکی خواہشات اور رجحانات میں ایک عظیم تغیر اور انقلاب برپا کر دیا۔ اس وقفہ تاریخ میں انسان پر یہ حقیقت کھلی کہ "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" اور اسکی منزل اس حیات فانی سے بہت بلند اور بہت آگے ہے اس لئے جب تک اس وقفے کے اثرات کام کرتے رہے زندگی کا یہی حریص انسان اپنی منزل مقصود کی دُھن میں زندگی کو اس طرح ٹھکراتا ہوا چلتا رہا جس طرح جواہرات کی جستجو میں نکلنے والا راستے کے سنگریزوں اور کنکریوں کو ٹھکراتا ہوا چلا جاتا ہے، اسی وقفہ میں لوگ ایک ایسی زندگی سے روشناس ہوئے جو فی الحقیقت زندگی کہلانے کی مستحق ہے کیونکہ اس پر نہ فنا طاری ہو سکتی نہ زوال آسکتا ہے اور نہ کوئی خوف و غم اس زندگی میں آدمی کو ستا سکتا ہے۔ شہادت کی موت گو اس زندگی میں حصہ پانے کے لئے شرط نہیں مگر چونکہ وہ ایک ایسا پُل ضرور ہے جو آدمی کو اس تک بلا روک ٹوک پہنچانے میں کبھی خطا نہیں کرتا۔ اس لئے جیسے ہی لوگوں پر یہ حقیقت کھلی اس پُل کو پار کرنے کے لئے دوڑ پڑے اور اس پُل سے گزر جانے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ـــــ پھر نتیجہ؟ اپنی اپنی قسمت کے مطابق فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ۔ وہ لوگ اس حقیقی زندگی کے محل یعنی جنت کے شوق کی زندہ تصویر بن گئے تھے، اسکے اشتیاق نے رگ رگ میں ایسی خلش پیدا کر دی تھی کہ اس دنیاوی زندگی کی ایک ایک گھڑی ان پر گراں تھی، سیدنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ایک موقع پر جب یہ پکار بلند ہوئی کہ :-

قُوْمُوْا اِلٰی جَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۔ (اُٹھ کھڑے ہو اس جنت کی طرف جس کا عرض زمین اور آسمانوں کی برابر ہے۔) تو انھیں میں کے ایک مست شوق عُمیر بن الحمام انصاری جو اس وقت چند چھوارے ہاتھ میں لئے ہوئے کھا رہے تھے بیتاب ہو گئے اور چھوارے یہ کہہ کر پھینک دئے کہ "میں ان کو کھا چکنے کا انتظار نہیں کر سکتا اسمیں تو بڑی دیر لگے گی" یہ کہا اور اسلحہ سنبھال کر دشمن کی صفوں میں جا گھسے اور خاک و خون میں تڑپتے ہوئے شہادت کے پُل سے گزر گئے۔ اسی طرح ایک اعرابی شخص آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہے اور اپنے حلقوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں اس جگہ تیر کھانے کی بیعت کر رہا ہوں" کیوں ــــ ؟ تاکہ شہادت کے پُل سے گزر کر ایک دم جنت میں پہنچ جاؤں۔ کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے ان کے شوق جنت کا کہ کس طرح رگ رگ میں سما گیا تھا۔ آنحضرتؐ کے ایک بوڑھے صحابی عمروؓ بن الجموحؓ جو غیر معمولی طور پر لنگ سے معذور تھے ان تک کو بھی اس مئے شوق نے ایسا مست کر دیا تھا کہ اس معذور اور بوڑھے جسم میں بھی ولولۂ شہادت کی برق کوندنے لگی تھی انھیں معلوم ہوا کہ حضورؐ عزم جہاد فرما رہے ہیں تو ہمرکابی کا تہیہ کر لیا وقت آیا اور ان کا ارادہ دیکھا تو جوان جوان بیٹے جو جہاد میں جا رہے تھے اُنھوں نے روکنا چاہا اور کہا کہ ہمارا جانا آپ کی طرف سے بھی کافی ہے۔ نہیں مانے۔ بات حضورؐ تک پہنچی، حضورؐ نے بھی بیٹوں کی تائید فرمائی اور علاوہ ازیں یہ بھی فرمایا کہ تم تو معذورین میں سے ہو جہاد تمھیں معاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف ہے۔ حضورؐ کے اس ارشاد پر بچوں کی طرح مچل گئے۔ بڑے اصرار سے بار بار اجازت چاہی، صرف اس آرزو کو پورا کرنے کے لئے کہ شہادت نصیب ہو جائے اور میں اپنے اس لنگ کے ساتھ جنت میں چلوں پھروں، چنانچہ غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے اور شہادت پائی۔

پھر یہ نشہ صرف بڑوں ہی پر نہیں چڑھا ہوا تھا بلکہ ان کے وہ بچے بھی اس میں چور تھے جن کی عمر کھیل کود میں مگن رہنے اور خطرات سے دور رہنے کی تھی۔ عُمیر بن ابی وقاص انھیں نونہالوں میں سے تھے جو ایک غزوہ کے موقع پر اسلامی فوج کی صفوں میں اِدھر سے اُدھر چھپتے پھرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضورؐ دیکھ پائیں اور کم عمری کی وجہ سے واپس کر دیں، اتفاق سے اس حالت میں ان کے بڑے بھائی سعد بن ابی وقاص کی نظر ان پر پڑی، انھوں نے کہا عُمیر کیا بات ہے کیوں اِدھر سے اُدھر چھپتے پھر رہے ہو؟ کہا بھائی میرا جی تو شہادت کے لئے بیچین کئے ہوئے ہے اس لئے میدان جنگ میں جانا چاہتا ہوں لیکن ڈر یہ ہے کہ کہیں حضورؐ نے دیکھ لیا تو واپس کر دیں گے کہ تو ابھی بچہ ہے بس اس لئے چھپتا پھر رہا ہوں کہ حضورؐ کی نظر مجھ پر نہ پڑے اور کسی طرح فوج کے ساتھ مدینے سے نکل جاؤں، مگر ایک مرتبہ حضورؐ کی نظر عُمیر پر پڑ گئی اور وہی ہوا جس کا عُمیر کو خطرہ تھا، یعنی حضورؐ نے کم عمری کے پیش نظر فوج میں جانے سے

منع فرمایا مگر ع:۔ یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے
انھوں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا، آنسوؤں کے معصوم قطرے اس معصوم کی سفارش کے لئے حضورؐ کے قدموں میں گر پڑے۔ بچوں کے اس سفارشی کی سفارش عام طور پر بہت کم رد ہوا کرتی ہے پھر حضورؐ جو شفقت اور نرم دلی میں دنیا کے لئے نمونہ تھے کیسے اس سفارش کو رد فرما دیتے، چنانچہ عُمیر کو اجازت مل گئی، عُمیر کے بچپن کا کیا حال تھا اس سے اندازہ فرمائیے کہ ان کے بھائی نے جب انکی کمر میں تلوار لگائی تو پرتلہ ان کے چھوٹے سے جسم پر فٹ نہ آسکا اور اس میں گرہ لگانی پڑی، الغرض گئے اور شہادت سے سُرخرو ہوئے۔

ایک دوسرے نوعمر کا شوق شہادت ذرا ملاحظہ فرمائیے! یہ صاحبزادے رافع بن خدیج ہیں، سن ابھی پورے پندرہ کا بھی نہیں ہے، قد و قامت سے بھی کم عمری عیاں ہے مگر شہادت کا شوق کہ پنجوں کے بل کھڑے ہو جاتے ہیں تاکہ لوگوں کو کم عمری کا احساس نہ ہو اور فوج کے ساتھ نکلنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے لیکن ان بلوں سے کہیں بچپن چھپ سکتا ہے۔ حضورؐ انھیں دیکھ کر واپس کر دیتے ہیں۔ اب واقعہ کی نوعیت اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بنجاتی ہے۔ باپ اُٹھتا ہے اور اپنے لخت جگر کے لئے سفارش کرتا ہے کہ حضور اس کو جانے دیں! اللہ اللہ! کیا منظر ہے۔ باپ! اور جنگ کا کھیل کھیلنے کے لئے بچے کی سفارش!! زمین و آسمان شاید حیرت سے منھ تک رہے ہونگے ___ آخر اجازت مل گئی اور رافع مسرت سے جھوم اُٹھے۔ پاس ہی رافع کے ہمجولی سمرۃ بن جندب کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے، رافع کو جو اجازت ملتی دیکھی تو رہا نہ گیا۔ حضورؐ سے عرض کیا اگر آپ انھیں ساتھ لیجا رہے ہیں تو مجھے بھی لیجانا پڑیگا، میں ان سے زیادہ طاقتور ہوں، چاہے آپ کشتی کرا کے دیکھ لیجئے، حضورؐ نے فرمایا اچھا بھئی لڑو، کشتی ہوتی ہے اور سمرہ رافع کو پچھاڑ دیتے ہیں، چنانچہ پھر انھیں بھی مجاہدین کی صف میں کھڑے ہونے کی اجازت دینی پڑتی ہے۔

ذرا خیال فرمائیے! ایک طرف یہ کمسن ہیں جو جنگ میں شریک ہونے کیلئے طرح طرح کے حیلے اور تدابیر کام میں لاتے ہیں اور زخم کھانے اور لہو بہانے میں ایک بچہ دوسرے بچے سے آگے رہنا چاہتا ہے اور دوسری طرف ہمارے آج کے کمسن ہیں جو آج کے ایسے دور میں بھی کہ جسمانی سزا و تادیب ممنوع قرار دیدی گئی ہے، مدرسہ جانے سے جی چراتے ہیں، پھر میدان کارزار کا تو ذکر ہی کیا ___! یہ بچے جانتے ہیں کہ اسکول میں ان پر کوئی مصیبت نہیں ٹوٹے گی، مار پیٹ نہیں ہو گی بلکہ صرف کچھ لکھنا پڑھنا اور اس کے ساتھ دلچسپی اور تفریح کے لئے مختلف قسم کے کھیل! مگر پھر بھی اسکول کے نام سے ان کی روح گھبراتی ہے۔ اس کے برعکس وہ بچے جانتے تھے کہ میدان جنگ کیا ہوتا ہے وہ جانتے تھے کہ اس فیلڈ میں گیند بلے سے نہیں شمشیر و سناں سے کھیلا جاتا ہے، مگر اس جاننے کے باوجود از خود وہاں جانا چاہتے تھے اور کوئی روکتا تھا تو مچل جاتے تھے ___ حضرات اساتذہ وعلماء! میں آپسے دریافت کرتا

چاہتا ہوں کہ کیا آپ اپنے وسیع تر علم و مطالعہ کے باوجود انسانی تاریخ کے کسی دور میں اور کسی دور میں اس خاص دور ایمانی کے بچوں، اسکے نوجوانوں اور اسکے بوڑھوں کی کوئی مثال کہیں پاتے ہیں، جنگ کی آگ میں کودنے کے لئے مسابقت کے اس جذبہ کی کوئی نظیر آپ کو ملتی ہے؟ زندگی کی ایسی بے وقعتی اور موت پر انسان کی یہ جسارت تاریخ کے کسی دور میں بھی دیکھنے میں آتی ہے؟

یہ ہے وہ ناقابل تسخیر قوت، جو رسالت کی تعلیمات نے اہل عرب میں پیدا کردی تھی اس قوت کے ساتھ جب وہ ایک بار اُٹھے تو پورے عالم کو زیروزبر کر ڈالا اور ایک نصف صدی کے عرصہ میں نصف دنیا پر تسلط جما لیا، اس قوت کے بل پر انھوں نے ایسی ایسی سرکش اور طاقتور قوموں کو زیر کیا جنھیں ان کی تنہا جنگی قوت زیر نہیں کرسکتی تھی یہی وہ قوت تھی جس کے سامنے روم و ایران نے اپنی جنگی قوت کی ہزار دس گنا زیادتی کے باوجود گھٹنے ٹیک دئے، یہی قوت تھی جس نے مغرب میں بربر، مشرق میں ترک و افغان اور علاقہ سندھ میں جاٹوں اور ٹھاکروں کو عربوں کے سامنے جھکنے پر مجبور کردیا، حالانکہ صدیوں سے کوئی بڑے سے بڑا فاتح ان کے غرور و قوت کو ٹھیس نہ لگا سکا تھا اور شکست و ہزیمت کے الفاظ ان کے لغت سے محو ہو چکے تھے لیکن عربوں کے مقابلہ میں ان سب کا غرور پاش پاش ہوا۔ کیوں؟ اس لئے کہ عرب لڑتے تھے شہادت کی آرزو میں اور یہ قومیں لڑتی تھیں زندگی کی ہوس میں! اور ایسے دو حریفوں کا مقابلہ کیا جن میں سے ایک تو لڑتا ہو اس لئے کہ موت آجائے اور دوسرا لڑتا ہو اس لئے کہ جان بچ جائے ایک موت کو گلے لگانے کے لئے لپکتا ہو، دوسرا اسکے سایہ سے بھی اپنے کو دور رکھنے کی کوشش کرتا ہو۔ ایک نے محض شہادت اور جنت کی طلب میں تلواروں کی چھاؤں اختیار کی اور دوسرے نے اپنی زندگی اور اسکی لذتوں کی حفاظت کے لئے تلوار اُٹھائی ہو وشتان مابینھما۔ بس یہی فرق تھا جسکی وجہ سے عرب اپنے حریفوں پر ہر معرکہ میں غالب رہے کیونکہ فتح و شکست کا یہ اٹل قانون ہے کہ جو زندگی کو ہیچ سمجھتا ہے اور موت کے خطرے کو خاطر میں نہیں لاتا وہ جیتتا ہے اور جسے زندگی پیاری ہوتی ہے وہ ہمیشہ مات کھاتا ہے۔

بہرحال عربوں کی اصلی طاقت یہ تھی، اس طاقت کا سرچشمہ اور خزانہ رسالت کی سب سے پہلی تعلیم (ایمان) ہے۔ یہ ایمان انسان کو خواہش پرستی، حرص زندگی اور خوفِ موت کی پستیوں سے اٹھا کر زندگی کی بے وقعتی اور طلب شہادت کی بلندیوں پر جا رکھتا ہے۔ اس ایمان نے عربوں کی اس بشری طبیعت کو پوری طرح مغلوب اور بے اثر کردیا تھا جو ہمیشہ طول حیات کی حریص، موت سے گریزاں اور راحت پسند رہتی ہے۔

لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ عربوں کی اس ممتاز معنوی قوت میں انحطاط آتا گیا اور اگلی اُمتوں کی مہلک بیماریاں، زندگی کی ہوس، راحت کی طلب اور خواہشات کی پرستش ـــــ ان میں رفتہ رفتہ گھسنا شروع ہوگئیں۔ اسی انحطاط معنوی کے دور میں انھوں نے عجمی تہذیب کے اثرات کو قبول کرنا شروع کیا، اس تہذیب نے

انھیں اور تو کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو لیکن شہسواری اور مردانگی کا وہ جوہر ان سے ضرور چھین لیا جو مدتوں سے ان کا طغرائے امتیاز تھا، اسی تہذیب کے زیر اثر انکی سادگی اور جفاکشی کی وہ قومی خو بھی مٹ گئی جو چھٹی صدی عیسوی کی مریض اور مضمحل قوموں کے مقابلہ میں ان کے ایک زبردست معاون کی حیثیت رکھتی تھی اور اس خو کی جگہ تنعم، تصنع اور نزاکت نے لے لی، پھر اب آخر میں آکر مغربی تہذیب اور اس کا مادی فلسفہ حملہ آور ہوا۔ اس آخری حملہ نے انھیں حیات چند روزہ کی تقدیس اور مادہ کی مبالغہ آمیز توقیر کا مرض لاحق ہوا اور اس مرض سے زندگی کو خطرات میں ڈال دینے اور اُدھار کو نقد پر ترجیح دینے کے پُر جوش جذبات سرد ہو گئے۔

اب ایک طرف تو یہ انحطاط اور انحلال ان میں آیا اور دوسری طرف ایمان کی جگہ ایسی کوئی اور چیز نہ لے سکی جو ان میں بلند نظری اور عالی ہمتی کو قائم رکھتی اور شیرازہ قومی کی حفاظت کرتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بالکل ہی خالی رہ گئے نہ دلوں کو گرمانے والا ایمان تھا نہ جمعیت اور وحدت کو قائم رکھنے والی کوئی ٹھوس بنیاد تھی اور نہ کوئی ایسا بلند نصب العین تھا جس کے حصول کا خیال شہوات نفس کی بدمستیوں کو قابو میں کئے رکھتا۔

اس کے برعکس خالص مادہ پرست اقوام گو ایمان سے تو سرتاسر محروم تھیں مگر انھوں نے اپنی زندگی کو بالکل بے اساس اور بے مقصد نہیں رکھا بلکہ کسی نظریاتی اساس سے وابستہ کر کے ایک مطمح نظر اور نصب العین متعین کر لیا جس کے حصول کی فکر نے ان کی جمعیت کو ایک لڑی میں پرو دیا اور افراد کی متصادم خواہشات و اغراض پر بڑی حد تک کنٹرول کر لیا۔ اس لئے اب بجائے عربوں کے ان قوموں میں مرمٹنے کا حوصلہ پیدا ہوا، یہ اپنے مقاصد کی خاطر بے تکلف قربانیاں کرنے لگے، انھوں نے اپنے اندرونی نزاعات و اختلافات کو پس پشت ڈال دیا، نصب العین کی لگن نے انھیں چھوٹی چھوٹی باتوں، من و تو کے جھگڑوں اور پست اغراض سے بالاتر بنا دیا، غرض کہ ان اجتماعی مقاصد کے مقابلہ میں ہر اعلیٰ سے اعلیٰ اور ہر قیمتی سے قیمتی حتیٰ کہ جان عزیز بھی ان کی نظر میں کم قیمت ہو گئی، ان اجتماعی مقاصد اور عزائم نے ان کے دل و دماغ اور شعور و ادراک پر اس طرح قبضہ کیا کہ باوجود بعض نقائص کے یہی ان قوموں میں ایک تازہ قوت اور ایک نئی روح دوڑانے والا ایمان و عقیدہ بن گئے، یہ ایمان اگرچہ اس ایمان کے مقابلہ میں تو کمزور ہوتا ہے جو تعلیمات نبوی کی گہری بنیادوں پر قائم، آخرت کی فکر پر مرکوز ہو اور دلوں کے بیچ میں جگہ پکڑ لے، لیکن اس مؤخر الذکر ایمان کی اگر صرف بے جان اور بے روح صورت باقی رہ جائے تو پھر اول الذکر کا نیاپن اور اسکی تازگی ضرور اس کو شکست دیدیتی ہے اور ان مادہ پرست قوموں کا نظام زندگی باوجود ایمان و تقویٰ سے ناآشنا ہونے کے اس نام کی اسلامی زندگی پر غالب ہو رہا ہے جس کا کوئی مقصد اور کوئی پیغام نہیں، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں وہ اغراض و خواہشات کی زندگی ہے، اختلافات و مناقشات کی زندگی ہے۔ شخصی حرص و طمع اور چیرہ دستیوں کی زندگی ہے۔ بغض و حسد اور

کینہ وعناد کی زندگی ہے، فوضویت اور انتشار کی زندگی ہے۔

حضرات محترم! فتح وظفر نہ سامان جنگ اور اسلحہ کی بہتری اور برتری پر موقوف ہے، نہ جنگی چالوں میں دشمن سے زیادہ ماہر اور پروپیگنڈے کے فن میں طاق ہونے پر موقوف ہے!! اس کا اصل دار و مدار اس پر ہے کہ اپنے بنیادی عقائد کے حق اور نصب العین کے صحیح و اجب الحصول ہونے کا یقین و ایمان دشمن سے زیادہ ہو، دلوں میں مقصد کی لگن اور تڑپ دشمن سے زیادہ ہو، اصول اور نصب العین کی خاطر مٹنے کا جذبہ دشمن سے زیادہ ہو۔ لڑنے اور مرنے پر ابھارنے والے اندرونی محرکات دشمن سے زیادہ تیز اور طاقتور ہوں لیکن افسوس یہ ہے کہ فتح وظفر کی یہی شرط ہم میں مفقود ہو گئی ہے، جہاد وایثار کی روح ہم میں مضمحل ہے۔ ہمارے دلوں میں جو اس کی جڑیں تھیں وہ سوکھ گئی ہیں، عرصۂ دراز سے ان کو غذا پہنچانے اور پانی دینے کا کام بند پڑا ہوا ہے۔

بس اب سب سے اہم اور سب سے مقدم کام یہ ہے کہ ان سوکھی ہوئی جڑوں میں اگر کوئی رمق باقی ہو تو ان کی سیرابی کا انتظام کیا جائے ورنہ نئے سرے سے اس روح کو پیدا کرنے کی کوشش کی جائے خواہ ہمیں کتنی ہی مشکل کیوں نہ پیش آئے اور کیسی ہی بڑی سے بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے، کیونکہ اس روح کا سرد پڑجانا اُمت کے حق میں ایک زبردست خطرے اور خسارے کی علامت ہے اور خدانخواستہ اس کا خاتمہ! یہ تو فلسطین اور اندلس کے سانحہ سے بھی شدید تر سانحہ ہوتا ___ لا قدر اللہ ___ ایثار و قربانی پر اُبھارنے والی یہ روح اگر ہم میں محفوظ ہو تو پھر نہ کسی خوف کی ضرورت ہے اور نہ اندلس و فلسطین پر حسرت کرنے کی، اس لئے کہ اس روح کے ساتھ اگر صحیح رہنمائی اور پُرعزم قیادت بھی اُمت کو میسر آجائے تو ہارے ہوئے میدان جیتے جاسکتے ہیں اور چھنی ہوئی متاع واپس لی جاسکتی ہے لیکن اگر یہ روح اور یہ طاقتور محرکات ہمارے اندر سے نکل گئے ___ جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل محنت، حکیمانہ تربیت، منفرد شخصیت اور پیغمبرانہ تعلیم کے ذریعہ سے پیدا کیا تھا ___ تو پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم اپنا راس المال بھی کھو بیٹھے، زندگی اور قوت کے خزانے کی کنجی ہمارے ہاتھ سے نکل گئی اور کھوئے ہوئے کی واپسی کے خواب دیکھنے کے بجائے اب بچے کھچے ہی کی خیر منانی چاہیئے۔

لیکن واضح رہے کہ یہ کام جنگ کے زمانہ میں کرنے کا نہیں ہے، جنگ کا زمانہ تو ان محرکات کی پکی ہوئی فصل کاٹنے کا ہوتا ہے نہ کہ بونے اور سینچنے کا، پس جس نے بونے کے وقت پر بویا نہیں سینچنے کے وقت پر سینچا نہیں وہ کاٹنے کے وقت پر کاٹے گا کیا؟ آج ہمیں ضرورت ضرور ہے کہ ان محرکات کی فصل ہمارے سینوں میں پکی کھڑی ہو۔ لیکن ایسا ممکن کب ہے؟ جب کہ ہم نے اس فصل کو تیار کرنے کی کوشش نہیں کی اور دل کی زمین ___ جس میں یہ فصل پیدا ہوتی ہے ___ کی، ایک مدت سے دیکھ بھال چھوڑے ہوئے (باقی صـ۴۱ـ پر)

ڈیڑھ مہینہ پاکستان میں

(محمد منظور نعمانی)

آج کا ہندوستان و پاکستان اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے بس ایک ملک (ہندوستان) تھا، ملک کے کسی باشندہ کیلئے کسی جگہ کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی ــــ اب یاد بھی نہیں کہ اس زمانہ میں کتنی دفعہ اُن علاقوں میں آنا جانا ہوا جو اب پاکستان بن گئے ہیں، اور جہاں ہم ہندوستانیوں کا جانا، یا وہاں کے دوستوں کا ہندوستان آنا، اب مصر و شام اور عرب و عراق کے سفر سے بھی زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ پہلے اپنے وطن کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے شہریت کی سند اور سفر کا اجازت نامہ (نو ابجکشن) حاصل کرنا، پھر دوسکر ہائی کمشنر کے دفتر سے پرمٹ بنوانے کے لئے ہفتوں اور کبھی کبھی مہینوں دوڑ دھوپ کرنا، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کے خیال ہی سے ہم جیسوں کی طبیعت ہمت ہار کے بیٹھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہوئی کہ باوجود اپنی دلی خواہش اور دوستوں کے تقاضوں کے پاکستان بننے کے بعد سے اب تک اس سفر کی ہمت نہیں کی جاسکی ــــ جنوری میں بعض ضروری کاموں کے تقاضے نے مجبور کیا کہ اس ہفت خواں کو کسی طرح طے ہی کیا جائے۔ پھر جب ارادہ کر لیا گیا تو اللہ کے فضل و کرم نے سارے قانونی مراحل بھی آسانی سے اور کم سے کم وقت میں طے کرا دیے، اور ۹ر فروری کو یہ عاجز بمبئی سے بحری جہاز سے روانہ ہو کر ۱۱ر فروری کو کراچی جا پہونچا، اور پھر ۲۶ر فروری تک پورے ۱۹ دن کراچی ہی میں قیام رہا ــــ اس کے بعد یکم مارچ سے ۱۰ر مارچ تک سندھ، پنجاب اور سرحد کے بعض اور مقامات پر بھی ایک ایک دو دو دن کے لئے جانا ہوا، اور ۱۹ر مارچ کو پھر کراچی واپس آ کے ۲۵ر مارچ کی شب میں وہاں سے روانہ ہو کر اسی رات میں دہلی آگیا۔ اس سفر کے کچھ واقعات اور احساسات و تأثرات اپنے اُن ناظرین کی خدمت میں بھی پیش ہیں، جو الفرقان میں میرے اس سفر کی اطلاع پڑھنے کے بعد سے اس کے منتظر ہوں گے ــ اس ڈیڑھ مہینہ میں سے چونکہ پورے ۲۵ دن کراچی میں قیام رہا، اسلئے واقعات اور احساسات کا جو حصہ حوالۂ قلم کر رہا ہوں ان کا زیادہ تر تعلق کراچی ہی سے ہے۔

کراچی میں تبلیغی کام: ــ اپنا تبلیغی کام (یعنی مسلمانوں میں ایمانی رُوح اور ایمانی زندگی پیدا کرنے کی جدوجہد)

جیسی ہونی چاہیئے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے پاکستان بننے کے بعد جیسے مواقع یہاں دئے ہیں اس کے لحاظ سے تو یہ کام یہاں بہت کم ہے لیکن ایک چیز ہے جو مستقبل کے بارے میں امید بندھاتی ہے اور گونہ اطمینان دلاتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ کے چند مخلص بندے اس راہ میں ایسی مخلصانہ محنتیں اور قربانیاں کر رہے ہیں جن سے ہم جیسوں کو عبرت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی کریمی سے یہ امید ہوتی ہے کہ وہ اپنے ان بندوں کی محنتوں کو ضرور بارآور فرمائیں گے ۔ ان میں سے اکثر ملازمت پیشہ ہیں بعضے خاصی بڑی تنخواہیں پانے والے بھی ہیں۔ غالباً بعض تاجر بھی ہیں اللہ تعالیٰ ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے اور ان کی محنتوں کو بارآور کرے۔ ان میں سے بعض کا حال تو یہ ہے کہ کراچی میں رہتے ہوئے ہفتوں گھر جانے کا ان کو موقع نہیں ملتا مکی مسجد (جو یہاں کے تبلیغی کام کا مرکز ہے اور جو پاکستان کے کام کے لئے گویا نظام الدین کی بنگلہ والی مسجد ہے بلکہ خستہ حالی اور بے سروسامانی میں جو اس سے بھی کچھ آگے ہے) اسی کا متعلقہ صحن گویا ان دوستوں کا صُفّہ ہے۔ رات کو وہیں جمع ہو کر مشورے اور دینی تقاضوں کے متعلق سوچ بچار کرتے ہیں پھر وہیں پڑکے سو جاتے ہیں۔ نماز فجر کے بعد پھر کچھ تشکیلیں اور تجویزیں کرتے ہیں پھر وہیں سے اپنے اپنے دفتروں یا دکانوں پر چلے جاتے ہیں اور دفتروں سے فارغ ہو کر پھر سیدھے وہیں آجاتے ہیں۔ دونوں وقت کا کھانا بھی ان کے گھروں سے مکی مسجد ہی پہنچتا ہے اور باہر سے آئے ہوئے تبلیغی سلسلہ کے مہمان روزانہ ان کے مہمان اور شریک طعام ہوتے ہیں۔ فی الحقیقت بڑی قابلِ رشک ہے ان کی زندگی بعض دوستوں کے متعلق معلوم ہوا کہ کبھی کبھی ان کو گھر کی صورت دیکھے مہینہ سے اوپر ہو جاتا ہے اور ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ اگر دین کی راہ میں تکلیفیں اُٹھانے کے اس ذائقہ کو انھوں نے چکھا نہ ہوتا تو شاید غریبوں سے بات کرنا اور نماز کے لئے مسجد میں آنا بھی وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ــــــ بہرحال ان دوستوں کا یہ حال دیکھ کر بڑی عبرت اور بڑی خوشی ہوئی اور الحمد للہ اس حقیقت پر اور یقین بڑھا کہ زندگی میں دین کے آنے اور قوم میں ایمانی رُوح اور اس کے لوازم کے پیدا ہونے کا راستہ یہی ہے کہ افراد میں ایمان و احتساب کی صفت پیدا کرنے کے لئے اور دلوں کا رُخ دنیوی عیشوں اور لذتوں سے پھیر کر اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کے عیش و لذت کی طرف موڑنے کے لئے جد و جہد کی جائے ــــــ جن دوستوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اونچی اونچی تنخواہیں پانے کے باوجود دین کی سرسبزی کے لئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی فکر میں غربت والی اور جہد و مشقت والی یہ بوترابی زندگی جب ہی اختیار کی ہے جب اللہ کے کچھ بندوں نے ان میں ایمان و احتساب کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے اور ان کی طبیعتوں کا رُخ اللہ کی رضا کی طرف اور جنت کی نعمتوں اور لذتوں کی طرف پھیرنے کے لئے جد و جہد کی۔ بس

کار این است غیر ایں ہمہ ہیچ

احتفال علماء اسلام: ۔ فروری کے تیسرے ہفتہ میں علماء اسلام کی یہ کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی تھی۔ یہ عاجز بھی اسکی بعض نشستوں میں ایک مشاہد کی حیثیت سے شریک ہوا۔ چند علماء کرام دوسرے ممالک سے بھی تشریف لائے تھے۔ برسہا برس

کے تجربہ کے بعد اس قسم کی کانفرنسوں کے متعلق جو مایوسی بہت پہلے سے دل میں بیٹھ چکی ہے افسوس ہے کہ اس کانفرنس کی کارروائی دیکھ کر اس میں کچھ اور اضافہ ہی ہوا اور یہ یقین اور بڑھ گیا کہ اس امت کے لئے یہ رسمی اور رواجی طریقے بالکل راست نہیں ہیں ــــــ یہ عاجز تو عمر بھر کے تجربہ سے اس نتیجہ پر پہونچا ہوا ہے کہ اگر اللہ کے صرف دو مخلص بندے جن میں اخلاص کے علاوہ صلاحیت اور باہم اعتماد اور ایک خاص حد تک فکری اتحاد ہو دین کی خدمت و نصرت اور اس امت کی صلاح و فلاح کے لئے جد وجہد کو اپنی زندگی کا مسئلہ بنا کر کسی شکستہ مسجد کے گوشہ یا جنگل کے کسی درخت ہی نیچے کچھ وقت کے لئے سر جوڑ کے بیٹھ جائیں اور باہم مشورہ سے جو کچھ طے کریں اس پر اپنی زندگی کا سرمایہ لگا دینے کا فیصلہ کرلیں تو ان دو بندوں کا یہ جڑ کے بیٹھنا اس امت کے اور اس کے دین کے حق میں ان شاء اللہ اس قسم کی کئی عالمی کانفرنسوں سے کہیں زیادہ خیر کا باعث ہوگا ــــــ بس اس سے زیادہ کیا عرض کیا جائے۔

کراچی کے عام حالات:۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی اس عاجز نے کراچی دیکھا تھا۔ اِس وقت کا نیا کراچی اُس پرانے کراچی سے بہت بدلا ہوا ہے اور بہت ترقی کر چکا ہے۔ آبادی ۶-۷ گنی بڑھ گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہر چیز میں ترقی ہے۔ تجارت میں ترقی ہے، صنعت میں ترقی ہے تعلیم میں ترقی ہے، دولت میں ترقی ہے تعیش میں ترقی ہے، شہر کی رونق اور چہل پہل میں بہت ترقی ہے اور غالباً سب سے زیادہ ترقی کانفرنسوں، جلسوں اور مشاعروں میں ہے۔ لوگوں نے بتلایا کہ شاید ہی کوئی ایسا اچھا یا برا دن ہوتا ہو کہ اس دن شہر میں کوئی کانفرنس، کوئی بڑا جلسہ یا کوئی مشاعرہ نہ ہو۔

کاش ایمانوں میں اور دین سے تعلق میں اور آخرت کی فکر میں بھی اسی تناسب سے ترقی ہوئی ہوتی ــــــ افسوس دیکھنے والا زندگی کے اس پہلو میں کوئی ترقی نہیں محسوس کرتا ــــــ ہاں امیدیں ہیں اور اس راہ میں جانبازی کرنے والے خوش نصیبوں کے لئے میدان وسیع ہے

عوام کی حالت کو بہتر بنانے اور ملک و مملکت کو ترقی دینے اور مستحکم کرنے کے لئے جو ٹھوس تعمیری کام اور جو محنتیں ہونی چاہئیں واقفین کا بیان ہے کہ اُن میں بھی بہت کمی ہو رہی ہے اور مختلف کارکن طبقوں سے جو توقعات تھیں وہ پوری نہیں ہو رہی ہیں اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں۔

یہاں آنے سے پہلے مختلف ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ انسداد رشوت ستانی کی مہم میں پاکستان بہت کامیاب ہو چکا ہے لیکن یہاں آکر معلوم ہوا کہ رشوت اب بھی بہت باقی ہے تاہم ہندوستان سے یقیناً کم ہے

ٹیکسوں کی حالت یہاں بھی غالباً وہی ہے جو ہندوستان میں ہے۔ تاجر طبقہ خصوصیت سے سخت شاکی اور بے حد پریشان ہے۔ میرے ایک معتمد دوست نے خود مجھ سے ذکر کیا کہ ہم پر جو انکم ٹیکس تجویز کیا گیا ہے وہ اس قدر غیر منصفانہ ہے کہ اسکے بارہ میں انصاف حاصل کرنے کی جو کوشش ہم کر رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ اس میں کامیابی نہ ہوئی اور موجودہ تجویز بحال رہی تو دوکان کے علاوہ اپنا مکان بیچ کر بھی ہم اس کو مشکل سے ادا کر سکیں گے۔

ضرورت کی اکثر چیزیں ہندوستان کے لحاظ سے یہاں کافی ارزاں ہیں اور بڑی سہولت سے ملتی ہیں خاص طور سے کپڑا تو نسبتہً یہاں بہت ہی ارزاں ہے۔ اسی طرح دوسرے ممالک سے آنے والی عام ضرورت کی اکثر اشیاء یہاں بہت ارزاں داموں پر مل جاتی ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے حکومت بیزاری اور ارباب حکومت سے ناراضی کا جذبہ یہاں کے عوام میں بہ نسبت ہندوستان کے بہت کم ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں کے اس "سکون" میں عوام کے شعور کی کمی کو بھی کافی دخل ہے ـــــ اُردو کے اخبارات اور رسائل اگرچہ بے تعداد نکل رہے ہیں لیکن جہاں تک اندازہ ہے ایسے اخبار کی جگہ خالی ہے جس کا مقصد اغراض سے بالاتر ہوکر عوام کی ذہنی تربیت اور حقیقتوں سے اُن کو آشنا کر کے ان کی مدد کرنا ہو۔ یہاں کے اکثر روزنامے نہایت پست اور گھٹیا معیار کے ہیں۔

مہاجرین کی حالت:۔ لکھوکھا غریب مہاجرین کو خصوصاً مکان نہ ہونے کی بڑی تکلیف ہے۔ اس بارہ میں کام کا غیر معمولی پن اور حکومت کی بعض مجبوریاں بھی بلاشبہ قابل لحاظ ہیں لیکن سب پہلوؤں پر نظر رکھ کر بھی سینہ میں دل اور دل میں درد کا کوئی ذرہ رکھنے والا انسان حکومت اور خاص کر اس کے شعبۂ آبادکاری کے متعلق بُرے خیالات کو اپنے دل میں آنے سے نہیں روک سکتا۔ پھر یہ مسئلہ ہرگز ایسا نہیں ہے کہ اس کو صرف حکومت کی ذمہ داری سمجھ کر پاکستان کے عام شہری اپنے کو اس کی فکر سے سبکدوش سمجھیں اور اطمینان سے اپنے کاموں میں لگے رہیں، بقدر استطاعت و طاقت اس کی ذمہ داری سب پر ہے۔ جس شہر کو مسلمانوں کی سب سے بڑی حکومت ہونے کا فخر و امتیاز حاصل ہو اس کا اس حال میں ہونا کہ کچھ لوگوں کے پاس تو عالیشان محلات اور اُن کے ساتھ وسیع تفریحی باغیچے ہوں اور اُن کے لاکھوں بھائی اس حال میں ہوں کہ اُن کے پاس بارش اور دھوپ سے بچا سکنے والی جھونپڑیاں بھی نہ ہوں۔ یہ نقشہ ہرگز اللہ کو پسند نہیں ہے اور اس میں بڑے خطرات ہیں بہرحال پاکستانی حکومت اور وہاں کے عام شہریوں کا فرض ہے کہ پورے صدق دلانہ تعاون کے ساتھ وہ اپنے بے گھر بھائیوں کے واسطے سکونت کا انتظام کرنے کے لئے اپنے امکانی وسائل سے جدوجہد کریں۔ جب آپ اس کے لئے قدم اُٹھائیں گے اللہ تعالیٰ آپ کی پوری مدد فرمائے گا اور اس سلسلہ کی ہر مشکل کو آپ کے لئے آسان کر دیگا۔

پاکستان میں دینی مدارس:۔ اتفاق کی بات ہے کہ سندھ، مغربی پنجاب اور سرحد میں ہمیشہ سے مسلمانوں کی اکثریت ہونے کے باوجود دینی مدارس بہت کم تھے اور جو تھے وہ معمولی حالت میں تھے اب ہمارے علماء کرام مدارس کے قیام کی طرف خاص طور سے متوجہ ہیں۔ جو مدارس اب تک قائم ہو چکے ہیں اور جن کا اس عاجز کو علم ہے ان میں سے تین خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

(۱) دارالعلوم الاسلامیہ۔ اشرف آباد ٹنڈو الہ یار ضلع حیدرآباد (سندھ)۔ (۲) خیر المدارس (ملتان) (۳) جامعہ اشرفیہ (لاہور)

حکیم الامۃ حضرت تھانوی رح کے مشہور جلیل القدر خلیفہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری جامعہ اشرفیہ لاہور کے غالباً بانی اور سرپرست ہیں اور صدر مدرس اس وقت حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی (صاحب التعلیق الصبیح) ہیں اور ملتان کا خیر المدارس گویا جالندھر کا قدیمی خیر المدارس ہے، اور حضرت حکیم الامۃ ہی کے ایک دوسرے خلیفہ اور مشہور و ممتاز عالم دین حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری گویا اس کے بانی اور سب کچھ ہیں۔ ان دونوں مدرسوں کو یہ عاجز دیکھ نہیں سکا اس لئے ان کے بارہ میں میرا علم بس آنا ہی ہے۔ ہاں اول الذکر (دارالعلوم الاسلامیہ) کو دیکھنے کے لئے مستقل سفر کیا اور قریباً ڈیڑھ دن وہاں رہا اور الحمد للہ بڑی خوشی ہوئی۔ یہ دارالعلوم گویا وہ مجوزہ دارالعلوم ہے جو حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کے قسم کا ایک مرکزی دینی دارالعلوم قائم فرمانا چاہتے تھے۔ ضلع حیدرآباد (سندھ) میں ٹنڈو الٰہیار ایک قصبہ ہے اس کی خوش نصیبی ہے کہ اس دارالعلوم کے لئے قرعۂ فال اس کے نام پڑا۔ مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی (جو غالباً حضرت حکیم الامۃ رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے بھی ہیں اور جن کا قرآنی درس روزانہ کراچی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوتا ہے[1]) وہ اس دارالعلوم کے مہتمم اور گویا روح رواں ہیں۔ جہاں تک اُن سے ہو سکا ہے اہل علم و کمال کو جوڑنے کی انھوں نے بڑی کوشش کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں اس کوشش میں کامیاب بھی کیا ہے

حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوری (سابق صدر مدرس مظاہر علوم سہارنپور) اس دارالعلوم کے صدر مدرس ہیں حضرت مولانا موصوف اس دور کی ان ممتاز ترین بابرکت ہستیوں میں سے ہیں جن کی مثالیں بہت ہی کمیاب ہیں اور جن کی صحبت اور زیارت اور خدمت میں حاضری سے بڑی خیر کی امید ہے۔ اللہ تعالیٰ طالبین صادقین کو توفیق بخشیں۔ حضرت ممدوح سے قریب ہو کر قلب میں ان کی بڑی محبت پیدا ہوتی ہے۔

میرے بڑے شفیق اور محترم دوست مولانا محمد یوسف صاحب بنوری بھی یہاں حدیث و تفسیر کے استاد ہیں موصوف حضرت استاذ مولانا سید انور شاہ قدس سرہ کے ان ممتاز ترین ذہین تلامذہ میں سے ایک ہیں جنھیں حضرت کے علم سے وافر حصہ ملا ہے اور جن کے درس میں بیٹھ کے حضرت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بڑا قابل رشک ہے ان کا علم اور ان کا مطالعہ اور ان کا حفظ

صف اول ہی کے اساتذہ میں حضرت مولانا مفتی اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی بھی ہیں عرصہ تک مدرسہ فتحپوری دہلی میں حدیث کے استاذ رہے ہیں نسائی شریف کے اپنے حاشیہ اور ترمذی شریف کے ابتدائی حصہ کی تخریج سے علمی حلقوں میں متعارف ہیں تدریس کے علاوہ افتاء کا کام بھی یہاں آپ ہی کے سپرد ہے۔ پاکستان تشریف لانے سے پہلے دو تین سال آپ کا قیام بھوپال رہا۔ اس ناچیز کا تعلق اسی زمانہ میں بڑھا، بڑی ہی شفقت اور محبت فرماتے ہیں

میرے دوست مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی جے پوری (صاحب لغات القرآن) بھی اس دارالعلوم کے مدرسین میں ہیں۔

[1] اب کچھ دنوں سے مولانا نے یہ سلسلہ بند کر دیا ہے ۱۲

مولانا احتشام الحق صاحب کی کامیابیوں اور دارالعلوم کی خوش نصیبیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تجوید و قرأت کے لئے اس کو استاذ القراء جناب مولانا قاری عبدالمالک صاحب الہ آبادی مل گئے ہیں جو اس وقت اس فن کے مسلم ائمہ میں سے ہیں۔ طلبہ میں بھی خیر و صلاح کے آثار زیادہ نظر آئے خدا کرے کہ یہ چیز باقی رہے۔ طلبہ کی خواہش اور ان بزرگوں کی فرمائش پر اس عاجز نے طلبہ کے سامنے ان کی زندگی اور مقصد زندگی کے بارہ میں کچھ عرض بھی کیا۔

اس وقت درس و تدریس اور طلبہ کا قیام جن عمارتوں میں ہے وہ عارضی کام چلاؤ بنالی گئی ہیں۔ مدرسہ کی مستقل تعمیر کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے اور عزائم بڑے بلند ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا احتشام الحق صاحب کو بڑا حوصلہ دیا ہے تخمینوں اور اسکیموں میں لاکھوں سے کم کا شاید ان کے یہاں کوئی حساب ہی نہیں ہے اور لاکھوں کا مہیا کرلینا شاید ان کیلئے اللہ تعالیٰ نے آسان بھی کر دیا ہے۔ بہرحال اس معاملہ میں اُن کی نگاہ بہت اونچی اور عزائم بہت بلند ہیں۔ اُن کے خیال میں دارالعلوم کا جو نقشہ ہے اور طلبہ کی زندگی کا بھی جو معیار اُن کے پیش نظر ہے وہ قریب قریب آج کل کے کالجوں اور یونیورسٹیوں والا معیار ہے۔ اللہ خیر کرے ابے تکلف عرض ہے کہ اس بارہ میں اس عاجز کو انشراح نہیں ہو سکا۔ ابتک کا تجربہ یہی ہے کہ اس قسم کی ترقیاں ہمارے مدرسوں کے لئے کچھ راست نہیں آئیں لیکن اس پالک میں سب قدرت ہے

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ

طرز تعلیم اور نصاب تعلیم کے متعلق مولانا محمد یوسف صاحب نے جن فیصلوں اور ارادوں کا اظہار فرمایا اُن سے بھی بڑی خوشی ہوئی۔ ان حضرات نے جو کچھ سوچا ہے اگر وہ عمل میں آگیا تو دینی تعلیم کے بارہ میں انشاء اللہ نہایت ضروری اور نہایت مفید اصلاحی قدم ہوگا۔ اس موضوع پر سوچنے والوں کو اکثر افراط یا تفریط میں مبتلا دیکھا گیا ہے لیکن ان حضرات نے جو سوچا ہے اس میں ضرورتوں کے پورے لحاظ کے ساتھ اعتدال بھی ہے اور وہ تجویزیں قابل عمل بھی ہیں۔ بہرحال دارالعلوم جاکر جی بڑا خوش اور مطمئن ہوا۔ حق تعالیٰ شانہٗ اس شجرۂ طلبہ کو ہر قسم کے شرور و فتن سے محفوظ رکھیں

ٹنڈو اللہ یار کا یہ سفر دارالعلوم اور حضرات دارالعلوم کی زیارت ہی کی نیت سے کیا تھا۔ اس کے بعد پنجاب اور سرحد میں جہاں جانا ہوا اپنے تبلیغی کام کے سلسلہ میں جانا ہوا اور پورے سفر میں رفقا کی جماعت ساتھ رہی۔ اس دورہ کی مختصر روداد بھی ہدیۂ ناظرین ہے۔

دو ہفتے پنجاب اور سرحد میں:۔ ٹنڈو اللہ یار سے روانہ ہو کر ۴ مارچ کی صبح کو بھاول پور پہنچے۔ بھاول پور میں ہمارے تبلیغی کام کو بہت اچھا کام سمجھنے والے تو بہت ہیں لیکن اس راہ میں محنت کرنے والے رفقا کم ہیں البتہ یہ دیکھ کر دل بہت خوش اور مطمئن ہوا کہ یہاں کے بعض اہل علم بھی اپنے علمی اور تدریسی مشاغل کے باوجود کام سے خاص شغف رکھتے ہیں اور رہنمائی کر رہے ہیں۔

۵ مارچ کی صبح کو بھاولپور سے لاہور کے لئے روانگی ہوئی راستہ میں ملتان پڑتا ہے لیکن میں وہاں ٹھہر نہیں سکتا تھا اس لئے وہاں کے اپنے بزرگوں اور دوستوں سے معذرت کرتے ہوئے بذریعہ خط میں نے استدعا کی تھی کہ اسٹیشن پر زحمت

فرماکر مجھے زیارت کا موقع دیں اسی واسطے بھاولپور سے اس ٹرین کو اختیار کیا۔ جو ملتان پر تبدیل کرنا پڑتی تھی۔ چنانچہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب مولانا عبدالشکور صاحب کیمل پوری، مولانا عبدالخالق صاحب، مولانا عبداللہ صاحب اور شہر کے بہت سے مخلص احباب اسٹیشن پر تشریف لے آئے تھے ایک گھنٹہ سے کچھ زیادہ ان حضرات کی خدمت میں حاضری نصیب رہی بعض بزرگوں کے حکم کی تعمیل میں مختصر سا خطاب بھی کیا۔

ملتان سے روانہ ہو کر مغرب وعشا کے درمیان لاہور پہنچے۔ پہلے سے چونکہ اطلاع تھی اس لئے اکثر تبلیغی احباب اسٹیشن پر تشریف لے آئے تھے۔ آسٹریلین مسجد (جو لاہور میں تبلیغی جماعتوں کا ایک مستقر ہے۔ اسٹیشن سے بالکل قریب ہے وہاں پہنچ کر عشا کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد دوستوں سے کچھ باتیں کیں جو اس موقع پر کہنی مناسب معلوم ہوئیں پھر مشورہ سے کام کا پروگرام بنا۔ رات کو وہیں مسجد کے عقب میں ادارہ اصلاح و تبلیغ میں میرا اور جماعت کا قیام رہا۔ اگلا دن جمعرات کا تھا۔ دن کے اوقات میں اپنے بزرگوں اور پرانے دوستوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ لاہور میں تبلیغی جماعت کا مرکز باغبان پورہ میں بلال پارک کی مسجد ہے ہفتہ وار اجتماع وہیں جمعرات کو ہوتا ہے۔ بعد مغرب وہاں پہنچ کر اجتماع میں شرکت کی بعض دوستوں نے بتلایا کہ آج یہاں بہت سے حضرات ایسے بھی آئے ہیں جو ہمارے کام سے ناواقف ہیں یا غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اس لئے تقریر میں دعوت کی وضاحت اور تفہیم کی کوشش کی ۔ لیکن قلوب تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں اس نے جن کے متعلق چاہا ان کو انشراح و اطمینان نصیب فرمایا۔ سکھر (سندھ) میں جو اجتماع وسط اپریل میں ہونے والا ہے اس کے لئے ابھی سے علاقوں میں پھر پھر کے کام کرنے کی دعوت بھی دی گئی (بلکہ اس دورہ کے قریباً ہر اجتماع اور ہر خطاب میں خاص دعوت یہی دی جاتی رہی) جمعہ اور شنبہ کو بھی قیام لاہور ہی میں رہا۔ جمعہ کو بعد نماز جمعہ نیلہ گنبد والی جامع مسجد میں اور ہفتہ کو بعد نماز مغرب آسٹریلین مسجد میں اجتماعات ہوئے کام کرنے والے دوستوں کے ساتھ مشاورتی گفتگو کا سلسلہ بھی دونوں دن جاری رہا۔ اتوار کو لاہور سے روانگی ہوئی شام کو گجرانوالہ پہنچے اور اگلا دن وہیں گزرا اس تھوڑے سے وقت میں دو تین اجتماع ہوئے یہاں مولانا عبدالواحد صاحب بڑے جوش اور اذعان کے ساتھ تبلیغی کام میں لگے ہوئے ہیں ان کے ساتھ کام کرنے والوں کی تعداد الحمدللہ خاصی ہے۔ پیر اور منگل کی درمیانی شب میں گجرانوالہ سے روانہ ہو کر صبح کو پشاور پہنچنا ہوا۔ یہاں دو دن قیام رہا اور دونوں دن اجتماع ہوا۔ کوہاٹ کے تبلیغی احباب کافی تعداد میں الحمدللہ پشاور آگئے تھے تیسرے دن (جمعرات کو) پشاور سے راولپنڈی پہنچے اور یہاں قیام ۲۱ گھنٹے سے بھی کچھ کم رہا عصر سے قریباً عشا تک اجتماع رہا اور رات ہی میں وہاں سے سرگودھے کے لئے روانہ ہوگئے۔ ضلع سرگودھے کی تحصیل جھاوریاں سے ۷۔۸ میل کے فاصلہ پر ڈھڈیاں ایک گاؤں ہے یہ مخدومنا حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری مدظلہ کا اصل وطن ہے اور حضرت ممدوح چند مہینے سے وہیں تشریف فرما ہیں۔ سرگودہا اور پھر وہاں سے ڈھڈیاں تک کا یہ سفر حضرت کی خدمت میں حاضری کی نیت سے کیا۔ لیکن وقت میں زیادہ گنجائش نہ تھی اس لئے قریباً ایک شب دروز ہی قیام رہ سکا اور ۱۵ مارچ شنبہ کی صبح کو وہاں سے روانہ ہو کر عصر سے کچھ پہلے لائل پور پہنچنا ہوا اور بعد مغرب جامع مسجد میں عام اجتماع ہوا اور رفقا سے

مشاورتی گفتگو اگلے روز بعد نماز صبح ہوئی پھر اسی دن یعنی ۱۶ر مارچ دوپہر کو وہاں سے روانہ ہوکر شام کو ہم لاہور پہنچ گئے۔
۱۷ر مارچ کو بھی لاہور ہی قیام رہا۔ دن کچھ ملاقاتوں میں گزرا اور رات کو بعد نماز مغرب نیلہ گنبد والی مسجد میں اجتماع ہوا
یہ گویا اس دورہ کا آخری اجتماع تھا۔

اس دورہ کے اجتماعات و خطابات کی خاص دعوت:۔ ہر جگہ کے اجتماع اور خطاب میں الفاظ و عنوان کے کچھ فرق کے ساتھ ایک ہی دعوت اس پورے دورہ میں دی اور وہ یہ کہ ہماری موجودہ زندگی وہ اصل ایمانی اور اسلامی زندگی نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کے آئے تھے اور ہمارے اندر اللہ کی ذات وصفات پر اور آخرت کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے نقشوں پر وہ یقین نہیں رہا ہے جو زندگی کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت والی اور آخرت کی فکر والی زندگی بنایا کرتا ہے اور جب تک ہم خود اپنی اس حالت کی برائی کو محسوس کرکے اس کو بدلنے کی فکر اور کوشش نہ کریں گے خدانخواستہ ہماری حالت یہی رہے گی بلکہ اور زیادہ بگڑتی چلی جائے گی اور اس کی اصلاح اور درستی کی تدبیر یہ اور صرف یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی زندگی کے بارے میں یہ فیصلہ کرے کہ وہ ہر مہینہ میں ۳-۴ دن اور ہر سال میں ایک چلہ یا ایک مہینہ اپنے دوسرے کاموں سے بالکل یکسو اور فارغ ہوکر اپنے اندر حقیقی ایمان و یقین پیدا کرنے اور اللہ سے اور دین سے اپنا تعلق بڑھانے کی فکر اور کوشش میں اور اللہ کے دوسرے بندوں کو اس کی دعوت دینے میں ایک خاص اصول اور پروگرام کے مطابق صرف کیا کرے گا ــــ بہرحال ہر جگہ لوگوں کو اسی کی دعوت دی گئی اور اپنی بساط کی حد تک اس فیصلہ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی ــــ الحمدللہ ہر جگہ اللہ کے کچھ بندوں نے بات کو سمجھا اور قبول کیا۔ کچھ اسی وقت تیار ہو گئے اور کچھ نے آئندہ کے لئے ارادے کئے۔

تبلیغی رفقاء کو چند خاص مشورے:۔ قریباً ہر جگہ کے تبلیغی رفقا کی خدمت میں مندرجہ ذیل چند باتیں خاص طور سے عرض کیں

(۱) اس عالم اسباب میں اس کام کے صحیح طور پر چلنے کا زیادہ دار و مدار اس بات پر ہے کہ آپ خود اس کام کو صحیح طور پر سمجھیں اور صحیح طور پر کریں۔ اس کام کے دو خاص بازو ہیں۔ ایک لوگوں کو دین کی سرسبزی کے لئے اور خود اپنے ایمان میں طاقت پیدا کرنے کے لئے سفر اور جد و جہد اور قربانی پر آمادہ کرنا۔ دوسرا یہ کہ اللہ کے جو بندے ہماری دعوت پر آمادہ ہو جائیں اُن کیلئے پوری دلسوزی اور فکرمندی کے ساتھ اس کا انتظام کرنا کہ ان کا وقت اس کام کے صحیح اصولوں کے مطابق اس طرح صرف ہو جس سے ان کی ایمانی کیفیات میں اور آخرت کی فکر میں ترقی ہو اور صحیح اصولوں پر دین کی جد و جہد کا رواج ہو۔ کام کے ان دونوں بازوؤں میں سے اگر کوئی ایک بھی کمزور ہوگا تو کام نہیں چل سکے گا۔ اگر ہم لوگوں کو جد و جہد اور قربانی پر آمادہ کرنے میں کمزور پڑیں گے یعنی اوقات لینے کی کوشش میں کمی کریں گے تو یہ کام بالکل نہیں چلے گا کیونکہ یہ کام ہی جماعتوں کی

نقل وحرکت کا ہے ــــ اور اگر ہم اوقات دینے والوں کے اوقات کے صحیح استعمال کی فکر نہیں کریں گے تو جانے والے کوئی نفع محسوس نہیں کریں گے اور ایک دو دفعہ کے تجربہ کے بعد وہ مایوس اور بد دل ہو کر بیٹھ جائیں گے اور پھر ہم انھیں آمادہ بھی نہ کر سکیں گے ــــ اور اس سے بھی بڑا نقصان یہ ہوگا کہ جہاں وہ جائیں گے وہاں والوں کے لئے وہ اس کام کی طرف کشش کا باعث نہیں بنیں گے ــــ یہ بات صرف نظری نہیں ہے بلکہ کام کرنے والوں کو دونوں قسم کی جماعتوں کا بار بار تجربہ ہوتا رہتا ہے ــــ اس لئے ضروری ہے کہ ہم جتنی فکر اور کوشش لوگوں کو سفر اور جد وجہد پر آمادہ کرنے کی کریں اتنی ہی فکر اور کوشش اس کی کریں کہ اللہ کے ان بندوں کا وقت صحیح طور پر صرف ہو ــــ کام کی مصلحت کے علاوہ ہم اپنی استطاعت کی حد تک اس کی فکر اور کوشش کے عند اللہ ذمہ دار بھی ہیں۔ اس کے لئے کچھ دنوں کے واسطے پرانوں کو اور کام سے خاص تعلق رکھنے والے دوستوں کو اپنی محنت اور قربانی کی مقدار بڑھانی پڑے گی۔ لیکن جب آپ اس کا پورا اہتمام اور فکر کرنے لگیں گے اور ہر جانے والی جماعت کا وقت صحیح طور پر اور اصولوں کی پابندی کے ساتھ صرف ہوگا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جماعتوں میں جانے والا ہر شخص ایک ہی دو دفعہ جانے کے بعد انشاء اللہ اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جائے گا اور پھر جہاں آج دس پرانے ہیں وہاں خدا نے چاہا تو بہت جلد ۲۰۔ ۳۰۔ ۴۰۔ ۵۰ آپ کا ہاتھ بٹانے والے اور اس بوجھ کے اٹھانے والے ہو جائیں گے اور روز بروز بڑھتے جائیں گے۔ اس وقت جو ایسے دوستوں کی کمی ہے جو اس ذمہ داری کو اٹھا سکیں اس کی وجہ یہی ہے کہ جماعتوں میں اصولوں کی پابندی کی ہم پوری فکر نہیں کرتے جس کی وجہ سے بار بار جانے والے بھی ذمہ داری اٹھانے کے لائق نہیں بنتے اور ذمہ داری کا سارا بوجھ ہمیشہ چند ہی آدمیوں پر رہتا ہے۔

(۲) اس کام سے آپ کا تعلق ہرگز وہ نہ ہو جو عام طور سے تحریک والوں کا اپنی تحریکوں سے ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں آپ کی دلچسپی اور آپ کا انہماک بالکل اس قسم کا ہونا چاہئے جس طرح کا ایک صاحب اخلاص نمازی کو نماز سے اور ایک ذاکر کو ذکر سے ہوتا ہے یعنی اس کام میں آپ کی کوشش اور آپ کی جد وجہد بس اللہ کی رضا کے اور جنت کے شوق میں ہو اور ہر قدم پر آپ بس اللہ تعالیٰ کی رضا کو اور آخرت کے ثواب کو نظر کے سامنے رکھیں ــــ اور اس کا معیار اور اس کی آسان پہچان یہ ہے کہ آپ دعوت کی کامیابی اور کام کے بڑھنے سے زیادہ اس کی فکر رکھیں کہ دعوت اور جد وجہد کے جوش میں کوئی بات آپ سے اللہ کو ناراض کرنے والی نہ ہو جائے۔ کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا ہے کہ ہمارے بعض احباب دعوت اور ترغیب دیتے وقت بولنے میں بڑی بے احتیاطی کرتے ہیں اور بعض اوقات ان کے الفاظ میں اتنا مبالغہ ہوتا ہے جو شاید جھوٹ کی حد میں آجاتا ہو۔ جو بڑی خطرناک اور بہت فکر کی بات ہے اس سے اللہ تعالیٰ ہرگز راضی نہیں ہوتا بلکہ اس سے شیطان خوش ہوتا ہے

اعاذنا اللہ من ذالک

(۳) ہمیں اور آپ کو تجربہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس امت میں بہت سے طبقے اس حال میں ہیں کہ وہ تدریجی حکمت عملی سے ہی اس کام میں لگ سکتے ہیں اور اگر ہم نے ان کے حال کی اور مزاج کی رعایت

کرتے ہوئے تدریجی حکمت عملی اختیار نہیں کی تو وہ بے چارے اس کام سے ہمیشہ دور ہی رہیں گے، تو ایمان کی اور ایمان والی جدوجہد کی نعمت میں ان کو بھی شریک کرنے کے لئے ہمارے واسطے ضروری ہے کہ ہم ان کے ساتھ تدریجی حکمت عملی اختیار کریں اور ان کو دعوت اس طرح دیں کہ وہ اس کام کو اپنی طاقت سے باہر اور اپنے لئے ناقابل عمل نہ سمجھیں جس کی صورت یہ ہے کہ اس کام میں شرکت کی ہلکی صورتیں بھی اُن کے سامنے رکھی جائیں جب وہ آپ سے اور آپ کے کام سے کچھ مانوس ہو جائیں گے تو انشاء اللہ آگے قدم بڑھانا بھی اُن کے لئے آسان ہو جائے گا ——— بہر حال ایسا نہ ہو کہ ہماری سخت گیری اور انتہا پسندی کی وجہ سے امت کے کچھ طبقے اس کام سے ہمیشہ بے تعلق رہیں جس کے متعلق اللہ نے ہمیں یقین نصیب فرمایا ہے کہ یہ کام قلوب میں ایمان پیدا کرنے والا اور اللہ سے اور دین سے تعلق بڑھانے والا ہے۔ اگر خدانخواستہ ہم نے ایسا کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزاروں لاکھوں اُمتیوں کی ایمان سے محرومی کا ہم ذریعہ بن جائیں گے اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ساتھ ہماری یہ بڑی بے رحمی اور بے دردی ہوگی۔ الغرض ہمیں اس کا پورا فکر ہونا چاہیئے کہ حضورؐ کی امت کے تمام طبقے کسی نہ کسی درجہ میں اس کام سے جُڑ جائیں۔ خواہ کسی کا جُڑنا اتنا ہی ہو کہ وہ ہمارے مقامی اجتماعات میں آنے لگے ——— اس راستہ کا ذرہ بھی نہ ہونے کے مقابلہ میں بہت ہے۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ ہمارے اس کام کے سلسلے میں جو چیزیں منصوص نہیں ہیں بلکہ ہم نے غور و فکر اور تجربہ کے بعد بطور ضروری تدبیر کے ان کو اختیار کیا ہے اُن کے ساتھ ہمارا معاملہ وہ نہ ہو جو منصوصات کے ساتھ ہوتا ہے ایسا کرنا غلو اور حدود سے تجاوز ہوگا اور بدعات ہمیشہ اسی غلطی سے وجود میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس غلطی سے ہماری حفاظت فرمائے۔

(۵) پانچویں بات یہ ہے کہ اس کام کے علاوہ جو اور دینی کام اور دینی سلسلے ہیں مثلاً دینی مدارس و مکاتب اور دوسرے دینی ادارے ہیں ان سب کی دل سے قدر اور عزت کی جائے اور ان کے ساتھ ہمارے دلوں میں ہمدردی اور خیر خواہی ہو اور اللہ کے ان بندوں کی پوری عظمت ہو جو اخلاص کے ساتھ دین کے ان سلسلوں میں لگے ہوئے ہیں اور اپنی کوششیں ان کے لئے صرف کر رہے ہیں۔ اگر ہم نے صرف اپنے کام کو دینی کام سمجھا اور دوسرے دینی کاموں اور اُن کے چلانے والوں کے متعلق ہمارے دلوں میں خدانخواستہ رقابت والے جذبات ہوئے تو یہ ہماری بڑی گمراہی اور بڑی بدنصیبی ہوگی بلکہ دین کے زعم میں یہ ہماری بددینی ہوگی۔ خاص کر علماء ربانی اور اہل اللہ کا ہم اپنے کو خادم بلکہ کفش بردار سمجھیں اور ان کی صحبت سے استفادہ کے لئے گاہ بگاہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا کریں اور اُن سے تعلق بڑھانے کو اپنی حاجت سمجھیں۔

(۶) چھٹی اور آخری بات یہ ہے کہ کثرت ذکر و دعا اس کام کا نور اور اس کی جان ہیں، ہمارے خاص کام کرنے والوں کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ ذکر و دعا کا خاص اہتمام رکھیں خصوصاً رات کو اُٹھ کر تہجد پڑھنے کی اور اس کے بعد سے فجر تک ذکر میں مشغول رہنے کی اور خوب دل سے رونے اور اللہ سے مانگنے کی عادت ڈالیں اور تنہائی کے مراقبوں سے اس یقین کو بڑھائیں کہ دین اور دنیا دونوں لائنوں کی ہر چیز کو وجود میں لانا صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے اُس کے سوا کسی کے بس میں کچھ نہیں ہے اور ہماری کوشش صرف اس کے حکم کی تعمیل میں ہے ——— جس قدر یہ یقین بڑھے گا اسی قدر دعا میں جان اور قوت آئے گی ——— اللّٰھم

لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ

لاہور کی ملاقاتیں:۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین (لاہور) بڑی شفقت فرمانے والے میرے بزرگوں میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے دین کی بڑی خدمت لی ہے اور ہزاروں بندگان خدا کو دین کی نعمت آپ کے ذریعہ سے ملی ہے۔ وعظ و ارشاد کے وسیع سلسلہ کے علاوہ درس قرآن آپ کا خاص ذریعۂ فیض اور گویا آپ کی دعوت ہے —
بہاولپور سے روانہ ہو کر جب ۵ مارچ کو لاہور پہنچا تو اگلے ہی روز مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پاکستان بننے سے پہلے سال میں کئی کئی دفعہ حضرت ممدوح سے ملاقات ہوتی رہتی تھی لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد یہ پہلی ملاقات تھی۔ ملک کی تقسیم کا اثر نفسیات پر بھی عجیب و غریب پڑا ہے۔ پاکستان میں اپنے جن بزرگوں اور دوستوں سے اب کے ملنا ہوا، اندازہ ہوا کہ ان ملاقاتوں کے وقت طرفین کے احساسات اور نفسیات پہلے زمانہ کی ملاقاتوں سے بہت مختلف قسم کے تھے

اسی روز فیض باغ پہنچ کر محب قدیم مولانا مطیع الحق صاحب دیوبندی سے ملاقات کی۔ مولانا علمی اور روحانی نسبت کے علاوہ وطن کی نسبت سے بھی دیوبندی ہیں بڑی عجیب اور قابل تقلید موصوف کی زندگی ہے۔ ایک عرصہ سے لاہور کے کسی اسکول سے ملازمت کا تعلق ہے۔ اس تعلق کی ذمہ داریوں کو پوری طرح ادا کرنے کے ساتھ قرآن مجید کا درس بھی دیتے ہیں اس کے علاوہ بچوں کی تعلیم کا ایک خاصا بڑا مرکز بھی قائم کر رکھا ہے جس کے ساتھ اولاد کا سا گہرا قلبی تعلق ہے۔ اسکول کے مقررہ چند گھنٹوں کے علاوہ باقی پوری زندگی محض لوجہ اللہ اس تعلیمی مرکز کی تعمیر و ترقی کے لئے وقف کر رکھی ہے —— موصوف کی محنت و مشغولیت اور ان کے اس تعلیمی مرکز کی کامیاب حالت کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لوگ اگر چاہیں تو ملازمت وغیرہ اپنے معاشی شغلوں کی ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا کرنے کے ساتھ بھی کتنے بڑے بڑے دینی اور قومی کام کر سکتے ہیں —— واقعہ یہ ہے کہ پاکستان ہو یا ہندوستان یا دنیا کا کوئی اور ملک ہر جگہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ایسے بندگان کا خدا کا وجود ہے جو اس طرح اپنی زندگی اور اپنی قوتوں کو اللہ کے لئے وقف کر دیں۔

لاہور میں جن بزرگوں کی ملاقات اور زیارت اس سفر میں میسر ہوئی ان میں ایک خاص قابل ذکر بزرگ (کندیاں والے) حضرت مولانا شاہ عبداللہ صاحب ہیں مغربی پنجاب ضلع میانوالی میں کندیاں ایک مشہور بستی ہے۔ حضرت مولانا احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو اس آخری دور میں نقشبندی مجددی سلسلہ سلوک کے گویا ایک امام تھے وہیں ان کی خانقاہ ہے۔ یہ حضرت مولانا شاہ عبداللہ صاحب اُن کے خلیفۂ راشد اور ان کی خانقاہ کے سجادہ نشین ہیں۔ دیوبند کی طالب علمی کے آخری سال دورۂ حدیث میں ہم دونوں شریک و ہم سبق تھے وہاں سے فارغ ہونے کے بعد ان کو تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچا دیا اور راقم سطور مختلف کوچوں اور میدانوں میں آوارہ گردی کرتا رہا سے

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق — او بصحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

قریباً بیس سال تک تو میں مولانا کے احوال سے بالکل بے خبر رہا۔ اس کے بعد۔ (اب سے کوئی ۵۔۶ سال پہلے)۔۔۔ کسی ذریعہ سے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ دارالعلوم دیوبند کے ہمارے ساتھی اور ہم درس سابق مولوی عبداللہ صاحب لدھیانوی حضرت مولانا احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فیضیاب اور ان کی مقدس امانت کے وارث اور امین ہو کر ان کے فیصلہ اور حکم سے اُن کے خلیفہ اور جانشین ہو چکے ہیں اور ان کے مشائخ کرام کا فیض اللہ کے بندوں کو اب ان کے ذریعہ سے پہنچ رہا ہے ۔۔۔۔ جب سے یہ معلوم ہوا تھا ممدوح کی زیارت اور ملاقات کا بڑا اشتیاق تھا لیکن تقسیم کے بعد جیسا کہ معلوم ہے ہمارے اور ان بزرگوں کے درمیان گویا لوہے کی دیواریں کھڑی ہو چکی ہیں ۔۔۔ حسن اتفاق کہ جس روز میں کراچی سے لاہور پہنچا مولانا موصوف بھی غالباً اسی دن تشریف فرما ہوئے۔ اگلے روز یعنی جمعہ کے دن (۷ مارچ) مجھے ایک دوست نے بتلایا بلکہ ازراہِ کرم خود ہی موصوف کی قیام گاہ تک مجھے پہنچا بھی دیا، اور اس طرح ملاقات نصیب ہوئی۔ بڑے خوش نصیب ہیں اللہ کے وہ بندے جنھیں اللہ تعالیٰ ہر طرف سے کاٹ کے اپنی ہی طرف متوجہ کرلے اور صرف اپنا بنالے۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی جو دارالعلوم دیوبند کے ممتاز اساتذہ میں سے تھے اور اب جامعہ اشرفیہ لاہور کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث ہیں۔ جب یہ نیاز مند حاضر خدمت ہوا تو فرمایا کہ یہ چلتی پھرتی ملاقات کافی نہیں کم از کم ایک رات میرے ہی پاس قیام کرو، میں نے وعدہ کرلیا اور قیام لاہور کی آخری شب میں حضرت مولانا ہی کے ساتھ کھانا کھایا اور رات کو قیام بھی وہیں کیا ۔۔۔ پاکستان کی دینی حالت اور اس کے امکانات اور اس سلسلہ کی مساعی پر تفصیل سے گفتگو ہوتی رہی ۔۔۔ اس سلسلہ میں ایک خوش کن بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ حکومت نے اہم دینی کتابوں کی حفاظت اور طباعت ونشر واشاعت کی کچھ خدمت انجام دینے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کے لئے ایک مستقل ادارہ قائم ہو گیا ہے اور بجٹ میں رقم بھی منظور ہو گئی ہے جو پیش نظر کام کے آغاز وافتتاح کے لئے کافی ہے ۔۔۔ اس کام میں مشورہ دینے کے لئے علماء کی جو مجلس مقرر کی گئی ہے اس میں مولانا ممدوح بھی ہیں۔ موصوف نے بتلایا کہ سب سے پہلے صحاح ستہ اور امام راغب کی مفردات القرآن خاص اہتمام سے چھاپنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ صحاح ستہ میں سے ہر کتاب کسی پرانی اور مستند شرح کے ساتھ چھاپی جائے گی۔ صحیح بخاری کے ساتھ شرح قسطلانی، صحیح مسلم کے ساتھ شرح نووی، ترمذی کے ساتھ شرح ابن العربی ابوداؤد کے ساتھ شرح ابن ارسلان، نسائی کے ساتھ زہرالربی اور ابن ماجہ کے ساتھ حاشیہ سندی چھاپنے کا فیصلہ کیا گیا ہے معلوم ہوا ہے کہ کتابوں کو بہتر سے بہتر ٹائپ سے چھاپنے کا اہتمام کیا جائے گا۔

اس سلسلہ کی چند اور طے شدہ تجاویز کا بھی مولانا نے ذکر فرمایا اللہ تعالیٰ ان کو بر لائے کا رلانا آسان فرمائے۔

لاہور میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور مولانا مودودی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی لیکن ایک اتفاقی مجبوری سے یہ ملاقات زیادہ مفصل نہیں ہو سکی ۔۔۔ واقعہ یہ ہوا کہ میرا ارادہ لاہور سے براہ راست دہلی واپس ہونے کا تھا اس لئے یہ سوچا تھا کہ پشاور اور پنجاب کے دوسرے مقامات سے فارغ ہو کر جب میں لاہور آؤں گا تو واپسی کا پرمٹ حاصل کرنیکے

سلسلہ میں مجھے دو چار دن لاہور ضرور ٹھیرنا پڑے گا۔ ان ہی دنوں میں سے کسی ایک دن میں ان حضرات سے تفصیلی ملاقات کرونگا لیکن جب میں دوسرے مقامات سے فارغ ہو کر لاہور پہنچا تو مجھے کراچی سے آیا ہوا ایک خط ملا جس کی وجہ سے مجھے جلد سے جلد کراچی روانہ ہو جانا ضروری ہو گیا اور پھر کسی کے ساتھ تفصیلی اور اطمینانی ملاقات کرنے کی میرے لئے گنجائش نہیں رہی۔ اس لئے صرف مختصر ملاقات پر اکتفا کرنا ناگزیر ہو گیا ——— اس مختصر ملاقات میں ان حضرات سے جو کچھ عرض کرنا میں نے ضروری یا مناسب سمجھا وہ میں نے عرض کیا اور جو اُن حضرات نے فرمانا مناسب جانا انھوں نے فرمایا ——— اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ اس عاجز کے اور ان حضرات کے مسلک اور طرز فکر میں خاصا فرق اور بُعد ہے۔ بایں ہمہ یہ عاجز یہی خیال رکھتا ہے کہ دین کی غربت کے اس دور میں ہیں جہاں کہیں خیر کا اور دین کی خدمت کا کوئی پہلو نظر آئے ہم اس کی قدر کریں اور ایک دوسرے کے ساتھ نیک گمانی اور خیر خواہی کی بنیاد پر معاملہ رکھیں۔ صرف اسی طرح ایک طرف کا خیر دوسری طرف تک متعدی ہو سکتا ہے اور غلطیوں کے بچانے میں ہر ایک دوسرے کا مددگار بن سکتا ہے۔

لاہور سے کراچی روانگی اور حاجی عبدالجبار صاحب کے انتقال کی اطلاع:- ۱۸ر مارچ کی صبح کو لاہور سے کراچی کو روانگی ہوئی۔ رفیق مکرم بابو عبدالوہاب صاحب بی۔ اے (جو اس پورے سفر میں رفیق رہے) وہ بھی میرے ساتھ ٹرین میں سوار ہوئے۔ ٹرین لاہور سے روانہ ہوئی۔ بھائی عبدالوہاب صاحب کے ہاتھ میں اس وقت لاہور کا روزنامہ نوائے وقت تھا اچانک ان کی زبان پر جاری ہوا " انا للہ و انا الیہ راجعون میں نے کہا خیریت تو ہے؟ بھائی عبدالوہاب صاحب نے اخبار میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ اس میں اپنے حاجی عبدالجبار صاحب کے انتقال کی خبر ہے۔ میں بھی سناٹے میں رہ گیا۔ یوں تو موصوف سے تعلق و تعارف ۸۔۹ سال سے تھا لیکن ساتھ رہنے کا اتنا موقع کبھی نہ ملا تھا جتنا کہ اب کے ملا، کراچی میں آپ ہی کے یہاں میرا قیام رہا۔ اصل میں ساتھ رہنے سے ہی آدمی کی زندگی کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں اور جوہر کھلتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُن کی زندگی کو چند در چند پہلوؤں سے بڑا ہی قابل رشک پایا ——— غیب کا علم تو اللہ ہی کو ہے لیکن اپنے بشری اندازہ میں حق تعالیٰ نے ان کو بڑے انعامات و کمالات سے نوازا تھا رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین من عبادہ اگلے روز صبح کو ٹرین نے کراچی پہنچایا حاجی صاحب موصوف مرحوم کے خلف الرشید بھائی حاجی محمد ابراہیم صاحب لینے کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے ——— دین اور دین کے سلسلہ کی ہر چیز کا اصلی نتیجہ اور اجر تو انشاء اللہ آخرت کی زندگی میں جنت میں پہنچ کر ملے گا لیکن اللہ کے دیندار بندوں کو اس دنیا میں بھی اس کی جن برکتوں کا تجربہ ہوتا ہے سچی بات یہ ہے کہ اگر اہل دنیا کو کسی طرح صرف اسی کا علم ہو جائے تو اپنی محرومی اور بے نصیبی پر وہ بے چارے اپنا سر پیٹ لیں بلکہ خودکشی کر لیں۔ موت کا حادثہ اور وہ بھی گھر کے سب سے بڑے ذمہ دار کی اور بہت وسیع کاروبار کے چلانے والے کی اچانک موت کا حادثہ ایسی چیز ہے کہ ایسے مواقع پر اچھے اچھے سنجیدہ اور متوازن لوگ فکر و غم کے غلبہ سے اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں لیکن جن کو دین اور ایمان کی

یقین کی دولت نصیب ہوتی ہے وہ ایسے موقعوں پر قرآنی ہدایت کے مطابق انا للہ و انا الیہ راجعون کے ذریعہ اس یقین کو اپنے اندر تازہ کر سکے کہ جانے والا اپنے مالک و مولیٰ اور اپنے رحیم و کریم رب کے حکم سے ٹھیک اپنے مقررہ وقت پر اس کی بارگاہ کی طرف چلا گیا ہے اور ہم سب بھی ایک دن وہیں پہونچنے والے ہیں اور وہی ہمارا اصلی اور دائمی وطن ہے" اپنے کو ہلکا و مطمئن کر لیتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ اُن کی اُس خاص حالت اور وقتی حاجت و ضرورت کے مطابق اپنی خاص رحمت اور سکینت اُنکے قلوب پر نازل فرماتا ہے۔

۱۹ مارچ کی صبح کو یہ عاجز کراچی پہنچا تھا۔ ہندوستان واپسی کا پرمٹ ملنے کے انتظار میں پورا ایک ہفتہ پھر رہنا پڑا، اس قیام میں یہ دیکھ کر الحمدللہ جی بڑا خوش ہوا کہ حاجی صاحب مرحوم کے گھر والوں کی ان دنوں میں خاص فکر یہ تھی کہ اللہ کے تعلق اور آخرت کی فکر کو بڑھانے کا یہ خاص موقع اور وقت ہے اور ہمیں اس وقت سے یہ فائدہ اٹھانا چاہئے ——— اللہ تعالیٰ مرحوم کے ساتھ رحمت و کرم کا خاص معاملہ فرمائے اور پسماندگان کو اپنا تعلق اور اپنے دین سے وابستگی نصیب فرماتے ہوئے اپنی خاص رحمتوں اور نعمتوں سے نوازے۔

واپسی اور آخری پیغام:- ۱۱ر فروری کو یہ عاجز کراچی پہنچا تھا اور پورے ڈیڑھ مہینہ میں یہ سفر ختم کر کے ۲۶ر مارچ کی صبح کو دہلی واپس ہو گیا۔ اس پورے سفر میں پاکستان کے مختلف شہروں میں مسلمانوں کی جو زندگی دیکھی اور احباب سے جو کچھ سنا اس کا تقاضا ہے کہ سفر کے اس تذکرہ کو اس آخری بات پر ختم کروں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو ترقی دینے اور کمال تک پہنچانے کے لئے اور آخرت کی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی میں اس کو جنت کا مستحق بنانے کے لئے نبوت و رسالت کا جو سلسلہ انسانیت کے بالکل ابتدائی دور سے شروع فرمایا تھا اس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ختم فرمایا ——— آپ کی نبوت تمام دنیا کے لئے اور قیامت تک کے لئے ہے اس لئے اب کوئی نیا نبی نہیں آئے گا ——— اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ اپنی عمر طبعی پوری کر کے اس دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں لیکن دنیا میں نشر ہدایت اور دینی و روحانی تعلیم و تربیت کا جو کام بحیثیت نبئ وقت کے آپ کو کرنا تھا وہ ہر دور اور ہر زمانہ میں آپ کی نیابت میں آپ کی امت کو کرنا ہے اور یہ اس امت کا طغرائے امتیاز ہے کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الخ. بہرحال اب یہ ساری امت اپنے منصب و مقام کو پہچانے تو یہ اپنے نبی کی نائب ہے اور قیامت تک کے لئے کارِ نبوت اس کے سپرد ہے ——— بس آپ کا جو امتی جس حال میں جہاں ہے اسے سمجھنا چاہئے کہ وہ اُس جگہ کے لئے اسلام کا نمائندہ اور ذمہ دار ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والے مقصد کے لئے اُسے جینا اور مرنا ہے ——— لیکن وہ ممالک جو اپنے کل باشندوں یا ان کی غالب اکثریت کے مسلمان ہونے کی وجہ سے اسلامی ممالک کہلائے جاتے ہیں اور جن کا سیاسی نظم و نسق بھی تمام تر مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں ہے اُن کی ذمہ داری نیابتِ نبوت کے اس کام کے بارے میں یقیناً بہت بڑی اور بہت وسیع ہے ——— اور اُن میں سے بھی خاص طور پر

پاکستان جو اسلام ہی کے نام پر بنا ہے اس وقت اس کے سب مسلمان باشندوں کی خواہ وہ عالم ہوں یا غیر عالم، امیر ہوں یا غریب حاکم ہوں یا عام شہری، تاجر ہوں یا مزدور، بہرحال سب کی اپنی اپنی حیثیت اور حالت کے مطابق یہ ذمہ داری ہے کہ وہ خود سچے مسلمان بنیں اور اسلام کی دعوت اور خدمت کا اس کو مرکز بنائیں۔ اگر انھوں نے اپنے اس فرض کو اور اسلام کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حق کو ادا نہ کیا اور "اپنی حکومت" سے صرف وہی مادی منافع اور دنیوی ترقیاں حاصل کرنے کو اپنا مقصد بنائے رکھا جو دنیا کی ساری خدا فراموش قومیں اپنی حکومت اور اپنے اقتدار سے حاصل کرتی ہیں تو آخرت میں اس کا جو انجام ہوگا وہ تو مرنے کے بعد سامنے آئے گا لیکن قرآن مجید نے ایسے مجرموں کو دنیا ہی میں ظاہر ہونے والے جن برے انجاموں سے جا بجا ڈرایا ہے اُن کے ظہور سے بھی بے خوف نہیں رہنا چاہیئے!

اس وقت تمام دنیا کے مسلمان اور خصوصاً اسلامی ممالک کہے جانے والے ملکوں کے مسلمان دو راہے پر ہیں۔ یا تو وہ دین کے بھولے ہوئے سبق کو یاد کریں اور ایک تازہ ایمان کے ذریعہ اللہ و رسول سے اپنا رشتہ پھر سے اور نئے سرے سے جوڑ کر اور اپنے لئے نبوت کی نیابت والی اور دعوت والی زندگی اختیار کرکے پیغمبروں کے طریقہ پر دنیا کی رہنمائی کریں اور اس کو تباہ ہونے سے بچائیں۔

یا اگر خدانخواستہ ایمان کے اس راستہ سے مطمئن نہیں ہیں اور اس بارہ میں ان کا ذہن بدقسمتی سے صاف نہیں ہے اور اس لئے اس زمانہ کی خدا فراموش، مادہ پرست عروج یافتہ قوموں کی نقالی اور پیروی ہی میں وہ اپنی ترقی منحصر سمجھتے ہیں تو پھر یہ راستہ تو چالو ہے ہی، آپ بھی اگر اس پر چلنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو چلیں اور اس کا جو انجام ہونے والا ہے اس کے منتظر رہیں۔

فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ○

انتخاب

ادارہ

سچی باتیں سنن ابن ماجہ۔ حدیث نبوی کی مشہور و مستند کتابوں میں ہے اس کی کتاب الحدود کے باب المخنثین کے ماتحت حدیث ذیل نظر سے گزری:۔

عن صفوان ابن امیۃ قال کنا عند رسول اللہ صلعم فجاء عمرو بن قرۃ فقال یا رسول اللہ ان اللہ قد کتب علی الشقوۃ فما ارانی ارزق الا من دفی بکفی فأذن لی فی الغناء فی غیر فاحشۃ فقال رسول اللہ صلعم لا آذن لک ولا کرامۃ ولا نعمۃ عین کذبت اے عدو اللہ لقد رزقک اللہ طیبا حلالاً فاخترت ما حرم اللہ علیک من رزقہ مکان ما احل اللہ عز وجل لک من حلالہ ولو کنت تقدمت الیک لفعلت بک وفعلت قم عنی وتب الی اللہ۔

صفوان بن امیہؓ سے روایت ہو کہ ہم لوگ رسول اللہ صلعم کے ہاں حاضر تھے کہ عمرو بن قرۃ آپ کے پاس آیا اور بولا کہ اے رسول اللہ میرے مقسوم میں اللہ نے بدبختی لکھدی تو میرے لیے کمائی کی کوئی راہ نہیں بجز اس کے کہ اپنے ہاتھ سے دف بجا بجا کر کماؤں۔ سو مجھے اجازت دیجئے گانے کی، بلا فحش کاری کے آپ نے فرمایا میں تجھے نہ اجازت دوں گا، نہ اجازت دے کر تجھے عزت دوں گا، اور نہ تیری آنکھ ٹھنڈی کروں گا۔ اے اللہ کے دشمن تو جھوٹ بولتا ہے۔ اللہ نے تو تجھ کو حلال پاکیزہ روزی دی تھی۔ لیکن تو نے حلال کے بجائے وہ روزی اختیار کی جو تجھ پر حرام تھی۔ اور اگر میں پہلے تجھے اس سے روک چکا ہوتا تو میں تجھے سزا دیتا اور ضرور دیتا، اٹھ میرے پاس سے دور۔

خلق مجسم و پیکر حلم و رافت کا عتاب گویئے پر ابھی ختم نہیں ہوا۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ گویّا تھا فحش سرائی فحش کاری برہنگی وغیرہ کسی اور جرم کا مجرم نہ تھا۔

اما انک ان تعلت بعد التقدمة الیک ضربتک ضربا وجیعا وحلقت راسک مثلة ونفیتک من اھلک واحللت سلبک نھبة لفتیان اھل المدینة فقام عمرو وبہ من الشرة الخزی مالا یعلمہ الا اللہ فلما ولی قال النبی صلعم ھولاء العصاة من مات منھم بغیر توبة حشرہ اللہ عزوجل یوم القیامة کما کان فی الدنیا۔

خبردار اگر تو نے پھر یہ کیا جس کو میں منع کر چکا تو تجھے سخت مار ماروں گا، اور بطور سزا کے تیرا سر منڈا دوں گا اور تجھکو تیرے گھر والوں سے نکلوا دوں گا۔ اور تیرا سامان مدینہ کے نوجوانوں سے لٹوا دوں گا۔ یہ سن کر عمرو کھڑا ہوا اور اس کو ایسی ذلت و رسوائی ہوئی کہ بس اللہ ہی جانتا ہے۔ جب وہ پیٹھ پھیر کر چلا تو آپ نے فرمایا کہ یہی لوگ گنہگار ہیں ان میں سے جو کوئی بغیر توبہ کیے مرجائے گا۔ اللہ اسے ویسا ہی اٹھائے گا جیسا وہ دنیا میں تھا۔

گویوں، سرودیوں، سازندوں، طبلچیوں، میوزک ماسٹروں، میوزک ڈائرکٹروں، پلے بیک سنگروں، ایکٹروں فلم ایکٹرسوں کے دلوں میں ایمان کا ابھی کوئی بھی درجہ باقی ہے، سوال صرف ان کی خدمت میں بڑے ادب اور لجاجت کے ساتھ ہے کہ آخر اپنا کیا انجام انھوں نے سوچا ہے؟ (صدق جدید)

جرم و سزا اور جرم

لاہور ۵ر اپریل، چیف جسٹس آنریبل مسٹر محمد منیر اور جسٹس عطا محمد جان نے آج اردو کے افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کو فحش نگاری کے جرم میں تین سو روپیہ جرمانہ (ورنہ پھر ایک ماہ قید با مشقت) کی سزا کا حکم سنا دیا۔ یہ سزا ان کو ایک فحش افسانہ "ٹھنڈا گوشت" لکھنے پر ہوئی ہے۔ مجسٹریٹ نے ابتداءً انھیں مجرم قرار دیا تھا مگر اڈیشنل جج مسٹر عنایت اللہ خاں نے انھیں بری کر دیا تھا حکومت نے اس کے خلاف اپیل دائر کی۔ اور اب ہائی کورٹ سے یہ سزا ملی ہے، ہائی کورٹ نے اپنے فیصلہ میں کہا ہے کہ افسانہ مذکور کے بعض حصے یقیناً فحش ہیں۔ اور قانون کی زد میں پوری طرح آجاتے ہیں۔ نیز یہ کہ پاکستان کے بعض ادبی حلقوں میں جن کے ایک رکن منٹو بھی ہیں۔ ادب میں شرافت کے بارہ میں بڑے غلط نظریئے پھیلے ہوئے ہیں۔ ابتدائی عدالت میں ملزم کی صفائی میں عابد علی عابد پرنسپل دیال سنگھ کالج، مسٹر احمد سعید پروفیسر دیال سنگھ کالج، اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم پیش ہوئے تھے۔ اور شہادت جرم کیطرف سے مولانا تاجور نجیب آبادی، ڈاکٹر لطیف ناظم شعبۂ نفسیات فورمین کالج لاہور، آغا شورش کاشمیری اور ابو سعید بزمی اڈیٹر احسان"۔

ہائی کورٹ کا ملزم کو مجرم قرار دینا یقیناً قابل داد ہے۔ لیکن اگر فحش نگاری قومی اخلاق کے بگاڑنے

کے مرادف ہے تو ایسے سنگین جرم کے لیے اتنی ہلکی سزا کی مصلحت ہم عامیوں کی فہم سے بالاتر ہے۔ تین سو کی رقم دے کر اگر نفع تین ہزار کا اٹھایا جا سکتا ہے تو یہ جرمانہ کیا ہوا، یہ تو اور انعام ہوا! ——— یہ نرمی اگر ججوں کی تھی تو بے محل بلکہ سخت مضر اور اگر یہ نقص خود قانون کا ہے۔ تو ایسا ناقص قانون ہی بدلوانے کے قابل ہے اور یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر پاکستان کے سارے اسلامی پریس کو متفق اللفظ ہو کر زور لگانا چاہیئے فحش نویسی کی بلا ایک نیم اسلامی ملک میں کسی طرح بھی قابل برداشت نہیں۔ (صدق جدید)

درکوئے نیکنامی مارا گزر نہ دادند

ملک کی مشہور ترین فلم ایکٹرس کی زبان سے:-

ہم لوگ اتنے بُرے نہیں جتنے کہ پبلک سمجھتی ہے۔ میں مانتی ہوں کہ فلم لائن میں بعض لوگ ایسے شامل ہوئے جنھوں نے اسے بدنام کیا میں جانتی ہوں کہ کچھ پیشتر معزز گھرانے کے لوگ اپنے لڑکوں، لڑکیوں کو اس لائن میں جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے ان کا خیال تھا کہ فلمی دنیا میں صرف بُرے ہی لوگ ہوتے ہیں لیکن وہ غلطی پر تھے یہ بات نہیں کہ فلمی دنیا بُری ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ اچھے اور شریف آدمی جو اس لائن میں آتے ہیں۔ بُرے ہی بن جاتے ہیں اور بُرے کبھی اچھے بننے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ بس اس طرح انڈسٹری بدنام ہو گئی ہے۔

بڑی خیر ہوئی جو فلمی لائن بری نہ ہوئی! برے نہ ہونے پر یہ حال ہے کہ جو اچھا اس میں جاتا ہے وہ برا بن جاتا ہے۔ اور جو برا جاتا ہے وہ اچھا بننے کی کوشش ہی نہیں کرتا! اگر یہ لائن کہیں واقعی بری ہوتی تو خدا معلوم کیا حال ہو کر رہتا! ——— سچائی اپنے آپ کو خواستہ و ناخواستہ کن کن طریقوں سے ظاہر کرتی رہتی اور اپنی آواز کتنے کتنے پردوں کے اندر سے بھی نکالتی رہتی ہے۔! (صدق جدید)

موت کی بارش

ایٹم بم نے ہیروشیما اور ناگاساگا میں جو تباہیاں مچائی تھیں وہ نظروں کے سامنے ہیں۔ اور ان سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہے کہ اگر جنگ ہوئی اور اس میں ایٹم بم استعمال کیے گیے تو انسانیت اور تمدن اور کلچر سب کچھ فنا ہو جائیں گے۔ آگے چل کر ایٹم بم نے ہیڈروجن بم کی شکل اختیار کی ہے اس طرح اس کی بربادی کی طاقت دس گنا بڑھ گئی۔ پھر اس میں کچھ اور ترقی ہوئی اور اب شاید یہ بم اس حد تک طاقت ور ہو چکا ہو کہ صرف دو بم کسی چھوٹے ملک کو ریگستان بنا سکتے ہیں۔

امریکا اب جراثیمی اسلحہ بنا رہا ہے اور اس کی دی ہوئی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ روس نے بھی ادھر توجہ کی ہو۔ جراثیمی اسلحہ کا مطلب یہ ہو کہ ہیضہ، طاعون، چیچک اور اس قسم کے وبائی امراض کے جراثیم کو دشمن کے ملک میں اس طرح گرا دیا جائے گا کہ وہ کارگر ہوں، یعنی ملک کی تمام آبادی کو مریض بنا دیں۔ ذرا تصور کیجئے ایسے اسلحہ استعمال کرنے کے بعد ملکوں کی حالت کیا ہو جائے گی؟ بوڑھے، بچے، مرد، عورتیں سب

وبائی امراض میں گرفتار ہیں اور سسک رہے ہیں۔ ڈاکٹر، نرس، اسپتال کا سب عملہ بھی شکار ہے۔ ہزاروں اور لاکھوں انسان دم توڑ رہے ہیں اور کوئی حلق میں پانی کی بوند تک ٹپکانے والا نہیں ہے۔ پھر جب اس حالت میں جنگ ختم ہوگی تو اس کے خاتمے کے ساتھ وبائیں ختم نہیں ہوں گی۔ ان پر قابو حاصل کرنے کے لیے یا تو فاتح کو اربوں روپے کی دوائیں کرنا ہوں گی اور ایک بہت بڑے عملے کی مدد سے برسوں حفظان صحت کے سخت ترین اور حقیقی ترین طریقے اختیار کرنا ہوں گے یا پورے ملک کا قرنطینہ کر دیا جائے گا کہ جو لوگ مرتے ہیں وہ مرتے رہیں۔ اس اسلحہ کے استعمال کے بعد بہت طویل عرصے کے لیے مفتوح ملک کے سب کارخانے بند ہو جائیں گے، اسکولوں میں تالے پڑ جائیں گے اور ملک کا نظم و ضبط ختم ہو جائے گا، افراتفری، لوٹ مار اور بداخلاقیاں عام ہو جائیں گی۔

اس تصویر پر جتنا غور کرو اتنا اس کا بھیانک پن زیادہ نظر آتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس جنگ کی تیاری وہ ممالک کر رہے ہیں جو اپنی تہذیبوں کو دنیا کے لیے نجات سمجھتے ہیں۔

(قومی آواز)

(بقیہ صفحہ ۲۷)

کی غلامی میں ڈوبے ہوئے اور مظاہر وزوائد کی طرف متوجہ ہیں بلکہ اگر اجازت ہو تو میں صاف صاف یہ بھی کہہ دوں کہ ان محرکات کے فقدان کی ذمہ داری موجودہ نظام تعلیم پر بھی عائد ہوتی ہے، کیونکہ اس نظام میں جتنا لحاظ و اہتمام مواد اور معلومات کا کیا جاتا ہے اتنا مقاصد و محرکات کا نہیں کیا جاتا، حالانکہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ صحیح محرکات اور اچھے مقاصد کے بغیر معلومات کی کثرت اور آلات و وسائل کی فراوانی انسانی سوسائٹی اور تہذیب کے لئے ایک زبردست خطرہ ہے۔ تہذیب یورپ کی کمزوری کا اصل سرچشمہ یہی ہے اور وہ دن دور نہیں ہے جب اس تہذیب کا یہ روگ اُسے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیگا۔ موجودہ نظام تعلیم کو دیکھ کر مجھے خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ چیز ہماری زندگی میں بھی کمزوری اور ناکامی کا سرچشمہ نہ ثابت ہو بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس نقص کا اگر تدارک نہیں کیا جاتا ہے تو فلسطین کا واقعہ مستقبل کے بڑے خطرات کی صرف ایک تمہید اور بروقت آگاہی ثابت ہوگا۔ خدا نہ کردہ۔

(باقی آئندہ)

بقیہ مضمون صفحہ (۱۶)

سے جو راہ متعین فرما دی گئی ہے وہی بالکل صاف سیدھی ہر طرح کی کجی (عوج) سے پاک راہ ہے، اس سے ذرہ برابر ادھر ادھر بھٹکنا گمراہی میں پڑنا ہے۔

البتہ آخرت کا یہ راستہ ـــــ چونکہ دنیا ہی سے ہو کر گیا ہے اس لیے بقدر ضرورت ایسی ہدایات دنیا ضروری تھا کہ منزل کھوئی ہوئے بغیر جہاں تک ہو سکے راستہ امن و راحت کے ساتھ طے ہو۔ نہ یہ کہ راستہ کے تماشوں اور دلچسپیوں میں کھو کر منزل ہی کھو جائے۔ عہد جدید کے فرنگستان کی لائی اور سکھائی جدید معاشیات و سیاسیات کی بنیاد بالکلیہ اسی آخرت فراموشی بلکہ آخرت بیزاری پر ہے اور یہی رجحان ساری دنیا پر ایسا چھا گیا ہے کہ راقم ہذا کو تو سچ پوچھئے "اسلامی معاشیات" یا "اسلامی سیاسیات" کی تعبیر سے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے کہ ان اصطلاحات میں معیشت و سیاست کی ضمنی و ذیلی یا وسائلی اہمیت سے زیادہ ہی نہیں بالکلیہ مقصدی اہمیت و معنویت پیدا ہو گئی ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ یہ تعبیرات و اصطلاحات جنھوں نے پھیلائی ہیں اور ان کو مستقل علم و فن دعوت و آئیڈیالوجی کا درجہ دیا ہے ان کی نظر میں یہ ضمنی و ذیلی وسائل نہیں اعلیٰ مقاصد ہی ہیں۔ جو تہذیب و تمدن بھی آخرت سے اپنا رشتہ کاٹ لے لازماً اس کی دنیوی زندگی ہی کے سارے شعبے اور ان کے مسائل ہی زندگی کا محور و مرکز بنکر رہ جائیں گے۔

بہرحال اب آگے نام نہاد اسلامی معاشیات، اور اسلامی سیاسیات پر جو کچھ گفتگو ہوگی اس کا تجدیدی و اصلاحی پہلو یہی ہوگا کہ ان کی حیثیت اسلامی زندگی کے مقاصد کی نہیں وسائل کی ہوگی۔ یعنی معاشی فراغ و رفاہیت اور سیاسی اقتدار و حکومت صرف اسی حد تک مطلوب و مقصود قرار پائے گی جس حد تک اس سے آخرت و انسانیت کے طلب و تکمیل میں اعانت ہو اور جو معیشت یا سیاست جس درجہ میں اس کے منافی یا بذات خود مقصود ہوگی اسی درجہ میں مردود ٹھہرے گی یہی اسلامی و غیر اسلامی معاشیات و سیاسیات کا مابہ الامتیاز ہوگا۔ وما توفیقی الا باللہ وعلیہ التکلان ـــ

اعتراف

از محمد منظور نعمانی

جمادی الاولیٰ کے "الفرقان" میں تنقید و تبصرہ کے زیر عنوان "ارواح ثلثہ" اور خاص طور سے اس کے حواشی کے متعلق جو رائے الفرقان کے تبصرہ نگار نے ظاہر کی تھی مدراس کے ایک صاحب علم بزرگ نے (اللہ ان کو جزائے خیر دے) ایک گرامی نامہ کے ذریعہ اس عاجز کو اس کی غلطی کی طرف توجہ دلائی ہے۔

اس تبصرہ میں واقعۃً دو افسوس ناک غلطیاں ہوئی ہیں۔

ایک یہ کہ بعض بزرگوں کے احوال یا اقوال کی توجیہات کو (غالباً اپنے خیال میں مستبعد سمجھتے ہوئے) غلو اور افراط قرار دیا ہے۔ حالاں کہ ان توجیہات کا مقصد ان بزرگوں کے ساتھ حسن ظن باقی رکھنے کی اور حتی الوسع ان کو طعن و اعتراض سے بچانے کی کوشش کرنا ہے اور اس مقصد کیلئے اگلوں کے اقوال و احوال کی گنجائش کی حد تک توجیہ و تاویل کرنے میں بعض بڑی اہم دینی مصلحتیں ہیں اور بہت سے مقاصد کا سدباب ہے — لیکن ان مصالح اور مفاسد تک ہر ایک کی نظر نہیں جاتی، اس لیے بہت سے لوگ اس کا منشا غلو اور افراط سمجھتے ہیں۔ الفرقان کے تبصرہ نگار عزیز سے بھی یہاں یہی غلطی ہوئی ہے۔

دوسری غلطی ان سے یہ ہوئی ہے کہ اس رائے کے اظہار میں جو زبان استعمال کی گئی ہے اس میں وہ ادب ملحوظ نہیں رہا جو ایسے موقعوں پر ضروری ہے — اپنے اکابر اور متقدین کی آراء تحقیقات سے اختلاف کرنا یا بضرورت ان کی کسی غلطی کو ظاہر کرنا ہمیشہ سے رہا ہے لیکن امت میں جب تک یہ کام ادب اور فرق مراتب کی رعایت کے ساتھ ہوتا رہا اس سے خیر ہی پیدا ہوتا رہا اور جب سے یہ حد ٹوٹی ہے آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ اس سے کس قدر شر پیدا ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ غلطیوں سے بچنے کی ہم کو توفیق دے اور جو غلطیاں ہو جائیں ان کو ہماری تربیت کا ذریعہ بنائے۔

پاکستانی احباب کو چند اہم اطّلاعات

۱۔ آئندہ سے پاکستان کے لیے "الفرقان" کا سالانہ چندہ پاکستانی سکّہ سے صرف چار روپئے کر دیا گیا ہے۔ اور ایجنٹوں سے خریدنے والے حضرات کے لیے ایک کاپی کی قیمت پاکستانی میں ۶ کر دی گئی ہے۔

۲۔ پاکستانی احباب آئندہ سے اپنے چندہ کی رقم "ناظم صاحب ادارۂ اصلاح و تبلیغ، آسٹریلین بلڈنگس لاہور" کے پتہ پر منی آرڈر سے روانہ کیا کریں، اور منی آرڈر کے کوپن میں اپنا نام اور پتہ صاف لکھیں، اور یہ بھی لکھیں کہ یہ روپئے "الفرقان لکھنؤ" کے چندہ کے ہیں، اور ایک خط کے ذریعہ "دفتر الفرقان لکھنؤ" کو بھی اس کی اطلاع ضرور دیدیا کریں، کہ ہم نے فلاں تاریخ کو الفرقان کے چندہ کے اتنے روپئے "ادارۂ اصلاح و تبلیغ لاہور" کو روانہ کیے ہیں (اور قدیم خریدار اپنا خریداری نمبر بھی ضرور لکھیں۔)

۳۔ وی پی سے رسالہ بہت تاخیر سے پہنچے گا اس لیے یہی بہتر ہے کہ رسالہ جاری کرانے والے حضرات مندرجہ بالا پتہ پر منی آرڈر کر دیں اور ہمیں اطلاع دیدیں۔

۴۔ جن حضرات کے ذمہ "الفرقان" یا "کتب خانہ الفرقان" کی کوئی رقم واجب الادا ہے، یا جو آئندہ کتب خانہ الفرقان سے کتابیں منگوائیں، وہ اپنی رقوم مذکورہ بالا پتہ پر لاہور ہی روانہ کر دیں اور اس کے ساتھ رقم بھیجنے کا مقصد منی آرڈر کوپن میں ضرور لکھ دیں، اور ایک علاحدہ کارڈ براہِ راست دفتر الفرقان لکھنؤ کو بھی ضرور بالضرور تحریر فرمائیں، اسمیں ہرگز غفلت نہ کریں۔

۵۔ الفرقان کا چندہ اور کتابوں کی رقوم آپ بنک کے ذریعہ براہِ راست "منیجر الفرقان لکھنؤ" کے نام بھی روانہ کر سکتے ہیں۔ دونوں حکومتوں نے اس کو منظور کر لیا ہے کہ اخبارات و رسائل اور کتابوں کی قیمتیں بنک کے ذریعہ ایک ملک سے دوسرے ملک کو بھیجی جا سکتی ہیں۔ اس کا طریقہ اور اس کے قواعد آپ اپنے مقامی بنک سے دریافت کر سکتے ہیں۔

۶۔ معلوم ہوا ہے کہ پاکستان میں بعض خریداروں کو "الفرقان" باقاعدہ نہیں پہونچتا، براہ کرم ایسے حضرات دفتر الفرقان کو ضرور اطلاع دیدیا کریں، دفتر سے پرچہ کی روانگی پوری احتیاط سے خوب دیکھ بھال کے سب خریداروں کیجاتی ہے، اس کے باوجود اگر پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع ہمیں دیدی جائے تو دفتر میں پرچہ باقی ہونے کی صورت میں انشاء اللہ ہم دوبارہ بلا قیمت بھیجیں گے۔

ناظم۔ دفتر الفرقان، لکھنؤ

V.P.P. 1340. g. C. Rs 5-9-0.

3-6-52

فہرست مضامین

جلد (۱۹) بابتہ ماہ شعبان ۱۳۷۱ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۵۲ء نمبر (۸)

سرخ پنسل کا نشان اس بات کی علامت ہے کہ جناب کی مدت خریداری اس شمارہ پر ختم ہوگئی ہے۔ لہٰذا اپنا چندہ برائے ایک سال مبلغ پانچ روپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرماکر مشکور فرمائیے۔ اگر ۳۰ جون ۱۹۵۲ء تک جناب کا چندہ وصول نہ ہوا، اور نہ کوئی اطلاع آئی تو اگلا پرچہ وی، پی بھیجا جائے گا جس کا وصول کرنا جناب کا اخلاقی فریضہ ہوگا ـــــــ پاکستان کے حضرات اب اپنا چندہ سکریٹری صاحب "ادارہ اصلاح و تبلیغ" آسٹریلین بلڈنگس لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں اور ایک کارڈ کے ذریعہ ہم کو اس کی اطلاع ضرور دیدیں، اور قدیم خریدار صاحبان اس اطلاع کے ساتھ اپنا نمبر خریداری بھی ضرور لکھیں۔ اگر آپ کے چندہ کی اطلاع ۳۰ جون ۱۹۵۲ء تک موصول نہیں ہوئی تو "ادارہ اصلاح و تبلیغ لاہور" سے آپ کی خدمت میں "الفرقان" بذریعہ وی، پی ارسال کیا جائے گا ـــــــ دیگر ممالک کے حضرات اپنا چندہ ۱۲ شلنگ بذریعہ پوسٹل آرڈر دفتر "الفرقان" لکھنؤ کو ارسال فرمائیں۔

والسلام

ناظم الفرقان لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شایع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

یہ شعبان کا شمارہ ہے جو انشاءاللہ رمضان کی ابتدائی تاریخوں میں آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔ اس لیے اس میں صرف رمضان مبارک ہی سے متعلق مضامین درج کیے گیے — یہ مضمون اگرچہ ۴۸ صفحات سے زیادہ پر ہیں لیکن گنتی میں صرف تین ہیں۔ خدا کرے ناظرین کرام کو ان سے وہ نفع ہو جس کی امید پر لکھنے والوں نے ان کو لکھا ہے، اور اللہ تعالیٰ "احیاء رمضان" کے سلسلہ کی مقبول کوششوں میں ان مضامین کو بھی شامل فرمالے — پہلے دو مضمون علمی قسم کے ہیں خصوصاً ہمارے مخدوم و محترم مولانا گیلانی کا مضمون "روزہ اور قرآن" (جو دراصل رمضان اور روزہ سے متعلق چند آیات قرآن کی تفسیر ہے) اس قسم کے ان کے دوسرے مضامین کی طرح بعض بہت ہی نادر اور عام افہام سے بالاتر نکات پر مشتمل ہیں جن تک ان ہی کا ذہن پرواز کر سکتا ہے — ان دو مضمونوں کے بعد آخر میں راقم سطور کی ایک تقریر ہے جو حال ہی میں ایک اجتماع میں کی گئی تھی، جیسا کہ ناظرین کرام انشاءاللہ خود بھی محسوس کریں گے اس تقریر کا مقصد صرف یہ تھا کہ اللہ کے بندے رمضان مبارک کی عظمتوں اور خاص برکتوں سے واقف ہوں اور اس ماہِ رحمت کا استقبال اس طرح کریں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی نسبت رکھنے والے اہل ایمان کو کرنا چاہیے — اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس امت کو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوتِ عظمیٰ کا سایہ نصیب فرمایا اور جس طرح اس کو کعبہ اور قرآن نصیب فرمایا اس طرح کے امتیازی عطایا میں سے ایک رمضان کا پورا مہینہ اور شب قدر بھی ہے — افسوس آج اس مقدس مہینہ کی عظمتوں اور خاص رحمتوں سے بیچارے عوام کا کیا ذکر بہت سے خواص بھی بے خبر یا غافل ہیں۔ یہ تقریر اسی مقصد کے لیے کی گئی تھی کہ اللہ کے بندے رمضان کی عظمت کو جان کر اس کی خاص رحمتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہوں — اگر آپ مسجدوں یا مجلسوں میں اللہ کے بندوں کو یہ تقریر پڑھ کر سنائیں تو امید ہے کہ انشاءاللہ اللہ کے بہت سے بندوں کو اللہ سے جوڑ دینے کا اور رحمت و مغفرت کا مستحق بنا دینے کا آپ ذریعہ بن جائیں گے۔ اور کسی مومن بندہ کے لیے یہ سب سے بڑی سعادت ہے۔ وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون۔

یہ چند کلمات محبین الفرقان کی خدمت میں :-

جی چاہتا ہو کہ الفرقان کے صفحات میں اس کی مالی مشکلات کا ذکر کبھی نہ آیا کرے لیکن جب حالات مجبور کر دیتے ہیں اور اس کی زندگی خطرہ میں نظر آتی ہے تو "اضطرار" یہ ناخوشگوار تذکرہ کرنا ہی پڑجاتا ہو اور اللہ ہی جانتا ہو کہ دل پر کس قدر جبر کر کے اس سلسلہ میں کبھی کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ الفرقان جیسا ہر خشک دینی رسالہ جس کی زندگی کا سرمایہ اس کے خریداروں کے چندہ کے سوا کچھ بھی نہ ہو اس عالم اسباب میں صرف اسی طرح زندہ اور جاری رہ سکتا ہے کہ اس کے خریداروں سے وصول ہونے والا روپیہ اس کے مصارف کی کفالت کر سکے لیکن الفرقان پر اس کی پوری عمر میں بہت کم وقت ایسے آئے ہیں جبکہ اس کی آمدنی اس کے مصارف کے لیے کافی رہی ہو ——— خصوصاً جب سے ہندستان و پاکستان کے درمیان منی آرڈر اور وی پی کا سلسلہ بند ہوا ہے پاکستان میں الفرقان کے خریداروں کی تعداد شاید نصف بھی نہیں رہی ہے (حالانکہ تقسیم سے پہلے الفرقان قریباً ۰۰ فیصدی پنجاب اور سندھ و سرحد ہی میں جاتا تھا)۔

بہرحال اس کمی کا یہ نتیجہ ہے کہ الفرقان کا مالی مسئلہ دفتری کارکنوں کے لیے روز بروز زیادہ پریشان کن اور تکلیف دہ ہوتا جا رہا ہے ——— اب سے آٹھ مہینے پہلے سال رواں کے پہلے شمارہ میں بھی اس سلسلہ میں کچھ عرض کیا گیا تھا، اس وقت بعض محبین و مخلصین نے (اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے) نئے خریداروں کے کوشش کی کچھ زحمت فرمائی تھی، اور اس سے کچھ نہ کچھ سہارا ضرور ملا تھا لیکن اس کے بعد بھی الفرقان کی آمدنی میں اس کے مصارف کی بہ نسبت قریباً سو سوا سو روپیہ ماہوار کی مستقل کمی ہے جو کارکنوں کے لیے مستقل فکر اور پریشاں خاطری کا باعث بنی رہتی ہے، اور یہ کمی قریباً چار سو خریداروں کے اضافہ سے پوری ہو سکتی ہے، اگر الفرقان کے ناظرین میں سے صرف سو مخلص احباب (جو الفرقان کو خدمت دینی کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں) اس کا ارادہ فرما لیں کہ وہ اس رمضان میں انشاء اللہ چار چار خریدار فراہم کرنے کی کوشش فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ کے کرم سے امید ہے کہ یہ مسئلہ مستقل طور پر حل ہو جائے گا ——

ہمارا آپ کا کام اسباب اور تدابیر کی راہ سے کوشش کرنا ہے اور انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منک الجد تبارکت ربنا و تعالیت۔

فریضۂ رمضان کی حکمتیں

(از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی)

اس مقالہ میں "حجۃ اللہ البالغہ" سے استفادہ کیا گیا ہے

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْن ــــــ

اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسے تم سے پہلوں پر کئے گئے تھے، تاکہ شاید تم میں تقویٰ پیدا ہو۔

اسلام اپنے پیروں کو جس اعتدال، ضبط نفس، اطاعت اور روحانیت کے کمال تک پہونچانا چاہتا ہے اس کے لیے اس نے دو راستے اختیار کیے ہیں۔

جو اشیاء اور اعمال انسان کی زندگی میں خود فراموشی سخت بے اعتدالی معصیت اور ارتکاب جرم کی طرف طبعی میلان، پستی اور بے عملی کیطرف رجحان اور سرکشی کیطرف رغبت، دنیا کی زندگی کی بڑھی ہوئی ہوس، اور تعیش و فسق و فجور کا بحران، بے حیائی اور بے غیرتی کی ترغیب پیدا کرتے ہیں ان سب کو اس نے ابدی طور پر انسان کے لیے ممنوع قرار دیدیا۔ جسمیں عمر کے کسی مرحلے، زمانے کے کسی اختلاف، اور ملک و مقام کے کسی امتیاز کو دخل نہیں ہے۔ ممنوعات کی اس فہرست میں وہ تمام معاصی داخل ہیں جو کبھی انسان کے لیے حلال اور جائز نہیں، مثلاً شراب، لحم خنزیر، قمار، ربوا، مال حرام اور دوسرے معاصی۔

جب کوئی شخص اسلام قبول کرتا ہے یا مسلمان سن بلوغ کو پہونچتا ہے تو وہ ان تمام چیزوں سے روزہ رکھ لیتا ہے اس روزے کی ابتدا ریا اس زندگی کی صبح صادق! اسلام کے احکام کا مخاطب بن جانا ہے۔ اب اس روزے کا افطار عمر کے آفتاب کے غروب ہونے سے پہلے نہیں ہے۔ یہ ایک طویل روزہ ہے جو ہر مسلمان کو سفر و حضر میں رکھنا ہوتا ہے اور حالت اضطرار (شرعی) کے سوا کوئی استثناء نہیں، شریعت کے مقاصد کے حصول کے لیے اور ان معاصی کو بند کرنے کے لیے جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے یہ روزہ لازمی ہے۔

ان منصوص چیزوں کے علاوہ لذت کی تمام چیزیں (بشرطیکہ وہ حرمت و کراہت سے خالی ہوں) مباح اور جائز ہیں ان سے خواہ مخواہ کے لیے رکنا پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھا گیا ہے اور ان حلال چیزوں کو اپنے لیے حرام کر لینا شریعت میں ایک طرح کی تحریف، دین میں تشدد اور کفران نعمت قرار دیا گیا ہے۔

آپ کہدیجئے کہ کس نے حرام کیا ہو اللہ کی اس زینت اور پاک رزق کو جو اُسنے اپنے بندوں کیلئے نکالا ہو آپ کہدیجئے کہ یہ سب چیزیں ایمان والوں کیلئے دنیا میں بھی ہیں اور آخرت میں تو ہیں

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ

دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ کھانا پینا ناجائز نہیں بلکہ اسراف ناجائز ہے۔

پس کھاؤ اور پیو اور اسراف مت کرو

فَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا

لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان مباحات و لذائذ کا بے قید اور دائمی استعمال، لذتوں میں انہماک اکل و شرب کی دائمی آزادی، اس جادہ اعتدال سے انسان کو ہٹا دیتی ہے جس پر دین مسلمان کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اسکے رجحانات اور مقاصد زندگی کو بدل دیتی ہے اور بعض اوقات نفس پروری، شکم پروری، نا و نوش اور عیش کوش مقصود زندگی بن جاتا ہے۔ طبیعت میں ایک طرح کی بلادت اور بے حسی پیدا ہوجاتی ہے۔ ضبط نفس اور جفاکشی کی قوت باقی نہیں رہتی، تن آسانی تنعم کی خو پیدا ہوجاتی ہے۔ انسانیت کی روح کچل جاتی ہو اور روحانی جذبات مردہ ہوجاتے ہیں، سالہا سال اور بعض اوقات پوری عمر، حقیقی روحانی مسرت، سبک روحی، دماغ کی یکسوئی، ذکر و عبادت میں لذت، مناجات کی حلاوت نصیب نہیں ہوتی۔ بعض لوگوں کو برسوں خالی پیٹ ہونے اور اعتدال کی سعادت حاصل نہیں ہوتی اور وہ اس کا مزہ نہیں جانتے۔

اس اعتدال، ضبط نفس اور روحانیت کی قوت کو بڑھانے کے لیے دو راستے تھے ایک تقلیل طعام کا راستہ تھا لیکن اس میں دو نقص ہیں۔ ایک تو اس کا عمومی معیار، سب کے لیے ایک مقدار مقرر کرنا نہایت مشکل ہے اور اس کو لوگوں کی رائے اور تمیز پر چھوڑنا بھی دشوار۔ کہ اول تو یہ اصول تشریع (آئین سازی) کے خلاف ہو دوسرے مذاہب و اخلاق کی تاریخ میں اسکا تجربہ ہمیشہ ناکام رہا ہو۔ لوگوں نے اس آزادی اور اختیار کا ہمیشہ غلط استعمال کیا ہے، اور مبہم اور غیر معین احکام عملاً بیکار و بے نتیجہ ہوکر رہ گیے (جیسے بہت سے اخلاقی نصائح اور ہدایات) دوسرے اکثر محض تقلیل طعام بہت طبائع کے لیے بالکل غیر مؤثر اور بے نتیجہ تدبیر ہے۔

دوسرا راستہ یہ ہو کہ کوئی ایسا طویل وقفہ مقرر کیا جائے جس میں کوئی چیز استعمال نہ ہو۔ یہ طریقہ زیادہ حسی زیادہ مؤثر اور قوت بہیمیہ کو زیادہ کمزور کرنے والا ہے یہ وقفہ دین کی اصطلاح میں (صوم) یا روزہ ہے۔ جس کے خاص احکام و شرائط ہیں جو بہت گہرے تشریعی اور نفسیاتی اسرار پر مشتمل اور حکم و مصالح پر مبنی ہیں۔

۱۔ روزہ صبح صادق سے شروع ہوکر غروب آفتاب تک رہتا ہے۔ اگر یہ وقفہ پورے دن سے کم ہوتا تو اس کا کوئی خاص اثر شعور و طبیعت پر نہ پڑتا۔ زندگی میں ایسے اتفاق ہوتے رہتے ہیں کہ کئی کئی وقت کا کھانا ناغہ ہوجاتا ہو اگر محض یہی ہو کہ دن میں صرف چند گھنٹوں کا روزہ رکھا جائے تو اس کا کوئی خاص احساس اور اصلاحی اثر نہ پڑیگا

اور بہت سے لوگوں کو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا اپنے حساب ایک روز ذرا دیر سے کھانا کھایا۔

۲۔ یہ روزے رمضان کے تیس یا انتیس دن رکھے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ایسے وقفے مسلسل ہوں تاکہ ان کے نقوش دیر پا ہوں۔ ایک طویل وقفے سے یہ بہت زیادہ مفید ہے کہ متواتر متعدد متوسط درجے کے وقفے ہوں۔

۳۔ ان وقفوں کی تعداد کا تعین بھی ضروری ہے کہ اس کو مبہم اور غیر معین چھوڑ دینے سے افراط و تفریط کا اندیشہ ہے بہت سے لوگ بہت تھوڑے روزے رکھتے اور بہت سے لوگ بہت زیادہ روزے رکھتے۔ اور پھر جب یہ عالمگیر فریضہ ہے، اور تشریع عام مقصود ہے تو اس میں انتخاب کا حق نہیں رہنا چاہیئے تھا کہ جو شخص جس مہینے میں چاہے روزے رکھے۔ اس سے عام طور پر حیلہ جوئی، عذر اور بے عملی کا دروازہ کھلتا ہے اور گریز کی راہ پیدا ہو جاتی ہے۔ احتساب اور باز پرس کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ وعظ و نصیحت امر بالمعروف نہی عن المنکر کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ جس شخص سے بھی کسی وقت اس بارے میں گفتگو کی جائے وہ یہ کہہ کر منہ بند کر سکتا ہے کہ میرا معمول فلاں مہینے میں ہے۔ اور اس کا کوئی جواب نہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ اس چیز کا رواج مٹ جائے گا۔

۴۔ ایک ہی وقت میں تمام روئے زمین کے مسلمانوں کے روزہ رکھنے میں بڑی حکمت ہے مسلمانوں کی بڑی جماعت کا فریضہ صیام کو اہتمام کے ساتھ ایک وقت میں ادا کرنا، کمزور طبیعت والوں کے لیے بھی ہمت افزا، شوق انگیز اور فریضہ کی ادائیگی میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ایک عالمگیر روحانی ماحول اور ایک عمومی دینی فضا پیدا ہو جاتی ہے جو قلوب و ارواح کے لیے موسم بہار کی سی تاثیر رکھتی ہے جس میں تھوڑی توجہ سے ہر چیز میں نشو و نما پیدا ہونے لگتا ہے مسلمانوں کے اس روحانی فریضہ میں مشغول ہونے سے ملکوتی انوار و برکات کا نزول ہوتا ہے اور عوام کے آئینہ دل پر انوار کا انعکاس ہوتا ہے۔ مسلمان عالم کے جس گوشہ میں بھی ہو اس کو روزہ دارانہ فضا معلوم ہوتی ہے جو اس سے خود ہی تقاضہ کرتی ہے کہ وہ بھی روزہ دار ہو۔ مسلمان روزہ شکنی کر کے اپنے کو اس ماحول میں اجنبی اور ایک طرح کا مجرم سمجھتا ہے۔

۵۔ ان تمام حکمتوں کی بنا پر سال میں ایک پورا مہینہ روزہ کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ دوسری خصوصیات کے علاوہ جن کا ہمیں علم نہیں رمضان کی تخصیص کی ایک کھلی وجہ یہ ہے کہ اس ماہ مبارک میں نزول قرآن کا سلسلہ شروع ہوا اور روزہ اور قرآن میں خاص مناسبت ہے۔ قرآن چونکہ عالم غیب اور عالم روحانیت کی چیز ہے اور روزہ عالم مادی سے بہت حد تک آزادی، قلب و روح میں لطافت اور عالم غیب اور عالم روح سے ایک طرح کی مناسبت پیدا کر دیتا ہے۔ روزہ دار پر خدا کی صفات کا ایک پرتو اور اس کی شان صمدیت کا ایک اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے قرآن کے دل میں بسنے اور روح میں پیوست ہونے کا خاص موقع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے حصے کو مختلف طریقوں سے روزہ میں زیادہ سے زیادہ داخل کیا گیا۔ اور

یہی تراویح کی حکمت ہے۔

۶۔ روزہ زندگی میں ایک ایسا محسوس فرق اور امتیاز پیدا کر دیتا ہے کہ بے حس سے بے حس انسان کو بھی اپنے سابقہ طرز زندگی، غفلت شعاری اور دنیاوی انہماک میں تخفیف کا طبعی تقاضہ پیدا ہو جاتا ہے۔ رمضان ایک مہمیز کا کام دیتا ہے۔ جو سوئی ہوئی طبیعتوں کو جگانے، بجھے ہوئے دلوں کو گرمانے، آتش محبت کو بھڑکانے اور دبی چنگاریوں کو ابھارنے کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔ انسان کی فطرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تنوع اور اختلاف کو انسان کے بیدار اور ہوشیار کرنے اور اس کی کند طبیعت کو تیز کر دینے میں بڑا دخل ہے۔ رات دن کے اختلاف کو انسان کی جسمانی روحانی تازگی میں خاص دخل ہے۔ قرآن کہتا ہے:۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ اَوْ اَرَادَ شُکُوْرًا

وہ وہی ہے جس نے بنایا رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین واسطے اسکے جو سوچے اور شکر گذاری کا ارادہ کرے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا۔

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور اختلاف لیل ونہار میں نشانیاں ہیں اُن اہل عقل و دانش کیلئے جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے۔ ( )

جس طرح سے کہ مادی طور پر رات دن کا اختلاف، ہر نئی صبح کا طلوع انسان میں ایک شعور، ایک نئی آمادگی اور خالق کی طرف توجہ پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح روحانی طور پر رمضان کی سالانہ آمد مسلمانوں کی بستیوں اور آبادیوں میں روحانیت کا احساس، دینی بیداری، اپنی کوتاہیوں پر ندامت، مجرموں میں اپنے جرائم پر ندامت اور خدا کی طرف ایک توجہ اور انابت پیدا کر دیتی ہے۔ اور اگر مادیت نے قلب کو بالکل بے حس نہیں بنا دیا ہے تو صدہا آدمیوں کو توبہ اور اصلاح کی توفیق ہو جاتی ہے۔ رمضان سالانہ احتساب اور اپنی سابق زندگی کا جائزہ لینے کا ایک بہترین موقع ہے۔ ہر شخص آسانی سے دیکھ لے سکتا ہے کہ اُس نے گزشتہ رمضان سے اس رمضان تک کیسی زندگی گزاری ہے اور اُس نے دینی حیثیت سے کیا کتنی ترقی کی ہے۔

۷۔ رمضان ہر سال ہر شخص کو اپنی سطح سے ترقی دینے کے لیے آتا ہے جو شخص جس سطح تک پہنچ گیا ہے، خواہ وہ سطح کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو اس سے بلند کرنے کی طاقت اس میں موجود ہے۔ ہر شخص عمل، روحانیت ذکر و عبادت، تعلق باللہ، اخلاص، جفاکشی و مجاہدہ، زہد و قناعت، ایثار، غمخواری اور مواساۃ کی

جس منزل و مقام پر بھی ہے ہر نیا رمضان اس کو اس سے آگے بڑھانے کے لیے اور زیادہ بلند منزل کا شوق دلانے کے لیے آتا ہے۔ رمضان کی ساخت، رمضان کا نظام، رمضان کے اجزاء، رمضان کے مشاغل اور رمضان کا ماحول ایسا بنایا گیا ہے کہ ہر شخص کو اپنے کو ترقی دینے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ مادی موانع تقریباً دور ہو جاتے ہیں۔ ذکر و عبادت میں جذبہ مسابقت پیدا ہوتا ہے۔ اچھے دینداروں اور روزہ داروں کا ساتھ ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت اور مطالعہ کا زیادہ سے زیادہ موقع ملتا ہے۔ قلب و روح میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔ غرض وہ سارے مواقع بہم پہونچ جاتے ہیں جو انسان کی روحانی ترقی اور اصلاح کے لیے ضروری اور مفید ہیں اور ہر شخص کو اپنی سطح کے مطابق ترقی ہوتی ہے۔

۸۔ رمضان کے روزہ کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اطاعت الٰہی کا ایک کھلا ہوا مظہر ہے اس سے بڑھ کر اطاعت کا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ نعمتوں کی موجودگی میں اور ہر چیز کے استعمال کی قدرت کے باوجود محض امتثال حکم کے لیے آدمی اپنے ہونٹوں پر قفل لگا لیتا ہے۔ یہ قفل اللہ کے حکم ہی سے کھلتا ہے اور اللہ کے حکم سے لگتا ہے۔ جب نہ کھانے کا حکم ہوا اس وقت کھانا گناہ اور جب کھانے کا حکم ہو جائے تو اس وقت تعمیل ارشاد میں دیر کرنا غلطی ہے۔ اسی لیے آفتاب کے غروب ہو جانے کے بعد افطار کرنے میں تاخیر کرنا مکروہ ہے۔

۹۔ روزہ میں جب وہ چیزیں بھی ممنوع ہو جاتی ہیں جو روزہ کے علاوہ ہمیشہ سے حلال و طیب ہیں اور روزہ کے بعد ہمیشہ حلال و طیب رہیں گی تو وہ چیزیں کیسے ممنوع نہ ہوں گی جو روزہ سے پہلے بھی حرام اور ممنوع تھیں اور روزہ کے بعد بھی حرام اور ممنوع ہوں گی یعنی غیبت، لڑائی جھگڑا، گالی گلوچ بے حیائی، جھوٹ، روزہ کی روح یہ ہے کہ تمام گناہوں سے اجتناب اور نفرت پیدا ہو اور روزہ کے درمیان میں ان سے مکمل اجتناب ہو۔ اگر صرف نہ کھانے پینے سے روزہ رہا اور تقویٰ نہ پیدا ہوا تو ایک بے روح روزہ ہے جو صرف ڈھانچہ ہے، اس میں روح نہیں، اسی لیے حدیث میں فرمایا گیا ہے:۔

مَن لَّمْ یَدَعْ قَولَ الزُّورِ وَالعَمَلَ بِہٖ فَلَیسَ لِلّٰہِ حَاجَۃٌ اَن یَّدَعَ طَعَامَہٗ وَشَرَابَہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزہ اور قرآن

(از مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

کہنا یہ ہے کہ شرعی مطالبات کی خود ساختہ توجیہوں اور تاویلوں کی جسارتوں سے کیا زیادہ مناسب یہ نہ تھا، کہ خود شریعت اور شریعت کی کتاب ہی میں یہ تلاش کیا جائے کہ اپنے ان مطالبات سے کن مقاصد کی تکمیل اس کے پیش نظر ہے۔ ایسے مذاہب و ادیان جن کی بنیادی کتابیں بھی مشکوک و مشتبہ ہو چکی ہیں، ان کے متعلق تو میں نہیں کہتا، لیکن ماننے والے جب یہ جانتے ہیں کہ قرآن میں براہ راست خطاب الٰہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اس کے ہر فقرہ اور ہر آیت کی بنیاد انسانی عقل کے ناقص معلومات ادھورے تجربات مشتبہ مشاہدات پر نہیں، بلکہ عالم الغیب والشہادۃ کے اس محیط اور حاوی علم پر قائم ہے جس کے احاطہ سے نہ کوئی چیز خارج ہے اور نہ ہو سکتی ہے تو اعتماد و یقین کے لیے اس سے زیادہ محکم اور زیادہ استوار اساس کا کیا کوئی تصور بھی کر سکتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ "یہ کتاب خدا اور خالق کائنات کی کتاب ہے" اس دعوی کو مشتبہ ٹھہراتے ہوئے دعوی کے پیش کرنے والے ہی کے متعلق العیاذ باللہ افترا اور جھوٹ کے وسوسے کی نیش زنی سے کسی بدبخت کو نجات نہ ملی ہو میرے خطاب کا رخ نسل انسانی کے ان بدقسمت وسواس کے گزیدوں کی طرف ہے بھی نہیں۔ ان مسکینوں، عقل کے مسکینوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے ایک طرف وہ یہ بھی پاتے ہیں اور یہی ان کو پانا بھی چاہیئے کہ خدا کے نام سے قرآن کے پیش کرنے والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و کردار کی عظمتوں سے ان کے قلوب لبریز بھی ہیں، آپ کی بے داغ صداقت اور سچائی کے وزن سے خود کہتے ہیں کہ ان کا دل ان کا دماغ دبا چلا جاتا ہے اور یہ کہ ان کی بڑائی کا اعتراف ہر انصاف پسند قلب کا قدرتی بار ہے یہی وجہ ہے جو یہ دیکھا جاتا ہے کہ نہ ماننے والوں میں بھی شاید انتہائی سیاہ سینہ اور قطعی مردہ ضمیر ہی آدمی ہوگا جو اس افترائی دعوے کے اظہار کی جرأت کر سکتا ہے ــــ ورنہ رمق بھی زندگی کی جن کے اخلاقی حاسہ میں باقی رہ گئی ہے نہ ماننے پر مصر ہونے کے باوجود انھوں نے اسی کے اقرار پر اپنے آپ کو بے بس پایا ہے کہ سچے ہونے کے لیے

کسی انسان کو جو کچھ بھی ہونا چاہیئے وہی سب کچھ محمد رسول اللہ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

بہرحال کچھ بھی ہو، دوسروں کے متعلق تو میں نہیں کہتا لیکن اپنا حال یہی ہے کہ قرآنی خبریں مثلاً یہی کہ نیکوکاروں اور بدکرداروں کا انجام ایک نہیں ہو سکتا، مٹی میں مل کر ظالم اور مظلوم دونوں کا قصہ ختم ہو کر برابر نہیں ہو جاتا بلکہ الدین یعنی بدلہ کی اقتداری قوت کے ساتھ مالک بن کر ایک دن سب کے سامنے ان کا بیدا کرنیوالا آئے گا اور کیے کے نتیجوں تک کرنے والوں کو پہونچا دے گا، الغرض بجائے بے حاصلی کے نظم عالم کی معنویت وافادیت کی یہی آگاہی قرآن سے جو حاصل ہوتی ہے جس آنے والی گھڑی کی تعبیر اسی کتاب میں "الساعت" سے کی گئی ہے اور قرآن ہی کی اصطلاح میں "القیامۃ" بھی اسی کا نام ہے کہ نتائج کو اگلنے کے لیے دنیا اس وقت کھڑی ہوگی۔ اسی "الساعۃ" یا "القیامۃ" کو اس وقت تک تو گویا میں اپنے سامنے پاتا ہوں، جب تک قرآنی آیتوں، اور اسکی دی ہوئی خبروں کی عینک میرے اعتماد و یقین کی آنکھوں پر چڑھی رہتی ہے، شاید گوشت اور پٹھوں، رگوں، ریشوں کے مجموعے سے بنی ہوئی اور پیشانی کی ہڈیوں میں جڑی ہوئی آنکھوں کا مشاہدہ یقین کی اس کیفیت کو میرے اندر نہیں پیدا کر سکتا تھا، جس لازوال قوت کو میں اپنے دل کے اس یقین واذعان سکون و اطمینان میں پاتا ہوں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا مان لینے کے بعد قدرتی طور پر قیامت کی متعلقہ قرآنی خبریں مجھ میں پیدا کرتی ہیں۔

اشتباہی آلائشوں سے پاتا ہوں کہ میرا یہ قرآنی یقین پاک اور قطعاً پاک ہو کہ اس علم میں واسطہ، نقائص اور کوتاہیوں سے بھرا ہوا، میرے جسم کا کوئی داعصابی آلہ (آنکھ) نہیں ہے، بلکہ علم و دانش کا وہ لازوالی خزانہ ہے جس پر چوک اور غلطی، غلط فہمی کے اندیشوں اور وسوسوں کی ساری راہیں بند ہیں، ادراک و علم کا یہی ایک واحد تنہا ذریعہ ہے جس پر نہ شکوک کے بادل ہی چھا سکتے ہیں اور نہ بے اعتمادی وارتیاب کی ہوا ہی اس کو چھو سکتی ہے۔

علم اور صرف علم، یقین اور فقط یقین!!!
دھلا دھلایا، صاف ستھرا، شفاف تاباں و درخشاں علم!

لیکن عالم کے اس موجودہ نظام کے اسی فائنل رزلٹ (Final Result) اور آخری نتیجہ کی اسی قرآنی اطلاع کے پیچھے، جوں ہی کہ عقلی کندھوں کے لگانے والوں کی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں، اور دیکھے ہوئے مشاہدات سے بھی زیادہ ناقابل زوال یقین پر جس علم کی بنیاد قائم ہے، جب اس کی پشتیبانی کا ارادہ استدلال کے "پائے چوبیں" سے کیا جاتا ہے، تو میں سچ کہتا ہوں مجھ پر تو خفقان کا دورہ پڑنے لگتا ہے، جو

چیز روشنی میں تھی کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے۔ کہ تاریکی کی گہرائیوں میں وہی ڈوبتی چلی جارہی ہو، اور جو بات سامنے تھی، نظروں سے گویا اوجھل ہو رہی ہے، بے ساختہ جی چاہتا ہو کہ نعرۂ خلیلی

لا احب الآفلین — میں نہیں چاہتا، ڈھل جانے والے کو

کے ساتھ میں بھی چیخ اٹھوں،

کچھ ٹھکانہ ہے ان بے تمیزیوں کا؟ خبر تو دی ہی جاتی ہے، ایسی چیزوں کی جو سامنے نہ ہوں، دن کی روشنی میں جو یہ اطلاع دے کہ آفتاب چمک رہا ہو، یا جمعہ کے بعد ہفتہ کا دن آئے گا۔ گرمی کے بعد برسات اور برسات کے بعد سرما کا موسم نمودار ہوگا بھلا سامنے کے ان واقعات، روزمرہ پیش آنے والے، آئے دن کے ان مشاہدات کی بھی کوئی خبر دیا کرتا ہے، یا لوگوں کو ان سے آگاہ کیا کرتا ہے، لوگ سوچتے نہیں، ورنہ بادنیٰ تامل ان پر بھی واضح ہو سکتا ہے آخر اس سے کون ناواقف ہے کہ مذاہب وادیان میں یہ کبھی نہیں منوایا جاتا کہ زمین دکھائی دے رہی ہے یا تارے چمک رہے ہیں، درخت جھوم رہے ہیں، پانی بہہ رہا ہے ان باتوں پر ایمان لایا جائے، ان کو مانا جائے۔

نبوتوں، اور رسالتوں کی آگاہیوں کا تعلق کون نہیں جانتا کہ ان ہی حقیقتوں سے ہوتا ہے، جن کو علم وادراک کے عام اور معمولی ذرائع سے نہ ہم جانتے ہیں اور نہ جان سکتے ہیں۔

آخر یہی قیام قیامت کا قصہ ہے، زندگی سے جو محروم تھے۔ ان ہی کو زندگی پانے کے بعد اپنا ہونا ہی کو زندگی سے محروم ہو جانے، یعنی مرنے کے بعد پھر زندہ ہونے کا موقعہ ان کو کیسے ملے گا؟

آپ دیکھ رہے ہیں، خواہ مخواہ کے انقباض، اور بے معنی گرانی واستبعاد کے سوا اس قسم کے بے بنیاد وسوسوں کی تہ میں اور بھی کچھ ہے؟ زندگی کی محرومی کے بعد زندہ ہونے کا جو تجربہ کر چکا ہے خود اپنے متعلق بھی کر چکا ہے اور آئے دن دوسروں کے متعلق بھی روزمرہ اسی واقعہ کے مشاہدہ کا موقعہ مسلسل جسے مل رہا ہو وہی آخر کس بنیاد پر یہ کہتا ہے، یا کہہ سکتا ہو کہ زندگی سے محروم ہو جانے کے بعد زندہ ہونے کی صورت ہی کیا ہوگی کسی طرح بھی اس کے منہ پر یہ بات پھبتی ہے؟

خیر اوروں کو جانے دیجئے۔ جو قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہیں۔ اور یہی مان کر اس کی تلاوت سے بھی سعادت اندوز ہوتے رہتے ہیں ان سے میں پوچھتا ہوں کہ اس کتاب میں ایسی آیتیں مثلاً یہ فرماتے ہوئے کہ:

کما بدأنا اول خلق نعیدہ — جیسے ہم نے پہلی آفرینش کی ابتدا کی اسی طرح اس آفرینش کو ہم دہرائیں گے۔

ارشاد ہوا ہے :-

یہ ہے ہم پر وعدہ اور بے شک وشبہ ہم ہی کر کے رہنے والے ہیں۔　　　　وعدا علینا انا کنا فاعلین

کیا قرآن میں ان کی کمی ہے، اس سلسلہ کی ساری آیتوں کو نقل کرنے کا ارادہ اگر کیا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ قرآن کے ایک بڑے حصہ کو مجھے نقل کرنا پڑے گا جس کا جی چاہے۔ اس کتاب کو اٹھالے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ اس کو اسی نوعیت کی آیتیں ملتی چلی جائیں گی جن میں قیام قیامت کے یقین کی بنیاد حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے وعدہ اپنے اعلان، اپنے بیان اور اپنی خبر اپنی اطلاع ہی کو ٹھہرایا ہے،

بلکہ سورہ النساء میں تو یہ فرماتے ہوئے کہ :-

اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں بلا شبہ وہ تم کو اکٹھا کرے گا قیامت کے دن یقیناً، کوئی شک نہیں اس میں۔　　　　اللہ لا الٰہ الا ہو لیجمعنکم یوم القیمۃ لا ریب فیہ

اسی کے بعد صراحۃً فرما بھی دیا گیا ہے کہ :-

اور بات کرنے میں اللہ سے زیادہ سچا اور کون ہے۔　　　　ومن اصدق من اللہ حدیثا

اسی سورہ میں چند آیتوں کے بعد اخروی زندگی کے بعض پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے تقریباً اسی کا اعادہ ان الفاظ میں فرمایا گیا :-

اللہ کا وعدہ ہے، اور اللہ سے سچا بات کرنے میں کون ہے۔　　　　وعد اللہ ومن اصدق من اللہ قیلا

واقعہ بھی یہی ہے، کہ بجائے مخلوقات کے خود عالم کے پیدا کرنے والے خالق کی خبر سے زیادہ یقینی آگاہی کا ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ لے دے کر اس راہ میں بحث ونظر کی ضرورت صرف اتنی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (العیاذ باللہ) غلط بیانی سے تو کام نہیں لیا؟ جوں ہی کہ یہ مسئلہ طے ہوا اچانک ہم مخلوقات کے سامنے سے ہٹ کر براہ راست خالق کائنات کے سامنے اپنے آپ کو کھڑا پاتے ہیں۔

اب میرے کان خدا کی آواز سن رہے ہیں اور کان کے سنے ہوئے ان الفاظ یا آنکھوں سے دیکھے ہوئے قرآنی حروف سے میرے دل کو دماغ کو براہ راست خالق کائنات سے آگاہیاں حاصل ہو رہی ہیں، میری دانش، میرا علم سبحانہ وتعالیٰ کے علم محیط کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے۔

بہرحال مختصر سی بات بہت طویل ہوگئی، ذکر تھا "روزے" یعنی قرآن کے مطالبہ "الصوم" کا۔ عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ اس مطالبہ کو عائد کرتے ہوئے خود قرآن ہی میں "روزے" کے متعلق براہ راست خالق کائنات نے جن باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے لا پروائی اختیار کرکے خدا کے اس مطالبہ کے اندر بندوں کے خود آفریدہ، من مانے مطالب کے بھرنے، یا اپنی خود تراشیدہ حکمتوں اور مصلحتوں کو اس الٰہی مطالبہ سے برآمد کرنے کا عام رواج اس زمانہ میں جو مقبول ہو رہا ہے، اور ٹھونسنے والے اللہ کی باتوں پر اپنی عقل کے بافیدہ تخیلات کو جو تھوپ رہے ہیں۔

میرے نزدیک تو بجائے بڑھنے کے غیر شعوری طور پر اس طریقہ سے مطالبہ کی قوت شائد گھٹ رہی ہو۔ آخر روزے کی یہ فیلاسفیان[1] کہ طبی منافع کا روزہ ضامن ہے، یا بھوکوں کی بھوک کی تکلیف کا احساس روزے کے ذریعہ سے شکم سیروں اور پیٹ بھروں کے اندر پیدا کرانا مقصود ہے، لہک لہک کر بنڈالوں میں حکمت کے دریا جو بہائے جاتے ہیں اور اب تو منبروں کے تختوں، اور سیڑھیوں سے بھی اسی کی آواز بازگشت ٹکرانے لگی ہے، کیا واقعی روزے کی یہی صحیح قیمت ہے جو اسلام کے ان گوہر ناشناس صرافوں کی طرف سے لگائی جارہی ہے وہ کیا جواب دے سکتے ہیں، اگر پوچھا جائے کہ جسمانی صحت کی شکایت جن لوگوں کو نہیں ہے، ان کو آپ کے اس طبی منافع کی ضمانت سے مستفید ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یا جن امیروں کے باورچی خانوں سے غریبوں، اور بھوکوں کو کھانا تقسیم ہی ہوتا رہتا ہے، روٹیاں جن کی طرف سے مسکینوں، یتیموں، بیواؤں میں بانٹی ہی جاتی ہیں، خواہ مخواہ ان بے چاروں کو بھوک مرنے والوں کے دکھ کا مزہ کیوں چکھایا جائے، غرباء کے حقوق کا خیال جو خود کر رہا ہو، بن ناکردہ گنہ گار امیر کو فاقہ کی سزا دینے کی معقول توجیہ کیا ہوگی؟ یا طبی منافع فاقہ ہی کے غیر شرعی طریقوں سے جب حاصل ہوسکتے ہیں روزے کے شرعی قیود کی زنجیروں میں آخر کس بنیاد پر لوگوں کو آپ جکڑتے پھریں گے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ سرشت میں جس کے بغاوت و طغیان کا ایسا طوفان پوشیدہ ہو، کہ اپنے پیدا کرنیوالے کے حکم کو لاپروائی کے ساتھ ٹال دینے کی جرأت کرسکتا ہو، اسی سرکش کو اسی جیسے مخلوق انسان کی اسرار آفرینیوں

---

[1] ان فلاسفیون کے متعلق حضرت مرشد تھانوی قدس اللہ سرہ کا یہ لطیفہ مشہور ہے، آپ نے فرمایا تھا کہ پرانے عربی مدرسوں میں "فلسفہ" اور "فلاسفہ" کے الفاظ تو سنے تھے لیکن روزے کی فلاسفی، حج کی فلاسفی کے نئے الفاظ کو سن کر سوچنے لگا کہ پرانے فلسفہ اور فلاسفہ کی مادہ (مؤنث) اس زمانہ میں کیا پیدا ہوگئی ہے، حضرت بھی فرمایا کرتے تھے کہ آبدست لینے میں عرق گلاب کو کوئی یہ سمجھ کر استعمال کرے کہ اس عرق کے وجود کا یہی مقصد ہے تو نجاست کا ازالہ اس میں شک نہیں عرق گلاب سے بھی سیال ہونے کی وجہ سے ہو جائے گا۔ مگر اسی کو عرق گلاب کا صحیح استعمال قرار دینا خود سوچنا چاہیئے کہ کتنی گھنونی کور ذوقی ہے — ۱۲

سے روزہ رکھنے پر سوچیے تو یہی کہاں تک راضی کرنے میں آپ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

کچھ بھی ہو، اپنا ذاتی احساس تو یہی ہے کہ مصالح تراشیوں، اور فلسفہ نوازیوں کے ان قصوں، دور دراز قصوں سے کہیں زیادہ بہتر تھا، اور ہے، آئندہ بھی رہے گا کہ بندوں کو ان کے پیدا کرنے والے خالق کا حکم سنا دیا جائے، حکم دینے والے نے حکم کے کچھ اسباب و وجوہ مصالح و فوائد بھی بتائے ہوں، تو ان کو بھی سمجھا دیا جائے۔ آگے چھوڑ دیا جائے بندے کو اور اس کے پیدا کرنے والے کو، اطاعت و بغاوت کے پارے کا اتار اور چڑھاؤ چاہے کوئی مانے یا نہ مانے مگر جو بھی سوچے گا، یہی پائے گا، کہ دار و مدار اس کا اعتماد اور بھروسہ کی اس کیفیت پر ہے، جو بندوں کو خالق کی مرضی سے آگاہ کرنے والے درمیانی واسطہ کے متعلق دلوں میں پائی جاتی ہے ع

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

"ہمہ اوست" کے اس اقبالی نظریہ ہی میں سچ پوچھیے تو دین کا سارا راز پوشیدہ ہے جس نے یہ سمجھ لیا، سب کچھ سمجھ لیا، اور سب کچھ سمجھ لینے کے بعد اس حقیقت سے جس کا دل بیگانہ رہا یقین مانیئے کہ زبان سے لاکھ دین اور مذہب کے نعرے لگاتا ہو، لیکن دل نے بھی اس کے کچھ پایا ہے؟ اس کا پتہ دل ہی کے ٹٹولنے سے خود اس کو چل سکتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہی دین کا فلسفہ بھی ہے، اور یہی اس کی سائنس بھی ہے، یہی علم کلام ہے اور یہی تصوف اور یہی وہ سب کچھ جس کا نام دین اور مذہب کے دائرے میں لیا جاتا ہے یا لیا جا سکتا ہے، کہنے والے نے سچ کہا ہے ؎

خدا باتیاں مے پرستی کنید   محمد بگویند و مستی کنید

اس تمہید کے بعد آیئے، اور اس قرآنی مطالبہ کو قرآن ہی کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔

الصیام (یعنی روزوں) کا مطالبہ جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں۔ سورۂ البقرہ کی حسب ذیل آیتوں میں کیا گیا ہے میں پورے رکوع کو پہلے ترجمہ کے ساتھ درج کر دیتا ہوں، اور اس کے بعد اپنے ناچیز خیال کے مطابق اسی حصہ کے مختلف اجزاء پر بحث کروں گا۔

ارشاد ہوا ہے:۔

اے ایمان والو! روزہ تم پر اسی طرح	یا ایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام
واجب ہو جس طرح واجب کیا گیا تھا	کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم
روزہ تم سے پہلوں پر، تاکہ تم تقوی	تتقون ایاما معدودات، فمن

والے بن جاؤ، یہ روزہ صرف چند دن کے	كان منكم مريضا أو على سفر
لیے ہے، پھر تم میں جو بیمار ہو جائے یا سفر پر	فعدة من ايام أخر وعلى الذين
ہو پس گن لینا چند دوسرے دنوں کا (کافی	يطيقونه فدية طعام مسكين
ہے) اور جو روزہ بدشواری رکھتے ہوں وہ	فمن تطوع خيرا فهو خير له
ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ کے دیں، پھر جو	وان تصوموا خير لكم ان
بھلا کرے گا وہ اسی کے لیے بھلا ہے، اور روزہ	كنتم تعلمون شهر رمضان
رکھ لو تو یہی تمھارے لیے اچھا ہے اگر تم جانتے ہو	الذي انزل فيه القرآن هدى
مہینہ رمضان کا جس میں قرآن نازل ہوا انسان	للناس وبينات من الهدى
کی راہ نمائی ہے وہ، اور ہدایت کی کھلی کھلی باتیں	والفرقان، فمن شهد منكم
(ہی اس میں ہیں) اور فرقان بھی ہو (یعنی جدا کر دیتا ہو	الشهر فليصمه ومن كان مريضا
غیر قدرتی عناصر کو مذاہب) پھر جو حاضر ہو، اس مہینہ	او على سفر فعدة من ايام
میں چاہیئے کہ اس میں روزہ رکھ لے اور جو بیمار ہو یا جو سفر	اخر، يريد الله بكم اليسر
پر ہو، پس چاہیئے کہ وہ بھی دوسرے دنوں کو گن لے،	ولا يريد بكم العسر، ولتكملوا العدة
چاہتا ہے اللہ تم سے آسانی، اور نہیں چاہتا ہے	ولتكبروا الله على ما هداكم
تمھارے لیے دشواری، اور پورا کرو گنتی کو، اور بڑائی کرو	ولعلكم تشكرون۔

اللہ کی اس نعمت پر جو اس نے تمھاری راہ نمائی کی، اور تاکہ تم شکر کرو۔

ا مندرجہ بالا آیات میں جیسا کہ عام طور پر لوگ جانتے بھی ہیں، بتایا گیا ہے کہ روزہ آدمی میں "تقویٰ" کے جذبہ کو ابھارتا اور بیدار کرتا ہو اور اس کے بعد اطلاع دی گئی ہے کہ رمضان ہی کے مہینے میں چونکہ قرآن کے نزول کی ابتدا ہوئی، اس لیے مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس مہینے کو روزے کے ساتھ گزاریں۔

یہی سوچنے کی بات ہو کہ "تقویٰ" کا مطلب کیا ہے، روزے سے اس کا کیا تعلق ہے، اور تقویٰ کے جس جذبہ کو روزہ ابھارتا اور جگاتا ہے، انسانی فطرت کے اس جذبہ سے قرآن کا کیا تعلق ہو؟

ایک مثال کو پہلے اپنے سامنے رکھ لیجئے۔ نور یا روشنی سے ظاہر ہو کہ وہی مستفید ہو سکتا ہے جس کی بینائی کی قوت آلائشوں سے پاک و صاف ہو، بینائی کی قوت جتنی شستہ اور ستھری مجلّی ہو گی اسی حد تک نور سے استفادہ کا موقعہ آدمی کے لیے آسان ہو گا، آپ اسی مثال کو پیش نظر رکھتے ہوئے غور کیجیے، قرآن کیا ہے؟ آدمی کی اپنی زندگی کے قدرتی دستور العمل ہی کا نام تو قرآن ہے، اسی طرح تقویٰ جس کا ترجمہ عموماً پرہیز، یا ڈر وغیرہ الفاظ سے کر دیا جاتا ہے۔

درحقیقت فطرت انسانی کے اس خاص رجحان کی یہ تعبیر ہے، جس کے قدرتی تقاضوں نے آدمی کو آئین پسند بنا دیا ہو مطلب یہ ہے کہ جب تک جنون ہی کی آفت سے کسی کا دماغ ماؤف نہ ہو، ہم میں ہر شخص جو یہ محسوس کرتا ہے، کہ اعمال و افعال میں ہم مطلق العنان بن کر نہیں پیدا کیے گیے ہیں یعنی جو جی میں آئے اسے کہہ گزریں، جسے چاہیں مار بیٹھیں، قتل کر دیں، جس کا مال چاہیں اڑا لیں، سڑکوں پر ننگے ہو کر ناچیں، تھرکیں یہ یا اسی قسم کے بہت سے کام ایسے ہیں، جس کے کرنے پر ہم آمادہ ہو جائیں، تو انھیں کر تو سکتے ہیں، لیکن اندر کی آواز ہمیں ٹوکتی ہے، اور حدود میں رہنے کا تقاضا کرتی ہے کردنی، ناکردنی، یعنی کچھ کام ایسے ہیں جو کیے جائیں اور کچھ ایسے بھی ہیں، جو نہ کیے جائیں، یہ تقسیم ہمارے اعمال و افعال کی سچ پوچھیے تو تقوی ہی کے فطری جذبہ کی پیداوار ہے۔

بہر حال کون کون سے کام کرنے کے ہیں، اور کون مستحق ہیں کہ نہ کیے جائیں، تفصیلات میں تو اس کے اختلاف ممکن ہے، اور ممکن کیا معنے ہوتا ہی رہتا ہے۔ لیکن اجمالاً کردنی اور ناکردنی ان دو حصوں میں اعمال کی تقسیم، انسان کا فطری احساس ہے ــ کسی شخص کے متعلق جوں ہی اس کا پتہ چلتا ہے، کہ اعمال و افعال کی حد بندی کے تقاضوں سے آزاد ہو گیا ہے، اس کے پاگل ہو جانے کا اعلان انسانی بستیوں میں کر دیا جاتا ہے، اگر تقوی کی واقعی حقیقت یہی ہے جو عرض کی گئی، تو پھر کتنی آسانی کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نزول قرآن یعنی آئینی زندگی کے قدرتی دستور العمل کو سپرد کرتے ہوئے تقوی کے احساس کو چونکانے والے اور جگانے والے عمل روزہ کی پابندی کا بھی ٹھیک اسی مہینہ میں مسلمانوں کو کیوں مکلف بنایا گیا، وہی مہینہ جس میں قرآن اترنے لگا، اور اس کے نزول کی ابتدا ہوئی ــ ظاہر ہے کہ آئین و دستور کی پابندی کا مطالبہ باہر سے ان پر پیش ہو رہا تھا، ضرورت تھی کہ ان کے اندر بھی اس احساس اور جذبہ کے ابھارنے کا نظم کیا جائے جس پر آدمی کی آئینی زندگی کا دارمدار ہے۔

اور یہ ہے وہ تعلق جو "تقوی" اور "قرآن" میں مجھے نظر آتا ہے گویا آئین کے ساتھ آئین پسندی کے جذبہ کو بھی بیدار رکھنے کا بندوبست کیا گیا ہے باقی یہ بات کہ آدمی میں آئین پسندی یعنی تقوی کا جو جذبہ فطرتاً پایا جاتا ہے۔ اس کے ابھارنے اور اس کو تر و تازہ رکھنے میں روزہ سے کیوں مدد ملتی ہے؟

سو اس کی وجہ بھی ظاہر ہے، چوبیس گھنٹوں میں بار بار جس چیز کی ضرورت آدمی کو ہوتی ہو، سوچنے کی بات ہے کہ روزمرّہ کی اسی عادت سے اچانک دست بردار ہو جانے پر آمادہ ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، کہ آئینی حدود کے اندر اپنے آپ کو روکے رکھنے کی پوری قوت اس کے اندر پائی جاتی ہے، سال کے گیارہ مہینوں میں جو کھا رہا تھا، پی رہا تھا، جنسی تقاضوں کی تکمیل پر جس کے کسی قسم کا روک ٹوک نہ تھا، وہی گیارہ مہینوں کے بعد بارھویں مہینے میں اس امتحان میں کامیاب ہو کر نکلتا ہے، کہ ساری چیزیں، جن کا گیارہ مہینوں میں عادی تھا، ان کو چھوڑ بیٹھا، خیال کیا جائے کہ آئینی جذبہ کی مشق کی اس سے زیادہ بہتر صورت

اور کیا ہو سکتی تھی۔

اور اب پڑھیئے روزہ والی مندرجہ بالا آیتوں کو، انصاف سے بتایا جائے کہ خود قرآن نے روزہ کے قانون کو نافذ کرتے ہوئے، جو کچھ اس کے متعلق بیان کیا ہے۔ دل آویزی، دل نشینی کی جتنی غیر معمولی چنگی اس میں پائی جاتی ہے، کیا عقل کے ناخن تراشوں کی تاویلوں میں اس کے بعد کچھ بھی جان رہ جاتی ہے اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ روزہ، اور اس کے اسرار و حکم، وجوہ و مصالح کے سمجھنے کے لیے بجائے قرآن کے غیر قرآنی راہوں سے مدد لینے کی قطعاً حاجت نہیں، مسلمانوں پر روزہ کیوں واجب کیا گیا، اور نزول قرآن ہی کے مہینے میں خاص طور پر مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا حکم کیوں دیا گیا، کوئی غور کرے تو خود قرآن ہی نے ان سوالوں کا جواب دیا ہے۔ یہی نہیں کہ تمام جوابوں میں یہی سب سے بہتر جواب ہے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ واقعی جواب ان سوالوں کا قرآنی جواب کے سوا شائد اور ہو بھی نہیں سکتا۔ اس سے ہٹ کر جو کچھ بھی کہا گیا ہے، یا آئندہ کہا جا سکتا ہے۔ وقتی شاعری سے زیادہ کم از کم میرے نزدیک تو اسکی کوئی قیمت نہیں ہے۔

(۲)

روزے کی متعلقہ آیتوں کا یہ تو اجتماعی مفاد تھا، اسی کے ساتھ ساتھ تفصیلی طور پر ان آیتوں کے ان پہلوؤں کی طرف اگر توجہ کی جائے، جنکی طرف قرآن نے ذیلی اشارے کیے ہیں۔ تو بجائے خود وہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں۔

مثلاً روزے کے مطالبے کو مسلمانوں پر عائد کرتے ہوئے گزشتہ ادیان و مذاہب اور ان کے پیش کرنے والے بزرگوں اور ان کے ماننے والی امتوں کے ساتھ اپنے تاریخی رشتہ کا اعادہ اس موقعہ بھی،

واجب کیا گیا تم پر روزہ جس طرح واجب کیا گیا	كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ
تھا ان لوگوں پر جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔	مِنْ قَبْلِكُمْ

کے الفاظ میں جو فرمایا گیا ہے۔ اس سے جہاں مسلمانوں میں یہ نفسیاتی اثر قدرتاً پیدا ہوتا ہے، کہ مطالبہ کی بارکشی میں وہ تنہا نہیں ہیں، بلکہ انسانی نسلیں ان سے جو پہلے گذری ہیں، وہ بھی اس بار کے اٹھانے میں ان کی شریک و سہیم ہیں۔ اور اسی سے خود بخود یہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ روزہ کا مطالبہ کوئی ایسا مطالبہ ہے بھی نہیں جسے بار سمجھا جائے۔ آخر جس کام کو تاریخ کے نامعلوم زمانے سے انسانیت برداشت کرتی چلی آئی ہے۔ اس کو بار اور بوجھ قرار دینے کے معنے ہی کیا ہو سکتے ہیں۔ گویا برداشت کے لحاظ سے یہ تجربہ کیا ہوا، جانچا اور پرکھا ہوا عمل ہو، سمجھا جائے تو یہ اشارہ بھی قرآن کے الفاظ سے ہمیں مل سکتا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حیوانی ضرورتوں کے لیے حرارت، روشنی، ہوا، پانی وغیرہ جیسی قدرتی امدادوں کا آدمی ہر زمانہ میں ہر جگہ محتاج رہا ہے، یہی نوعیت قدرت کے ان قوانین کی بھی ہے جن کی پابندی کے بغیر انسان انسان باقی نہیں رہ سکتا، اور اپنی انسانی خصوصیتوں کو کھو بیٹھتا ہے۔

بس یہ جو فرمایا گیا ہے کہ جیسے اگلوں پر روزہ واجب کیا گیا تھا، اسی طرح تم پر بھی واجب کیا جا رہا ہے، سمجھا

جائے تو اس سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ روزہ بھی قدرت کے ان ہی قوانین میں شریک ہو جس سے نہ اگلے بے نیاز ہو کر رہ سکتے تھے اور نہ پچھلے اس سے مستغنی ہو سکتے ہیں، آپ دیکھ چکے کہ روزہ درحقیقت انسانی فطرت کے اس قدرتی احساس کے زندہ اور بیدار رکھنے کی عملی تدبیر ہے، جس احساس سے خالی ہو جانے کے بعد ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے اگرچہ آدمی آدمی ہی باقی رہتا ہے، لیکن معنوی طور پر انسانی زندگی کے امتیازی سرمایہ سے محروم ہو کر پاگلوں اور مجنونوں میں شریک ہو جاتا ہے، عرض کر چکا ہوں کہ انہی رجحانات سے خالی ہو جانے کے ساتھ ہی اعلان کر دیا جاتا ہے کہ فلاں آدمی پاگل ہو گیا۔ بجائے انسانوں کے سمجھا جاتا ہے کہ ایسے برتاؤ اور سلوک کا وہ مستحق ہو گیا جو جانوروں اور حیوانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

اس موقعہ پر پھر وہی بات مجھے یاد آ جاتی ہے، اور جب یاد آتی ہے تڑپ اٹھتا ہوں کہ قرآن کے طریقہ کار کو چھوڑ کر اپنے دین کی دعوت و تبلیغ، یا حمایت و وکالت کی راہوں میں غیر قوموں کے کردہ اور گھناؤنے طریقوں کو کچھ دنوں سے مسلمانوں نے اختیار کر کے، بجائے فائدے کے جہاں تک میرا اندازہ ہے دین کو نقصان ہی پہونچایا ہے۔

مطلب یہ ہو کہ یورپ و امریکہ کے علمی حلقوں میں آج کل مذاہب و ادیان کی تنقید و تحقیق کے سلسلے میں تقابلی مطالعہ کو سب سے زیادہ عالمانہ، اور فضیلت مآبانہ طریقہ سمجھا جاتا ہے، پہلے تو مذہبی پیشہ وروں، یعنی پادریوں نے اس کام کو شروع کیا تھا، بعد کو ان ہی پادریوں کی اولاد دوسرے علمی القاب اور خطابات کے ساتھ اسی کام کو ریسرچ اور تحقیق کے نام سے انجام دینے لگی۔ باور کرانے کی حد تک تو یقیناً یہی باور کرایا جاتا ہے کہ تحقیق و تنقید کی ان راہوں میں کسی خاص مذہب یا دین کی پاسداری، خیانت، اور علمی بد دیانتی سمجھی جائے گی، لیکن جو کچھ کیا جاتا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سارے پاپڑ دراصل کسی خاص مذہب کی تائید و حمایت ہی کے لیے بیلے جاتے ہیں۔

بہرحال نیت کچھ ہی ہو، لیکن تقابلی مطالعہ میں جو طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہو۔ چاہا جائے یا نہ چاہا جائے، لیکن اس میں ہوتا یہی ہے کہ مختلف ادیان و مذاہب اور ان کے پیش کرنے والے بزرگوں کی تحقیر و تنقیص سے دامن ضرور آلودہ ہوتا ہے اور تحقیر و تنقیص کے ان قصوں سے دانستہ یا نادانستہ طور پر دلوں کو جو دکھ پہونچ جاتا ہے، یا پہونچایا جاتا ہے، دل آزاری کی جو وبائی آندھیاں چل پڑتی ہیں ان کا رکنا یا روکنا ناممکن ہوتا ہے۔

اس بات میں غیروں سے نہ مجھے شکایت ہے، اور نہ شکایت کا حق حاصل ہے، مگر مسلمانوں کو بھی دیکھ رہا ہوں کہ دعوت و تبلیغ کے قرآنی منہج خاص سے لاپروا ہو کر اپنے یہاں کے کچھ لوگ بھی کچھ دنوں سے ان ہی باتوں کی حوصلہ افزائیوں میں مشغول رہے، جس سے "تقابلی مطالعہ" اور اس طریقہ کے سارے سمّی مفاسد اور زہر پاشیں فتنوں کے نشو و نما میں مدد مل رہی ہے، دیکھتا ہوں، اور دل ہی دل میں گھٹتا ہوں کڑھتا ہوں، قرآن سکھاتا ہے کہ بنی آدم کی جن جن نسلوں کو مسلمانوں سے پہلے اپنے اپنے وقت میں انسانی زندگی کے قدرتی دستور العمل کا مخاطب و مکلف

خالق کائنات نے بتایا تھا، ان سب سے مسلمانوں کا تاریخی رشتہ تکذیب تغلیط، تحقیر و توہین کا نہیں، قطعاً نہیں بلکہ تصدیق و توثیق کا ہے، ایک ہی دیوان عشق کے ہم سبق ہم سب کے سب ہیں، ایک ہی لاہوتی کالج سب کی تعلیم گاہ ہے حقیقی معلم اور واقعی استاد بھی سب کا ایک ہی ہے اور بجز معمولی رد و بدل کے اصولاً تعلیمی نصاب بھی اگلوں اور پچھلوں کا اول سے آخر تک ایک ہی رہا ہے۔

قرآن نے اپنے ماننے والوں کی ذہنی تربیت ہی کچھ ایسے ڈھنگ سے کی ہے کہ ہمارے پیشوا تمہارے پیشوا، ہمارے دینی بزرگ، تمہارے دینی بزرگ، یہ انا و انت یا نحن و انتم یا ہم تم کا سوال ہی درمیان سے مذہب اور دین کے دائرے میں ان کی نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گیا ہے، اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان دنیا کے مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں کا جب ذکر کرتے ہیں تو سننے والا یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ خود اپنے گھر کے بزرگوں کا ذکر کر رہے ہیں یا تذکرہ ان لوگوں کا کر رہے ہیں جنکو یہودی اپنا پیغمبر یا عیسائی اپنے دین کی سب سے بڑی ہستی تسلیم کرتے ہیں۔ در اصل گھر اور باہر کے اس فرق کو مسلمانوں کا دینی احساس پہچانتا ہی نہیں ہے۔ ایک ہی فہرست ہو گی جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گزشتہ ادیان و مذاہب کے منادیوں اور پیغمبروں کے اسماء گرامی کو مسلمانوں کے یہاں آپ پائینگے۔

اس عام اور مشہور کلیہ کے سوا جزئیاتی طور پر آپ دیکھئے اسی روزے کو دیکھئے مسلمانوں پر اس مطالبے کو عائد کرتے ہوئے بجائے یہ فرمانے کے کہ مسلمانوں کے دین کا یہ کوئی امتیازی سرمایہ ہے، جیسا کہ "تقابلی مطالعہ" والی راہوں میں کچھ اسی قسم کی باتوں کے بنانے کے لوگ عادی ہیں، بالکل اس کے برعکس قرآن نے صاف لفظوں میں یہ اطلاع دی ہے کہ کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ پہلے بھی لوگ اسی کی پابندی کرتے چلے آئے ہیں، تم سے بھی اسی کی پابندی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

اور قرآن کا صرف دعویٰ ہی نہیں ہے۔ تفصیلات میں جانے کا موقعہ نہیں، اجمالاً میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ روزہ کا رکھنے والا بجائے اجر و ثواب کے کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے، کہ دنیا کے کسی مذہب میں مجرم یا گنہگار ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ یا روزہ کے قانون کی پابندی کر کے اپنے موروثی بزرگوں، اور آبائی پیشواؤں کے نقش قدم سے ہٹ جاتا ہو۔

پھر قرآن اگر یہ کہتا ہے کہ وہ قوموں کو ان کے بزرگوں، اور مہاپرکھوں، سے چھڑانے اور توڑنے کے لیے نازل نہیں ہوا ہو، بلکہ بچھڑے ہوؤں کو ملانا، اور اپنے بزرگوں کی راہ سے جو ہٹ گیے ہیں، ہی راہ پران کو چڑھانا، واپس لانا یہی اس کا اسی نصب العین ہے، تو بتایا جائے کہ واقعہ کی تعبیر اور کیا کی جائے، یا کیا کی جا سکتی ہو، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ دل آزاری کی راہوں کو چھوڑ کر دین کی دعوت میں قرآنی منہج پر لوگ اگر چلتے، تو اسلام سے محرومی کی مدت جن قوموں کی درازسے دراز تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ مدت گھٹ کر بہت مختصر ہو جاتی، اور اب بھی چاہا جائے تو ہو سکتی ہے۔

سچ پوچھیے تو اصل چیز ہر عمل میں اس کی روح ہی ہوتی ہے یہی روزہ قرآن ہی میں جب بتایا گیا ہو کہ آئین بندی یعنی تقویٰ کے فطری رجحان کو بروئے کار لانے کا یہ قدرتی ذریعہ ہے، گویا پانی کا حقیقی مقصد جیسے پیاس

بجھانا اور تشنگی کا ازالہ ہے۔ باقی یہ سوال کہ پینے والے نے پانی شیشے کے گلاس میں پیا، یا مراد آبادی پیالہ میں وہی پانی اس کو پلایا گیا، یا اسی پانی کو مٹی کے آبخوروں میں اس نے نوش کیا۔ ظاہر ہے کہ پانی پینے کا جو مقصد اور واقعی مطلب ہے۔ اس کے لحاظ سے پینے کے ظروف کی نوعیتوں، اور خصوصیتوں کا سوال۔ انصاف سے کہنا چاہیئے کچھ بھی اہمیت رکھتا ہے، اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ رمضان کا مہینہ روزوں کے لیے پہلی امتوں کے لیے مان بھی لیا جائے کہ متعین نہ تھا، تو اس کی حیثیت بجز اس کے اور کیا ہے، کہ بجائے مٹی کے بدھنوں کے شیشے کے گلاس میں پانی آپ کو پلایا گیا، اور آئینی زندگی کی مشق کے لیے اسی مہینہ کو متعین کر دیا جس میں آئین کے نزول وظہور کا آغاز ہوا، مناسبت اور موزونیت کے لیے اس سے بہتر تعلق اور کیا ہو سکتا تھا۔

علاوہ تصدیق وتوثیق کے کہنے والے جو کہتے ہیں کہ سابقہ ادیان ومذاہب کی تعلیمات کے بعض پہلوؤں کے ساتھ قرآن تکمیلی رشتہ بھی رکھتا ہے، تو عموماً اس کا تعلق بھی کچھ اسی قسم کی باتوں سے ہے یعنی پینے والوں کو ہر زمانہ میں پانی ہی پلایا جاتا رہا، البتہ یہی پانی کبھی مٹی کے برتنوں میں لوگ پیتے رہے، اور جب موقعہ آیا، تو اسی پانی کو شیشے کے گلاسوں، اور چینی کے پیالوں میں بھی پلانے کا نظم کر دیا گیا، یہی نہیں بلکہ قرآن کی جن ترمیموں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ کسی وجہ سے سابقہ ادیان کے بعض تعلیمات میں ردوبدل کی صورت پیدا ہو گئی ہے میرے نزدیک تو یہ بھی ایک تعبیری نیرنگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مانا جائے یا نہ مانا جائے، لیکن اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، کہ پانی میں جیسے کبھی ادھر سے ادھر اڑ اڑ کر ایسی چیزیں شریک ہو جاتی ہیں، جن سے پانی اپنے منافع کو کھو بیٹھتا ہے۔ یا پانی سے صحیح معنوں میں جیسا کہ پینے والوں کو جو فائدہ پہونچنا چاہیئے۔ تجربہ ثابت کرنے لگے، کہ وہ فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ اب اس موقعہ پر خارجی آمیزشوں سے پانی کو پاک کر کے اسے جو صاف ستھرا نہیں ہوا اب مصفّی بنا دے۔ تو گندے پانی کے پینے پر مجبور ہونے والوں کی یہ تعبیر کہ ہم عادی جس پانی کے پینے کے تھے، اس پانی کو بدل دیا گیا، تعبیر کے سوا اور بھی کچھ ہے؟ ورنہ واقعہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ بیرونی آمیزشوں سے جو پانی بدل گیا تھا، اس کو پھر اس کے اصل حال کی طرف واپس کر دیا گیا۔

ضرورت ہو کہ تصدیق وتوثیق کے رشتہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کو سمجھایا جائے کہ گزشتہ ادیان ومذاہب کے جن پہلوؤں کی تصحیح یا تکمیل کا کام قرآن نے انجام دیا ہے۔ اس کا بھی صحیح مطلب کیا ہے اس کے لیے بجائے دوسروں کے خود قرآن ہی میں آپ کو روشنی مل سکتی ہے۔ اسی موقعہ پر دیکھئے رمضان ہی کے مہینہ کو روزے کے لیے متعین کرتے ہوئے نزول قرآن کے ذکر میں خاص اس موقعہ پر یہ فرما کر کہ الناس (یعنی نسل انسانی) کی ہدایت کا سرچشمہ یہ کتاب ہے، قرآن کی اس عام صفت کے بعد آگے اسی کی خصوصیت کا اظہار

بینات من الھدیٰ والفرقان ہدایت کی کھلی کھلی باتوں پر (قرآن مشتمل ہے) اور الفرقان (یعنی خارجی آمیزشوں کو بھی ہدایت کی قدرتی باتوں سے جدا کرتا ہے)

کے الفاظ میں جو فرمایا گیا ہے، مطلب جس کا یہی ہے کہ مذاہب و ادیان کے بینات یعنی واضح اور کھلے کھلے حقائق جنھیں عام طور پر لوگ جانتے ہیں ان کے سوا قرآن چونکہ الفرقان بھی ہے، یعنی بیرونی آمیزشوں اور خارجی آلائشوں کو تمام مذاہب و ادیان سے جدا کرنا، سب کو پاک و صاف کرنا یہ بھی قرآن ہی کا ایک پہلو ہے، اس لیے رمضان یا نزول قرآن کا مہینہ ان لوگوں کا بھی دینی مہینہ ہے، جن کے پاس پہلے سے ہدایت کے بینات نہ تھے اور جن کے پاس کسی نہ کسی شکل میں ہدایت کے یہ بینات باقی رہ گیے تھے ان کے لیے بھی رمضان اس لیے دینی مہینہ بن گیا کہ قرآن کے فرقانی پہلو سے استفادہ کا موقعہ ان کو بھی ملا، الغرض رمضان سابق الذکر کے لیے اگر قرآنی مہینہ ہے، تو موخر الذکر طبقات کے لیے وہ فرقانی مہینہ ہے، اور ظاہر ہے کہ کرۂ زمین پر انسانوں کی جو نسلیں آباد ہیں وہ ان دو پہلوؤں میں سے کسی ایک یا دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے قرآن کی بہرحال محتاج ہیں اور یوں رمضان ساری انسانی نسلوں، خاندانوں، قبیلوں کا دینی مہینہ بن جاتا ہے، خواہ بعضوں کے لیے قرآنی اور بعضوں کے لیے وہ فرقانی مہینہ ہی کیوں نہ ہو۔

بہرحال مجھے کہنا یہی ہے کہ قرآن جیسی خود مکتفی کتاب کی اشاعت و تبلیغ کے لیے یا اس کے تعلیمات کی توجیہ و تاویل کے لیے غیر قرآنی ذرائع کی دست نگری کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن آگے تو کیا بڑھتا خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ کہیں (لا فعلہ اللہ) اس کا دائرہ گھٹ نہ جائے۔ اگرچہ یہ خطرہ بھی صرف دلوں کے ایک وسواسی خطرہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور صرف ان ہی میں پیدا ہوسکتا ہے، یا ہوتا ہے جن کے متعلق قرآن ہی میں یہ اطلاع دی گئی ہے۔

جب بولے وہ لوگ جو منافق (دورخے تھے) اور جن کے دلوں میں روگ تھا کہ نہیں وعدہ کیا ہم سے اللہ اور اسکے رسول نے مگر صرف فریب۔	اذ یقول المنافقون والذین فی قلوبھم مرض ما وعدنا اللہ و رسولہ الا غرورا۔ (۳)

اور خواہ میرے اس خیال کی ہمنوائی نہ کی جائے مگر اپنے دل کے احساس کو کیسے چھپاؤں، کہنا یہ چاہتا ہوں کہ روزے کے متعلق مذکورہ بالا آیات میں یہ طریقۂ تعبیر جو اختیار کیا گیا ہے، کہ پہلے تو "ایام معدودات" یعنی چند گنے چنے دن کا معلوم ہوتا ہے کہ روزہ فرض ہوا اور بعد کو پھر رمضان کا مہینہ روزہ رکھنے کے لیے مقرر کر دیا گیا، گویا یہ دونوں حصے سمجھے جاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا ہیں اور ہر ایک کی بجائے خود اپنی مستقل ذاتی حیثیت ہے۔ لیکن مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ہی مطالبہ کو خاص طریقہ سے پیش کیا گیا ہے، اور یہ دونوں دو مستقل مطالبے نہیں ہیں، بلکہ رمضان ہی کے مہینہ کو روزے کے حکم کی تعمیل کا مہینہ مقرر کرنا مقصود تھا، لیکن اسی مقصد کو پہلے عام الفاظ میں ادا کیا گیا یعنی فرمایا گیا کہ بڑی مدت روزے کے لیے نہیں چاہی جا رہی ہے، بلکہ چند گنے چنے دن کی حد تک اس عمل میں مسلمانوں کو مشغول ہونا پڑے گا، پھر ان ہی گنے چنے دنوں کی تفصیل یہ کی گئی کہ وہ رمضان کا مہینہ ہے۔ البتہ اتنا

فرقِ اجمال و تفصیل میں ضرور کیا گیا ہے کہ "ایاماً معدودات" کے موقعہ پر مرض اور سفر کی رعایت کا ذکر کرتے ہوئے "تو منکم" فرمایا گیا ہے، جس کا ترجمہ ہے "تم میں سے" بظاہر اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ شاید یہ رعایت گزشتہ امتوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے ساتھ کی گئی تھی، لیکن جب قرآنی اور فرقانی دونوں تعلقات کا ذکر کر کے رمضان کے مہینے کو ساری انسانی نسل کا دینی مہینہ بنا دیا گیا، تو اب یہ رعایت عام ہوگئی، اسی لیے دوبارہ جب اسی رعایت کو قرآن میں رمضان والے حکم کے بعد دہرایا گیا ہے تو اس میں "منکم" کا لفظ نہیں پایا جاتا ہے، واللہ اعلم بالصواب، کچھ بھی ہو بجائے دو مستقل حصوں کے اول سے آخر تک کی آیتوں کو ایک ہی بیان قرار دیتے ہوئے اگر یہ سمجھا جائے کہ ایام کی عمومیت کے بعد، اسی عمومیت کو رمضان کا اختصاصی قالب عطا کیا گیا۔ تو ناسخ و منسوخ وغیرہ کے قصوں کے ماننے کی ضرورت نہیں رہتی۔

(۴)

اسی طرح روزہ کا حکم جب عائد کیا گیا اور معذوری کے ساتھ یہ رعایت دی گئی کہ گن کر روزوں کی قضا دوسرے دنوں میں کر لی جائے تو ایک قدرتی سوال پھر بھی باقی رہ جاتا تھا کہ اس رعایت سے ظاہر ہے کہ معذوروں کا وہی طبقہ مستفید ہو سکتا ہے جس کا عذر زوال پذیر ہو، کیوں کہ دوسرے دنوں میں روزہ رکھنے کا موقعہ ظاہر ہے ان ہی کو مل سکتا ہے لیکن جن لوگوں کا عذر موت تک عام حالات میں باقی رہتا ہے۔ مثلاً شیخ فانی بے چارے یا سل و دق وغیرہ مہلک امراض کے مریض، جن کو بہت کم شفایاب ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ ان کا حکم روزوں کے سلسلہ میں کیا ہے، ضرورت تھی کہ اس قدرتی سوال کا جواب بھی دے دیا جاتا، مندرجہ بالا آیتوں میں

اور ان لوگوں پر جو روزہ بدشواری رکھ پاتے ہوں،	وعلی الذین یطیقونہ
ان کو چاہیئے، کہ ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دیدیا کریں۔	فدیۃ طعام مسکین

کا جزء جو پایا جاتا ہے، میرا خیال یہی ہے کہ اسی قدرتی سوال کا یہ قرآنی جواب ہے جس کی تائید خود یطیقونہ کی شاذ قراۃ یطوّقونہ سے بھی ہوتی ہے، آئمہ مجتہدین نے بھی ان معذوروں کا حکم جن کا عذر زوال پذیر نہ ہو۔ اسی آیت سے نکالا ہے تفصیل کے لیے مطولات کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

(۵) روزہ کی اس حقیقت پر اگر غور کیا جائے کہ سب سے زیادہ آدمی جن چیزوں کا عادی ہوتا ہے، روزہ کی وجہ سے اپنی اس دوامی عادت سے دست برداری کی مشق پیدا ہوتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ دین ہو، یا دنیا زندگی کے تمام شعبوں میں اس مشق سے یہ مدد ملتی ہے کہ عادت کے خلاف کسی قسم کی مشکلات سے دوچار ہونے کا موقعہ کیوں سامنے نہ آجائے لیکن روزے کی مشق ان مشکلات کو قدرتاً روزہ رکھنے والوں کے لیے آسان بنا دیتی ہے، اسی لیے یہ فرماتے ہوئے کہ جن رعایتوں اور جن شروط کے ساتھ روزہ کا مطالبہ واجب کیا گیا ہے ان ہی کو دیکھ کر تم یہ سمجھ سکتے ہو کہ مشقت اور دشواری میں مبتلا کرنے کا ارادہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کے مقابلہ میں روزے کی مشق سے زندگی کے عام عادی مشکلات ہیں جو

مدد ملتی ہے خصوصاً قمری مہینے کی وجہ سے ہر موسم اور سال کے ہر حال میں روزہ رکھنے کی عادت سہولت کے دائرے میں جس وسعت کو پیدا کرتی ہے، اور مشقت کی برداشت کی قوت کو بڑھاتی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہو کہ روزے سے آسانی کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے قرآنی تعبیر

چاہتا ہو اللہ تم سے آسانی، اور نہیں چاہتا	یرید اللہ بکم الیسر ولا
ہے تم سے دشواری،	یرید بکم العسر

بظاہر حاصل دونوں اجزا کا ایک ہی معلوم ہوتا ہے، اور قرآن کے خاص ایجازی رنگ کے پیش نظر یہ ترکیب تھوڑی دیر کے لیے غور طلب ہو جاتی ہے لیکن مذکورہ بالا معروضات کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو کچھ کہنا مقصود ہے۔ اس پیرایہ بیان کے بغیر وہ ادا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ گویا پہلے جزء سے اشارہ ان آسانیوں کی طرف کیا گیا ہو جن کی رعایت اس قانون میں کی گئی ہے اور دشواریوں سے مقابلہ کرنے کی قوت روزے کی وجہ سے آدمی میں پیدا ہوتی ہے اس کی طرف دوسرے جزء سے ایماء کیا گیا ہے۔

(۶) سال کے بارہ مہینوں میں لوگوں کو اگر اختیار دے دیا جاتا کہ اپنی اپنی سہولتوں کے لحاظ سے تیس[۳۰] دن کا روزہ رکھ لیا کریں۔ بظاہر ایک خوش کن بات معلوم ہوتی ہے لیکن رمضان کے خاص مہینہ میں مشرق سے مغرب تک مسلمانوں کا روزہ دار ہو جانا، اس اجتماعی رنگ کے فوائد اس انتشاری کیفیت سے خود سوچنا چاہیئے کیا حاصل ہو سکتے تھے۔ میرا مضمون کافی طویل ہو چکا ہے، تفصیل کا موقعہ باقی نہیں رہا ہے، اجمالاً یہی کیا کم ہے کہ ایک خاص ماہ کی تعیین کی وجہ سے روزوں کی معینہ تعداد کی گنتی اور شمار میں کتنی آسانی ہو گئی ہو مسلمان قوم جن میں جاہل عالم پڑھے اَن پڑھے، عورت مرد سب ہی طرح کے لوگ شریک ہیں غیر منظم روزوں کا شمار کیا ان کیلئے آسان ہوتا بلکہ شمسی حساب کی جگہ قمری حساب سے بھی ہر عامی و خاصی کو روزوں کی گنتی میں کافی مدد مل رہی ہے، ریاضی اور ہیئت کے علوم سے ناواقف قومیں بھی باسانی قمری حساب سے مستفید ہو سکتی ہیں اور ہو رہی ہیں، بہرحال لتکملوا العدۃ کے قرآنی الفاظ کے مختلف پہلوؤں میں ایک پہلو یہ بھی ہے امید ہے کہ سوچنے والے ان پہلوؤں کو جنھیں طوالت کی وجہ سے میں نے ترک کر دیا ہے۔ غور کریں گے تو خود بھی سمجھ سکتے ہیں۔

(۷) انسانیت اپنے صحیح انجام تک ہدایت کے جس نظام کی پابندی کر کے پہونچ سکتی ہے، یقیناً اس کا علم ساری انسانی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہو سکتی ہے، اس غیر معمولی، انمول نعمت سے سرفراز فرمانے والے کی بڑائی کے اقرار کی یہی روزہ کتنی بہترین عملی شکل ہے، کہ آدمی سب سے زیادہ جن چیزوں کا رسیا اور عادی ہے، ہر ایک کو ٹھکرا کر اس بڑے کے حکم کی تعمیل کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔

تاکہ بڑائی کرو، اللہ کی اس نعمت کے مقابلہ میں	لتکبروا اللہ علیٰ ما ھداکم
کہ تمھاری راہ نمائی اس نے کی۔	

(۸) اور سچ تو یہ ہے کہ زندگی بھر جو ہمیں کھلاتا پلاتا رہتا ہو۔ اور طرح طرح کی نعمتوں سے نوازتا ہے، آدمی کا جی چاہتا ہے کہ اسکی نعمتوں کا شکر کیسے ادا کرے۔ کیا کرے۔ زبان سے شکر کے الفاظ ادا ہوتے ہیں، یا دل میں شکر و امتنان کے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ شکر ادا کرنے کی صورتیں یہ بھی ہیں، لیکن کھلانے پلانے والے کے شکر کی یہ شکل کہ جتنی دیر کے لیے کھانا چھوڑ دینے کا حکم کھلانے والے پلانے والے نے دیا اتنی دیر کے لیے ہم اس کو چھوڑ بیٹھیں، حق تو یہ ہے کہ زبان اور دل والے شکریوں سے شکر کا یہ عملی قالب خود شکر کرنے والوں ہی کے لیے زیادہ اطمینان بخش ہے۔ اس کی طرف جہاں تک میں سمجھتا ہوں آخر میں

تاکہ تم شکر ادا کرو، لعلکم تشکرون

کے الفاظ سے اشارہ فرمایا گیا۔

(۹) روزے کے ان ہشت گانہ قرآنی مصالح و حکم کے سوا روزے کی ان ہی آیتوں کے بعد معاً

اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے میرے	واذا سالک عبادی عنی فانی قریب
متعلق تو میں قریب ہوں، جواب دیتا ہوں پکارنے	اجیب دعوۃ الداع اذا دعان
والے کی پکار کا بس چاہیے کہ میرا بھی وہ جواب دیں	فلیستجیبوا لی ولیومنوا بی لعلھم
اور مجھے بھی مانیں ہوسکتا ہو کہ وہ راہ پر لگ جائیں۔	یرشدون۔

اور اس کے بعد پھر روزے ہی کے بعض ذیلی احکام والی آتیں قرآن میں پائی جاتی ہیں جن کی تفصیل اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے۔

بہرحال اس درمیانی آیت سے پہلے بھی روزہ ہی کا ذکر ہے اور اس کے بعد بھی جو آتیں ہیں، ان کا تعلق بھی روزہ ہی سے ہو، بیچ میں اس آیت کا ہونا یقیناً بلا وجہ نہیں ہوسکتا۔

بظاہر یہی خیال گذرتا ہے کہ حق تعالیٰ کے حکم کے مطابق جب بندہ اپنی مالوف عادتوں سے دستبردار ہوکر اپنے پیدا کرنے والے کی خوشی اور اسی کی مرضی کے مطابق اپنی خوشی اور اپنی مرضی کو بنا دیتا ہے، تو روزہ کے زمانہ میں روزہ دار کا خالق کائنات کے ساتھ یہ وفاقی تعلق قرآن بتانا چاہتا ہے، کہ اسے معمولی حال نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ منطقی طور پر یوں ترتیب قائم کی جائے کہ ساری کائنات حق تعالیٰ کی مرضی مبارک کے مطابق چل رہی ہو، بس انسان جب اسی عالمگیر مرضی کے مطابق اپنے آپ کو کرلیتا ہے تو کیوں نہ سمجھا جائے کہ اس خاص حال میں عالم کا ہر قانون انسان کی مرضی کی مطابقت کے لیے تیار ہوجاتا ہے یعنی اسکی ہر دعاء کو حق تعالیٰ قبول فرماتے ہیں تو آپ ہی بتائیے اس کے سوا دوسری توقع ہی کیا کی جاسکتی ہے، اسی آیت کے آخر میں خود ارشاد ہوا ہو کہ "بس چاہیئے کہ میری باتوں کا تم بھی جواب دو، اور مجھے مانو ہوسکتا ہو کہ صحیح راہ پر وہ لگ جائیں۔"

یعنی فلیستجیبوا لی ولیومنوا بی لعلھم یرشدون کا جو ترجمہ ہے، گویا سمجھنا چاہیئے کہ قدرت اور اس کے سارے قوانین کے ساتھ وفاقی تعلق اور ہم آہنگی روزے کا منطقی نتیجہ ہے، اگر یہی واقعہ ہے، اور قرآنی نص کے بعد اس کی واقعیت میں شک و شبہ کی گنجائش ہی کیا باقی رہتی ہے تو ہماری سائنس اور ہمارا فلسفہ ان کی کتابیں، لائبریریاں، سب کی سب دین کے صرف ایک رکن روزہ پر باسانی قربان ہوسکتی ہیں، آخر جس نصب العین تک پہونچنے میں جزئی کامیابی سائنس اور حکمت کی راہوں سے حاصل ہو رہی ہو، کلی طور پر جو چیز اسی نصب العین تک ہمیں پہونچاتی ہو بتایا جائے کہ ہم اس کو اور کیا سمجھیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہ رحمت

(مدیر الفرقان کی ایک تازہ تقریر)
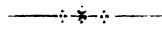
الحمد للہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقد جاءت رسل ربنا بالحق۔ صلوات اللہ تعالیٰ علیھم وعلیٰ کل من اتبعھم باحسان الیٰ یوم الدین

حضرات! اللہ کی رحمتوں والا مہینہ رمضان قریب ہو، بلکہ گویا آچکا ہو۔ اگرچہ ہم جیسے عوام کی آنکھیں اس مبارک مہینہ میں اور دوسرے مہینوں میں کوئی خاص فرق نہیں دیکھتیں بلکہ ظاہری نظر میں رمضان کے دن اور رمضان کی راتیں اسی طرح کی ہوتی ہیں جس طرح دوسرے مہینوں کے دن اور ان کی راتیں ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقت میں رمضان میں اور دوسرے مہینوں میں بہت بڑا فرق ہو۔ اتنا بڑا فرق ہو کہ اگر وہ ہم پر منکشف ہو جائے تو رمضان کی آمد پر ہم کو کچھ اس قسم کی خوشی اور مسرت حاصل ہوا کرے جیسی کہ پانی میں رہنے والے جانوروں کو سخت قحط اور خشکی کے بعد بارش کا موسم شروع ہونے سے ہوتی ہوگی۔ یا شاعروں کی زبان میں جیسی خوشی بلبل کو فصل بہار آنے پر ہوتی ہو ـــــ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رمضان مبارک کا بڑے اشتیاق کے ساتھ انتظار رہتا تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ جب آپ رجب کا چاند دیکھتے تو اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے کہ "اللھم بارك لنا فی رجبنا وشعبان وبلغنا رمضان" (اے اللہ ہمارے رجب اور شعبان کو ہمارے واسطے مبارک کر اور رمضان تک ہمیں پہونچا دے) اور جب شعبان شروع ہوتا تو آپ کثرت سے روزے رکھنے شروع کر دیتے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رمضان کے علاوہ سب مہینوں سے زیادہ روزے آپ شعبان میں رکھتے تھے۔ بلکہ کبھی کبھی تو پورا مہینہ گویا روزوں ہی میں گزر جاتا تھا۔ دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ روزے رمضان ہی کے اشتیاق میں اور اس کی تیاری کے لیے اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کے استقبال کے واسطے ہوتے تھے۔

پھر جب رمضان بالکل قریب آتا تو آپ اس کی فضیلتوں اور برکتوں پر مستقل خطبے دیتے اور صحابۂ کرام کو

اس کی قدر دانی اور اس کی رحمتوں کے استقبال کے لیے تیار کرتے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سلسلہ کے بعض خطبے حدیث کی کتابوں میں بھی محفوظ ہوگئے ہیں، اگر ہم میں طلب اور عزم ہو تو ان خطبات نبوی کی رہنمائی میں رمضانِ مبارک کی وہ رحمتیں اور برکتیں کسی درجہ میں ہم بھی ضرور حاصل کرسکتے ہیں جو ان خطبوں کے براہ راست سننے والے صحابۂ کرام حاصل کرتے تھے۔

اس سلسلہ کا سب سے بڑا اور مفصل خطبہ تو وہ ہے جس کو حضرت سلمان فارسیؓ کی روایت سے بیہقی وغیرہ محدثین نے روایت کیا ہے اور وہ مشکوٰۃ شریف میں بھی ہے۔ حضرت سلمانؓ راوی ہیں کہ ایک دفعہ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور اس میں ارشاد فرمایا۔

ایھا الناس قد اظلکم شھر عظیمٌ شھر مبارکٌ شھر فیہ لیلۃ خیر من الف شھر۔

اے لوگو! ایک بڑی عظمتوں اور برکتوں والا مہینہ تم پر سایہ افگن ہو رہا ہے، اس مبارک مہینہ کی ایک رات (شب قدر) ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

(حضور کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ شب قدر عموماً رمضان ہی میں ہوتی ہے، اور شب قدر کی یہ فضیلت کہ "وہ ہزار مہینوں سے بہتر ہے" [خیر من الف شھر] ان ہی لفظوں میں قرآن پاک میں بھی بیان فرمائی گئی ہے)

اس کے بعد آپ نے فرمایا

جعل اللہ صیامہ فریضۃ وقیام لیلہ تطوّعاً، من تقرب فیہ بخصلۃ من خصال الخیر کان کمن ادی فریضۃ فیما سواہ، ومن ادی فیہ فریضۃً کان کمن ادی سبعین فریضۃً فیما سواہ۔

اللہ تعالیٰ نے اس پورے مہینہ کے روزے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں کی نماز (تراویح) کو کارِ ثواب قرار دیا ہے (یعنی اس کو فرض تو نہیں کیا ہے لیکن اس میں بڑا ثواب رکھا ہے) جو شخص اس مہینہ میں اللہ کی کوئی غیر فرضی عبادت کرے (یعنی سنت یا نفل ادا کرے) تو اسکو دوسرے زمانہ کی فرض عبادت کی برابر اس کا ثواب ملے گا اور جو شخص اس مہینہ میں فرض عبادت ادا کرے گا اس کا ثواب دوسرے مہینوں کے اسی طرح کے ستر فرضوں کے برابر ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ یوں ہی سن کر گزر جانے کے نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم ان پر دھیان کریں اور ان میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اپنے دل و دماغ میں اس کا یقین بٹھائیں۔ آپ کے اس ارشاد کا مطلب واضح ہے۔ اس میں خاص طور سے ہم جیسے دین کے مفلسوں کے لیے بڑی بشارت ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ رمضان

میں تمام عبادات اور اعمال صالحہ کا اجر و ثواب بہت بڑھا دیا جاتا ہو، نوافل کا ثواب فرضوں کے برابر کر دیا جاتا ہو اور فرائض کا ثواب ستر گنا بڑھا دیا جاتا ہو، مثلاً رمضان میں فجر کی جو دو رکعتیں پڑھی جائیں گی ان کا ثواب غیر رمضان کی دو رکعتوں سے ستر گنا زیادہ ہوگا، گویا ایک سو چالیس رکعت کے برابر ہوگا۔ علیٰ ہذا زکوٰۃ کے جو دس روپے مثلاً رمضان میں نکالے جائیں گے اُن کا ثواب دوسرے زمانے کے سات سو روپے کے برابر ہوگا[۵۱]۔ اور اسی طرح نفلی عبادات جن کا ثواب فرض عبادات کے مقابلہ میں بہت کم ہوتا ہے، رمضان مبارک میں ان کا ثواب بڑھا کر فرضوں کے برابر کر دیا جاتا ہو — پس ہم جیسے کم ہمت لوگ جو اللہ کے عابد بندوں کی طرح ہمیشہ زیادہ عبادتیں نہیں کر سکتے۔ ان کے لیے یہ ماہ مبارک خاص رحمت کا موسم ہو، اگر اس ایک مہینہ کے لیے وہ ہمت کی کمر کس لیں تو بھی بہت کچھ کمائی کر سکتے ہیں — پھر اسی مہینہ میں وہ رات بھی ہو جس کے متعلق صرف حدیثی روایات میں نہیں، بلکہ قرآن مجید میں بھی فرمایا گیا ہو کہ وہ ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جس کا ظاہری مطلب یہی ہو کہ یہ رات رحمت اور برکات کے نزول کے لحاظ سے اور عبادات کے اجر و ثواب کے اعتبار سے ہزار مہینوں سے بہتر ہو اور اس ایک رات میں ہزار مہینوں سے زیادہ کمائی کی جا سکتی ہو۔ بہرحال یہ مہینہ اللہ کی رحمت کی بارش کا مہینہ ہو، اگر ہم اس کی ناقدری کریں اور اس کی رحمتوں اور برکتوں سے حصہ لینے کی کوشش نہ کریں، اور جن غفلتوں میں ہمیشہ رہتے ہیں ان ہی غفلتوں میں یہ مبارک مہینہ بھی گزار دیں تو یہ ہماری انتہائی بدبختی اور محرومی ہوگی۔ اس کے بعد حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔

ھو شھر الصبر والصبر ثوابہ الجنّۃ و شھر المواساۃ و شھر یزاد فیہ رزق المومن۔	یہ رمضان صبر کا مہینہ ہو اور صبر کا بدلہ بس جنت ہو۔ اور یہ ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ ہو اور یہ وہ مہینہ ہو جس میں ایمان والوں کا رزق بڑھا دیا جاتا ہو۔

ان جملوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کو صبر کا، ہمدردی و غمخواری کا اور رزق میں زیادتی کا مہینہ بتلایا ہو۔

صبر اس کا نام ہو کہ آدمی کسی اعلیٰ مقصد کی خاطر اس چیز کو برداشت کرے جس میں اس کو تکلیف ہو اور جو اس کی طبیعت کو ناگوار ہو۔ یہ انسان کی بہت اونچی صفتوں میں سے ہو اور بڑی زبردست طاقت ہو اور دین میں

---

[۵۱] زکوٰۃ نکالنے والوں کے لیے بہتر ہو کہ وہ حساب لگا کر اپنے پورے مال کی زکوٰۃ رمضان میں نکال لیا کریں۔ پھر اس کے صرف کے لیے جو مناسب موقعے رمضان میں سامنے آئیں ان میں صرف کریں، اور جو باقی بچ جائے اس کو محفوظ رکھیں اور حسبِ موقع دوسرے مہینوں میں صرف کریں۔ انشاء اللہ ان کی پوری زکوٰۃ رمضان ہی کے حساب میں شمار ہوگی۔ ۱۲

اور اللہ کی نگاہ میں اس کی بڑی فضیلت ہے۔ کہیں فرمایا گیا ہے ان اللہ مع الصّٰبرین" (اللہ تعالیٰ صبر والوں کے ساتھ ہے) ۔ کہیں فرمایا گیا ہے" واللہ یحب الصّٰبرین" (اللہ تعالیٰ صبر والوں سے محبت کرتا ہے) اور اسی خطبہ میں فرمایا گیا ہے کہ صبر کا بدلہ جنت ہے، بہر حال صبر انسان کے اونچے کمالات میں سے ہے اور رمضان میں اسی صبر کی مشق ہے۔ بندہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں اور اس کی رضا کے لیے کھانے پینے سے اور نفسانی خواہش سے پورے ایک مہینہ کے دنوں میں اپنے کو روک کر صبر کا عمل کرتا ہے۔ اور صبر کی صفت اپنے اندر پیدا کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے واسطے جنت کی بشارت ہے ـــــ اور ماہ رمضان کے" ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ" ہونے کا مطلب ا یہ ہے کہ اس مہینہ میں ہر روزہ دار کو بھوک پیاس وغیرہ کی تکلیف کا تجربہ ہوتا ہے تو ان کو ان کا احساس ہوتا ہے کہ اللہ کے جن بندوں کو ناداری کی وجہ سے فاقے ہوتے ہیں اور جو بیچارے افلاس اور غربت کی وجہ سے دو دو چار چار وقت بھوک کے ساتھ گزارتے ہیں ان پر کیسی گزرتی ہوگی، اور یہ احساس ان میں ہمدردی و غمخواری کے جذبہ کو پیدا کرتا ہے۔ اور ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رمضان میں اہلِ ایمان کو ہمدردی اور غمخواری کی خصوصیت کے ساتھ تاکید ہے۔ گویا رمضان مبارک کے خاص اعمال خیر میں سے یہ بھی ہے۔

اور رحمت کے اس مہینہ میں ایمان والوں کے رزق میں زیادتی اور برکت کا جو ذکر فرمایا گیا ہے، ہر صاحب ایمان اس کی شہادت دے سکتا ہے کہ یہ اس کا ہمیشہ کا تجربہ ہے، اللہ کے مومن بندوں کو رمضان مبارک میں جتنا اچھا اور جتنی فراغت سے رزق ملتا ہے یقیناً بقیہ گیارہ مہینوں میں وہ بات نصیب نہیں ہوتی۔ اس کے بعد حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔

من فطر فیہ صائماً کان لہ مغفرۃ لذنوبہ وعتق رقبتہ من النار وکان لہ مثل اجرہ من غیر ان ینتقص من اجرہ شیئ۔	اس مہینہ میں جو شخص کسی روزہ دار کو افطار کرائے تو یہ اس کے لیے گناہوں کی مغفرت کا اور آتش دوزخ سے اس کی آزادی کا ذریعہ ہوگا اور اس کو اس روزہ دار کے برابر ثواب ہوگا۔ بغیر اس کے کہ اس کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے۔

یعنی اللہ تعالیٰ روزہ افطار کرانے والے کو روزہ دار کے برابر ثواب اپنے خاص خزانۂ فضل سے دے گا، روزہ دار کے ثواب میں سے نہیں دیا جائے گا کہ اس میں کوئی کمی آئے۔

اس خطبہ کے راوی حضرت سلمانؓ فارسی فرماتے ہیں کہ جب حضورؐ نے روزہ افطار کرانے والے کا یہ ثواب عظیم بیان فرمادیا تو بعض حاضرین نے عرض کیا۔

یارسول اللّٰہ لیس کلّنا نجد ما نفطّر بہ الصائم	حضور! ہم میں سب تو ایسے نہیں ہیں جنھیں روزہ افطار کرانے کی کوئی خاص چیز میسر ہو۔
آپ نے ارشاد فرمایا	
یعطی اللّٰہ ھذا الثواب من فطّر صائماً علیٰ مذقۃ لبن او تمرۃ او شربۃ من ماء	اللہ تعالیٰ یہی ثواب (یعنی روزہ دار کے برابر ثواب) اس شخص کو بھی دے گا جو کسی روزہ دار کو دودھ کی تھوڑی سی لسی سے یا کھجور کے ایک دانہ ہی سے یا پانی کے ایک گھونٹ ہی سے افطار کرادے۔
اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا۔	
ومن اشبع صائماً سقاہ اللّٰہ من حوضی شربۃ لا یظمأ حتی یدخل الجنۃ۔	اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلائے تو اللہ تعالیٰ اسکو میرے حوض کوثر سے ایسا سیراب فرمائیں گے کہ پھر جنت میں جانے تک اسکو پیاس نہ لگے گی۔

ہمارے زمانہ کے بعض لوگ جب کسی حدیث میں کسی ایسے عمل پر جس کو وہ معمولی اور آسان سمجھتے ہیں کسی بڑے ثواب کا وعدہ دیکھتے ہیں تو انھیں اس کے بارے میں شکوک اور شبہات ہوتے ہیں۔ یہ شکوک دراصل اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل و کرم کی وسعتوں کو نہ جاننے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ اصل بات یہ ہے کہ اعمال کے اُخروی نتائج یعنی ثواب اور عذاب کی مقدار اور اس کی تفصیلات کے بارہ میں انسانی ذہن بالکل عاجز ہے۔ " بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ " (آخرت کے بارے میں سب کا علم عاجز ہے) بلکہ اللہ و رسول جو کچھ فرمائیں ہمارا کام بس اس پر ایمان لانا ہے۔ اِس ثبوت مستند طریقہ سے ہونا چاہیے ـــ ورنہ اگر ہم ان چیزوں میں بھی اپنی بیمار عقلوں اور اپنے ماؤف ذہنوں کو معیار بنائیں گے تو دین کی بہت سی بنیادی اور مسلم حقیقتیں ہمارے نزدیک مشکوک اور مشتبہ ہو جائیں گی۔ مثلاً ایمان کے نتیجہ میں ہمیشہ اور ابدالآباد تک جنت میں عیش کرنا اور کفر و شرک کے نتیجہ میں ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں جلنا وہ حقیقت ہے جس کو قرآن مجید نے سیکڑوں جگہ بیان فرمایا ہے۔ لیکن کتنے احمق اور یورپ زدہ لوگ ہیں جن کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ایمان اور کفر کے انجام میں اتنا بڑا فرق کیوں ہے ـــ بہرحال جس عمل کا جو ثواب یا جو عذاب صحیح اور مستند طریقہ سے معلوم ہو جائے ہمیں اس پر یقین کر کے اس ثواب کے حاصل کرنے یا اس عذاب سے بچنے کی فکر کرنا چاہیے۔

ایمانی طریقہ کار یہی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ دار کو افطار کرانے اور کھانا کھلانے کا یہ ثواب بیان فرماکر آگے ارشاد فرمایا۔

وھو شھر اولہ رحمۃ واوسطہ مغفرۃ وآخرہ عتق من النار۔

اس مہینہ کا (یعنی رمضان کا) پہلا حصہ رحمت کا ہے، درمیانی حصہ مغفرت کا ہے، اور آخری حصہ جہنم سے آزادی کا ہے۔

اس حدیث کی شرح کرنے والے علماء نے خطبہ کے اس جز کے کئی مطلب بیان کیے ہیں. ان میں جو سب سے زیادہ میرے دل کو لگتا ہے وہ یہ ہے کہ رمضان کی برکتوں میں حصہ لینے والے آدمی تین طرح کے ہوسکتے ہیں۔ ایک وہ ابرار اور علماء اور اولیاء اللہ جو تقویٰ اور پرہیزگاری کی وجہ سے اور مسلسل توبہ استغفار کی وجہ سے گناہوں کی ناپاکی سے پاک صاف رہتے ہیں توان حضرات پر تو شروع مہینہ ہی سے بلکہ رمضان کی پہلی رات ہی سے رحمت اور انعام کی بارشیں ہونے لگتی ہیں۔ دوسرا طبقہ ان بندوں کا ہے جو معمولی اور ہلکے درجہ کے گناہگار ہوتے ہیں۔ تو یہ لوگ جب رمضان کے ابتدائی حصہ میں روزوں کے اور دوسرے اعمال حسنہ کے ذریعہ اپنے گناہوں کی کچھ تلافی کر دیتے ہیں اور اپنی حالت کو درست کرلیتے ہیں تو درمیانی حصہ میں ان کو معافی دے دی جاتی ہے اور ان کی مغفرت کردی جاتی ہے، اور تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جن کے گناہ اس دوسرے طبقہ والوں سے بھی زیادہ ہوتے ہیں اور جن کا دینی حال ان سے زیادہ خراب ہوتا ہے اور وہ گویا اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے جہنم کے مستحق بن چکے ہوتے ہیں تو اس طبقہ والے بھی جب رمضان کے ابتدائی اور درمیانی حصہ میں روزے رکھ کے اور دوسرے اچھے اعمال کرکے اپنی سیاہ کاریوں کی کچھ تلافی کرلیتے ہیں، اور اللہ کے سامنے رو رو کے دھوتے ہیں تو ان کو بھی جہنم سے آزادی دے دی جاتی ہے ـــــ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا حاصل یہ ہوا کہ پہلی قسم کے مستحقین رحمت کے لیے تو رحمت کا دور دورہ شروع مہینہ ہی سے شروع ہوجاتا ہے اور درمیانی حصہ میں دوم درجہ والوں کی بھی مغفرت کردی جاتی ہے اور آخر میں ان لوگوں پر بھی کرم کیا جاتا ہے جو اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے جہنم کی فہرست پر چڑھ چکے ہوتے ہیں۔ تو رمضان کے آخری حصہ میں ان کو بھی جہنم سے چھٹی دے دی جاتی ہے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:۔

من خفف فیہ عن مملوکہ غفر اللہ

جو کوئی اس مہینہ میں اپنے مملوک (یا ماتحت) کے

لہ واعتقہ من النار | کام میں تخفیف کردے گا اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے گا اور اسکو جہنم سے آزادی دے گا۔

یہ خطبہ مشکوٰۃ شریف میں امام بیہقی کی شعب الایمان کے حوالے سے بس اتنا ہی ہے، مگر منذری کی ترغیب و ترہیب" میں اس پر ایک جز کا اور اضافہ ہے۔ اس میں ہے کہ اس خطبہ میں آپ نے صحابہ کرام سے یہ بھی فرمایا کہ رمضان کے اس مہینہ میں تم چار چیزوں کی خصوصیت کے ساتھ کثرت کرو، ایک لا الہ الا اللہ کی کثرت رکھو، دوسرے استغفار کی کثرت کرو، اور تیسرے جنت کے سوال کی اور چوتھے دوزخ سے پناہ مانگنے کی کثرت کرو یعنی اس مہینہ کے دن رات میں ان چار شغلوں کی کثرت رکھو۔

امام منذری کی "ترغیب و ترہیب" میں رمضان ہی کے سلسلہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور خطبہ بھی حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت سے طبرانی کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے، اس میں ہے کہ ایک دفعہ جب رمضان مبارک آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں سے ارشاد فرمایا۔

اتاکم رمضان شهر برکة يغشاكم الله فيه فينزل الرحمة ويحط الخطايا ويستجيب فيه الدعاء ينظر الله تعالى الى تنافسكم فيه ويباهي بكم ملائكته

لوگو ماہ رمضان آگیا، یہ بڑی برکت والا مہینہ ہے، اللہ تعالیٰ اس میں اپنے خاص فضل و کرم سے تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اپنی خاص رحمتیں نازل فرماتے ہیں، خطائیں معاف کرتے ہیں اور دعائیں قبول فرماتے ہیں اور اس مہینہ میں طاعات حسنات اور عبادات کی طرف تمہاری رغبت اور مسابقت کو دیکھتے ہیں اور مسرت و مفاخرت کے ساتھ اپنے فرشتوں کو بھی دکھاتے ہیں۔

اللہ اللہ! کیسے خوش نصیب ہیں وہ بندے جن کو روزہ کی اور بھوک پیاس کی حالت میں نماز پڑھتے یا تلاوت کرتے یا ذکر کرتے یا رات کو تراویح میں رکوع و سجود اور قیام و قعود کرتے یا پچھلے پہر تہجد پڑھتے ان کا آقا و مولا خود دیکھتا ہے اور ان کی طرف اشارہ کرکے اپنے درباری فرشتوں سے کہتا ہو کہ دیکھتے ہو یہ ہماری رضا کے لیے کیا کیا کر رہے ہیں۔ ع

کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا۔

فاروا الله من انفسكم خيراً | پس اے لوگو ان مبارک دنوں میں اللہ پاک کو

فان الشقی من حرم فیہ رحمۃ اللہ عزوجل۔

اپنی نیکیاں ہی دکھاؤ (یعنی عبادات وحسنات کثرت سے کرو) بلاشبہ وہ شخص بڑا بے نصیب ہو جو رحمتوں کے اس مہینہ میں بھی اللہ کی رحمت سے محروم رہے۔

حضرات! اگرچہ ہم نے اور آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک زمانہ نہیں پایا اور اس لیے حضور کے یہ خطبے خود آپ کی زبان مبارک سے ہم نے نہیں سنے لیکن واقعہ یہ ہو کہ ہم اور آپ بلکہ قیامت تک آنے والے سارے مسلمان ان خطبوں کے اسی طرح مخاطب ہیں جس طرح کہ صحابۂ کرام تھے اور آپ کے خطبات کے متعلق ہمیں یہی تصور کرنا چاہیے کہ گویا آپ ارشاد فرما رہے ہیں اور ہم سُن رہے ہیں۔ انشاء اللہ اس تصور سے عمل کے شوق و ذوق میں ترقی ہوگی۔

مشکوٰۃ شریف ہی میں ایک اور حدیث ہو جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان مبارک کی فضیلتیں اور اس کی برکتیں بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ رمضان کی ہر رات میں اللہ کا منادی پکارتا ہے۔

یا باغی الخیر اقبل ویا باغی الشر اقصر!

اے نیکی اور ثواب کے طالب قدم بڑھا کے آ، اور اے بدی کے شائق رُک اور باز رہ۔

میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ہمیں رمضان کی ہر رات میں یہ دھیان کرنا چاہیے کہ اللہ کا منادی خیر کے طالبوں کو پکار رہا ہو اور بدی کے طالبوں کو ڈانٹ رہا ہو اور پھر ہمیں لبیک کہہ کے دل کے شوق و ذوق کے ساتھ خیر کی طرف اور اللہ کی رحمت اور رضا کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کرنا چاہیے اور اس راہ میں برابر ترقی اور تیز قدمی جاری رکھنی چاہیے۔ دراصل رمضان کا ایک ایک منٹ بڑی قدر کے قابل ہو ــــ اللہ کے جن بندوں کو رمضان کی عظمتوں اور برکتوں کا یقین نصیب ہو جاتا ہے ان کا حال اس مبارک مہینہ میں بالکل مختلف ہوتا ہو۔ وہ اس کے ایک ایک لمحہ کی بڑی قدر اور بڑی حفاظت فرماتے ہیں ــــ ہمارے ایک مخدوم بزرگ کا دستور اور معمول تو یہ ہو کہ پورے رمضان کے مہینہ صرف اتنا آرام کرتے ہیں جو زندگی اور صحت کے لیے بالکل ناگزیر ہو۔ اور لوگوں سے ملنے اور بات چیت کرنے کے اوقات بھی بہت محدود کر دیتے ہیں یعنی دن رات کے ۲۴ گھنٹوں میں سے روزانہ بمشکل بس ۲ دھ گھنٹہ پون گھنٹہ اس کے لیے دیتے ہیں۔ باقی تمام اوقات تلاوتِ قرآن اور نوافل و اذکار میں مشغول رہتے ہیں ــــ پھر ان کا پروگرام بھی بڑا عجیب اور بڑا دلچسپ ہو، پورے رمضان ان کا یہ معمول ہوتا ہو کہ نماز مغرب کے بعد اوابین کی چھ رکعتوں میں تین پارے پڑھتے ہیں۔ پھر وہی تین پارے عشا کے بعد تراویح

میں پڑھتے ہیں، تراویح کے بعد چائے پیتے ہیں اور چائے کی یہ مجلس قریباً آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ تک رہتی ہے۔ (ان بزرگ کے یہاں رمضان بھر گفتگو اور ملاقات کا بس یہی وقت رہتا ہے) اس چائے سے فارغ ہو کر پھر قرآن مجید لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان ہی تین پاروں کی پورے غور و تدبر کے ساتھ تلاوت فرماتے ہیں اور اس وقت بعض تفاسیر بھی سامنے رہتی ہیں اور غور طلب چیزوں کے لیے ان کی طرف رجوع بھی فرماتے ہیں۔ اس تلاوت اور مطالعہ سے فارغ ہو کر تہجد کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور اس میں بھی وہی تین پارے پڑھتے ہیں، بس پوری رات یوں ہی گزر جاتی ہے، اس کے بعد نماز فجر سے اول وقت فارغ ہو کر کچھ دیر کے لیے آرام فرماتے ہیں۔ پھر اٹھ کر چاشت کے نوافل پڑھتے ہیں، اور ان میں بھی وہی تین پارے پڑھتے ہیں اس کے بعد پھر ان ہی تین پاروں کی تلاوت فرماتے ہیں، پھر ظہر کی سنتوں اور نفلوں میں وہی تین پارے پھر پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد عصر تک انہی تین پاروں کی دو دفعہ اور تلاوت فرماتے ہیں۔ پھر عصر کے بعد کسی دوسرے حافظ کو وہی تین پارے سناتے ہیں۔ اس طرح یہ دن رات میں دس دفعہ تین پاروں کا دور ہوتا ہے اور ایک عشرہ میں قرآن مجید کے دس ختم ان بزرگ کے پورے ہو جاتے ہیں۔ پھر آخری عشرہ میں اس خیال سے کہ شاید ۲۹ رمضان کو رویت ہو جائے بجائے تین تین پاروں کے سوا تین تین پارے ہر دفعہ پڑھتے ہیں۔ اور اس طرح آخری عشرہ کے ۹ ہی دن میں دس قرآن مجید ختم ہو کر انتیسویں رمضان کو ان بزرگ کے تیس قرآن اس طرح پورے ہو جاتے ہیں۔ پھر اگر ۲۹ رمضان کو رویت نہ ہوئی اور مہینہ پورے ۳۰ دن کا ہوا تو ۳۰ رمضان کو ایک قرآن مجید اور ختم ہو جاتا ہے ——— ان بزرگ کا برسہا برس سے یہی معمول ہے اور دوسرے اذکار و تسبیحات اور دعوات و صلوات اس کے علاوہ ——— بلکہ ان کے تو گھر کی مستورات کا بھی یہی حال ہے کہ گھر کا سارا کام کاج، جھاڑو برتن، کھانا پکانا بھی خود کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ۲۰۔ ۲۰ اور ۲۵۔ ۲۵ پارے روزانہ تلاوت بھی کرتی ہیں، بلکہ کبھی کبھی پورا قرآن روزانہ ختم کرتی ہیں۔

اور یہ تو میں نے اس زمانے کے صرف ایک بزرگ کا ذکر کیا اور وہ بھی صرف اس لیے کیا کہ ان کا عجیب و غریب اور دلچسپ پروگرام جو مجھے معلوم ہو گیا تھا وہ آپ کو بھی معلوم ہو جائے شاید آپ میں سے کسی کے دل میں کسی درجہ میں اس کی نقل اور تقلید کا شوق پیدا ہو جائے ——— ان کے علاوہ بھی اللہ کے نیک بندوں کا یہ عام معمول ہے کہ رمضان مبارک میں وہ اپنے کو زیادہ سے زیادہ اللہ کی عبادت کے لیے اور اس کی راہ میں مجاہدہ کے لیے تیار کر لیتے ہیں۔ پھر جن کو تلاوت قرآن کا زیادہ ذوق ہوتا ہے وہ اس مہینہ میں تلاوت زیادہ کرتے ہیں۔ جن کو ذکر سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے وہ ذکر زیادہ کرتے ہیں۔ جن کو نوافل میں زیادہ روحانی لذت ملتی ہے وہ نوافل زیادہ پڑھتے ہیں، جن کے دلوں میں اللہ نے دین کی خدمت اور دین کے لیے جد و جہد کا

احساس زیادہ پیدا کر دیا ہو اور جو اس عمل کو سب سے اونچا اور زیادہ کمائی والا عمل سمجھتے ہیں۔ وہ رمضان میں اس کو زیادہ کرنا چاہتے ہیں ___ بہرحال رمضان کا یہ خاص حق ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہو اور اللہ کے تمام صالح اور مقبول بندوں کا یہ طریقہ ہو کہ رمضان میں اپنے کو عبادات اور طاعات کے لیے زیادہ سے زیادہ فارغ کر لیا جائے اور اس مبارک مہینہ میں اللہ کی رضا اور رحمت حاصل کرنے کے لیے اور اپنی دینی ترقی کے لیے جو جد و جہد کی جا سکے اس میں کسر نہ رکھی جائے۔ بعض اہل ادراک بزرگوں کا ارشاد ہو کہ جس شخص کا رمضان میں جو دینی حال رہتا ہو اسی نسبت سے باقی پورے سال میں اس کا حال رہتا ہو۔

تو مجھے آپ سے یہی کہنا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کے مہینہ کی شکل میں ہمیں جو ایک نعمت عظمیٰ نصیب فرمائی ہو کہ اس ایک مہینہ میں ہم برسوں کی کمائی انشاء اللہ کر سکتے ہیں، ہم اس کی قدر کریں، دوسرے کاموں سے ہم اپنے کو زیادہ سے زیادہ ہلکا کریں اور اس پورے مہینہ کا ایسا پروگرام بنائیں جس میں اللہ کا ذکر و فکر، اللہ کی طاعت و عبادت اور اللہ کے لیے مجاہدہ زیادہ سے زیادہ ہو ___ اگر سال میں یہ ایک مہینہ خاص اہتمام سے اس طرح گزار دیا جایا کرے جس طرح اس کے گزارنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت فرماتے تھے تو اپنی اصلاح کے لیے اور اللہ سے تعلق بڑھنے کے لیے اور تقویٰ کی صفت پیدا ہونے کے لیے اس ایک مہینہ کا محنت و مجاہدہ انشاء اللہ اچھی خاصی حد تک کافی ہوگا ___ جو لوگ اپنے کو اس ایک مہینہ کے لیے دوسرے کاموں سے فارغ کر سکیں ان کے لیے تو سب سے بہتر یہ ہو کہ وہ یہ پورا مہینہ اللہ کے کسی خاص بندہ کی صحبت میں اور کسی ایسے ماحول میں جا کر گزاریں جو اللہ کے ذکر و فکر کا ماحول ہو، طاعت و عبادت کا ماحول ہو، صلاح و تقوے کا ماحول ہو، تربیت و تذکیر کا اور مجاہدہ کا ماحول ہو اور جو بھائی پورے مہینہ کے لیے ایسا نہ کر سکیں وہ کم سے کم ایک عشرہ کے لیے اور خاص طور سے آخری عشرہ کے لیے اگر کر سکیں تو ضرور کریں انشاء اللہ ان کی دینی ترقیات کے لئے یہ چیز بہت مفید ہوگی۔ باقی وہ حضرات جو ایسے کاموں میں اور ایسے حالات میں ہیں کہ دوسرے شغلوں سے وہ اپنے کو فارغ نہیں کر سکتے وہ کم سے کم اس کا فیصلہ ضرور کر لیں کہ اس مہینہ کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کاموں کے کرنے کی خصوصیت کے ساتھ ہدایت فرمائی ہو انشاء اللہ ان کو پورے اہتمام سے کرنے کی کوشش کریں گے، اور جن باتوں سے اس مبارک مہینہ میں پرہیز کرنے کی آپ نے خصوصیت کے ساتھ ہدایت فرمائی ہو ان سے پوری طرح انشاء اللہ پرہیز کریں گے اور اپنے کو زیادہ سے زیادہ ذکر و تلاوت اور طاعت و عبادت میں مشغول رکھیں گے۔

اس مہینہ کی خاص عبادتوں میں سب سے اہم تو روزہ ہو جو اسلام کا ایک رکن ہو ___ اسلام میں

رمضان کے علاوہ کسی دن کا روزہ فرض نہیں، اور رمضان کے پورے مہینے کے روزے فرض ہیں اور ان کی اتنی اہمیت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ جو شخص کسی شرعی عذر کے بغیر رمضان کے ایک دن کا بھی روزہ چھوڑ دے گا وہ اگر ساری عمر نفل روزے رکھ کر اس کی تلافی کرنا چاہے گا تو نہ کر سکے گا۔

اور واقعہ یہ ہے کہ حدیثوں میں رمضان کے روزوں کا جو اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر جیسے انعامات کا وعدہ کیا ہے ان کے معلوم ہو جانے کے بعد شرعی مجبوریوں اور شرعی عذر کے بغیر وہی محروم شخص روزہ چھوڑ سکتا ہے جسے اللہ و رسول کی باتوں کی اور اللہ کی رحمت کی کوئی پرواہ نہ ہو —— جن حدیثوں میں روزہ کے اجر و ثواب کا اور روزہ پر ملنے والے انعام کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے پہلے ایک حدیث قدسی کا ذکر کرتا ہوں۔ حدیث قدسی ایک خاص اصطلاح ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی حدیث میں صراحۃً یہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے تو اس کو "حدیث قدسی" کہتے ہیں۔ تو جو حدیث میں روزہ کے متعلق ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ اسی قسم کی حدیث ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ حدیث کی تمام کتابوں میں یہ حدیث روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان والوں کو اپنے تمام اچھے اعمال کا ثواب دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک ملنے والا ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ نے اس امت مرحومہ کے لیے عام قانون اپنے کرم سے یہ مقرر فرمایا ہے کہ اس کی ہر نیکی کا ثواب بہ نسبت پہلی امتوں کے کم از کم دس گنا زیادہ دیا جائے گا۔ اور جن لوگوں کی نیکیاں زیادہ جاندار، زیادہ روح والی اور احسان کی صفت کے ساتھ اور خوف و محبت کی خاص کیفیات کے ساتھ ہوں گی تو ان کا ثواب اور بھی زیادہ ہوگا، یہاں تک کہ بعضوں کو سو گنا اور بعضوں کو دو سو گنا اور بعضوں کو ان کی کیفیات اور خصوصیات کے موافق اس سے بھی زیادہ، حتیٰ کہ بعض خوش نصیب بندوں کو سات سو گنا تک دیا جائے گا) حضورؐ فرماتے ہیں کہ اس امت کے اعمال خیر کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ عام قانون ہے لیکن حق تعالیٰ نے روزے کو اس سے مستثنیٰ رکھا ہے، روزہ کے متعلق اس کا ارشاد ہے کہ روزہ میں بندہ میرے لیے اپنا کھانا پینا اور اپنی نفسانی خواہش چھوڑتا ہے۔ میں اس کی اس قربانی کی میں پوری پوری قدر کر کے دکھاؤں گا اور ثواب کے اس عام حساب سے نہیں، بلکہ اپنے خاص کرم سے اور بلا واسطہ میں ہی روزہ کا اجر اس کو دوں گا، گویا بندہ بس اسی وقت دیکھے گا کہ میں اسے اپنے ہاتھ سے کیا دوں گا۔ حدیث کے اصل الفاظ اس موقع پر یہ ہیں کہ "الا الصوم فانہ لی و انا اجزی بہ یدع لی شہوتہ و طعامہ و شرابہ"

دوستو! اللہ تعالیٰ آخرت میں روزہ داروں پر جو انعام و اکرام فرمائیں گے جس کا وعدہ اس حدیث میں کیا گیا ہے وہ تو ان شاء اللہ اسی وقت سامنے آئے گا اور اس کی عظمت اور قیمت اسی وقت معلوم ہو سکے گی لیکن اس قدسی حدیث میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ میرا بندہ میری وجہ سے اپنا کھانا پینا چھوڑتا ہے، اہل ذوق کے لیے

یہ کچھ کم نعمت نہیں ہے۔ اگر بالفرض آخرت میں کچھ بھی نہ ملے تو اللہ تعالیٰ کا بس یہ فرما دینا کہ بندہ نے اپنا کھانا پینا میری وجہ سے چھوڑا۔ ہمارے روزہ کی وہ قیمت ہے جس کے ہم ہرگز مستحق نہیں ؎

ہزار جان فدائے دمے کہ من از شوق　　بخاک و خون تپم و گوئی برائے من است

پھر اسی حدیث میں فرمایا گیا ہے

ولخلوف فم الصائم عند اللہ اطیب من ریح المسک　　یعنی روزہ دار کے منہ میں خلو معدہ کی وجہ سے جو بدبو بعض اوقات پیدا ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ میرے نزدیک مشک کی خوشبو سے اچھی ہے۔

گویا روزہ دار اللہ کا ایسا محبوب بن جاتا ہے کہ اس کے منہ کی بدبو بھی اللہ کو محبوب ہوتی ہے۔ سبحان اللہ وبحمدہ۔

ایک اور صحیح حدیث میں خاص رمضان ہی کے روزوں کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

من صام رمضان ایماناً و احتساباً غفرلہ ما تقدم من ذنبہ۔　　جو شخص ایمان اور احتساب کی صفت کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے گا اس کے سب پہلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

ایمان اور احتساب یہ دو خاص دینی اصطلاحیں ہیں اور حدیثوں میں بہت سے اعمال خیر کے ثواب کے ذکر کے ساتھ شرط کے طور پر ان دونوں کا ذکر کیا جاتا ہے یعنی کہا جاتا ہے کہ اس عمل کا یہ ثواب ہے بشرطیکہ یہ عمل ایمان اور احتساب کے ساتھ کیا جائے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کرنے والا اس عمل کو اس یقین کے ساتھ کرے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور قرآن و حدیث میں اس کا جو اجر و ثواب بتلایا گیا ہے وہ بالکل حق ہے، اور اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے اس عمل کو دیکھنے والا ہے، اور پھر اسی یقین کی تحریک سے اور حکم الٰہی کی تعمیل ہی کی نیت سے اور اللہ و رسول کے بیان کیے ہوئے اس ثواب ہی کی امید پر اس عمل کو کیا جائے۔ پس یہ مطلب ہوتا ہے ایمان و احتساب کے ساتھ کسی عمل کے کرنے کا، تو اس حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ جو کوئی رمضان کے روزے اس یقین کے ساتھ رکھے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور مجھے اس کے حکم کی تعمیل کرنا ہے اور اللہ مجھے اور میرے عمل کو دیکھنے والا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ قبول فرمائے تو مجھے اس عمل پر انشاء اللہ بہت بڑا ثواب ملنے والا ہے تو اس شخص کے پہلے سب گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

روزہ کے علاوہ رمضان کی دوسری خاص عبادت "قیام لیل" یعنی رات کی خاص نماز ہے جس میں تراویح اور تہجد دونوں داخل ہیں اس کے بارہ میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے کہ

من قام رمضان ایماناً و احتساباً غفرلہ ما تقدم من ذنبہ	جو شخص ایمان و احتساب کے ساتھ رمضان کی راتوں میں اللہ کے حضور میں کھڑا ہو (یعنی تراویح و تہجد پڑھے) تو اس کے پہلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

تو حدیث میں رمضان کی ان دونوں عبادتوں کی (یعنی دن کے روزوں کی اور رات کی نماز تراویح و تہجد کی) یہ فضیلت اور تاثیر بیان کی گئی ہو کہ ان کی برکت سے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں لیکن شرط یہ ہو کہ یہ عبادتیں ایمان اور احتساب کے ساتھ کی جائیں۔ در اصل ایمان و احتساب اعمال کی روح اور اعمال کا باطن ہیں۔ جو اعمال ایمان و احتساب کے بغیر کیے جاتے ہیں وہ بے روح اور بے اثر ہیں آجکل اول تو اعمال کرنے والے کم ہیں اور پھر جو کرنے والے ہیں ان میں ایمان و احتساب والے بہت ہی کم ہیں اسی لیے ہمارے اعمال بے اثر ہیں۔

اعمال میں ایمان و احتساب پیدا کرنے کی تدبیر یہ ہو کہ ہر عمل نیت سے کیا جائے اور اس یقین کو بار بار دل میں دہرایا جائے کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہیں اور یہ ان کا حکم ہو اور وہ اس کی تعمیل سے راضی ہوتے ہیں اور میں ان کو راضی کرنے کے لیے اور آخرت میں ان کا رحم و کرم حاصل کرنے کے لیے ہی یہ عمل کرتا ہوں ــــ مثلاً ہم روزہ رکھیں تو اس نیت سے رکھیں اور اس نیت کو برابر تازہ کرتے رہا کریں۔ یہاں تک کہ دن میں جب جب کچھ کھانے یا پینے کو دل چاہے تو دل کو یہی یاد دلایا جائے کہ میں اللہ کے حکم سے اور اسکی رضا کے لیے روزے سے ہوں اور وہ مجھے دیکھ رہا ہو اور میری اس بھوک پیاس پر وہ مجھے بڑا ثواب دینے والا ہو ــــ اسی طرح تراویح اور تہجد پڑھنا جب نفس پر بھاری ہو اور جی اس وقت آرام کرنے کو چاہے تو اس یقین کو تازہ کیا جائے کہ میرے اللہ مجھے اور میرے حال کو دیکھ رہے ہیں اور اس وقت اللہ کے حضور میں کھڑے ہو کر میرا نماز پڑھنا آخرت میں اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کو آسان کرے گا اور اس وقت تھوڑی سی تکلیف اٹھالینا ان شاء اللہ دوزخ کی سخت تکلیفوں سے نجات کا ذریعہ ہو جائے گا ــــ ان شاء اللہ چند روز ایسا کرنے سے یہ ایمان و احتساب دل کا مستقل حال بن جائے گا اور پھر خدا نے چاہا تو ہمارا ہر عمل ایمان و احتساب کی صفت سے ہوا کرے گا۔

رمضان کی ان دونوں عبادتوں (یعنی دن کے روزوں اور رات کی نمازوں) کے متعلق ایک حدیث اور بیان کرتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

الصیام والقرآن یشفعان للعبد یقول الصیام اے رب انی منعتہ الطعام	روزے اور قرآن (یعنی تراویح یا تہجد میں جو قرآن پڑھا یا سنا جائے) یہ دونوں مومن بندہ کے حق میں

والشهوات بالنهار فشفعني فيه ويقول القرآن منعته المنام بالليل فشفعني فيه فيشفعان

اللہ تعالیٰ سے سفارش کریں گے۔ روزہ عرض کرے گا اے میرے رب میں نے تیرے اس بندہ کو کھانے پینے سے اور خواہش نفس پورا کرنے سے دن کے اوقات میں روکا تھا، لہٰذا میری شفاعت اس کے حق میں قبول فرما، اور قرآن کہے گا کہ میں نے اسکو رات میں سونے نہیں دیا تھا۔ اس لیے میری شفاعت اسکے حق میں قبول فرما۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ) پھر ان دونوں کی شفاعت اس بندہ کے حق میں قبول کی جائے گی۔

دوستو! ہمیں اور آپ کو بلاشبہ روزہ سے بھوک پیاس کی کچھ تکلیف ہوتی ہے، اور دن کو روزہ رکھکر رات کو تراویح اور تہجد پڑھنا اکثر لوگوں کے لیے ضرور کچھ شاق ہوتا ہے۔ لیکن جب قیامت میں ہمارے یہ روزے اور رمضان کی راتوں کی ہماری یہ نمازیں اور ان میں پڑھے جانے والا قرآن ہمارے شفیع بن کر کھڑے ہوں گے اور ہمارے لیے بارگاہ خداوندی میں سفارش کریں گے اور جب ان کی وجہ سے ہمارے گناہ معاف کیے جائیں گے اور جب اللہ تعالیٰ براہ راست اور بلا واسطہ ہمیں ان کے انعام دیں گے تو اسوقت ان سے زیادہ محبوب اور لذیذ ہمارے لیے کوئی چیز نہ ہوگی اور اس دن ہمیں ان کی اصل قدر و قیمت معلوم ہوگی۔

ہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ رمضان کے صیام اور قیام کی یہ ساری فضیلتیں اور انعام و اکرام کے یہ تمام وعدے ان ہی خوش نصیبوں کے لیے ہیں جن کے روزے اور جن کی راتوں کی نمازیں صرف رسمی نہ ہوں، بلکہ اخلاص کے ساتھ اور ایمان و احتساب کی کیفیت کے ساتھ ہوں اور جنھوں نے ان کے بارے میں اللہ و رسولؐ کے احکام کی پوری پابندی کی ہو۔ ورنہ اگر یہ بات نہ ہوئی تو حدیث میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے۔

رب صائم ليس له من صيامه الا الجوع والظمأ ورب قائم ليس له من قيامه الا السهر۔

کتنے ہی روزہ دار ہیں کہ ان کے روزہ کا حاصل بھوک پیاس کے سوا کچھ نہیں، اور کتنے ہی شب زندہ دار ہیں کہ راتوں کی ان کی نمازوں کا حاصل رات کے جاگنے کے سوا کچھ نہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ وشرابہ

جس روزہ دار نے روزہ رکھتے ہوئے جھوٹ اور بیہودہ باتیں اور غلط اور بیہودہ اعمال نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کے بھوکے پیاسے رہنے کی کچھ پرواہ نہیں

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص روزے میں کھانے پینے سے تو اپنے منھ کو بند کر لے لیکن جھوٹ سے اور بری باتوں سے اپنی زبان کی حفاظت نہ کرے اور بُرے اعمال اور بری عادتیں نہ چھوڑے تو اللہ کے یہاں اس کا روزہ قبول نہ ہوگا۔

ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ روزہ صرف کھانا پینا چھوڑ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ بُرے کاموں اور بُری باتوں سے بھی رُکا جائے تو حقیقی روزہ ہے۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ داروں کو ہدایت فرمائی ہے کہ

اذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث ولا یصخب فان سابہ احد او قاتلہ فلیقل انی صائم۔

جب تم میں سے کسی کے روزہ کا دن ہو تو چاہیے کہ وہ کوئی بیہودہ حرکت اور کوئی بیہودہ بات نہ کرے اور تیزی میں زور سے بھی نہ بولے اور اگر بالفرض کوئی دوسرا اس سے گالی گلوج کرے اور لڑنا چاہے تو کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں۔

یعنی روزہ دار کو چاہیے کہ کسی بدتمیز کے جواب میں بھی کوئی بدتمیزی نہ کرے اور دل کے جذبات پر اور زبان پر پورا قابو رکھے حتیٰ کہ چیخ کر اور زور سے بھی نہ بولے۔

دوستو! یہ ہے حقیقی روزہ اور یہ ہیں وہ روزہ دار جن کے روزہ سے پیدا ہونے والی منھ کی بدبو بھی اللہ کو مشک کی خوشبو سے زیادہ پیاری ہے — اور یہ بات جب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب روزہ دار یہ دھیان برابر تازہ کرتا رہے کہ میرا مالک اور میرا رب میرے ساتھ ہے، حاضر ناظر ہے اور اس کا حکم ہے کہ میں روزہ میں کوئی برا کام نہ کروں، کوئی بری بات زبان سے نہ نکالوں حتیٰ کہ زور سے بھی نہ بولوں، پس اللہ کے حاضر اور شاہد ہونے کا یہ یقین روزہ دار پر جتنا طاری ہوگا اور ہر دم اپنے اللہ کے سامنے ہونے کا دھیان جتنا پختہ اور گہرا ہوگا اتنی ہی ان چیزوں سے احتیاط نصیب ہوگی جو روزہ کو خراب کرنے والی ہیں بس سارا کھیل اس یقین اور دھیان کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نصیب فرمائے۔

حضرات! رمضان کے خاص اعمال میں سے ایک اعتکاف بھی ہے۔ اعتکاف کیا ہے؟ ہر طرف سے منقطع ہو کر

اللہ کے در پر پڑ جانا اور اس سے لو لگا کے بیٹھ جانا۔ اس کا اصل وقت رمضان کا آخری عشرہ ہے۔

یوں تو رمضان کا پورا مہینہ خاص رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ ہے لیکن اس حیثیت سے اس کا آخری عشرہ پہلے دونوں عشروں سے بڑھا ہوا ہے، قرآن پاک کا نزول بھی آخری عشرہ ہی میں ہوا تھا اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر بھی عام طور سے اس آخری عشرہ ہی میں ہوتی ہے اسلیے اعتکاف کیلیے اسی عشرہ کو مخصوص کیا گیا ہے ___ گویا پورے رمضان کے دنوں کا مجاہدہ تو تمام امت پر فرض کیا گیا ہے جس سے بیماروں معذوروں کے سوا کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ اور پورے مہینہ کی راتوں میں عشا کی روزمرہ کی نماز کے علاوہ زائد نماز پڑھنا اور اللہ کے حضور میں زیادہ سے زیادہ کھڑا رہنا جسکو حدیثوں میں "قیام لیل" کہا گیا ہے وہ اگرچہ روزہ کی طرح فرض تو نہیں کیا گیا ہے لیکن فرض قرار دیے بغیر اس کا حکم بھی سب کو دیا گیا ہے، گویا رمضان کے دنوں میں صیام اور راتوں میں قیام تو ایمان والوں کے لیے رمضان کے مجاہدہ اور رمضان کی عبادت کا عام نصاب ہے۔ پھر اللہ کے جو بندے رحمت والے اس مہینہ کی رحمتوں اور برکتوں میں خاص الخاص حصہ لینا چاہیں ان کے لیے خاص نصاب اعتکاف ہے ___ یعنی اللہ کا طالب بندہ رمضان کے آخری دس دنوں اور دس راتوں میں سب طرف سے کٹ کے اور گویا سب سے ہٹ کے اللہ ہی کے آستانہ پر جا پڑے اور گویا اسی کے قدموں میں جا گرے یعنی اللہ کی کسی مسجد میں اپنے جسم کو مقید کر دے، حاجت بشری کے سوا وہاں سے نہ نکلے، اسی طرح اپنے باطن کو صرف اللہ کی طرف متوجہ کر دے اسی کی یاد ہو اسی کا دھیان ہو، اسی کی عبادت ہو اسی کی تسبیح و تقدیس ہو، اسی سے ڈرنا اسی کے حضور میں رونا اور تڑپنا ہو، اسی سے مانگنا ہو اسی کے سامنے گڑگڑانا ہو، غرض وہاں بس وہ بندہ ہو اور اس کا رب کریم۔

حضرات! اعتکاف کا جو اجر و ثواب آخرت میں ملے گا وہ تو وہیں پہنچکر سامنے آئے گا لیکن جس بندہ کو اپنے مولا کی محبت کا کوئی ذرہ نصیب ہو اس کے لیے تو حضوری کے ایسے چند دنوں اور چند راتوں کا نصیب ہو جانا بجائے خود وہ نعمت عظمیٰ ہے جس کے سامنے دنیا کی ساری نعمتیں اور لذتیں ہیچ ہیں، اہل محبت تو ایسے وقت کی تمنا میں تڑپتے ہیں ؎

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑا رہوں		سر زیر بار منت درباں کیے ہوئے
دل ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن		بیٹھا رہوں تصور جاناں کیے ہوئے

میں آپ حضرات سے عرض کر رہا تھا کہ اعتکاف بجائے خود ایک نعمت اور لذت ہے ایسی نعمت اور لذت جو اگر ہم سب پر منکشف ہو جائے تو ہماری مسجدیں رمضان میں معتکفین سے بھری رہا کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوامی معمول تھا کہ آپ رمضان کے آخری عشرہ میں برابر اعتکاف فرماتے تھے، ایک سال کسی وجہ سے آپ اعتکاف نہیں کر سکے تو اگلے سال آپ نے ۲۰ دن کا اعتکاف فرمایا اور ایک سال

ایسا بھی ہوا کہ رمضان کے پورے مہینہ میں آپ معتکف رہے۔

تو اللہ تعالیٰ آپ میں سے جنکو توفیق دے وہ آخری عشرہ میں اعتکاف کریں اور جنکے لیے کسی وجہ سے اس کا موقع نہ ہو وہ بھی اتنا ضرور کریں کہ آخری عشرہ میں اپنے دوسرے مشغلوں کو کم سے کم کر دیں اور دن رات کا زیادہ سے زیادہ وقت اللہ کے ذکر میں، قرآن مجید کی تلاوت میں، اللہ کی عبادت میں، اللہ کے دھیان میں، اور اس سے دعا و استغفار میں گزاریں خصوصاً ان راتوں میں زیادہ سے زیادہ اللہ کی طرف متوجہ اور اسکے ذکر میں مصروف اور دعا و استغفار میں مشغول رہیں۔ حدیث شریف میں ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کی آخری دس راتوں میں خود بھی جاگتے تھے اور اپنے گھر والوں کو بھی بیداری کا حکم فرماتے تھے اور ترغیب دیتے تھے (احییٰ لیلہ وایقظ اھلہ)

اور بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہو اور اہل تجربہ بھی بیان کرتے ہیں کہ عموماً رمضان کے اسی آخری عشرہ کی راتوں میں شب قدر ہوتی ہو جس کی عظمت اور فضیلت اور جس کی قدر و منزلت قرآن مجید کی ایک مستقل سورت میں بیان کی گئی ہو اور اس وجہ سے اس سورت کا نام ہی "سورۃ القدر" ہو تو جو شخص رمضان کے آخری عشرہ کی راتوں میں ذکر و عبادت کا اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنے کا اور دعا و استغفار میں مشغول رہنے کا اہتمام کرے گا۔ انشاء اللہ وہ شب قدر میں نازل ہونے والی اللہ کی خاص رحمتوں اور برکتوں سے ضرور اپنا دامن بھرلے گا۔ اور جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہو وہ اس ایک رات کی عبادت پر ہزار مہینہ کی عبادت سے زیادہ ثواب کا مستحق ہوگا۔

دوستو اور دینی بھائیو! اللہ تعالیٰ نے رمضان کی شکل میں رحمت کا جو موسم ہمارے لیے بھیجا ہو، اس کی قدر کر لو، تھوڑی سی ہمت اور محنت کر کے اپنے گناہوں کو بخشوانے اور اپنے اللہ کو راضی کرنے کا سامان کر لو، اور رمضان کے دنوں اور راتوں میں کچھ کر کے اپنے نامۂ اعمال میں نیکیوں کی میزان کو بڑھوا لو، معلوم نہیں اس سال کے بعد ہم میں سے کس کس کو رمضان نصیب ہوگا اور کس کس کے لیے یہی آخری رمضان ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صحابی کو ان کی خاص استدعا پر چند نصیحتیں فرمائی تھیں ان میں سے ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ "صلّ صلوٰۃ مودّعٍ"، یعنی اس شخص کی سی نماز پڑھو جو اپنے متعلقین کو خیرباد کہہ کے دنیا سے رخصت ہونے والا ہو اور اپنی نماز کو آخری نماز سمجھ کر حضور و خشوع سے پڑھ رہا ہو، میں عرض کرتا ہوں کہ اسی طرح اس رمضان میں ہم سب یہ خیال کر کے کچھ کریں کہ کیا خبر ہو شاید یہی ہمارے لیے آخری رمضان ہو اور اللہ کی رحمت و مغفرت حاصل کرنے کا یہی ہمارے لیے آخری موقع ہو۔

آخر میں مجھے ایک بات آپ حضرات سے اور عرض کرنی ہے، اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے رمضان اور اسکے خاص اعمال کے متعلق یعنی روزہ، تراویح، اور اعتکاف وغیرہ کے متعلق جو کچھ عرض کیا ہے در اصل وہ سب ثواب آخرت کی وہ ترغیبات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے سامنے بیان فرمایا کرتے تھے اور جو حدیثوں میں اب تک محفوظ ہیں، ان اعمال میں اسکے علاوہ جو اور مصلحتیں اور فائدے ہو سکتے ہیں جن کا تعلق ہماری اسی دنیوی زندگی سے ہے۔ اس وقت میں نے ان کو قصداً نظر انداز کیا ہے۔ یہ میں نے اسلیے کیا ہے کہ میرے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہی ہے کہ وہ جو عمل کرانا چاہتے ہیں آخرت کے ثواب کو سامنے رکھکر کرانا چاہتے ہیں اور جس کام سے لوگوں کو بچانا چاہتے اس کے آخرتی عذاب سے ڈراکر بچانا چاہتے ہیں ان کا امتیازی اور اصلی کام یہی تبشیر اور انذار ہے (یعنی ثواب کی بشارتیں سنا کر اچھے اعمال پر لوگوں کو آمادہ کرنا اور عذاب سے ڈرا کر لوگوں کو بُرے اعمال سے بچانا) قرآن پاک میں فرمایا گیا "رُسُلاً مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ"

ہمارے اس زمانہ میں دین میں اور دین کی دعوت میں جو غلطیاں داخل ہوئی ہیں ان میں کی بہت اہم ایک غلطی یہ ہے کہ بہت سے حضرات تبشیر اور انذار کے اس نبوی طریقہ سے اس قدر ہٹ کر دین کی اور دین کے اعمال و ارکان کی دعوت دیتے ہیں کہ ان کی گفتگوؤں اور ان کی کتابوں میں جنت کے ثواب اور دوزخ کے عذاب کا تذکرہ کسی تلاش کرنے والے کو مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ حالانکہ قرآن و حدیث اسی تذکرے سے بھرے ہوئے ہیں۔ قرآن پاک سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دین کی پوری دعوت کی بنیاد آخرت کے ثواب و عذاب کو بنایا ہے، اور جنت کی نعمتوں اور دوزخ کے عذابوں کا ذکر قرآن مجید میں اسقدر تفصیل سے اور اتنی تکرار کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اگر اسکو نکال لیا جائے تو قرآن شاید آدھا بھی مشکل سے رہے گا بہرحال انبیاء علیہم السلام کا یہی طریقہ ہے اور ہمیں مادہ پرستی اور دنیا پرستی کے اس دور میں اپنے قول و عمل سے اسکو اجاگر اور زندہ کرنا ہے۔ کہ دین کی اور دین کے اعمال و ارکان کی دعوت آخرت کے ثواب و عذاب کی بنیاد پر دیجائے اور جنت و دوزخ کو قرآن مجید کے طریقہ پر ایک سچی اور یقینی حقیقت کی طرح لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے ــــ اسکے علاوہ آج میں نے خاص طور پر یہ التزام اسلیے بھی کیا کہ رمضان کے مخصوص اعمال روزہ، قیام لیل، احیاء لیلۃ القدر ان سب کے متعلق حدیث میں یہ صراحۃ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان پر یہ انعام اور یہ اجر و ثواب اسی وقت ملیگا جبکہ انکو ایمان اور احتساب کی صفت کے ساتھ کیا جائے ــ اور ایمان و احتساب کا مطلب جیساکہ میں نے ابھی بتلایا تھا یہی ہے کہ اللہ کے وعدوں اور وعیدوں پر یقین کر کے اور انکے بتلائے ہوئے ثواب و عذاب کو بالکل برحق جان کے اس ثواب کی امید ہی میں ان اعمال کو کیا جائے ــــ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ اعمال بھی نصیب فرمائے اور ایمان و احتساب کی صفت بھی نصیب فرمائے، میں عرض کر چکا ہوں کہ وہی دین کی روح اور جان ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین وسلام علی المرسلین ۰

چند ضروری اطلاعات

۱۔ اس وقت جو شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے شعبان کا ہے، اس کے بعد رمضان اور شوال کے شماروں کو یکجا شایع کرنے کا ارادہ ہے، لہذا آپ حضرات ۵ ارشوال سے پہلے رسالے کا انتظار نہ فرمائیں۔

۲۔ اس شمارہ میں سرخ نشان کے ذریعہ سے جیسے ان حضرات کو اطلاع دی جارہی ہے جن کی مدت خریداری شعبان میں ختم ہوگئی ہے، ویسے ہی ان حضرات کو بھی مطلع کیا جارہا ہے جن کی مدت خریداری رمضان میں ختم ہوگی، براہ کرم مؤخر الذکر حضرات بھی مقررہ وقت کے اندر سال آئندہ کا چندہ ارسال فرمائیں۔ رمضان کا پرچہ علیحدہ شایع نہ ہوسکنے کی وجہ سے ان حضرات کو اب دوبارہ اطلاع نہیں دی جاسکے گی، بلکہ اگر چندہ یا کوئی دوسری اطلاع نہ آئی تو اگلا پرچہ وی، پی کیا جائے گا۔

۳۔ پاکستان میں کتابیں طلب کرنے والے حضرات سے گزارش ہے کہ وہ کتابوں کی قیمت مندرجۂ ذیل پتہ پر پیشگی ارسال فرماکر ہمیں فرمائش بھیجا کریں۔ اور اسی کے ساتھ روپیہ بھیجنے کی رسید بھی۔ اس صورت میں ہمیں زیادہ آسانی ہوگی اور آپ کو کتابیں نسبتاً جلدی مل جائیں گی۔ روپیہ بھیجنے کا پتہ یہ ہے:

سکریٹری صاحب ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ ——— لاہور

مندرجۂ بالا پتہ پر روپیہ بھیجتے وقت اس کے ساتھ یہ ضرور لکھ دیں کہ یہ رقم کتب خانہ الفرقان لکھنؤ کی ہے۔

۴۔ پاکستان میں رسالۂ الفرقان کا چندہ جمع کرنے کا بھی یہی پتہ ہے۔

۵۔ گزشتہ مہینے یعنی رجب کے رسالہ میں صفحہ ۲۶ کی آخری سطر کے آخر کے چند لفظ چھوٹ گئے ہیں۔ اس سطر میں جو آخری لفظ چھپا ہوا ہے اس کے بعد ان الفاظ کا اضافہ کرلیا جائے۔

جسم کی بندگی اور عقل الخ

تعارف و تبصرہ

(از حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی)

تصحیح الاغلاط الکتابیہ الواقعۃ فی النسخ الطحاویہ[1]

امام طحاوی روایت و درایت دونوں کے مسلم امام ہیں، فن روایت میں ان کا شمار حفاظ حدیث میں، اور فقہ میں ان کا شمار مجتہدین میں ہے اور ان دونوں حیثیتوں سے وہ ان افراد رجال میں سے ہیں جن پر اسلام کی تاریخ کو بجا طور پر فخر ہے، امام طحاوی کی تصنیفات تعداد میں پچیس سے زائد ہیں، مگر پانچ کے سوا کل غیر مطبوعہ بلکہ بعض بظاہر ناپید ہیں، مطبوعات میں ایک تو بیان اعتقاد اهل السنة والجماعة جو عقیدۂ طحاوی کے نام سے مشہور ہے، ایک مختصر رسالہ ہے جو مصر و ہند دونوں جگہ طبع ہوا ہے، دوسری تصنیف مشکل الآثار ہے جس کو دائرۃ المعارف حیدرآباد نے چار جلدوں میں شائع کیا ہے، مگر وہ ناتمام ہے، اور غالباً حصہ طبع ہوا ہے وہ آدھے سے بھی کم ہے اس کا کامل نسخہ نہایت صحیح سات جلدوں میں استنبول میں موجود ہے جیسا کہ علامہ کوثری کا بیان ہے، تیسری تصنیف کتاب الشروط الکبیر ہے اس کا ایک ٹکڑا یورپ سے شائع ہوا ہے، چوتھی کتاب مختصر الطحاوی چار سو تیس صفحات کا ایک فقہی متن ہے جس کو ابھی اسی سال مولانا ابوالوفا صاحب افغانی نے لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ کی طرف سے مصر میں طبع کرا کے شائع کیا ہے، اور اس کا ذکر آ گیا تو اتنا عرض کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا کہ حق تعالیٰ مولانا ابوالوفا (کثر اللہ امثالہ فینا) کو جزائے خیر دے، انھوں نے ایک ایسے گوہر گراں مایہ کا تحفہ پیش کیا ہے جس کو صدیوں سے اہل علم کی آنکھیں ترس رہی تھیں، اور میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنی اس علمی خدمت کی وجہ سے دنیائے اسلام کے تمام اہل علم کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔

امام طحاوی کی پانچویں تصنیف جو غالباً سب سے پہلے زیور طبع سے آراستہ ہوئی شرح معانی الآثار ہے، جو ہندستان کے سوا اور کہیں نہیں چھپی ہے، سب سے پہلے ۱۳۰۰ھ میں مطبع مصطفائی دہلی نے اس کو چھاپا، اس کے بعد ۱۳۲۰ھ میں لاہور میں چھپی، پھر ۱۳۴۸ھ میں رحیمیہ دہلی نے اس کو شایع کیا، طبع اول کے وقت ہر چند کہ اس کی تصحیح کا کافی اہتمام کیا گیا، اور اس اہم کام کی ذمہ داری مولانا وصی احمد سورتی کے سپرد کی گئی، ان کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی اس میں حصہ لیا۔

لیکن افسوس ہے کہ یا تو سامان کی قلت یا فرصت کی کمی کی وجہ سے تصحیح کا کام جیسا ہونا چاہیے تھا نہ ہو سکا

---

[1] قیمت دو روپے (۲ر) ملنے کا پتہ مولوی حافظ محمد الیاس متصل دارالشفا یعقوبی محلہ مفتی، سہارن پور (یو، پی)

اور اس اہتمام و انتظام کے باوجود کتاب اغلاط سے پاک نہ ہو سکی۔ دوسری دفعہ لاہور میں چھپی تو نقل در نقل ہونے اور صحت کا اہتمام نہ کرنے کی وجہ سے اغلاط کی تعداد دوگنی یا اس سے بھی زیادہ ہوگئی تیسری بار رحیمیہ میں چھپی تو تصحیح کا اہتمام ضرور ہوا اور سابق غلطیوں کی تعداد بھی کچھ کم ہوئی مگر زیادہ تعداد میں غلطیاں باقی رہ گئیں، اور کچھ نئی غلطیوں کا اضافہ بھی ہوگیا۔

کتاب کے طبع اول کے بعد ہی سے اس ضرورت کا احساس بہت شدت سے کیا جا رہا تھا کہ کوئی صاحب علم اس کتاب کی مکمل تصحیح کی ہمت کرتے تو یہ ایک عظیم الشان علمی کارنامہ ہوتا۔ قدرت کی طرف سے یہ سعادت مولانا حکیم محمد ایوب صاحب سہارن پوری کے حصہ میں آئی، اور انھوں نے بڑی جانفشانی و جانکاہی سے پہلے رجال اسانید متون، احادیث اور باقی عبارات کی ایک ایک غلطی کو پکڑا، پھر مراجع و مظان کا پورا تتبع کر کے اغلاط کی تصحیح کی، اور ان تمام اغلاط اور انکی تصویبات کو ایک مجموعہ میں یکجا کیا جس کا نام "تصحیح الاغلاط الکتابیہ الواقعۃ فی النسخ الطحاویہ" ہے اس مجموعہ کی صرف پہلی جلد ابھی شایع ہوئی ہے جو شرح معانی الآثار جلد اول کے اغلاط اور اس کی تصویبات پر مشتمل ہے، صفحات کی تعداد اتنی ہے، تقطیع معانی الآثار کے برابر ہے۔

عزیزم مولانا محمد منظور نعمانی سلمہٗ کی عنایت سے مجھے اس کتاب کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا، چوں کہ امام طحاوی کے مصنفات سے دیرینہ تعلق و شغف ہے اور الحاوی لرجال الطحاوی (معانی و مشکل کے رجال) کی تصنیف کے تعلق سے اسماء رجال کی تصحیح سے بھی دلچسپی ہے، اس لیے میں نے اس مجموعہ کو بڑے شوق سے پڑھا۔

میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا محمد ایوب نے اس کتاب کی خدمت کا حق ادا کر دیا ہے اور دل سے دعا کرتا ہوں کہ حق تعالےٰ مولانا موصوف کو انکی محنت و جانفشانی کا اجر جزیل عطا فرمائے، اور علم دین کی مزید خدمت کی توفیق بخشے۔

رجال اسانید کی تصحیح میں مولانا نے جس تتبع و تفتیش سے کام لیا ہے حد درجہ قابل تعریف ہے اور اس باب میں اپنی فطری ذکاوت کے جو جوہر دکھاتے ہیں وہ قابل رشک ہیں۔

میں یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ معدودے چند کے سوا اکثر مقامات میں مجھے مولانا کی رائے سے اتفاق ہے، جن مقامات میں مجھے مولانا کی رائے سے اختلاف ہے ان میں سے چند مثالوں کا ذکر اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان پر دوبارہ غور و فکر کر کے اگر اصلاح و ترمیم کی ضرورت ہو تو آئندہ کیجا سکے۔

(۱) صہ میں مولانا نے فرمایا ہے کہ عیاض بن عبد اللہ القرشی کے بجائے عیاض بن عبداللہ الفہری صحیح ہے مگر میرے نزدیک القرشی جیسا کہ معانی الآثار میں ہے وہی صحیح ہے اس لیے کہ

ابوعوانہ نے بعینہ امام طحاوی کی سند سے اس حدیث کو مسند ص۲۸۹/۱ میں روایت کیا ہے اور اس میں القرشی ہی ہے، پھر بیہقی ص۱۶۴/۱ میں بھی القرشی ہی ہے۔

۲۔ ص۱۰ میں مولانا نے فرمایا ہے کہ عبد الرحمن بن ثابت کی بجائے غالباً عبد اللہ بن عبد الرحمن بن ثابت صحیح ہے، مگر ناچیز کے نزدیک عبد الرحمن بن عبد الرحمن بن ثابت صحیح ہے اس لیے کہ مسند احمد ص۳/۴ کے علاوہ مجمع الزوائد ص۲۵۴/۱ میں بھی یہی ہے

۳۔ ص۱۱ میں فرمایا کہ انتم لاتسرعون کی جگہ پر لاتسوعون صحیح ہے، احقر کے نزدیک لاتدعون صحیح ہے، یعنی عبارت یوں درست ہوگی (انتم لاتدعون خصمکم ان یحتج علیکم۔

۴۔ ص۱۲ میں یعقوب بن ابی عباد کے بجائے یعقوب بن ابی عبادۃ کو صحیح قرار دیا ہے، احقر کے نزدیک ابن ابی عباد ہی صحیح ہے، ایسا ہی انساب سمعانی، تاریخ بخاری اور لباب میں ہے اور اسی طرح معانی الآثار ص۲۰۱، مشکل الآثار ص۱۴/۱ ص۱۶۷/۱ ص۲/۴ میں بھی ہے۔

۵۔ ص۶۲ میں عن الزھری عن عبد الرحمن بن الحارث بن ھشام کے بجائے مولانا کا ظن غالب یہ ہے کہ الزھری عن عبد الملک بن ابی بکر بن عبد الرحمن بن الحارث تھا لیکن میرا گمان غالب یہ ہے کہ الزھری عن ابی بکر بن عبد الرحمن الخ تھا، اولاً اس لیے کہ اس حدیث کی اسناد صحیح بخاری میں بطریق شعیب یوں ہی ہے ثانیاً اس لیے کہ زہری کا اس حدیث کو ابوبکر سے روایت کرنا تو معلوم ومشہور ہے لیکن عبد الملک سے اس حدیث کو زہری کا روایت کرنا اس وقت تک میرے علم میں نہیں ہے۔

اس کے علاوہ میری نظر سے بعض ایسے مقامات بھی گزرے جو تصحیح سے رہ گیے ہیں، سردست ایسی جو مثالیں بآسانی پیش ہوسکتی ہیں، ان کو پیش کرتا ہوں۔

۱۔ معانی الآثار ص۲۳/۲ میں ابوحمزہ کے بجائے ابوجمرہ صحیح ہے، تصحیح الاغلاط میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

۲۔ ص۳۵ میں بنانۃ کی جگہ نباتۃ صحیح ہے تصحیح میں اس کا ذکر بھی نہیں ہے۔

۳۔ ص۴۵ عمرو بن شریح کے بجائے عمر بن سریج صحیح ہے یعنی عمرو کے بجائے عمر اور شریح کے سریج سین مہملہ اور جیم کے ساتھ، اور یہ عمر منسوب الی الجد ہیں ورنہ باپ کا نام سعید ہے۔

۴۔ ص۷۲ میں المخارق بن احمد کے بجائے المخارق بن احمر صحیح ہے جیسا کہ تاریخ بخاری میں ہے، پھر اسی سطر میں پہلی سے بھی بڑی غلطی یہ ہے کہ قتادۃ عن المخارق کے بجائے قتادۃ عن مسلم ابی حسان عن المخارق ہونا چاہیے، قتادہ براہ راست مخارق سے روایت نہیں کرتے بلکہ بواسطہ مسلم ابی حسان کے، اس کے لیے تاریخ کی طرف رجوع کیا جائے، تصحیح الاغلاط میں ان غلطیوں کی اصلاح نہیں کی گئی ہے۔

۵۔ ص۹۵ میں عمران بن حصین کے بجائے عمران بن حدیر ہونا چاہیئے، یہ بھی چھوٹ گیا ہے۔
۶۔ ص۱۱۵ میں ابن ذھب کے بجائے ابن ابی ذئب ہونا چاہیئے، یہ بھی رہ گیا ہے۔
۷۔ ص۱۲۰ میں سنان بن عبد الرحمٰن کی تصحیح سیار بن عبد الرحمٰن کے ساتھ ہونی چاہیئے، جو نہیں ہوئی۔
۸۔ ص۲۶۹ میں حبیب بن سلیمان کے بجائے خبیب (بالخاء المعجمۃ فی اولہ) ہونا چاہیئے۔ یہ بھی مذکور نہیں ہے۔
۹۔ ص۴۴۲ میں حبیب بن میمون بن مھران واقع ہوا ہے، حالاں کہ صحیح یوں ہے حبیب بن الشھید عن میمون بن مھران جیسا کہ ابوداؤد ص۱۸۴ اور سنن بیہقی ص۲۱۱ میں ہے اس کا ذکر بھی تصحیح الاغلاط میں نہیں ہے۔
۱۰۔ ص۴۳۵ میں اسرائیل عن ابی اسحٰق عن ابی السفر واقع ہوا ہے احقر کے نزدیک یوں صحیح ہے اسرائیل عن یونس بن ابی اسحٰق عن ابی السفر اس لیے کہ بیہقی کی اسناد میں ابوالسفر سے روایت کرنے والے یونس بن ابی اسحٰق ہیں، ابو اسحٰق نہیں ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ بیہقی کے یہاں یونس کے شاگرد احمد بن خالد وہبی اور یہاں اسرائیل۔

بہرحال یہ چند مقامات جن کی نشان دہی میں نے کی ہو، ان میں اگر میرے خیالات صحیح ہیں جب بھی کتاب کی خوبی اور مصنف کی محنت و کاوش پر کوئی حرف نہیں آتا، اس لیے کہ اس قسم کی نادانستہ فروگذاشتوں سے شاید ہی کوئی تصنیف محفوظ ہو تصحیح الاغلاط کے مصنف ہر طرح ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں، اور ان کی کتاب اس لائق ہے کہ ہمارے تمام مدارس علمی ادارے اور علم دوست حضرات اس کی قدر کریں، اس کی خریداری فرماکر مصنف کو موقع دیں کہ وہ اس کا دوسرا حصہ بھی جلد از جلد شایع کرسکیں۔

پاکستان سے سالانہ: للعہ (پاکستانی سکہ) دیگر ممالک سے سالانہ: (بارہ شلنگ)	ماہنامہ الفرقان لکھنؤ	ہندوستان سے سالانہ چندہ: ـہ فی کاپی ۸/
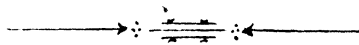
نمبر ۹-۱۰	بابتہ ماہ رمضان و شوال ۱۳۷۱ ہجری	جلد ۱۹

سرخ پنسل کا نشان اس بات کی علامت ہے کہ جناب کی مدتِ خریداری اس شمارہ پر ختم ہو گئی ہے، لہذا اپنا چندہ برائے ایک سال مبلغ (پانچ روپیہ) بذریعۂ منی آرڈر ارسال فرما کر مشکور فرمائیے۔ اگر ۲۰ اگست ۱۹۵۲ء تک جناب کا چندہ وصول نہ ہوا، اور نہ کوئی اطلاع آئی، تو اگلا پرچہ وی۔ پی بھیجا جائے گا جس کا وصول کرنا جناب کا اخلاقی فریضہ ہوگا

پاکستان کے حضرات اب اپنا چندہ سکریٹری صاحب "ادارہ اصلاح و تبلیغ، آسٹریلین بلڈنگس لاہور" کے پتہ پر ارسال فرمائیں اور ایک کارڈ کے ذریعہ ہم کو اس کی اطلاع ضرور دیدیں اور قدیم خریدار صاحبان اس اطلاع کے ساتھ اپنا نمبر خریداری بھی ضرور لکھیں۔ آپ کے چندہ کی اطلاع ۲۰ اگست ۱۹۵۲ء تک موصول نہیں ہوئی تو "ادارہ اصلاح و تبلیغ، لاہور" سے آپ کی خدمت میں "الفرقان" بذریعہ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا ——— دیگر ممالک کے حضرات اپنا چندہ ۱۲ شلنگ بذریعہ پوسٹل آرڈر دفتر "الفرقان" لکھنؤ کو ارسال فرمائیں۔ والسلام

ناظم: الفرقان لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

قلب ونظر کی پاکی کسی قوم کا وہ جوہر ہے جس میں دنیا و آخرت کی عزت وفلاح کی ضمانت پوشیدہ ہے یہ وہ بلندی ہے کہ اس کو چھو لینے والی قوم دنیا کی نظروں میں آپ سے آپ معزز ہو جاتی ہے۔ اس کے افراد کی طرف عزت ومحبت کی نظریں اٹھتی ہیں اور حریفوں کے دل تک ان کی عزت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسلام نے اپنی ملت میں اس جوہر کو پیدا کرنے کے لئے بڑا اہتمام کیا تھا اور اپنے نظام میں ایسے سب دروازوں کو بڑی خوردہ گیری کے ساتھ بند کیا تھا جن سے کسی قسم کی ناپاکی مسلمانوں کے قلب ونظر میں راہ پا سکتی تھی۔ چنانچہ ایک مدت تک ملتِ اسلامیہ کی سیرت کا یہ جوہر بڑی آب وتاب دکھاتا رہا۔ مگر زوال وانحطاط کے سیلاب میں جہاں ایک سے ایک قیمتی سرمایہ امت کا بچ نہ سکا یہ جوہر بھی گم ہو گیا۔ آج حال یہ ہے (جو حقیقت میں ناگفتنی ہے) کہ باستثناءِ افراد جتنی بلندی تھی آج اتنی ہی پستی ہے۔ جس چیز میں قلب ونظر کی گندگی کا ذرا سا بھی سامان ہوتا ہے قوم کی قوم اس پر اس بری طرح ٹوٹتی ہے جیسے گندگی کے کیڑے اور مکھیاں گندگی پر، گویا یہی ان کی طبعی غذا ہے۔ جو قوم کبھی مساجد، تزکیۂ نفس کے مراکز اور تواصی بالحق کی مجالس کی زینت تھی آج اسی کے دم سے بے حیائی اور فحاشی کی درس گاہوں (سینما اور تھیٹروں) راگ ورنگ کی محفلوں، اور منکرات کے اڈوں میں رونق ہے۔ جن کے اگلے گذرگاہوں اور بازاروں میں نظریں جھکا کر چلنے کے لئے مشہور تھے آج وہ صرف نظر بازی کے لئے بازاروں اور پلیٹ فارموں کے چکر لگاتے ہیں اور صبح وشام گرلس اسکولوں اور کالجوں کے دروازوں پر منڈلایا کرتے ہیں۔ جن کی زبانیں کبھی اللہ کے نام اور اس کے کلام سے تر رہا کرتی تھیں آج ثریا اور نرگس، نگو اور مدھو بالا کے ناموں اور ان کے گائے ہوئے گانوں سے تر رہتی ہیں۔ جن کی مجلسوں کی گرمی کبھی اللہ ورسول کے چرچوں سے تھی۔ آج فلموں اور فلم ایکٹرسوں کے تذکروں سے ہے۔ جن کے گھر دوں کو پاک کرنے والے قرآن کی تلاوت سے گونجتے رہا کرتے تھے آج اُن کے گھر فحش اور عریاں گانوں سے گونجتے رہتے ہیں ——— یہ ہے آج کی حالت! اور واقعتہً ایسی بری حالت ہے کہ اس پر جتنا بھی رنج ہو اور رونا آئے کم ہے اس لئے کہ اسلام، انسانیت اور شرافت کے نقطۂ نظر سے یہ حالت مرض الموت کی حالت ہے۔ اس کے اسباب میں سے ایک بے حیا اور بے غیرت قوم کا طویل العہد اقتدار

ایک سبب ضرور ہے لیکن وہ اقتدار اب نہیں ہے اور یوں بھی ساری ذمہ داری اس پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ اس نے ابتدا ضرور کی تھی لیکن اس کو انتہا تک پہونچانے کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ ہم نے اس معاملہ میں کوئی کشمکش اس سے نہیں کی۔ اس اقتدار نے ایک غلط راہ دکھائی ضرور تھی اور اس کے لئے ترغیبات بھی مہیا کی تھیں مگر جبر کبھی نہیں کیا تھا اس لئے اُس دور کی نئی نسل اور اس دور کی نئی نسل کے سرپرست اگر کوشش کرتے تو دونوں نسلوں کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور بچ جاتا۔ مگر کوشش کا کیا ذکر یہ سرپرست خود اپنی نگرانی میں اپنی نسل کو اس راہ پر بڑھاتے ہیں اور جو ایسا کرنے کی جرات نہیں رکھتے یا کرنا نہیں چاہتے وہ سکوت اور چشم پوشی کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں (گویا وہ کچھ نہیں کرسکتے) اور زمانے کے رخ کا شکوہ کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ان باتوں کو ہلکا سمجھتے ہیں اور اپنی نسل کو پاک دل اور پاک نظر بنانے کی ذمہ داری کو معمولی ذمہ داری کے برابر بھی نہیں سمجھتے۔ کاش یہ لوگ جانتے کہ کیسی مہلک بیماری کے سپرد یہ اپنی نسل کو کر رہے ہیں اور ایسی نسل سے تیار ہونے والے معاشرہ کی بربادیوں اور بدبختیوں کی کیسی سنگین ذمہ داری وہ اپنے سر لے رہے ہیں اور اس کا کتنا سخت حساب انھیں اللہ کے حضور میں دینا ہوگا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا

کسی ملک کی حکومت کے لئے یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ اس کے قول و عمل کے دو بالکل جدا جدا رنگ ہوں اور اُس کے قول سے جو امیدیں بندھتی ہوں خود اسی کے عمل سے ٹوٹ کر رہ جاتی ہوں۔ پچھلے دنوں کئی ہندو صحافیوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو بدگوئی کا نشانہ بنایا۔ مسلمانوں کے جذبات اس معاملہ میں جس قدر نازک ہیں ان کو ساری دنیا جانتی ہے اور بارہا اس نزاکت کا تجربہ بھی کر چکی ہے مگر بایں ہمہ انھوں نے ان تازہ واقعات کو خون کے گھونٹوں کی طرح پی لیا اور صرف پر امن احتجاج پر اکتفا کیا محض اس لئے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے دامن پر فرقہ واریت کی آگ کو ہوا دینے کا کوئی معمولی سے معمولی الزام بھی آئے۔ انھیں امید تھی کہ مساوات اور نامذہبیت کی علمبردار حکومت ان کے جذبات کا احترام کرے گی اور ان صحافیوں کے ساتھ وہ معاملہ کرے گی جس کے یہ اپنی حرکات کی بنا پر مستحق ہوئے ہیں۔ چنانچہ وعدہ کی حد تک یہ امید پوری بھی ہوئی مگر جہاں تک اخباری اطلاعات کا تعلق ہے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت صرف دلاسہ دے کر رہ گئی اور جس عملی کارروائی کا انتظار تھا وہ ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی۔ ایسے واقعات ایک دو نہیں بلکہ آزادی کے بعد سے کئی بار ہو چکے ہیں لیکن ایک بار بھی وہ توقعات پوری نہیں ہوئیں جن کا پورا کرنا اپنے کاغذی اعلانات اور زبانی بیانات کے پیش نظر حکومت کا فرض تھا۔ اس طرح کا بار بار کا تجربہ اس نتیجہ پر پہونچا رہا ہے کہ حکومت کی نظر میں مسلمانوں کے جذبات کی وہ اہمیت نہیں ہے جو اہمیت اس ملک کے دوسرے بسنے والوں کے جذبات کی ہے ان جزئیات کو نظر انداز کر بھی دیا جائے۔ اور اب ہم بھی ان کے بارے میں کسی کارروائی پر اصرار نہیں کرتے کیونکہ

باتیں پرانی ہوچکیں اور کارروائی کا وقت گزر چکا — مگر اصولی حیثیت سے یہ مسئلہ ضرور قابل فکر ہے کہ آخر یہ امتیاز کیوں روا رکھا جاتا ہے کہ ایسی حرکت اگر کوئی مسلمان کر بیٹھتا ہے تو جبین اقتدار مارے شکنوں کے دیکھی نہیں جاتی — جس کی متعدد مثالیں ہیں — درانحالیکہ غیر مسلموں کی ایسی دل آزار حرکتوں پر بار بار پے در پے احتجاجات کے حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اگر جمہوریت اور سیکولرزم کے معنی یہی ہیں کہ اکثریت کو ناجائز قسم کی مراعات حاصل ہوں تو ایسی جمہوریت اور ایسے سیکولرزم سے ہزار بار پناہ! اور اگر یہ معنی نہیں ہیں بلکہ حکومت کسی مصلحت کی خاطر ڈھیل کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہے تو بجز اس کے کیا کہا جائے کہ خدا اس ملک کی خیر کرے جس کی حکومت مصلحت کو فرض پر مقدم رکھتی ہے۔

ہم حکومت سے اپنے نبی اور اپنے مذہب کے ناموس کے تحفظ کی بھیک نہیں مانگتے۔ مسلمانوں کی غیرت ایک لمحہ کے لئے بھی یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ وہ اس ناموس کے تحفظ کی بھیک مانگتے پھریں۔ ہم صرف حکومت کو اس طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ ملک کی تین چار کروڑ کی آبادی کے جذبات کے معاملہ میں ایسی لاپروائی کسی لحاظ سے بھی دانشمندی نہیں ہے۔ ہر شخص اور ہر ملت کے صبر کا ایک پیمانہ ہوتا ہے اس میں خواہ کتنی ہی وسعت ہو مگر ایک حد ایسی ضرور آتی ہے جہاں پہونچ کر وہ اپنی ساری وسعتوں کے باوجود چھلک پڑتا ہے۔

تصوف کیا ہے؟

اردو میں تصوف سے متعلق کئی اچھی اچھی چیزیں ہمارے اس زمانہ میں شائع ہوچکی ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ تازہ طبع کتاب اپنے اختصار کے ساتھ انصاف و تحقیق اور مباحث کے سلجھاؤ کے لحاظ سے بہت ممتاز سمجھی جائے گی اور ان شاء اللہ ان تمام حق پسند حضرات کے لئے اطمینان کا باعث ہوگی جو تصوف کے بارہ میں بھی انصاف سے غور کرنا چاہتے ہیں اور جن کو اس کے نام سے خواہ مخواہ کی ضد اور چڑ نہیں ہے

اس میں مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان، مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے مندرجہ ذیل آٹھ مقالے ہیں۔ گویا ان تینوں حضرات کی مشترک تالیف ہے۔

(۱) تصوف پر ابتدائی غور اور تجربہ (۲) تصوف اور اس کے اعمال و اشغال کے متعلق میرے چند یقین (۳) تصوف اور اس کے اعمال و اشغال کے متعلق بعض شبہات (۴) تصوف کے متعلق بعض شکوک و شبہات کا جواب۔ (۵) یقین اور اس کے ثمرات۔ (۶) تصوف اور شیخین (یعنی تصوف کے بارہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شیخ ابن القیم کی تصریحات)۔ (۷) اہل تصوف اور دینی جدوجہد۔ (۸) طالبانِ سلوک کو ابتدائی مشورے۔

۸۰ صفحات۔ کتابت طباعت دیدہ زیب، کاغذ اعلیٰ قیمت عہ

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معارف الاحادیث

شفاعت:-

محشر میں پیش آنے والے جن واقعات کی اطلاع احادیث میں صراحت کے ساتھ دی گئی ہے، اور جن پر ایک مومن کو یقین لانا ضروری ہے، اُن میں سے ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت بھی ہے شفاعت کے متعلق حدیثیں اتنی کثرت سے وارد ہوئی ہیں کہ سب ملا کر تواتر کی حد کو پہونچ جاتی ہیں ــــــ پھر شفاعت کی ان حدیثوں کے مجموعہ سے سمجھ کر شارحین نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کئی قسم کی ہوگی اور بار بار ہوگی۔ سب سے پہلے جبکہ سارے اہل محشر اللہ کے جلال سے سراسیمہ اور خوفزدہ ہوں گے اور کسی کو لب ہلانے کی جرأت و ہمت نہ ہوگی اور آدم علیہ السلام سے لیکر عیسیٰ علیہ السلام تک تمام اولوالعزم پیغمبر بھی نفسی نفسی کے عالم میں ہوں گے اور کسی کے لیے شفاعت کی جرأت نہ کر سکیں گے تو اس وقت عام اہل محشر کی درخواست پر اور ان کی تکلیف سے متاثر ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہمت کر کے اور اللہ کے لطف و کرم پر اعتماد کر کے آگے بڑھیں گے اور پوری نیازمندی اور حسنِ ادب کے ساتھ (جو آپ کے شایانِ شان ہے) بارگاہ رب العزت میں اہلِ محشر کے لیے سفارش کریں گے کہ ان کو اس فکر اور بے چینی کی حالت سے نجات دی جائے اور ان کا حساب کتاب اور فیصلہ فرما دیا جائے ــــــ بارگاہ جلالت میں اس دن یہ سب سے پہلی شفاعت ہوگی اور یہ شفاعت صرف آپ ہی فرمائیں گے۔ اس کے بعد ہی حساب و فیصلہ کا کام شروع ہو جائے گا۔ یہ شفاعت جیسا کہ عرض کیا گیا عام اہلِ محشر کے لیے ہوگی، اسی لیے اس کو "شفاعت عظمیٰ" بھی کہتے ہیں۔ اس کے بعد آپ اپنی امت کے مختلف درجہ کے ان گنہگاروں کے بارہ میں جو اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے جہنم کے سزاوار ہوں گے یا جو جہنم میں ڈالے جا چکے ہوں گے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کریں گے کہ ان کو معاف کر دیا جائے۔ اور جہنم سے ان کو نکالنے کی اجازت دے دی جائے۔ آپ کی یہ شفاعت بھی قبول ہوگی اور اس کی وجہ سے خطا کار امتیوں کی بہت بڑی تعداد جہنم سے نکالی جائے گی، اس کے علاوہ کچھ صالحین امت کے لیے آپ اس کی بھی شفاعت کریں گے کہ ان کے لیے بغیر حساب کے داخلہ جنت کا حکم دے دیا جائے ــــــ اسی طرح اپنے بہت سے امتیوں کے حق میں آپ ترقی درجات

کی بھی اللہ تعالیٰ سے استدعا کریں گے، حدیثوں میں شفاعت کے ان تمام اقسام اور واقعات کی تفصیل وارد ہوئی ہے۔

پھر حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ شفاعت کا دروازہ کھل جانے کے بعد اور انبیاء علیہم السلام ملائکہ عظام اور اللہ کے دوسرے صالح اور مقرب بندے بھی اپنے سے تعلق رکھنے والے اہل ایمان کے حق میں سفارشیں کریں گے۔ یہاں تک کہ کم عمری میں فوت ہونے والے اہل ایمان کے معصوم بچے بھی اپنے ماں باپ کے لیے سفارشیں کریں گے۔ اسی طرح بعض اعمال صالحہ بھی اپنے عاملوں کے لیے سفارش کریں گے اور یہ سفارشیں بھی قبول فرمائی جائیں گی اور بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہوگی جن کی نجات اور بخشش ان سفارشوں ہی کے بہانہ ہوگی۔

مگر لحاظ رہے کہ یہ سب شفاعتیں اللہ کے اذن سے اور اس کی مرضی اور اجازت سے ہوں گی۔ ورنہ کسی نبی اور کسی فرشتہ کی بھی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مرضی کے بغیر کسی ایک آدمی کو بھی دوزخ سے نکال سکے یا اس کا اذن اور ایما پائے بغیر کسی کے حق میں سفارش کے لیے زبان کھول سکے۔ قرآن پاک میں ہے۔

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ (بقرہ) — کون ہے جو اس کی بارگاہ میں بغیر اس کی اجازت کے کسی کی سفارش کر سکے۔

دوسرے موقع پر فرمایا گیا۔

وَلَا یَشۡفَعُوۡنَ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی — اور وہ نہیں سفارش کر سکیں گے مگر صرف اس کے لیے جس کے لیے اس کی رضا ہوگی۔

بلکہ علمائے کرام نے جیسا کہ فرمایا ہے شفاعت دراصل شفاعت کرنے والوں کی عظمت ومقبولیت کے اظہار کے لیے اور ان کے اکرام واعزاز کے واسطے ہوگی ورنہ حق تعالیٰ کے کاموں اور اس کے فیصلوں میں دخل دینے کی کسے مجال ہے۔

"یفعل مایشاء ویحکم مایرید" اس کی شان ہے۔

اب ذیل میں باب شفاعت کی چند حدیثیں درج کی جا رہی ہیں۔

---

(۸۹) عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان یوم القیٰمۃ ماج الناس بعضھم فی بعض فیاتون آدم فیقولون اشفع الی ربک فیقول لست لھا ولکن علیکم بابراھیم فانہ خلیل الرحمٰن فیاتون ابراھیم فیقول لست لھا ولکن علیکم بموسیٰ فانہ کلیم اللہ فیاتون موسیٰ فیقول لست لھا ولکن علیکم بعیسیٰ فانہ روح اللہ وکلمتہ، فیاتون عیسیٰ فیقول لست لھا ولکن علیکم

بمحامد فیاتونی فاقول انا لہا فاستاذن علی ربی فیوذن لی ویلہمنی محامد احمدہ
بہا لا تحضرنی الان فاحمدہ بتلک المحامد واخر لہ ساجداً فیقال یا محمد ارفع راسک
وقل تسمع وسل تعط واشفع تشفع فاقول یارب اُمتی اُمتی فیقال انطلق فاخرج من
کان فی قلبہ مثقال شعیرۃ من ایمان فانطلق فافعل ثم اعود فاحمدہ بتلک المحامد
ثم اخر لہ ساجداً فیقال یا محمد ارفع راسک وقل تسمع وسل تعطہ واشفع وتشفع فاقول
یارب امتی امتی فیقال انطلق فاخرج من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ اوخردلۃ من ایمان
فانطلق فافعل ثم اعود فاحمدہ بتلک المحامد ثم اخر لہ ساجداً فیقال یا محمد ارفع
راسک وقل تسمع وسل تعطہ واشفع تشفع فاقول یارب امتی امتی فیقال انطلق فاخرج
من کان فی قلبہ ادنی ادنی ادنی مثقال حبۃ خردلۃ من ایمان فاخرجہ من النار فانطلق
فافعل ثم اعود الرابعۃ فاحمدہ بتلک المحامد ثم اخر لہ ساجداً فیقال یا محمد ارفع راسک
وقل تسمع وسل تعطہ واشفع تشفع فاقول یارب ائذن لی فیمن قال لا الہ الا اللہ قال
لیس ذالک الیک ولکن وعزتی وجلالی وکبریائی وعظمتی لاخرجن منہا من قال لا
الہ الا اللہ ۔ (متفق علیہ)

(ترجمہ) حضرت انسؓ سے مروی ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ جب قیامت کا دن ہوگا (اور سب اولین و آخرین میدان حشر میں جمع ہوں گے) تو لوگوں میں سخت اضطراب اور اژدحام کی کیفیت ہوگی۔ پس وہ لوگ (یعنی اہل محشر کے کچھ نمائندے) آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونگے اور عرض کریں گے کہ اپنے رب سے ہماری سفارش کر دیجیے (کہ ہمیں اس حالت سے چھٹکارا ملے) آدم علیہ السلام فرمائیں گے کہ میں اس کام کے لائق اور اس مرتبہ کا نہیں ہوں لیکن تم کو چاہیے کہ ابراہیم کے پاس جاؤ وہ اللہ کے خلیل ہیں (شاید وہ تمہارے کام آسکیں) پس یہ لوگ ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے (اور ان کے سامنے شفاعت کا اپنا سوال رکھیں گے) وہ بھی فرمائیں گے کہ میں اس کام کے لائق نہیں ہوں لیکن تمھیں موسیٰ کے پاس جانا چاہیے وہ اللہ کے کلیم ہیں (جنھیں اللہ نے بلا واسطہ اپنی ہم کلامی کا شرف بخشا ہو) شاید وہ تمہارا کام کر سکیں۔ پس یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے (اور اپنی وہی عرض ان کے سامنے رکھیں گے) وہ بھی یہی فرمائیں گے کہ میں اس کام کے لائق نہیں ہوں لیکن تمھیں عیسیٰ کے پاس جانا چاہیے وہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں (یعنی اللہ نے ان کو انسانی پیدائش کے عام مقررہ اسباب کے بغیر صرف اپنے حکم سے پیدا کیا ہو اور ان کو غیر معمولی قسم کی روح اور روحانیت بخشی ہو ــــ تو تم ان کی خدمت میں جاؤ شاید وہ تمہارے لیے حق تعالیٰ

سے عرض کرنے کی جرأت کر سکیں) پس یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے (اور ان سے شفاعت کی درخواست کریں گے) وہ بھی یہی فرمائیں گے کہ میں اس کام کا اور اس مرتبہ کا نہیں ہوں تم کو (اللہ کے آخری نبی) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ) پھر وہ لوگ میرے پاس آئیں گے (اور شفاعت کے لیے مجھ سے کہیں گے) پس میں کہوں گا کہ میں اس کام کا ہوں (اور یہ میرا ہی کام ہے) پس میں اپنے رب کریم کی بارگاہ خاص میں حاضری کی اجازت طلب کروں گا، مجھے اجازت دے دی جائے گی (میں اندر حاضر ہو جاؤں گا) اور اللہ تعالیٰ اس وقت مجھے اپنی کچھ خاص تعریفیں اپنی حمد کے لیے الہام فرمائیں گے جو اِس وقت مجھے معلوم نہیں ہیں تو اُس وقت میں انہی الہامی محامد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کروں گا اور اس کے آگے سجدہ میں گر جاؤں گا (مسند احمد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہو کہ آپ وہاں ایک ہفتہ تک سجدہ میں پڑے رہیں گے۔ اس کے بعد) اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو فرمایا جائے گا کہ اے محمد سر اٹھاؤ اور جو کہنا ہو کہو تمھاری سنی جائے گی اور جو مانگنا ہو مانگو تم کو دیا جائے گا اور جو سفارش کرنا چاہو کرو تمھاری مانی جائے گی۔ پس میں کہوں گا کہ اے پروردگار میری امت، میری امت! (یعنی میری امت پر آج رحم فرمایا جائے اور اس کو بخشدیا جائے) پس مجھ سے کہا جائے گا جاؤ اور جس کے دل میں جو کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو تو اس کو نکال لو، پس میں جاؤں گا اور ایسا کروں گا (یعنی جن کے دل میں جو کے دانہ برابر بھی نور ایمان ہوگا ان کو نکال لاؤں گا) اور پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کرم کی طرف لوٹوں گا اور پھر ان ہی الہامی محامد کے ذریعہ اس کی حمد و ثنا کروں گا اور اس کے آگے پھر سجدہ میں گر جاؤں گا ــــ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا جائے گا اے محمد سر اٹھاؤ اور جو کہنا ہو کہو تمھاری بات سنی جائے گی اور جو مانگنا ہو مانگو تم کو دیا جائے گا اور جو سفارش کرنا چاہو کرو تمھاری شفاعت مانی جائے گی، پس میں عرض کروں گا، اے پروردگار میری امت میری امت! تو مجھ سے فرمایا جائے گا کہ جاؤ اور جن کے دل میں ایک ذرہ کے بقدر (یا فرمایا کہ رائی کے دانہ کے بقدر) ایمان ہو ان کو بھی نکال لو ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ــــ میں جاؤں گا اور ایسا کروں گا (یعنی جن کے دلوں میں ذرّہ برابر یا رائی کے دانہ کے برابر نور ایمان ہوگا اُن کو بھی نکال لاؤں گا) اور پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ کرم کی طرف لوٹوں گا اور پھر ان ہی الہامی محامد کے ذریعہ اس کی حمد و ثنا کروں گا اور اس کے آگے پھر سجدہ میں گر جاؤں گا، پس مجھ سے فرمایا جائے گا اے محمد اپنا سر اٹھاؤ اور جو کہنا ہو کہو، تمھاری سُنی جائے گی اور جو مانگنا چاہو مانگو تم کو دیا جائے گا اور جو سفارش کرنا چاہو کرو تمھاری سفارش قبول کی جائے گی، پس میں عرض کروں گا میرے رب میری امت میری امت! پس مجھ سے فرمایا جائے گا جاؤ اور جن کے دل میں رائی کے دانہ سے کم سے کمتر بھی ایمان

ہوا اس کو بھی نکال لو ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ۔ پس میں جاؤں گا اور ایسا کروں گا۔ یعنی جن کے دل میں رائی کے دانہ سے کم سے کمتر بھی ایمان کا نور ہوگا ان کو بھی نکال لاؤں گا) اور اس کے بعد چوتھی دفعہ پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کرم کی طرف لوٹ کر آؤں گا اور ان ہی الہامی محامد کے ذریعہ اس کی حمد کروں گا۔ پھر اس کے آگے سجدہ میں گر جاؤں گا۔ پس مجھ سے فرمایا جائے گا، اے محمدؐ اپنا سر سجدہ سے اٹھاؤ اور جو کہنا ہو کہو، تمھاری سنی جائے گی۔ اور جو مانگنا چاہو مانگو تم کو دیا جائے گا۔ اور جو سفارش کرنا چاہو کرو تمھاری سفارش مانی جائے گی۔ پس میں عرض کروں گا کہ اے پروردگار۔ مجھے اجازت دیجیے ان سب کے حق میں جنھوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہو ـــ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ کام تمھارا نہیں ہے، لیکن میرے عزت و جلال اور میری عظمت و کبریائی کی قسم میں خود دوزخ سے ان سب کو نکال لوں گا جنھوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہو۔ (بخاری و مسلم)

(**تشریح**) اس حدیث میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔

(۱) حدیث میں جو کے برابر، رائی کے دانہ کے برابر، اور رائی کے دانہ سے کم سے کمتر دل میں ایمان ہونے کا جو ذکر ہے اس سے مراد نورِ ایمان اور ثمراتِ ایمان کے خاص خاص درجے ہیں۔ جن کا ادراک ہم کو تو نہیں ہوتا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت اس وقت اس کا ادراک کر لے گی اور آپ ان درجوں والوں کو اللہ کے حکم سے نکال لائیں گے۔

(۲) حدیث کے آخری حصہ میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کے لیے تین دفعہ شفاعت فرمانے کے بعد چوتھی دفعہ حق تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ مجھے ان لوگوں کے بارے میں اجازت دی جائے جنھوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہو، اس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ جن لوگوں نے آپ کی دعوت توحید کو تو قبول کر لیا اور ایمان لے آئے، لیکن دوزخ سے نجات پانے اور جنت میں جانے کے لیے جو اور اعمال کرنا چاہیے تھے۔ وہ انھوں نے بالکل نہیں کیے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر میں ایسے لوگوں کو بھی دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کرنے کی اجازت چاہیں گے جن کے پاس کسی درجہ کا مجردِ ایمان اور توحید کا اعتقاد تو ہوگا لیکن عملِ خیر سے بالکل خالی ہوں گے (مسلم شریف کی ایک روایت میں غالباً اسی گروہ کے حق میں لم یعمل خیراً قط کے الفاظ آئے ہیں۔ جن کا مطلب یہی ہے کہ انھوں نے کبھی کوئی نیک عمل نہیں کیا ہوگا) اللہ تعالیٰ فرمائیں گے " لیس ذالک لک " یعنی ان مسکینوں کو جہنم سے نکالنے کا کام میں نے آپ کے لیے نہیں رکھا ہے، یا مطلب یہ ہے کہ آپ کے لیے یہ سزاوار اور مناسب نہیں ہے۔ بلکہ یہ کام میری عزت و جلال اور میری عظمت و کبریائی اور شانِ فعال لما یرید کیلیے

ہی سزاوار ہو اس لیے اس کو میں خود ہی کروں گا۔ اس عاجز کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہو کہ جن لوگوں نے ایمان لاکر احکام کی تعمیل بالکل نہیں کی ایسوں کو دوزخ سے نکالنا پیغمبر کے لیے مناسب نہیں ہو۔ اس درجہ کا عفو و درگزر اللہ ہی کے لیے سزاوار ہو۔ واللہ اعلم۔

(۳) معلوم ہوتا ہو اس روایت میں کچھ اختصار سے کام لیا گیا ہو۔ چنانچہ اسی حدیث کی صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہی کی ایک دوسری روایت میں آدم علیہ السلام کے بعد اور ابراہیم علیہ السلام سے پہلے اہلِ محشر کے نوح علیہ السلام کی خدمت میں بھی حاضر ہونے کا ذکر ہو جو اس میں نہیں ہو ــــ نیز اس میں صرف اپنی امت کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا ذکر ہو، حالانکہ قرینِ قیاس یہ ہو کہ پہلے آپ عام اہلِ محشر کے لیے حساب اور فیصلہ کی شفاعت فرمائیں گے جس کو "شفاعت کبریٰ" کہتے ہیں، پھر جب حساب کے نتیجہ میں بہت سے آپ کے امتی اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے دوزخ کی طرف بھیجدیے جائیں گے تو آپ ان کو دوزخ سے نکالنے اور جنت میں داخل کرنے کے لیے شفاعت فرمائیں گے۔ ــ واللہ اعلم

(۴) اہلِ محشر کے جو نمائندے کسی شفیع کی تلاش میں نکلیں گے اسوقت اللہ تعالیٰ ان کے دل میں یہی ڈالے گا کہ وہ پہلے آدم علیہ السلام کی خدمت میں اور پھر ان کی رہنمائی اور مشورہ سے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ و عیسیٰؑ کی خدمت میں حاضر ہوں ــ یہ سب منجانب اللہ اس دن اس لیے ہوگا کہ عملی طور پر سب کو معلوم ہوجائے کہ اس شفاعت کا منصب اور "مقام محمود" اس کے آخری نبی کے لیے مخصوص ہو۔ بہرحال اس دن یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور رفعتِ مقام کے برسرِ محشر اظہار کے لیے منجانب اللہ ہوگا۔

(۹۰) عن عمران بن حصین قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخرج قوم من امتی من النار بشفاعتی یسمون الجہنمیین (رواہ البخاری)

(ترجمہ) عمران بن حصین سے مروی ہو۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک گروہ میری امت میں سے میری شفاعت سے دوزخ سے نکالا جائے گا جن کو جہنمیون کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ (بخاری)

(تشریح) یہ ان کی توہین و تنقیص نہ ہوگی، بلکہ جہنم سے نکالے جانے کی وجہ سے ان کا یہ نام پڑجائے گا جو ان کے لیے خوشی کا باعث ہوگا کیونکہ یہ اللہ کے کرم کو یاد دلائے گا۔

(۹۱) عن عوف بن مالک قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتانی آت من عند ربی فخیرنی بین ان ید[illegible] نصف امتی الجنۃ وبین الشفاعۃ فاخترت الشفاعۃ وھی لمن مات لا یشرک باللہ شیئاً۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ)

(ترجمہ) عوف بن مالک سے مروی ہو۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے

پاس میرے رب کی طرف سے ایک آنے والا پیغام لے کر آیا۔ اس میں میرے رب نے مجھے اختیار دیا کہ میں ان دو باتوں میں سے کوئی ایک بات اختیار کر لوں یا یہ کہ اللہ تعالیٰ میری نصف امت کو جنت میں داخل فرما دیں یا یہ کہ مجھے شفاعت کا موقع ملے تو میں نے حق شفاعت کو اختیار کر لیا، اور میری شفاعت ان لوگوں کے لیے ہوگی جو ایمان اور توحید کی میری دعوت کو قبول کر کے، اس حال میں مرے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے تھے۔ (ترمذی و ابن ماجہ)

(۹۲) عن ابی هریرة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اسعد الناس بشفاعتی یوم القیمۃ من قال لا الہ الا اللہ خالصاً من قلبه او نفسه (رواہ البخاری)

(ترجمہ) حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن میری شفاعت سے بہرہ مند وہی ہوں گے جنھوں نے خلوص قلب سے لا الہ الا اللہ کہا ہو۔

(تشریح) اس حدیث کا بھی مطلب وہی ہو جو اوپر والی حدیث میں دوسرے لفظوں میں فرمایا گیا یعنی جو شرک کی بیماری میں مبتلا ہوگا اس کو شفاعت سے فائدہ نہ ہوگا۔ ہاں اگر شرک سے پاک ہو گیا ہو اور دوسرے قسم کے گناہ ہیں تو اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے فائدہ ہوگا۔

(۹۳) عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال شفاعتی لاهل الکبائر من امتی ——— (ترمذی و ابوداؤد ورواہ ابن ماجہ عن جابر)

(ترجمہ) حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے حق میں ہوگی جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوئے ہوں گے۔ (ترمذی وابوداؤد)۔ اور اسی حدیث کو ابن ماجہ نے بجائے انس کے حضرت جابر سے روایت کیا ہو)

(تشریح) اس قسم کی حدیثوں سے نڈر اور بے خوف ہو کر گناہوں پر اور زیادہ جری ہو جانا بڑا کمینہ پن ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قسم کے ارشادات کا مقصد یہ ہوتا ہو کہ جن لوگوں سے شامت نفس سے گناہ ہو جائیں وہ بھی مایوس اور ناامید نہ ہوں، میں ان کی شفاعت کروں گا اس لیے وہ شفاعت کا استحقاق پیدا کرنے کے لیے اللہ کے ساتھ اپنے بندگی کے تعلق کو اور میرے امتی ہونے کے تعلق کو درست کرنے کی فکر کریں۔

(۹۴) عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم تلا قول اللہ تعالیٰ فی ابراهیم رب انهن اضللن کثیراً من الناس فمن تبعنی فانه منی وقال عیسیٰ ان تعذبهم فانهم عبادك فرفع یدیه فقال اللهم امتی امتی وبکی

فقال الله تعالیٰ یا جبرئیل اذهب الی محمد ـــ وربك اعلم ـــ فسله ما یبکیه فاتاه جبرئیل فسأله فاخبره رسول الله صلی الله علیه وسلم بما قال فقال الله لجبرئیل اذهب الی محمد فقل انا سنرضیك فی امتك ولا نسوءك　　(رواہ مسلم)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک (سورۂ ابراہیم) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ آیت تلاوت فرمائی "رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ" میرے پروردگار ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کردیا ہے یعنی ان کی وجہ سے بہت سے آدمی گمراہ ہوئے، پس جو لوگ میری پیروی کریں وہی میرے ہیں (تو ان کے لیے تو میں تجھ سے عرض کرتا ہوں کہ ان کو تو بخش ہی دے) اور عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بھی تلاوت فرمایا جو قرآن پاک (سورۂ مائدہ) میں ہے اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ" (اے اللہ اگر آپ میری امت کے ان لوگوں کو عذاب دیں تو یہ آپکے بندے ہیں (یعنی آپ کو عذاب و سزا کا پورا حق ہے) یہ دونوں آیتیں تلاوت فرماکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یاد کیا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کہا اے میرے اللہ میری امت! میری امت! اور آپ اس دعا میں روئے، اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کو فرمایا تم محمدؐ کے پاس جاؤ ـــ اور اگرچہ تمہارا رب سب کچھ خوب جانتا ہے مگر پھر بھی ـــ تم جاکر ہماری طرف سے پوچھو کہ ان کے اس رونے کا کیا سبب ہے، پس جبرئیل آپکے پاس گئے، اور آپ سے پوچھا آپ نے جبرئیل کو وہ بتلا دیا جو اللہ سے عرض کیا تھا (یعنی یہ کہ اس وقت کے میرے رونے کا سبب امت کی فکر ہے) جبرئیل نے جاکر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا) تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو فرمایا کہ محمد کے پاس جاؤ اور ان کو ہماری طرف سے کہو کہ تمہاری امت کے بارہ میں ہم تمھیں راضی اور خوش کردیں گے۔ اور تمھیں رنجیدہ اور غمگین نہیں کریں گے۔　　(مسلم)

(تشریح) حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی دو آیتوں کی تلاوت فرمائی ایک سورۂ ابراہیم کی آیت جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے متعلق ذکر فرمایا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم اور اپنی امت کے بارہ میں عرض کیا کہ "فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" (یعنی ان میں سے جن لوگوں نے میری بات مانی وہ تو میرے ہیں (اور میں ان کے لیے آپ سے مغفرت کی درخواست کرتا ہوں) اور جنھوں نے میری نافرمانی کی تو آپ غفورٌ رحیم ہیں چاہیں تو ان کو بھی بخش سکتے ہیں ـــ اور دوسری آیت سورۂ مائدہ کی جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ذکر ہے کہ وہ اپنے گمراہ امتیوں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ "اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ

فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ہ" (اگر آپ ان کو عذاب دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور آپ کو عذاب دینے کا پورا حق ہے۔ اور اگر آپ ان کو بخش دیں تو آپ غالب ہیں (سب کچھ کر سکتے ہیں) اور حکیم ہیں (جو کچھ کریں گے حکمت کے مطابق ہی ہوگا) ان دونوں آیتوں میں اللہ کے دونوں جلیل القدر پیغمبروں نے پورے ادب اور بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی اپنی امتوں کے خطا کار لوگوں کے لیے دبے لفظوں میں سفارش کی ہے۔ ان آیتوں کی تلاوت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کا مسئلہ یاد دلایا اور آپ نے ہاتھ اٹھا کر اور رو کر بارگاہ الٰہی میں اپنی فکر کو عرض کیا جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطمینان دلایا کہ آپ کی امت کا مسئلہ آپ کی مرضی اور خوشی کے مطابق ہی طے کر دیا جائے گا اور اس معاملہ کی وجہ سے آپ کو رنجیدہ اور غمگین ہونا نہیں پڑے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر پیغمبر کو اپنی امت کے بلکہ ہر مقتدا کو اپنے متبعین اور منتسبین کے ساتھ ایک خاص قسم کا شفقت کا تعلق ہوتا ہے جس طرح کہ ہر شخص کو اپنی اولاد کے ساتھ ایک خاص تعلق ہوتا ہے جو دوسرے انسانوں کے ساتھ نہیں ہوتا اور اس تعلق کی وجہ سے ان کی قدرتی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے عذاب سے چھٹکارا پائیں اور اس شفقت اور رأفت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب پیغمبروں سے بڑھے ہوئے ہیں اور اس لئے قدرتی طور پر آپ کی یہ بڑی خواہش ہے جو مختلف موقعوں پر بار بار آپ سے ظاہر ہوئی کہ آپ کی امت دوزخ میں نہ جائے اور جن کی بدعملی اس درجہ کی ہو کہ ان کا دوزخ میں ڈالا جانا اور کچھ عذاب پانا ناگزیر ہو، ان کو کچھ سزا پانے کے بعد نکال لیا جائے چنانچہ مندرجہ بالا احادیث سے معلوم ہو چکا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اس خواہش کو پورا فرمائیں گے اور آپ کی شفاعت سے بہت سے لوگ جہنم سے بچ جائیں گے اور بہت سے ڈالے جانے کے بعد نکال لیے جائیں گے۔

شفاعت کے سلسلہ کی حدیثوں میں صحیح مسلم کی یہ حدیث ہم جیسے خطا کاروں، گنہگاروں کے لیے بڑا سہارا ہے اور اس میں بڑی بشارت ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل سے اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سن کر فرمایا کہ میں تو جب مطمئن اور خوش ہوں گا جب میرا کوئی امتی بھی دوزخ میں نہیں رہے گا۔ ع۔ بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

اللہ تعالیٰ کو بطور خود سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود رونے کا سبب پوچھنے کے لیے حضرت جبرئیل کو رسول اللہ کے پاس بھیجنا صرف آپ کے اکرام اور اعزاز کے طور پر تھا کہ اپنے مقربین کے ساتھ بادشاہوں کا یہی طرز ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۹۵) عن عثمان بن عفان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یشفع یوم القیمۃ ثلثۃ الانبیاء ثم العلماء ثم الشہداء (رواہ ابن ماجہ)

(ترجمہ) حضرت عثمان بن عفان سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت

میں تین طرح کے لوگ (خصوصیت سے) شفاعت کریں گے۔ انبیاء علیہم السلام پھر دین کا علم رکھنے والے، اور پھر شہدار۔ (ابن ماجہ)

(تشریح) حدیث کا مطلب یہ نہیں ہو کہ ان تین گروہوں سے باہر کا کوئی شخص کسی کی سفارش نہیں کرسکے گا بلکہ خاص شفاعت انہی تین گروہ والوں کی ہوگی لیکن ان کے علاوہ بعض ان صالحین کو بھی اذن شفاعت ملے گا جو ان تینوں میں سے کسی گروہ میں بھی نہیں ہوں گے۔ بلکہ جیسا کہ دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہو چھوٹے بچے بھی اپنے ماں باپ کی سفارش کریں گے اور اعمال صالحہ کی بھی شفاعت ہوگی۔

(۹۶) عن ابی سعید ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان من امتی من یشفع للفئام ومنھم من یشفع للقبیلۃ ومنھم من یشفع للعصبۃ ومنھم من یشفع للرجل حتی یدخلوا الجنۃ۔ (رواہ الترمذی)

(ترجمہ) حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں بعض افراد وہ ہوں گے جو جماعتوں اور قوموں کی شفاعت کریں گے (یعنی ان کا مقام یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کو قوموں کی شفاعت کی اجازت دے گا اور قوموں کے حق میں ان کی سفارش قبول فرمائے گا) اور بعض وہ ہوں گے جو عصبہ (یعنی دس سے چالیس تک کی تعداد والی کسی پارٹی) کے بارہ میں شفاعت کریں گے اور بعض وہ ہوں گے جو ایک آدمی کی سفارش کرسکیں گے (اور اللہ تعالیٰ ان سب کی شفاعتیں قبول فرمائے گا) یہاں تک کہ سب جنت میں پہونچ جائیں گے۔ (ترمذی)

(۹۷) عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصف اھل النار فیمر بھم الرجل من اھل الجنۃ فیقول الرجل منھم یا فلان اما تعرفنی انا الذی سقیتک شربۃ وقال بعضھم انا الذی وھبت لک وضوءً فیشفع لہ فیدخلہ الجنۃ۔ (رواہ ابن ماجہ)

(ترجمہ) حضرت انس سے مروی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ آخرت میں صف باندھے کھڑے کیے جائیں گے اہل دوزخ (یعنی اہل ایمان میں سے کچھ گنہگار لوگ جو اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے دوزخ میں سزا پانے کے مستحق ہوں گے وہ آخرت میں کسی موقع پر صف باندھے کھڑے ہوں گے) پس ایک شخص اہل جنت میں سے ان کے پاس سے گزرے گا تو صف والوں میں سے ایک شخص اس گزرنے والے جنتی کو پکار کر کہے گا کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟ میں وہ ہوں کہ ایک دفعہ میں نے تمکو پانی پلایا تھا۔ (یا شربت وغیرہ پینے کی کوئی اچھی چیز پلائی تھی) اور اسی صف والوں میں سے کوئی اور کہے گا کہ میں نے تمھیں وضو کے لیے پانی

دیا تھا، پس یہ شخص ان لوگوں کے حق میں اللہ تعالیٰ سے سفارش کرے گا اور ان کو جنت میں داخل کرا دے گا۔ (ابن ماجہ)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دنیا میں صالحین سے محبت اور قربت کا تعلق اپنی عملی کوتاہیوں کے باوجود بھی انشاء اللہ بہت کچھ کام آنے والا ہو بشرطیکہ ایمان نصیب ہو۔ افسوس ان چیزوں میں جس طرح بہت سے جاہل عوام سخت غلو اور افراط میں مبتلا ہو کر گمراہ ہوئے ہیں اسی طرح ہمارے زمانے کے بعض اچھے خاصے پڑھے لکھے سخت تفریط میں مبتلا ہیں ۔۔۔ اور ان چیزوں میں افراط کی خرابی ہو یا تفریط کی گمراہی جب ہی آتی ہو جبکہ اللہ تعالیٰ کی اور اس کی صفات کی صحیح معرفت نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنی صحیح معرفت اور اپنی صفات کا صحیح یقین نصیب فرمائے اور ایمان پر خاتمہ فرمائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے بہرہ مند کرے کہ معاملہ اول و آخر اسی کے ہاتھ ہو۔

"اللہ کے گھر پہنچ کر"

(گزشتہ تین سالوں میں اللہ تعالیٰ نے ادارۂ الفرقان کو حج نمبر نکالنے کی توفیق دی پھر ان نمبروں کے خاص مقالات و مضامین "آپ حج کیسے کریں؟" کے نام سے کتابی شکل میں بھی مرتب ہو کر شائع ہو گئے اور الحمد للہ وہ ایسی چیز تیار ہو گئی کہ اس کے بعد اس سال حج نمبر نکالنے کے لئے دل میں کوئی خاص تحریک ہی پیدا نہیں ہوئی۔ البتہ ہمارے مخدوم و محترم مولانا گیلانی نے پچھلے نمبروں کے لئے ہماری ہی استدعا پر اپنے سفر حج کی جو سرگزشت سپرد قلم فرمائی تھی (جس کی دو قسطیں ۶۹ھ و ۷۰ھ کے حج نمبروں میں شائع ہو چکی ہیں) چونکہ اس کا آخری حصہ جو خاص حج سے متعلق تھا باقی رہ گیا تھا اور الفرقان کے ناظرین میں سے بہت سوں کو اس کا خاص اشتیاق تھا اس لئے رمضان مبارک میں مولانا سے اس کے لئے عرض کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ مولانا ممدوح کو ہماری طرف سے اور الفرقان کے ناظرین کی طرف سے بہتر سے بہتر جزا دے، آپ نے یہ آخری قسط تحریر فرما کر اس سلسلہ کو پورا فرما دیا ــــ ۶۹ھ کے حج نمبر والی پہلی قسط میں عزم سفر سے لے کر مدینہ طیبہ کی حاضری اور وہاں کے قیام کی سرگزشت اور ۷۰ھ کے حج نمبر والی دوسری قسط میں مدینہ طیبہ سے روانہ ہو کر مکہ معظمہ پہنچنے تک کے حالات و واقعات ناظرین کرام پڑھ چکے ہیں۔ اس کے بعد "اللہ کے گھر پہنچ کر" جو کچھ گزرا وہ آئندہ صفحات میں پڑھیے)

(مدیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے گھر پہنچ کر

(از مولانا مناظر احسن گیلانی)

(ایک نمبر، دو نمبر، تیسرے نمبر کے لئے مدیر الفرقان فقیر سے صرف ایک "حج" پر تین مقالے لکھوا چکے ہیں خیال تھا کہ شاید اب بخش دیا جاؤں گا، لیکن تقاضے کا سلسلہ جاری ہے۔ کچھ باتیں رہ بھی گئی ہیں ان ہی سے یہ چوتھی قسط اس سلسلہ کی تیار کی جاتی ہے۔ بھولی بسری باتیں خدا کرے یاد آتی چلی جائیں نفس حج اور اس کے مناسک کی عام باتیں ہیں، ظاہر ہے کہ اس قسم کے مضامین میں جیسا کہ یہ مضمون ہے ان کے ذکر کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مناسک کی عام کتابیں عربی اُردو میں موجود ہیں، اور الفرقان کے گذشتہ حج نمبروں کے ذریعہ کافی سرمایہ اس سلسلہ میں جمع ہو چکا ہے بس جو کچھ بھی گنجائش رہ گئی ہے وہ اسی بات کی ہے کہ اپنے شخصی واردات و سوانح جو قابل ذکر ہوں، اور کسی نہ کسی حیثیت سے افادیت کا کوئی پہلو ان میں ہو ان کو پیش کر دیا جائے۔ اسی لحاظ سے آئندہ سطروں کا مطالعہ کیا جائے۔ فقط　　　مناظر احسن گیلانی

طواف قدوم و سعی وغیرہ کے قصوں سے فارغ ہونے کے بعد ہمارے رفقاء کرام خصوصاً مولینا عبدالماجد و مولینا عبدالباری صاحبان وغیرہ تو متمتع ہونے کی وجہ سے حلال ہونے کے مشاغل میں مصروف ہوئے لیکن فقیر قارن تھا یعنی حج و عمرہ دونوں کے احرام کی نیت ساتھ کی تھی۔ حنفی مذہب کی رو سے حج کی تین قسموں قران و افراد و تمتع میں افضل ترین شکل قران ہی کی ہے۔ علماء احناف کا دعویٰ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قران ہی کی شکل میں حج فرمایا تھا عمل کرنے کے بعد محسوس ہوا کہ حلال ہونے کی جھنجھٹوں سے بھی آزاد رہنے کی ضمانت قران ہی میں تھی۔ اگرچہ ہمارے رفقاء کا دعویٰ اُس وقت بھی تھا اور شاید اب بھی ہو کہ تمتع ہی میں سہولت کا پہلو زیادہ ہے۔ مجھ پر عزیمت کا الزام قائم کیا گیا تھا اور اپنے آپ کو رخصت سے مستفید ہونے والوں میں شمار فرماتے تھے۔ مولینا عبدالباری غربیا لو والا لطیفہ[1] نماز کے متعلق

---

[1] گدریہ میں کوئی بے چارہ مسلمان تھا جو صرف ہفتہ میں ایک دفعہ جمعہ کی نماز پڑھا کرتا تھا۔ مولوی عبدالباری صاحب فرماتے تھے۔ اس کو جب کہا گیا کہ بھائی پانچ وقتوں کی نماز تم کیوں نہیں پڑھتے تو جھنجلا کر بولا کہ جناب آپ امیر لوگ ہیں جتنی نمازیں چاہے پڑھئے (باقی صفحہ آئندہ پر)

جو بیان کیا کرتے ہیں کچھ وہی نوعیت اپنے حج و عمرہ کی اس زمانہ میں یہ حضرات قرار دیتے تھے۔

ہمارے قافلہ نے فرودگاہ کے لئے محلہ مسفلہ کی مشہور رباط، رباط محروقی کا انتخاب کیا تھا غالباً حیدرآباد کی کسی بیگم کی تعمیر کرائی ہوئی یہ رباط ہے، سب کے ساتھ فقیر کی منزل بھی یہ رباط قرار پائی لیکن طواف وسعی سے فارغ ہونے کے بعد جب رباط پہونچا اور قیام وطعام کے نظم کا سوال اٹھا تو خاکسار نے رفیقوں سے عرض کیا کہ نامناسب نہ سمجھا جائے تو اس بندے کو پروانۂ آزادی عطا فرما دیا جائے۔ پوچھا گیا تیرا مطلب کیا ہے؟ عرض کیا گیا کہ میرے لئے نہ قیام ہی کی فکر کیجئے نہ طعام کی۔ دل یہ چاہتا ہے کہ چند دن کے لئے میر مرحوم کے شعر کی لذت حاصل کروں یعنی ؎ ہوگا کسی دیوار کے سائے تلے میر　　کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

میری آرام طلبی نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ صرف شطرنجی اور تکیہ لے کر یہ دو تین دن، جو آغاز مناسک کے لئے باقی ہیں ان کو حرم ہی کے کسی گوشہ میں گذار دوں۔ یہ تجویز دماغ میں مختلف وجوہ سے آئی، مکہ معظمہ میں قیام کی مدت کا حد سے زیادہ اختصار، زمانہ وہ آگیا تھا کہ چاروں طرف سے حجاج کھنچ کھنچا کر مکہ معظمہ میں جمع ہو چکے تھے لاکھوں لاکھ کی اس بھیڑ میں سب سے بڑی محرومی اپنی یہ محسوس ہوتی تھی کہ براہ راست حجر اسود کی تقبیل ولمس یعنی بوسہ دینے کی آرزو دل ہی دل میں رہی جاتی تھی، خیال آتا تھا کہ از آدم تا خاتم حضرات انبیاء علیہم السلام کے دست مبارک کی قائم مقامی جو پتھر کر رہا ہے، تواتر کی روشنی میں جانتا ہوں کہ ان بزرگوں کی تقبیل ولمس سے خانہ کعبہ کا یہ پتھر مشرف ہے اس کو چومنا اور اس پر ہاتھ رکھ کر کلمۂ شہادت و دعوت کے عہد و میثاق کی تجدید کی تمنا دل کو تڑپا رہی تھی "ید اللہ فوق ایدیھم" کا قرآنی اشارہ حوصلہ میں اور بلندی پیدا کرتا تھا، صحیح حدیثوں میں پڑھا تھا کہ کعبہ کی دیوار کا یہ پتھر آسمان و زمین کے خالق و مالک کا یمین اور سیدھا ہاتھ ہے، اللہ اللہ! اللہ کا دہنا ہاتھ بڑھا ہوا تھا، وہی ہاتھ جو اول سے آخر تک سارے انبیاء کے مبارک و مقدس ہاتھوں پر تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اسی کے ساتھ لپٹ جاؤں، پکڑ لوں اس ہاتھ کو، کہ پھر وہ ہاتھ سے نہ چھوٹے لیکن انسانوں کا طوفان تھا جو اس پتھر کے اردگرد ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ گھسنے والے بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے سنگ اسود تک پہونچنے کی کوششوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کچھ کھو بیٹھے ہیں۔ خواجہ حافظ کی مشہور غزل کے اشعار مجسم ہو کر سامنے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کھڑے ہیں، گویا ان کے قلم نے ٹھیک اسی موقع کی تصویر کھینچی ہے، فرماتے ہیں ؎

چہ رہ بود اینکہ زد در پردہ مطرب　　کہ می رقصند باہم مست و ہشیار

ازیں افیوں کہ ساقی در مے افگند　　حریفاں را نہ سر ماند و نہ دستار

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بندہ غریب آدمی ہے، مجھ غریب آدمی کے لئے ایک ہی جمعہ کی نماز اٹھوارے میں بہت ہے شائد کتاب سفر حجاز میں مولانا دریابادی نے اپنے حج کے اس غریبانہ پہلو کا تذکرہ فرماتے ہوئے مجھ غریب کے قرآن کی امیرانہ شان کی طرف کچھ اشارہ بھی فرمایا ہے ۱۲

دیکھتا تھا اور دل کہتا تھا۔

خرد ہر چند نقد کائنات ست　　چہ سنجد پیش عشق کیمیا کار

"عشق کیمیا کار" کی گرمی بازار کا حال دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا تھا، نہ بڑوں کی بڑائی باقی تھی اور نہ چھوٹوں کا چھٹ پنا لوگ تھے کہ گرے پڑتے تھے اور پکارنے والا پکار رہا تھا۔

سکندر را نمی بخشند آبے　　بزور و زر میسر نیست ایں کار

یہ مبالغہ نہیں واقعہ ہے۔ اپنی آنکھوں دیکھی بات ہے کہ لاکھوں میں نہیں تو یقیناً ہزاروں میں چند ہی خوش قسمت تھے جو کسی نہ کسی طرح انسانی بحر مواج کو چیرتے پھاڑتے کعبہ کے اس سیاہ پتھر تک براہ راست پہونچنے میں کامیاب ہوتے تھے۔ دردناک منظر غریب نجدی حاجیوں کا تھا، سنگدلی میں حالانکہ ان کی شہرت ہے لیکن اس سیاہ سنگ کے عشق میں ہم دیکھتے تھے کہ آج بجائے دل کے ان کے سر گویا پتھر کے بنے ہوئے تھے سعودی حکومت کی پولیس کے جوان ہاتھوں میں بید لئے ہوئے حجر اسود کے گرد کھڑے ہوئے تھے۔ نجدی دیوانہ حاجی ہر چیز سے بے پرواہ ہو کر استلام[۱] کو ناکافی ٹھہراتے ہوئے حجر اسود کی تقبیل کے لئے جان پر کھیل کر جب حجر اسود تک پہونچ جاتا اور بوسہ کے لئے اپنے سر کو جھکاتا کہ اچانک تڑا تڑ انتہائی بے دردی کے ساتھ نجدی پولیس کے سپاہی کی بید اس غریب کے سر پر برسنے لگتی۔ بید پر بید سپاہی مارتا جا رہا ہے لیکن پتہ چلتا تھا کہ ان کو نجدی حاجی پھول سمجھ رہا ہے سنگ اسود کے ساتھ لپٹا ہوا ہے۔

طواف قدوم کے ابتدائی مناسک ہی میں ان باتوں کا اندازہ ہو گیا، میرے لئے نہ نجدی حاجیوں کے سروں کی سنگینی آسان تھی، اور نہ دل اس پر راضی ہوتا تھا کہ استلام کی شکل میں شرعی مطالبہ کی تکمیل کر کے آگے بڑھ جاؤں سوچ بچار کر اس راحت طلب دل نے یہی صورت نکالی کہ اپنا بستر اسی کسی کی دیوار کے نیچے ڈال دیا جائے۔ جو بس گھنٹوں میں آخر کوئی وقت، دن کو نہیں رات کی پچھلی گھڑیوں ہی میں شاید ایسا مل جائے کہ کھل کر دل کی آرزو پوری کر لوں۔

رفیقوں نے اجازت دیدی، سب کا بستر رباط محروق کے کمروں میں لگ گیا اور جسے اجازت مل گئی تھی سب سے الگ ہو کر باب ابراہیم کی سمت میں حرم شریف کے ایک گوشہ میں اپنا بستر ڈال دیا۔ ڈر تھا نجدی سپاہی کی ٹھوکروں کا۔ ڈر تھا بھری محفل سے اٹھا دئے جانے کی رسوائی نہ پیش آئے۔ اس رسوائی کی برداشت پر دل کو آمادہ کر لیا گیا تھا، لیکن شکر ہے کہ ایسی صورت کبھی پیش نہ آئی۔

اب ہم تھے۔ اور کعبہ مکرمہ و مقدسہ کی دید و دوام کا تماشا، دیکھتے دیکھتے جب طبیعت میں نشاط کی کیفیت پیدا ہوتی اٹھتا اور کسی کے گھر کے چاروں طرف رقص کا مشغلہ شروع ہوتا، دن کو تو خیر ناممکن تھا اور رات میں بھی

---

[۱] یعنی بجائے بوسہ کے دور سے حجر اسود کی طرف اشارہ بھی شرعاً جو کافی سمجھا جاتا ہے نجدی دادا والوں کے نزدیک وہ ناکافی تھا۔

بارہ ایک بجے تک طوافی تلاطم کا جوش موجیں ہی مارتا رہتا لیکن رات جب کافی بھیگ جاتی، ڈھائی تین بجے تک نسبتاً طواف کرنے والوں کی تعداد گھٹ گھٹا کر اس نقطہ تک پہونچ جاتی، کہ مجھ جیسے کمزور جسم وجان والوں کے لئے بھی حجر اسود تک براہِ راست رسائی گونہ آسان ہو جاتی تھی

بات جو گذری ہوئی ہے اُسے کیسے چھپاؤں، روایات کی روشنی میں حجر اسود جو کچھ میرے لئے تھا اس باب میں اپنے نقطۂ نظر کا ذکر کرچکا ہوں، میرے لئے وہ نمائندگی کر رہا تھا آدمؑ و شیثؑ، ادریسؑ و نوحؑ کے ساتھ ساتھ قوموں کے امام ابراہیم خلیل اور ان کے فرزند ذبیح علیہما السلام کے مبارک ہاتھوں کی بھی اور یقین کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ اور کسی جگہ کے متعلق کچھ بھی کہا جائے لیکن بغیر کسی شک وشبہ کے کعبہ کا یہ وہی پتھر ہے جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کے لمس اور لب اقدس کی تقبیل کی سعادت قطعی طور پر حاصل ہوئی ہے۔ الغرض ایمان کی آنکھوں سے تو نہ پوچھئے کہ ذہن کہاں کہاں تک پہونچتا تھا اور اڑتا ہوا دماغ کن بلندیوں کو چھو چھو لیتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مخلوقات سے گذر کر خالق تک کے یمین (دست راست) کی تجلی اسی سیاہ پتھر سے تڑپ تڑپ کر نکل رہی تھی اور ایمان کی آنکھ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی لیکن اسی کے ساتھ اب کیا بتاؤں کہ پہلی دفعہ رات کی پچھلی گھڑیوں میں جب حجر اسود کے چومنے کی سعادت سے سرفرازی میسر آئی تو اس وقت میں نے کیا پایا، کوئی تشبیہ سمجھ میں نہیں آتی، کچھ ایسا معلوم ہوا کہ کوند کر کوئی بجلی تھی جو چاندی[1] کے پتروں میں مڑھے ہوئے اس کالے پتھر کے ان ٹکڑوں سے مرے ظاہر و باطن میں جذب ہوگئی۔ ناقابل بیان سرور ونشاط کا ایک کیف مجہول تھا، جو میرے وجود میں ہلچل مچائے ہوئے تھا، ایک حال تھا نہیں کہہ سکتا کہ کیا حال تھا، باہر کی کوئی تاثیر تھی یا ایمانی مشاہدات کے نتائج نے ناسوتی رنگ اختیار کرلیا تھا۔ لیکن بات کچھ اسی رنگ میں پیش آئی۔

دیوار حرم کے نیچے کی چند دن کی یہ زندگی جو ساری زندگی کے اوقات میں سب سے زیادہ قیمتی تھی

---

[1] مسلمانوں کا ایک گمراہ ملحد طبقہ جو فرقہ قرامطہ کے نام سے مشہور ہے اور ان ہی کو باطنیہ بھی کہتے ہیں جن کو مسلمانوں کی فہرست میں شریک کرنا سچ پوچھئے تو اسلام کی توہین ہے۔ اسی گروہ کی ایک ٹولی کعبہ سے اس پتھر کو اکھاڑ کرلے بھاگی تھی، خیال ان بے ایمانوں کا یہ تھا کہ خلقت کی کشش کعبہ کی طرف اسی پتھر کا نتیجہ ہے۔ ہجر واقع ملک یمن کی مسجد میں اس پتھر کو ان ایمان باختوں نے نصب کردیا۔ سمجھا تھا کہ حج کا رُخ اسی طرف پلٹ جائے گا لیکن ایسا نہ ہوا آخر عباسی خلیفہ مقتدر کے زمانہ میں یہ پتھر واپس ہوا مگر چند ٹکڑوں کی شکل میں۔ ان ٹکڑوں کو چاندی کے پتروں سے جکڑ کر پھر کعبہ میں اسی مقام پر نصب کردیا گیا جہاں وہ پہلے تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ملاحدہ کی یہ جماعت محمرہ سرخ پوشوں کے نام سے بھی موسوم تھی۔ ان کے حالات موجودہ ریڈ شرٹ (سرخ قمیص) والوں سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ تاریخ کا یہ راز ہے، کاش کوئی اس پر کام کرتا ۱۲

دشواری اگر کبھی محسوس ہوئی، تو صرف اس وقت جب بشری ناگزیر تقاضے کے لئے جگہ کی تلاش ہوئی۔ جاننے والوں نے حرم کی عمارت کے پیچھے پتہ دیا کہ ایک مکان ہی اس کام کے لئے مختص ہے۔ داخل ہونے کے لئے اس مکان میں فقیر داخل تو ہو گیا لیکن جو گھنا ؤنا حد سے زیادہ مکروہ رُخ کو توڑ مروڑ دینے والا نظارہ آنکھ کے لئے اور روح گسل بدبو کا بھبھارا ناک کے لئے سامنے آیا، اب بھی جب اس کا خیال آجاتا ہے تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ باضابطہ حکومت قایم ہے نہ زمین ہی کی کمی ہے، اور نہ روپے کی، پھر اتنے اہم مسئلہ کی طرف سے حکومت کی غفلت یقیناً ایک بدترین مجرمانہ غفلت تھی نہیں کہہ سکتا کہ پٹرول اور طلا کے معادن کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد بھی اللہ کے کعبہ کی نگرانی جس حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اس مسئلہ کی طرف اس نے توجہ کی ہے یا نہیں۔

پہلی دفعہ تو جس طرح بھی ممکن ہوا شستم پستم کام چلا لیا گیا لیکن دوبارہ اس غلاظت کدہ کا تصور بھی مرے لئے وبال جان بنا ہوا تھا۔ تدبیر یہی سمجھ میں آئی کہ مخارج کا سوال تو مداخل کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ مداخل ہی میں ممکنہ حد تک جو کمی ہو سکتی تھی دل کو اسی پر راضی کرنا پڑا۔ جب شکمی مطالبہ حد سے زیادہ بڑھ جاتا تو ایک خاص قسم کی ڈبل روٹی باب ابراہیم کے باہر دکانوں میں ملتی تھی اسی کے چند ٹکڑوں کو پنیر کے بدرقہ کے ساتھ روانہ کر دیا کرتا، پینے کے لئے زم زم کا پانی تھا اور کبھی کبھی دکانوں میں پہونچ کر چائے کی ایک دو پیالیاں۔ مداخل کی کمی کی اس تدبیر سے مخارج کی فکر غیر معمولی حد تک کم ہو گئی اور جب کبھی ہوئی تو اس کے لئے بعض دوسری صورتیں نکل آئی تھیں جو صحیح طور پر اب یاد نہیں رہیں۔ باب ابراہیم کے متصل ایک مدرسہ ہے جس کے مہتمم قاری محمد اسحاق صاحب سے فقیر کی راہ ورسم حیدر آباد ہی سے تھی شاید ان کی دستگیری کام آئی یا اس ناگزیر ضرورت کے لئے اپنے ساتھیوں کی فرودگاہ رباط محروق تک جانے کی زحمت گوارا کرنی پڑی۔

بہر حال اپنے رفیقوں کا یہ آزاد کیا ہوا بندہ بے دام جو مزاجاً کہیئے یا عمداً اس زمانہ میں

دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند

والے مشہور قاعدے کے تحت زندگی گذار رہا تھا۔ ہر چیز سے بے پروا ہو کر چند روزہ مجاور حرم بنا ہوا چوبیس گھنٹے وہیں گذارتا تھا۔ منیٰ وعرفات وغیرہ کے لئے خیمہ خرگاہ، سواری شکاری اور دوسرے ساز وسامان کی دردسریوں کو اس ہوشیار دیوانے یا دیوانہ ہشیار نے اپنے دوستوں اور رفیقوں کے سر ڈال دیا۔ امتنان وتشکر کے جذبات آج بھی اپنے ان مخلص کرم فرماؤں کی طرف سے دل میں پاتا ہوں۔ سب سے زیادہ بار اس مسئلہ میں خاکساری کی طرف سے مولینا عبدالباری بے چارے کے سر پڑ گیا۔ وہ خود بھی تھے ان کے ساتھ ان کے والد ووالدہ بھی۔ مزید ایک ناکارہ کا اضافہ بھی ہو گیا۔ عرض کر دیا گیا تھا جو کچھ اپنے لئے کیجئے گا وہی سب کچھ اس دیوانے کے لئے کر لیجئے گا۔ خوشی کے ساتھ دیوانے کے اس "غم" کو اپنے قلب ودماغ میں انھوں نے جگہ دی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی ان قصوں اور ان کے

متعلقہ سوالوں کا خطرہ بھی میرے دل میں کبھی نہیں گذرا، کام سب ہو رہا تھا لیکن جس کے لئے ہو رہا تھا وہ بے غم ہو کر اپنے جنون و سرمستی کے تصوں میں غرق تھا۔ ایک دن مولانا عبدالباری صاحب نے فرمایا کہ آخر یہ خود غرضی کب تک؟ ایک رات حرم میں مولانا نے بھی گذاری اور حجر اسود کے متعلق ذاتی تجربات کا موقع ان کو بھی ملا ان ہی سے ان کے ذاتی تجربات کا حال دریافت کیا جا سکتا ہے: تا اینکہ یوم الترویہ کی تاریخ آگئی۔ ۸ ذیحجہ جب مکہ معظمہ سے حجاج منیٰ کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور شب منیٰ میں گذار کر ۹ کو عرفات کے تاریخی میدان میں پہونچتے ہیں

کب تک بے ہوش رہتا، ہوش میں آنا ہی پڑا۔ یوم الترویہ کی صبح ہوئی۔ بستر احرم سے اٹھا کر رباط محروق میں لے آیا، سمجھے ہوئے تھا کہ سواری کے اونٹ تیار ہی ملیں گے۔ سویرے اپنے رفیقوں کے ساتھ نکل جائیں گے ہمارے رفقاء بھی تیار بیٹھے تھے۔ مطوف صاحب .... جو خود مرحوم ہو چکے اور اب مطوفی کا کام ان کے صاحبزادگان والا تبار انجام دیتے ہیں عموماً ادھر کے حاجیوں کی قیادت و سربراہی ان ہی کے سپرد ہے اکثریت میرے قافلہ میں ادھر ہی کے بزرگوں کی تھی۔ ہماری نم دکنی ہونے کے باوجود اپنے کو فقیر نے ادھر ہی کے ان مطوف صاحب کے سپرد کر دیا تھا۔ بڑے خوشنما قطعی الفاظ کے مواعید وثیقہ کے ساتھ اپنے حاجیوں کو مطمئن کئے ہوئے تھے کہ وقت پر سواری اور بار برداری کے اونٹ آپ کی فرودگاہ پر پہونچ جائیں گے اور بسہولت تمام ٹھیک وقت پر سب کو لے کر روانہ ہوں گے۔ سب کام سے فارغ ہو کر صرف سوار ہو جانے کا ارادہ کر کے سب آٹھویں کی صبح کو بیٹھ گئے۔ دیدۂ انتظار مطوف صاحب کے بھیجے ہوئے اونٹوں پر لگی ہوئی تھی۔ ہر ہڑ بڑیا کھٹکا یہی سمجھ میں آتا کہ مطوف کے اونٹوں ہی سے اس کا تعلق ہے لیکن ہر سمجھ غلط ہی ثابت ہوتی رہی۔ احتیاطاً مقررہ وقت سے پہلے بھیجنے کا وعدہ تو خیر جب وقت پر بھی نہ اونٹ ہی پہونچے اور نہ پہونچنے کی توجیہ کرنے والی خبر ہی مطوف صاحب نے دربار سے ہم لوگوں تک پہونچی تو انتظار نے غم، اور غم بالآخر غیظ و غضب کے پارے تک چڑھ گیا۔ سب سے زیادہ متاثر ہمارے میر قافلہ مولانا عبدالماجد تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ حج سے فارغ ہو جانے گھر پہونچنے کے بعد بھی دماغی کوفت کے آثار و نقوش کا ازالہ مولانا کے دل و دماغ سے نہ ہو سکا، جو سفر حجاز میں بھی بالآخر کسی نہ کسی رنگ میں ابھر ہی پڑا، غریب مطوف کی رسوائیاں اس کتاب کی اشاعت کے بعد نہ صرف یہی کہ دور دور تک پہنچیں بلکہ ان کے پیشہ [۱] پر بھی اچھا خاصہ اثر پڑا، مطوف اور ان کے فرزندوں کو جس کی معذرت

[۱] مطوفی ایک پیشہ ہے۔ یہ شاعری نہیں بلکہ واقعہ کا اظہار ہے۔ ابتدا میں اس کا حال کچھ بھی ہو کتابوں سے اس کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔ واللہ اعلم اس پیشہ کا آغاز حجاز میں کب سے ہوا۔ شرم آتی ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں قریش کے جہلاء حجاج کا خیر مقدم میزبانوں کی حیثیت سے کرتے تھے۔ چندہ سے کعبہ کے ان مہمانوں کے لئے رفادہ (مہمان نوازی) سقایہ (آب رسانی) کا نظم کیا جاتا تھا (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

طلب کرنی پڑی۔

اپنے رفقا کے اس حال کو دیکھ کر جو دیوانہ تھا، اس کو اپنے جنون سے دست بردار ہونے پر مجبور ہونا پڑا، ہوش میں آکر عرض کرنے لگا کہ اجازت دیجئے تو مطوف صاحب کے مکان تک پہونچ کر واقعہ کا پتہ چلاؤں، ٹوٹی پھوٹی عربی میں گفتگو کی قدرت نے اس خیال پر مجھے بھی آمادہ کیا تھا اور اسی بنیاد پر دوسروں کو بھی اجازت دینی پڑی۔

ایک دلچسپ لطیفہ: جب چلنے لگا تو ساتھیوں میں ادھر ہی کے ایک رفیق جو عرفاً ننّے میاں کے نام سے پکارے جاتے تھے اپنی ہمشیرہ کے محرم بن کر حج کرنے آئے تھے۔ ضرورت سے کچھ زیادہ نیک بھی تھے اور جسم بھی ایسا پایا تھا جو بجائے طول کے عرضاً و عمقاً بسطۃً کی خصوصیت سے سرفراز تھا جس کی وجہ سے پیدل چلنے میں کافی صعوبت بھی ہوتی تھی، دم پھولنے لگتا، تاہم بے چارے یہ سوچ کر کہ تنہا مولوی کا جانا مناسب نہیں ہے میری رفاقت پر تیار ہوئے۔ راہگیروں سے پوچھتے پاچھتے سڑکوں سے گذر کر گلیوں میں پہونچے جو کافی پیچیدہ تھیں ننّے میاں نے دیکھا کہ مولوی کی امداد کا وقت آگیا، ادھر عربی میں راہگیروں سے فقیر دریافت کر رہا تھا، دیکھا کہ ایک طرف سے

"مکان عبدالقادر کجا ست"

کے سوال کی آواز آرہی ہے، پلٹ کر دیکھا تو ہمارے ننّے میاں کسی سے فارسی میں دریافت کر رہے ہیں جس سے پوچھ رہے تھے حیران تھا کہ کیا جواب دے۔ بے ساختہ ہنس پڑا، ننّے میاں! ایران نہیں آپ عرب کی گلیوں میں ہیں، تب چونکے، بے چارے نے خیال کیا کہ اُردو کی جگہ شاید ہر زبان سے کام نکل جائے گا۔

بہرحال یوں ہی گرتے پڑتے ہنستے ہنساتے ننّے میاں کے ساتھ اس مکان تک پہونچا جس کے متعلق بتایا گیا تھا کہ یہی ہمارے مطوف صاحب کا مکان ہے۔ اندر داخل ہوا زینے سے اوپر چڑھ گیا لیکن نیچے ہو یا اوپر مکان کے سوا کہیں مکین کا پتہ نہ تھا۔ حجاج کے تقاضوں سے بچنے کے لئے "خانہ بجاجی گذاشت" کر کے اپنے فرزندوں اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مقابلہ اس میں ہوتا تھا کہ مہمان نوازی میں کون کس پر سبقت لے جاتا ہے لیکن ہمارے "اسلامی دور" میں مسئلہ معکوس ہو گیا ہے اب حجاج کی حیثیت ان درختوں کی ہے جن کے پھلوں کے انتظار میں باغباں سال بھر گذارتا ہے۔ پھل نہ ملے تو پھر ان کے پتے اور لکڑیوں سے ممکنہ حد تک کام نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ بظاہر میرا خیال تو کچھ اور جاتا ہے کہ ہندوستان کے پنڈوں کے طرزِ عمل سے کچھ تاریخی تعلق مطوفی کے پیشہ کا ہے۔ تعجب نہیں ہندوستان ہی سے یہ لہر کسی نہ کسی شکل میں حجاز پہونچی ہو، اپنے مطوف صاحب سے عرفات کے میدان میں فقیر نے دریافت کیا کہ شیخ کہیئے پیشہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں آپ نے کوئی حج کیا ہے۔ آب دیدہ ہو کر خدا غریق رحمت کرے جواب دیا کہ شاید ساٹھویں دفعہ وہ عرفات میں آئے تھے لیکن واقعی حج کی نیت سے اب تک ان کا پیشہ ور انہ حج محروم ہی رہا۔ عرض کیا گیا مرنے سے پہلے ایک دفعہ تو حج ہی کی نیت سے حج کر لیجئے۔ وعدہ کیا کچھ ہی دن بعد ان کا انتقال ہو گیا شاید وعدہ پورا کر کے مرے ہوں رحمہ اللہ ۱۲

نمایندوں سمیت مطوف صاحب روپوش ہوگئے تھے، مایوس، ناکام، نامراد ہم دونوں واپس ہوئے۔ سارے رفقا دم بخود تھے۔ وقت تھا کہ بے رحمی کے ساتھ گذرتا جاتا تھا لیکن مطوف کے دل میں بھی رحم پیدا ہوا اس کی کوئی علامت کسی شکل میں سامنے نہیں آرہی تھی۔ حیران تھے کہ اب کریں تو کیا کریں۔

مارے انتظار کی غیر معمولی کوفت کے برداشت کرنے کے بعد کسی نہ کسی شکل میں سواریوں کی صورت سامنے آئی۔ اونٹ آئے سامان لادا گیا، ہم لوگ بھی شغدفوں میں لدگئے، مدینہ منورہ کا سفر تو لاری میں طے ہوا تھا، شغدف کی سواری کا یہ پہلا تجربہ ہم لوگوں کے لئے تھا کچھ ایسا خیال آتا ہے کہ شہری حدود تک پیدل ہی ہم میں کچھ لوگ روانہ ہوئے۔ ارادہ یہ کیا گیا کہ فنائے شہر سے نکل جانے کے بعد اونٹوں پر سوار ہوں گے۔ اس کا ایک فائدہ بھی ہوا، فائدہ کیا حج کی کرامت ہی اسے خیال کیجئے

ٹھیک جب مکہ معظمہ سے باہر نکل رہے تھے۔ شہر کے آخری کناروں پر کچھ دکانیں تھیں، میری نظر اچانک ایک دکان پر پڑی، دیکھا کہ سامنے ہرے ہرے رنگ کے کچھ پھل ہیں، آگے بڑھ کر دیکھا تو نیم خام قسم کے دس پندرہ لیموں تھے، یوں ہی بے سوچے قیمت پوچھی، جو بتائی گئی کچھ زیادہ نہ تھی۔ میں نے ان سارے لیموؤں کو اٹھا لیا۔ بڑا سا ایک بٹوا احرام کی چادر کے ساتھ میری کمر میں لٹکا ہوا تھا اسی میں ان ہرے ہرے تازہ لیموؤں کو بھر لیا۔ دام ادا کر دیا اس وقت سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے آخر یہ لیموں کیوں خرید کئے، لیکن بعد کو ثابت ہوا کہ "میرے اجل مسمیٰ کا یہ زور تھا، حالات جو پیش آئے عالم اسباب کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ یہ لیموں میرے ساتھ نہ ہوتے، تو اب تک جو جی رہا ہے خواہ کسی حال میں جی رہا ہو، وہ آج سے بیس اکیس سال پہلے ہی ختم ہو چکا ہوتا۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

بالآخر شہر مکہ کی آبادی ختم ہوگئی اور فقیر اپنے شغدف پر دوسرے رفیق فی الشغدف کے ساتھ چڑھ گیا جو غالباً مولانا عبدالباری صاحب کے والد ماجد مرحوم حکیم عبدالخالق صاحب تھے۔ اب میرا اونٹ بڑھتا چلا جاتا تھا ڈگ مگ، اونچے نیچے ہوتے ہوئے وہ تو منیٰ کے میدان کی طرف جا رہا تھا، اور یہاں دیوانے کے لئے وادیٔ مکہ کی ہواؤں کی سنسناہٹ نے "ہو" کا کام کیا، "روح" کو تو کیسے کہوں، کہ "روحانیت" والے ہی جانیں روح کیسے کھلتی ہے لیکن دماغ کے پٹ کھل گئے۔ مطالعہ کے معلومات مجسم و متشکل ہو ہو کر سامنے آنے لگے۔ اللہ کے خلیل ابراہیم اوّاہ (صلوات اللہ علیہ وسلامہ) کی اسی وادی میں آمد و رفت کا زمانہ ایسا معلوم ہوتا تھا، ماضی کے پردوں کو چاک کرکے مرے روبرو کھڑا ہوا ہے۔ ایک ایک واقعہ جس کا ذکر کتابوں میں کیا گیا ہے یاد آتا جاتا تھا، شکار کے لئے حضرت ابراہیمؑ کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام ان ہی میدانوں میں نکلتے ہوں گے، جراہمہ سے ان کے صہری تعلقات، جراہمہ کا دورِ حکومت، جراہمہ کے بعد عمالقہ کے جبر و زور کے افسانے، اسماعیلی نسل کی ملوکیت۔ ان کے گذرے ہوئے سلاطین، ان کے خزانے، ان کی معدنی دولت[۵]، ملوک بنی خزاعہ کا مکہ کی حکومت پر استیلا، خزاعی

---

[۵] حجاز کی معدنی ثروت اس زمانہ میں چونکہ امتیاز حاصل کر رہی ہے سکتے ہیں کہ عرب کی سرزمین کا نصف حصہ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

بادشاہوں میں عمرو بن لحی کا عہد اسلام سے تین ساڑھے تین صدی پہلے مکہ معظمہ میں ان اصنام کو لانا، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ابتدا ان کی عہد نوح میں ہوئی اور بقول سہیلی ہندوستان میں وہی بت اور مورتیاں کسی زمانہ میں پہونچیں سہیلی کے الفاظ ہیں کہ

وهذه اسماء سريانية	(عہد نوح کے ان ہی بتوں کے نام ہندوستان تک پہونچے
وقعت الى الهند فسموا بها	جو سریانی الفاظ ہیں، انھوں نے یہی نام اپنے ان بتوں کے رکھ دئے
اصنامهم التى زعموا انها صور	جنکے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ سبع سیارات کی مورتیں ہیں ان مورتیوں کی پیٹ میں
الدرارى السبعة وربما كلمتهم الجن	جن بھی کبھی داخل ہو کر بولتا ہے اور اسی بات نے ہندوستان
من جوفها ففتنهم ص ۶۳ ج ۱	کے باشندوں کو فتنے میں ڈال دیا۔[۵]

الغرض اپنے وطن ہند اور قدیم عرب کے ان تعلقات کے متعلق میرے پرانے مالی خولیائی خیالات جن میں ایک خیال وہ بھی ہے جس کا ذکر حافظ ابن قیم جیسے محدث جلیل نے اپنی مشہور کتاب کتاب الروح میں کیا ہے یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے کہ:- خير واد فى الارض وادى مكة و الوادى الذى بالهند ص ۱۰۱ کرۂ زمین پر سب سے بہتر وادی ایک تو مکہ کی ہے اور دوسری وادی ہندوستان کی ہے[۵]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) پتھروں سے معمور پہاڑوں کے سواد میں معدنی ذخیروں کا بھی سراغ مل رہا ہو اسی کو دیکھ کر تاریخ کے ان قصوں کو جھٹلانے کی اب ہمت نہیں ہوتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کمسنی کے زمانہ میں عبداللہ بن جدعان ایک مشہور جواد آدمی تھا۔ لکھا ہے کہ حاجیوں کے لئے شام سے گیہوں، شہد، کبھی کبھی دو دو ہزار اونٹوں پر منگوایا کرتا تھا کہتے ہیں کہ اس کی دولت کا تعلق جراہمہ کے ایک پوشیدہ خزانے سے تھا مکہ کی پہاڑیوں میں اتفاق سے اس کا پتہ چل گیا تھا، سہیلی نے روض الانف میں لکھا ہے کہ جراہمہ کی قبروں میں

• كوم عظيم من الياقوت واللؤلؤ والذهب والفضة والزبرجد (روض ص ۹۳) ایک بڑا تودہ اس کو ملا یاقوت موتی، سونا، چاندی اور زبرجد کا

پہاڑوں میں کھود کر قبروں کے بنانے کا طریقہ معلوم ہوتا ہے کہ فراعنہ مصر کی طرح ان میں بھی تھا۔ بہرحال اسی خزانہ سے جب جی چاہتا وہ کچھ لے آتا اور لوگوں میں کھانا کپڑے تقسیم کرتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ہے کہ بچپن میں اس کی دیگ کے سایہ کے نیچے دوپہر کی دھوپ سے مجھے پناہ ملتی تھی۔ یہ دیگ اس قدر اونچی تھی کہ اونٹ کا سوار اونٹ ہی پر بیٹھے بیٹھے اس سے کھانا نکال سکتا تھا۔

[۵] شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بھی اپنی کتاب النبوات میں اسی قسم کے ذاتی تجربوں کا دعوی کیا ہے میری کتاب الطاف تصوف میں جس کی تھوڑی تفصیل مل سکتی ہے [۵] حضرت علی کے اسی قول میں ہے کہ ہندوستان کی اسی وادی سے طیب یعنی خوشبو والی چیزیں عرب میں آئی ہیں۔ یہ بھی ہے کہ حضرت آدم اسی وجہ سے ہندوستان کی اسی وادی میں اتارے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب و ہند کے تعلقات پر بہت کم توجہ کی گئی ہے ورنہ روایاتی و تاریخی رشتے ان دونوں ملکوں کے حد سے زیادہ گہرے ہیں۔ قریش کے مشرکین کو اسی بنیاد پر عرب کے ہندو اپنی کتابوں میں فقیر نے قرار دیا ہے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بجز جزئی فضیلت کے اس قسم کے استرداد کی روایتوں کا معاد اور کچھ نہیں ملتا اسی لئے طرداً دکھا

عرب کے کھلے ہوئے اس میدان میں ذہن کو کھل کھیلنے بلکہ قندوں کے بھرنے کا خوب موقع ملا۔ اسی راستہ سے کتابوں میں لکھا ہے کہ یمن کے حبشی ہاتھی والے جو کعبہ کو گرانے کے لئے آئے تھے یعنی اصحاب فیل بھاگے تھے، اور اسی راستہ کی مختلف منزلوں پر جیسا کہ ایام جاہلیت کے شعراء نے ذکر کیا ہے حبشیوں کی لاشیں گل گل کر گرتی چلی جاتی تھیں جن کو پرندوں سے جھڑنے والی کنکریوں نے عصف ماکول (کھایا ہوا بھوسہ) گویا گوبر بنا کر رکھ دیا تھا۔

الغرض کتابوں میں پڑھے ہوئے تاریخی مقامات جو سنے ہوئے تھے اب دیکھے ہوئے بنتے چلے جا رہے تھے بڑھتے ہوئے سامنے قربانی کا وہ میدان (منحر) منیٰ نام والا بھی آ ہی گیا۔ اسی وادی میں دو باپ بیٹے ابراہیم خلیل واسمٰعیل ذبیح دونوں اللہ کے ان راستباز مخلص بندوں نے اس دین کا پہلا سنگ بنیاد نصب کیا تھا جس دین کے ماننے والوں کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ اپنا سب کچھ اسی کے سپرد انھوں نے کر دیا جس کا سب کچھ ہے جو قرآنی الفاظ

فلما اسلما وتلہ للجبین — جب دونوں باپ بیٹے مسلمان ہوگئے اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل پٹک دیا۔

کا کھلا ہوا اقتضاء و مفاد ہے، اسی دن کے "اسلما" نے اس دین کو پیدا کیا جس کا نام "اسلام" ہے

بہرحال ہم "اسلام" "سپردگی تام" "کلی تفویض" والی اس وادی میں آخر پہونچ ہی گئے۔ یہ ایک غیر آباد مقام تھا لیکن چند دنوں کے لئے دنیا کے بڑے سے بڑے شہر کی آبادیوں سے دعویٰ ہم سری کرنے لگتا ہے سنگین یک منزلہ و دو منزلہ مکانوں کی دو طرفہ قطاروں کی بیچ میں اوسط درجہ کی خام سنگریزوں سے بھری ہوئی ایک سڑک نکلتی ہے۔ صحیح طور سے یاد نہیں رہا یا دیکھنے کا موقع نہ ملا کہ اس سڑک کے دو رویہ مکانوں کا جو سلسلہ ہے، ان کے سوا بھی دوسری سمتوں میں مکانات ہیں یا نہیں، ہمارے اونٹ اسی مرکزی سڑک میں داخل ہوگئے۔ شروع میں ایک ترشے ہوئے پہاڑ کے پاس جمرۃ العقبہ ملا، جمال ہمارے اونٹ کا چلانے والا جو راستہ بھر "میزان" "میزان" کی صداؤں سے کان کو بہرہ کئے ہوئے تھا یعنی ہر تھوڑی دیر بعد ہم شغدف نشینوں کو حکم دیتا کہ وزن برابر رکھو، کسی ایک طرف زیادہ بار نہ ڈالو، اسی جمال نے

"شیطان الکبیر"[۱]

---

[۱] روایات میں جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ قربانی کے ارادے میں شیطان رہ رہ کر حضرت ابراہیم خلیل علیہ الصلوٰت والتسلیم کے قلب مبارک میں وسوسے ڈالتا رہا اور حضرت اسے دھتکارتے رہے اسی کی یاد میں ان مقامات کو علامتوں سے نمایاں کر دیا گیا ہے۔ عوام ان کو شیطان کے لفظ سے یہی وجہ ہے جو موسوم کرنے لگے۔ سیدنا الاستاذ الامام شیخ الہند رحمۃ اللہ سے درس حدیث میں فقیر نے یہ لطیفہ سنا تھا کہ ایک سادہ دل ترک سپاہی نے یہ سن کر کہ منیٰ میں کنکریوں سے شیطان کو لوگ مارتے ہیں کنکریوں کو ناکافی سمجھ کر بغل میں پستول دبائے پہونچا اور دن دن بجائے کنکریوں کے

یا ”بڑے شیطان“ کا نعرہ مارا، بڑے بڑے کے ہندی لفظ کا عربی تلفظ تھا جس سوا اس کے ہندی ہیں وہ ان کی رعایت کر کے عربی کا گویا ہندی میں ترجمہ کر رہا تھا اور اتنی ہندوستانی زبان (اردو) سے تقریباً مکہ اور مدینہ میں کاروبار کرنے والے بہرحال واقف ہوتے ہیں۔

وہ آگے بڑھا، اور شیطان اوسط، یا ”منجھلے شیطان“ کی علامت ایک مخروطی گول تودے کی شکل میں جو تھی اسی کے آس پاس کسی جگہ اونٹ کو ٹھہرالیا معلوم ہوا کہ ہم لوگوں کے اترنے کی جگہ منجھلے شیطان کے پڑوس ہی میں مقرر کی گئی الجنس الی الجنس یمیل کی ستم ظریفی کے سوا بخت و اتفاق کے اس دلچسپ حادثہ کی توجیہ اور کیا کی جائے۔

خیر اب جو کچھ بھی سمجھئے، اتارے گئے ہم لوگ ”منجھلے شیطان“ کے قدموں ہی میں۔ دن کا آخری حصہ تھا، جس طرح سبھوں نے گذارا ہم نے بھی گذارا، کوئی خاص بات قابل ذکر پیش نہ آئی صبح ہوئی۔ اونٹ موجود تھے۔ اب تلاش و جستجو کی حاجت نہ تھی۔ خیمہ خرگاہ سب لد گیا اور اس وادی کی طرف انسانوں کا سیلاب چل پڑا جس میں تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے نسل انسانی کی غیر معمولی تعداد اکٹھی ہوتی رہی ہے اور انشاء اللہ رہتی دنیا تک ہوتی رہے گی۔

چلے جا رہے تھے صبح کا سہانا وقت تھا، بے آب و گیاہ، بے سنگ و میل وادی کے ان چٹیل میدانوں میں جن میں شمالاً و جنوباً، شرقاً و غرباً پست پہاڑیوں کی قطاریں پھیلی ہوئی تھیں۔

خیال آتا کہ یہ کتنا بڑا میلہ ہے۔ پھر وسوسہ ہوتا کہ دنیا میں میلوں ٹھیلوں کی کیا کمی ہے قوموں کی یہ عام عادت ہے۔ دل جواب دیتا، دیکھنے کی بات یہ نہیں ہے کہ کتنے لوگ جمع ہوئے بلکہ سوچنے کا مسئلہ یہ ہے کہ انسانیت کا یہ اجتماع کس کے لئے ہو رہا ہے؟

ناچنے گانے بجانے، تھرکنے، پینے پلانے، کھل کھیلنے کے مخلوط و غیر مخلوط میلوں کو تو جانے دیجئے، دین اور دھرم کی چھاپ جن میلوں اور ٹھیلوں پر لگائی جاتی ہے یا لگی ہوئی ہے۔ دین ہی کے نام پر لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اس باب میں ان کا حال کیا ہے؟ واقعہ بتا رہا ہے کہ جمع ہونے والے جہاں کہیں بھی جمع ہوتے ہیں کسی مخلوق ہی کے نام پر جمع ہوتے ہیں۔ یلدا اور یلدلد کے داغ سے کسی کا دامن پاک نہیں۔

الّا یہ کہ

زمین کے اس سارے کرہ پر، ایشیا و افریقہ، یورپ و امریکہ کے بیچ میں عرفات ہی کے میدان کا میلہ وہ میلہ ہے جس میں اکٹھے ہونے والے بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ا۔

”کائنات کے خالق قدوس“

اور صرف کائنات کے خالق قدوس ہی کی بزرگی اور بڑائی کے نعروں کے ساتھ اکٹھے ہوتے ہیں اسی کے قدموں پر لوٹنے کے لئے زندگی کی ساری کوتاہیوں کی تلافی کے لئے چلے آتے ہیں، ہند سے سندھ سے، چین سے ماچین سے

ترکی سے تاجیک سے، مراکو سے قازان (روس) اور افریقہ کے مغربی و شمالی و جنوبی حصوں سے، تیونس سے سوڈان سے مصر سے اور لیبیا سے اور کیا کیا بتایا جائے کہ کہاں کہاں سے کن کن راستوں سے عمان و یمن سے ان دور افتادہ مقامات سے بھی جہاں اسٹیشن تک پہونچنے والے کبھی کبھی دو دو تین تین مہینوں میں پہونچتے ہیں[1] کچھ اسی قسم کے خیالات میں ڈوبے ہوئے ہم بالآخر اس

موقف اعظم

تک پہونچا ہی دئے گئے جہاں کے وقوف اور قیام کے بغیر حج کے قالب میں حج کی روح پیدا نہیں ہوتی، یہی حج کا رکن اکبر ہے جس کے بغیر کسی کا حج، حج نہیں ہوتا،

حد نظر تک جدھر دیکھئے گردن موڑئیے خیموں کے جنگلوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا خیمے ہی خیمے، نہ ایک درخت، نہ کوئی جھاڑی، نیچے ریت اوپر آسمان اور زمین کی پشت پر ٹلتا ہوں سے بھرے ہوئے حجاج کی بارگاہیں۔ شاید ہندوستانی حساب سے نو بجے کا وقت ہوگا ہمارا قافلہ اس مقام تک پہونچ گیا جہاں ہمارے مطوف صاحب نے ہمارے خیمے گڑوا دئے تھے۔ سب کے سب اپنے اپنے خیموں میں داخل ہو گئے میری نظر پانی بیچنے والے کے ٹین پر پڑی۔ غالباً چار آنے میں ایک ٹین قیمت بتائی گئی خرید لیا گیا اور اترنے کے ساتھ ہی اس پانی پیش کر کے رفقاء کی خدمت میں حاضر ہوا، آزادی کے پروانے کا پھر طالب ہوا لوگ فارغ ہوئے۔ ڈرایا گیا، تجربہ کاروں نے سمجھایا کہ اپنے خیمہ کے حدود سے نکل جانے کے بعد پھر اس کی طرف واپسی عرفات کی وادی میں ناممکن ہے لیکن بات سمجھ میں نہ آئی، دامن جھٹک کر نکل بھاگا، ساتھیوں میں کسی نے ساتھ نہ دیا۔ ابراہیم خلیل کی مسجد کا پتہ پوچھتے ہوئے بے سوچے بغیر کہ واپسی کی راہ کیا ہوگی آگے ہی بڑھتا گیا، ظہر کی نماز تک اس مقام تک پہونچ گیا جہاں کہا جاتا ہے اللہ کے خلیل نے اپنے مالک کے آگے ماتھا ٹیکا تھا اور جس تماشے کو ہم دیکھ رہے تھے اس کے لئے دعائیں مانگی تھیں یہی رہنمائی سجدہ گاہ اب مسجد ابراہیم کے نام سے ایک اچھی خاصی عمارت کی شکل میں موجود ہے۔ مسجد میں حجاج بھرے ہوئے تھے لیکن سیکڑوں کی بھی گنجائش جس مسجد میں بمشکل نکل سکتی ہے اسی میں لاکھوں کی سمائی کا سوال ہی کیا تھا چند عقل باختوں اور دیوانوں کے سوا بھلا یہاں تک اور کون پہونچتا۔ ظہر کی نماز تو اطمینان سے ادا ہوئی ظہر کا وقت، آفتاب سمت الراس سے ذرا سا ڈھلا تھا، غالباً مئی کا مہینہ تھا، عرب کا ریگستان، مسجد سے باہر نکلا اس ارادے سے کہ دھوپ اور لو کی تپش کی شدت سے پناہ لینے کے لئے جہاں تک جلد ممکن ہو اپنے خیمہ تک پہونچ جاؤں لیکن ع

منزل نہاں شد از نظر

چٹیل میدان میں نہ کوئی نشانی نہ علامت جس سے اپنی جگہ پہچانی جائے۔ ناسخن شنوی اور خود رائی کی سزا بھگتنی پڑی۔

---

[1] مغربی افریقہ کے حجاج جو عموماً آج کل حجاز میں تکرونی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں میں نے سنا ہے کہ ڈھائی تین مہینے میں وطن سے چل کر اسٹیشن تک پہونچتے ہیں وہاں سے ریل پر سوار ہوتے ہیں تکرونی حاجیوں کی کافی تعداد ہر سال حرمین میں حاضر ہوتی ہے ۱۲

اُف لق دق وادی کے اس خیمستان میں اس کا پتہ چلانا کہ مولینا عبدالماجد و مولینا عبدالباری کے خیمے کہاں ہیں الہام یا کشف کے سوا ناممکن تھا۔ بھٹکنے والا غریب دونوں سے محروم، دونوں آنکھیں تھیں اور دونوں ٹانگیں غنیمت تھا کہ چھتری ہاتھ میں تھی، شاید گھنٹے دو گھنٹے تک تلاش کا جذبہ غالب رہا لیکن کب تک؟ رفقا نے بھی جیسا کہ معلوم ہوا، واپسی کا انتظار کچھ دیر کر کے جانے والے کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ یہاں کوئی ڈھونڈتا؟ صبر کے سوا ان کے لئے چارہ ہی کیا تھا، دلچسپ کہئے یا دلدوز اتفاق یہ تھا کہ مسجد ابراہیم سے نکلنے کے بعد خدا ہی جانتا ہے کہ میلوں کا چکر ریگستان میں دیتا رہا اور ہر طرف آدمی ہی آدمی تھے، آدم زاد ہی تھے، سب مسلمان ہی تھے، اپنے دینی بھائی ہی تھے لیکن دل ہندی بھائی کو ڈھونڈتا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتا پھرتا تھا، کاش کسی ہندوستانی حاجی پر نظر پڑ جائے۔ ڈھونڈتا رہا لیکن صرف ڈھونڈتا ہی رہا، جو بھی سامنے آتے وہ مصری ہوتے یا مراکشی، بخاری ہوتے یا جاوی لیکن میرا ہندوستانی بھائی ناپید تھا، کس سے بولوں کس زبان میں بولوں ہمت ہی نہیں پڑتی تھی، گویا اس میرے لئے یہ سارے سامنے آنے والے بجائے بنی آدم کے بنی جان یا جن زادے بنے ہوئے تھے۔ ان کی توجہ میری طرف ہوتی، نہ میرے دل میں ان سے ملنے کی لپک پیدا ہوتی، لو کی شدت الامان الحفیظ تیز و تند گرم آتشیں جھونکوں پر جھونکے آتے، اور ایک نیم جان غریب ہندی ان ہی میں جھونک دیا گیا تھا۔ کلیجہ تک معلوم ہوتا تھا کہ لو کی حدت سرایت کر گئی۔ بسا اوقات زبان باہر نکل پڑتی چلتے چلتے کبھی کبھی یہ تماشا بھی پیش ہوتا کہ لو کی شدت سے بے جان غریب حاجی دیکھا کہ مر گیا ہے۔ رفقا ریت کو ہٹا ہٹا کر اس کو دفن کر رہے ہیں۔ ایک نہیں متعدد مقامات میں اس نظارے کو دیکھ دیکھ کر یقین ہو گیا کہ اسی وادی میں تڑپ کر اپنی جان اب تجھے بھی جان آفریں کے سپرد کرنی پڑے گی۔ جذباتی خیال آتا کہ اوروں کے ساتھ تو رفقا بھی ہیں جو مٹی کے نیچے نہ سہی ریت ہی کے نیچے مرنے والے کو دبا دیتے ہیں۔ ہائے تیری موت کہ دفن کرنے والا بھی کوئی نہیں، رات ہوگی میدان خالی ہو جائے گا تو درندے کا پیٹ اپنی قبر بنے گی۔ جو ہندوستان کے صوبہ بہار کے ایک گاؤں میں پیدا کیا گیا، کہاں آ کر کس جگہ گاڑا گیا؟ وسوسوں کا زور ہوتا کہ عقل سمجھاتی، کہ موت بہرحال موت ہے

چہ بر تخت مردن چہ بر روئے خاک

یہ تو صرف وہمی وسوسے ہیں کہ مرنے والا بیکسی کے ساتھ اس حال میں یا اس حال میں مرا، ہوائی جہازوں کے گولوں سے مرا تو توپ کیا، تلوار سے مرا تو کیا، بندوق کی گولیوں سے مرا تو کیا سچ تو یہ ہے کہ ایٹم بم سے بھی مرنے والے جو مر چکے یا ہائیڈروجن سے مار ڈالنے کی جو دھمکیاں انسانیت کو دی جا رہی ہیں، ہر حال میں مرنے والے مر ہی جاتے ہیں، زندگی کا ختم ہو جانا آخری انجام ہر مرنے والے کا یقیناً ایک ہی ہوتا ہے، ہاں، خاص مقاصد سے جذباتی جوش پیدا کرنے کے لئے موت کی ان شکلوں کو جن تعبیروں میں بھی پیش کیا جائے، یہ دکھایا جائے کہ محبوب کے زانو پر سر رکھ کر جان دیدی یا اسی موت کو بھیانک بنانے

کے لئے کہا جائے کہ دشمنوں نے پٹک کر ذبح کر دیا۔ لاش کو گھسیٹ کر کنوئیں میں ڈال دیا، کتوں کو کھلا دیا حالانکہ دیکھئے تو ہر حال میں مرنے کے سوا اور بھی کوئی نئی بات کسی حال میں بھی پیش آتی ہے۔ خیر کچھ بھی ہو حالات ہی ایسے تھے کہ ملفوظات کا خیال قدرتاً دل سے نکلنے لگا۔ جب دل خالی ہوا تو چاہئے یہی کہ ایسے خیال سے بھر جاتا جو مخلوق نہ ہو لیکن اب یاد نہیں کہ ہوا کیا، اور خلا ملا کے یہ قصے شائد گفتنی بھی نہیں۔ جو کچھ کہد یا گیا پڑھنے والے بس اسی کو غنیمت خیال کریں۔ بس اتنی بات یاد رکھنے کی ہے جب لُو کی شدت ہوتی، گرم ہوا کے آتشیں جھونکوں کا حملہ ہوتا جس کی وجہ سے پیاس سے حالت زبوں ہونے لگتی تو بیچ بیچ میں قہوہ خانے یا چائے خانے جہاں کہیں مل جاتے اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے عموماً وہ مل ہی جاتے تھے تو وہیں گھس جاتا اور کم از کم پانچ چھ فنجانوں کی کامل ایک براد (کتلی) سادہ چائے کی طلب کر کے پیتا لیکن کس طرح پیتا؟ اب سمجھ میں آیا کہ مکہ کے سواد کے آخری کنارے پر ہرے ہرے لیموں جو خرید وا کر کے میرے بٹوے میں ڈلوا دئے گئے تھے ان کی غرض کیا تھی لیموں یاد آئے وقفہ وقفہ سے ایک ایک لیموں نکالتا جاتا قہوہ خانہ کے مالک سے مانگ لیتا تراش کر کے لیموں کا عرق فنجان میں نچوڑ دیتا، پینے کے ساتھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نئی رُوح قالب میں واپس آگئی ۔اس موقعہ پر میرے لئے مکہ معظمہ کے یہ لیموں آب حیات کی گویا قدرتی کپیاں بن گئے تھے جن کا ایک ایک قطرہ امرت کا کام کر رہا تھا۔ ہر براد (کتلی) میں چار پانچ فنجانوں کی چائے عموماً ہوتی۔ چائے کی رُوح افزا خوشبو، شکر اور عرق لیموں کی ترشی کا یہ چاشنی دار آمیزہ کیا بتاؤں کہ کن خوشگواریوں کو پیدا کرتا تھا۔ زمانہ گذر گیا لیکن کام و دہن میں اب بھی ان کی یاد ہلچل پیدا کر دیتی ہے ان سفری قہوہ خانوں میں پینے والوں کا تانتا ہی بندھا رہتا تھا، دیر تک اسی لئے پناہ لینے کی ان میں بھی گنجائش نہ تھی، قبل اس کے کہ قہوہ خانہ کا عرب یا بدوی مالک اُٹھ جانے کا حکم دے، خود ہی اٹھ جاتا، آگے پیچھے، دائیں بائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے، بڑے بھی چھوٹے بھی، چاہتا تو ان میں سے کسی میں گھس جاتا، لیکن کاش ہندی کا خیمہ ہوتا، اس آرزو کے سوا کوئی بات بن نہ آئی۔ مرحوم ڈاکٹر اقبال کے تجریدی تفریدی فلسفہ کے زیر اثر وطنیت کے رشتہ کی اہمیت مدت ہوئی دل سے نکل چکی تھی۔ لیکن آج وہی بھولا ہوا رشتہ عرب کے میدان، عرفات کی وادی میں یاد آیا، اب سمجھتا ہوں کہ عقلی ہوں یا جذباتی جو لہریں بھی ہماری فطرت میں اُبھرتی رہی ان میں کوئی بے کار بے معنی لغو نہیں ہے صرف استعمال کی غلطی سے وہ غلط ہو جاتی ہیں۔

آفتاب کی تمازت بہ تدریج جیسا کہ چاہئے تھا کم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ بھیڑ کے بعد مرے دل کا آخری سہارا حدت و شدت کی یہی کمی تھی۔ دن جیسے جیسے ڈھل رہا تھا، حاجیوں کے خیموں میں اسی نسبت سے دیکھا کہ شور و غل بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہزارہا ہزار میلوں کی مسافت طے کر کے سفر کے صعوبات کو برداشت کر کے غیر معمولی قربانیوں کے بعد

پہونچنے والے جس مقصد سے معرفت و عرفان کے اس میدان تک اپنے آپ کو پہونچانے میں کامیاب ہوئے تھے، جس طرح ممکن ہو چاہتے تھے کہ اسی مقصد و مراد سے دامن کو بھر لیا جائے۔

ایک طرف دن بھی پگھلتا چلا جا رہا تھا اور اسی نسبت سے دل بھی پگھل رہے تھے۔ اللہ اللہ خیموں کے اندر کی چیخ پکار، گریہ و بکا، نالہ و زار، توبہ و استغفار، شاید زمین بھی کانپ رہی تھی، آسمان بھی تھرا رہا تھا، آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے بے گانہ ہوتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی مخلوق کو دوسری مخلوق کی خبر نہیں ہے۔ سامنے سب کے گویا صرف ان کا ارحم الراحمین، غافر الذنب، قابل التوب، الغفور الرحیم خالق کے سوا کوئی دوسرا باقی نہ رہا تھا۔

اپنے وجدان کے شخصی آئینے میں مجھے تو کچھ ایسا دکھایا جا رہا تھا کہ ہر ایک کا ماضی، حال کے مرقع میں کھنچ کر ہر ایک کے سامنے گویا کھڑا ہے۔ غیر کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا لیکن قرآنی آیت۔

یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرا و ما عملت من سوء ہر شخص نے جو کچھ بھلا برا کیا ہے اس دن اس کو حاضر پائے گا

میں سُوء (برائی) کے جس ثانوی بروز و ظہور کی اطلاع دی گئی ہے اسی واقعہ کی ایک جھلک آج دکھائی جا رہی تھی اور یوں اس حال میں۔

یوم یصدر الناس اشتاتا لیروا اعمالھم اس دن واپس ہوں گے لوگ بکھرے ہوئے تاکہ دیکھیں اپنے کرتوتوں کو

کا استقبالی نظارہ بھی جھانک رہا تھا، گویا یوں سمجھیے کہ ماضی حال اور حال مستقبل بنا ہوا تھا۔ تینوں زمانے ایک دوسرے میں آج مدغم اور مندرج ہو کر ایک ناقابل بیان کیفیت کو پیدا کئے ہوئے تھے۔

دیوانوں کے لئے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ "ہو، بس" ہوتی ہے۔ پھر جہاں ہا و ہو، شور و غل کے ہنگاموں کا یہ حال ہو سوچا جا سکتا ہے کہ عقل سوختوں پر ان کا کیا اثر ہو سکتا تھا، جاننے پہچاننے والے رفیقوں کے لئے "مجہول مطلق" بن جانے یا بنا دئے جانے کی زحمت میں رحمت کا جو مخفی پہلو تھا، اب سامنے آیا۔

اخذته العزة بالاثم پکڑ لیا عزت (کے خیال) نے اس کو گناہ کے ساتھ

کے نفسیاتی نرغہ کی جڑ ہی گویا کٹ چکی تھی، مولویت، بزرگی و فیسریت خطابت، اور خدا جانے اور کیا کیا بلا اس قسم کے جتنے لفافے اوپر سے چڑھے ہوئے تھے، پھٹ پھٹ کر عرفاتی جھونکوں کے نذر ہو چکے تھے۔

کتابوں میں وادی عرفات میں آنے والی عرفانی ہستیوں کے جو تاریخی اقوال یا نعرے پڑھنے میں آئے تھے ایک ایک کر کے آج یاد آتے چلے جاتے تھے، سب سے زیادہ دھمکنے والا جس پر سر دھن رہا تھا وہ اس راہ کے مشہور راہی فضیل بن عیاض نور اللہ روحہ و مزیجہ کے قلب مبارک کی پکار اسی وادی میں اسی دن، ان کی جان کی بولے پناہ کراہ: واسوأتاه وان غفرت لی ہائے رے میری رسوائی خواہ تو مجھے بخش ہی کیوں نہ چکا ہو۔

یاد آ آ کر تڑپا تڑپا دیتی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ ابل ابل کر فطرت کی باطنی گہرائیوں سے "واحسرتا! علی ما فرطت"

فِي جَنْبِ اللّٰهِ وَإِنْ كُنْتُ لَمِنَ السَّاخِرِينَ　　افسوس ہے اپنی ان زیادتیوں پر جس کا اللہ کے پہلو میں مرتکب ہوا اور تھا مذاق اڑانے والوں میں۔

کی موجیں باہر آکر ندامت و خجالت میں غوطے پر غوطے دینی پہلی بار رو رہی تھیں اور کیا کیا بتایا جائے کہ کن کن پر کیا کیا گذر رہا تھا۔ اب آفتاب مغربی افق کے آخری کنارے تک پہونچ چکا تھا، کلیجے خون تھے، آفتاب سرخ تھا، حسرت و یاس کی نگاہ سے ۹ ذی الحجہ کے اس تاریخی دن کو ہر ایک رخصت کر رہا تھا، زندگی بھر کا سودا تھا جو آج چکایا جا رہا تھا، آنے والوں کو یہاں تک پہونچنے کا موقعہ خدا ہی جانتا ہے کہ کیسے مل گیا تھا۔ کون جانے کہ ختم ہونے کے بعد عرفات کے اس میدان میں مغفرت و آمرزش عام کے اس پاک دن کے گذارنے کا موقعہ ملے گا، بے ساختہ سینوں سے چیخیں نکل رہی تھیں بلبلانے والے بلبلا رہے تھے رونے والے چلا رہے تھے۔ گو دوپہر اور ظہر کی تمازت کے لحاظ سے نسبتاً وقت ٹھنڈا ہو چکا تھا لیکن ظاہر ہے کہ مئی کے مہینے کی یہ شام مئی ہی کے مہینے کی شام تھی۔

اچانک عرفاتی فضا میں ابر کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا، آفتاب ڈوب رہا تھا اور ابر کا یہ ٹکڑا پھیل رہا تھا چند لمحوں میں وہی وادی جو میلوں میں پھیلی ہوئی تھی اچانک گھنگھور گھٹاؤں کے سائے میں آگئی۔ جو نہی کہ ٹپ ٹپ کا سلسلہ شروع ہوا خیموں والے خیموں کی طرف، خرگاہوں والے خرگاہوں کی طرف بھاگنے لگے لیکن ہائے اس مسافر بیکس کی بے کسی جس کے پاس خیمہ بھی تھا، اور ڈیرہ بھی، اس کے دوست بھی تھے اور ساتھی بھی، آج سب سے بچھڑا ہوا کالے کپڑے کی ایک ہلکی سی چھتری کے سوا لاکھوں لاکھ سے بھرے ہوئے اس میدان میں "پناہ" کا کوئی ٹھکانہ نہیں رکھتا، کہاں جاتے۔

کچھ پتہ نہیں کہ بڑھتے ہوئے یہ بارش جس کا سلسلہ بتدریج شدت پذیر تھا کہاں تک پہونچنے والا ہے۔ احرام کی دو چادروں کے سوا کوئی دوسرا کپڑا بھی پاس نہیں، عاریت میں ملنے کی توقع نہیں۔ قہوہ خانے والوں کی مشتی علیحدگیوں کا اندیشہ ادھر بھی رخ کرنے میں مانع تھا۔ جہاں تک یاد آتا ہے، جس کے بھروسہ کے سوا ہر بھروسہ غلط تھا اسی کے بھروسے پر کالی کپڑے والی چھتری ہی کے نیچے کسی جگہ بیٹھ گیا، بادل گرجنے لگے بجلیاں کڑکنے لگیں، نم ناک سرد جھونکے، جلے بھنے کلیجے میں بشاشت و نشاط کی نئی زندگی پھونک رہے تھے، اندیشہ تھا کہ برسے گا اور خوب برسے گا، آغاز اسی رنگ میں ہوا لیکن اگر حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو کہہ سکتا ہوں پندرہ بیس منٹ سے زیادہ صحیح معنوں میں بارش کا سلسلہ باقی نہ رہا، ایک طرف سے بارش آئی اور عرفات کی وادی کو تر کرکے نکل گئی، شاید کچھ پہاڑی نالے بھی بہہ پڑے پھر بھی چھتری کی پناہ کافی ہوگئی، کپڑے کچھ بھیگے ضرور لیکن بر داشت سے زیادہ ان کی تری نہیں پہونچی تھی۔

اب آفتاب ڈوب چکا تھا، اونٹوں والے، گدھوں والے، اپنی اپنی سواریوں پر مغرب کی نماز پڑھے بغیر

اس نیت سے کہ مزدلفہ میں عشاء کی نماز کے ساتھ جمع کرکے دونوں وقتوں کی نمازوں کو ادا کرکے سنت نبویہ کی تعمیل کی سعادت حاصل کریں گے، چل پڑے۔ ان ٹانگوں کے سوا قطع مسافت کا کوئی دوسرا ذریعہ جس کے پاس نہ تھا۔ اس تماشے کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ اب وہ کیا کرے ٹانگوں کی سواری کے مسافروں کی کمی نہ تھی۔ گرجنے لگی، کہاں میں۔

ثم افیضوا من حیث افاض الناس　　　پس بڑھو اسی جگہ سے جہاں سے عوام الناس چل پڑے

کی قرآنی آواز اور الناس کی عملی جھلکیں جدھر سب جا رہے تھے۔ ریگستانی ریت میں پاؤں پھیلے دھنستے تھے لیکن آسمانی چھڑکاؤ نے اس مسئلہ کو بھی آسان کردیا، اور قرآنی آیت۔

یثبت بہ الاقدام　　　تاکہ جمادے پاؤں کو

کا مطلب اب سمجھ میں آیا کہ بارش کے افادی پہلوؤں میں ایک فائدہ تثبیت اقدام کا بھی ریگستانی علاقوں میں ہے۔

راستہ میں ہر ایک دوسرے کو بشارت دیتا چلا جا رہا تھا۔ یوم عرفات کے ٹھیک اختتام کی پاک گھڑیوں میں باران رحمت کا جھل رحمت کے دامن میں نزول سمجھا گیا کہ نیک فال تھی۔ قول سے نہیں فعل ہی سے رضامندی کے نتیجے کو امیدواروں کا حسن ظن پیدا کر رہا تھا۔ دلچسپ بات اس سلسلے میں یہ تھی کہ جن ہندیوں کے حصے میں عرفات سے پیدل افاضہ کی سعادت حاصل ہو رہی تھی۔ سنا کہ باہم ایک دوسرے کو یا الحاج کے جدید لقبی اضافہ سے پکار رہے ہیں راستہ میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوکر مبارکبادیاں دیتا چلا جاتا ہے۔ یا الحاج محمود، یا الحاج محمد، یا الحاج علی ان ہی آوازوں سے کان معمور تھے۔

چل پڑنے کی حد تک گو پیدل چل پڑا لیکن رات بھر اور وہ بھی جن حالات میں مسلسل جو گویا پیدل چلتا ہی رہا تھا۔ قہوہ خانوں کی ہلکی سی کرایہ کی نشست کے سوا بیٹھنے کا موقعہ مشکل ہی سے ملا تھا۔ یاد نہیں کہ کہاں کہاں بھٹک بھٹک کر پہونچا۔ اتنی بات یاد رہ گئی ہے کہ جہاں نہر زبیدہ کے صاف شفاف پانی کے بڑے بڑے لمبے حوض بنے ہوئے تھے۔ وہاں تک بھی پہونچا، اسی سلسلہ میں اپنی گذر اس جگہ بھی ہوئی جہاں پر لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ جلالۃ الملک ابن سعود سلطان نجد وحجاز وقوف فرما ہیں۔ میری نظر تو نہیں پڑی لیکن مجمع والے کہہ رہے تھے کہ خطیب اونٹ پر سوار ہوکر خطبہ مسنونہ سلطانی موقف کے قریب کسی پہاڑی پر پڑھ رہا ہے لیکن نہ میری آنکھوں نے خطیب کو دیکھا اور نہ کانوں تک خطبہ کی آواز پہونچی۔ کچھ بھی ہو خیال یہی ہے کہ اپنی تنہائی کے ان اوقات کو گذارنے کے لئے شاید وادی عرفات کے طول وعرض میں گھومنے اور کہہ سکتا ہوں کہ اس مبارک وادی کے اکثر حصوں میں وقوف کا شرف من حیث لا یدری غالباً میسر آگیا۔

بہرحال چلنے کی حد تک گویا پیادہ افاضہ کی شکل میں سب کے ساتھ شریک ضرور تھا لیکن بار بار جی چاہتا تھا کہ کاش کوئی سواری مل جاتی، لیکن سواری ملنے کا امکان ہے؟ اس سوال کی بھی ہمت اپنے غیر ہندی نامانوس ساتھیوں

سے نہیں ہوتی تھی، البتہ دیر سے کبھی کبھی کان میں ایک آواز گونجتی تھی لیکن صرف آواز؟ آواز کے الفاظ کیا ہیں اس کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ الفاظ عربی کے ہیں اس سے زیادہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، آخر دل کڑا کرکے اپنے ایک ہم دوش ہم سفر ساتھی سے جو غالباً کوئی بدوی عرب تھا، دریافت کیا کہ آواز لگانے والے کیا کہہ رہے ہیں۔ تب اس نے بتایا کہ

"یا رواکبا ، یا رواکبا!"

یعنی (اے سواری پر چڑھنے والو اے سواری پر چڑھنے والو) کے الفاظ کو خاص ندائی صورت میں ادا کر رہا ہے سواری کے حاجت مندوں کو بلا رہا ہے۔ اس تفسیر کے بعد اب میرے کان بھی یا رواکبا ہی سننے لگے۔ ورنہ اس سے پہلے اس مبہم و مجمل آواز پر خدا ہی جانتا ہے کتنے عربی الفاظ کو میرا ذہن منطبق کر چکا تھا، سوار ہو جانے کا بھی امکان ہے! بدوی کی اس اطلاع سے فائدہ حاصل ہوا۔ اب بلند ہونے والی ان آوازوں کی طرف میری توجہ ہوئی تاک کر ایک آواز لگانے والے شتر سوار کے پاس پہونچ گیا اور عربی ہی میں مخاطب کرکے کہنے لگا۔ ہاں میں سوار ہونا چاہتا ہوں شتر سوار نے پوچھا کہ مزدلفہ میں کس جگہ اترو گے؟ کیونکہ کرایہ کی مقدار کا اندازہ مسافت کی مقدار سے ہو سکتا تھا۔ میرے لئے شتر سوار بدوی کا یہ سوال، جذر اصم بن گیا، کیا جواب دوں، ایک مسافر جس کی نہ کوئی منزل ہے اور نہ مسکن، مراخیمہ مطوف صاحب مرے ساتھیوں کے قافلہ کے ساتھ خالی واپس لئے چلے جا رہے ہونگے یا ممکن ہے کسی کو سوار کر لیا ہو لیکن میں کیا جانوں کہ مرے رفقاء کہاں اتارے جائیں گے؟ میلوں میں پھیلی ہوئی مزدلفہ کی وادی، جس سے کسی قسم کی سابقہ واقفیت نہیں، یہ حالات ہی ایسے تھے کہ بدوی کے سوال سے ہچکا ہو کر رہ گیا۔ پھر کچھ سوچ کر جواب دیا کہ جہاں تمہارا جی چاہے کسی مناسب مقام پر حاجیوں کے درمیان مجھے اتار دینا۔ اب یاد نہیں اس نے کرایہ کیا مانگا، روپیہ دو روپیہ بس کچھ خفیف ہی سی رقم تھی۔ بٹوے میں لیموؤں کے ساتھ کچھ رپے بھی سعودی سکے کے پڑے ہوئے تھے جو کرایہ کے لئے کافی ہو سکتے تھے راضی ہو گیا۔

ایک عرفاتی فتنہ: آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ کچھ ابر کی وجہ سے بھی تاریکی معمول سے زیادہ تھی۔ اونٹ جب بٹھایا گیا تب معلوم ہوا کہ اسی اونٹ پر جمّال نے کسی کو سوار کر رکھا ہے اور مجھے ردیف کی حیثیت سے اسی اونٹ کی پشت پر بیٹھنا پڑے گا، زندگی میں شتر سواری کا موقع کبھی نہیں ملا تھا۔ ڈرتے کانپتے ہوئے کسی طرح پہلے سوار کے پیچھے بیٹھنے کی حد تک تو بیٹھ گیا، اونٹ کھڑا ہو گیا تاریکی کی وجہ سے صحیح طور سے شخصیت اس سوار کی متعین نہ ہو سکی جس کا مجھے ردیف بنایا گیا تھا لیکن جوں ہی کہ قدم اونٹ نے بڑھایا آگے بیٹھے ہوئے سوار نے مخاطب کرتے ہوئے صاف شستہ اردو میں کچھ دریافت کیا آواز ہی سے میں چونکا، اس میں یہی نہیں کہ نسوانی خصوصیت نمایاں تھی بلکہ نسوانیت کے ساتھ شبابی کیفیتوں سے بظاہر وہ لبریز تھی۔ دماغ چونکا، پوچھا آپ کون ہیں؟ جواب میں جو کچھ کہا جا رہا تھا اور جس طریقہ سے کہا جا رہا تھا میں تو سناٹے میں آگیا، اونٹ کی نئی نئی سواری (غیر شعوری) کی وجہ سے اعصاب یوں ہی متاثر تھے اور اب اس احساس

کے ساتھ کہ مجھے کسی جوان ہندی خاتون کا ردیف بنا دیا گیا ہے، میرے ہوش اڑ گئے، کچھ دیر کے لئے تو مبہوت سا بنا رہا اور خاتون صاحبہ فصیح و بلیغ اردو میں فراٹے اور طرارے بھرتے ہوئے خدا ہی جانتا ہے کہ کیا کچھ فرماتی چلی جا رہی تھیں وہ کون ہیں، ان کا وطن کہاں ہے کن کی صاحبزادی ہیں، حجاز تک پہونچنے کی وجہ کیا ہے۔ بظاہر یو.پی شاید الہ آباد انھوں نے اپنا آبائی وطن بتایا تھا۔ بہر حال مبہوت ہونے کے بعد جب ہوش آیا تو اس کے سوا کوئی فکر مجھ پر مسلط نہ تھی کہ ردافت کے اس شرف سے محرومی کا موقعہ جہاں تک جلد جس طرح بھی ممکن ہو میسر آئے دل دھڑک رہا تھا اور بار بار بخاری والی مشہور روایت یاد آ رہی تھی یعنی حج کے موقعہ پر یمن کے قبیلہ خثعم کی ایک خاتون سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ سلم کے سامنے اس وقت آئی جب آپ حضرت عباس کے بڑے صاحبزادے فضل بن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اپنے عم زاد نوجوان بھائی کو ردیف بنائے ہوئے عرفات ہی سے واپس ہوئے تھے، خثعمیہ خاتون اپنے پیغمبر سے حج ہی کے متعلق ایک مسئلہ دریافت کر رہی تھی جواب دیتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا نوجوان ردیف فضل بن عباس کی نظر بار بار مسئلہ دریافت کرنے والی خاتون پر پڑ رہی ہے جو خود بھی دیکھنے والے کی طرح عمر کے شبابی حدود سے متجاوز نہ ہوئی تھیں۔ دیکھا گیا تھا کہ فضل بن عباس کے کان کی لو کو پکڑے ہوئے ان کے سر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسری طرف پھیرتے ہیں اور فرماتے جاتے ہیں کہ بھائی!

انّ ھذا یوم من ملک فیہ سمعہ و بصرہ و لسانہ غفرلہ (بخاری) — آج کے دن[1] جو اپنے کان اور اپنی نگاہ اور اپنی زبان کا مالک ہوا وہی بخشا گیا،

خیال یہی آیا کہ آدم کے بچوں کو مغفرت اور رحمت حق سے محرومی کی ابلیسی کوششوں کی شاید یہ کوشش ہو، اس کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مجھ جیسے سست ارادہ فاقد العزم ناتوانوں کے لئے اتنا بڑا نظم کیا گیا ہو، جس غریب کو گرانے کے لئے شیطان کا دوامی تجربہ یہ ہو کہ ہلکا سا ہلکا جھٹکا ہمیشہ کافی ہوا، بن ایدی یعنی سن ملکہ ہو کر سینہ تانے بغیر کسی جھجک کے جس کے سامنے بارہا آیا اور کامیاب ہوا اسی کے لئے خلف یا یمین و شمال سے آنے کی ضرورت ہی کیا تھی، خلفی و یمینی و شمالی گھاتیں تو ان کے لئے کرتا ہے جن کے متعلق سمجھتا ہے کہ ٹر در ٹر وہو کر جن سے مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صورت جو پیش آئی تھی وہ کافی خطرناک تھی، نگاہوں کی حفاظت کے لئے تو بعون اللہ و توفیقہ رات کی تاریکی کافی ہو گئی اور سماعت کے متعلق بھی کہہ سکتا ہوں کہ کانوں نے خود سننے کا ارادہ نہ کیا بلکہ اتفاقاً سنا دیا گیا۔

بہر حال ابتلاء و آزمائش کے میدانوں میں اترنا تو دور کی بات ہے اس امتحان و ابتلاء کے لفظ کے سننے کی بھی جس بیچارے کو نوبت نہ آئی ہو خفی الطاف کے لطف خفی ہی کے نیچے جس کی ساری زندگی گذری ہو، الطاف مخفیہ کے تجربات کے سوا جن کے

---

[1] قانونِ حجاب کی سختیوں پر اصرار شدید کے باوجود حج کے موقعہ پر بعض دستیں عورتیں کے مسئلے میں جو نظر آتی ہیں خصوصاً چہرے کو بے نقاب رکھنے کا حکم جو عورتوں کو دیا گیا ہے شاید کچھ ابتلائی و امتحانی معاملات ہی سے اس کا تعلق ہے ۱۲

پاس کچھ نہ ہو اور سچ پوچھیے تو اپنے پاس پہلے کچھ تھا نہ اس وقت کوئی دوسری بات کام آئی اور آج تک انہی حالات سے گزرتے ہوئے قبر کے قریب ہوتا چلا جا رہا ہے۔

بہرحال تنبیہ اور پونک کے بعد پہلا ارادہ تو یہی ہوا کہ اونٹ سے کود پڑوں لیکن اونٹ سے کودنے کے نتائج سے ناواقفیت روک بن گئی۔ الحاح کے ساتھ شتربان (جمال بدوی) سے کہنے لگا اونٹ بٹھا دو، اس اونٹ پر بس ایک قدم آگے بڑھ نہیں سکتا۔ بدوی بھی حیران تھا اور رنشا بد بھا در ہندی خاتون بھی میرے اس بودے پن پر حیران تھیں کچھ دہتی بھی رہیں لیکن اتر جانے کے سوا کسی دوسری چیز کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ مرے اس حال کو دیکھ کر بدو بھی نرم پڑ گیا، اونٹ بٹھا دیا گیا، اتر پڑا، بدوی نے ایک دوسرے اونٹ کی طرف اشارہ کیا جو شاید اسی حلقہ سے تعلق رکھتا تھا حکم دیا کہ اسی پر بیٹھ جاؤں، اونٹ بٹھایا گیا، چڑھ گیا، اب بھی بجائے انفراد کے پھر وہی ردافت کا قصہ پیش آیا، تاہم جس کا ردیف اس اونٹ پر بنایا گیا تھا بجائے عورت کے وہ مرد نکلے، اب اطمینان تھا، آگے بڑھے، قدرتاً کچھ ہم کلامی کا سلسلہ شروع ہوا، حیرت ہوگئی جب میرے عربی سوال کا جواب انھوں نے بھی اردو میں دینا شروع کیا، معلوم ہوا کہ صرف یہی نہیں کہ وہ ہندی ہیں بلکہ سعودی میں وہ بھی اسی طرح معلم الصبیانی کا پیشہ کرتے ہیں جیسے فقیر سعد عثمانی (جامعہ عثمانیہ) میں بچوں کی پڑھونی کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھا، دلچسپ باتیں ہونے لگیں، زیادہ دیر نہیں لگی کہ ہم مزدلفہ کی اس وادی میں پہونچ گئے، جس میں جس طرف دیکھیے پٹرومکس کے عنصری فانوسوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا اور انسانیت ان ہی کی روشنی میں ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔ جیسا کہ وعدہ تھا کسی جگہ جہاں چاروں طرف حجاج ہی حجاج تھے، جمال (شتربان) نے اتار دیا ہم بھی اُتر گئے، رات کا کچھ حصہ گذر چکا تھا، پہلی فکر نمازوں کی ہوئی۔ جو کسی طرح ادا کر لی گئیں بیٹھے ہوئے اونٹوں کے قطاروں میں ایک کھلی زمین پر بیٹھ گیا۔ زمین بارش کی وجہ سے تر تھی لیکن کہاں جاتا، مرے لئے کوئی جگہ بھی ہو۔ آلتی پالتی مار کر وہیں بیٹھ گیا، کچھ بھوک لگی، سامنے کے چائے خانے میں چند بسکٹوں کے ساتھ چائے پی۔ اب ناگزیر تقاضے نے ستانا شروع کیا، کہاں جاؤں، کدھر جاؤں، انسانی آنکھوں کے دریچے ہر طرف کھلے ہوئے ہیں۔ ادھر اُدھر بھٹکنے کے بعد آخر ایک بدوی ہی سے اپنی ناگزیر ضرورت کا اظہار کیا، عرب کے یہ بدوی باہر سے جیسے کچھ بھی معلوم ہوں لیکن تجربے نے ہمیشہ یہی ثابت کیا کہ غیر معمولی چلبلی طبیعت رکھتے ہیں۔ انتہائی بے تکلفی کے ساتھ اس نے سامنے کی کسی جگہ کی طرف اشارہ کرکے کہا وہیں بیٹھ جاؤ، میں نے کہا بھائی! انسانوں کے اس ہجوم میں؟ بے ساختہ اس کی زبان سے اس وقت جو فقرہ نکلا اب تک حافظہ میں محفوظ ہے۔ بولا

اجلس الحاج لا یستحی　　　　بیٹھ بھی جاؤ حاجی نہیں شرماتا

مجھے بھی بے ساختہ ہنسی آگئی، اس کے مشورے پر جیسا کہ چاہئے تھا عمل کرنے کی جرأت تو نہ ہوئی لیکن تاکتے جھانکتے

اونٹوں کی آڑ لے کر ضرورت پوری کی گئی، اسی سلسلہ میں دلچسپ سوال "پانی" کا تھا، کوئی لوٹا، برتن میرے پاس نہ تھا، کیا کروں؟ کسی قہوہ خانے میں پہونچ کر شربہ (صراحی) کے لے جانے کی اجازت چاہی، مالک قہوہ خانے نے اجازت نہ دی تب میں نے چھتری جو ظاہر ہے مٹی کی صراحی سے یقیناً بہت زیادہ قیمتی تھی، اسی کو رہن رکھ کر صراحی پانی کے ساتھ حاصل کی لیکن آڑ کی جگہ تلاش کرتے ہوئے اس قہوہ خانے سے اتنا دور نکل گیا کہ واپسی کے بعد پھر وہاں تک پہونچنا میرے لئے ناممکن تھا۔ صراحی کو چھتری کا کافی معاوضہ خیال کر کے چھتری کا خیال دل سے نکال دیا۔ دریافت کرتے ہوئے مزدلفہ کی مسجد مشعر حرام پہونچا، صبح کی نماز جو مسلسل دو ادا ہوئی، نماز کے بعد منیٰ کے لئے حاجی چل پڑے، پیادہ پا حاجیوں کے ساتھ بندہ بھی روانہ ہوا۔ یا رد اکبیا! یا رد اکبیا! کی صدائیں پھر آنے لگیں، ایک اونٹ والے سے معاملہ طے ہوا سوار ہوا، یہ کچھ کالے رنگ کا اونٹ تھا اور نکیل بھی اس کی ناک میں نہ تھی۔ بدو نے بٹھا دیا اور پیچھے سے اس کو ہنکاتا چلا، اونٹ کافی شاردار آہستہ بھی بھڑکنے والا تھا، چند ہی قدموں کے بعد عجیب و غریب آوازیں بلبلاہٹ کی اس کے اندر سے نکلنے لگیں، اور گردن جھکا کر ایسا معلوم ہوتا تھا اب نہیں تو تب سوار کو زمین پر پٹک کر رہے گا، خدا جانے یہ واقعہ تھا بھی یا نہیں لیکن مجھ پر اسی قسم کے وسوسے مسلط تھے۔ چلانے لگا، حافظ کا شعر یاد آیا۔

اے ساربان فروکش کیں رہ کراں نہ دارد

مگر مسکرا مسکرا کر جمال کچھ دیر تک ٹالتا رہا، زیر لب کچھ کہتا بھی رہا، خدا جانے "ہندی بطال" وغیرہ کی گالیوں سے نوازا رہا تھا یا کیا تاہم میرے اضطراب کو دیکھا کہ حد سے گذر رہا ہے اور میں نے اس کو یقین دلایا کہ کرایہ کا جو روپیہ ادا کر چکا ہوں اس سے باز آیا، تب اس نے اونٹ کو بٹھا کر مجھے اتار دیا۔ اب آزاد تھا، پیدل رفیقوں کے ساتھ منیٰ تک پہونچ گیا سب کے ساتھ جمرہ عقبہ پہونچا، مطوف سکھانے والے مناسک حج کے میرے پاس تو تھے نہیں، کچھ اپنے کتابی معلومات کچھ دوسروں کو دیکھ دیکھ کر رمی کے کام سے فارغ ہو کر جمرہ عقبہ کے سامنے ہی ایک چھوٹا سا میدان تھا جس میں دکانیں تھیں، چند پیسوں کے بھنے ہوئے چنے لے کر گرد گھنٹال بن کر زمین پر آلتی پالتی مارے ان ہی چنوں کو چبانے لگا خیال تھا کہ رمی کے لئے جمرہ عقبہ تک ہر حاجی کا پہونچنا یقینی ہے۔ یہی مقام ہے جہاں ان رفیقوں سے ملنے کی قطعی توقع کی جا سکتی تھی جن سے ایک دن اور ایک رات بچھڑا رہا۔ دل کا یہ فیصلہ صحیح تھا۔ حیدرآباد کے ایک قدیم کرم فرما مولینا حکیم مرتضیٰ احسن صاحب، جو مجلس اشاعت العلوم کے ناظم بھی تھے اور خاکسار پر خاص عنایت فرماتے ہیں، اچانک دیکھتا ہوں چلا رہے ہیں۔

"ارے مولانا! آپ کہاں ہیں کل سے آپ کی تلاش ہے، سرکاری مکان جو حاجیوں کے لئے منیٰ میں میر قافلہ نے لیا ہے، اس میں آپ کے لئے ایک خاص کمرہ مختص کر دیا گیا ہے۔"

لپٹ پڑا، معلوم ہوتا تھا کہ برسوں سے جدا ہوئے خدا جانے مہینے گذرے یا سال، حکیم صاحب کے ساتھ ساتھ اسی

حیدر آبادی مکان تک پہونچ گیا۔ یہاں بحمد اللہ اپنے قافلہ کے ایک ایک رفیق خصوصاً مولینا عبد الباری و مولینا عبد الماجد صاحبان سے تعارف کی سعادت اس زمانہ میں حاصل ہوئی جب دونوں حضرات اپنے دوسرے مناقب و فضائل کے ساتھ "الحاج" بھی بن چکے تھے، جس وقت الگ ہوا وہ حاجی نہ تھے اور جس وقت ملا، اس وقت وہ حاجی ہو چکے تھے بغل گیری ہوئی پوچھ گچھ ہوئی، کہاں رہے، کیسے کھوئے گئے، سوالوں کی بوچھاڑ تھی لیکن ہنس کر ٹال دینے کے سوا اس تقدیری نوشتہ کی توجیہ و تفسیر اور کیا ہو سکتی تھی۔

نحر و حلق وغیرہ کے مناسک ادا ہوئے، طواف زیارۃ کے لئے مکہ معظمہ حاضر ہوئے اور واپس ہوتے ہوئے مولینا عبد الباری کو ردیف بنا کر ایک اونٹ پر پھر منیٰ کی قیام گاہ تک پہونچے اور تو کچھ نہیں ایک لطیفہ واپسی کے وقت ایسا پیش آیا جسے عمر بھر نہیں بھول سکتا، اونٹ جس بدو کا واپسی کے لئے کرایہ کیا گیا، اس نے سوار کرنے کی حد تک تو ہم دونوں کو سوار کرلیا، ہم آگے، مولینا ندوی پیچھے میری کمر تھام کر بیٹھ گئے۔ دو ہی قدم اونٹ چلا ہوگا کہ بدو نے تقاضا شروع کیا، میرا کرایہ دیدو، کہا گیا بھائی! قیام گاہ پہونچ کر دوں گا، اس وقت پیسے میرے پاس نہیں ہیں، اتنی کتابی عربی وہ بھی سمجھ لیتا تھا، سننے کے ساتھ ہی اس کی زبان سے بے ساختہ نکلنے لگا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون لاحول لاقوۃ یعنی انا للہ اور لاحول کے بعد اس نے کہا کہ "تو سلیمانی"

الا باللہ انت سلیمانی حسبنا اللہ ونعم الوکیل ہے اور حسبنا اللہ نعم الوکیل کا وظیفہ شروع کردیا۔

"سلیمانی" پہلے تو سمجھ میں نہ آیا کہ کیا مطلب؟ لیکن کان میں بات پڑی ہوئی تھی، سرحد کے پٹھانوں کو عموماً عرب میں سلیمانی کہتے ہیں[1]۔ وہ مجھے سرحدی پٹھان ٹھیرا رہا تھا اور اپنی بدوی زبان میں کچھ بڑبڑانے لگا، اتنی بات سمجھ میں آتی تھی کہ اپنے کرایہ سے وہ مایوس ہو چکا ہے۔ اور ہم دونوں پٹھانوں نے دھوکہ دے کر اس کے اونٹ پر قبضہ کرلیا ہے۔ منیٰ پہونچ کر اونٹ سے کود کر کرایہ دیے بغیر بھاگ جاؤں گا۔ لاکھ سمجھاتا رہا کہ بھائی میں سلیمانی نہیں ہوں، ہندی مسلمان ہوں لیکن وہ بار بار استرجاع و حوقلہ کے ساتھ حسبنا اللہ ونعم الوکیل کا وظیفہ مسلسل پڑھتا رہا جب تک کہ منیٰ کی فرودگاہ میں پہونچ کر کرایہ کے پیسے اس کے حوالہ نہ کئے گئے۔

---

[1] اسرائیل کے بارہ اسباط میں دس اسباط اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے نام سے انجیل میں موسوم ہیں۔ وہ کہاں گم ہوئے بخت نصر (بنوخذ نضر) عراقی جبار سے پہلے ایران، ایران سے ہٹ کر بلخ وغیرہ ہوتے ہوئے ان ہی کھوئی ہوئی بھیڑوں کا کوئی جتھا سرحد ہند کی پہاڑیوں میں بھی بس گیا ہے تقریباً اس زمانہ میں ایک ترجیحی فیصلہ کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ سرحدی پٹھان خود بھی بنی اسرائیل ہونے کے مدعی ہیں۔ ان کی مقامی زبان پشتو میں عبری زبان کے کافی الفاظ ملتے ہیں خیبر کا عبری لفظ جس کے معنی قلعہ جیسے مدینہ کے یہودیوں کا ممکن ہے اسی لفظ سے سرحدی درے کی تعبیر بھی کچھ اسی طرف اشارہ کرتی ہے کوہ سلیمان اب بھی سلیمان اسرائیلی بادشاہ و نبی کی یاد تازہ کرتے ہیں تعجب ہے کہ عرب کے بدوؤں تک یہ بات کیسے پہنچ گئی ۱۲

منیٰ کے یہ چند دن بڑے سکون اور لطف کے گذرے۔ حیدرآبادی قافلہ کے امیر فقیر کے قدیم محسن، وکیل شہیر مولوی فیض الدین صاحب تھے جن کا مکان سارے شہر حیدرآباد میں مولویوں اور اسی قسم کی دوسری مذہبی شخصیتوں کی عام فرودگاہ کسی زمانہ میں تھی۔ دس دس بیس بیس مہمان اسی ٹولی کے وکیل صاحب کے ہاں اس زمانے میں عموماً فروکش رہا کرتے تھے، دیوبندیوں پر خصوصی عنایت مبذول فرماتے تھے۔ بہترین پکے پکائے الوان نعم ان کے یاں سے آتے رہے اور ہم صرف کھاتے رہے۔ منیٰ ہی میں ایک دن رقعہ کسی صاحب نے لاکر دیا، لکھا ہوا تھا، ذرا مجھ سے آکر ملو، رقعہ لانے والے کے ساتھ روانہ ہوا، قریب ہی میں ڈیرہ تھا، ایک لاغر اندام بزرگ بیٹھے ہوئے تھے، جن کو پہلے نہیں پہچانتا تھا۔ سلام و مزاج پرسی کے بعد وہی. بولے، آپ نے مجھے پہچانا، نفی میں جواب پاکر فرمانے لگے۔

"مسٹر موتی"

کا نام آپ نے سُنا ہے "مسٹر موتی" اوہوہ وہ میرے خاص عزیزوں میں ہیں، ہاں! وہی موتی جس کا نام اصلی

سید مطیع الرحمٰن ہے

آپ کے سامنے بیٹھا ہے، خود ان سے ملاقات نہ تھی لیکن خصوصیات وصفات سے کافی واقف تھا برادری کے آدمی تھے ضلع مونگیر بہار وطن تھا، بیرسٹری کی ڈگری لانے کے لئے ولایت (لندن) تشریف لے گئے، سنا ہے کہ ایک میم صاحبہ پر تو وہی فریفتہ ہوئے لیکن کوئی دوسری میم صاحبہ تھیں جوان ہی کی گرویدہ و شیفتہ ہوئیں اس جوڑی کے ساتھ ہندوستان (بہار) واپس ہوئے۔ دربھنگہ میں بیرسٹری شروع کی۔ بیرسٹری خوب چمکی، ان معلومات کی روشنی میں میرا قدرتی سوال ہوا آپ یہاں کہاں؟ آبدیدہ ہوئے فرمانے لگے کیا عرض کروں اچانک میرا خواب دیدہ دماغ خدا ہی جانتا ہے کیوں چونکا اور جاگا چونکنے کے ساتھ ہی جس کے پاس سے بھاگا تھا اسی کے آستانے تک بھاگا چلا آیا ہوں۔ پہونچنے کی حد تک پہونچ گیا لیکن عرفات جانے کے لئے چند دن باقی تھے کہ شدید بخار کا حملہ ہوا، ایسا بخار جس کے بعد نہ ہوش باقی رہا نہ حواس بجا رہے۔ کبھی کبھی ہوش آتا اور معلوم ہوتا کہ عرفات جانے کی تاریخ قریب آگئی ہے، تب یقین ہوا کہ یہاں تک پہونچ کر روکا گیا ہوں، اس کا مطلب یہی ہے کہ میرا جرم ناقابل عفو اور قصور مغفرت کا مستحق نہیں ٹھہرا، مایوس ہوکر جو کچھ مرضی ہو سر تسلیم خم کرکے پڑا رہا۔ کہنے لگے کہ ٹھیک دو دن عرفات کی روانگی کے لئے باقی تھے کہ کچھ بخار میں کمی بھی محسوس ہوئی اور قوت کا احساس بھی ہونے لگا، اب یاد نہیں رہا کہ بخار ہی کی حالت میں یا ضعف شدید کے باوجود شغدف میں لدکر عرفات روانہ ہوئے اور عرفات کے وقوف کا موقعہ مل گیا۔ واپسی میں اس قدر تندرست ہوچکے تھے کہ بظاہر دیکھنے والا مشکل ہی سے ان کو ایسا آدمی سمجھ سکتا تھا جو ابھی شدید بخاری دورے سے شفایاب ہوا ہو، ان کی زندگی عبرت کی زندگی تھی، آغاز لندن سے ہوئی اختتام حرم محترم سے مربوط ہونے کے بعد ہوا۔

اسی زمانہ میں شاید اس کا بھی تجربہ ہوا کہ جمعہ کی نماز سعودی حکومت کی طرف سے زوال سے پہلے ادا کی گئی[1]

---

[1] بعض ائمہ سلف کا مذہب ہے کہ جمعہ کا وقت قبل از زوال ہوجاتا ہے ممکن ہے کہ اہل نجد کا مسلک بھی یہی ہو لیکن اس عاجز نے دو دفعہ کی حاضری میں کم از کم دس بارہ جمعے مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں نجدی اماموں کے پیچھے پڑھے ہیں لیکن کبھی بھی زوال سے پہلے نہیں

جس پر سب متحیر تھے اور بہتیروں کی تمناؤں کا خون ہوا، حرم میں مقیم ہوتے ہوئے حرم کی مسجد میں جمعہ کی نماز سے محروم کئے گئے، کیونکہ حسب دستور وہ زوال کے بعد مسجد میں حاضر ہوئے۔

دل پر تھی آرزو یہ تھی کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد سواری شکاری کے قصوں میں کچھ وقفہ ضرور ہوگا، قیام کا موقعہ کچھ ملے گا لیکن یہ تمنا پوری نہ ہوئی ——— خلاف توقع حج سے فارغ ہونے کے دوسرے یا تیسرے دن واپسی کے سارے ذرائع آسان کئے گئے۔ رفقاء واپسی پر مصر ہوئے مجبوراً سب کے ساتھ واپس ہی ہونا پڑا، واپسی میں جدہ جس موٹر پر جا رہے تھے راستہ میں سواق (شوفر) جو سمالی لینڈ کا مسلمان تھا سگریٹ پیتے ہوئے اتنی لاپروائی کا مرتکب ہوا کہ ہم لوگوں کے بستروں میں چنگاری پہونچی اور آگ بھڑک اٹھی لاکھ چلاتا رہا عربی میں اردو میں "آگ آگ النار النار" مگر کامل اطمینان کے ساتھ وہ موٹر کو تیزی کے ساتھ کچھ سنے بغیر دوڑاتا ہی چلا گیا۔ تاآنکہ ساتھ کی صراحیوں سے چلتی موٹر میں پانی ڈال کر کسی نہ کسی طرح آگ بجھانی پڑی شہر جدہ کے حدود میں پہونچنے کے ساتھ کا نپور کے مشہور واعظ مولینا نثار احمد صاحب مرحوم پر نظر پڑی، موٹر کسی وجہ سے وہیں ٹھہری۔ مولانا سے شوفر کی اس شرارت اور غیر ایمانی مزاج وطبیعت کی شکایت کی۔ انھوں نے سواق (شوفر) سے جب وجہ پوچھی کہ تونے موٹر کیوں نہ روکی، حالانکہ تیرے ہی سگریٹ سے آگ لگی تھی تو جواب میں مسلسل مولینا کو مخاطب کر کر کے کہہ رہا تھا انت ملعون، انت کذاب،

ظاہر ہے کہ اس کا جواب بیچارے مولینا اور ہم لوگ کیا دے سکتے تھے مسلمانوں کی تعلیم سے غفلت جس نتیجے کو بھی پیدا کرے حالانکہ اسلام کی بنیاد ہی:- اقرء بسم ربك الذی خلق خلق الانسان من علق اقرء وربك الاكرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم۔

پڑھ نام سے اپنے اس رب کے جس نے پیدا کیا، پیدا کیا انسان کو علق سے، پڑھ! اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے سکھایا قلم سے، سکھایا انسان کو وہ سب جس کو وہ سب کچھ جسے وہ نہیں جانتا

آخر قراۃ (خواندگی) تعلیم بالقلم (کتابت) تعلیم الم یعلم کا ذکر اسلام کی پہلی وحی میں یقیناً بے وجہ نہیں کیا گیا ہے۔ جدہ پہونچ کر جہاز میں سوار ہو گئے بمبئی بمبئی سے گھر پہونچ گئے خیر سے بعافیت گھر کو آئے

والحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات۔

قصہ مختصر تھا، مولینا نعمانی کے اصرار سے بیس سال کے مدفون ارتسامات کو حافظہ میں ابھارنا پڑا نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ لکھا گیا قلم کی لغزشوں نے کس حد تک محفوظ ہے اسی لئے اپنے اس مقالہ کو یہ دعا کرتے ہوئے ختم کرتا ہوں۔

ربنا لاتواخذنا ان نسینا او اخطانا ربنا ولاتحمل علینا اصرا کما حملتہ علی الذین من قبلنا ربنا ولاتحملنا مالا طاقۃ لنا بہ واعف عنا، واغفرلنا وارحمنا انت مولنا فانصرنا علی القوم الکافرین۔

الفرقان کے سلسلۂ حج کی یہ چوتھی قسط ہے، پانچویں قسط کے لئے ظاہر ہے کہ اب باقی ہی کیا رہا ہے۔ اور کون جانتا ہے کہ پانچویں قسط کا وقت جب آئے گا تو لکھنے والے کا وقت اس وقت تک پورا نہ ہو چکا ہوگا، کوئی بات پڑھنے والوں کو فائدہ پہونچائے یا پسند آئے تو خاتمہ بالخیر کی دعا کا امید وار ہوں۔

ارشاداتِ شیخ

(از۔ مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی)

محبوب سبحانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مجلس وعظ درحقیقت انوار و برکات کی مجلس ہوتی تھی جو کچھ فرماتے تھے قلوب اس سے متاثر ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں ہوں شیخ عفیف الدین بن مبارک پر کہ انھوں نے ان مواعظ میں سے باسٹھ وعظ قلمبند فرمائے جو آج تشنگانِ حق کے لیے چشمۂ آبِ حیواں سے کم نہیں ہیں۔ اہل مصر نے الفتح الربانی کے نام سے ان مواعظ کو شایع کیا تھا اور جناب مولانا عاشق الٰہیؒ مرحوم نے اردو میں ان کا ترجمہ بھی فرمایا تھا جو غالباً اب نایاب ہوچکا ہے، اثنا مطالعہ میں خیال آیا کہ ان مواعظ میں سے ملفوظات کے طور پر کچھ انتخاب کیا جائے اور اصحاب قلوب اور صاحبانِ ذوق کے سامنے پیش کرکے ان کی دعا حاصل کیجائے!

(۱) ایمان والا قلب "کیوں" اور "کس طرح" نہیں جانتا وہ نہیں جانتا کہ "بلکہ" "کیا ہو" اس کا قول تو "ہاں" رہی۔

(۲) اپنے "بیدار" ہونے کو موت کے بعد کے لیے نہ چھوڑو کہ اس وقت بیدار ہونا تم کو مفید نہ ہوگا۔

(۳) قلب گویا پرندہ ہے بدن کے "پنجرہ" میں، موتی ہے ڈبہ میں، مال ہو صندوق میں، پس اعتبار پرندکا ہے "پنجرہ" کا نہیں، اعتبار موتی کا ہے ڈبہ کا نہیں، اعتبار مال کا ہے صندوق کا نہیں۔

(۴) اول اپنے نفس کو نصیحت کرو اس کے بعد دوسرے کے نفس کو نصیحت کرو۔

(۵) جب توحید گھر کے دروازے پر ہو اور شرک گھر کے اندر، تو یہی نفاق ہے۔

(۶) افسوس تجھ پر کہ تیری زبان تقویٰ پکارتی ہے اور دل فاجر بن رہا ہے زبان شکر کرتی ہے اور دل اعتراض کر رہا ہے۔

(۷) جب تم توبہ کرو تو چاہیئے کہ تمھارا ظاہر بھی توبہ کرے اور باطن بھی، توبہ حکومت کی کایا پلٹ ہے۔

(۸) یوں سمجھو کہ تمھاری عمر میں صرف یہی ایک دن باقی رہ گیا ہے پس آخرت کے لیے تیار رہو۔

(۹) کثرت سے وہ لوگ ہیں جو گھر میں بیٹھیں تو درماندہ و بیکار بنیں، اور دوکان پر آئیں تو پرہیزگار بنیں، کھانے پینے میں زندیق اور ممبر پر گویا صدیق،

(۱۰) جو شخص اہل فلاح کو نہیں دیکھتا وہ فلاح نہیں پاتا۔

(۱۱) مخلوق کے دروازہ کو بند کرو اور اپنے اور خدا کے درمیان دروازے کھول لو۔

(۱۲) کھردرے اور موٹے کپڑے پہننے اور کھا سو کھا کھانے میں شان نہیں ہے، شان تیرے قلب کے زہد اختیار کرنے میں ہے سچا شخص پہلے اپنے باطن پر صوف پہنتا ہے اسکے بعد اسکا اثر ظاہر تک پہونچتا ہے۔

(۱۳) تنگ حالی کا مقابلہ کرو صبر سے اور خوشحالی کا شکر سے۔

(۱۴) قلب کی زندگی اس میں ہے کہ مخلوق (کے خیال) سے نکل جائے اور حق تعالےٰ کیساتھ قائم ہو۔

(۱۵) افسوس ہے کہ تمھاری زبان مسلمان ہے مگر دل مسلمان نہیں، قول مسلمان ہے مگر فعل مسلمان نہیں۔

(۱۶) تمھارا علم تم کو پکار رہا ہے کہ میں تم پر حجت ہوں۔

(۱۷) اپنی آرزو کم کرو زہد پاؤگے، کہ سارا زہد تمناؤں کا کم کرنا ہی ہو۔

(۱۸) برے ساتھیوں کو چھوڑ، ان کے تعلقات کو توڑ، اور رشتہ اہل حق سے جوڑ۔

(۱۹) خالق کا شکوہ مخلوق سے مت کرو۔

(۲۰) اس دنیا کے سمندر سے ڈرو کہ بہتیری مخلوق اس میں ڈوب چکی ہے۔

(۲۱) اے مبتلائے مصیبت، میں تجھ کو دیکھتا ہوں کہ ہر مخلوق کو راضی کرتا ہے اور خالق کو ناراض، اپنی دنیا کی آبادی کے پیچھے اپنی آخرت کو ویران کرتا ہے۔

(۲۲) دنیا کے حاصل کرنے میں ایسے نہ ہو جاؤ کہ جیسے رات کے وقت لکڑیاں جمع کرنے والا کہ اسے خبر نہیں کہ اس کے ہاتھ میں کیا آتا ہے (یعنی لکڑی یا سانپ؟)

(۲۳) قناعت اختیار کرو کیونکہ قناعت کا خزانہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

(۲۴) اے مسکین، اپنے نفس پر رو، تیرا بچہ مرجاتا ہے تو تجھ پر قیامت قائم ہو جاتی ہے اور تیرا دین مرجاتا ہے تو تجھکو پروا نہیں ہوتی ہے اور نہ تو اس پر روتا ہے۔

(۲۵) افسوس کہ تو سانپوں کو کس طرح چھو رہا ہے اور الٹ پلٹ رہا ہو حالاں کہ نہ تجھکو سانپ پکڑنے کا ہنر معلوم اور نہ تونے تریاق کھا رکھا ہو (کہ زہر اثر نہ کرے) تو خود اندھا ہے پھر لوگوں کی آنکھوں کا علاج کیونکر کرے گا، تو گونگا ہے پھر لوگوں کو تعلیم کس طرح دے گا جاہل ہے پھر دین کیونکر درست کرے گا؟

(۲۶) اے غافلو، قبر اور موت کا اژدہا اپنا منہ کھولے ہوئے ہو شاہ قضا و قدر کا جلاد اپنے ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے

(باقی آئندہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تھوڑی دیر اہلِ حق کیساتھ

(از مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی)

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

(۱)

دل بیٹھے جا رہے ہیں۔ اہل دل سہمے جا رہے ہیں کہ آج مدینہ کے دار الامارۃ میں امام دار الہجرۃ حضرت مالک کو کوڑے لگائے جا رہے ہیں۔

امام کا فتویٰ ہے کہ خلافت نفس ذکیہ کا حق ہے۔ منصور نے جبراً بیعت لی ہے اور جبر کا شرع میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر کسی سے جبراً طلاق دلای جائے تو واقع نہ ہوگی [۱]

منصور کے عمال چاہتے ہیں کہ امام طلاق جبری کے عدم اعتبار کا فتویٰ نہ دیں کہ مبادا لوگ بیعت جبری کا انکار نہ کر بیٹھیں۔ مگر یہ ممکن کیسے تھا امام کے نزدیک مسئلہ یوں ہی ثابت تھا وہ اس کے خلاف کیسے فتویٰ دیتے؟ حکم ہوا کہ ستر کوڑے لگائے جائیں۔۔

اللہ اللہ، کیسا عبرت خیز سماں ہو وہ مالک بن انس جو مدینہ کی گلیوں میں کبھی گھوڑے اور خچر پر اس لیے سوار نہیں ہوئے کہ جو سرزمین قدوم نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مشرف ہوئی ہے اس کو میں جانور کے سموں سے کیسے روندوں؟ آج انھیں کے جسم نازک پر درے پڑ رہے ہیں، تمام پیٹھ خون آلود ہو گئی ہو اور دونوں ہاتھوں کے مونڈھے اتر گیے ہیں۔ حکم ہوا کہ اونٹ پر بٹھا کر ان کی تشہیر کرو،، امام مالک کی مدینہ میں تشہیر ہو رہی تھی (یعنی مجرموں کی

---

[۱] فقہ مالکیہ میں طلاق جبری درست نہیں ہو۔ حنفیہ کے یہاں طلاق مکرہ واقع ہو جائے گی اسکے لیے حنفیہ کے پاس دلائل ہیں جن کے ذکر کرنے کا یہ موقع نہیں ہو۔

طرح باندھ کے ان کو مدینہ میں گھمایا جارہا تھا) اور ان کی زبان حقیقت ترجمان سے مسلسل یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے:۔

من عرفنی فقد عرفنی ومن لا یعرفنی	جو مجھ کو جانتا ہو وہ جانتا ہو جو نہیں جانتا
فانا مالك بن انس اقول طلاق المکرہ	ہو وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں فتویٰ
لیس بشئ۔	دیتا ہوں کہ طلاق جبری کچھ نہیں ہے۔!

(۲)

بغداد کا ایوان خلافت درباریوں سے بھرا ہو خلیفہ معتصم اپنے پورے شان و شکوہ کے ساتھ تخت خلافت پر جلوہ افروز ہے۔ امام اہل السنۃ والجماعۃ حضرت احمد بن حنبل پابزنجیر کھڑے ہیں۔ بیڑیاں اتنی بوجھل ہیں کہ پیروں میں حرکت نہیں ہوسکتی ہے۔ خلیفہ اور معتزلی علماء امام سے خلق قرآن کی تائید چاہتے ہیں لیکن امام بآواز بلند فرماتے ہیں:۔

اعطونی شیئاً من کتاب اللہ	مجھ کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت
وسنۃ رسولہ حتی اقول۔	میں سے کچھ دو تاکہ میں اسی کے مطابق کہوں۔

امام ربانی کی حق پرستی سے خلیفہ کا دل نرم ہوتا ہے اور کہتا ہو کہ:۔

اے احمد میرے مسلک کی تائید کرو، تمہیں اپنا مقرب خاص بناؤں گا پھر تم کو میرے اس قیمتی فرش پر چلنے کا فخر حاصل ہوگا۔

جواب میں پھر ارشاد ہوا۔

مجھ کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں سے کچھ دو تاکہ میں اسی کے مطابق کہوں۔

حکم ہوا کہ احمد کے پیر میں بیڑیاں ڈال دی جائیں، دُرّے لگانے والے بلائے گئے اور امام کے ہاتھ باندھ دیے گئے، اتمام حجت کے لیے ایک بار زبان حق کھلتی ہے اور یوں گویا ہوتی ہے کہ

"اے امیر المومنین قیامت کے دن کو یاد کیجئے جب کہ آپ بھی منتقم حقیقی کے دربار میں کھڑے ہوں گے ٹھیک اسی طرح کہ اس وقت میں آپکے سامنے ہوں، پھر آپ میرے اس خون کا کیا جواب دینگے؟

مخالفین نے دیکھا کہ معتصم ان الفاظ سے متاثر ہو رہا ہے، چیخ اٹھے کہ اے امیر المومنین یہ شخص گمراہ ہو (نعوذ باللہ) اس کو ہرگز نہ چھوڑا جائے، انجام کار کوڑے پڑنا شروع ہوگیے۔ پہلا کوڑا پڑا تو امام نے فرمایا، بسم اللہ۔ دوسرے پر فرمایا لاحول ولا قوۃ الا باللہ، تیسرے پر فرمایا القرآن کلام اللہ غیر مخلوق، (قرآن اللہ کا کلام ہو غیر مخلوق ہو) چوتھے پر ارشاد فرمایا قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا (کہ دیجئے گا کہ ہم کو ہرگز نہ پہنچے گی کوئی چیز (تکلیف یا مصیبت) لیکن وہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے

شدت الم سے امام بیہوش ہوگیے، تھوڑی دیر کے لیے کوڑے روک دیے گیے، جب ہوش آیا تو خلیفہ نے پھر کہا کہ میری بات مان لیجئے میں رہا کر دوں! امام نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور پھر کوڑے پڑنا شروع ہوگیے۔ متعدد بار ایسا ہی ہوا۔ امام جب بیہوش ہو جاتے تو کوڑے روک دیے جاتے جب ہوش آتا تو خلیفہ پھر درخواست کرتا مگر حق و استقامت کا یہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹلنے کا نام نہ لیتا۔ جب آخری بار ہوش آیا تو اپنے کو معتصم کی قید و بند سے آزاد پایا۔ گھر لائے گیے ستو پیش کیا گیا مگر روزہ سے تھے اس لیے نوش نہیں فرمایا، ظہر کا وقت آگیا تو تکلیف کی شدت کے باوجود جماعت سے نماز ادا فرمائی۔

(۳)

آج عروس البلاد بغداد کی زینت و آرائش کی کوئی حد نہیں، خلیفہ ہارون الرشید تخت خلافت پر متمکن ہوئے ہیں، ہر مجلس مجلس عشرت و طرب، ہر محفل محفل لطف و مسرت، ہر جا نغمۂ عیش و نشاط، ہر سمت منظر فرحت و انبساط کہیں علماء و زہاد کا مجمع، کہیں نامی گرامی شعراء کا اجتماع، انعام و اکرام کی بارش ہو رہی ہو، خزانۂ شاہی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اعزاز و مناصب کی تقسیم ہو رہی ہے لیکن کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ حضرت سفیان ثوریؒ جن سے خلیفہ کو دلی عقیدت ہے اس جشن مسرت میں شریک نہیں ہیں خود ہارون الرشید کو بھی حیرت ہے جس کا اظہار وہ اپنے خط میں یوں کرتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے بندے ہارون الرشید امیر المومنین کی طرف سے اپنے دینی بھائی سفیان ابن سعید الثوری کی جانب!

میرے بھائی آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسلمانوں کے درمیان بھائی چارہ قائم فرمایا ہے، مجھ کو بھی محض اللہ کے واسطے آپ سے محبت اور قلبی تعلق ہے اگر خلافت کا طوق میری گردن میں نہ ہوتا تو اپنی محبت و اخلاص کے باعث خود حاضر خدمت ہوتا، کوئی ایسا نہیں ہے جس نے اس موقع پر مجھے اس منصب جلیل کی مبارکباد نہ دی ہو، میں نے خزانوں کے دروازے کھول دیے ہیں، گرانقدر عطیات اور عظیم الشان بخششوں کی وجہ سے میری آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہو رہا ہے ان تمام باتوں کے باوجود آپ اب تک میرے پاس تشریف نہیں لائے میں نہایت شوق سے یہ عریضہ خدمت اقدس میں بھیج رہا ہوں، اے ابو عبداللہ آپ کو مومن کی زیارت اور اس کی ملاقات کے فضائل بخوبی معلوم ہیں اس لیے یہ خط دیکھتے ہی تشریف لائیے اور عجلت فرمائیے۔

ہارون الرشید نے عباد طالقانی کو یہ خط دیا اور حکم دیا کہ حضرت سفیان ثوری کی خدمت میں لے جائیں، عباد کہتے ہیں کہ میں خط لے کر کوفہ پہونچا اور حضرت موصوف کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت سفیان ثوری نے خط اہل مجلس کے سامنے ڈال دیا، اور فرمایا کہ میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ اپنے ہاتھ ایسی چیز میں لگاؤں جس میں ظالموں کا ہاتھ لگا ہو۔ حضرت کے حکم سے بعض اہل مجلس نے خط پڑھنا شروع کیا، پورا خط سننے کے بعد حضرت سفیان ثوری نے ارشاد فرمایا کہ اسی خط کی پشت پر ظالم کو جواب لکھو، لوگوں نے عرض کیا کہ اے ابو عبد اللہ خلیفہ کا معاملہ ہے اگر خط کا جواب اچھے اور صاف خط پر دیا جائے تو بہتر ہے۔ ارشاد فرمایا کہ نہیں اسی خط کی پشت پر جواب لکھو، یہ خط اگر کسب حلال سے ہے تو ہارون الرشید کو اس کا عوض ملے گا ورنہ وہ اسی کے ساتھ ڈالا جائے گا، میرے یہاں ایسی کوئی چیز نہ رہے جس کو ظالم کے ہاتھ نے مس کیا ہو کہ مبادا وہ ہمارے دین کو خراب کردے، عرض کیا گیا کہ جواب میں کیا لکھا جائے، فرمایا کہ لکھو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے بندے سفیان کی جانب سے ہارون الرشید کی طرف، جو امیدوں اور آرزوؤں کے فریب میں مبتلا ہے جس کی ایمانی حلاوت سلب کرلی گئی ہے جو تلاوت قرآن کی لذت سے محروم ہی، میں تم کو صاف لکھ رہا ہوں کہ میں نے تم سے محبت کا رشتہ توڑ دیا۔ میرے اور تمھارے تعلقات ختم ہوگئے تم نے میرے نام جو خط بھیجا ہے اس میں اقرار کیا ہے کہ مسلمانوں کے بیت المال سے تم بیجا اور غیر صحیح مصارف کر رہے ہو، گویا تم یہ لکھ کر اپنے اس فعل پر خود شاہد ہوگئے ہو جن کے سامنے تمھارا خط پڑھا گیا ہے اور ہم لوگ کل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی شہادت دیں گے۔

اے ہارون، تم نے مسلمانوں کے مال پر حملہ کر رکھا ہے کیا تمھارے اس فعل سے مجاہدین فی سبیل اللہ اور مسافرین راضی ہیں؟ کیا تمھارا یہ فعل اہل علم کے نزدیک پسندیدہ ہے؟ کیا بیوہ عورتیں اور یتیم بچے اس سے راضی ہیں؟ کیا تمھاری رعایا کو اس سے مسرت ہے؟ اے ہارون اپنے ہاتھ کو روکو۔ کل اللہ کے یہاں جوابدہی کے لیے تیار رہو، یقین کرو کہ تم کو ایک عادل اور حکیم کے دربار میں کھڑا ہونا ہے۔ اپنے معاملہ میں اللہ سے ڈرو، کیونکہ ایمان اور زہد کی صورت تم سے سلب کرلی گئی ہے تلاوت قرآن مجید کی لذت اور صلحاء کی ہمنشینی کے شرف سے تم محروم ہوگئے ہو اور تم نے اپنے لیے ظالم اور ظالموں کا سرگروہ بننا پسند کرلیا ہے۔

اے ہارون تم تخت شاہی پر بیٹھے ہوئے حریر و دیبا کے استعمال میں مصروف ہو اور دروازہ پر تم نے پردے ڈال رکھے ہیں، ظالم سپاہ تمھارے قصر معلّےٰ کے سامنے کھڑی رہتی ہے، یہ

لوگوں پر ظلم کرتی ہے۔ اس کا انصاف نہیں ہوتا ہے، دوسروں پر شراب کی حد جاری کرتے ہیں لیکن خود شراب خوار ہیں، زانی کو سزا دیتے ہیں لیکن خود زانی ہیں، چوروں کے ہاتھ کاٹتے ہیں لیکن خود چور ہیں، قاتل کو سزائے موت کا حکم سناتے ہیں لیکن خود قتل کرنے میں بیباک ہیں کیا یہ احکام تم پر اور تمھاری سپاہ پر ضروری نہیں ہیں قبل اس کے کہ وہ دوسروں پر جاری کیے جائیں؟

اے ہارون، اس دن تمھارا کیا حشر ہوگا جب پکارنے والا پکارے گا کہ ظالمین اور ان کے اعوان و انصار کو جمع کرو، پھر تم مع اپنی پوری جماعت کے بارگاہ ایزدی میں حاضر کیے جاؤگے اور تم ان سب کے امام ہوگے!

اے ہارون میری نصیحت پر عمل کرو۔ اپنی رعایا کے بارہ میں اللہ سے ڈرو اور اس پر غور کرو کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کے متعلق کیا حال تھا؟ اے ہارون جس طرح خلافت تم کو ملی ہے اسی طرح تم سے کسی دوسرے کو ملے گی، دنیا کا یہی رنگ ہے پس کچھ لوگ تو وہ ہیں جو (اس سلسلہ میں) اپنے لیے نفع آخرت کا سامان مہیا کر لیتے ہیں اور کچھ لوگ وہ ہیں جن کی دنیا و آخرت دونوں تباہ ہیں۔ اب تم آئندہ مجھے کوئی خط نہ لکھنا اس لیے کہ میں جواب نہ دوں گا۔

عباد طالقانی کہتے ہیں کہ حضرت سفیان ثوری کے نصیحت بھرے الفاظ مجھ پر اثر کر چکے تھے، میں خط لیکر کوفہ کے بازار آیا اور پکار کر کہا کوئی ایک اللہ کی طرف بھاگنے والے کا خریدار ہے؟ لوگ درہم و دینار لیکر دوڑے، میں نے کہا درہم و دینار نہیں، ایک صوف کا جبہ چاہیئے وہ لایا گیا میں نے اپنا امیرانہ لباس اتار کر اسی جبہ کو پہنا اور خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں پہونچا۔ پہلے تو دربان نے میرا مذاق اڑایا پھر مجھے شرف باریابی حاصل ہوا۔ ہارون نے جب مجھے اس رنگ میں دیکھا تو کھڑا ہوگیا اور پھر بیٹھ گیا اپنا سر پیٹنے لگا کہ افسوس میں نامراد ہی رہا، اور قاصد بامراد ہوگیا پھر اس نے خط پڑھنا شروع کیا اور آنسو اس کے چہرہ پر جاری تھے۔

بعض مصاحبین نے عرض کیا کہ امیر المومنین سفیان نے آپ کے مقابلہ میں بڑی بے باکی سے کام لیا ہے انھیں پابہ زنجیر قید خانہ میں ڈال دیا جائے۔ ہارون الرشید نے کہا اے بندگان دنیا سفیان کو ان کے حال پر چھوڑ دو بیشک وہ شخص بدبخت ہے جس کے تم ہمنشیں ہو، یقیناً سفیان ایک مرد متقی ہے!

عباد کہتے ہیں کہ ہارون الرشید نے اس روز سے معمول کر لیا کہ نماز پنجگانہ کے بعد اس کو پڑھتا اور خوب روتا۔

(۴)

۲۰ ذی قعدہ ۷۲۸ھ آج قلعۂ دمشق کا ایک قیدی قید حیات سے آزاد ہوگیا، کہتے ہیں کہ جب سانس نے آخری ہچکی لی تو اس کی زبان پر یہ آیت تھی

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ

یہ قیدی کہا کرتا تھا کہ قید میری خلوت ہو، قتل میری شہادت ہو، اور جلا وطنی میری سیاحت ہو، مقید وہ ہے جو اپنی خواہشات کا مقید ہے اور محبوس وہ ہے جس کا قلب خدا کی جانب سے بند ہے۔

اس قیدی کا نام شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ہے، بلا شبہ علماء کی ایک جماعت نے ابن تیمیہؒ پر سخت تنقید کی ہو خود ان کے مؤیدین اور انکے کمال کے معترفین نے بھی ان کے تفردات سے اختلاف بلکہ اپنی براءت تک کا اظہار کیا ہو، مگر ان کے ولولۂ حق اور حمایت دین کے جوش کا سب کو اقرار ہو، ان کو ایک سلسلہ میں زندان خانہ جانا پڑا، وہاں دیکھا کہ سب قیدی خدا سے غافل ہیں آخرت سے بے پرواہیں، لہو و لعب میں مبتلا ہیں، شیخ نے ان سب کو نصیحت کی، ان سے توبہ کرائی، عقائد کی تصحیح کی، جو کل تک چور اور ڈاکو تھے ان کی پیشانیاں سجدوں کے آثار سے چمک اٹھیں اور زبانیں ذکر الٰہی سے تر ہوگئیں۔

ایک مرتبہ شیخ الاسلام کی قازان سے ملاقات ہوئی قازان اور بہت سے تاتاری دائرہ اسلام میں داخل ہوچکے تھے مگر اخلاق و اعمال میں کوئی تغیر نہیں ہوا تھا، ابن تیمیہؒ نے انتہائی بے باکی سے نصیحت کی، لوگوں کا خیال تھا کہ قازان اب قتل کا حکم دینا ہی چاہتا ہے مگر اس پر حق کی ہیبت طاری ہوچکی تھی، زبان کھلی تو ان الفاظ پر کہ ——— میرے لیے دعا فرمائیے۔

اب ذرا سنیئے کہ شیخ الاسلام نے کیا دعا شروع کی! ہاتھ اٹھائے اور عرض کیا خداوندا اگر قازان خدا اور رسول کے لیے لڑ رہا ہو تو اس کی مدد کر اور اگر مال و دولت اور سلطنت کی خواہش کے لیے لڑ رہا ہو تو اس کو اپنی مدد سے محروم رکھ۔ لوگوں نے دیکھا کہ قازان ہاتھ اٹھائے ہوئے ہر فقرہ پر آمین، آمین کہہ رہا تھا۔

قازان کے حکم سے کھانا آیا۔ ابن تیمیہؒ کے سوا سب نے کھایا وجہ دریافت کی گئی تو صاف فرمایا کہ میں یہ کھانا کیسے کھاؤں جو لوگوں کے مال سے لوٹ کر حاصل کیا گیا ہو اور لوگوں کے درختوں کو کاٹ کر پکایا گیا ہو۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را   گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

(صفحہ ۲۴ کا بقیہ) ——— ہے صرف حکم کا منتظر ہے۔

(۲۷) صاحبو، تم دنیا کے پیچھے دوڑ رہے ہو کہ وہ تم کو کچھ دے دے، اور دنیا اہل اللہ کے پیچھے دوڑ رہی ہے تاکہ ان کو کچھ دے دے، وہ ان کے سامنے سر جھکائے کھڑی رہتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معاشیاتِ عبدیت

(از مولانا عبد الباری صاحب ندوی)

مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ مَآ اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ۔

"نہیں پیدا کیا میں نے جن و انس کو مگر اس لئے کہ میری ہی عبادت میں لگے رہیں۔ میری مراد (ان لوگوں کے پیدا کرنے سے) رزق (کی فکر میں ان کو کھپانا) نہیں۔ نہ یہ مراد (ہو سکتی) ہے کہ مجھ کو کھلائیں (جیسا کہ بہت سے مشرکین بزعمِ خود اپنے دیبی دیوتاؤں کو کھلاتے پلاتے ہیں) یہ تو خود اللہ ہی ہے جو سب کا رزق رساں پختہ قوت والا ہے۔"

بس یہی آیات اسلامی معاشیات کے سارے اصول و فروع کی اساسی بینات ہیں۔ معاش یا قرآن کی اصطلاح میں رزق بلاشبہ زندگی کی سب سے مقدم اور ناگزیر ضرورت ہے لیکن ہے ذریعہ یا ضرورت ہی زندگی کا مقصد بہرحال نہیں۔ لہٰذا جب تک پہلے خود مقصد معلوم و متعین نہ ہولے، اس کے مناسب و موافق کسی ذریعہ یا وسیلہ کا تعین کیسے ہوگا۔ زندگی کا جو مقصد ہوگا اسی کے اعتبار سے تو ذرائع و وسائل کی نوعیت و حیثیت اور اہمیت کا فیصلہ ہوگا اور جہاں کہیں وسیلہ نفس وسیلہ کی حیثیت سے باہر قدم نکالے گا یا اصل مقصد میں معاون ہونے کی جگہ مزاحم ہونے لگے گا وہیں اس کو روک دینا پڑے گا۔

پہلی آیت ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون　　میں نفی و استثنا کی انحصاری تعبیر سے دو ٹوک قطعیت کے ساتھ فرما دیا گیا کہ انسان کی پیدائش کا مقصد و مدعا اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس اپنے پیدا کرنے والی کی عبادت و عبدیت یا پرستش و بندگی میں لگا رہے۔ کوئی بھی مخلوق ہو اس کا مقصد تخلیق خود اسی کی امتیازی خلقت و فطرت یا خصوصی نوعیت کی ترقی و تکمیل ہی ہو سکتی ہے۔ آم کا کمال یہی ہوگا کہ بہتر سے بہتر آم کے صفات اس میں نمایاں ہوں نہ کہ انگور یا انار ہو جائے۔ گھوڑے کا کمال اس کی فرسیت یعنی فرسی صفات کی ترقی ہوگی، نہ کہ شیر یا ہاتھی بن جانا اسی طرح آدمی کا مقصود بھی صرف آدمی بننا ہی ہو سکتا ہے یعنی آدمیت کی خصوصی و امتیازی فطرت کی ترقی و تکمیل، نہ کہ کھانے پینے پہنے جنے جنانے کی مشترک حیوانی ضروریات میں دوسرے جانوروں سے آگے نکل جانا یا بڑھیا جانور

(HIGHYER ANIMAL) بن جانا۔ غرض انسان کا اعلیٰ سے اعلیٰ انسان بننا یہی اس کی انسانیت یا انسانی ذات و شخصیت کا ارتقا و تحقق (REALIZATION) یعنی اس کے پیدائشی و نوعی مقصد کا کمال ہوگا اس لیے معاشیات ہی کیا زندگی کے کسی چھوٹے بڑے شعبے کو بھی اسلامی نقطۂ نظر سے سمجھانے سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ ذات و شخصیت یا انسان کی خاص و خالص امتیازی خلقت اسلام کی نگاہ میں ہے کیا؟

انسان کی پیدائش کا ملائکہ میں اعلان فرمایا کر جب اُن کو اس کے سجدے کا حکم دیا گیا تو خاص خصوصیت اس کی یہ منصوص فرمائی گئی ہے کہ اس کے اندر میں (خدا) نے خود اپنی رُوح کی ایک شان پھونکی ہے (نفخت فیه من روحی) دوسرے عنوان سے کائنات میں اس کے خاص مقام کا یوں تعین فرمایا گیا کہ زمین پر ایک اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں کسی کا خلیفہ یا جانشین صحیح معنی میں وہی ہوگا اور ہو سکتا ہے جو اپنے متخلف یا خلیفہ بنانے والے کی ذات و صفات سے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مماثلت" و اقربیت" رکھتا ہو حضرات صوفیا اسی معنی میں انسان کو حق جل وعلا کا مظہر اتم کہتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالےٰ نے اپنی ذات و صفات کے کمالات کو سب سے زیادہ ظہور بخشا ہے۔ ایک اور اعتبار سے اسی حقیقت کو امانت سے بھی تعبیر فرمایا گیا ہے۔

خدا کا جوہری مفہوم و تصور۔ حیات و ارادہ، علم و قدرت، خلق و امر وغیرہ۔ تمام صفات کمال کی جامعیت و نامحدودیت ہے اسی نامحدودیت کی رُوح یا طلب و تڑپ انسان کے اندر اس حد تک پھونکی گئی ہے کہ اس دنیا کی محدود و مختصر زندگی کے مطلوبات میں بھی اس کی طلب و تمنا کو کسی حد و نہایت پر قرار و قناعت قطعاً نہیں۔ نہ اس وقت تک ممکن ہے جب تک اس کی خواہش یا چاہ پر سے تمام حد بندیاں ہٹ کر نامحدودیت کے اس مقام کو نہ پالے جہاں جو کچھ چاہے اور مانگے بے روک ٹوک پائے۔ لکم فیها ما تشتهی انفسکم ولکم فیها ما تدّعون ۔ دوسرے لفظوں میں انسان کی فطرت کی اعلیٰ مانگ جنت ہے۔ خدا میں نامحدودیت کا تحقق بالذات و بالفعل ہے اور اپنے خلیفہ میں اس نے اسی نامحدودیت کے تحقق یا قوت سے فعل میں لانے کا مطالبہ پھونک کر گویا اسی کو مخلوق خدا (CREATED GOD) بنا دیا گیا ہے تاکہ اپنے خالق خدا کی جانشینی کا سزاوار رہو۔

ایک مقدمہ یہ ہوا۔ دوسرا یہ ہے کہ کسی کی جانشینی کے معنی یا خلافت کی حقیقت و کمال یہی ہے کہ اپنی خوشی و خواہش کو اپنے جانشین یا خلیفہ بنانے والے کی مرضی و مشیت کے تابع بلکہ اس میں فنا کر دے یہی مطلب عبادت و عبدیت یا بندگی و سرافگندگی کا ہے۔ خود اسلام کے معنی بھی ایسی کامل سپردگی ہی کے ہیں کہ عبد اپنے رب، بندہ اپنے مالک کے حوالہ اپنے کو اس طرح کرے کہ اس کی مرضی و مشیت کے ساتھ پورا پورا توافق پیدا ہو کر کوئی تعارض و تصادم باقی نہ رہ جائے۔ عبدیت کی اسی خصوصیت کو حضرت مجدد دقت نے جابجا ذیل کی اس مثالی حکایت

سے واضح فرمایا ہے کہ:۔

"ایک شخص نے ایک غلام خریدا، خریدنے کے بعد دریافت کیا کہ میاں تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ حضور آج سے تو وہی نام ہے جس سے آپ پکاریں۔ دریافت کیا کہ کھایا کیا کرتے ہو؟ کہا حضور آج سے کھانا بھی وہی ہے جو آپ کھلائیں دریافت کیا پہنا کیا کرتے ہو؟ کہا آج سے پوشاک بھی وہی ہے جو حضور پہنا ئیں۔"

"اسی طرح حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے سامنے آیت وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون پر اشکال کیا گیا کہ اس میں جن وانس کی تخصیص کی کیا وجہ ہے۔ خدا تعالیٰ کی عبادت تو ساری مخلوق ہی کرتی ہے حضرت نے فرمایا کہ ایک مثال سے فرق سمجھو ایک تو نوکر ہے اور ایک غلام (عبد) نوکر کا کام تو متعین ہوتا ہے خواہ ایک خواہ متعدد، مثلاً باورچی کہ اس کے لئے کھانا پکانے کی خدمت معین ہے .... اور غلام کی کوئی خدمت معین نہیں ہوتی بلکہ تمام خدمات اس کے ذمہ ہیں جس کا بھی حکم ہو جائے چنانچہ ایک وقت اس کو آقا کا پاخانہ بھی اٹھانا پڑتا ہے اور ایک وقت آقا کی پوشاک پہن کر آقا کا قائم مقام اور نائب (خلیفہ) بن کر جلسہ یا دربار میں جانا پڑتا ہے غرض غلام کو کسی وقت کسی خدمت سے بھی انکار نہ ہو گا۔"

حاصل یہ کہ جن وانس کے سوا دیگر مخلوقات میں سے ہر ایک کی طاعت وعبادت کی کوئی نہ کوئی صورت معین ہے یعنی ہر مخلوق سے کوئی نہ کوئی خاص کام ہی متعلق ہے جس کے سوا دوسرا کام اس سے نہیں لیا جاتا۔

"مگر انسان کی کوئی خدمت معین نہیں ایک وقت میں انسان کا سونا عبادت ہے۔ ایک وقت میں پاخانہ پھرنا بھی عبادت ہے مثلاً جماعت تیار ہو اور پاخانہ پیشاب کا زور ہو تو پاخانہ پیشاب سے فراغت واجب ہے اور نماز پڑھنا حرام۔ اس وقت اس کا پاخانہ جانا ہی عبادت ہے ...... اور ایک وقت انسان کی یہ شان ہے کہ مظہر حق بنا ہوا ہے اس وقت اس کی زبان سے مردہ دل زندہ ہوتے ہیں۔

غرض جو شان غلام کی ہوتی ہے وہی انسان کی ہے عبدیت کے یہ معنی ہیں ..... کہ کسی خاص حالت اور خاص کام کو اپنے لئے تجویز نہیں کر سکتا بلکہ حضرت حق جس حال میں رکھیں اسی میں اس کو رہنا چاہئے کمل اڑھائیں تو کمل اوڑھے دوشالہ اڑھائیں تو دوشالہ اوڑھے، بھوکا رکھیں تو بھوکا رہے گھی دودھ کھلائیں تو گھی دودھ کھائے۔"[1]

یہ مطلب نہیں کہ رزق ومعاش کی اسبابی فکر وتدبیر ترک کرکے اپاہجوں کی طرح ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور خود ہی فاقہ کو دعوت دے یا آسمان سے خوان اترنے کا انتظار کرنے لگے بلکہ ہمارے اندر کسب واختیار کی جو صفت ودیعت فرمائی گئی ہے اسی کا دہرا مطالبہ جس طرح ایک طرف یہ ہے کہ حصول معاش کے اسبابی مشاغل وتدابیر میں اپنی فہم وبصیرت کے موافق آزادی کے ساتھ اس کسبی اختیار کو کما حقہ استعمال کریں اسی طرح اس کی اماتی جہت کا یہ تقاضا ہے کہ طلب رزق کی ساری تدبیروں اور کوششوں میں صاحب امانت (حق تعالیٰ) کی مرضی ومنشا کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا جائے ایک طرف

[1] وعظ صلوٰۃ الجنین ص۱۵۱ و ۱۵۱

اگر صنعت و حرفت زراعت و تجارت، مزدوری و ملازمت وغیرہ معاشی اسباب میں ہمارے اختیار کو تکوینی آزادی بخشی گئی ہے۔ تو دوسری طرف ان اسباب کی بعض صورتوں پر حرام و حلال، جائز و ناجائز کی کچھ تشریعی پابندیاں خود ہماری خلاقی و روحانی فطرت یا انسانیت کی ترقی و تکمیل کے لئے عائد کردی گئی ہیں۔

اب ان آزادیوں اور پابندیوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے میں اگر کبھی ہم کو بھوکا رہنا پڑے تو یہ سمجھنا درست ہوگا کہ ہمارا پروردگار (رب) ہی خود ہمارے ہی پرورشی مصالح کے تحت اسی طرح بھوکا رکھنا چاہتا ہے جس طرح طبیب کسی مریض کو۔ اور اگر آزادی و پابندی کے اس "سندان عشق" اور "جام شریعت" کی بازی یا ہم آہنگی میں دودھ گھی کیا ہفت اقلیم کی سلطنت و دولت مل جائے تو اس کو بھی اپنے رب ہی کی طرف سے اور اپنی عبدیت ہی کی پرورش و ربوبیت کا سامان اور امتحان جاننا چاہئے کیونکہ

"رزق میں فراخی و تنگی کرنے والا تو خود تمہارا رب (پالنہار) ہی ہے جو اپنے بندوں کو خوب جانتا، بوجھتا ہے کہ کس کے حق میں فراخی مناسب ہے اور کس کے تنگی"	ان ربک یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر انہ کان بعبادہ خبیرا بصیرا۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن | کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

آدمی کے بچے کو اگر آدمی بننا بنانا ہے یا آدمی ہی کی نمایندگی و خلافت کا حق ادا کرنا کرانا ہے تو اس کی صورت فقط یہی ہے کہ جب آدمی ماں باپ کی صفات نے کر پیدا ہوا ہے تو انہیں کی تربیت و شفقت کی گود میں بے چوں و چرا اپنے کو ڈال دے ورنہ اتفاق سے اگر کسی بھیڑئیے کے جنگل میں پڑ گیا تو اس کے بھٹ اور اس کی پرورش میں رہ کر تو کھانے پینے رہنے سہنے کی گرگی صفات ہی کا اس کے اندر نشو و نما ہوگا۔ مدت ہوئی لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں ایک ایسا ہی کوئی دس بارہ برس کا بچہ دیکھنے میں آیا تھا جو کسی بھیڑئیے کے بھٹ میں ملا تھا اور جس کو اب از سر نو آدمی کی طرح کھانا پینا، بولنا چالنا سکھلایا جا رہا تھا۔ کیا عرض کیا جائے کہ آج پوری انسانیت یورپ کے ایسے ہی گرگ صفات نام نہاد انسان کے جنگل میں گرفتار ہے اور اس گرگی معاشیات و سیاسیات ہی کی بدولت سچ پوچھئے تو آدمی آدمیت کی روح اور اس روحانیت کی زندگی دونوں سے ایک ساتھ محروم ہو رہا ہے۔

غرض اسلام کی کتاب کی رو سے انسان کی انسانیت جب خود اس کے خالق کی پھونکی ہوئی روحانیت اور اسی کی عطا کی ہوئی خلافت میں منحصر ہے تو لازماً اس روحانیت و خلافت کا پروان چڑھنا بھی اسی پروردگار کی بنائی اور بتائی ہوئی راہ معیشت پر چلنے چلانے میں منحصر ہوگا جس نے اس کے اندر خود اپنی روح پھونکی اور اس کے سر پر خود اپنی خلافت کا تاج رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جو خاص صفت عبد کے بالمقابل واقع ہوئی ہے وہ رب ہی کی ہے اور "عبدیت" کا مطالبہ

براہِ راست صفتِ "ربوبیت" ہی کا لازمہ ٹھرایا گیا ہے ارشاد ہے کہ اللہ ہی ہمارا تمہارا سب کا رب یا پروردگار ہے۔ اس لئے اسی کے ساتھ عبدیت یا بندگی کا تعلق پیدا کرو یہی ساری انسانیت کی صلاح و فلاح کی جانب سیدھی شاہراہ ہے۔ إِنَّ اللهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ کسی کا پالنے والا یا مربی صحیح طور پر وہی ہوتا او سمجھا جاتا ہے جو اُس کی امتیازی و نوعی فطرت و صلاحیت کو تربیت کی راہ سے کمال تک پہونچاسکے جیسے باغباں اس معنی میں باغ کا پالنہا ہے کہ ہر پودے ہر درخت کو اس کی خصوصیات کے مطابق پروان چڑھانے کا سامان کرتا ہے

زندگی کی ہر راہ کی طرح معاشی زندگی میں بھی ہماری شان عبدیت کا پہلا مطالبہ یہی ہے کہ اپنے معاشی رب یا رزاق کی ربوبیت و رزاقیت پر بھروسہ کرکے فقر و غنا کے نتائج سے بے پرواہ ہوکر اس کی طرف سے عائد کی ہوئی رزقی و معاشی آزادی اور پابندیوں کو بے چون و چرا قبول کرلیں عبدیت بلکہ نفس اسلامیت ہی کی معنوی حقیقت یہی بے چون و چرا سپردگی و سرافگندگی کی زندگی ہے باقی معاشی فراغ و فراخی کے کسی اپنے مزعومہ یا خود ساختہ خاص و عام انفرادی و اجتماعی معیار و نتیجہ کو حاصل و پیدا کرلینا نہ ہمارے قبضہ و قدرت میں ہے اور نہ ہم پر اس کی جواب دہی و ذمہ داری ہے اور نہ انسانی زندگی کے انجام و آخرت کی اصل فلاح و کامیابی کسی خاص و عام معاشی معیار پر موقوف فرمائی گئی ہے۔ اس کا انحصار تو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح معاشی تنگی و فراخی کے ہر حال میں بھی سرتاسر بس وہی بندگی کی زندگی گذارنے پر رکھا گیا ہے۔

انسان کی پیدائش کا مقصد و مدعا عبادت و عبدیت کو قرار دینے کے ساتھ ہی ساتھ یہ فرمانا کہ تمہارے پیدا کرنے سے مراد رزق و معاش کے مسائل حل کرنا نہیں اس کا مطلب یہی ہے کہ آدمی کو پیدا ہونے اور زندگی ملنے کے بعد زندگی کی حفاظت و بقا کے لئے سب سے پہلی فکر رزق کی جو لگ جاتی ہے اس سے بے فکر فرما دیا جائے تاکہ زندگی کی اصل مراد بندگی کی تحصیل و تکمیل میں یکسوئی سے لگے رہنے میں پیٹ کا دھندا حائل نہ ہو۔ دنیا میں بھی غلام اور غلامی کا تصور یہی رہا ہے کہ جب آقا غلام کے سارے وقت و قوت کو اپنی غلامی کے لئے گھیر لیتا ہے تو بقائے حیات بھر کی اس کی معاشی حاجتوں کی پابجائی خود اپنے ذمہ رکھتا ہے۔ یہی صاف سیدھی بات معلوم ہوتی ہے کہ درج عنوان پہلی آیت میں ایک طرف انسان سے اگر اپنی پوری کی پوری زندگی کو بندگی بنا دینے کا مطالبہ فرمایا گیا ہے تو دوسری طرف دوسری ہی آیت میں رزقی احتیاجات کی ذمہ داری نہ تنگ و دوسے سبکدوش فرماکر خود ہی اس کی ضمانت فرمائی ہے کہ روزی رساں تو دراصل صرف اللہ ہی پکی قوت والا ہے ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین۔

اہل و عیال کے نان و نفقہ کی ایک درجہ میں ذمہ داری نہ فکر و تدبیر سے مامور ہے پھر بھی سورۂ طٰہٰ میں عبد کامل بلکہ اکمل العباد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اولاً خود دن رات کے مختلف اوقات میں تسبیح یا نماز و عبادت کا حکم فرماکر ساتھ ہی اس پر آگاہ فرمایا کہ

کافروں کو دنیوی یا معاشی زندگی میں ہم نے بظاہر جو سرسبزی ولا تمدن عينيك الى ما متعنا به

وشادابی بخشی ہے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھنا یہ تو ان کے حق میں فتنہ ہے، آپ کے لئے تو بس آپ کے پروردگار ہی کا رزق بہتر و پائندہ تر ہے

ازواجا منھم زھرۃ الحیوۃ الدنیا لنفتنھم فیہ و رزق ربک خیر و ابقی۔

اس کے بعد ہی اہل و عیال کے معاملہ میں فرمایا کہ:۔

خود اپنے اہل و عیال کے متعلق بھی آپ کا اصل فریضہ ان کو عبادت یا نماز کا حکم کرنا اور اس پر جمے رہنا ہے رہا رزق یا معاش کا معاملہ تو ہم اس کا کوئی سوال یا مواخذہ آپ سے نہ کریں گے۔ رزق تو ہم خود ہی آپ کو دیں گے (اور اس میں کچھ کمی اور تنگی بھی ہو تو) اعتبار تو انجام و عاقبت یعنی آخرت (کی کامیابی) کا ہے سو وہ صرف تقویٰ (وہی عبدیت) کی زندگی سے وابستہ ہے"

و أمر اھلک بالصلوۃ و اصطبر علیھا لا نسئلک رزقا نحن نرزقک والعاقبۃ للتقوی۔

مدعا وہی کہ رزق رساں درحقیقت صرف مسبب الاسباب ہے نہ کہ وہ اسباب جن کو ہم رزق سعی و طلب میں اختیار کرتے ہیں طلب و تدبیر کی جو کچھ اجازت یا حکم ہے وہ بھی اس لئے نہیں کہ رزق کا ملنا نہ ملنا اس پر موقوف ہے بلکہ یہ بھی دراصل عبدیت ہی کی تربیت و تمرین کی ایک تدبیر ہے کہ کون اپنی طلب و تدبیر کو بالذات حصول رزق میں موثر نہ جان کر اور بالکلیہ مشیت الٰہی پر مبنی مان کر جائز و ناجائز حلال و حرام کے قائم کئے ہوئے ربوبیتی حدود و اللہ پر اپنی معاشی تدبیروں میں استوار رہتا ہے اور کون خود ان تدبیروں کا بندہ بن جاتا ہے ورنہ جس طرح پانی زمین اور ہوا کی گوناگوں ادنیٰ و اعلیٰ حیوانی مخلوقات کو رزقی طلب و تدبیر کے شعوری اختیار و تمیز کے بجائے غیر شعوری جبلت کی خاص خاص بندھی راہوں سے پیٹ پالنے کی رہنمائی کر دی گئی ہے اسی طرح انسان کو بھی اس کی حیوانی حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے کسی خاص جبلت کے سپرد کر دیا ہوتا یا فرشتوں کی طرح سرے سے پیٹ کے دھندے سے آزاد ہی رکھا گیا ہوتا شعوری اختیار کی امانت تو اسی لئے عطا ہوئی ہے تاکہ انسان اپنی روحانی و خلافتی فطرت کے کمالات کو تشریعی و تکلیفی عبدیت کی راہوں سے حاصل کر سکے اور اس کے لئے اپنے بندوں کے حال کی پوری واقفیت و بصیرت رکھنے والے (انہ کان بعبادہٖ خبیراً بصیراً) حضرت حق

"جس کو جس حال میں رکھیں اسی میں اس کو رہنا چاہئے کمل اڑھائیں تو کمل اوڑھے اور دوشالہ اڑھائیں تو دوشالہ اوڑھے۔ بھوکا رکھیں تو بھوکا رہے گھی دودھ کھلائیں تو گھی دودھ کھائے۔"

بھلا بندگی کی اس معاشیات کو خدا بننے والوں کی اس معاشیات سے کیا سروکار جس کی اندھیر نگری میں نہ کوئی

امیر امیر رہ سکتا ہے نہ غریب غریب، نہ مزدور مزدور، نہ کارخانہ دار کارخانہ دار، نہ کاشتکار کاشتکار، نہ زمیندار زمیندار سب کو اسم بے مسمیٰ اشتراکیت واشتمالیت وغیرہ کی ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔ خیر جن کے سامنے نہ اس زندگی کے آگے کوئی زندگی ہے، نہ اپنے ہی وسواسی دماغوں کی نت نئی روز روز بنتے بگڑتے والی خرافاتی آ[illegible] یا توہیوں کے سوا علم و یقین کا کوئی غیر مشکوک سرچشمہ۔ وہ غریب اندھے کی لاٹھی چلانے کے سوا آخر کر ہی کیا سکتے ہیں۔ غم و غصہ تو ان پر ہے۔ جو ایک طرف نامحدود ابدی زندگی پر ایمان کے مدعی ہیں جس کے سامنے اس "پست زندگی" الحیوٰۃ الدنیا۔ کے رنج و راحت کی بساطِ خواب کی بھی نہیں، دوسری طرف "لاریب فیہ" والی "ذالک الکتاب" کی خدائی تعلیمات کے حرف حرف کو ہر شک و شبہ سے پاک جانتے ہیں وہ اسلام کے لیبل کے ساتھ سیاسیات و معاشیات پر کتابیں لکھ لکھ کر اپنی ہی نہیں اپنے خدا و رسولؐ کی کتاب وسنت کی آوازیں اس طرح ان کی آوازوں میں ملانے کی کیوں کوشش کرتے رہتے ہیں کہ گویا آخرت کی "خیر و ابقیٰ" حیات کی طرف بلانے والی کتاب اور اُس کے لانے والے رسولؐ کے مدنظر بھی صرف اسی پست زندگی کے سیاسی و معاشی منافع ہیں اور ابدی و اعلیٰ زندگی کے مصالح یا تو سرے سے نظر انداز یا محض ضمنی و ذیلی نظر آتے ہیں۔

بہر حال اسلامی و غیر اسلامی معاشیات کا سب سے پہلا فرق تو یہی ہے کہ

(۱) اسلامی معاشیات کا بنیادی تعلق معادیات یا آخرت کی نہ ختم ہونے والی زندگی کے بناؤ بگاڑ یا فلاح و خسران سے ہے جس کی طرف اشارہ تمہیدی سطروں ہی میں کیا جا چکا اور تفصیل آئندہ مباحث میں آئے گی۔

(۲) دوسرے اسلامی معاشیات کی رو سے انسان کے رزق و معاش کا مدار "ایجاد بندہ" معاشیاتی نظریات پر قطعاً نہیں بقائے زیست کے لئے جس طرح ہر جاندار کے رزق کی ضمانت خود اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے اسی طرح مومن و کافر ہر انسان کی بھی۔

"کتنے طرح طرح کے جاندار ہیں جو اپنی روزی اپنی پیٹھ پر لادے نہیں پھرتے اللہ ہی تم کو بھی روزی دیتا ہے اور ان کو بھی (معاذ اللہ وہ اندھا بہرا نہیں کہ جب تک تم داد فریاد و احتجاج و ہڑتال کے ہنگامے نہ برپا کرو سماعت ہی نہ کرے) وہ تو سب کا حال خود ہی پوری طرح سننے اور جاننے والا ہے"

کائن من دابۃ لا تحمل رزقھا اللہ یرزقکم و ایاھم وھو السمیع العلیم۔

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ

"کوئی بھی زمین پر چلنے والا جاندار نہیں مگر اس کا رزق اللہ ہی پر ہے وہ جانتا ہے کہ کب تک کس کو زمین پر ٹھہرنا اور کب سپرد خاک ہو جانا ہے"۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا

اس وقت تک کی رزق رسانی کا وہ خود ہی ضامن ہے۔ حدیث میں تو یہاں تک اور اس قوت کے ساتھ اس ضمانت کی تصریح فرما دی گئی ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک کبھی مرتا ہی نہیں جب تک اپنا مقررہ رزق پورا نہ کرلے۔"

اِنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰی تَسْتَکْمِلَ رِزْقَهَا

مسلمان جب مسلمان تھے ان کے معاشی مسائل کا اصلی حل یہی خدائی ضمانت یا خدا کی رزاقیت تھی صحابہ اور خیر القرون کا ذکر نہیں، عام مسلمانوں کے بھی عہد عروج نہیں عین زوال کی گذشتہ صدی کے اسی ہندوستان اور اس کے پائے تخت دہلی کے ایک بزرگ حضرت شاہ اسحٰق صاحب کے متعلق ابھی وہ ہی دن ہوئے حضرت مجدد تھانوی کے ملفوظات میں پڑھا کہ

ان کی یہ تنخواہ بادشاہ کی طرف سے مقرر تھی جب انگریزوں کا دور دورہ ہوا تو بجائے عربی مہینوں کے انگریزی مہینوں سے تنخواہ ملنی شروع ہوئی جب شاہ صاحب کی تنخواہ آئی تو رسید پر دستخط کرنے اور انگریزی تاریخ لکھنے کے لئے کہا گیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا میں انگریزی تاریخ نہیں لکھوں گا لانے والے نے عرض کیا کہ اب انگریزی تاریخ ہی لکھنے کا حکم ہے ورنہ تنخواہ بند ہو جائے گی۔ آپ نے فرمایا میں کافروں کی عادت پر عمل نہیں کروں گا چاہے تنخواہ بند ہو جائے۔ خدا رزاق ہے انگریز رزاق نہیں[1]"

بظاہر کیسی چھوٹی بات پر یہ ضد تھی۔ بات چھوٹی ہو یا بڑی اصلی بات وہی ہے کہ ان کی نظر میں بس جو رزاق تھا، تھا، غیر پر ان کی نظر پڑتی ہی نہ تھی۔

یہ تو پھر بھی گئی صدی کے ایک گئے بزرگ کا واقعہ تھا راقم احقر کے خود اپنے والد مرحوم[2] کا رزق و معیشت کے معاملہ میں بارہا خالی ہاتھ ہونے پر بھی ایسی بے فکری اور اطمینان کا رنگ تھا جو اس ناخلف کو بنک میں ہزاروں کا کھاتہ رکھ کر بھی نصیب نہ ہوا۔ آج بھی اللہ تعالیٰ سے ذرا گہرا تعلق رکھنے والے ایسے ایک نہیں کئی صالح جوانوں کو جاننے کی سعادت حاصل ہے جو رزقی بے فکری کا کوئی خاص یا معتدبہ سامان نہ رکھنے پر بھی ایسی بے فکری سے اللہ کے کاموں میں لگے ہیں کہ معاش و معیشت کا مسئلہ گویا زندگی کا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اسی طرح اور بھی من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ کی کئی مثالیں وطن و دکن دونوں جگہ کی آنکھوں دیکھی سامنے ہیں۔

(۳) نفس رزق کی ضمانت کے بعد رزقی بسط و قدر یا معاشی تنگی و کشادگی کا مسئلہ ہے اس پر مفصل گفتگو تو آگے کے باب میں آتی ہے لیکن اوپر عبدیتی معاشیات کی جو تفصیل گذری اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ آج کل معاشی اونچ اور نیچ کو مٹانے کے فتنوں نے جس طرح آسمان سر پر اٹھا کر رکھا ہے اس نابرابری کا مٹانا نہ صرف اسلامی معاشیات کا مبنیٰ نہاد نہیں بلکہ عبدیت یا "بندہ پروری" کے مصالح اور خدائی مشیت کے بالکل منافی ہے۔ (بقیہ بر صفحہ ۶۴)

---

[1] الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص۱۳۱

[2] اس سلسلہ کے کچھ معروضات تجدید تعلیم و تبلیغ میں بھی قابل ملاحظہ ہیں خصوصاً دینی خادموں اور طلباء کے معاش سے متعلق۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تلاوت قرآن کے متعلق

ایک مسئلہ کی تحقیق

از محمد منظور نعمانی

اس ناچیز نے رمضان کے متعلق ایک تقریر میں اپنے ایک بزرگ کا یہ معمول نقل کیا تھا کہ وہ اس مبارک مہینہ میں دوسرے اذکار و تسبیحات کے علاوہ قرآن مجید کے تیس سے زیادہ ختم کر لیتے ہیں ـــــــ معلوم ہوا کہ بعض اہل علم نے اس کے متعلق یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ ان بزرگ کا یہ طرز عمل قابل مدح اور لائق تقلید نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن میں پورا قرآن ختم کرنے سے صراحۃً منع فرمایا ہے اور عمل بھی آپ کا یہی رہا کہ آپ نے کبھی ایک دن میں پورا قرآن ختم نہیں فرمایا۔ حالاں کہ اگر یہ کوئی اچھا کام ہوتا تو آپ ضرور اس کو کرتے۔ ذیل کی سطروں میں اسی مسئلہ کی کچھ تحقیق و تنقیح کرنے کا ارادہ ہے وباللہ التوفیق۔

بیشک بعض احادیث میں اس کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو جو روزانہ ایک قرآن ختم کیا کرتے تھے اس سے منع فرمایا پھر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان کو سات دن سے کم میں قرآن ختم کرنے کی اجازت نہیں دی اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان کو ۵ دن میں ختم کرنے کی اجازت دی اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے آخر میں ۳ دن میں ختم کرنے کی بھی اجازت دی اور اس سے کم میں ختم کرنے سے منع فرما دیا۔

اس بارہ میں سب سے زیادہ مشہور اور زیادہ واضح حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہما) کی ہے۔ یہ اجمال و تفصیل اور الفاظ و عنوان کے کچھ فرق کے ساتھ صحیحین میں بھی ہے اور سنن میں بھی ـــ زیر بحث مسئلہ پر زیادہ روشنی چونکہ صحیح مسلم کی ایک روایت کے الفاظ سے پڑتی ہے اس لیے میں اسی کے الفاظ نقل کرتا ہوں ـــ حضرت عبداللہ بن عمرو بیان فرماتے ہیں۔

کنت اصوم الدھر واقرء القرآن   میں ہمیشہ (بلا ناغہ) روزہ رکھا کرتا تھا اور ہر

كل ليلة فاما ذكرت للنبي صلى الله
عليه وسلم واما ارسل
الي فاتيته فقال لي الم
اخبر انك تصوم الدهر و
تقرء القرآن كل ليلة
فقلت بلى يا نبي الله ولم
ارد بذالك الا الخير
قال فان بحسبك ان تصوم
من كل شهر ثلثة ايام
قلت يا نبي الله اني اطيق
افضل من ذالك ... قال
فصم صوم داؤد نبي الله
فانه كان اعبد الناس .....
قال واقرء القرآن في كل
شهر قلت فاني اطيق افضل
من ذالك قال فاقرء في كل
عشرين قلت اني اطيق افضل
من ذالك قال فاقرءه في
كل عشر قلت يا نبي الله
اني اطيق افضل من
ذالك قال فاقرءه في
سبع ولا تزد على ذالك
فان لزوجك عليك
حقا ولزورك عليك
حقا ولجسدك عليك حقا

رات میں (یعنی نوافل میں) پورا قرآن پڑھا
کرتا تھا۔ پس یا تو کسی نے میرے بارہ میں رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا (اور آپ خود
تشریف لائے) یا آپ نے مجھے بلوایا اور میں آپ کی
خدمت میں حاضر ہوا۔۔۔ آپ نے مجھ سے فرمایا مجھے
خبر ملی ہے کہ تم ہمیشہ روزہ رکھتے ہو اور ہر رات میں
پورا قرآن پڑھتے ہو، میں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ!
اور میں یہ ثواب ہی کی نیت سے کرتا ہوں، اس کے
سوا میرا کچھ مقصد نہیں ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا تمہیں
اتنا کافی ہے کہ ہر مہینہ میں بس تین روزے رکھ لیا کرو،
میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں اس سے زیادہ کی
پوری طاقت رکھتا ہوں..... آپ نے فرمایا تو پھر زیادہ
سے زیادہ یہ کرو کہ اللہ کے پیغمبر داؤد علیہ السلام کے طریقہ
پر روزے رکھا کرو، وہ اللہ کے بڑے عبادت گزار
بندے تھے (انکا طریقہ یہ تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے
اور ایک دن ناغہ کرتے) اور ختم قرآن کے بارہ میں
آپ نے فرمایا کہ ہر مہینہ میں ایک قرآن پورا کر لیا کرو،
میں نے عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ کی قوت
رکھتا ہوں، آپ نے فرمایا تو بیس دن میں پڑھ لیا کرو،
میں نے عرض کیا میں اس سے زیادہ کی پوری طاقت
رکھتا ہوں آپ نے فرمایا تو پھر دس دن میں ایک قرآن
پڑھ لیا کرو، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں اس سے
زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں، آپ نے فرمایا سات
دن میں قرآن پورا کر لیا کرو اور اس سے زیادہ نہ
کرو کیونکہ تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے اور تمہارے

قال عبد اللہ فشددت فشدد علیّ۔

ملنے والوں اور مہمانوں کا بھی تم پر کچھ حق ہے اور تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے۔ حضرت عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے سختی کی یعنی نفس کے لیے مشقت کی راہ اختیار کی تو مجھ پر سختی ڈالی گئی۔

(صحیح مسلم باب النہی من صوم الدھر)

اس روایت سے چند چیزیں معلوم ہوئیں۔

(۱) ایک یہ کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو ہر رات میں یعنی روزانہ تہجد میں پورا قرآن مجید ختم کیا کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ گفتگو اسی کے متعلق کی تھی۔

(۲) دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ان کو ایک مہینہ میں ایک قرآن ختم کرنے کا مشورہ دیا پھر جب انھوں نے عرض کیا کہ میں بآسانی اس سے زیادہ کر سکتا ہوں تو آپ نے بیس دن میں ایک قرآن ختم کرنے کا مشورہ دیا اور جب انھوں نے اس کے بعد بھی یہ عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ بھی بآسانی کر سکتا ہوں تو آپ نے ان کو دس دن میں اور اس کے بعد عرض کرنے پر سات دن میں ایک ختم کرنے کی اجازت دے دی اور اس سے زیادہ سے منع فرما دیا۔ (صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں آخری اجازت سات ہی دن کی ہے)

(۳) تیسری بات حدیث کے آخری الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوئی کہ زیادہ پڑھنے سے آپ نے ان کو صرف اس لیے منع فرمایا کہ ان کی بیوی اور ان کے پاس آنے جانے والوں کی حق تلفی نہ ہو اور جسمانی صحت پر کوئی زیادہ برا اثر نہ پڑے۔

اور جامع ترمذی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے آخری دفعہ عرض کرنے پر پانچ دن میں ختم کرنے کی اجازت دی اور اس سے کم میں ختم کرنے سے منع فرمایا تھا (ترمذی ج۲ ص۱۱۸)

اس روایت سے اور اس کے علاوہ بھی کسی روایت سے معلوم نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سات دن سے کم میں یا پانچ دن سے کم میں ختم کرنے سے منع فرمانا اس وجہ سے تھا کہ ایسا کرنا فی نفسہ کوئی بری بات ہے بلکہ روایت میں صاف تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ مشورہ اس لیے دیا تھا کہ ان کے اہل خانہ کی اور دوسرے لوگوں کی حق تلفی نہ ہو اور غیر معمولی تعب و مشقت سے ان کی جسمانی صحت پر کوئی زیادہ خراب اثر نہ پڑے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض صحابہ کو آپ نے تین دن میں ختم کرنے کی بھی اجازت دی چنانچہ مجمع الزوائد میں بحوالہ معجم کبیر طبرانی سعد بن منذر انصاری سے مروی ہے۔

قلت یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم) میں تین دن میں پورا قرآن پڑھا کرتا ہوں؟

اقرأ القرآن فی ثلث قال نعم فکان یقرأ حتی توفی۔ — آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ چنانچہ زندگی بھران کا یہی معمول رہا اور تین دن میں قرآن ختم کرتے رہے۔

مجمع الزوائد ص ۲۶۹/۲ج

ان کے علاوہ بھی بہت سے صحابہ کرام سے ثابت ہے کہ تین دن میں پورا قرآن ختم فرمانے کا ان کا معمول تھا، چنانچہ مجمع الزوائد ہی میں حضرت عبد اللہ بن مسعود اور دوسرے صحابہ کرام کے متعلق اس کی روایات موجود ہیں (مجمع الزوائد جلد ثانی باب کم یقرأ فی اللیل)

بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن عمرو کو سات دن سے کم میں یا پانچ دن سے کم میں قرآن ختم کرنے کی اجازت جن وجوہ سے نہیں دی وہ ایسی چیزیں نہیں ہیں جن میں سب کا حال یکساں ہو بلکہ بعض لوگ ایسے ہو سکتے ہیں جن کے احوال میں اس سے زیادہ کی گنجائش ہو، چنانچہ جن صحابہ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۳ دن میں ختم کرنے کی اجازت دی ان کے حالات ایسے ہی ہوں گے۔ اور امام ترمذی نے ابواب القراءۃ میں اسی مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق نقل کیا ہے۔

وروی عن عثمان بن عفان انہ کان یقرء القرآن فی رکعۃ یوتر بھا۔ ص ۱۱۱/۲ج — اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ ایک رکعت میں پورا قرآن ختم کر لیتے تھے، یہ ان کا وتر ہوتا تھا۔ (یعنی وتر کی ایک رکعت اتنی طویل پڑھتے تھے۔)

اور حضرت مولانا عبد الحی فرنگی محلی نے اپنے رسالہ "اقامۃ الحجۃ" میں تمیم بن اوس بن خارجہ صحابی کے متعلق بھی کتاب الانساب للسمعانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ وہ بھی ایک رکعت میں پورا قرآن ختم کرتے تھے۔ ان کے علاوہ قتادہ و سعید بن جبیر وغیرہ متعدد اکابر تابعین کے متعلق بھی ایسا ہی نقل کیا گیا ہے[۲]۔ تو ان سب حضرات کے اس طرز عمل کی توجیہ بھی یہی ہو سکتی ہے کہ انھوں نے اپنے حالات میں اس کی گنجائش سمجھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو "نہی شفقت" پر محمول کیا اور کسی غور کرنے والے والے کو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کا حضرت عبد اللہ بن عمرو کو سات دن سے کم میں یا پانچ دن سے کم میں ختم کرنے سے منع فرمانا شفقت ہی کی بنا پر تھا۔ یہی وجہ ہوئی کہ آپ نے ان کو پہلے ایک مہینہ میں ختم کرنے کے لیے کہا

---

[۱] فی الترمذی وروی عن سعید بن جبیر انہ قرء القرآن فی رکعۃ فی الکعبۃ۔ ص ۱۱۱/۲ج [۲] قال الحافظ فی الفتح وثبت عن کثیر من السلف انہم قرؤا القرآن فی دون ذالک (ای فی اقل من ثلث) فتح الباری ص ۲۲/۲۱ج

اور اس کے بعد بار بار ان کے اس عرض کرنے پر کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں سات دن تک کی یا پانچ دن تک کی اجازت دی اگر بالفرض یہ نہی تحریم یا نہی کراہت ہوتی تو آپ ان کے عرض کرنے پر اپنے حکم کو نہ بدلتے اور دوسروں کو تین دن تک کی اجازت نہ دیتے۔ بہرحال اس کو تحریم یا کراہت کی نہی سمجھنا اور ایک دن میں پورا قرآن ختم کرنے کو مطلق معصیت یا امر قبیح قرار دینا صحیح نہیں بلکہ ایک قسم کا غلو ہے۔[۱]

اس سلسلہ میں ایک بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو کی مذکورہ بالا روایت (نیز اس مضمون کی دوسری روایات) کا تعلق صرف قیام لیل یعنی تہجد میں قرآن مجید ختم کرنے سے ہے۔ صحابہ کرام تہجد ہی میں قرآن مجید زیادہ پڑھتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عمرو وغیرہ جن حضرات کے متعلق اس کا ذکر آتا ہے کہ وہ روزانہ پورا قرآن ختم کیا کرتے تھے تو ان کا معمول رات کے نوافل ہی میں ختم کرنے کا تھا، حضرت عبداللہ بن عمرو کی جو روایت اوپر نقل کی گئی ہے اس کے الفاظ سے بھی یہ ظاہر ہے، اور امام بخاری نے عبداللہ بن عمرو کی اس حدیث کا "قیام لیل" کے ابواب میں ذکر کر کے گویا اس پر تنبیہ کر دی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ روزانہ رات کے نوافل میں پورا قرآن ختم کرنا اور اس کو بھی مستقل اور دوامی معمول بنا لینا یقیناً بڑا سخت مجاہدہ ہے اور اس میں اہل و عیال کے اور دوسرے اپنے ملنے والوں کے حقوق کے ضائع ہونے کا اور جسمانی صحت پر اثر پڑنے کا قوی خطرہ ہے اس لیے عام حکم اسکا یہی ہوگا کہ لوگوں کو اس سے منع کیا جائے لیکن اگر کبھی کبھی ایسا ہو، یا سال میں چند دنوں کوئی ایسا کرے (جیسا کہ حضرت قتادہ تابعی کے متعلق روایات میں ہے کہ وہ رمضان کے آخری عشرہ میں روزانہ رات کو ایک قرآن ختم کرتے تھے) یا کوئی اللہ کا بندہ اپنا معمول ایسا مقرر کرے کہ مثلاً دو تین منزلیں تہجد میں پڑھ لیا کرے اور باقی چند گھنٹہ دن میں تلاوت کر کے پورا قرآن ختم کر لیا کرے اور اس شخص کے حالات ایسے ہوں کہ اس طرز عمل کی وجہ سے دوسرے حقوق اللہ اور حقوق العباد میں کوئی خلل نہ پڑے تو ایسے شخص کے اس طرز عمل کو خلاف شرع یا خلاف منشاء نبوی قرار دینا یقیناً غلط ہوگا۔

ہاں اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ہی کی ایک اور روایت بھی قابل ذکر ہے، یہ روایت ترمذی اور ابو داؤد میں ہے اور اس کے الفاظ صرف اتنے ہیں:۔

---

[۱] حافظ ابن حجر اسی حدیث کی شرح میں فتح الباری میں فرماتے ہیں "واغرب بعض الظاہریہ فقال یحرم ان یقرء القرآن فی اقل من ثلث وقال النووی اکثر العلماء علی انہ لا تقدیر فی ذالک وانما ہو بحسب النشاط والقوۃ فعلی ہذا یختلف باختلاف الاحوال والاشخاص۔ فتح الباری جز ۲۱ ص ۲۲

عن عبد اللہ بن عمرو ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لم یفقہ من قرء القرآن فی اقل من ثلاث۔ (ترمذی ص۱۱۹)

عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے تین دن سے کم میں قرآن ختم کیا اس نے سمجھ کر نہیں پڑھا۔

اس کے متعلق پہلی بات تو یہی ہے کہ اس کا تعلق بھی صرف قیام لیل سے ہے اس کا ایک قرینہ تو یہی ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا عام دستور تہجد ہی میں زیادہ قرآن پڑھنے کا تھا اور دوسرا قرینہ بلکہ دوسری دلیل یہ ہے کہ "فقہ قرآن" سے مراد اگر اس کے دقائق اور معارف کا سمجھنا ہو تو وہ تو مہینوں بلکہ سالوں میں بھی مشکل ہے[۵]، اور اگر اس کے ظاہر معنی کا فہم مراد لیا جائے (جیسا کہ ظاہر اور متبادر ہے اور جیسا کہ شارحین نے سمجھا ہے) تو قرآن کی زبان اور اس کے اسلوب بیان کا ہر جاننے والا یقیناً ایک دن میں تہائی قرآن سے بہت زیادہ بلکہ بہت سے اللہ کے بندے پورا قرآن اس کے سادہ معنی کے فہم کیا تھ ختم کر سکتے ہیں۔۔۔ یہ عاجز ایسے بہت سے حضرات کو جانتا ہے جو قرآن پاک کے ظاہر معنی کے فہم کے ساتھ پورا قرآن مجید ایک دن میں آسانی سے ختم کر سکتے ہیں اور کر لیتے ہیں۔ اس لیے اس حدیث کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ جو شخص تہجد میں تہائی قرآن سے زیادہ پڑھے وہ سمجھ کر نہیں پڑھ سکے گا اور بیشک عام حال یہی ہے۔

دوسری بات اس حدیث کے بارہ میں یہ قابل لحاظ ہے کہ اس میں قرآن کے سمجھنے کی نفی کی گئی ہے ثواب کی اور مقبولیت کی نفی نہیں کی گئی ہے۔۔۔ پس اگر کوئی شخص تہجد میں بھی تہائی قرآن سے زیادہ پڑھے اور بلا سمجھے پڑھے (خواہ وہ عالم ہو یا غیر عالم) تو آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اس نے سمجھ کر نہیں پڑھا اور اس لیے فہم قرآن کی فضیلت وہ حاصل نہیں کر سکا، لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے کوئی اچھا کام نہیں کیا یا وہ اجر و ثواب اور قبول عند اللہ کا مستحق نہیں ہے۔۔۔ ہاں اگر کوئی شخص اس کو مستقل معمول بناتا ہے اور اس کی وجہ سے اس سے متعلق دوسرے حقوق اللہ یا حقوق العباد میں خلل پڑتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا یہ طرز عمل شریعت کی نگاہ میں صحیح نہ ہوگا لیکن اس میں تہائی قرآن سے کم یا بیش کی کوئی خصوصیت نہیں، اگر بالفرض کوئی شخص تہجد

---

[۵] شیخ ابن القیم زاد المعاد میں۔۔۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلی سے ناقل ہیں دخلت علی امراۃ وانا اقرء سورۃ ہود فقالت یا عبدالرحمٰن ہکذا تقرء سورۃ ہود واللہ انی فیہا منذ ستۃ اشہر وما فرغت من قراءتہا (زاد المعاد بر ہامش زرقانی ص۳۳/۱۷) میں سورہ ہود کی تلاوت کر رہا تھا کہ اللہ کی ایک بندی آگئی اور اس نے کہا عبدالرحمٰن تم سورہ ہود کو اس طرح پڑھتے ہو، خدا کی قسم میں چھ مہینے سے یہ سورہ ہود پڑھ رہی ہوں اور ابھی ختم نہیں کر سکی ہوں"۔ تو فقہ قرآن کا ایک درجہ یہ بھی ہو کہ چھ مہینے میں سورہ ہود بھی ختم نہ ہو۔"

میں روزانہ صرف ایک ہی منزل پڑھنے کا اپنا معمول مقرر کرتا ہے اور اس کے خاص حالات ایسے ہیں کہ اس معمول کی وجہ سے اس کے متعلقہ فرائض اور حقوق پر اثر پڑتا ہے تو اس کو کہا جائے گا کہ وہ اس معمول میں بھی تخفیف کرے اور اس کے لیے یہ تخفیف کرنا ہی افضل ہو گا۔

یہاں تک توسلہ کی تحقیق اور اس سے متعلقہ احادیث کی مختصر تشریح ہوئی، آخر میں یہ اور عرض کرنا ہے کہ میں نے اپنی تقریر میں جن بزرگ کے متعلق یہ ذکر کیا تھا کہ وہ رمضان مبارک میں دوسرے اذکار و تسبیحات کے علاوہ ۳۰ سے زیادہ قرآن ختم کر لیتے ہیں ان بزرگ کا معمول یہ ہے کہ وہ رمضان مبارک میں روزانہ دس دفعہ تین سوا تین پارے (چند دفعہ دن رات کی نفل نمازوں میں اور چند دفعہ نمازوں سے باہر، غرض کل تین سوا تین پارے) یومیہ دس دفعہ پڑھتے ہیں اور اس طرح رمضان کے مہینے کے ختم کے ساتھ قرآن مجید کے ان کے ۳۰ سے زیادہ ختم پورے ہو جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ طرز عمل کسی طرح بھی کسی حدیث کے خلاف نہیں پڑتا۔

رہی یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرز عمل نہ تھا، بلاشبہ یہ صحیح ہو۔ لیکن یہ سمجھنا بڑی سطحی درجہ کی غلطی ہے کہ اس قسم کے اعمال کے صحیح اور مقبول ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ بالکل وہی عمل اسی صورت اور اسی مقدار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی رہا ہو۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ليدع العمل وهو يحب ان يعمل به خشية ان يعمل به الناس فيفرض عليهم (جمع الفوائد)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض عمل کرنا چاہتے تھے (اور آپ کو وہ عمل پسند ہوتے تھے لیکن اس پسند اور چاہت کے باوجود) آپ اس عمل کو صرف اس خطرہ سے چھوڑ دیتے تھے کہ مبادا اور لوگ بھی اس کو کریں اور پھر وہ ان پر فرض کر دیا جائے۔

پس ہو سکتا ہے کہ کوئی عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت محبوب ہو اور آپ نے مذکورۂ حدیث مصلحت کی وجہ سے اس کو اپنا معمول نہ بنایا ہو۔

اور مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب سے فارغ ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وضو کے لیے پانی پیش کیا تو آپ نے فرمایا:۔

ما امرت كلما بلت ان اتوضأ ولو فعلت	مجھے اس کا حکم نہیں ہے کہ جب جب پیشاب کروں تو ضرور اسی وقت وضو کروں اور اگر

لطائف سنۃ　　　　　　میں ایسا کروں گا تو مسئلہ ہو جائے گا یعنی پھر
(جمع الفوائد)　　　　　　لوگوں کو اس کی پیروی کرنی پڑے گی۔

حالانکہ دوام وضو کی فضیلت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض موقعوں پر بیان فرمائی اور اس کی ترغیب دی ہے لیکن خود آپ نے کبھی اس کے مطابق عمل کیا تاکہ وہ سنت نہ بن جائے اور عوام مشقت میں نہ پڑ جائیں۔ لیکن جن صالحین امت کا یہ طرز عمل ہے کہ وہ ہر دم وضو کی حالت میں رہنا چاہتے ہیں ان کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ سنت نبوی کے خلاف عمل کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ کتنی بڑی غلطی ہوگی ——

بہرکیف اگر اللہ کا کوئی بندہ اتنے نوافل پڑھتا ہو، یا ذکر و تسبیح یا تلاوت قرآن میں اتنا مشغول رہتا ہو جتنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول نہ تھا تو صرف اس وجہ سے اس کے عمل کو غلط بلکہ خلاف سنت بھی نہیں کہا جا سکتا —— ہاں ہمارے لیے اس کا یقین رکھنا ضروری ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کاموں میں شب و روز مشغول رہتے تھے، مثلاً تعلیم، تربیت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اعلاء کلمۃ الحق کی جد و جہد، اور امت کے ہر طبقہ کے لیے عملی نمونے قائم کرنا، یہ سب چیزیں ہمارے نوافل اور ذکر و تلاوت سے افضل ہیں، خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں تو یہ چیزیں فرائض کے درجہ میں تھیں۔ پس ہر حال میں فضیلت تو آپ ہی کے عمل میں ہے اور آج بھی جو اس قسم کی ذمہ داریاں رکھنے والے ہیں ان کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل ہی اسوۂ حسنہ ہے لیکن رمضان مبارک میں خود آپ کے مشاغل میں بھی اس لحاظ سے جو فرق آجاتا تھا اس کو بھی ہمیں پیش نظر رکھنا چاہیے۔ نیز یہ بھولنا نہ چاہیے کہ دن میں یہ سارے کام کرنے کے ساتھ ساتھ رات کو آپ اللہ کے حضور میں اتنی اتنی دیر کھڑے ہوتے کہ پاؤں پر ورم آجاتا تھا۔
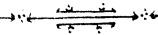
(بقیہ صہ ۵۶) مسلمان جو اپنی خدائی سے دست بردار ہو کر جو خدا ہے اسکی بندگی کا برا بھلا تھوڑا بہت اقرار کر چکے ہیں انکے ساتھ تو تنگی و فراخی یا بسطی و قدری رزق کا معاملہ خصوصاً انکی "بندہ پروری" کے مصالح پر ہی مبنی ہوتا ہو گزشتہ ہفتہ اقوال اشرف کے نام سے حضرت حکیم الامت علیہ الرحمۃ کے ملفوظات کا ایک بہت مختصر کتابچہ ناشر[1] کی عنایت سے موصول ہوا جس میں قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کی تفسیر سے ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ

"بہت سے مسلمان ایسے ہیں کہ انکا ایمان افلاس ہی سے باقی ہو اگر اللہ تعالیٰ ان کو غنی کر دیتا تو اس قدر طغیانی اختیار کریں کہ کفر تک پہونچ جائیں اور بہت سے ایسے ہیں کہ انکا ایمان ان کے غنا (خوشحالی) کی وجہ سے محفوظ ہو اگر ان پر افلاس آجائے تو کفر و الحاد میں مبتلا ہو جائیں۔" —— بس "خواجہ خود روش بندہ پروری داند" (باقی)

---

[1] اقبال بک ڈپو پٹنہ

حجاج منزل جدّہ
اور
اُس کی جامع مسجد

[گزشتہ سال حق تعالیٰ نے جب حرمین شریفین کی حاضری کی توفیق دی تو جدہ میں چار دفعہ کچھ کم و بیش ایک ایک دن حجاج منزل میں قیام ہوا اور اس لیے حجاج منزل کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھنے اور محسوس کرنے کا زیادہ موقع ملا۔ آخری دفعہ میں نے ادارۂ حجاج منزل کے صدر مولانا محمد سلیم صاحب سے اور ان کے چھوٹے بھائی حجاج منزل کے منتظم حکیم محمد نعیم صاحب سے اس بارہ میں ایک گفتگو کی اور اس میں عرض کیا کہ پوری حجاج منزل کا کام تو بہت بڑا ہے اور اگر بیسوں برس میں بھی یہ تیار ہو سکے تو بہت جلد ہی تیار ہو گی اور اب صورت یہ ہو کہ آئندہ دس بارہ برس تک حج سخت گرمی ہی کے موسم میں آئے گا اور حجاج کو ان سالوں ہی میں حجاج منزل میں سر چھپانے کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہو گی اس لیے میری رائے ہے کہ پہلے آپ حجاج منزل کی مجوزہ جامع مسجد اور اس کے ساتھ غسل خانے اور پاخانے اور اسی سے متعلق صرف چند خاص کمرے بنانے کا منصوبہ بنائیں اور اس کے مصارف کا تخمینہ کرا کے اور اس کو شائع کر کے اس کے لیے ہندستان و پاکستان کے مسلمانوں سے اعانت کی اپیل کریں اور کوششوں کی رفتار کو تیز کر دیں، اگر سال دو سال میں یہ کام ہو گیا تو اتنے ہی اللہ و رسول کے مہمانوں کو بہت کچھ آسائش مل سکے گی۔

ناظرین کو یاد ہو گا اس سفر سے واپسی پر الفرقان میں بھی میں نے اپنی اس گفتگو کا ذکر کیا تھا اس کے بعد مولانا محمد سلیم صاحب کو میں نے اس کی یاد دہانی اور تقاضے کے لیے خط بھی لکھا موصوف نے میرے اس خط کے جواب میں "جامع مسجد حجاج منزل" کا تخمینہ اور اپیل بھیجی ہے جو

کسی قدر اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کی جارہی ہے اس کے ساتھ چند اکابر کی اپیلیں بھی ہیں۔ اور یہ عاجز (مدیر الفرقان) ایک عظیم کارِ خیر سمجھ کر اس اپیل کو الفرقان میں شائع کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو توفیق دے کہ اس سعادت میں حصّہ لیں۔

جو حضرات جامع مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں لوہا، لکڑی، جیسا تعمیری سامان بھیجنا چاہیں وہ اس کے متعلق مولانا محمد سلیم صاحب سے مکاتبت کریں۔ نقد روپیہ اپنے خاص معتمد حجاج کے ذریعہ بھی بھیجا جاسکتا ہے جس کی ان کو وہاں سے رسید ملے گی اور براہ راست ڈاک کے ذریعہ رقوم بھیجنے کی صورتیں بھی ہیں جن کے تفصیلی قواعد بڑے ڈاکخانوں سے معلوم کیے جاسکتے ہیں۔]

(مدیر)

(از ادارہ حجاج منزل جدہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حجاج منزل جدہ کی تحریک کسی خاص تعارف کی محتاج نہیں۔ چار سال سے ہندو پاکستان کے ہزاروں حجاج کرام اس کی عارضی قیام گاہوں میں قیام کر چکے ہیں اور حجاج منزل کی مسجد ان مقبول بندوں کی تہلیل و تکبیر اور ذکر و عبادت سے آباد ہو چکی ہے۔ ہمیشہ سے حجاج ہند و پاکستان کے لیے جدہ کا قیام ایک مصیبت تھی۔ اس لیے حجاج منزل کی تحریک معرض وجود میں آئی۔ اور اس مقصد خیر کے لیے جلالۃ الملک عبد العزیز آل سعود نے اپنے مراحم شاہانہ سے چونسٹھ ہزار مربع میٹر کا وسیع رقبہ نئی گودی اور شہر کے قریب عطا فرمایا جس کے بعد ۱۳۶۷ھ ۱۹۴۸ء سے عام طور پر حجاج کرام نے اس زمین سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔

حجاج منزل کی تعمیر اور اس کی مختلف عمارتوں کی تیاری کا وسیع کام کارکنان منزل کے پیش نظر ہے۔ مگر آغاز تعمیر خدا کے گھر سے ہو تو یقیناً باعث خیر و برکت ہوگا۔ جامع مسجد حجاج منزل بجائے خود ایک مستقل صدقۂ جاریہ ہے۔ اس مختصر اپیل کے ذریعہ اسی دینی ضرورت کو آپ کے سامنے رکھنا ہے۔ جن خوش نصیب بندوں کو اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل و کرم سے قدرت و استطاعت کے ساتھ توفیق خیر کی نعمت عطا فرمائی ہے وہ ہمیشہ ایسے مواقع خیر کے متلاشی رہتے ہیں۔

"جامع مسجد حجاج منزل" کی تعمیر میں شرکت اُن عالی ہمت مقبول بندوں کا حق ہے جو اس کی لازوال رحمت کے امیدوار ہیں۔

اللہ کی مسجدیں وہی آباد کیا کرتا ہے جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھے، نماز پڑھتا اور زکوٰۃ دیتا ہو اور خدا کے سوا کسی سے ڈرتا بھی نہ ہو۔ (قرآن مجید)

اسی یقین پر میں آپ کو شرکت کی دعوت دے کر اجر و ثواب عظیم کا مستحق بنانا چاہتا ہوں۔
"جامع مسجد حجاج منزل" کی تعمیر کا سوال بار بار آپ کے سامنے آنے والا نہیں، رب العالمین کی رضامندی اور خوشنودی کی راہ میں دینے والوں کے لیے یہ خاص موقع ہے۔

کیا آپ اس عظیم کارِ خیر کے لیے اپنی فرض شناسی کو ہاتھ بڑھانے کی اجازت دیں گے۔؟ کیا آپ اللہ کے اس گھر کی تعمیر میں حصہ لیں گے؟ خدا داد توفیق اگر شامل حال ہے تو لائیے اور جو کچھ ہو سکے "حجاج منزل جدہ" کی جامع مسجد کے لیے جمع کیجئے، تاکہ آپ کا عطیہ خدا کے سامنے رکھ دیا جائے۔

والسلام — خاکسار
محمد سلیم عفی عنہٗ
صدر ادارۂ حجاج منزل، جدہ

(مسجد حجاج منزل کا ابتدائی تخمینہ)

۱۔ مسجد کے اندرونی تمام حصوں وغیرہ کی لاگت،	ایک لاکھ بتیس ہزار ریال
۲۔ صحن۔ برآمدوں اور گیلریوں وغیرہ کی لاگت،	ستانوے ہزار ریال
۳۔ بڑے چھوٹے گنبدوں چھت اور مناروں کی لاگت،	ایک لاکھ چھہتر ہزار ریال
۴۔ بیت الخلا، حوض، فٹ پاتھ اور بیرونی احاطۂ مسجد وغیرہ کی لاگت،	چوالیس ہزار ریال
۵۔ لکڑی کا تمام کام۔ (دروازے، کھڑکیاں وغیرہ) زمین کی بھرائی۔ جائے نمازیں، بجلی کی فٹنگ آب رسانی وغیرہ کے مصارف،	تیتیس ہزار ریال
کل میزان ——————	۴۷۵۰۰۰ ریال عہ

نوٹ:۔ (۱) مسجد میں تین ہزار سے زیادہ بیک وقت نمازیوں کی گنجائش ہوگی، اور بیرونی احاطہ تک مزید ڈیڑھ ہزار نمازی شریک ہو سکیں گے۔

---

(۲) مصارف تعمیر ریالات میں رکھے گئے ہیں۔ اس لیے کہ ریال اس ملک کا سکّہ ہے۔ آجکل سو روپیہ ہندی کا اوسطاً نرخ ۶۵ ریال ہے۔ جس کے حساب سے ایک ہزار روپیہ ہندی کے ۶۵۰ ریال ہوتے ہیں۔

چند اہم آراء کے ضروری اقتباسات

(۱) حجاج منزل کے وسط میں مسجد کا وسیع شامیانہ تنا ہوا ہو جس میں پانچ وقت ڈیڑھ ہزار کی جماعت ہوتی ہے، ہندوستانی و پاکستانی علماء اس یکجائی اجتماع کو مواعظ و نصائح سے منتفع فرماتے رہتے ہیں۔ یہ صورت جب مستقل صورت اختیار کرلے گی اور مسجد مجوزہ کے طولانی منارے اور گنبد میلوں دور سے جہاز میں نظر آیا کریں گے تو قلوب کس درجہ فرحت و طمانیت سے لبریز ہوجایا کریں گے،

(۲۶ر نومبر ۴۸ء) مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

---

(۲) وسط میں ایک وسیع شامیانہ کے نیچے نماز پڑھنے کی جگہ ہے اور ہزاروں حاجیوں کے لیے جو میدانوں اور سڑکوں کے کنارے دن رات بسر کرتے تھے ایک گونہ آرام کی جگہ مہیّا ہوگئی۔

(۷ر دسمبر ۴۸ء) خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی رئیس لکھنؤ

---

(۳) اس وسیع قطعۂ اراضی پر جو تعمیر کا نقشہ آفس میں آویزاں ہے اس کے بغور معائنہ کے بعد حرمین شریفین کے ہر زائر کو اس عظیم الشان نقشہ کے مطابق حجاج منزل و جامع مسجد کی جلد سے جلد تعمیر کی تکمیل پر عملی توجہ کرنا چاہیئے۔

(۱۳ر اکتوبر ۴۹ء) شفاء الملک حکیم نثار احمد صاحب، کلکتہ

---

(۴) منزل کے وسط میں ایک مسجد بنائی گئی ہے، جو بہت کشادہ اور ہموار ہے، مگر افسوس ہے کہ قلیل سرمایہ کی وجہ سے ابھی تک وہ صرف لکڑی کے ستونوں پر ایستادہ اور چٹائیوں سے مسقف ہے، پانچوں وقت جب کہ عظمت و جبروت والے شہنشاہ حقیقی کے بلاوے پر مؤذن حجاج کو بلاتے ہیں تو کثیر التعداد حجاج کی لمبی لمبی صفیں بندھ جاتی ہیں، اللہ اللہ یہ ایک بہت ہی پرکیف نظارہ ہوتا ہے۔

(۱۱ر نومبر ۴۹ء) خانصاحب حاجی محمد رب نواز صاحب
رئیس ڈیرہ غازی خاں

---

(۵) وسط میں حجاج کی باجماعت نماز کی ادائگی کے لیے عارضی طور پر ایک بڑا حصّہ مسقف کردیا گیا ہے،

تاکہ بارش اور دھوپ سے بچتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ دو ہزار حجاج و زائرین نماز ادا کرسکیں۔ مختلف اوقات میں دینی اجتماعات بھی یہاں مشاہدہ میں آئے، کیا اچھا ہو کہ ہندوستان و پاکستان کے مخیر حضرات اس حجاج منزل کی کچی بارکوں کو جلد از جلد پختہ کمروں کی شکل میں تبدیل کرنے کی جدوجہد فرمانے کے ساتھ اس کی مسجد کو مستحکم اور پختہ بنا کر ثواب عظیم حاصل فرمائیں اور اس کی تعمیر میں حصہ لے کر دارین کی سعادت حاصل کریں۔

(۱۲ اکتوبر ۱۹۵۰ء) الحاج مولینا مفتی محمد یونس صاحب

خطیب جامع مسجد و عید گاہ ۔ لائل پور

---

(۶) احقر عبدالقادر رائے پوری عرض کرتا ہے کہ اس سے پہلے دو دفعہ بیت اللہ شریف کی حاضری ہوئی۔ واقعی ان دونوں مرتبہ جدہ میں تکلیف دیکھی اس دفعہ حجاج منزل میں رہ کر بہت راحت اٹھائی۔ اس کی ضرورت ہو کہ مسلمان اسکی تکمیل کی طرف توجہ کریں۔ کیوں کہ اس سے ہندوستان اور پاکستان کے آنے والے حجاج کو بہت آرام ملنے کی قوی امید ہے، میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جلد سے جلد اس کو پورا کرا دے۔

(۲ نومبر ۱۹۵۰ء) حضرت مولینا شاہ عبدالقادر صاحب

(رائے پور ضلع سہارنپور)

---

(۷) جس شخص کو حجاز کی مقدس سرزمین پر حاضری کا ایک بار بھی شرف حاصل ہوا ہو وہ ان تکالیف اور زحمتوں سے خوب واقف ہو جو جدہ میں حجاج کو پیش آتی ہیں۔ غالباً حج کا مشکل ترین مرحلہ اور سب سے بڑا امتحان "باب مکہ" اور ساحل جدہ ہی پر پیش آتا ہے، "حجاج منزل" کی تعمیر ہندی اور پاکستانی حجاج کی اہم ترین ضرورت تھی۔ "مدرسہ صولتیہ" کا وجود مکہ معظمہ میں حجاج کے حق میں ایک آیۂ رحمت ہے، اور اب حجاج منزل جدہ کا وجود جدہ میں ان کے لیے ایک بے بدل نعمت ہے، اگر حجاج کو اپنی ضرورتوں کا صحیح احساس اور بعد میں آنے والوں کے ساتھ کچھ بھی ہمدردی ہے تو وہ حجاج منزل کی تکمیل کے لیے پوری کوشش کریں گے، اور جلد سے جلد اس کو اس قابل بنا دیں گے کہ وہ بیک وقت ہزاروں حجاج کے لیے فرودگاہ اور مرکز بن سکے۔ خدا کرے آئندہ سال اس میں معتدبہ اضافہ اور ترقی نظر آئے۔

(۲۱ محرم ۱۳۷۰ھ) الحاج مولینا ابوالحسن علی صاحب ندوی

۲ نومبر ۱۹۵۰ء (لکھنؤ)

استدراک

محمد منظور نعمانی

الفرقان کی گزشتہ سے پیوستہ اشاعت میں یعنی رجب کے شمارہ میں زیر عنوان "ڈیڑھ مہینہ پاکستان میں" اس عاجز نے اپنے سفر پاکستان کے جستہ جستہ کچھ واقعات لکھے تھے یہ کوئی تفصیلی روزنامچہ یا سفرنامہ نہیں تھا بلکہ جن واقعات یا جن تاثرات کو کسی حیثیت سے میں نے قابل ذکر سمجھا صرف وہی اس میں ذکر کیے تھے۔ اس سلسلہ میں اتفاق سے لاہور کے چند بزرگوں اور دوستوں سے ملاقات کا بھی ذکر آ گیا تھا اور لاہور کے علاوہ جہاں جہاں جانا ہوا وہاں کے بزرگوں اور دوستوں سے ملاقات کا کوئی مستقل تذکرہ نہیں کیا گیا تھا۔ اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ دوسرے مقامات پر اپنے بزرگوں اور دوستوں سے جو ملاقاتیں ہوئیں چونکہ ان کے لیے مجھے کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا پڑا اور اکثر و بیشتر دوسرے کاموں کے ضمن ہی میں یہ ملاقاتیں میسر آ گئیں اس لیے واقعات سفر کی ابتدائی یادداشت میں ان ملاقاتوں کا کوئی تذکرہ درج نہیں ہوا لیکن لاہور میں مجھے ان ملاقاتوں کے لیے خاص اہتمام کرنا پڑا اس لیے یادداشت میں ان کا ذکر آ گیا اور پھر اس یادداشت ہی کو سامنے رکھ کر میں نے وہ مضمون مرتب کیا جو رجب کے الفرقان میں شایع ہوا تھا ــــ بہر حال دوسرے مقامات کے بزرگوں اور دوستوں سے ملاقات کا کوئی ذکر اسی وجہ سے اس مضمون میں نہیں آیا ــــ لیکن الفرقان کے بعض ناظرین نے اس سے یہ سمجھا کہ جن حضرات کی ملاقات کا ذکر اس میں کیا گیا ہے ان کے علاوہ کسی اور قابل ذکر بزرگ سے شاید اس سفر میں مل ہی نہیں سکا اور پھر انھوں نے اس کو ایک عجیب اور غیر متوقع بات سمجھ کر مجھ سے دریافت کیا ہے کہ فلاں فلاں جگہ فلاں فلاں حضرات سے کیوں ملاقات نہیں ہو سکی اور وہ خیریت سے تو ہیں۔؟"

جن احباب نے اس قسم کے خطوط لکھے ہیں اور جن کے دلوں میں اس طرح کے سوالات پیدا ہوئے، امید ہے کہ اوپر کی سطروں سے اصل واقعہ معلوم کرکے ان کا تردد رفع ہو گیا ہوگا ـــــ تاہم ان خطوط کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اپنے جن معروف بزرگوں اور دوستوں سے اس سفر میں مختلف مقامات پر ملاقات میسر ہوئی تھی مجھے ان سب کا ذکر کرنا چاہیئے تھا کیونکہ قارئین الفرقان میں کافی تعداد ایسے حضرات کی ہو جن کو ان میں سے بہت سے حضرات کے ساتھ خاص تعلق خاطر ہے اور ان کو ان کے احوال معلوم کرنے کا اشتیاق اور انتظار رہتا ہے خصوصاً ہمارے مخدوم مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی، مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری، مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، مولانا محمد ناظم صاحب ندوی جیسے حضرات! ـــــ واقعہ یہ ہے کہ الفرقان کے ناظرین میں خاصی تعداد ایسے حضرات کی ہے جو اِن حضرات میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ نیازمندانہ اور عقیدت مندانہ یا دوستانہ تعلق رکھتے ہیں اور انھیں اِن حضرات کے ساتھ راقم سطور کا تعلق بھی معلوم ہے، پس میرے واقعات سفر کے سلسلہ میں ان حضرات سے ملاقات کا کوئی ذکر نہ ہونے سے ایسے احباب کے دلوں میں اس قسم کے سوالات کا پیدا ہونا بالکل قدرتی بات ہے۔ اگر مجھے پہلے سے اس کا احساس ہوتا تو اِن حضرات سے اپنی ملاقاتوں کا اور ان حضرات کی عنایتوں کا بھی میں اس مضمون میں ذکر کرتا۔

---

(۲)

اسی سفر کے سلسلہ کی ایک دوسری چیز جس کی مجھے وضاحت کرنا ہے یہ ہے کہ "دارالعلوم الاسلامیہ" اشرف آباد (ٹنڈو اللہ یار) کے متعلق اپنے تاثرات لکھتے ہوئے اس کے مہتمم اور روح رواں مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی کی اولوالعزمیوں اور حوصلہ مندیوں کا ذکر کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ:۔

> "طلبہ کی زندگی کا بھی جو معیار ان کے پیش نظر ہے وہ قریب قریب آج کل کے کالجوں اور یونیورسٹیوں والا معیار ہو۔ اللہ خیر کرے بے تکلف عرض ہے کہ اس بارہ میں اس عاجز کو انشراح نہیں ہو سکا، اب تک کا تجربہ یہی ہو کہ اس قسم کی ترقیاں ہمارے مدرسوں کے لیے کچھ راست نہیں آتیں لیکن اس مالک میں سب قدرت ہے۔
> يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ"

اپنے ایک مخدوم بزرگ کے توجہ دلانے سے مجھے اس کا احساس ہوا کہ جو لوگ مولانا احتشام الحق صاحب سے شخصی طور پر واقف نہیں ہیں ان کو میرے ان الفاظ سے شبہ ہو سکتا ہے کہ مولانا موصوف شاید کچھ تجدد پسند قسم کے واقع ہوئے ہیں اور وہ اپنے دار العلوم کے طلبہ کو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اسٹوڈنٹس کا نمونہ بنانے اور ان کے نقش قدم پر چلانے کا شوق یا ارادہ رکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر توجہ نہ دلائی جاتی تو شاید کبھی بھی مجھے اس کا شعور نہ ہوتا کہ میرے ان الفاظ سے کسی کو یہ شبہ بھی ہو سکتا ہو لیکن اب مجھے اس کا اعتراف ہے کہ جو لوگ مولانا کی شخصیت سے یکسر ناواقف ہوں ان کو میرے ان لفظوں سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ بہر حال اگر کسی صاحب کو ایسا خیال ہوا ہو تو وہ اس کی تصحیح فرمالیں، واقعہ یہ ہے کہ مولانا موصوف ان سطور کے راقم سے بھی غالباً کئی درجہ زیادہ تجدد پسندی سے دور ہیں، ان کا حال تو یہ ہے کہ لباس تک میں اپنے اکابر کی وضع اور طرز کے شدت سے پابند ہیں، اونچی سے اونچی مجالس میں ہمارے پرانے بزرگوں کی طرح صرف کرتا پہن کر اور بغل میں یا کاندھے پر بڑا سا رومال رکھ کر شریک ہوتے ہیں اور اس لیے قدرتی طور پر وہ اپنے دار العلوم کے طلبہ کے لیے بھی (بلکہ سب ہی مسلمانوں کے لیے) اپنے بزرگوں کے طرز زندگی ہی کو بہتر سمجھتے ہیں۔

اس عاجز نے اپنے تذکرہ سفر کی منقولہ بالا سطروں میں جو کچھ عرض کیا تھا اس سے میرا اشارہ طلبہ کی صرف رہائش اور خورد و نوش کے اُن اونچے انتظامات کی طرف تھا جو مولانا موصوف کے زیر تجویز ہیں۔ مولانا کا نقطۂ نظر اس بارہ میں مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ طلبہ کی رہائش اور خورد و نوش کا معیار اونچا ہونے سے اُن کو طلبہ کی سیرت اور ان کے عزائم میں بلندی پیدا ہونے کی توقع ہے۔ لیکن اس عاجز کو ہندوستان کی بعض مشہور دینی درسگاہوں میں اس تجربہ کے نتائج دیکھنے کے بعد اس بارہ میں اطمینان نہیں، بلکہ دوسرا خدشہ ہے، بہر حال ان سطروں سے میرا مطلب صرف اتنا ہی تھا۔

نسیمِ جانفزا

(از حمید صدیقی لکھنوی)

بھینی بھینی پھر نسیمِ جاں فزا آنے لگی
ٹھنڈی ٹھنڈی پھر مدینے کی ہوا آنے لگی

اضطرابِ دل کا ساماں پھر بہم ہونے لگا
مژدۂ لطف و کرم لے کر صبا آنے لگی

پھر سکونِ دل نے کروٹ لی کہ تڑپانے لگا
دل سے پھر بے ساختہ لب تک دعا آنے لگی

میں نے چھیڑا نغمۂ نعت اور اُدھر ہر سمت سے
جیسے کانوں میں صدائے مرحبا آنے لگی

رفتہ رفتہ سب مناظر ہو گئے پیشِ نظر
دل میں رہ رہ کر حرم کی یاد کیا آنے لگی

قابلِ نظارہ ہے کعبے کے پردے کی بہار
ہر طرف سے جھومتی کالی گھٹا آنے لگی

پھر گیا نظروں میں میدانِ احد کا لالہ زار
بن کے نکہت یادِ گلزارِ قبا آنے لگی

حبّذا اہلِ مدینہ میں سراپا گوش ہوں
مُرحبا اہلاً و سہلاً کی صدا آنے لگی

کیوں نہ ہو اپنا مشامِ جاں معطّر اے حمید
باغِ طیبہ سے نسیمِ دل کشا آنے لگی

جگر پارے

(حضرت جگر مرادآبادی)

جب تک کہ غمِ انساں سے جگرؔ انسان کا دل معمور نہیں
جنت ہی سہی دنیا لیکن جنت سے جہنم دور نہیں

جز ذوقِ طلب، جز شوقِ سفر، کچھ اور مجھے منظور نہیں
اے عشق بتا اب کیا ہوگا کہتے ہیں کہ منزل دور نہیں

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

اس نفع و ضرر کی دنیا سے، میں نے یہ لیا ہے درسِ جنوں
خود اپنا زیاں تسلیم مگر، اوروں کا زیاں منظور نہیں

میں زخم بھی کھاتا جاتا ہوں، قاتل سے بھی کہتا جاتا ہوں
توہین ہے دست و بازو کی، وہ وار کہ جو بھرپور نہیں

اربابِ ستم کی خدمت میں اتنی ہی گزارش ہے میری
دنیا سے قیامت دور سہی، دنیا کی قیامت دور نہیں

انتخاب

از ـــــــــــــ ادارہ

بعض اہم تاریخی حقیقتیں

عام اندازے کے مطابق روس میں ڈھائی کروڑ مسلمان آباد ہیں مسلمانوں کی اکثریت وسطی ایشیا اور کوہ قاف کی جمہوریتوں میں بستی ہے۔ یہ تعداد کسی واحد ملک میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہونے کے علاوہ سوویٹ یونین کے اندر ایک مضبوط اور بہت بڑے مذہبی بلاک کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس کے باوجود سوویٹ یونین میں مسلمانوں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جاتا جس کے وہ مستحق ہیں مسلمانوں کے ساتھ سوویٹ یونین کا یہ رویہ سوویٹ یونین کے اس نظریہ کا نتیجہ ہے جس کے مطابق مذہب اشتراکیت کا دشمن ہے اور اسی لئے اسے روسی حدود میں کوئی جگہ نہیں مل سکتی موقع پرست روسی سیاست داں مسلمانوں کی اہمیت صرف اس وقت محسوس کرتے ہیں جب کہ وہ مشرق وسطیٰ اور مشرق قریب کے اسلامی ملکوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں اور مقاصد کے حصول کے بعد اسلام کے اثر و نفوذ کو ختم کرنے کے لئے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرنے لگتے ہیں اس وقت انھیں مسلمانوں کی اہمیت اور ان کی سیاسی طاقت کا کوئی خیال نہیں آتا۔

۱۹۲۹ء کے مشہور مقدمہ تاشقند سے پہلے مسلمانوں کے متعلق حکومت سوویٹ یونین کی پالیسی انتہائی محتاط تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ کوہ قاف اور وسطی ایشیا کے علاقوں میں اشتراکیت نے پوری طرح ہاتھ پاؤں نہیں پھیلائے تھے اس کی جڑیں مضبوط نہیں ہوئی تھیں۔ یہ علاقے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے سوویٹ یونین میں اسلام کے مضبوط مراکز ہیں۔ مقدمہ تاشقند کے کچھ عرصہ بعد روس کو مجلس اقوام میں شامل کر لیا گیا رکن بننے کے کچھ عرصے بعد تک روس نے مذہب کے خلاف مہم نرم کر دی تھی۔ اس کا مقصد مہذب دنیا کو یہ باور کرانا تھا کہ روس اب مذاہب کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرے گا۔ لوگوں کو ان کی مرضی کے مطابق عبادت کرنے کی آزادی حاصل ہو گئی ہے لیکن ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

کچھ عرصہ بعد روسی ارباب اختیار پھر اپنے اصلی رنگ روپ میں جلوہ گر ہو گئے اور نام نہاد مسلمان جمہوریتوں میں مسلمانوں

پر عرصۂ حیات تنگ کیا جانے لگا، اگر دوسری جنگ عظیم نہ چھڑ جاتی تو مسلمانوں کے آلام و مصائب کا کبھی خاتمہ نہ ہو سکتا تھا
نازیوں کا مقابلہ کرنے اور جنگ جیتنے کے لئے حکومت روس کو مسلمانوں کی سرگرم امداد کی اشد ضرورت تھی
لیکن روسی حکام کی جارحانہ حکمت عملی کے پیش نظر یہ توقع نہ تھی کہ مسلمان جنگ میں روس کی جی کھول کر مدد کریں گے چنانچہ
مطلب براری کے لئے ماسکو کی پالیسی میں نرمی اور لچک پیدا ہو گئی۔ اس نئی حکمت عملی کا مقصد صرف مسلمانوں کو رام
کرنا ہی نہ تھا، اس کا ایک بڑا مقصد اتحادی طاقتوں پر یہ ظاہر کرنا بھی تھا کہ روس میں کسی قسم کا مذہبی تشدد نہیں ہے
اگر مذہبی تشدد ہوتا تو بھلا مسلمان روسی افواج میں کیوں شامل ہوتے اور مسلمان جمہوریتیں تن من دھن سے ماسکو
کی خیمہ برداری کیوں کرتیں

جنگ کے دوران میں مسلمانوں کو قرآن کریم اور احادیث شریف اور قانون شریعت شائع کرنے کی اجازت
دی گئی۔ ان کتب مقدسہ کی اشاعت پر ۱۹۳۰ء میں پابندی لگا دی گئی تھی بلکہ ۱۹۴۴ء میں حکومت نے چند مسلمانوں
کو حج پر بھیجنے کے لئے منتخب کیا۔ چند مساجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت دے دی گئی اور مسلمانوں کے بعض اہم شہروں
میں نئی مساجد تعمیر کی گئیں۔

مابعد جنگ:۔ یہ حالات زیادہ دیر تک قائم نہیں رہے جنگ میں اتحادیوں کی فتح نے روس کو نشۂ اقتدار میں
بدمست کر دیا مسلمانوں کے متعلق ان کی نرم پالیسی میں پھر سختی آ گئی اور اب حال یہ کہ اسلام کی جگہ اشتراکی نظریات کو مسلمانوں
پر زبردستی ٹھونسا جا رہا ہے۔ قانون شریعت پر رکیک حملے کئے جا رہے ہیں، ان پر کیچڑ اچھالی جا رہی ہے اور ان کا مضحکہ
اڑایا جا رہا ہے۔ اشتراکی اخبارات و رسائل ان نظریات کی کھلم کھلا توہین کر رہے ہیں جو مسلمانوں کے لئے جان سے زیادہ
عزیز ہیں۔ ماسکو کے حکم پر اسلامی قومیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے اور کوہ قاف اور وسط ایشیا کی اسلامی
جمہوریتوں کی تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ اشتراکی جماعت اس مسخ شدہ تاریخ کو اسلامی معاشرت اور اسلامی نظریات
پر ضرب کاری لگانے کے لئے استعمال کر رہی ہے۔ ایسے تمام مسلمان رہنماؤں کا صفایا کیا جا چکا ہے جو اسلامی رسم و رواج
میں روسی مداخلت کے خلاف تھے مسجدوں کے دروازے نمازیوں پر پھر بند ہو گئے ہیں حج کے لئے مکہ معظمہ جانے کی پھر
ممانعت ہو گئی ہے قرآن پاک کا رکھنا یا اس کی تلاوت کرنا جرم قرار دیدیا گیا ہے اور عید میلاد، عید قربان اور عید الفطر
منانے والوں کو حکومت کا باغی سمجھا جاتا ہے۔

تاریخ کی شدھی:۔ آذربائیجان کی اشتراکی جماعت کی مجلس مرکزیہ کے معتمد اول میر ظفر باگروف نے ۱۴ جولائی ۱۹۵۰ء
کو آذربائیجان کے دارالحکومت "باگو" کے دانشوروں سے خطاب کرتے ہوئے اپنی تقریر میں انیسویں صدی کی
مشہور اسلامی تحریک "مریدیت" کے خلاف خوب زہر اگلا اور اس کے شارح حضرت شمیل علیہ الرحمۃ پر خوب کیچڑ
اچھالی، اس تحریک کا مقصد، داغستان اور کوہ قاف کے دوسرے مسلمان ملکوں میں زار روس کے غاصبانہ سامراجی

اقدامات کے خلاف جدوجہد کرتا تھا۔ تاریخ میں اس تحریک اور اس کے رُوحِ رواں حضرت شمیل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چند سال پہلے کی بات ہے کہ روسی مورخین حضرت شمیل کو ایک بہت بڑا دانشور اور ترقی پسند مانتے تھے جس نے سامراجی روس کی نوآبادیاتی استحصال پسندی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ مگر اب جب کہ ماسکو کے حکم پر مسلم قومیت کو ختم کیا جارہا ہے تو یہی حضرت شمیل عثمانی شہنشاہیت کے ایجنٹ بن گئے۔ زار روس سے غداری کرنے کا الزام ان کے سر تھوپ دیا گیا ہے اور ان کی تحریک کو ایک تخریبی تحریک سے تعبیر کیا جارہا ہے جس نے روسی ثقافت کی توسیع میں رکاوٹیں پیدا کرکے اسے سخت نقصان پہنچایا۔ کریملن کے ناخداؤں کی طرف سے کوہ قاف کے علاقے کی تاریخ میں یہ تصرف نہ صرف حضرت شمیل کو تاریخ اسلام اور ترقیات اسلام میں ان کے جائز مقام سے ہٹانے کے لئے کیا گیا ہے بلکہ اس کا سب سے بڑا مقصد اسلام اور مسلمانوں کی خواہشات کی مذمت کرنا ہے۔ جو زار کے عہد میں ترقی پسند روسی ثقافت کی تہذیبی تحریک کی دشمن تھیں اور اپنی ہمہ گیریت کی وجہ سے روسی تہذیب و تمدن کو پھیلنے نہیں دیتی تھیں۔ بالگروف نے تحریک مریدیت کی مذمت کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ یہ تحریک ترکوں کے مابین اتحاد اور دنیا کے دوسرے مسلمان ملکوں کے مابین اتحاد کی داعی تھی جو ایک رجعت پسند نظریہ ہے۔ (ترجمہ) (مدینہ بجنور)

روس کی سیر

ڈھاکہ ۲۰ / جولائی۔ مسٹر مرتضیٰ چودھری جو ماسکو کی بین اقوامی اقتصادی کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد ڈھاکہ واپس آئے ہیں انھوں نے کہا روسی حکومت اپنی پوری توجہ ملک کی صنعتی اور زراعتی ترقی پر صرف کرتی ہے جس نے ملک کو ترقی و توسیع کے موجودہ دور تک پہونچا دیا ہے۔

مسٹر چودھری نے کہا روسی حکومت پسماندہ ملکوں کو امداد دینے کی بڑی خواہش رکھتی ہے لیکن وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ ان کی امداد قبول کرنے والے ملک روسی نظریات کو بھی قبول کریں۔

روسی مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر چودھری نے کہا کہ صرف ماسکو ہی میں مسلمانوں کی آبادی ساٹھ ہزار کی ہے لیکن شہر میں صرف ایک مسجد ہے جو صرف جمعہ کو کھلتی ہے اور باقی دنوں میں بند رہتی ہے ہم نے نماز جمعہ اسی مسجد میں ادا کی اور وہاں کے مسلمانوں سے تعارف حاصل کیا۔ ہم روس کی مسلمان مملکتوں کو دیکھنا چاہتے تھے لیکن آخری وقت پر ہمیں مطلع کیا گیا کہ اس بارے میں انتظامات نہیں کئے جاسکتے۔ ملک کی سیاسی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے مسٹر چودھری نے کہا روس کی برسراقتدار اشتراکی جماعت اپنے سوا کسی دوسری جماعت کا وجود برداشت نہیں کرتی ملک میں کوئی دوسری جماعت موجود نہیں ہے اور کسی شخص کو حکومت پر تنقید کی اجازت نہیں ہے ملک میں پریس کی آزادی مفقود ہے اور خبروں پر سخت سنسر عائد ہے۔

مسٹر چودھری نے روس کے نظام تعلیم کی بڑی تعریف کی اور طبی سائنس کا خاص طور پر ذکر کیا۔ آپ نے کہا وہاں تربیت یافتہ ڈاکٹروں اور لیڈی ڈاکٹروں کی افراط ہے لیکن روسی مسلمانوں میں تعلیمیافتہ افراد کی بہت کمی ہے۔ (نئی دنیا)

۷۵ سال کی عمر میں

"مکہ ۱۸ جون۔ کل سلطان ابن سعود کے محل میں ایک شہزادہ کی ولادت اور ہوئی ہے سرکاری اعلامیہ میں ہے کہ سلطان کا یہ ۴۳ واں فرزند ہے" (خبر)

ولادت مبارک ہو، قابل ذکر پہلو صرف یہ ہے کہ سلطان کا سن ماشاءاللہ ۷۵ سال سے کم نہیں اور مرد ۷۵ سال کی عمر میں بھی مرد ہی ہوتا ہے مرد کیلئے اس سن میں ولادت کوئی ایسی غیر معمولی چیز نہیں۔ اور مثالیں بھی اچھی خاصی تعداد میں ملتی ہیں گو بہت کثرت سے نہ ملتی ہوں لیکن کسی خاتون کی بھی کوئی مثال اس سن میں زچگی کی ہے؟ ۷۵ سال نہ سہی دس سال اور گھٹا کر ۶۵ سال کے سن میں سہی؟ دس نہیں بیس سال اور گھٹا کر ۵۵ میں سہی؟ — جو لوگ مرد و عورت کو جسمانی اعتبار سے ایک سطح پر لاکر شادی بیاہ کے قانون دونوں کے لئے بالکل یکساں چاہتے ہیں وہ طبعی حقایق کو ٹھکرا کر خود اپنی فہم سلیم پر کیسا ظلم کر رہے ہیں! (صدق جدید)

اسکول اور بد چلنی کے اڈے

دہلی کے مشہور غیر مسلم روزنامہ ملاپ کی تحقیقات خاص کا نتیجہ:۔

"دہلی میں کم سن لڑکیوں کے اغوا کے جس قدر واقعات ہو رہے ہیں ان کے متعلق اعداد و شمار جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۰ فیصدی یہ واقعات دہلی کے پرائیوٹ اسکولوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر ہفتہ کسی نہ کسی علاقہ سے کسی نابالغ لڑکی کے اغوا کی اطلاع موصول ہوتی ہے اور جب اس کی تحقیقات کی جاتی ہے تو اس کا تعلق کسی نہ کسی پرائیوٹ اسکول اور اس کے کسی ٹیچر سے جا ملتا ہے"

اسکولوں میں (جیسے کہ وہ ہیں) سب سے زیادہ سبق "اخلاقی بندشوں سے آزادی" کا پڑھاتے جائیے۔ کورس میں اہمیت اور مرکزیت، ڈراما، سنگیت، ناچ، ناٹک وغیرہ مرد کے لبھانے والے "آرٹس" مضمونوں کو جی بھر کر دئیے جائیے۔ اور پھر جب اس کے قدرتی نتیجے دو اور دو چار کی طرح برآمد ہونے لگیں تو چیخ چیخ کر الزام فلاں ماسٹر پر رکھنے لگیے اور بدنام فلاں لڑکی کو کرنے لگیئے! (صدق جدید)

سچی باتیں

آچاریہ شری ونوبا بھاوے کی ہندو دنیا میں شہرت و عظمت سے آپ یقیناً ناواقف نہ ہونگے گاندھی جی کے سب سے بڑے چیلے اور جانشیں اب وہی ہیں۔ ان کی عملی زندگی، ریاضت اور تپسیا، مہاتما جی کا نمونہ ہے، ان کے اصول، عقیدے، تعلیمات سب اپنے گرو کی آواز بازگشت، مگر یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ اسی اپریل کے مہینہ میں وہ بندروں کے فتنہ سے متعلق کیا فتویٰ دے چکے ہیں؟ یہ اور بات ہے کہ ہندوؤں کے انگریزی پریس نے اسے سرے سے شایع کرنا ہی خلاف مصلحت سمجھا ہو۔ ہاں تو انھوں نے علانیہ یہ کہا کہ:۔

"ہنومان کی اس اولاد کو ضرور ہلاک کر دینا چاہئیے۔ اس لئے کہ یہ اس ذخیرہ خوراک کو برباد کر ڈالتے ہیں جس کی شدید احتیاج نسل انسانی کو ہے"

یہ فرمان وہ دے رہا ہے، جو ہندو قوم کا اس وقت ایک پیشوائے اعظم ہے اور جس کے مذہب میں چیونٹی تک کی جان لینا گناہ ہے — بنارس کے مشہور معمر فاضل ڈاکٹر بھگوان داس ایم۔ اے۔ ڈی۔ لٹ وغیرہ جو اپنے

علم و فضل، دھیان، گیان اور درویشانہ ریاضتوں کے لحاظ سے پرانے ہندو رشیوں کے نقش قدم پر ہیں اور ہندوؤں کے علمی حلقہ میں مرتبہ اجتہاد رکھتے ہیں۔ ۵ار جون کے انگریزی روزنامہ لیڈر (الہ آباد) میں بھائی جی کے اس قول کی تائید ہی نہیں بلکہ انتہائی شدومد سے کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"یہ فرمان تو اپنی اہمیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ اس کو ریڈیو سے، مائیکرو فون سے، میگا فون سے ہر ہر علاقہ میں جہاں یہ موذی جانور رہیں خوب خوب نشر کیا جائے۔ اور شری ہونو باجی کے اس مضمون کی تحریر ہے کہ مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کو چاہیئے کہ پولیس اور مجسٹریٹوں کو ہدایت کریں کہ اس درندہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جائے جو حملہ کے وقت بھیڑیئے اور لگر بگھے ہی کی طرح خطرناک ہو جاتا ہے اور ان سے کہیں بڑھ کر نقصان رساں عامۂ خلائق کے حق میں ہو جاتا ہے، مجھے تو ایسا یاد پڑتا ہے کہ سر ایچ پی، موڈی (سابق گورنر یو۔ پی) اپنی تقریر میں کہہ چکے ہیں کہ ملک میں مختلف قسم کے بندروں کی آبادی کا تخمینہ ۲ کروڑ کا ہے تو اگر ہر بندر سے روزانہ نقصان کا تخمینہ ہلکے سے ہلکا ۴ ر کا ہی رکھا جائے جب بھی سالانہ نقصان مجموعی ۲ ارب روپیہ کا ہوتا ہے"۔

آگے چل کر اس موذی جانور کے ہاتھوں ہولناک عمارتی نقصانات، میونسپلٹیوں کی غفلت شعاری اور غلط کاری کا اور بہت سی کام کی چیزوں کا ذکر ہے۔ طویل مضمون تمام و کمال اُردو میں لانے کے قابل ہے۔ کم از کم ایک اقتباس تو اور سن ہی لیجیے۔

"یہ بھی عجیب سی بات ہے کہ جہاں بنارس کے متعدد محلوں کی طرح ہندو مسلم آبادی ملی جلی ہے وہاں بندر مسلمانوں کے گھر میں داخل نہیں ہوتے جہاں ان کا استقبال بندوق یا پستول سے کیا جاتا ہے برخلاف اس کے ان کے ہندو پڑوسیوں کے گھر بار کو وہ خوب جی بھر کر لوٹتے ہیں، اس بارہ میں اسلام ہندو مت سے کہیں زیادہ معقول پسند ہے"۔

کوئی مسلمان اگر اس کی آدھی آزادی سے بھی اس مسئلہ پر لکھتا تو خدا جانے اس پر کیا بیت جاتی! (صدق جدید لکھنؤ)

سیکولرازم چور دروازے سے

لکھنؤ میونسپلٹی کی طرف سے ایک نئے مجوزہ قانون کا اعلان:- "آئندہ سے ہر قصاب کو مذبح میں بکری، بھیڑ وغیرہ کے ذبیحہ کے لئے ۶ ر فی راس فیس دینا ہوگی، اور بھینس وغیرہ کے لئے ۸ ر فی راس لیکن جو قصاب بجائے ذبیحہ کے جانور کو "ہیومن کلر" نامی مشین کے ذریعہ سے ہلاک کر ڈالنا چاہیں گے اُنکے لئے کوئی فیس نہیں"

گویا جو قصاب اس روشن خیال میونسپلٹی کے حدود کے اندر اب بھی ذبح کے طریقہ پر قایم رہیں گے انھیں ہر چھوٹے بڑے جانور پر ایک روپیہ سے لے کر چھ آنے تک جرمانہ دینا ہوگا۔ اور جو ذبح کو چھوڑ کر دوسرا طریق جانور کشی

اختیار کر بیٹھے گے (جس سے اصل مقصود امریکا یا یورپ کے کسی کارخانہ کو اس کی مشین خرید کر نفع پہنچانا ہے) ان کیلئے فیس معاف رہے گی! ـــــ کتنا اچھا، کتنا لطیف طریقہ لوگوں کو ذبیحہ سے ہٹانے اور لوگوں کو حرام گوشت کھلانیکا نکل آیا۔ جبر کا جبر بھی نہ ہونے پایا اور بات کی بات بھی پوری ہوگئی۔ کیا کہنے ہیں اس نئی سوجھ بوجھ کے! (صدق جدید)

بیسوائی کی لعنت

"نئی دہلی ۷ ارجون۔ مسز پنڈت نے چین کے دورے سے واپس ہو کر آج یہاں انجمن تحفظ خواتین کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "ہندوستان میں جب تک عصمت فروشی ختم ہوگی ...... ملک صحیح معنوں میں ترقی نہ کر سکے گا" انھوں نے چین کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اس برائی کے خاتمہ کے لیے حکومت کو عملی اقدام کرنا چاہئے۔ اگر چین میں عصمت فروشی ختم کی جا سکتی ہے تو ہندوستان میں کیوں نہیں ختم کی جا سکتی"۔

شکر ہے کہ ملک کی بڑی ہستیوں میں سے کوئی ایک آواز تو بیسوائی کی لعنت دور کرنے کے حق میں بلند ہوئی ـــ گو حسرت اس کی ہے کہ وہ آواز کسی مسلمان کی کیوں نہ ہوئی

دوسری قوموں کا نقطۂ نظر جو کچھ ہو مسلمانوں کے ہاں تو ہر فرقہ اور ہر طبقہ میں بیسوائی کی حرمت شد بدایک متفقہ اور اجماعی مسئلہ ہے۔ اس کے خلاف عملی جد وجہد کے نقطہ پر بھی کاش سارے مسلمان متحد ہو جائیں!

(صدق جدید)

پاکستانی احباب کی خدمت میں!

ہم کئی ماہ سے آپ حضرات کو یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ اب رسالہ الفرقان اور کتب خانہ الفرقان کی جملہ رقوم سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگس لاہور۔ کو بھیجی جائیں۔ مگر معلوم ہوا ہے کہ بعض حضرات اب بھی کراچی بھیجدیتے ہیں۔ ایسے تمام حضرات سے گزارش ہے کہ براہ کرم اب ہمارے حساب میں کوئی رقم کراچی نہ بھیجئے۔ ہماری تمام رقوم صرف اسی پتہ پر بھیجنی چاہئیں۔

سکریٹری صاحب ادارہ اصلاح و تبلیغ
آسٹریلین بلڈنگس لاہور

نوٹ:۔ جو صاحب اس پتہ پر رقم روانہ فرمائیں وہ یہ ضرور لکھدیا کریں کہ یہ رقم الفرقان لکھنؤ کے لئے ہے۔ نیز ایک کارڈ کے ذریعہ ہم کو ترسیل زر کی اطلاع مع تاریخ۔ اپنا مکمل نام و پتہ اور مقصد ضرور بالضرور تحریر فرما دیا کریں۔ منیجر الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہندوستان سے
سالانہ چندہ :- صہ ر
فی کاپی :- ۸ ر

پاکستان سے
سالانہ :- للعہ ر (پاکستانی سکہ)
دیگر ممالک سے
سالانہ :- ۱۲ (شلنگ)

جلد ۱۹ | بابتہ ماہ ذیقعدہ ۱۳۷۱ھ | نمبر ۱۱

سُرخ پنسل کا نشان! اس بات کی علامت ہے کہ جناب کی مدت خریداری اس شمارہ پر ختم ہو گئی ہے لہذا اپنا چندہ برائے ایک سال مبلغ (پانچ روپیہ صہ) بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما کر مشکور فرمائیے، اگر ۱۰ ستمبر ۵۲ء تک جناب کا چندہ وصول نہ ہوا اور نہ کوئی اطلاع آئی تو اگلا پرچہ وی۔ پی بھیجا جائے گا جس کا وصول کرنا جناب کا اخلاقی فریضہ ہوگا

پاکستان کے حضرات اپنا چندہ سکریٹری صاحب "ادارۂ اصلاح و تبلیغ- آسٹریلین بلڈنگس لاہور" کے پتہ پر ارسال فرمائیں اور ایک کارڈ کے ذریعہ ہم کو اس کی اطلاع ضرور دیدیں، اور قدیم خریدار صاحبان اس اطلاع کے ساتھ اپنا نمبر خریداری بھی ضرور لکھیں۔ اگر آپ کے چندہ کی اطلاع ۱۰ ستمبر ۵۲ء تک موصول نہیں ہوئی تو ادارہ اصلاح و تبلیغ- لاہور سے آپ کی خدمت میں "الفرقان" بذریعہ وی- پی ارسال کیا جائے گا۔

دیگر ممالک کے حضرات اپنا چندہ ۱۲ شلنگ بذریعہ پوسٹل آرڈر دفتر "الفرقان" لکھنؤ کو ارسال فرمائیں۔ والسلام

ناظم :- الفرقان لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

پچھلے مہینے انھیں صفحات میں ہم نے ایڈیٹر "قلم انڈیا" اور اس جیسے دوسرے دریدہ دہن شاتمانِ رسولؐ کے بارے میں حکومت کی سردمہری پر اظہار تشویش کرتے ہوئے آگاہی دی تھی کہ اگر حکومت نے ان لوگوں کے خلاف سخت اقدام کر کے ان ناپاک حرکات کا سدباب نہ کیا تو ایک نہ ایک دن ضرور مسلمانوں کا پیمانۂ صبر چھلک جائے گا۔

ہم نے لکھا تھا کہ

"ہم حکومت سے اپنے نبی اور اپنے مذہب کے ناموس کے تحفظ کی بھیک نہیں مانگتے۔ مسلمانوں کی غیرت ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ وہ اس ناموس کے تحفظ کی بھیک مانگتے پھریں۔ ہم صرف حکومت کو اس طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ ملک کی تین چار کروڑ آبادی کے جذبات کے معاملہ میں ایسی لاپروائی کسی لحاظ سے بھی دانشمندی نہیں ہے۔ ہر شخص اور ہر ملت کے صبر کا ایک پیمانہ ہوتا ہے، اس میں خواہ کتنی ہی وسعت ہو مگر ایک حد ایسی ضرور آتی ہے جہاں پہنچ کر وہ اپنی ساری وسعتوں کے باوجود چھلک پڑتا ہے۔"

خدا کی شان کہ ان الفاظ کو لکھے ہوئے پورا ایک مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ ہمارا یہ اندیشہ امر واقعہ بن کر سامنے آگیا۔ الہ آباد کے ہندی روزنامے "امرت پتریکا" نے اپنی ۵ اگست کی اشاعت میں سرکار دو عالم (ہم، ہمارے ماں باپ اور ہماری اولاد آپ پر قربان) کی شان میں ایک ایسی ناپاک عبارت شایع کی کہ اگرچہ نقل کفر کفر نہیں پھر بھی زبان و قلم میں اس کے نقل کرنے کی تاب نہیں اور جب جب بھی وہ عبارت نظر سے گزرتی ہے جذبات کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہو۔ اس عبارت کا مسلمانوں کے علم میں آنا تھا کہ ان کے سینوں میں ایک آگ بھڑک اٹھی اور اس آگ نے صبر و ضبط کے اس دامن کو جلا کر خاک کر دیا جس نے اب تک ان جذبات کو چھپائے رکھا تھا۔ یوپی کی حکومت نے جب اپنی راجدھانی اور اس کے آس پاس الہ آباد اور کانپور کے شہروں کو خاص طور سے ان شعلوں کی لپیٹ میں آتا دیکھا تو اس مسئلہ کو قابل اعتنا سمجھا ——— اور ۱۴ اگست کے اخبارات سے معلوم ہوا کہ حکومت اس روزنامہ کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ مگر چونکہ اس ارادہ کا اعلان خود حکومت کی جانب سے ایک باقاعدہ کمیونک کی شکل میں نہیں ہوا (جو کہ ضروری تھا ——— نیز پچھلے تجربات کی بنا پر مسلمانوں میں حکومت کی جانب سے ایک عام مایوسی اور بے اعتمادی پھیلی ہوئی تھی اسلیے یہ خبر بھی ان میں سے بہت سوں کے جذبات کی ہیجانی کیفیت میں کمی نہ کر سکی، اور وہ ہو گیا جس کا ہمیں اندیشہ تھا۔

جو کچھ ہوا، وہ اچھا ہوا یا برا ہوا؟ اور خود مسلمانوں کے مفاد کے لیے کیسا ہوا؟ اس بحث کو رکھیے! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ یہ دیکھیے کہ جو کچھ ہوا وہ کیوں ہوا؟ اور اس کا ذمہ دار کون ہو؟ تاکہ آئندہ نہ ہو۔

ہماری قطعی رائے ہو کہ جو کچھ ہوا اس میں گو چند موقع پرستوں کی موقع پرستی کو بھی دخل ہو مگر سب سے زیادہ ذمہ دار خود حکومت ہو نہ صرف یو، پی کی حکومت بلکہ ہر اس صوبہ کی حکومت جہاں پچھلے دنوں ایسی کوئی کمینہ حرکت کی گئی اور وہاں کی حکومت نے خاموشی سے تماشہ دیکھا۔ مسلمانوں نے ہر ممکن طریقہ سے ان کو اپنے جذبات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ الارم پر الارم دیا، احتجاج پر احتجاج کیا، مگر تمام حکومتوں کا رویہ یکساں ہی رہا اور انھوں نے کوئی ضرورت اسکی محسوس نہ کی کہ اتنی بڑی آبادی کے جذبات پر مشق ستم کرنے کی آزادی پر پابندی عائد کریں اور مجروح جذبات کی تسکین کا پورا پورا سامان کریں ——— پھر کوئی

تبلائے کہ اس کا نتیجہ آخر اس کے سوا کیا ہوتا جو ہوا اور اس پر کسی کو کس منہ سے مسلمانوں سے شکایت ہوسکتی ہو۔ یہ پھل ہے اس درخت کا جسے خود یو۔پی اور بعض دوسرے صوبوں کی حکومتوں نے اپنی امتیازی پالیسی اور مسلسل تغافل سے پروان چڑھایا،

اگر حکومت چاہتی ہے کہ اب ان واقعات کا اعادہ نہ ہو تو یہ بہترین موقع ہو کہ حکومت "امرت پتریکا" کے معاملہ میں پوری غیر جانبداری اور انصاف پسندی کا ثبوت دیکر مسلمانوں کو یقین دلائے کہ اب وہ تغافل اور امتیاز کی پالیسی چھوڑ چکی ہے۔

حکومت کے بعد دوسرے نمبر پر ہم ان واقعات کا ذمہ داران موقع پرستوں کو سمجھتے ہیں جو ہر وقت اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ کوئی موقع آئے جس میں وہ اپنی لیڈری کی ہوس پوری کر سکیں۔ یہ موقع گویا آیا گویا ان کی بن آئی اور مسلمانوں کے ان پاکیزہ جذبات محبت و فدائیت کو اپنی لیڈری کا آلہ کار بنانے کے لیے انھوں نے ایک بالکل غلط راستہ پر لگا دیا اور تھوڑے سے مسلمان عوام جذبات سے مغلوب ہو کر ان کے پھانسہ میں آگیے۔ ہم ان مسلمان بھائیوں کی مذمت تو نہیں کرتے ——— کیونکہ یہ بڑی حد تک معذور تھے مگر ہمیں ان سے ایک بہت سخت شکایت ہے اور وہ یہ کہ وہ ہر اس شخص کے پیچھے چل کھڑے ہوتے ہیں جو ان کی سی کہے، خواہ وہ کتنا ہی خود غرض، کتنا ہی مکار اور کتنا ہی پست نیت کیوں نہ ہو۔ انھیں جاننا چاہیئے کہ یہ بہت ہی بُرا مرض ہے اور ایسی قوم کبھی کسی مہم میں کامیاب نہیں ہوسکتی وہ ہمیشہ اچکوں اور خود غرضوں کا کھلونا بنی رہے گی۔ جوش اور جذبات یقیناً زندگی کی نشانی ہیں جس قوم کو کبھی پھریری نہ آئے وہ یقیناً مردہ ہو مگر اس مرض سے جب تک نجات نہ ہو جوش و غیرت کا سارا سرمایہ ان اچکوں اور پیشہ وروں کے کام آئے گا اور قوم کو اپنے اس قیمتی سرمایہ سے کچھ نفع نہ ملے گا۔

ہمیں اس سلسلہ میں اپنے بھائیوں سے چند بہت صاف صاف باتیں اور بھی کرنی ہیں۔ جو انشاء اللہ ہم آئیندہ اشاعت میں عرض کریں گے۔

معارف الاحادیث

جنّت اور اس کی نعمتیں

عالم آخرت کی جن حقیقتوں پر ایمان لانا ایک مومن کے لیے ضروری ہے اور جن پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مومن و مسلم نہیں ہو سکتا ان ہی میں سے جنت و دوزخ بھی ہیں اور یہی دونوں مقام انسانوں کا آخری اور پھر ابدی ٹھکانا ہیں۔ قرآن مجید میں بھی جنت اور اس کی نعمتوں کا اور دوزخ اور اس کی تکلیفوں کا ذکر اتنی کثرت سے کیا گیا ہے اور ان دونوں کے متعلق اتنا کچھ بیان فرمایا گیا ہے کہ اگر اس سلسلے کی سب آیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو صرف انہی سے اچھی خاصی ایک کتاب تیار ہو جائے ——— اسی طرح کتب حدیث میں بھی جنت و دوزخ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صدہا حدیثیں محفوظ ہیں جن سے ان دونوں کے متعلق کافی معلومات مل جاتی ہیں۔ پھر بھی یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ قرآن مجید میں اور اسی طرح احادیث میں جنت و دوزخ کے متعلق جو کچھ بیان فرمایا گیا ہے اس کی پوری اور اصلی حقیقت کا علم وہاں پہنچ کے اور مشاہدہ کر کے ہی حاصل ہو سکے گا۔ جنت تو جنت ہے، اگر کوئی شخص ہماری اس دنیا ہی کے کسی بارونق شہر کے بازاروں کا اور وہاں کے باغوں اور گلزاروں کا ذکر ہمارے سامنے کرے تو اسکے بیان سے جو تصور ہمارے ذہنوں میں قائم ہوتا ہے، ہمیشہ کا تجربہ ہے کہ وہ اصل کے مقابلہ میں ہمیشہ بہت ناقص ہوتا ہے ——— بہر حال اس نفس الامری حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے قرآن و حدیث میں جنت یا دوزخ کے بیان کو پڑھنا چاہیئے۔

دراصل آیات یا احادیث میں جنت اور دوزخ کا جو ذکر فرمایا گیا ہے اس کا یہ مقصد ہی نہیں ہے کہ لوگوں کے سامنے وہاں کا مکمل جغرافیہ اور وہاں کے احوال کا پورا نقشہ آجائے بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں میں دوزخ اور اس کے عذاب کا خوف پیدا ہو اور وہ ان برائیوں سے بچیں جو دوزخ میں

لے جانے والی ہیں اور جنت اور اسکی بہاروں اور لذتوں کا شوق ابھرے تاکہ وہ اچھے اعمال اختیار کریں جو جنت میں پہنچانے والے ہیں اور وہاں کی نعمتوں کا مستحق بنانے والے ہیں ـــــ پس اس سلسلہ کی آیات اور احادیث کا اصلی حق یہی ہے کہ اُن کے پڑھنے اور سننے سے شوق اور خوف کی یہ کیفیتیں پیدا ہوں ـــــ اب اس سلسلہ کی چند حدیثیں درج کی جاتی ہیں۔

---

(۹۸) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ تعالیٰ اعددت لعبادی الصالحین ما لا عین رأت ولا اذن سمعت و لاخطر علی قلب بشر واقرءوا ان شئتم فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین

(متفق علیہ)

(ترجمہ) حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کیلئے وہ چیزیں تیار کی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی بشر کے دل میں کبھی ان کا خطرہ یا خیال ہی گذرا ہے اور اگر تم چاہو تو پڑھو قرآن کی آیت "فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ" (جس کا مطلب یہ ہو کہ کوئی آدمی بھی اُن نعمتوں کو نہیں جانتا جو ان بندوں کے لیے (جو راہ خدا میں اپنا محبوب مال خرچ کرنے والے ہیں اور راتوں کو عبادت خداوندی میں مصروف رہنے والے ہیں) چھپا کے اور محفوظ کرکے رکھی گئی ہیں جن میں ان کی آنکھوں کے لیے ٹھنڈک کا سامان ہے] (بخاری ومسلم)

تشریح: - یہ حدیث قدسی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات اس تصریح کیساتھ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے (اور وہ قرآن مجید کی آیت نہ ہو) تو ایسی حدیث کو "حدیث قدسی" کہتے ہیں۔ یہ حدیث شریف بھی اسی قسم کی ہے۔ اس میں اللہ کے صالح بندوں کے لیے بشارت اور خوشی کا ایک عام اور ظاہر پہلو تو یہ ہے کہ دار آخرت میں ان کو ایسی اعلیٰ قسم کی نعمتیں ملینگی جو دنیا میں کبھی کسی کو نصیب نہیں ہوئیں بلکہ کسی آنکھ نے بھی انکو نہیں دیکھا اور نہ کسی کان نے انکا حال سنا اور نہ کبھی کسی

انسان کے دل میں ان کا خیال بھی آیا۔ اور بشارت مسرت کا دوسرا خاص پہلو، محبت و شفقت اور عنایت وکرم سے بھرے ہوئے رب کریم کے ان الفاظ میں ہے کہ "اعددت لعبادی" (میں نے اپنے بندوں کے لیے ایسی ایسی نعمتیں تیار کر کے رکھی ہیں) قربان ہوں بندے اپنے رب کریم کے اس کرم پر۔

(۹۹) وعنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موضع سوط فی الجنۃ خیر من الدنیا وما فیھا (متفق علیہ)

(ترجمہ) اور حضرت ابوہریرہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں ایک کوڑے کی جگہ دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح:- عرب کا یہ رواج تھا کہ جب چند سواروں کا قافلہ چلتا تو جو سوار منزل پر اترتے وقت جہاں قیام کرنا چاہتا وہاں اپنا کوڑا ڈال دیتا پھر وہ جگہ اسی کی سمجھی جاتی اور کوئی دوسرا اس پر قبضہ نہ کرتا۔ تو اس حدیث میں کوڑے کی جگہ سے مراد دراصل اتنی مختصری جگہ ہے جو کوڑا ڈالدینے سے کوڑے والے سوار کیلئے مخصوص ہو جاتی ہے جس میں وہ اپنا بستر لگالے یا خیمہ ڈال لے۔ تو حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ جنت کی تھوڑی سے تھوڑی جگہ بھی دنیا و ما فیہا سے بہتر اور زیادہ قیمتی ہے ــــ اور اس میں کیا شبہ ہے، دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے فانی ہے اور جنت اور اسکی ہر نعمت باقی ہے اور فانی اور باقی کا کیا مقابلہ۔

(۱۰۰) عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غدوۃ فی سبیل اللہ او روحۃ خیر من الدنیا وما فیھا ولو ان امرأۃ من نساء اھل الجنۃ اطلعت الی الارض لاضاءت ما بینھما ولملأت ما بینھما ریحا ولنصیفھا علی راسھا خیر من الدنیا وما فیھا (رواہ البخاری)

(ترجمہ) حضرت انس سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا راہ خدا میں ایک دفعہ صبح کا نکلنا یا شام کا نکلنا دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے ــــ اور اگر اہل جنت کی بیویوں میں سے کوئی عورت زمین کی طرف جھانکے تو ان دونوں کے درمیان (یعنی جنت سے لے کر زمین تک) روشنی ہی روشنی ہو جائے اور مہک اور خوشبو سے بھر جائے اور اس کے سر کی صرف اوڑھنی

بھی دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ (بخاری)

تشریح :۔ حدیث کے ابتدائی حصہ میں راہ خدا میں نکلنے کی یعنی خدمت دین کے کسی سلسلہ میں سفر کرنے اور چلنے پھرنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ ایک دفعہ صبح کا یا شام کا نکلنا بھی دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ اور یہاں صبح شام کا ذکر غالباً صرف اس لیے کر دیا گیا ہے کہ صبح یا شام ہی کو سفر پر روانہ ہونے کا دستور تھا، ورنہ اگر کوئی شخص مثلاً دن کے درمیانی حصہ میں خدمت دین کے کسی سلسلہ میں جائے تو یقیناً اس کے اس جانے کی بھی وہی فضیلت ہے پھر حدیث کے دوسرے حصہ میں اہل جنت کی جنتی بیویوں کے غیر معمولی حسن وجمال اور ان کے لباس کی قدر و قیمت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس موقع پر اس کے ذکر کرنے کا مقصد غالباً اہل ایمان کو خدمت دین کے سلسلہ کے کاموں کے لیے گھر چھوڑ کر نکلنے کی ترغیب دینا اور یہ تبلانا ہے کہ اگر تم اپنے گھروں اور گھر والیوں کو عارضی طور پر چھوڑ کر تھوڑے سے وقت کے لیے بھی راہ خدا میں نکلو گے تو جنت میں ایسی بیویاں ہمیشہ ہمیشہ تمہاری رفیق اور زندگی کی شریک رہیں گی جن کے حسن وجمال کا یہ عالم ہے کہ اگر ان میں سے کوئی اس زمین کی طرف ذرا جھانکے تو زمین اور آسمان کے درمیان کی ساری فضا روشن اور معطر ہو جائے اور جن کا لباس اس قدر قیمتی ہے کہ صرف سر کی اوڑھنی اس دنیا و مافیہا سے بہتر اور بیش قیمت ہے۔

(۱۰۱) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان فی الجنۃ شجرۃ یسیر الراکب فی ظلھا مائۃ عام لا یقطعھا ولقاب قوس احدکم فی الجنۃ خیر مما طلعت علیہ الشمس او تغرب۔ (متفق علیہ)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں ایک ایسا درخت ہے کہ سوار اسکے سایہ میں سو سال چلے اور پھر بھی اسکو پار نہ کر سکے۔ اور جنت میں تم میں سے کسی کی کمان کے بقدر جگہ بھی اس ساری کائنات سے بہتر ہے جس پر آفتاب طلوع ہوتا ہے یا غروب ہوتا ہے۔ (بخاری مسلم)

تشریح :۔ حدیث کا مقصد دنیا اور اسکی راحتوں اور لذتوں کے مقابلہ میں جنت اور

اس کی نعمتوں کی بالاتری بیان فرما کے اس کا شوق دلوں میں پیدا کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں اور راحت کے جو سامان اپنے بندوں کے لیے جنت میں پیدا کر دیے ہیں ان میں سے ایک جنت کے وہ طویل و عریض سایہ دار درخت ہیں جن کا سایہ اتنے وسیع رقبہ پر پڑتا ہے کہ سوار سو سال میں بھی اس کو طے نہیں کر سکتا۔ اور دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ جنت میں ایک کمان کی جگہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ ــــــ ابھی اوپر عرض کیے اس دستور کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ کوئی سوار جب کہیں اترنا چاہتا تھا تو اس جگہ پر اپنا کوڑا ڈال دیتا تھا اس سے اس جگہ پر اس کا حق قائم ہو جاتا تھا ــــــ اسی طرح کا ایک دستور یہ تھا کہ جب کوئی پیادہ آدمی کسی جگہ منزل کرنا چاہتا تھا تو وہ اپنی کمان وہاں ڈال دیتا تھا اور اس طرح وہ جگہ اس کے لیے مخصوص ہو جاتی تھی، پس اس حدیث میں کمان کی جگہ سے مراد گویا ایک آدمی کی منزل ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایک پیادہ مسافر کمان ڈال کے جتنی جگہ کا مستحق ہو جاتا ہے جنت کی اتنی مختصر سی جگہ بھی اس دنیا کی اس ساری کائنات سے زیادہ قیمتی اور بہتر ہے جس پر آفتاب طلوع ہوتا ہے۔

(۱۰۲) عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھل الجنۃ یاکلون فیھا ویشربون ولا یتفلون ولا یبولون ولا یتغوطون ولا یمتخطون قالوا فما بال الطعام قال جشاء ورشح کرشح المسک یلھمون التسبیح والتحمید کما تلھمون النفس۔ (رواہ مسلم)

(ترجمہ) حضرت جابر سے مروی ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت جنت میں کھائیں گے بھی اور پئیں گے بھی لیکن نہ انھیں تھوک آئے گا اور نہ پیشاب پاخانہ ہوگا اور نہ ان کی ناک سے ریزش آئے گی ــ بعض صحابہ نے عرض کیا تو کھانے کا کیا ہوگا؟ (یعنی جب پیشاب پاخانہ کچھ بھی نہ ہوگا تو جو کچھ کھایا جائے گا وہ آخر کہاں جائے گا؟) آپ نے فرمایا کہ ڈکار اور پسینہ مشک کے پسینہ کی طرح (یعنی غذا کا جو اثر نکلنا ہوگا وہ انہی دو طریقوں سے نکل جایا کرے گا) اور ان اہل جنت کی زبانوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ کی حمد و تسبیح اس طرح جاری

ہوگی جس طرح تمھارا سانس جاری رہتا ہے۔ (مسلم)

تشریح :- مطلب یہ ہے کہ جنت کی ہر غذا کثیف مادہ سے پاک ایسی لطیف اور نورانی ہوگی کہ پیٹ میں اس کا کوئی فضلہ نیار نہیں ہوگا بس ایک خوشگوار ڈکار کے آنے سے معدہ خالی اور ہلکا ہوجایا کریگا اور کچھ پسینے کے راستے نکل جایا کرے گا لیکن اس پسینہ میں بھی مشک کی سی خوشبو ہوگی ___ اور اس دنیا میں جس طرح آپسے آپ ہمارے اندر سے باہر اور باہر سے اندر سانس کی آمد و رفت ہو جنت میں اسی طرح اللہ کا ذکر جاری ہوگا اور سبحان اللہ، و الحمد للہ، یا سبحان اللہ و بحمدہ سانس کی طرح ہر دم جاری رہے گا۔

(۱۰۴۲) عن ابی سعید و ابی هریرۃ قالا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ینادی منادٍ ان لکم ان تصحوا فلا تسقموا ابداً وان لکم ان تحیوا فلا تموتوا ابداً وان لکم ان تشبّوا فلا تهرموا ابداً وان لکم ان تنعموا فلا تبأسوا ابداً۔ (رواہ مسلم)

(ترجمہ) حضرت ابوسعید اور ابوہریرہ سے مروی ہے یہ دونوں بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک پکارنے والا جنت میں جنتیوں کو مخاطب کرکے پکارے گا کہ یہاں صحت ہی تمھارا حق ہے اور تندرستی ہی تمھارے لیے مقدر ہے اس لیے اب تم کبھی بیمار نہ پڑوگے اور یہاں تمھارے لیے زندگی اور حیات ہی ہے اس لیے اب تمھیں موت کبھی نہ آئے گی۔ اور تمھارے واسطے جوانی اور شباب ہی ہے اس لیے اب کبھی تمھیں بڑھاپا نہیں آئیگا اور تمھارے واسطے یہاں چین اور عیش ہی ہے اس لیے اب کبھی تمھیں کوئی تنگی اور تکلیف نہ ہوگی۔

تشریح :- جنت صرف آرام اور راحت کا گھر ہے اس لیے وہاں کسی تکلیف کا اور کسی تکلیف دہ حالت کا گزر نہ ہوگا نہ وہاں بیماری ہوگی نہ موت آئے گی نہ بڑھاپا کسی کو ستائے گا نہ کسی اور قسم کی کوئی تنگی اور پریشانی کسی کو لاحق ہوگی ___ اور جنتی بندے جب جنت میں پہنچیں گے تو شروع ہی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابدی حیات اور ابدی راحت کی یہ بشارت سنا کر ان کو مطمئن کردیا جائے گا۔

(۱۰۴۳) عن ابی هریرۃ قال قلت یا رسول اللہ مما خلق الخلق؟ قال من الماء قلنا الجنۃ ما بناءها قال لبنۃ من ذهب ولبنۃ من فضۃ وملاطها المسک الاذفر وحصباءها اللؤلؤ

والیا قوت وتربتھا الزعفران من یدخلھا ینعم ولا یباس ویخلد ولا یموت ولا یبلی ثیا بھم ولا یفنی شبابھم۔ (رواہ احمد والترمذی والدارمی)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مخلوق کس چیز سے پیدا کی گئی؟ آپ نے فرمایا پانی سے، پھر ہم نے عرض کیا کہ جنت کس چیز سے بنی ہے (یعنی اسکی تعمیر پتھروں سے ہوئی ہے یا اینٹوں سے یا کس چیز سے؟) آپ نے فرمایا اس کی تعمیر اس طرح ہے کہ ایک اینٹ سونے کی اور ایک اینٹ چاندی کی اور اس کا مسالہ (جس سے اینٹوں کو جوڑا گیا ہے) تیز خوشبو دار مشک ہے اور وہاں کے سنگریزے جو بچھے ہوئے ہیں وہ موتی اور یاقوت ہیں اور وہاں کی خاک گویا زعفران ہے۔ جو لوگ اس جنت میں پہنچیں گے ہمیشہ عیش اور چین سے رہیں گے اور کوئی تنگی تکلیف انکو نہ ہوگی اور ہمیشہ زندہ رہیں گے وہاں ان کو موت نہیں آئے گی اور کبھی ان کے کپڑے پرانے اور خستہ نہ ہوں گے اور ان کی جوانی کبھی زائل نہ ہوگی۔ (احمد، ترمذی، دارمی)

تشریح:۔ حضرت ابوہریرہ کے پہلے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا ہو کہ عام مخلوق پانی سے پیدا کی گئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے پہلے پانی پیدا کیا اور پھر اس سے اور مخلوق وجود میں آئی ـــــ قرآن مجید میں بھی فرمایا گیا ہے" وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّن مَّآءٍ" اور دوسری جگہ فرمایا گیا ہے" وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ" جس کا حاصل یہی ہے کہ ہر جاندار پانی سے پیدا کیا گیا ہے) پھر دوسرے سوال کے جواب میں جنت کی تعمیر اور وہاں کے فرش اور وہاں کی خاک کے متعلق جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے اس کی اصلی حقیقت اور کیفیت مشاہدہ ہی سے معلوم ہوگی۔ البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ جنت کی تعمیر اس طرح نہیں ہوئی ہے کہ کسی عملہ نے اسے بنایا ہو جس طرح ہماری اس دنیا میں عمارتیں بنتی ہیں بلکہ وہ جنت اور اسکی ہر چیز معماروں اور صناعوں کے توسط کے بغیر محض اللہ کے حکم سے بنی ہے جس طرح کہ زمین و آسمان اور آسمان کے ستارے آفتاب و ماہتاب وغیرہ مثلاً براہ راست اللہ کے حکم سے بنے ہیں۔

اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝

(باقی)

اب سے ایک سو چالیس برس پہلے ایک مردِ حق آگاہ کی مجلس میں

(نسیم احمد فریدی فاروقی امروہی)

تصوّر کی کارفرمائی سے تیرھویں صدی کے ثلث اول کی دہلی میں جا پہونچا۔

یہ دہلی ہے ـــــ سلطنت مغلیہ کا چراغ لال قلعہ میں ٹمٹا رہا ہے غنیمت ہے ابھی بجھا نہیں ہے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رح باوجود پیرانہ سالی پوری جد وجہد کے ساتھ ملت بیضا کی نگرانی میں مصروف ہیں اور سلطنت کے مادی سہارے کے زوال سے جو خراب نتائج پیدا ہوگئے ہیں اُن کے ازالہ کی تدبیر انھوں نے تعلیمات اسلامیہ کی ترویج و اشاعت کے اندر ڈھونڈھ لی ہے اُن کے یہاں شاگردوں اور مریدوں کا ایک جم غفیر جمع ہے اور حدیث و تفسیر کے اعلیٰ مضامین بیان ہورہے ہیں. وہ اپنے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نقش قدم پر چل کر اوران کی روایات کو زندہ رکھ کر اُن کی جانشینی کا پورا پورا حق ادا کر رہے ہیں. اس عظیم الشان محدث کے آستانہ فیض پر پہلے حاضر ہو کر اکابر اولیا کے مزارات پر حاضر ہوا. بعدہٗ شاہجہانی مسجد جامع کو عظمت کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ ـــــ حضرت مرزا مظہر جانِ جاں شہیدؒ[۱] کے مزار پُرانوار پر حاضری کا شوق غالب ہوا

---

[۱] حضرت میرزا صاحبؒ کو عام طور سے جان جاناں کہا اور لکھا جاتا ہے میں بھی پہلے ایسے ہی کہتا اور لکھتا تھا لیکن مولانا شاہ رؤف احمد صاحب رامپوریؒ نے درالمعارف میں جانِ جاں لکھا ہے اور مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اس کی صراحت کی ہے جس کے بعد کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ (فریدی)

—وہاں پہونچا— دیکھا کہ خانقاہ مظہریہ میں ایک درویش بصد انداز خسروانہ، بیٹھا ہوا، باہر کے تیز و تند جھونکوں سے بے پرواہو کر چراغِ ایمان جلا رہا ہے۔ اُس کے چہرے پر عجیب انوار ہیں۔ اُس کی باتوں میں دل لگتا ہے۔ اُس کی خاموشی میں بھی ایک کشش ہے۔ توحید کا متوالا ہے عشق رسول میں سرشار ہے کبھی قرآن مجید کی تفسیر بیان کر رہا ہے کبھی بخاری و ترمذی کا درس دے رہا ہے کبھی مکتوبات امام ربانیؒ کے معارف سبقاً سبقاً پڑھا رہا ہے۔ کبھی مثنوی مولانا رومؒ کی جانب متوجہ ہوتا ہے— پھر اُس کے ساتھ ساتھ صبح و شام کا حلقہ ہے، ذکر ہے، تلاوت ہے، رات کو تہجد ہے۔ ہند و بیرون ہند کے کثیر التعداد طالبین جمع ہیں— روزانہ آنے جانے والوں کا کوئی شمار نہیں۔ خانقاہ میں باقاعدہ مقیم رہ کر منازل سلوک کو طے کرنے والے لگ بھگ ڈیڑھ سو ہیں ان سب کے معمولات اور ظاہری و باطنی حالات کی پوری نگرانی ہو رہی ہے اُن میں اکثر غریب و نادار ہیں مگر توکل و قناعت کا مجسمہ ہیں— اپنے ایمان کو سنوارنے آئے ہیں، اپنے مرشد کے قدموں سے لگے بیٹھے ہیں اور ایک زندہ و تابندہ عمل کو سامنے رکھ کر اتباعِ سنت کی مشق کر رہے ہیں اور یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ جی چاہی زندگی نہیں گزاریں گے بلکہ وہ زندگی گذاریں گے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کا پیام اللہ کی طرف سے پہنچایا ہے۔

میں دریافت کرنا چاہتا تھا کہ یہ کون بزرگ ہیں؟ مجمع میں اگرچہ قاری امام الدین نخشبی امروہیؒ بھی بیٹھے تھے (جو کہ قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی کے استاذ ہیں) مگر وہ مجھ سے فاصلے پر تھے —یکایک میری ملاقات حضرت شاہ رؤف احمد رافت مجددی رامپوریؒ سے ہوگئی۔ اس سے پہلے غائبانہ طور پر اُردو فارسی کے ایک ادیب کی حیثیت سے میں اُن سے واقف تھا مگر یہاں اُن کو خاص درویشانہ رنگ میں دیکھا۔ یہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد میں اُس شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جو رامپور میں مقیم ہوگئی ہے۔ حضرت شاہ ابوسعید مجددیؒ، حضرت شاہ احمد سعید مجددیؒ اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددی مہاجرؒ (استاذ مولینا نانوتویؒ) کے قریبی رشتے دار ہیں۔

میں نے ان سے عرض کیا ان بزرگ کے کچھ حالات بتلایئے— انھوں نے فرمایا میرے پیر و مرشد

حضرت شاہ غلام علی صاحب نقشبندی مجددی ہیں حضرت مرزا مظہر جان جاں شہیدؒ کے خلیفہ و جانشین ہیں۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں (۱۱۷۰ھ) پنجاب سے دہلی آ گئے۔ اپنے مرشد کی وفات (۱۱۹۵ھ) تک سلوک کی تکمیل کی، بعدہٗ اُن کی قائم مقامی میں رشد و ہدایت کے اندر مشغول و مصروف ہیں۔ میں نے کہا اتنا کثیر مجمع رہتا ہے آخر خانقاہ کے مصارف کی کیا صورت ہے؟ فرمایا اس کو نہ پوچھو بس خزانۂ غیب سے سب انتظام ہو رہا ہے۔ حضرت والا خود فرمایا کرتے ہیں کہ میرا خزانہ تو اللہ کے وعدے ہیں یہ مجمع تو کچھ بھی نہیں اس سے زائد مجمع ہوتا ہے سب کو کھانا ملتا ہے سب کی تواضع کی جاتی ہے ــــ خودداری کا یہ عالم ہے کہ نواب ٹونک نے ایک مرتبہ لکھا کہ خانقاہ کے مصارف کے لئے کچھ مقرر کر دیا جائے تو حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ نواب صاحب کو یہ شعر لکھ کر بھیج دو ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم
با میر خاں بگوئے کہ روزی مقرر است

(ہم فقر و قناعت کی آبرو کو برباد نہیں کریں گے۔ نواب امیر خاں والی ٹونک سے کہدو کہ روزی اللہ تعالیٰ کے یہاں سے مقرر ہے)

یہ شعر سن کر میرے اوپر عجیب کیفیت طاری ہوئی اور معاً رقعات عالمگیری کا وہ واقعہ ذہن میں گھومنے لگا کہ حضرت عالمگیر اورنگ زیبؒ ایک درویش کے پاس پہنچے تھے اور ان سے اُن کی خانقاہ کے مصارف کے لئے جاگیر دینے کی خواہش ظاہر کی تھی درویش نے یہ شعر پڑھ دیا تھا۔

شاہ ما را دہ دہد منت نہد
رازقِ ما رزق بے منت دہد

میں نے کہا کہ ان کے کچھ ملفوظات بھی جمع کئے گئے ہیں۔ یہ سن کر انھوں نے اپنی بیاض درالمعارف نکالی جو فارسی زبان میں تھی ــــ اور فرمایا کہ اس میں لکھے ہوئے ہیں دیکھ لو مگر یہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۲۳۱ھ سے یکم شوال ۱۲۳۱ھ تک کے یعنی صرف ساڑھے پانچ مہینے کے ملفوظات ہیں ان کی تاریخ اور دن

بھی درج ہے ــــ آخر میں تھوڑے سے ملفوظات بغیر قید تاریخ ہیں۔

ڈھائی سو صفحے سے زیادہ کی یہ کتاب میں نے اوّل سے آخر تک دو مرتبہ پڑھی۔ اس کے پڑھنے سے دل کو عجیب کیفیات وجذبات نصیب ہوئے۔ اس میں توحید وسنت کے اسرار، سلوک و تصوف کے رموز، بزرگان دین کے حالات اور اخلاقی ومعاشرتی ہدایات سب چیزیں موجود ہیں میں نے اس مجموعہ میں سے رموز سلوک وتصوف (جو بڑی تعداد میں ہیں اور بڑے لوگوں کے سمجھنے کے ہیں) اور چند اور باتوں کے علاوہ باقی ملفوظات کو اُردو زبان میں ترجمہ کرلیا ــــ تاکہ میں ان بزرگ کی باتیں ان لوگوں تک پہنچا دوں، جو اِن سے مل نہیں سکے اور براہِ راست فارسی زبان کی کتاب سے کماحقہٗ مستفیض نہیں ہو سکتے۔

بعد کو مؤرخ نے بتایا کہ ۱۲۳۹ھ میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی دنیا سے چل بسے اور بقول مومن خاں مومن ؎

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں، لطف وکرم، فضل وہنر، علم وعمل

اس کے اگلے ہی سال ۱۲۴۰ھ کو دہلی کا نقشبندی، مجددی مظہری درویش بھی رخصت ہوگیا، جو اللہ کے نام کا عاشق۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اداؤں کا شیدا تھا اور جس نے اپنے جیتے جی چار دانگ عالم میں توحید وسنت کا غلغلہ ڈال رکھا تھا ــــ اور جس کو مدینہ اور رونق مدینہ سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ باوجود انتہائی ضبط کے واشوق المدینہ، واشوق المدینہ واحسرۃ المدینہ ــــ کا دل ہلا دینے والا نعرہ اُس کی زبان سے نکل جاتا تھا اور آج تک یہ محسوس ہوتا ہے کہ فضاؤں میں یہ آواز گونج رہی ہے۔

رہے نام اللہ کا ــــــــ نور اللہ مضجعہٗ[۱]
۱۲۴۰ھ

اب اس بزرگ کے ملفوظات سنیئے :ــــــــ

---

[۱] نور اللہ مضجعہٗ حضرت شاہ غلام علیؒ کی تاریخ وصال ہے۔ "آثار الصنادید" فریدی

فرمایا ـــ شیخ عبدالحق محدث رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خط خواجہ حسام الدین خلیفہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کو لکھا ہے اُس میں تحریر ہے کہ شیخ احمد سلمہ اللہ تعالیٰ کی آمد سے میرے دل کے حالات دگرگوں ہوگئے اور "غشاوۂ بشری" میرے دل میں نہیں رہا اور یہ بات خاطر نشین ہوگئی کہ ایسے بزرگوں سے بداعتقاد نہیں ہونا چاہیئے ـــ اس لفظ "غشاوہ" سے پتہ چلا کہ شیخ محدث کے اعتراضات جو انھوں نے حضرت مجددؒ پر کئے ہیں از راہِ بشریت تھے نہ از راہِ حقیقت یہ بات شیخ محدث کے پچھلے تمام اعتراضات کا جواب ہے۔

حضرت خازن الرحمۃ خواجہ محمد سعید و عروۃ الوثقی حضرت خواجہ محمد معصوم رحمہما اللہ کا ذکر آیا اُس پر فرمایا کہ حضرت خواجہ باقی باللہ نوراللہ مرقدہٗ نے فرمایا ہے کہ "اولادِ شیخ احمدؒ جواہر پارے ہیں" وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ یہ دونوں صاحبزادے "مقاماتِ حضرت مجدد الف ثانیؒ" کی انتہا کو پہونچے ہوئے ہیں۔

کسی نے عرض کیا کہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ محمد معصومؒ تجدید میں حضرت مجدد کے شریک ہیں فرمایا جزماً و یقیناً یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ البتہ حضرت مجددؒ نے اُن کے بارے میں یہ ضرور فرمایا ہے کہ ہمارا اور تمہارا معاملہ صاحب شرح وقایہ کا اپنے دادا کے ساتھ والا معاملہ ہے کہ اُن کے دادا وقایہ کو جتنا تحریر کر لیتے تھے، صاحب شرح وقایہ اتنا ہی حصہ یاد اور حفظ کر لیتے تھے یعنی جو کچھ معارف میرے اوپر کھلتے ہیں تم اُن کو (معاً) حاصل کر لیتے ہو۔

فرمایا ـــ حضرت خواجہ ضیاء اللہ خلیفہ خواجہ محمد زبیرؒ آخر شب میں گریہ وزاری کیا کرتے تھے اور لوگوں کو تنبیہاً بیدار کرتے تھے اور فرماتے تھے، افسوس ہے تمہارے حال پر ـــ تم دعویٰ محبت کرتے ہو ـــ اور حال یہ ہے کہ تمہارا محبوب حقیقی بیدار ہے۔ تمہاری طرف متوجہ ہے اور تم ہو کہ غافل پڑے ہو، تم دعویٔ محبت میں جھوٹے ہو عاشقوں کا تو یہ حال ہوتا ہے ؎

مجنوں بخیالِ زلفِ لیلیٰ در دشت   در دشت بجستجوئے لیلیٰ می گشت
می گشت بدشت و بر زبانش لیلیٰ   لیلیٰ می گفت تا زبانش می گشت

فرمایا ـــ آدمی کو چاہئے ہمہ وقت متوجہ الی اللہ رہے اور ہر وقت اور ہر فعل میں انوار و اسرار اور فیوض و برکات کی تمیز کرے مثلاً جب نماز پڑھے تو اس بات پر دھیان دے کہ انوار و برکات

کس کیفیت کے ساتھ آرہے ہیں۔ قرآن پڑھتے وقت غور کرے کہ اب کس نوعیت کے انوار ہیں۔ اسی طرح اس کا خیال کرے کہ درود پڑھنے میں کیا فیض آرہا ہے لا الہ الا اللہ پڑھنے میں کیا برکات ظہور پذیر ہوئے ہیں مطالعہ حدیث سے کیا کیا اسرار منکشف ہوتے ہیں ـــــ اسی طرح مضرات کا خیال کرے کہ منہیات و مشتبہات سے مثلاً لقمہ مشتبہ سے کیا ظلمت آئی غیبت سے کیا ضرر باطن کو پہونچا ـــــ دروغ گوئی سے دل پر کیا تاریکی چھائی علیٰ ہذا القیاس تمام مناہی میں اپنا ضرر سمجھے اور ان سے پرہیز کرے۔

فرمایا ـــــ "خطرات" مرتبہ ولایت میں ضرر پہونچاتے ہیں، مرتبہ کمالات نبوت میں "خطرہ نیک" مضر نہیں ـــ چنانچہ دیکھو امام الاصفیا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ عین حالت نماز میں تدبیر جنگ اور درستی صف لشکر فرماتے تھے ـــ اور ان خیالات سے ان کی حضوری دل میں فرق نہیں آتا تھا ـ

فرمایا ـــــ طریقہ نقشبندیہ میں دو چیزیں (خاص طور پر) اختیار کی جاتی ہیں۔ ایک اتباع سنت دوسری توجہ بقلب ـــــ جیسا کہ صحابہ کرام کا طریقہ تھا صحابہ کرام کمالات کے اندر تمام اولیا امت سے افضل ہیں ـــ کمالات صحابہ اصول کی حیثیت رکھتے ہیں اور کمالات اولیا فروع ہیں پس جس طریقہ میں طور و نہج صحابہ ہوگا وہ افضل ہوگا ۔

فرمایا ـــــ الہام چند قسم کا ہوتا ہے (۱) القار خداوندی (۲) صدائے فرشتہ (۳) ندائے روحانی (۴) آواز نفس مطمئنہ

فرمایا ـــــ "فنا" زوال آرزو کا نام ہے ایک بزرگ نے اسی کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎ تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا تری آرزو ہے اگر آرزو ہے

فرمایا ـــــ مرد باتمیز (درویش) دو چیزیں شکستہ اور دو ثابت رکھتا ہے۔ دل اور پاؤں شکستہ اور دین و یقین ثابت ۔

فرمایا ـــــ ایمان باللہ فرض ہے لیکن تین باتیں خاص طور پر ملحوظ رہیں

(۱) اللہ کی وحدانیت پر پورا ایمان

(۲) یہ یقین کرے کہ جو امر وقوع میں آتا ہے قضا رالٰہی سے وقوع میں آتا ہے

(۳) ہر فرحت و غم اور ہر مسرت و الم جو پیش آئے اس کو حق تعالیٰ کی طرف سے جانے — درد و غم سے شاداں اور صدمہ و رنج سے خنداں ہو

فرمایا — فقر و فاقہ کمال طریقہ ہے — درویشوں کو طریقہ پیغمبر خدا اختیار کرنا چاہئے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات یہ تھے کہ انتہائی بھوک کی وجہ سے پتھر پیٹ پر باندھتے تھے توکل کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بلا پر صبر اور عطا پر شکر فرماتے تھے — آپ کے متعلق قلت طعام کی بہت سی احادیث وارد ہیں چنانچہ شمائل ترمذی میں آیا ہے — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کی روٹی سے بھی دو دن متواتر اپنا پیٹ نہیں بھرا — فقراء نے کہا ہے کہ فاقہ کی رات درویشوں کی لیلۃ المعراج ہے۔

محفل مبارک میں ذکر آیا — کہ صحابہ کے بعد قرن تابعین میں کون فاضل تر ہے؟ آپ نے فرمایا اس مسئلہ میں اختلاف ہے بعض نے بسبب نسب و عبادت حضرت امام العارفین زین العابدین رضی اللہ عنہ کو فضیلت دی ہے۔ بعض نے فقر و زہد اور افراط محبت رسول کو پیش نظر رکھ کر حضرت اویس قرنی قدس سرہ کو افضل قرار دیا ہے بعض نے ترویج شریعت و تجدید ملت کا لحاظ کر کے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو ترجیح دی ہے اور بعض نے طریق طریقت کے اجرا کی بناء پر حضرت حسن بصری نور اللہ مرقدہ کو بہتر کہا ہے۔

میاں رمضان شاہ خلیفہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مجلس میں اپنا ایک خواب بیان کیا کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اس جہاں سے رحلت فرماگئے اور حضرت ام کلثومؓ دیدۂ پُرنم سے آنسو بہا رہی ہیں میں بھی رو یا اور شدت الم سے بیدار ہو گیا میں اس خواب کی تعبیر میں حیران ہوں۔ حضرت نے فرمایا تم سے امر معروف ترک ہوا ہو گا یا آئندہ ایسا ہو گا

اس تعبیر پر ایک واقعہ سنایا کہ عالمگیر بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ سرکار دو عالم کی وفات ہو گئی اسی دن حضرت علم اللہ[۵] رائے بریلوی کی وفات واقع ہوئی۔

---

[۵] حضرت سید علم اللہ نقشبندی حضرت سید آدم بنوری کے خلفاء کبار میں سے تھے، اتباع سنت اور عمل بالعزیمت میں دور دور نظیر نہیں رکھتے تھے آپ کی اولاد میں حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ ہوئے ہیں تفصیلی حالات کیلئے ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہیدہ

ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہا کہ مکتوب شیخ احمدؒ میں ایسا لکھا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کون شیخ احمدؒ؟ اس نے کہا شیخ احمد سرہندی، اس پر فرمایا ــــ میری مجلس سے اٹھ جاؤ بہت نا شائستہ میرے پیر کا نام اس طرح لیتے ہو (ادب واحترام کے ساتھ نہیں لیتے)

سفر حجاز کا ذکر آیا تو فرمایا ــــ بیت اللہ شریف کے نام سے عجیب انوار محیط ہو جاتے ہیں اور میرا دل شوق طواف میں اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔

نسبت مجددیہ کا ذکر آیا ــــ تو آپ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا الٰہی زندگی میں۔ نزع میں ــ اور قبر میں اس نسبت شریفہ سے بہرہ ور رکھنا اور حشر و نشر بھی اسی کے ساتھ کرنا

فرمایا ــــ بوقتِ دعا انوار و برکات آتے ہیں لیکن یہ فرق کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ انوارِ دعا ہیں یا انوارِ قبولیت ــــ بعض اکابر نے لکھا ہے کہ اگر دعا کے وقت دونوں ہاتھ بوجھل معلوم ہوں تو یہ علامت قبولیت ہے اور میں اس طرح امتیاز کرتا ہوں کہ اگر دعا کے وقت قلب کو بشاشت حاصل ہو تو یہ علامت قبولیت ہے ورنہ انوارِ دعا ہیں۔

فرمایا ایک روز حضرت مرزا صاحب شہیدؒ نے ایک کام کے لئے دعا کی، انوارِ دعا آئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ امید قبولیت ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ کام نہیں ہوگا چنانچہ بحکم الٰہی وہ کام وقوع میں نہیں آیا۔

فرمایا ایک روز حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک کام کے لئے میں نے دعا کی ایسا محسوس ہوا کہ دعا ابھی قبول نہیں ہوئی ــــ پھر دعا کی پھر عدم قبولیت معلوم ہوئی، اس کے بعد پھر دعا کی تب میرے قلب میں انبساط و انشراح پیدا ہوا ــــ میں نے دل میں کہا دعا ضرور ہم آغوش مدعا ہوگئی چنانچہ بفضل الٰہی وہ کام بر آیا۔

فرمایا ــــ بازار میں تجارت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس نیت سے ہو کہ مخلوق خدا کی حاجت رفع ہوگی اور اس کے ساتھ موثر حقیقی کو سبب اور اسباب کو نہ جانے

فرمایا ــــ حضرت خواجہ محمد زبیر قدس سرہٗ مصری اپنے منھ میں رکھتے تھے اور کلام کم کرتے تھے۔

اس لئے کہ انسان پر بہت سی آفات زبان ہی کی بدولت آتی ہیں اور خموشی بہت سی بلاؤں کو دفع کرتی ہے، پھر مثنوی مولینا روم کا یہ شعر پڑھا ؎

اے زباں ہم رنج بے درماں توئی اے زباں ہم گنج بے پایاں توئی

ایک محفل میں یہ شعر بار بار پڑھا

بعشقت گر جنوں پیدائی کردم چہ می کردم چوں مجنوں سر سوئے صحرائی کردم چہ می کردم

فرمایا بیعت تین قسم کی ہوتی ہے۔

(۱) بیعت توسل (۲) بیعت برائے رفع معاصی۔ (۳) بیعت برائے کسب سلوک

طلب حق جل مجدہ کا ذکر آیا ــــ حضرت نے یہ دوہرہ پڑھا

بِکٹ کہانی میں کہوں سنو سکھیو تم آئے پی کو ڈھونڈھن میں گئی آئی آپ گنوائے

یعنی میں (مختصر) افسانۂ عشق بیان کرتا ہوں اے دوستو سُنو میں نے جستجوئے محبوب میں آخرکار خود ہی کو گم کر دیا اُس کا پانا تو درکنار[۱]

فرمایا ــــ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب نفس مطمئنہ ہوجاتا ہے شرح صدر حاصل ہوجاتا ہے۔ اس منزل میں ایمانیات کے اندر انسان محتاج دلیل نہیں رہتا ــــ امر نظری ــ بدیہی ــــ اور امر اعتقادی کشفی ہوجاتا ہے۔

ایک روز شدت ضعف قلب کے باعث اُٹھ کر بیٹھنے کی طاقت نہیں تھی ایک خادم نے عرض کیا ــــ حضرت کو کمال ضعف ہے اس کا ازالہ ادویات کے ذریعہ کرنا چاہیئے یہ سن حرارت محبت الٰہی جوش میں آئی اور بے اختیار ہوکر یہ شعر پڑھا

ہرچند پیر خستہ دل وناتواں شدم ہرگہ کہ یاد روئے تو کردم جواں شدم

اور اُٹھ کر بیٹھ گئے ــ اہل طریقہ کو توجہ دی۔

---

[۱] شاہ رؤف احمد مجددیؒ نے اس موقع پر لکھا ہے کہ خود کو گم کر دینا ہی اُس کا پانا ہے اور یہ شعر لکھا ہے ؎

رفتم از خویشتن نگارم آمد بے خودی طرفہ بکارم آمد

ایک دن فرمایا ـــــ میرا دل چاہتا ہے کہ میرے مرشد کی یہ خانقاہ وسیع ہو جائے۔ پھر فرمایا کہ میں اہل وعیال نہیں رکھتا کہ اُن کے واسطے مکان کی وسعت چاہوں یہ خواہش محض اللہ کے واسطے ہے کہ لوگ طلب حق میں اپنے اپنے وطنوں کو چھوڑ کر آتے ہیں اور جائے اقامت نہیں پاتے بس اُن کی ہی سہولت کے لئے وسعتِ مکان چاہتا ہوں ـــــ نیز فرمایا کہ میرے بعد اس جگہ میاں ابوسعید بیٹھیں اور حلقہ و مراقبہ اور درسِ حدیث وتفسیر میں مشغول رہیں ـــــ بعد ازاں فرمایا کہ بعض اشخاص کہتے ہیں کہ میاں ابوسعید پر یہ عنایت کس لئے ہے وہ نہیں سمجھتے کہ میاں ابوسعید پانسو مریدوں کو چھوڑ کر میرے پاس آئے ہیں اس سے پہلے وہ دوسرے مشائخ سے خرقہ خلافت پاچکے ہیں لیکن اب وہ اپنی گردن اخلاص میں میری بیعت کا حلقہ ڈالے ہوئے پیری سے مریدی کی طرف آئے ہیں بھلا وہ کیونکر عنایت ودعا کے مستحق نہ ہوں۔

فرمایا ـــــ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ نے چار بزرگوں سے بیعت کی تھی اور مجھ کو (اس وقت) تین[1] یاد ہیں۔

(۱) اپنے والد حضرت سید ابوصالح سے

(۲) حضرت شیخ ابوسعید مخزومی ؒ سے

(۳) حضرت حماد دباس سے (یہ کپڑہ سازی کا پیشہ کرتے تھے)

فرمایا ـــــ حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے فرمایا ہے کہ نماز پڑھتے میں بوقت قیام نظر کا سجدہ گاہ پر رکھنا عمل مسنون ہے اور یہ عمل اُن بہت سے تعینات سے جو موافق سنت نہیں ہیں بہتر و مفید تر ہے۔

فرمایا ـــــ کہ طریقۂ خواجگان نقشبندیہ اگرچہ اتباع سنت ہے لیکن حضرت شاہ نقشبند نے عملی حیثیت سے اس کا خاص اہتمام کیا بعدہٗ حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے اتباع سنت کو شائع و رائج فرمایا۔

فرمایا ـــــ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہم اللہ میں سے ہر ایک "معدن اسرار الٰہی" ہے ایک کو

[1] ایک دوسری مجلس میں آپ نے اُن کے چوتھے پیر کا نام شیخ ابوالوفاؒ بتلایا ہے ـــــ

دوسرے پر فضیلت دینا اور ایک کے کمال کو دوسرے کے کمال پر فوقیت دینا نہ چاہئے ان بزرگوں کی مثال اُن آئینوں کی سی ہے جو مختلف رنگ کے ہوں مثلاً چار آئینے ہیں اُن میں ایک سرخ ہے۔ دوسرا سبز، تیسرا زرد اور چوتھا سفید ہے۔ ہر ایک آئینہ آفتاب سے روشن ہے اور ہر ایک پر اس کی کرنیں چمک رہی ہیں پس پرتو آفتاب کے لحاظ سے سب آئینے مساوی ہیں گو رنگ کا فرق ہے لیکن فیض آفتاب سے سب مستفیض ہیں۔

فرمایا ـــ کوئی شخص قابلِ پیری ولائق مسند نشینی اس وقت ہوتا ہے جبکہ مسائل ضروریہ کا علم رکھتا ہو، توکل وقناعت زہد وصبر وغیرہ مقامات عشرہ اس کو حاصل ہوں۔ ارباب دنیا کی صحبت سے اجتناب رکھتا ہو، مشائخ کرام کی صحبت سے فیض یافتہ ہو ـــ اُس کا ظاہر شریعت سے آراستہ اور باطن طریقت سے پیراستہ ہو ـــ بعد ازاں فرمایا ـــ میں اپنا حال کیا بیان کروں عراقی کے ان شعروں کے بموجب ہے ؏

بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا برآمد — کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندا دند — کہ برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

فرمایا ـــ کشف میں احتمال خطا وصواب ہر دو ہے اور وجدان میں احتمال خطا نہیں ہے مثلاً ایک شخص نے دور سے ایک چار پائے کی صورت دیکھی اور یہ جانا کہ شیر ہے لیکن درحقیقت وہ شیر نہیں بلکہ وہ کوئی اور چار پایہ ہے یا پانی دیکھا اور وہ سراب تھا پس مثال اہل کشف کی یہی ہے ـــ اور وجدان کی مثال ہوا کی سی ہے کہ وہ اگرچہ نظر نہیں آتی لیکن اس کی حرارت و برودت محسوس ہوتی ہے اس ادراک میں خطا کا احتمال نہیں ہے اس کے بعد فرمایا کہ مجھ کو وجدان صحیح کا ادراک عطا فرمایا گیا ہے۔

بعد ازاں مولینا رؤف احمد مجددی رامپوریؒ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا تم نے تو مشائخ نقشبندیہ کے رسائل مثلاً فقرات حضرت خواجہ احرارؒ و رشحات وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے، وہ ادباً خاموش رہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس سلسلے کے بزرگوں نے اپنی کتابوں میں حضور و جمعیت کی ترغیب دی ہے ذوق و

شوق کا چنداں اعتبار نہیں کیا۔

ایک دن فرمایا——صوفیان خانقاہ کے حالات کا جائزہ لیا جائے کہ ہر ایک کا "وقوف قلبی" کس مقدار میں ہے تہلیل بلحاظ معنی کس قدر ہے۔ اسم ذات کی قلباً ولساناً کتنی مداومت ہے۔ درود استغفار، تلاوت کلام پاک کی کیا رفتار ہے۔ خانقاہ میں لیل ونہار ہر شخص کس طرح گذارتا ہے اور اوقات کو کس عنوان سے صرف کر رہا ہے پس جو کوئی مصروف "ایں کار" ومشغول "ایں اذکار" ہو اسکو خانقاہ میں رکھیں ورنہ خارج کریں۔

فرمایا——مکتوب امام ربانیؒ کے معارف بہت بلند ہیں ہمارا حال تو ان مکتوبات کے سمجھنے میں اس امی ونا خواندہ جیسا ہے جو وضو کرکے رو بہ قبلہ ہوکر کلام اللہ شریف کو کھولتا تھا اور اپنی انگلی قرآن کی سطروں پر پھیرتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا——الٰہی تو نے سچ کہا——الٰہی تو نے سچ کہا تو نے موتی پروئے ہیں۔

فرمایا کہ میں مکتوبات امام ربانیؒ سے اخذ فیض کرتا ہوں بالکل اس طرح جس طرح مرید اپنے پیروں سے اخذ فیوض وبرکات کیا کرتے ہیں۔

ایک دن حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے عقیدت مندوں اور مریدوں کو توجہ دینے کی طرف متوجہ ہو رہے تھے جب آپ نے دیکھا کہ مجمع بے شمار ہے کیونکہ لوگ سمرقند، بخارا، غزنی، تاشقند، حصار، قندھار، کابل، پشاور، ملتان، کشمیر، لاہور، سرہند، امروہہ، سنبھل، بریلی، رامپور، لکھنؤ، جائس، بہرائچ، گورکھپور، عظیم آباد، ڈھاکہ، حیدرآباد، پونہ وغیرہ مقامات سے بطلب حق آئے ہوئے تھے۔ حضرت کو ان دنوں ضعف بہت تھا فرمایا کہ لوگوں کی باری مقرر ہو جائے تیس آدمی حلقۂ صبح کے لئے مخصوص ہو جائیں اور تیس حلقۂ عصر کے لئے اور باقی اشخاص اگلے دن اسی طرح تیس تیس کرکے آئیں اور توجہ حاصل کریں جب سب کو توجہ حاصل ہو جائے پھر وہ پہلے تیس اشخاص آئیں اور توجہ سے مستفیض ہوں——

فرمایا حضرت مجدد صاحب اور میرے پیر و مرشد کا معمول یہی تھا کہ باری مقرر ہوتی تھی۔

فرمایا ایک روز مجھ کو الہام ہوا کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنے خلفاء بطرف دکن بھیجے

تھے تم اپنے خلفار کو بطرف کابل و بخارا و قندھار بھیجو۔

فرمایا۔۔۔ جو ترقی بسبب خدمت حاصل ہوتی ہے ریاضت سے اُس کا عشرِ عشیر بھی حاصل نہیں ہوتا، خدمت سے سالہا سال کا کام منٹوں میں ہو جاتا ہے۔ خدمت ہی سالک کو کامیاب کرتی ہے۔

کسب صوفیار کا ذکر آیا تو فرمایا۔۔۔ بعض صوفیار نے برائے اکل حلال تجارت وغیرہ بھی کی ہے لیکن نماز صبح (کے بعد) سے لے کر ظہر کی نماز تک اس کسب میں مشغول رہے اور ظہر کے بعد کے اوقات کو حلقہ و مراقبہ اور ذکر و توجہ میں بسر کیا ہے۔

فرمایا۔۔۔ آدمی کو چاہیئے کہ اللہ کے وعدوں پر نظر کرے اسبابِ ظاہرہ پر نگاہ نہ کرے۔ یقین کے ساتھ جانے کہ وہ روزی رساں ہے جس کو پیدا کیا اُس کی روزی مہیا کی ہے۔

فرمایا۔۔۔ بنار خانقاہ سے پہلے جگہ کی تنگی کے باعث صوفیوں کی اقامت کے لئے مکان کی آرزو تھی پڑوس میں ایک مکان تھا اُس کا مالک فروخت کرنا چاہتا تھا۔ ایک شخص نے کہا اس مکان کو آپ خرید لیں اُس وقت ایک کوڑی میرے پاس نہیں تھی۔ کارسازِ حقیقی کی جناب میں اس مدعا کے پورا ہونے کی دعا کی اُس نے دعا کو ہم آغوشِ مدعا کر دیا غیب سے انتظام ہو گیا اور اس مکان کو خرید کر تحت تصرف لایا چند مکانات اور بھی سات آٹھ ہزار روپیہ میں خرید کر شامل کر لئے۔۔۔ اس وقت تک اللہ تعالے غیب الغیب سے خرچ عنایت فرما رہا ہے اور تمام کام بوجہ احسن پورے کر رہا ہے۔

فرمایا۔۔۔ صوفیان خانقاہ کو مداومت تہجد کی تاکید بلیغ کی جائے۔ سوتے کو بیدار اور بیدار کو متوجہ بیار کیا جائے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نہ باشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نہ باشی

(باقی آئندہ)

قانونِ مشیت نہ کہ قانونِ معیشت

(از مولینا عبد الباری ندوی)

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ تُوْلِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔

"اقرار کرو کہ اے اللہ ملک کے (حقیقی) مالک تو ہی جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور تو ہی جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے جس کو چاہتا ہے (ملک وحکومت دے کر) عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے (چھین کر) ذلیل کر دیتا ہے بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے کہ تو ہی ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو ہی زندہ کو مردے سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور تو ہی جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔"

کیسا پختہ قول وقرار لیا گیا ہے کہ جس طرح لیل ونہار، موت وحیات کے سارے طبعی قوانین یا تکوینی حوادث وواقعات تمامتر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہیں اسی طرح ملک ورزق یا سیاست ومعیشت کے سارے الٹ پھیر یا انقلابات پر بھی بالکلیہ اللہ ہی کی مشیت فرمانروا ہے۔

اسلام اور اسلامیت کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز توحید کی تعلیم ہے اس توحید کا مطلب صرف

یہ نہیں کہ خدا اپنی ذات و صفات میں ایک یکتا ہے ایک تو ایک معنی کرکے یہ چیز ہی ہے کہ اس کی خاص منطق جزئیت و انفرادیت یا وحدت میں کوئی دوسرا فرد شریک نہیں نہ یہ مطلب ہے کہ خالق عالم صرف ایک ہے۔ اس توحید کے قائل تو ۳۳ کرور دیوتاؤں کے پجاری ہمارے وطنی بھائی بھی ہیں بلکہ ساری دنیا کے مشرک اس اعتبار سے اپنے کو موحد ہی کہتے ہیں۔ خود عرب کے مشرک بھی خالق صرف ایک اللہ ہی کو جانتے مانتے تھے۔

"اگر ان سے پوچھو کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ نے لَیَقُوْلُنَّ اللّٰہُ۔

اسلامی یا قرآنی توحید کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اللہ معطل خالق نہیں کہ مخلوق کو پیدا کرکے خود ریٹائر ہو گیا ہو یعنی کائنات اور انسان کو پیدا کرکے اس طرح آزاد نہیں چھوڑ دیا ہے کہ اپنے آفاقی (طبعی) اور نفسی (ذہنی) قوانین کے تحت خود بخود چلتے رہیں قرآنی اصطلاح میں ان قوانین کی حیثیت اللہ تعالےٰ کی قدرت و مشیت کی محض آیات یا ایک دوسرے پہلو سے حکیمانہ انتظامات کی ہے۔ بالفاظ دیگر عالم میں جو طبعی اسباب یا انسانی تدابیر کارفرما نظر آتی ہیں یہ اپنے نتائج و ثمرات کی علت نہیں فقط ایک مقررہ انتظامی علامت ہیں۔ علت آفاقی و نفسی مخلوقات و تغیرات کے ہر ہر ذرہ کی ہر ہر حرکت و سکون کی بالذات خود ان کے خالق یا اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوتی ہے۔ ہمارے اندر یا باہر آفاق و انفس میں جہاں کہیں جو کچھ بھی ہے اور ہو رہا ہے "فعّال لما یرید" اور "یفعل ما یشاء" کے ارادہ و مشیت ہی سے ہو رہا ہے۔

ایک سیاست و معیشت کیا آدمی اپنی زندگی کے کسی حقیر سے حقیر معاملہ میں بھی جو اسباب و تدابیر اختیار کرتا ہے مسلمان کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ وہ نتائج و مقاصد کے حصول میں بالذات قطعی موثر و دخیل نہیں تاثیر بالکلیہ اللہ تعالیٰ کی مشیت و اذن پر موقوف ہوتی ہے۔ زندگی کے ہر انفرادی و اجتماعی بناؤ بگاڑ ترقی و تنزل، نفع و ضرر، عطا و منع، مصیبت و نعمت، رنج و راحت کے ظاہری اسباب بس ظاہری ہی ہوتے ہیں حقیقی سبب صرف مسبب الاسباب کی مشیت و ارادہ ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیم کی اس ہمہ گیر توحید مشیت سے قرآن و حدیث کا دفتر معمور ملے گا جس کا حاصل یہی ہے کہ نظام عالم میں طبیعت کا قانون مشیت کے قانون کی محض ظاہری و اصطلاحی علامت و آیت یا انتظامی حکمت ہے بالکل اسی طرح جیسے ریل کا ہتھا

(سگنل) گرنا ریل کے آنے کی محض ظاہری و انتظامی علامت ہوتی ہے کہ علت علّت تو دراصل ڈرائیور کا ارادہ یا مشیت[1] ہے۔

یہ مثال تو علت و معلول ہی کی بحث میں غالباً فلسفہ یا سائنس کی کسی جدید کتاب میں نظر سے گذری ہے عجیب مسرت ہوئی کہ معاشیات ہی کے سلسلہ میں آج کل حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمۃ کے بعض مواعظ وغیرہ پڑھ رہا تھا تو علل و اسباب کی اسی نوعیت و حقیقت کی بحث میں مثال تک بعینہٖ یہی ملی فرق ریل کے ہتھے کی جگہ صرف ریل کی لال جھنڈی کا ہے ارشاد ہے کہ

"اسباب و تدابیر کا درجہ صرف اتنا ہے جیسے ریل کا ملازم لال جھنڈی دکھلادے جس سے ریل گاڑی فوراً رک جائے گی سو ظاہر ہے کہ لال جھنڈی میں تاثیر کی قوت نہیں۔ اگر ڈرائیور انجن کو نہ روکے تو ہزار جھنڈیاں بیکار ہو جائیں گی بس لال جھنڈی کا درجہ صرف اتنا ہے کہ ایک اصطلاح مقرر کر لی ہے لیکن اگر کسی وقت ڈرائیور اس قرارداد (اصطلاح) کے خلاف کرنا چاہے تو جھنڈی میں اس کو روکنے کی طاقت ہرگز نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ قاعدہ مقرر فرما دیا ہے کہ جو شخص اسباب کو اختیار کرے گا ہم مسببات بر ان کو فائز کر دیں گے لیکن کسی وقت اگر وہ مسببات کو پیدا نہ کرنا چاہیں تو اسباب سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے حقیقت شناس یوں کہتا ہے ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں   مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند

اسباب کا نام مصلحت و حکمت کی وجہ سے ہے ورنہ کرتے سب کچھ وہی ہیں اور بندہ کا نام ہو جاتا ہے

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل   نسیم صبح تیری مہربانی

حقیقت میں موثر وہی ہیں اسباب میں تاثیر کی طاقت نہیں۔ وہ صرف علامات ہیں جیسے ابھی لال جھنڈی کی مثال دی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس مضمون کو بار بار بیان فرمایا ہے کہ ایک جگہ بہت تصریح کے ساتھ

---

[1] علت یا علیت (Causuali) کی اس حقیقت کو فلسفیانہ اور سائنسی طور پر سمجھنے کے لئے راقم ہذا کا مضمون سیرۃ النبیؐ جلد سوم (مطبوعہ دار المصنفین) میں ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے اور اب بیسویں صدی کی سائنس میں تو علت (   ) کا رہا سہا نام بھی ختم ہی سمجھو "لا الٰہ" کی تصدیق تو ہو ہی گئی "الا اللہ" کی شہادت میں علم نہیں زیادہ تر ہوا مانع ہے۔

کے ساتھ فرماتے ہیں :-

ذرا دیکھو تو یہی کہ جو کچھ تم بوتے ہو اس کو اُگاتے تم ہو یا ہم ہیں اُگانے والے۔ اگر ہم چاہیں تو (اس ساری پیداوار) کو چورا چورا کر دیں پھر تم (اس طرح کی) باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم تو بڑے تاوان (تباہی) میں آگئے بلکہ سرے سے خالی ہاتھ ہی رہ گئے کہ (اصل سرمایہ تک جاتا رہا) اچھا پھر دیکھو کہ پانی جو تم پیتے ہو وہ بادل سے تم برساتے ہو یا ہم ہیں برسانے والے اگر ہم اگر چاہیں تو اس کو (پینے کے ناقابل) کھاری بنا دیں سو تم شکر کیوں نہیں کرتے۔ پھر دیکھو کہ (اسی طرح) آگ جو تم جلاتے ہو (اس کی لکڑی یا) درخت تم نے پیدا کیا یا پیدا کرنے والے ہم ہیں۔

أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ۔

(سورۂ واقعہ)

مطلب یہ ہے کہ اعیان و اشیاہی کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کہ ان کے افعال و آثار ان کے اندھے بہرے قانون طبیعت کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون مشیت کی پیداوار ہوتے ہیں۔ انسان اپنی کھیتی باڑی کھانے پینے وغیرہ کی معاشی ضروریات کے لئے جو اختیاری تدابیر و افعال اختیار کرتا ہے وہ بھی اپنی کامیابی ناکامیابی میں علمائے معاشیات کے مزعومہ قوانین معیشت کے نہیں بلکہ بالکلیہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ مشیت کے تابع ہوتے ہیں ہمارے ان اختیاری افعال و تدابیر کی ــــــــ

"ہماری طرف نسبت ایسی ہی ہے جیسے بچے کے ہاتھ میں قلم دے کر پھر اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر لکھایا جائے اور دو چار لفظ خوشنما لکھ کر (دل بڑھانے کے لئے) بچہ کی تعریف کر دی جائے کہ شاباش بہت اچھا لکھا اب اگر بچہ سمجھدار ہے وہ جانے گا کہ میرا اپنا کمال کچھ نہیں، کمال اس کا ہے جس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے اور نادان ہے تو جہالت سے ناز کرنے لگے گا، مگر

جس وقت دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے الگ ہو جائیگا اس وقت معلوم ہوگا (اور قلعی کھل جائے گی) کہ وہ (بچہ) خود لکھنے پر کتنا قادر ہے اور اس میں کتنا کمال[1] ہے"۔

معاشیات کی دنیا میں اس "دوسرے ہاتھ کے الگ ہو جانے" اور "اگاتے تم ہو یا ہم ہیں اگانے والے" کا تماشہ شاید آج ساری دنیا سے بڑھ کر خود ہمارے ہندوستان میں دیکھا دکھلایا جا رہا ہے آزادی کے بعد سب سے بڑوں کی بڑی بڑی زبانوں پر سب سے بڑا دعویٰ یہ تھا کہ اس ملک میں ننگا بھوکا کسی کو نہ رہنے دیا جائے گا۔ مگر ہو مسلسل پانچ سال سے یہ رہا ہے کہ "زیادہ اگاؤ زیادہ اگاؤ" کی جتنی زیادہ سے زیادہ تدبیروں پر تدبیریں کی جا رہی ہیں اتنی ہی کمی پر کمی یا قلت پر قلت زیادہ ہوتی جا رہی ہے عین جنگ کے زمانے سے بھی گرانی دنا یا کتنی چیزوں کی بڑھ گئی ہے۔ پہلے سب سے بڑی زبان سے یہ دعویٰ نکلا کہ دو سال (۱۹۵۱ء) کے بعد باہر سے غلہ کا ایک دانہ نہ منگوایا جائے گا۔ ابھی ۱۹۵۱ء آنے بھی نہ پایا تھا کہ "اہل تدبیر کی درماندگیوں" کی صدائیں ہر طرف سے آنے لگیں اب ۱۹۵۱ء کے بجائے خدا کا نام لئے بغیر کسی پنج سالہ منصوبہ کی خدائی کے اعلان پر اعلان ہوتے رہتے ہیں پھر بھی اگر "دوسرا ہاتھ" الگ ہی رہا تو منصوبہ بازیوں یا "تفکہات" کی کمی کیا ہوگی کوئی اور منصوبہ کچھ اور باتیں بنا لی جائیں گی ورنہ اپنی خوش تدبیریوں پر ماتمات کا ناز ہوگا۔

آگے کا حال تو اللہ ہی کو معلوم اور اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے سر دست "اگاتے تم ہو یا ہم ہیں اگانے والے" کا یہ حال ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ کسی فرد و جماعت کی نہیں، پورے ملک و حکومت کی پوری طاقتیں سالہا سال سے "زیادہ اگاؤ" پر صرف ہو رہی ہیں مستقل وزارتیں قائم ہیں سیکڑوں دفتر کھل گئے ہیں، ہزاروں لاکھوں کام کرنے والے لگے ہیں۔ کروڑوں اربوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے ماہرین کے کمیشن پر کمیشن اور کمیٹیوں پر کمیٹیاں بنتی رہتی ہیں۔ ساتھ ساتھ اخباروں میں جیسی جیسی آئے دن خبریں آتی رہتی ہیں ان کا اندازہ دو ہی چار دن کی تازہ خبروں

---

[1] الاصابۃ فی معنی الاجابۃ ص ۱۱ و ۱۲ و ۱۳

سے لگائیے :-

"۲۴ اپریل ۵۲ء کی خبر ہے کہ مستقل اطلاعات مل رہی ہیں کہ بستی (یو۔پی) کے شمالی حصوں میں تہائی آبادی سخت غذائی کمی کا سامنا کر رہی ہے۔ درختوں کی پتیاں اور جڑیں چبا چبا کر لوگ پیٹ بھر رہے ہیں تین مہینوں سے روز بروز حالت بد سے بدتر ہو رہی ہے۔"

"اسی تاریخ کی اندور سے آئی ہوئی خبر ہے کہ اناج اور پانی دونوں کی کمی سے ضلع جھبوا کے چار سو گاؤں کے ایک لاکھ آدمی باسیوں کو سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔"

مدھیہ بھارت کے خود وزیر اعلیٰ کو متاثر علاقوں کا دورہ کر کے سخت حیرت ہوئی کہ زیادہ تر لوگ جنگلی پھلوں پتیوں املی کے بیجوں اور درختوں کی جڑوں پر گذارہ کر رہے ہیں (قومی آواز ۲۵ اپریل ۵۲ء)

اس سے ایک دن پہلے (۲۳ اپریل ۵۲ء) کی شملہ سے اطلاع ہے کہ ضلع حصار (پنجاب) میں مویشیوں تک کے لئے چارہ پانی دونوں کی اتنی قلت ہے کہ ستمبر سے اب تک دو ہزار ویگن چارہ بھیجا جا چکا ہے۔ مارچ و اپریل میں چارہ خریدنے کے لئے تین لاکھ اکتالیس ہزار کی تقاوی دی گئی۔ پانی کی قلت دور کرنے کے لئے نہر کھودی گئی تاکہ گاؤں کے تالابوں میں پانی اکٹھا کیا جا سکے۔

گرانی یوں ہی کیا کم ہے کہ بمبئی میں حکومت کو غلہ کے نرخ میں تھوڑا نہیں پچاس فیصدی کا اضافہ کرنا پڑا ہے جس کے متعلق ایک ہی دن بعد (۲۵ اپریل) کی خبر ہے کہ سوشلسٹوں نے ستیہ گرہ کا تہیہ اور طے کر لیا ہے کہ غلہ کے گوداموں پر مارچ کر کے قبضہ کر لیں گے اور اسے پرانے داموں پر فروخت کریں گے۔" (قومی آواز ۲۶ اپریل ۵۲ء)

تین چار سال کے اندر ملک میں لاکھوں ایکڑ زمین نئی زیر کاشت آ چکی ہے۔ کروروں کا غلہ باہر سے آتا ہے پھر بھی قحط و قلت و گرانی و کمی کا ہنوز روز اول ہی نہیں روز افزوں نظر آتا ہے اور حکومت والوں کی یہ بے بسی کیسی عبرت کی ہے کہ بس باتیں بناتے رہ جاتے ہیں۔

فظلتم تفکھون اس "تفکھون" کی ایک مثال یہ ہے کہ کیا کیا جائے آبادی بہت بڑھتی جاتی ہے ابھی ۲۴ اپریل ہی کو ہمارے ہندوستان کے وزیر غذا نے کل ہند زراعتی کانفرنس کی ایک تقریر میں اس

بڑھتی آبادی پر اس طرح اظہارِ تشویش فرمایا کہ۔

"ایک طرف آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے دوسری طرف زمین کی قوت پیداوار کم ہوتی جا رہی ہے جس سے ملک کو سخت غذائی دشواری کے سامنے کا اندیشہ ہے۔"

اور عبرت پر عبرت ہے کہ تھک کر ان مدعیانِ تدبیر کے ترکش سے آخری تیر اس طرح کے نکلنے لگے ہیں کہ ضبط تولید (برتھ کنٹرول)[1] کے ذریعہ بڑھتی ہوئی آبادی کو روکا جائے اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اناج کھانا ہی کیا ضرور ہے؟ بے اناجی غذا کے ادارے قائم ہو رہے ہیں، نمائشیں ہوتی ہیں۔ ہوٹل کھل رہے ہیں "لفکھونی" بے بسی ہی کی ایک مثال اور یاد آئی کہ کیا کیا جائے ارضی وسماوی آفات خشک سالی وتر سالی (سیلاب) وغیرہ دم ہی نہیں لینے دیتیں! کسی اخبار (غالباً پائنیر) نے جھنجلا کر جواب دیا کہ

"اتنے بڑے ملک میں اس طرح کی آفات تو ہمیشہ ہی کہیں نہ کہیں آتی رہی ہیں اور آتی رہیں گی اگر حکومت ایسے عذرات میں پناہ لیتی رہی تو قحط وقلت پر کبھی قابو نہ پاسکے گی!"

مدعا ان "ظنی وفرضی" تفلھات کے ذکر کا فقط یہ ہے کہ انسانی تدابیر ہی اگر ملکی وعمومی قحط وقلت یا شخصی وانفرادی افلاس وعسرت پر قابو پانے کے لئے ہوتیں تو کون ملک یا کون فرد ہے جو اپنی والی کوئی تدبیر اٹھا رکھتا ہے، مگر نتیجہ ہمیشہ ایک ہی نکلتا رہتا ہے کہ "لگ گیا تو تیر نہیں تکا"، اگر کامیابی ہوگئی تو اپنی خوش تدبیری پر ناز ورنہ تفلھات کی کیا کمی؟ سیدھی بات سمجھنے سے گریز نہ ہو تو معاشیات کیا انسانی تدابیر کا زندگی کے سارے چھوٹے بڑے معاملات میں یہی حال ہے کہ تیر کبھی لگا کبھی نہیں لگا جس کے معنی یہی ہیں کہ ہمارے قابو سے باہر کوئی اور غیبی قوت یا مشیت دخیل کار ہے جنھوں نے اس مشیت کو پایا اور مانا ہی نہیں وہ "تفلھاتی" باتیں سیاسیات ومعاشیات میں بھی جتنی چاہیں بناتے رہیں لیکن اسلامی توحید لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه کے بنیادی اقرار ہی کا مطلب جب یہ ہے کہ ہر قسم کا نفع وضرر فعل واثر تنہا ذاتی تدابیر واسباب کے نہیں بالکلیہ غیبی مسبب الاسباب کے ارادہ ومشیت کے تابع ہے تو اسلامی سیاسیات ومعاشیات کا بھی یہ اقرار کوئی جزئی وفرعی مسئلہ نہیں بلکہ بالکل ابتدائی

---

[1] شاید اس تعبیر کی خرمناکی چھپانے کے لئے اب نئی اصطلاح Family Planning (منزلی منصوبہ بندی) ایجاد کی گئی ہے۔

مطالبہ او[illegible] کہ اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت جس کو چاہتی ہے ملک دیتی ہے اور جس سے چاہتی ہے چھین لیتی ہے [illegible] کی مشیت جس کو چاہتی ہے بے حساب رزق عطا فرماتی ہے تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ ...... وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔

"خود اپنا تجربہ اپنے اور اکثر عزیزوں دوستوں کے انفرادی واقعات تک میں یہی ہے اور جو بھی ذرا غور کرے گا یہی تجربہ ہوگا کہ معاش و رزق کا معاملہ بالخصوص کچھ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ہی ظاہر ہوتا ہے اور تدبیر کے تیر بالعموم نشانہ سے ہٹ کر ہی گرتے ہیں۔ بارہا دیکھا کہ انگریزی تعلیم میں صاحب [illegible] خیال کیا جاتا تھا وہ کچھ نہ ہوئے اور جن کو انہون ن[illegible] سمجھا گیا تھا وہ ہونہاروں سے میدان معاش میں کہیں آگے نکل گئے تجارت وغیرہ ہر چیز میں یہی مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ بارہا جس شخص اور جس چیز کی تجارت کے چلنے کے ظاہری اسباب زیادہ ہوتے ہیں وہ رہ جاتی ہیں اور جس کے ظاہری امکانات کم ہوتے ہیں وہ چل جاتی ہیں باقی نکات بعد الوقوع تو ہر واقعہ میں نکال ہی لئے جاتے ہیں۔" (تجدید تعلیم و تبلیغ ص۷۹)

غرض کوئی مانے نہ مانے لیکن اسلامی معاشیات کا نام لینے والوں، اس پر کتابیں اور مضامین لکھنے والوں کو اس کے سمجھنے سمجھانے کے سوا حق ہی کیا حاصل ہے کہ معاش یا رزق کی کمی یا زیادتی، تنگی و فراخی یا خود قرآن کی تعبیر میں "بسط و قدر" کا تعلق نہ معاشی اشیا کے قانون طبیعت سے ہے اور نہ انسانی تدبیروں کے تہ تکوینی یا انسان ساز قانون معیشت سے۔ بلکہ اس کا دار و مدار تمام تر اللہ تعالیٰ کے دیدہ دانستہ قانون مشیت پر ہے اور معاشی مشکلات کا حل خود قدرت والے خدا کے بتائے ہوئے قوانین مشیت[1] ہی میں ڈھونڈھنا چاہئے نہ کہ بے بس بندوں کے بنائے ہوئے قانون معیشت میں۔ رزقی مشیت پر۔ اس کی گوناگوں حکمتوں کی طرف ارشادات کے ساتھ جس تکرار و اصرار کے ساتھ زور دیا گیا ہو ذیل کی آیات سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

---

[1] معاشی مشکلات کا یہ اسلامی حل ان شاء اللہ اگلے مباحث میں اپنے موقع پر ملے گا۔

کہیں اس مشیت کو صفت رب کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ پالنے یا پرورش کرنے والا ہی اپنے زیر پرورش کی مصلحتوں یا نفع و ضرر کو خوب جانتا ہے کہ اس کو کون سی حاجت کس کمیت و کیفیت یا کس مقدار و صورت میں پوری کرنی چاہیئے پھر انسان کے پیدا کرنے والے رب (پروردگار) سے بڑھ کر اپنے زیر پرورش بندوں کی فطرت و خلقت کے منافع و مضار کو کون پوری طرح جان اور سمجھ سکتا ہے اور اس کے مناسب اس کی معاشی یا رزقی حاجتوں کو بسط یا قدر کے ساتھ پوری کر سکتا ہے اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ کے ساتھ ہی فرمایا کہ انہ کان بعبادہ بصیرا کہ وہی اپنے بندوں کے حالی و مالی دنیا و آخرت کے مصالح کی پوری پوری خبر و بصیرت رکھتا ہے۔

آدمی کو مال و دولت پر کتنا گھمنڈ ہوتا ہے خصوصاً غریبوں کے مقابلہ میں، ہم پر بھلا کوئی مشکل و مصیبت کیا آسکتی ہے۔ ہر چیز کا مقابلہ مال و دولت سے کریں گے اسی گھمنڈ میں انبیاء و مرسلین کے ڈراوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور ان سے اور ان کے غریب پیروں سے اکڑ اکڑ کر کہتے ہیں کہ ہم تو تمہاری باتوں کو ماننے والے نہیں ہم مال و اولاد سب میں تم سے بڑھے ہوئے ہیں ہم پر بھلا وہ عذاب کیا آسکتا ہے جس سے تم ڈراتے ہو۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ۔ (سباع ۴)

فرمایا کہ ان مال و اولاد پر اکڑنے والوں سے کہدو کہ "یہ تو میرے پرورش فرمانے والے (رب) ہی کا کام ہے کہ (اپنی پرورشی حکمتوں کے تحت) جس کو چاہتا ہے رزق زیادہ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے لیکن اکثر نادان انسان (ان حکمتوں کو) جانتے نہیں ہیں" (قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ) سب سے بڑی حکمت و مصلحت تو آخرت کی فلاح اور خدا کا قرب ہے سو خوب جان لو کہ تمہارے اموال و اولاد جن پر اتراتے ہو) تم کو ہمارا مقرب نہیں بنا سکتے مگر ہاں (ایسے اموال و اولاد والوں کو بھی ہمارا قرب نصیب ہو سکتا

ہے) جو ایمان لائیں اور عمل صالح کریں (یعنی اپنے مال و اولاد کو بھی ایمان و عمل نیک ہی کی راہ میں لگائیں) اور جنت میں ایسے لوگ بالیقین ایسے ہیں کہ ان کو ان کے عمل کی بدولت (کہ مال و اولاد کو بھی خدا ہی کی راہ میں لگایا) دوہرا صلہ ملے گا اور جو لوگ (مال و اولاد کے گھمنڈ میں ہماری ان حکمتوں اور انتظامی مصالح اور معاملات کی) آیات میں ہم کو ہرانے کی کوشش کرتے ہیں (جیسے آج کل کی مدعیان ربانیت حکومتیں) تو یاد رکھیں کہ ان کو عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔ لہٰذا پروردگار کے پرورشی معاملات و انتظامات میں ان ہرانے والی کوششوں کے دخل در معقولات سے باز رہیں۔ اور پھر بتاکید ان کو سنا دو کہ یہ کام تو صرف میرے پروردگار رب ہی کا ہے کہ (پرورش کے مناسب) جس کو چاہتا ہے رزق زیادہ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے۔ اور اگر تم کو زیادہ دیا ہے تو گھمنڈ کرنے کے بجائے اس کو بیشتر اسی کی راہ میں خرچ کرو۔ اس طرح جو کچھ بھی تم خرچ کروگے (وہ رائیگاں نہ جائے گا بلکہ پروردگار) اس کا بدلہ دے گا اور وہی بہترین رزق دینے والا ہے۔"

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفَىٰ إِلَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الضِّعْفِ وَهُمْ فِي الْغُرُفَاتِ آمِنُونَ وَالَّذِينَ يَسْعَوْنَ فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ (سبا ع ۵)

صفت رب ہی کے سیاق و سباق میں سورۂ شوریٰ کے دوسرے رکوع میں ارشاد ہے کہ اے محمدؐ آپ ان مشرکین سے کہئے کہ جس بات میں تم اہل حق کے ساتھ اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ اللہ ہی کے سپرد ہے۔ (باقی اپنا معاملہ تو یہ ہے کہ جس اللہ کی اوپر شان توحید و قدرت وغیرہ بیان ہوئی) اسی اللہ کو اپنا رب مانتا اور جو رب ہے لازماً اسی (کی مرضی و مشیت) پر بھروسہ کرتا اور (ہر معاملہ میں) اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں ..... وہی ہر بات کا پوری طرح سننے دیکھنے والا ہے اسی کے ہاتھ میں آسمان و زمین کی کنجیاں ہیں۔ اس کے بعد معاً فرمایا کہ وہی ربوبیت یا پروردگاری پر مبنی حکمتوں کے موافق اپنی قدرت کی ان کنجیوں سے کھول کر جس کو چاہتا ہے رزق زیادہ دیتا ہے

اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے بے شک وہی ہر شے کی حکمت و مصلحت کو کما حقہ جاننے والا ہے

"وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ

...... لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ"

صفت رب کی خصوصیت کے علاوہ خود ذات جامع الصفات اللہ کی طرف نسبت فرما کر بھی رزق کی بسط و قدر کو اسی کی مشیت پر بالکلیہ منحصر ہونے کو صاف بیان فرما گیا ہے۔ ساتھ ہی متنبہ فرمایا گیا ہے کہ رزق کی بسط یا معاشی کشادگی ہر حال میں ہر شخص کے لئے لازماً خیر ہی نہیں ہوتی۔ رعد کے تیسرے رکوع میں "اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ" کے ساتھ ہی فرمایا گیا کہ جن کو یہ دنیوی مال و دولت کا حصہ مل گیا ہے" وہ اس دنیوی (پست) زندگی پر اتراتے ہیں حالانکہ دنیا کی یہ (پست) زندگی آخرت کے مقابلہ میں ایک نہایت حقیر متاع کے سوا کچھ بھی نہیں۔ "وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ"

اسی طرح عنکبوت کے چھٹے رکوع میں "اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ" کے ذرا آگے ہے کہ یہ پست دنیوی زندگی تو کھیل کود کے سوا کچھ بھی نہیں، اور زندگی تو بے شک بس آخرت ہی کی زندگی ہے کاش جو نادان اس کھیل کود کی زندگی میں مگن ہیں، وہ اس کو جانتے۔ "وَمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ" تو اس کھیل کود میں زندگی گنوانے کی حماقت کیوں کرتے۔ مطلب یہ ہوا کہ رزق کی بسط و قدر کی حکمتوں یا معاشی کشادگی و تنگی کی مصلحتوں کو محض کھیل کود میں گنوا دینے والی چند روزہ زندگی کی ترازو میں تولتے اور اتراتے رہنا آخرت سے بے خبری و غفلت کی حماقت کے سوا کیا ہے۔

بلکہ درحقیقت اس غفلت و حماقت ہی نے دنیوی زندگی کو کھیل کود بنا دیا ہے ورنہ اگر اسی معاشی خوش حالی و فراغت یا مال و دولت کو خدا کی راہ میں لگایا اور آخرت بنانے والے مصارف میں صرف کیا جاتا تو سراسر کامیابی و کامرانی کا ذریعہ بن جاتی کیا روزمرہ کے تجربات سے دیکھتے نہیں کہ رزق و معاش کی زیادتی و کمی کا مدار خالی انسانی تدبیروں پر نہیں اللہ ہی جس کو چاہتا ہے رزق زیادہ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے بے شبہ اس زیادتی و کمی میں ایمان

لانے والوں کے لئے (اللہ کی حکمتوں کی) نشانیاں ہیں۔ بس (اگر اس معاشی کشاکش کا حقیقی اُخروی نفع حاصل کرنا ہے تو اس کو اہل حقوق پر اللہ کی راہ میں خرچ کرو) رشتہ دار کو رشتہ دار کا حق دو مسکین کو مسکین کا اور مسافر کو مسافر کا (اسی طرح اور بھی جو مالی حقوق اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں ان کو ادا کرتے رہیں) ان لوگوں کے لیے بھلائی ہے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"

"اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ذٰلِکَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (روم ع ۴)

لیکن آدمی کا عام حال یہ ہے کہ جہاں اس کو کچھ خوش حالی یا مال و دولت کی نعمت عطا ہوئی تو خدا و آخرت سب کو بھول کر اُلٹے اس کو اپنی دانش و تدبیر کا نتیجہ جاننے لگتا ہے (اِذَا خَوَّلْنٰہُ نِعْمَۃً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ) حالانکہ دراصل یہ آزمائش ہوتی ہے کہ دیکھیں تم ہمارے اس عطیہ و نعمت کو دنیا ہی کی پست زندگی اور کھیل کود میں کھپا دیتے ہو یا اس سے ہماری وفاجوئی اور آخرت کی فلاح کا کام لیتے ہو (بَلْ ہِیَ فِتْنَۃٌ وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَہُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ) اس کے کچھ ہی آگے سورۂ زمر (ع ۵) میں پھر اسی حقیقت کا اعادہ فرمایا گیا ہے کہ کیا خود روزمرہ کے معاشی و رزقی تجربات سے لوگوں کو یہ نظر نہیں آتا کہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے اور اس زیادتی و کمی) میں ایمان لانے والوں کے لئے (اللہ کی حکمتوں کی) نشانیاں ہیں۔ اَوَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔

اسلامی معاشیات پر خامہ فرسائی فرمانے والے نو مسلمان یہ تو بڑی دھوم دھام سے دعویٰ کرتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہے سب انسان ہی کے لیے پیدا کیا گیا خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے خدمت و تابعداری کے لیے ہے سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی

الْاَرْضِ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ بے شک دنیا تو تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے، مگر تم الٹ کر خود دنیا کے لئے نہیں پیدا کئے گئے ہو کہ اسی کے پیچھے جان دیتے رہو۔ سارا مغالطہ اسی اُلٹی منطق اور اصلی اسلامی منطق کے صرف ایک مقدمہ اَلدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ کو یاد رکھنے اور دوسرے وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ کو فراموش کر دینے کا ہے۔ حالانکہ خود قرآن مجید میں یہ تو دو ہی چار جگہ ملے گا کہ دنیا انسان کے لئے ہے۔ سارا زور بیسیوں مقامات پر ذرا ذرا سے تعبیری اختلاف سے اسی پر ملتا ہے کہ خود انسان خدا و آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہی انسانیت کا مرجع و منتہی ہے وَاِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی۔ وَاِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی۔ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ۔ اِلَیْہِ الْمَصِیْرُ۔ اِلَیْنَا اِیَابَھُمْ وغیرہ عنوانات سے۔ معاشی دنیا ہی نہیں، پوری اسلامی زندگی کی منطق کے اصلی دوسرے ہی مقدمہ پر بار بار زور دیا گیا ہے اور ان دونوں مقدموں کے ملانے سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے وہی ہر شعبہ میں ٹھیک اور ٹھیٹھ اسلامی زندگی کا تصور و معیار ہے یعنی جب دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم خدا و آخرت کے لئے تو دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو اس طرح استعمال کرو کہ خدا کی رضا اور آخرت کی فلاح و نجات حاصل ہو۔ بالفاظ دیگر دنیا اور اپنے دونوں کے پیدا کرنے والے کے مطابق زندگی بسر کرو یہی تمام دوسرے شعبوں کی طرح زندگی کے معاشی شعبہ میں بھی عبادت و عبدیت، بندگی و سرافگندگی والی وہ اسلامی زندگی ہوگی جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے اور جس کو اوپر معاشیات عبدیت کے عنوان سے واضح کیا جا چکا اسی منطق کے مطابق زندگی وہ صالح زندگی ہے جس کا ایمان کے ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کو جوڑ کر ہر جگہ مطالبہ کیا گیا اور موت و زندگی کا سارا ہنگامہ اسی حسن عمل کی آزمائش و امتحان کے لئے برپا کیا گیا ہے خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ زمین پر ہم کو اپنا جانشین (خلیفہ) بنا کر اور بعض کو بعض پر برتری دے کر جاہی یا مالی یا معاشی زندگی میں جو اونچ نیچ خود ہمارے پالنے والے رب نے رکھدی ہے، یہ اسی لئے ہے کہ ہمارے پرورشی مقام و مصالح کے لئے ہم کو امتحان سے گذارا جائے۔ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ وَاِنَّہٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ؎

نبوی تمثیل میں اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا گیا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے (الدنیا مزرعۃ الاخرۃ) یعنی اس کھیتی کے لیے دنیا کی مختلف مخلوقات کی صورت میں تم کو زمین پانی، بیج بسار اور کشاورزی کے آلات وغیرہ جو کچھ بھی طرح طرح کے سامان دئے گئے ہیں (قیما اتاکم) ان سب کی غرض یہی امتحان ہے کہ تم ان سامانوں کو آخرت میں کام آنے والی کھیتی میں لگاتے ہو یا نہیں ۔ ضرورت ہی نہیں زینت کا بھی جو کچھ سامان اس زمین پر پھیلا یا گیا ہے وہ بھی حسن عمل ہی کے امتحان کے لیے ہے (انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لھا لنبلوھم ایھم احسن عملا) اور اسی لیے امتحان ختم ہوتے ہی سامان امتحان کو بھی ختم کر دیا جائے گا (وانا لجاعلون ما علیھا صعیدا جرزا) جا بجا کی ان مختلف تصریحات کے علاوہ ایک جگہ زمین و آسمان سب کی پیدائش کی غرض دو ٹوک میں اسی حسن عمل کے امتحان و ابتلا کو فرمادیا (ھو الذی خلق السموات والارض فی ستۃ ایام وکان عرشہ علی الماء لیبلوکم ایکم احسن عملا) لیکن جو لوگ پیدائش سموات و ارض کی اس ابتلائی آفرینش کے اصلی نتیجہ بعث بعد الموت ہی کے سرے سے منکر ہیں ظاہر ہے کہ وہ ایسی باتوں کو افسانہ و افسوں ہی جانیں گے (ولئن قلت انکم مبعوثون من بعد الموت لیقولن الذین کفروا ان ھذا الا سحر مبین)

جب ساری کائنات ارض و سماوات کا مدعا انسان کو اس کی انسانیت کی تربیت و تکمیل کے لیے ابتلا و آزمائش سے گذارنا ہے تو معاشی تنگی و فراخی یا رزق کی بسط و قدر سے بھی مشیت کا مقصود اس ابتلا ہی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

سورہ الفجر میں معاش و رزق کی اس ابتلائی نوعیت کو خصوصیت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے پہلے عاد و ثمود و فرعون وغیرہ کے لئے جاہ و مال، سلطنت و ثروت والے بڑے بڑے جباروں کی سرکشی و فساد انگیزی اور پھر اسی دنیا میں ان کے معتوب و برباد ہونے کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ

بہر حال آدمی کا یہ حال ہے کہ جب اس کو اس کا پروردگار	فاما الانسان اذا ما ابتلٰہ
بطور آزمائش عزت و نعمت عطا کرتا ہے تو اکڑنے	ربہ فاکرمہ و نعمہ فیقول
اور کہنے لگتا ہے کہ مجھ کو تو میرے پروردگار نے معزز	ربی اکرمن واما اذا ما ابتلٰہ

بنا لیاہے۔ دوسری طرف جب آزمائش ہی کے طور پر رزق یا معاش میں کمی یا تنگی کر دی جاتی ہے تو بے صبر ہو کر کہنے لگتا ہے کہ مجھ کو تو میرے پروردگار نے ذلیل ہی کر ڈالا

فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ.

آگے شدت کے ساتھ تنبیہ کیا گیا کہ ہرگز نہیں (کلّا) اصل بات نہ یہ ہے نہ وہ، تم کو جو مال وجاہ دیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ دوسروں کے مقابلہ میں اکڑو اور اپنی بڑائی ہانکو، بلکہ (بل) دراصل یہ تمہارا امتحان ہے کہ تم اس جاہ و مال کو یتیموں مسکینوں وغیرہ کی خدمت وعزت میں خرچ کر کے اپنی انسانیت و آخرت کو سنوارتے ہو یا نہیں سو تمہارا عام حال یہ ہے کہ نہ تم خود یتیموں کی قدر پہچانتے ہو نہ دوسروں کو مسکینوں کو کھلانے پلانے پر اپنی مثال و ترغیب سے آمادہ کرتے ہو۔ حد یہ ہے کہ خاص اپنی ہی کمائی نہیں میراث تک کے مال کو سمیٹ کر خود ہی اپنے عیش وعشرت میں اڑا دیتے ہو پھر بھی مال سے جی نہیں بھرتا اور جائز و ناجائز حق و ناحق کی تمیز کے بغیر اس کے عشق و طلب میں غرقاب رہتے ہو۔

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِينِ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا

حالانکہ اپنی واجبی ضرورتوں سے جو زائد مال تم کو دیا گیا تھا اس کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ اپنی ہی عیش وعشرت جاہ و منزلت کا اس کو ذریعہ بنا لو اور پھر بھی ہل من مزید کی جہنم نہ بھرے۔ بلکہ وہ دراصل تمہاری اس آزمائش کے لئے تھا کہ دوسرے اہل حقوق اور اہل حاجت پر صرف کر کے اپنی انسانیت و آخرت کے بناؤ کا انتظام کر لو لیکن تم نے ایسا نہ کیا تو اب کان کھول کر سن لو کہ آخرت یا قیامت میں

"جب زمین ریزہ ریزہ کر دی جائے گی (یعنی یہ دنیا برباد کر دی جائے گی) اور جس امتحان کے لئے تم پیدا کئے گئے تھے اس کے نتیجہ کا فیصلہ و اعلان فرمانے کے لئے تمہارا پروردگار صف در صف (کاتب اعمال وغیرہ) فرشتوں کے ساتھ (میدان حشر میں) تشریف فرما ہوگا اور ساتھ ہی (تمہارے امتحانی نتیجہ کی جگہ) جہنم کو بھی سامنے لایا جائے گا اس دن سمجھ آئے گی لیکن اب سمجھ آنے کا وقت کہاں رہا ہوگا

تب بے بسی کے عالم میں حسرت سے آدمی کہنے لگے گا کہ کاش میں نے اس (اُخروی) زندگی میں کام آنے والا کوئی عمل بھیجا ہوتا لیکن اس دن نہ خدا کے عذاب کے برابر کوئی عذاب دینے والا ہوگا اور نہ اس کی جکڑ کے برابر کوئی جکڑنے والا۔

"كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا وَجِايءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ الذِّكْرَىٰ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ۔

دوسری طرف جو لوگ دنیا کی عیش و عشرت میں آخرت یا اپنے پروردگار (رب) کی طرف واپسی کو نہ بھولے مال و دولت جاہ و عزت کی کثرت و قلت بسط و قدر کے جس حال میں بھی رہے، اپنے اپنے مقام امتحان کے حقوق نفس کے ایمانی اطمینان کے ساتھ ادا کرتے رہے، ان سے ارشاد ہوگا کہ

اے اپنے پروردگار پر اعتماد و اطمینان رکھنے والے نفس اب تو پروان چڑھ کر (یعنی عبدیتی تکمیل کے ساتھ) اپنے پالنے والے کے پاس اس طرح خوش خوش واپس ہو کہ وہ تجھ سے خوش ہے اور تو اس سے۔ پس میرے بندوں (یعنی عبدیت و بندگی کا امتحان پاس کرنے والوں) میں داخل ہو جا اور داخل ہو جا میری جنت میں (جو میں نے اپنے بندوں ہی کے لئے تیار رکھی ہے)۔"

"يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي۔"

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم
راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم

حجاب چہرۂ جاں می شود غبار تنم		خوشا دمے کہ ازیں چہرہ پردہ بر فگنم
چنیں قفس نہ سزائے چو من خوش الحان است		روم بہ گلشن رضواں کہ مرغ آں چمنم

المیہ فلسطین کے بنیادی اسباب

(از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی)

(مترجمہ عتیق الرحمٰن سنبھلی)

اس ترجمہ کی پہلی قسط الفرقان بابتہ ماہ رجب ۱۳۷۱ھ میں شائع ہوئی تھی جس میں بتلایا گیا تھا کہ فلسطین میں مسلمانوں کی ناکامی کے تین خاص سبب ہیں (۱) اُن داخلی اور نفسیاتی محرکات کی کمزوری جو عقیدے اور اصول کی راہ میں موت کو محبوب بنا دیتے ہیں۔ (۲) جذبات پر عقل کی زور دستی اور جانبازی کے مواقع پر احتیاط پسندی (۳) ایک ایسی شخصیت کا فقدان جس کے دل و دماغ پر فلسطین ہی فلسطین چھا جائے ــــ پھر پہلے سبب پر کچھ تفصیلی بحث کی گئی تھی جس میں دکھلایا گیا تھا کہ داخلی محرکات کی قوت کن نتائج کو پیدا کرتی ہے اور ان کے ضعف کے نتائج کس شکل میں سامنے آتے ہیں ــــ اب آج اس مقالہ کے بقیہ حصے کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے یاد رہے کہ یہ مقالہ دمشق کی ایک مجلس میں پیش کیا گیا تھا۔ اور الاخوان المسلمون نے اسی وقت اسے چھپوا کر شایع بھی کر دیا تھا ــــ مدیر

حضرات! اب میں کچھ گفتگو دوسرے سبب پر کرنا چاہتا ہوں۔

عقل کی قیمت اپنی جگہ پر تسلیم ہے۔ کسے مجال ہے کہ اس میں کلام کرے اور اس کی اہمیت کا انکار کرے اور کسی معاملہ میں سوچ بچار اور حزم احتیاط کو غلط قرار دے خصوصاً جبکہ معاملہ افراد کا نہیں اُمم کا ہو لیکن بایں ہمہ اعتراف میں یہ کہنے کی جرأت اپنے اندر پاتا ہوں کہ

ہر امت کی زندگی میں بعض مراحل ایسے ضرور آتے ہیں کہ جب عواقب سے

بے پروا ہو کر جوش و جذبات کی آواز پر لبیک کہنا عین زندگی اور ہوش و
خرد کے چکر میں پڑنا عین ہلاکت ہوتا ہے

کیونکہ عقل زمانہ قدیم سے آدمی کو ڈرانے سہمانے، فوری اقدامات سے باز رکھنے اور کاموں میں دیر لگوانے کے لئے بدنام ہے۔ بارہا اس عقل نے عظمت و سربلندی کے بہترین مواقع قوموں کے ہاتھوں سے نکلوا دئے ہیں۔ بارہا خطرات کو نہایت مبالغہ آمیز انداز میں پیش کیا ہے کتنی ہی بار فتح و ظفر کی قریب ہوتی ہوئی گھڑیوں کو دور کیا ہے کتنے ہی زرین لمحات کو ضائع کیا اور کتنے ہی اموال غنیمت کو کھوا ہے بیشک یہ ٹھیک نہیں ہے کہ دل عقل سے بالکل بیگانہ رہے بلکہ اس سے مشورہ اور امداد لیتے رہنا چاہئے لیکن یہ بھی ٹھیک نہیں ہے کہ اس کی رائے کا بالکل پابند رہے بلکہ کسی وقت تنہا اپنے رجحان پر بھی بھروسہ کرنا چاہئے

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

جو دل کبھی عقل سے بغاوت اور کبھی خود اعتمادی کی جرات نہ کرے۔ اس میں کوئی خیر نہیں وہ ایک بجھا ہوا انگارہ اور ایک بے جان وجود ہے۔

ہم جب دنیا کی تاریخ پڑھتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ بیشتر فتوحات اور وہ بڑے بڑے معرکے جن کی تعجب خیزی اور حیرت انگیزی بقائے دوام اختیار کر گئی ہے ان سب کا سہرا دل اور اس کے سرفروشانہ جذبات کے سر ہے اور وہ تاریخ جو ہمارے قلوب کو ایمان اور شجاعت سے معمور کر دیتی ہے اس کی عظمت اور اس کا دبدبہ بھی اس کے انھیں اوراق سے قائم ہے جن پر سرفروشی اور جانبازی کی داستانیں ثبت ہیں۔ اگر یہ اوراق ہماری تاریخ سے نکال دئے جائیں تو یہ تاریخ تاریخ سے زیادہ ریاضی کی کتاب بن جائے

جو دل ایمان سے قوت حاصل کرتا ہے اس کے کام کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے جہاں کار عقل تمام ہوتا ہے اور عقل تھک کر بیٹھ جاتی ہے عقل اس پر جہالت جنوں اور تہور و شیخی کی تہمتیں دھرتی اور فقرے کستی ہے لیکن وہ یہ بھول جاتی ہے کہ ایک بار نہیں سیکڑوں بار دل کا جوش و جنوں خود اس کے کام آیا ہے اور اس جاہل کے احسانات سے علم و تہذیب کی گردن بھی جھکی ہوئی ہے، کیا

عقل کو اپنی بے چارگی، اسیری اور مظلومیت کا وہ زمانہ یاد نہیں ہے جب یہ دل ہی اس کی مدد کو آیا تھا، اسی نے اُس کے بندھن کھولے اور بیڑیاں توڑیں تھیں اور پھر انصاف کے ساتھ اُس کا حق دلایا تھا۔ یہ دل کا جوشیلا پن ہی تھا جس کی بدولت علم کو تسلط حاصل ہوا اور یہ دل ہی تھا جس نے کتنے ہی موقعوں پر تہذیب و ثقافت کی حفاظت کی اور وحشیوں کی غارتگری سے اُسے بچایا۔

قوی ایمان اور یقین والا دل خطرات میں کود پڑتا ہے اور جو کچھ کرنا ہوتا ہے کر گزرتا ہے اور عقل تذبذب، سوچ بچار، عاقبت اندیشی اور مصلحت بینی میں کھڑی رہ جاتی ہے

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق حسن ہے محو تماشائے لب بام ابھی

پھر لطف یہ ہے کہ جب صاحب ایمان و عشق پر خطر بازی جیت لیتا ہے اور مظفر و منصور ہو کر لوٹتا ہے تو وہی عقل جو تھوڑی دیر پہلے اس پر نا عاقبت اندیشی کے فتوے صادر کر رہی تھی اس کے اقدام کے لئے وجہ جواز بیان کرتی ہے اور سو سو دلیلیں اس کے اقدام کے صحیح اور برمحل ہونے پر لاتی ہے

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

حضرات! اسلام کے عہد اولیں کو یاد کیجیے۔ ادھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوتی ہے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بار خلافت سنبھال لیتے ہیں اور اُدھر یکایک فتنوں کا ایک سیلاب اُمنڈ آتا ہے، ہاتھوں کے طوطے اڑا دینے والے مصائب کی یلغار شروع ہوتی ہے۔ مدینے کے اندر نفاق کی وبا پھوٹ پڑتی ہے اور مدینے سے باہر بعض قبائل مرتد ہو جاتے ہیں اور باقی بعض خلیفہ رسول کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیتے ہیں پورے عرب میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے علاوہ کوئی جگہ ایسی باقی نہیں رہی ہے جہاں جمعہ قایم ہوا اور مسلمانوں کا حال اپنی قلت، دشمنوں کی کثرت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم موجودگی کی وجہ سے عروہ بن زبیرؓ کے الفاظ میں اُن بھیڑوں کے مانند ہو گیا ہے جو بارش کی سرد رات میں بھیگنے کے خوف سے اپنے باڑے میں دُبکی پڑی ہوں۔ ایسی نازک اور ناگفتہ بہ حالت میں ابوبکر صدیقؓ جناب رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت اور آپ کی

مرضی کو پورا کرنے کے خیال سے جیش اسامہ کو شام کی طرف روانہ کرنے کا قصد فرماتے ہیں (کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لشکر کو حضرت اسامہ کے زیر قیادت اسی مقصد سے ترتیب دیا تھا) یہاں عقل معارضہ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ نہیں! ایسی حالت میں کہ مدینہ ایک کھلا ہوا شہر ہے۔ چاروں طرف دشمن ہیں، ان کے حملہ کا ہر دم خطرہ ہے اور ہمارے پاس بس یہی ایک منظم لشکر ہے۔ ایسی حالت میں اس کو مدینہ سے باہر بھیج دینا ہرگز قرین ہوشمندی اور دانائی نہیں ہے مدینہ کے اہل الرائے حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ اے خلیفہ رسولؐ اس لشکر میں مسلمانوں کی اہم جمعیت بلکہ ان کی کل پونجی ہے۔ عرب سارا کا سارا آپ سے باغی ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ مسلمانوں کی ایک اہم جماعت کو آپ اپنے سے جدا کردیں۔ مگر ابوبکر یقین و عشق کا پتلا جو "عشق کی ایک جست" کے لئے تلا بیٹھا ہے۔ انھیں جواب دیتا ہے۔

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں ابوبکر کی جان ہے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء مبارک کو پورا کر کے رہوں گا، اگرچہ مجھے اس کا بھی یقین ہو جائے کہ درندے مجھے اٹھا لیجائیں گے اور قسم ہے اسی ذات کی میں اس ارادہ کو نافذ کر کے رہوں گا اگرچہ میں بستیوں میں تنہا ہی کیوں نہ رہ جاؤں"

آخر کار ابوبکرؓ جو چاہتے تھے وہ ہوا اور اسامہؓ اپنے لشکر کو لے کر مدینہ سے چل پڑے جبین خرد پر بل پڑگئے کیونکہ اُسے خیال تھا کہ اُس کی نہ مان کر ایک زبردست غلطی کی گئی ہے جس کا خمیازہ بھگتنے میں بلا استثنا سب ہی کو شریک ہونا پڑے گا ___ مگر ___ جب اُسامہؓ مظفر و منصور واپس آئے اور واقعات نے ثابت کیا کہ اس لشکر کا نکلنا بہت ہی اچھا ہوا ___ تو ___ عقل نے اپنا موقف تبدیل کردیا اور پھر اسی نے اس فیصلہ پر یوں تبصرہ کیا (جو تاریخ نے محفوظ کرلیا ہے) کہ

"اُس وقت میں اُسامہؓ کا کوچ ایک نہایت مفید اقدام اور عین مصلحت ثابت ہوا کیونکہ راہ میں عرب کے جس قبیلہ پر بھی ان کا گذر ہوتا تھا وہ مرعوب اور پست ہمت ہو جاتا تھا قبائل کہتے تھے کہ اگر مدینہ میں زبردست قوت نہ ہوتی تو ایسے نازک وقت میں ان کا یہ لشکر ہرگز مدینہ

سے باہر نہ جاتا۔ پس مسلمانوں کا یہ ایک اقدام سیکڑوں تدبیروں کے قائم مقام ہوگیا ہے۔"

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسمان کو بے کراں سمجھا تھا میں

معزز حاضرین! عرب کی تاریخ کا ورق ورق سرفروشیوں اور جاں بازیوں سے معمور ہے اور شاید یہ کہنا صحیح ہے کہ سرفروشی میں دنیا کی کوئی قوم عربوں کی ہمسر نہیں ہے اور یہ بھی حقیقتاً صحیح ہے کہ ان سرفروشیوں کو اس تہذیب کو وجود میں لانے کا شرف حاصل ہے جس کے سایہ میں عقل، علم اور انسانیت کو پھلنے پھولنے کا موقع حاصل ہوا۔

بے جگری اور سرفروشی کے ان واقعات میں سب سے بڑا کارنامہ اور جنگوں کی تاریخ میں سب سے زیادہ پرخطر اقدام حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا وہ سفر ہے جو آپ نے ایک لشکر جرار کے ساتھ عراق سے شام کی طرف کیا تھا اور نفس سفر سے بھی زیادہ یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں کی نہایت خطرناک اور دشوار گذار درمیانی مسافت کو انھوں نے صرف پانچ دن میں طے کیا! مورخین کا کہنا ہے کہ

"معرکہ یرموک سے قبل حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے حضرت خالد رضؓ کو لکھا کہ عراق میں اپنا ایک نائب چھوڑ کر اپنی فوج کے ساتھ شام کا رُخ کریں۔ یہ حکم پاتے ہی وہ ساڑھے نو ہزار فوج کے ساتھ نہایت تیز رفتاری سے شام روانہ ہوگئے۔ رافع بن عمیرۃ الطائی ان کے دلیل راہ تھے اور عجلت کے پیش نظر وہ انھیں ایسے راستے سے لے گئے جس پر ان مسافروں سے پہلے کسی کا گزر نہوا تھا، خشک صحراؤں اور چٹیل میدانوں سے گزرے، پہاڑوں پر چڑھے اور وادیوں میں اترے، تنگ گھاٹیوں، لق و دق ریگستانوں اور ہلاکت خیز جنگلوں کو قطع کیا۔ پانی نہ ملا تو اونٹوں کو نحر (ذبح) کیا اور ان کے پیٹ کے پانی کے ذخیرہ سے خود پیا اور گھوڑوں کو پلایا اور کسی نہ کسی طرح پانچ دن میں منزل مقصود تک جا پہونچے۔"

اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاص کا پورے لاؤ لشکر کے ساتھ دریائے دجلہ میں کود پڑنا بھی تاریخ عالم میں بے خوفی اور جاں فروشی کا ایک نادر واقعہ ہے جو ہمیشہ یادگار رہے گا۔ مورخین بیان کرتے ہیں کہ

"سعد رضؓ شہر مدائن کے سامنے دجلہ کے کنارے پر ٹھہرے دریا کو پار کرنے کے لئے کشتیاں وغیرہ

ان کے پاس نہ تھیں اور اس وقت کشتیوں کا فراہم کرنا ان کے لئے ناممکن تھا اور پھر دجلہ غیر معمولی طور پر چڑھا ہوا بھی تھا۔ زیادتی کے مارے پانی کا رنگ سیاہ ہوگیا تھا اور طغیانی کی شدت سے سطح پر جھاگ آگئے تھے جیسے فرطِ غضب سے منہ سے جھاگ نکلنے لگے ہوں۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت سعدؓ امیر لشکر نے دجلہ کے ساحل پر ہی لشکر کے سامنے ایک تقریر کی اور کہا رفیقو! میں نے عزمِ مصمم کرلیا ہے کہ اس بحرِ تلاطم خیز کو عبور کرنا ہے! لشکر نے ایک آواز ہوکر جواب دیا اللہ ہمارے اور آپ کے لئے بھلائی اور راست روی کا فیصلہ فرمائے۔ جو رائے عالی ہو اس پر عمل فرمایئے! بس حضرت سعدؓ نے اپنا گھوڑا دجلہ میں ڈال دیا اور تمام لشکر نے بلا استثناء اور بلا تامل آپ کی اقتدا کی اور اس طرح بے تکلف بڑھنا شروع کردیا جیسے خشکی پر چل رہے ہوں یہاں تک کہ اس کنارے سے اس کنارے تک پانی کو ڈھانپ لیا اور جہاں پہلے پانی کے سوا کچھ نہ دکھائی دیتا تھا اب وہاں آدمیوں اور گھوڑوں کے سوا کچھ نہیں نظر آرہا تھا۔ اطمینان اور بے خوفی کا ان کی یہ عالم تھا کہ آپس میں اس طرح مزے سے باتیں کرتے جارہے تھے جیسے دریا کے اندر نہیں کنارے پر چل رہے ہوں۔ اہل فارس نے جب ان سرپھروں کی یہ شان دیکھی اور وہ منظر دیکھا جو آج سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا تو بے ساختہ چلانے لگے دیوانے ہیں! دیوانے! ان سے لڑنا انسانوں سے نہیں دیووں اور جنات سے لڑنا ہے۔

اور ایسے ہی دلیری کے عظیم کارناموں میں سے فاتح اندلس طارق بن زیاد کا کارنامہ بھی ہے مورخین لکھتے ہیں کہ جب طارق اس سرسبز جزیرہ میں اترے تو جن کشتیوں پر سوار ہوکر آئے تھے ان سب کو جلوا دیا۔ اس پر لشکر کے کچھ لوگوں نے ان کو ملامت کی اور کہا کہ آپ نے واپسی کی راہ مسدود کردی اب اگر ضرورت پڑی تو ہم اپنے ملک کو کیسے لوٹیں گے۔ آپ کا یہ فعل عقل اور دانائی کے سراسر خلاف ہے۔ یہ سن کر طارق ہنسے اور ہاتھ تلوار کے قبضہ پر رکھ کر بولے کشتیوں اور ذرائع نقل و حمل کی حفاظت اور نقصان سے بچاؤ کی فکر اسے ہوتی ہے جس کے سامنے واپسی کا سوال ہوتا ہے۔ لیکن میرا معاملہ یہ ہے کہ میں نے قطعی طور پر طے کرلیا ہے کہ یہیں رہنا اور جنگ کرنا ہے۔ یہاں تک

کہ یا تو یہ سرزمین ہمارا وطن بن جائے یا مدفن ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ حضرت طارق کا یہی جرأت مندانہ اقدام اُندلس کی فتح کا سب سے بڑا سبب تھا اگر انھوں نے کشتیاں نہ جلوا دی ہوتیں تو وہ فوج سے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ

اب تمہارے لئے فرار کی کوئی راہ نہیں ہے	اَیُّھَا النَّاس، اَیْنَ الْمَفَرّ، اَلْبَحْرُ
پیچھے سمندر ہے اور سامنے دشمن بخدا اب	مِنْ وَّرَائِکُمْ وَالْعَدُوُّ اَمَامَکُمْ
تمہارے لئے صرف یہی راہ ہے کہ صدق	وَلَیْسَ لَکُمْ وَاللّٰہِ اِلَّا الصِّدْقَ
اور صبر کی طاقت سے لڑو	وَالصَّبْرَ۔

کشتیاں جلوانے کے بعد حضرت طارق کی زبان سے نکلے ہوئے ان الفاظ نے فوج میں جہاد اور سرفروشی کی ایک آگ بھڑکا دی اور انھیں اپنے سر اپنی گردنوں پر بار معلوم ہونے لگے۔ نتیجہ جو ہونا چاہئے تھا ہوا یعنی فتح اور کامیابی ——— اور حضرت طارق کا یہی "خطرناک" اقدام جسے عقل نے تہور وجہالت سے تعبیر کیا تھا اُس سلطنت کا سنگ بنیاد بنا جس نے عقل اور علم کو چار چاند لگائے۔ تہذیب کے گیسو سنوارے، تمدن کو ترقی کے آخری زینے تک پہونچایا، یورپ کو علم وعقل کا سبق پڑھایا اور دنیا سے منوا لیا کہ ان امور میں بھی امامت کا منصب عربوں ہی کو حاصل ہے یہ سلطنت اسی اندلس کی اسلامی سلطنت تھی جس کی یاد کے ساتھ طارق کی یاد ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گئی ہے۔

ایسی ہی محیر العقول جرأت اور بے پناہ بہادری کے اور بھی کتنے ہی کارنامے ہیں جن سے عربوں کی تاریخ تابندہ ہے۔ مثلاً عبدالرحمٰن الداخل صقر قریش کا اندلس میں داخلہ، ہارون الرشید کا شدید سردی کے ایام میں بغداد سے ہرقلہ کا تاریخی سفر اور نقفور کی سرکوبی۔ سرزمین روم پر معتصم کے تاریخی غزوات اور رحلیہ کی مشہور جنگ۔

حضرات! عربوں کے عہد اول میں ان کو اقوام عالم کے مقابلہ میں مقام امتیاز عطا

کرنے والی یہی بے خوفی اور سر فروشی کی اسپرٹ تھی جس اسپرٹ سے ان کی مقابل اقوام خالی ہوگئی تھیں اور ضرورت سے زیادہ غور وخوض کرنے اور مواضع خطر سے بچنے اور گریز کرنے کا مرض ان کو لاحق ہوگیا تھا جس کی بدولت ان میں بزدلی اور کمزوری آگئی اور اپنے ملک اور اپنی عزت سے ہاتھ دھو بیٹھیں، عربی فتوحات کے تیز و تند جھونکوں نے ان کے رہے سہے کس بل بھی نکال دیے اور بھوسے کی طرح اڑا کر پھینک دیا اور اس ریلے کے بعد انکے وجود کے صرف کچھ مٹے مٹے نشانات رہ گئے، لیکن عربوں کا یہ دور ختم ہو کر ایک دوسرا دور شروع ہوا جس میں بزدل بنا دینے والی عقلیت اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا مشورہ دینے والی علمیت کا ان پر تسلط ہوگیا اور بے دھڑک قدم بڑھانا اور موت کے منہ میں کود جانا وہ بھول گئے اور ان کے بجائے یہ فن دوسری قوموں نے سیکھ لیا کہ زندگی کو کیسے داؤ پر لگایا جاتا ہے اور موقعوں سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ چنانچہ یورپ کی تریبی جنگوں کی تاریخ اور انیسویں صدی میں مشرق پر یورپ کی قبضہ گیری کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے نہایت خطرناک تیز اور جرأت مندانہ اقدامات سے بھری ہوئی ملے گی۔۔۔ اب عربی دنیا کے موجودہ احوال میں اس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں آسکتی جب تک کہ عرب اس معاملہ میں اپنے اندر تبدیلی پیدا کرلیں، ضروری ہے کہ حکمت کے ساتھ اسی پہلی مجاہدانہ اسپرٹ، چابکدستی اور جرأت کو ان میں واپس لایا جائے اور بقول شاعر ان کا حال ایسا ہوجائے کہ

اذا هم القى بين عينيه عزمه　　ونكب عن ذكر العواقب جانبا

(جب وہ کسی بات کی ٹھان لیتا ہے تو پھر اسی کو پیش نظر رکھتا ہے اور نتائج سے بالکل آنکھیں بند کرلیتا ہے)

حاضرین کرام! فلسطین کا موجودہ مسئلہ تو بہت ہلکا اور معمولی مسئلہ ہے اور عربوں کی کامیابی اس میں بالکل یقینی ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ ان کا ہر تصرف آزادانہ ہو، کوئی خارجی دباؤ اثر انداز نہ ہو، زمام کار پوری طرح ان کے اپنے ہاتھ میں ہو، اپنی سیاست کے وہ خود مالک اور خود مختار ہوں، وہ اور ان کی فوجیں بے دریغ قربانیاں دیں، طاقت کا بھرپور استعمال کریں، اللہ کی مدد پر کامل یقین رکھیں صرف اپنے دست و بازو پر بھروسہ رکھیں، مادہ کو حقیر سمجھیں اور نفس پر قابو رکھیں اور طے کرلیں

کہ تا دم نزع جان دینے اور جان لینے سے منہ نہ موڑیں گے۔

اب صرف آخری نقطہ بحث رہ گیا اور یہی آخری چیز جس پر میں اس وقت بحث کرنا چاہتا ہوں ہمارے تمام پیچیدہ مسائل اور معاملات کا تاریک ترین پہلو ہے۔ یہ ہے ایک ایسی شخصیت کی کمی جس پر اس قضیہ کی ہمہ وقتی فکر مسلط ہو جائے اور دن کا چین اور راتوں کی نیند اس پر حرام کر دے۔

معزز حضرات! میں نے تاریخ کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا اور عام دنیا کی تاریخ اور خاص اس اُمت کی تاریخ کے نازک ترین لمحوں اور ہوش فرسا مرحلوں کا گہری نظر سے جائزہ لیا تو ہر ایسی مشکل کے سرے پر جو اس امت کے وجود اس کی عزت اور اس کے وقار کو چیلنج کر رہی ہو، ایک ایسا مرد خود آگاہ کھڑا نظر آیا جس کا دل اس حالت پر بے چین اور مضطرب ہو گیا۔ وہ اپنے آپ اور اپنے اہل و عیال کو بھول گیا، اس نے اپنے عیش اور اپنی راحت کو تج دیا اور اس نے اپنی زندگی کا مقصد وحید اُمت کو اس دلدل سے نکال لینا قرار دے لیا، پھر اس وقت تک وہ چین سے نہ بیٹھا جب تک اس مصیبت کو شکست نہ دے لی، اس نے اپنی ذات کو اس کام کا مکلف سمجھا گویا کہ وہ پیدا ہی اس کے لئے کیا گیا ہے اور اس سے الگ رہنے کے لئے اس کے پاس کوئی عذر نہیں ہے!

اب اس سلسلہ میں چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں پر کیا گذری ان کو اُن ہوش ربا مصائب سے سابقہ ہوا جن سے کوئی اُمت اور کوئی جماعت اپنے اٹھان کی ابتدا میں کبھی آشنا نہیں ہوئی اور قریب تھا کہ یہ مصائب دعوت اسلام کا خاتمہ کر دیں۔ ان مصائب کی شدت کو سمجھنے کے لئے میں آپ کو عروہ بن زبیرؓ کا وہ قول پھر یاد دلاتا ہوں کہ "مسلمانوں کی وہ حالت ہو گئی تھی جو بارش کی سرد رات میں بھیڑوں کی ہو جاتی ہے" لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس مصیبت سے نمٹنے کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کھڑا کر دیا۔ وہ نبی نہ ہوتے ہوئے بھی انبیاء کی شان استقامت کے ساتھ کھڑے ہوئے اور اپنی پوری توجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

عظیم میراث کو بچانے اور اس کی بگڑی کو بنانے پر مرکوز کردی انھوں نے اپنی جان اس میں کھپا دی اور اس کی فکر میں اپنے وجود کو گم کردیا اور مافوق الفطرت شخصیت ثابت ہوئے۔ ان کی ضرورت سے بھی زیادہ نرمی مشہور ہے اور انھوں نے ہمیشہ سختی اور سخت گیری پر نرمی اور مہربانی کو ترجیح دی تھی لیکن آج وہ ابوبکر کوئی اور ہی ابوبکر تھے۔ اس موقع پر ان کی سختی کے مقابلہ میں جلال فاروقی بھی ماند پڑگیا — کیونکہ وقت اسی کا متقاضی تھا۔ ابوبکر نے دیکھا کہ وہ ایک عظیم امانت کے ذمہ دار اور اس کے لئے جواب دہ ہیں چنانچہ اس موقع پر ان کی زبان سے وہ بلیغ جملہ ادا ہوا جو اُن کے جذبات، ان کی نفسیات اور اُن کے احساس ذمہ داری کا سچا ترجمان تھا انھوں نے کہا — أَيُنْقَصُ الدِّينُ وَانَا حَيٌّ ———— (یہ نہیں ہوسکتا کہ میں زندہ رہوں اور دین میں کوئی رخنہ پڑ جائے) —— یہی بھڑکتی ہوئی غیرت اور تڑپتا ہوا دل تھا جس نے ابوبکر میں یہ طاقت پیدا کی کہ انھوں نے دین کو نرغہ سے نکال لیا اور آنے والی نسلوں تک بلا کم و کاست پہنچا دیا حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ

"جونہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ فرمایا، عرب میں ارتداد اور نفاق اس تیزی سے پھیلنا شروع ہوا جس تیزی سے خشک جنگل میں آگ پھیلتی ہے اور خدا جانتا ہے کہ میرے والد (حضرت ابوبکرؓ) پر مصائب اور افکار کا وہ ہجوم ہوا کہ ان کی جگہ اگر پہاڑ بھی ہوتا تو ہل جاتا۔ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ کیفیت ہوگئی تھی جو بارش کی رات میں باڑے میں چھپی ہوئی بھیگی ہوئی بھیڑوں کی ہوتی ہے لیکن میرے والد کی استقامت اور درستی ہوش و حواس کا یہ عالم تھا کہ اصحاب کرام میں اگر کسی بات پر اختلاف رائے ہوتا تھا تو فوراً عنان فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس گتھی کو سلجھا دیتے تھے"

اور اسی لئے حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا تھا اور کوئی شبہ نہیں کہ بالکل سچ فرمایا تھا کہ :-

"قسم ہے اُس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں اگر اس وقت خلافت کا بار ابوبکرؓ نہ اٹھاتے تو پھر دنیا میں کوئی اللہ کی عبادت کرنے والا نہ رہتا"

یہ جملہ حضرت ابوہریرہؓ نے تین بار دہرایا۔

ایک دوسری مثال میں ایک اوسط درجہ کے آدمی کی پیش کرتا ہوں جسے ہم صرف دنیا کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کی حیثیت سے جانتے ہیں۔

یورپ سے ٹڈی دل صلیبی فوجوں نے یکبارگی مارچ کیا اور فلسطین کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یورپ سے فلسطین تک کوئی بادشاہ اور کوئی لشکران کی یلغار کے سامنے نہ ٹھیر سکا۔ اسلامی حکومتوں نے گھٹنے ٹیک دئے۔ ان کی تاب مقاومت جواب دے گئی اور مسلمانوں کے شہر کے شہر انکی غلامی کے بیرحم شکنجہ میں آگئے، صلیبی فوجوں کا یہ سیل رواں اس امت اور اس کی تہذیب کے وجود کو چیلنج پر چیلنج کر رہا تھا۔ ایک زبردست مصیبت جس نے عالم اسلام کو موت وزلیست کے دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا اور یہ طوفان اگر یونہی بڑھتا رہتا تو کوئی شبہ نہیں کہ مشرق پر مغربی استبداد اور استعماریت کے قیام کا جو سانحہ انیسویں صدی میں پیش آیا وہ سولہویں صدی ہی میں پیش آجاتا، اس طوفان سے ٹکر لینا ان عام بادشاہوں اور جرنیلوں کے بس کا کام نہ تھا جو بیت المقدس اور عالم اسلام کی آزادی کے دفاع کو فکر وسعی کا صرف جزوی حصہ دے سکتے تھے اور اس کے لئے اپنے دوسرے مقاصد اور مشاغل سے دستبردار نہیں ہوسکتے تھے۔ اس کام کے لئے ایک ایسے مرد مجاہد کی ضرورت تھی جو اس ایک فکر کو لے کے دنیا کی ہر فکر سے دست بردار ہو جاتا یہ مرد مجاہد سلطان صلاح الدین ایوبی تھا جسے اللہ نے اس عظیم الشان کام کے لئے منتخب فرمایا اور اسکے بھی دل سے لگ گئی ع یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

اُس نے دم کے دم میں اپنی زندگی کا نقشہ بدل کر اپنے کو اس مقدس کام کا بیڑا اُٹھانے کے لائق بنالیا چنانچہ سلطان کے دوست قاضی بہاء الدین عرف ابن شداد (متوفی ۶۳۲ھ) کا بیان ہے کہ

"اس نے محرمات سے توبہ کی، لذائذ وتنعمات کو ترک کیا اور محسوس کیا کہ اللہ نے اُس کو جس کا عظیم کے لئے پیدا کیا ہے اس کا اور اس عیش پرستی اور معصیت کوشی کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔"

بہر کیف صلاح الدین فلسطین کی عزت کو بچانے اور صلیبی یلغار کو پسپا کرنے کے لئے کمر بستہ ہوا اور تن من دھن کا کل سرمایہ اس کے لئے وقف کر دیا۔ ابن شداد اس کی سیرت میں لکھتے ہیں کہ

"سلطان کا شوق جہاد اس درجہ بڑھ گیا تھا اور اس کے ظاہر و باطن پر یہ شوق اس طرح غالب ہو گیا تھا کہ اسے جہاد کے سوا کوئی دوسری بات نہ تھی اسکی توجہ کا مرکز صرف سامان جہاد اور مجاہدین تھے اور صرف اس شخص سے دلچسپی تھی جو جہاد کی باتیں کرے اور اس کے شوق کو بھڑکائے جہاد فی سبیل اللہ کی محبت و شیفتگی میں اس نے اپنا محل، اپنا وطن [illegible] اور اپنی اولاد سب کو خیرباد کہہ دیا تھا اور ایک اپنے معمولی سے خیمے میں زندگی بسر کرتا تھا جو ہوا کے تیز جھونکوں کا بھی مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ کوئی شخص اگر اس کا تقرب حاصل کرنا چاہتا تو اس کی واحد صورت یہی ہوتی کہ وہ سلطان کے جوش جہاد کو تیز کرنے والی باتیں کرتا[1]"

بیت المقدس کی فکر سلطان کے دل میں گھر کر گئی تھی اور اس پر صلیبیوں کے قبضہ کا اس کو اتنا رنج تھا کہ بیان میں نہیں آسکتا۔ ابن شداد کہتے ہیں کہ :-

"خدا غریق رحمت کرے سلطان کے دل پر بیت المقدس کی فکر کا اتنا بوجھ تھا جسے پہاڑ بھی برداشت نہ کر سکیں[2]"

میں چاہتا ہوں کہ بیت المقدس اور بلاد اسلامیہ کے سقوط پر سلطان کے اضطراب، درد و کرب اور رنج و الم اور ان مقامات کو واپس لینے اور صلیبی فوجوں کو شکست دینے کے لئے سلطان کی بے چینی اور بیتابی کا مرقع آپ کے سامنے پیش کروں مگر اس مقصد کے لئے مجھے ابن شداد کے الفاظ سے زیادہ کامیاب اور بلیغ الفاظ نہیں ملتے عکا کے دلدوز واقعہ پر صلاح الدینؒ کے اضطراب کا عالم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"سلطان کا حال ٹھیک اس غم نصیب ماں کا سا تھا جو اپنے لخت جگر کو رو رہی ہو گھوڑا دوڑا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے، لوگوں کو آمادۂ جہاد و پیکار کرتے تھے۔ لشکر کی صفوں میں بنفس نفیس دیوانہ وار گشت لگاتے تھے اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ یہ دل دگار صدا بلند کرتے جاتے تھے "یا للاسلام" اسلام

---

[1] النوادر السلطانیہ والمحاسن الیوسفیہ ص ۱۲ [2] ۵۲ ایضاً ص ۲۱۳

کے فرزندوں اسلام کی مدد کو دوڑو، عکا کی بربادی اور اس کے باشندوں کی تباہی جب جب سلطان کی نظر کے سامنے آتی تھی بپھر جاتے تھے اور پوری قوت سے لوگوں کو انتقام اور جہاد پر ابھارتے تھے۔ اس دن دن بھر رزق کا ایک دانہ منہ میں نہیں گیا، صرف مشروبات کے چند گلاس طبیب خاص کے کہنے سننے پر نوش کئے تھے۔[۱]

عکا کی طرف پیش قدمی کرنے کے لئے راستہ بنانے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"سلطان ان تمام امور کی دیکھ بھال بنفس نفیس کرتے تھے اور اس سلسلہ میں ہر طرح کی مشقت برداشت کرتے تھے اور کسی موقع پر بھی پیچھے نہیں رہتے تھے یہ ان کی شدت حرص اور وفور درد وفکر کا مقتضیٰ تھا۔ مجھے ان کے ایک طبیب سے یہاں تک معلوم ہوا کہ جمعہ کے دن سے اتوار تک انھوں نے اتنی تھوڑی غذا کھائی تھی جو بالکل نہ کھانے کے برابر تھی اور وہ بھی طبیب کے بہت اصرار سے۔"[۲]

عادلیہ کی جنگ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

"میں نے دیکھا کہ سلطان رحمۃ اللہ علیہ اپنے خواص کی چھوٹی سی جماعت کے ساتھ اپنے خیمہ سے سوار ہو کر نکل پڑے حالانکہ فوج ابھی سوار بھی نہ ہونے پائی تھی ——— بالکل جیسے ماں اپنے بچے کی موت پر رونے کے لئے کسی اور کی منتظر نہیں رہا کرتی"![۳]

حضرات! یہ اس بے پناہ فکر، مضطرب دل اور بے چین روح ہی کا طفیل ہے جو سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی مہم شاندار طریقہ سے سر ہوئی اور ایسے سخت اور خونیں معرکہ میں فتح مبین حاصل ہوئی۔ اس کے جھنڈے کے نیچے بھاری تعداد میں فوجوں کا اجتماع اور امراء کا غیر معمولی التفات یہ سب بھی کیا تھا؟ اس کے دھڑکتے ہوئے دل، پھڑکتی روح اور ابلتے ہوئے ایمان کی صدائے بازگشت! آپ تاریخ کا کوئی سنگین معرکہ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ آپ کو ضرور فتح کے پیچھے ایک دھڑکتا ہوا دل، اچھلتی ہوئی نبض، ایک گرجتا ہوا شیر اور بپھرا ہوا بہادر ملے گا۔

---

[۱] النوادر السلطانیہ والمحاسن الیوسفیہ ص ۱۵۵۔ [۲] ایضاً ص ۹۔ [۳] ایضاً ص ۱۱۲

ہمارے اس تازہ جہاد کا سب سے کمزور پہلو یہی ہے کہ عرب میں کوئی جماعت کوئی سلطنت اور کوئی فرد ایسا موجود نہیں جو فلسطین کی حفاظت کے لئے ہر فکر اور ہر کام سے اس شخص کی طرح فارغ ہو جس کا اکلوتا بیٹا بیمار ہو یا وہ کسی ایسے سنگین مقدمہ میں پھنس گیا ہو جس کے ہار جانے کی صورت میں سخت ترین سزا یقینی ہو، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک طرف تو فلسطین کا معرکہ درپیش ہے اور دشمن ہماری گھات میں ہے اور دوسری طرف ہماری باہمی چپقلش اور اندرونی رقابتوں کا بازار بھی گرم ہے۔ آپ نے کہیں بھی سنا ہے کہ کسی خاندان کا کوئی عزیز جوان یا بڑا بوڑھا بیمار ہو مرض شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہو، موت سر پہ کھڑی نظر آ رہی ہو اور اس خاندان کے باقی ارکان بجائے مریض کے دوا علاج کے، اس کے منصب اور اعزاز پر قابض ہونے کے لئے باہم دست و گریباں ہو رہے ہوں۔ یہ افسوسناک حال اگر کہیں دیکھنے میں آئے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انھیں مریض سے کوئی تعلق اور محبت نہیں بلکہ نفس انسانیت تک سے یہ عاری ہیں۔ فلسطین کی ذمہ داری قدرتی طور پر بہت سے اسلامی ملکوں کے درمیان تقسیم ہے لیکن وائے حسرت! کسی ملک والوں میں یہ جذبہ نہیں ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ محسوس کریں بلکہ اپنی ذمہ داری بھی دوسروں ہی پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ یہ سب کا مسئلہ ہے اور اس کے خاطر خواہ حل نہ ہونے کی صورت میں سبھی کو خطرہ ہے۔ اور پھر اس جمہوری تماشہ نے مسئلہ کو اور بھی کھٹائی میں ڈال دیا ہے کہ ایک ملک کے حصہ میں جو ذمہ داری آتی ہے وہ پھر ملک کے ہر ہر باشندے پر تقسیم ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی اہم ذمہ داری ایک مذاق بن کے رہ جاتی ہے، عوام ارکان حکومت پر ٹال دیتے ہیں اور ارکان حکومت عوام پر، کوئی شخص اس کو اپنا ذاتی مسئلہ اور خود کو اس کا پورا ذمہ دار اور جواب دہ نہیں سمجھتا۔

لیکن میرے بزرگو اور عزیزو! مایوسی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہماری یہ تینوں کمزوریاں ——— جن کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ——— لاعلاج نہیں ہیں۔ داخلی اور نفسی محرکات کا سرچشمہ ایمان ہے جو اس امت کے سینہ میں آج بھی ہے اور ابھی خشک نہیں ہوا ہے اور ہر وقت اسے گرمایا جا سکتا ہے وہ روح اور وہ دل جو جانبازی پر آمادہ کرتا ہے کمزور کبھی نہیں ہوتا صرف باگیں ڈھیلی کر دینے کا

منتظر ہوتا ہے علیٰ ہذا امت خدانخواستہ بانجھ نہیں ہوگئی ہے۔ ایسی امت کے متعلق بانجھ ہونے کا تصور بھی کیسے کیا جاسکتا ہے جس نے اب تک ہر گتھی کو سلجھانے کے لئے اور ہر آڑے وقت میں کام آنے کے لئے ایسے ایسے مردوں کو جنم دیا ہے جن کے حوصلوں کے سامنے آسمان پست ہو ہو گیا اور کیا بعید ہے کہ یہ فلسطین ہی امت میں ایک نئی روح اور مشرق عربی میں بیداری کی ایک عام لہر دوڑا دے۔

ہمارے عظیم شاعر ڈاکٹر محمد اقبال نے تو کہا ہے:—

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عروقِ مردہ مشرق میں خون زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

اور اقبال کے ایک شعر پر ہی اپنی بات ختم کرتا ہوں

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی
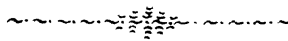
قم باذن اللہ

(از محمد نیاز صاحب)

ترے دل میں جو مومن واقعی ایمان پیدا ہو تو پھر تیرے جہانِ امن کا سامان پیدا ہو

غنا میں شانِ استغنا کہاں، غافل دعا یہ کر کہ یا رب! ہم میں فقرِ بوذرؓ و سلمانؓ پیدا ہو

زمانے کی غلامی سے نجات اے دوست مشکل ہے امامت کا اگر دل میں فقط ارمان پیدا ہو

اگر بدر و احد کے معرکے سر آج بھی ہو لیں تو پھر دورِ خلافت کا ابھی امکان پیدا ہو

توکل ہو تو پھر تجھ سے درِ خیبر لرز اٹھے ابھی نانِ جویں سے جسم میں وہ جان پیدا ہو

ذرا اٹھ خانقاہوں سے ہویدا ہو مساجد سے حسینی روح بن کر آ، سرِ میدان پیدا ہو

افق پر زندگی کے آفتاب آسا نمایاں ہو تجلی کر، ہویدا ہو، بہ عز و شان پیدا ہو

دکھا دے پھر زمانے کو ابھی اسلام زندہ ہے اٹھا قرآن کو، اے صاحبِ قرآن پیدا ہو

سبق بھولے ہوئے بندوں کو پھر سے معرفت کا دے باندازِ نوی اے مستِ صد عرفان پیدا ہو

ترا انسانیت کا درس پا کر اس زمانے میں نئے جذبوں کا حامل اک نیا انسان پیدا ہو

عرب کے ریگ زاروں سے نمایاں ہونے والے اٹھ

نئے سرے میانِ خاکِ ہندستان پیدا ہو!

جلد ۱۹ | ماہ ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ مطابق ستمبر ۱۹۵۲ء | نمبر ۱۲

سُرخ پنسل کا نشان! اس بات کی علامت ہے کہ جناب کی مدتِ خریداری اس شمارہ پر ختم ہوگئی ہے لہذا اپنا چندہ برائے ایک سال مبلغ (پانچ روپیہ صہ/) بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما کر مشکور فرمائیے۔ اگر ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۲ء تک جناب کا چندہ وصول نہ ہوا، اور نہ کوئی اطلاع آئی تو اگلا پرچہ وی. پی بھیجا جائے گا جس کا وصول کرنا جناب کا اخلاقی فریضہ ہوگا ـــــ پاکستان کے حضرات اپنا چندہ سکریٹری صاحب "ادارۂ اصلاح و تبلیغ" آسٹریلین بلڈنگس لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں، اور ایک کارڈ کے ذریعہ ہم کو اس کی اطلاع ضرور دیں، اور قدیم خریدار صاحبان اس اطلاع کے ساتھ اپنا نمبر خریداری بھی ضرور لکھیں۔ اگر آپ کے چندہ کی اطلاع ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۲ء تک موصول نہ ہوئی تو ادارۂ اصلاح و تبلیغ لاہور سے آپ کی خدمت میں "الفرقان" بذریعہ وی. پی ارسال کیا جائے گا ـــــ دیگر ممالک کے حضرات اپنا چندہ ۱۲ شلنگ بذریعہ پوسٹل آرڈر دفتر "الفرقان" لکھنؤ کو ارسال فرمائیں۔ والسلام

ناظم:- الفرقان - لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

خاتمہ

جلد نوزدہم ۱۹

(از:- محمد منظور نعمانی)

یہ شمارہ سنہ رواں (۱۳۷۱ھ) کا آخری شمارہ ہے، اس پر "الفرقان" کی اُنیسویں جلد ختم ہو گئی، اور اب اگلے پرچہ سے اسکی عمر کا بیسواں سال بفضلہٖ تعالیٰ شروع ہو گا۔

اُس ربِ کریم کا شکر کس طرح ادا ہو جس نے اب سے ۱۹ برس پہلے "الفرقان" کے اجراء کا داعیہ دل میں ڈالا، اور انتہائی بے سرو سامانی کی حالت میں جبکہ اس راہ کا کوئی تجربہ بھی نہ تھا اس کے جاری کرنے کی ہمت عطا فرمائی، اور پھر اُس وقت سے اب تک اُسی کی مدد اور دستگیری نے اس کو زندہ اور جاری رکھا

فللہ الحمد فی الابتداء والانتہاء ولہ الشکر فی السراء والضراء۔

اگر کوئی دینی خدمت اس کے ذریعہ ہوئی، اور اللہ کے کچھ بندوں کو اگر کچھ دینی نفع پہنچا تو وہ محض فضلِ ربی ہے، اور جو قصور رہا، اور جو غلطیاں اور کوتاہیاں ہوئیں وہ سب اپنی نااہلی اور بے بضاعتی کا نتیجہ ہیں جن کی معافی کی اُسی ربِ کریم سے التجا اور اُمید ہے۔

---

۱۹ برس کی اس طویل مُدت میں "الفرقان" کے ذریعہ اللہ کے ہزاروں بندوں سے دینی اخوت کا اور ایک قسم کی معاملت کا تعلق ہوا، پھر کچھ وہ ہیں جن کا یہ تعلق اب تک قائم ہے، اور کچھ وہ ہیں جن کا تعلق کچھ عرصہ رہا اور کسی وجہ سے پھر نہ رہ سکا (بلکہ سیکڑوں تو ایسے بھی ہونگے جو کسی زمانہ میں الفرقان کے خریدار تھے اور اب وہ اِس دُنیا سے بھی جا چکے ہیں، اللہ اُن کے ساتھ رحمت و مغفرت کا معاملہ فرمائے) بہرحال یہ سب حضرات ایک درجہ میں الفرقان کے محسن اور اس خدمت کی انجام دہی میں ہمارے معاون رہے ہیں، اور اگر دینی

دعوت وخدمت کا یہ سلسلہ اللہ کے نزدیک کسی درجہ میں قابلِ قبول اور لائقِ اجر ہے، تو انشاء اللہ وہ حضرات بھی اسکے اجر میں حصہ دار ہیں۔ ہمارے پاس شکریہ کے چند الفاظ کے سوا ان حضرات کے لئے کچھ بھی نہیں ہے بس حق تعالیٰ ہی اُنکے اس تعاونِ علی الخیر کا اجر، اور ہماری طرف سے جزاءِ خیر عطا فرمائے۔

ہمیں اس کا بھی پورا اندازہ اور صدقِ دل سے اعتراف ہے کہ الفرقان کے ان محسنین اور معاونین کے بارہ میں ہم سے بہت کوتاہیاں ہوئیں، اور ان میں سے بہت سے حضرات کو (خاصکر دفتر کی انتظامی کمزوری سے) بارہا تکلیفیں پہنچیں۔

جیساکہ پہلے بھی غالباً کئی بار الفرقان کے انہی صفحات میں عرض کیا گیا ہے، آج بھی عرض کرنا ہے کہ اہلِ دفتر کی غفلت سے یا کسی حسابی غلطی کی وجہ سے جن دوستوں کی کوئی حق تلفی اس سلسلہ میں کبھی ہوئی ہو وہ بے تکلف مجھے اطلاع دیں، انشاء اللہ تاامکان اُن کا حق ادا کرنے کی کوشش کی جائے گی، اور اگر کوئی دوست اپنی محبت اور شرافت کی وجہ سے اطلاع دینا پسند نہ کریں تو پھر معاف ضرور فرمادیں، اِس عاجز پر یہ اُن کا بڑا صدقہ اور بڑا احسان ہوگا، اور انشاء اللہ وہ اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے۔

ناظرینِ کرام کو یاد ہوگا (الفرقان) پہلے ۵۶ صفحات پر شائع ہوتا تھا، گذشتہ سال جب کوریا کی جنگ میں تیزی آئی تو ایکدم کاغذ کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا، اور ہمیں مجبوراً الفرقان کے صفحات ۴۸ کردینے پڑے، لیکن اُس وقت ہم نے وعدہ کیا تھا کہ جب کاغذ کی قیمت کچھ اعتدال پر آئے گی، الفرقان کے صفحات پھر ۵۶ کردیئے جائیں گے۔

چنانچہ اب چند ہفتوں سے کاغذ کی قیمت کچھ اُتری ہے، اِسلئے اب "الفرقان" اِنشاء اللہ سابق معمول کے مطابق ۵۶ ہی صفحات پر شائع ہوا کرے گا۔

خیال یہ ہے کہ شکایات پیدا ہونے میں اکثر اس کو بھی دخل ہوتا ہے کہ بیشتر حضرات خط وکتابت کے وقت خریداری نمبر کا حوالہ نہیں دیتے۔ اگر اسکی پابندی کرلی جائے کہ ہر خط اور منی آرڈر کوپن پر ہمیشہ خریداری نمبر اور اپنا پورا پتہ صاف صاف تحریر کردیا جائے تو شکایات میں بڑی حد تک کمی ہوجائیگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

۱۹۴۷ء میں ہمارے ملک سے انگریزی حکومت کے خاتمہ اور قومی حکومت کے قیام کے بعد ہندوستانی مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو طوفان آیا وہ اگرچہ سراسر شر و فساد تھا لیکن قدرتی طور پر اسمیں یہ ایک پہلو خیر کا بھی تھا کہ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کی کمزور پوزیشن کو پوری طرح کھول کر انکے سامنے رکھدیا تاکہ وہ نئے ہندوستان میں اپنے صحیح موقف اور مقام کو سمجھ لیں اور یہاں باعزت زندگی حاصل کرنے کیلئے انھیں جو کچھ کرنا چاہئے اور اپنے کو جیسا کچھ بنانا چاہئے اسمیں وہ دیر نہ کریں ـــــ چنانچہ اُن طوفانی مصائب سے جہاں بہت سوں کے پاؤں اُکھڑے اور بہت سوں میں افسردگی اور مایوسی آئی، وہیں بہت سے مسلمانوں میں ایک چونک اور بیداری کی کیفیت بھی پیدا ہوئی بہت سے وہ بھائی جو اللہ سے اپنا تعلق توڑے ہوئے تھے انھوں نے اپنے مالک سے نئے سرے سے اپنا تعلق جوڑنے کا فیصلہ کیا، اور بہت سے وہ لوگ جو ہمیشہ سے حسین خوابوں کی "جنت" میں رہنے کے عادی تھے اور مسلمانوں کی کمزوریوں کو سمجھنے کیلئے حقیقت پسندوں کی طرح اپنے کمزور پہلوؤں پر غور کرنے کے وہ مطلق خوگر نہ تھے ہم نے دیکھا کہ اس طمانچہ نے اُن کو بھی حقیقت پسند بنا دیا، اور بہت سے وہ جذباتی بھائی جو اپنے جذبات اور اپنی جھوٹی تمناؤں کے خلاف عقل کی کوئی بات سننے کیلئے تیار نہ تھے وہ معقولیت پسند بن گئے، اور عقل کی "کڑوی" باتیں بھی سُننے لگے ـــــ لیکن افسوس، کہ یہ حالت دیر تک قائم نہ رہی، اور جیسے ہی وہ طوفان کچھ اُترا، اور حالات کچھ درست ہوئے، پھر وہی پہلی والی غفلت اور بے فکری واپس آگئی، اور اپنی بُرائیوں اور کمزوریوں کے خلاف جہاد کے ارادے، اور نئی زندگی پیدا کرنے کے عزائم سب ختم ہو گئے، جیسے کہ مسلمانوں کے سب مسئلے حل ہو گئے، اور اب کوئی خطرہ اور غم باقی نہیں رہا۔

کئی برس کی لاپرواہی کے بعد اب اچانک ایک ایسا تکلیف دہ سانحہ پیش آیا جس نے مسلمانوں میں پھر کچھ حرارت اور بیداری پیدا کرنے کی خدمت انجام دی، اور وہ یہ کہ الہ آباد کے ہندی روزنامے "امرت پتریکا" نے کسی ایک مسلمان کے

جان یا مال پر نہیں، بلکہ پوری مسلمان قوم کی روح پر ایک ایسا کاری وار کیا کہ پوری قوم تڑپ اٹھی اور پھر مختلف مقامات پر وہ واقعات پیش آئے جو عام طور سے اخبارات میں آچکے ہیں ـــــ ان واقعات نے جیسا کہ عرض کیا گیا پھر مسلمانوں میں احساس و بیداری کی ایک کیفیت کسی درجہ میں پیدا کی ہے، اور ان میں کے بہت سے وہ لوگ بھی جو گذشتہ تین چار سالوں میں مسلمانوں کی فکر سے یکسو سے ہو گئے تھے سوچنے لگے ہیں، کہ آئے دن کی ان دلآزاریوں، ستم رانیوں اور ناانصافیوں سے بچنے کیلئے ہمیں کیا کرنا چاہئے ـــــ لیکن دیکھا جا رہا ہے کہ بہت پرانی اس غلطی کا پھر اعادہ ہو رہا ہے کہ غور و فکر اور قلم و زبان کا سارا زور صرف اس پر صرف کیا جا رہا ہے کہ جن کی طرف سے اکثریت کے زعم یا اقتدار کے نشہ میں دلآزاریاں اور ناانصافیاں ہوتی ہیں ان کو کس طرح روکا جائے اور شرافت و انصاف کا رویہ اختیار کرنے پر کن تدبیروں اور کوششوں سے ان کو مجبور کیا جائے ـــــ حالانکہ سب سے پہلے سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں وہ کیا کمزوریاں ہیں جن کی وجہ سے اس ملک میں قریباً ۴ کروڑ ہونے کے باوجود ہمارے نازک ترین جذبات سے کھیلنا اور ہمارے ساتھ بڑی سے بڑی ناانصافی کرنا لوگوں کے لئے اتنا آسان ہو گیا ہے۔

اسوقت ہم اپنے بھائیوں کی رضامندی اور ناراضی سے بالکل بے پروا ہو کر یہ حق بات صاف صاف کہنا اپنا ایمانی فرض سمجھتے ہیں کہ دوسروں کے مظالم کے شکوے شکایتیں کر کے اور انکے خلاف غیظ و غضب سے بھری پُرجوش تقریریں کر کے، اور آتشیں مضامین لکھ کے ہم اپنے دل کا بخار تو نکال سکتے ہیں، اور عام مسلمانوں کی نگاہ میں مقبول اور محبوب بھی بڑی آسانی سے بن سکتے ہیں، لیکن اس سے حالات کو نہیں بدلا جا سکتا، اور مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا جا سکتا۔

موجودہ حالات میں ذلت اور مقہوریت کی اس لعنت سے مسلمانانِ ہند کے نجات پانے کی پہلی اور اہم شرط یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے ان برائیوں اور کمزوریوں کو دور کیا جائے جنکی نحوست نے مسلمانوں کو اللہ کی نظر سے گرایا ہے اور دنیا میں اتنا بے وزن اور بے اثر کر دیا ہے کہ ہر کمینہ شخص انھیں ستانے اور انکے ساتھ شدید سے شدید بے انصافی کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔

وہ برائیاں اور کمزوریاں کیا ہیں؟ ـــــ مسلمان کہلانے کے باوجود خدا سے بے تعلقی ـــــ اللہ کے احکام کے مقابلے میں اپنی خواہشات کی پیروی ـــــ دعوتِ الی اللہ کے پیغمبرانہ کام سے دستبرداری اور اپنے ذاتی کاموں ہی میں انہماک، بدعملی اور بداخلاقی ـــــ انکی بہت بڑی تعداد کا اس حال میں ہونا کہ وہ ناتعلیم یافتہ اور

جاہل ہے ـــــــ ملی احساس وشعور سے بالکل خالی ہے، اپنے پیٹ اور اپنی دوسری ذاتی ضرورتوں کے سوا اس کے سامنے کوئی مقصد اور مسئلہ نہیں ہے ـــــــ وہ زمانہ کے اُن عوامل اور اُن حالات وحقائق سے بھی بے خبر ہے جن سے اس زمانہ میں کسی ایسی قوم کے ایک فرد کو بھی ناواقف اور بے خبر نہیں رہنا چاہئے، جو دُنیا میں عزت کے ساتھ رہنے کی آرزومند ہو۔

یہ ہیں ہماری قوم کی وہ اصولی بیماریاں اور کمزوریاں جنھوں نے ہمیں اللہ کی رحمت اور نصرت سے محروم کیا ہے، اور دنیا میں ہماری ساکھ گرائی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں سے اِن بُرائیوں کو نکالنے کی کوشش کرنا اور ان میں کھڑے ہوکے یہ کہنا کہ تمھارے اندر یہ یہ بیماریاں موجود ہیں، اور تمھارا سب سے اہم مسئلہ جس پر تمھارے سب مسئلوں کا حل موقوف ہے، یہ ہے کہ ان بیماریوں سے نجات حاصل کرکے تم تندرست اور توانا، اور عزت کی زندگی حاصل کرنے کے لائق بنو! مسلمانوں کیلئے ایک خاصا کڑوا گھونٹ ہے، اور ایسا کرنے والے قوم میں مقبول اور محبوب نہیں بن سکیں گے، بلکہ بہت ممکن ہے کہ وہ سفہائے قوم کے معتوب بنیں، اُن کی گالیاں سنیں، اور اُنکے ہاتھوں سے تکلیفیں اُٹھائیں، اور بہت سے درمیانہ درجہ کے لوگ بھی ان کی بات کو بے وقت کی راگنی کہیں، لیکن اللہ کے بخشے ہوئے یقین کی بنا پر قسم کھا کے کہا جا سکتا ہے کہ راہ صرف یہی ہے، اور اسکے بغیر عزت کی زندگی حاصل کرنیکے دروازے ہمارے لئے بند ہیں، کسی میں طاقت نہیں ہے کہ قانونِ قدرت اور نوشتہ الٰہی کو بدل سکے۔

پھر یہ کام ہاتھوں پر سرسوں جمانے کا کام نہیں ہے، یہ قوم کی سیرت میں انقلاب کا کام ہے، جو بڑے صبر اور استقلال، اور بڑی بے لذت اور بے ذائقہ محنت کو چاہتا ہے، وہ صبر و استقلال اور وہ بے ذائقہ محنت جس کے نمونے انبیاء علیہم السلام اور انکے متبعین کی اس مقصد کی کوششوں میں ہمیں نظر آتے ہیں ـــــــ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اِس کا یقین نصیب فرمائے، اور اِس راہ میں جانبازی کی توفیق بخشے۔ اللھم تمتنا علی ملۃ رسولک وتوفنا علی الجہاد فی سبیلک۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اِس سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ دوسری تدبیریں اور کوششیں سرے سے ترک کردی جائیں بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ تعمیرِ سیرت کے جس پہلو کی طرف ہم نے توجہ دلائی ہے اُس کی واقعی اہمیت کو محسوس کیا جائے، اور قومی جدوجہد میں ابتک یہ پہلو جس طرح نظر انداز ہوتا رہا ہے، آئندہ یہ غلطی نہ ہو۔

معارف الاحادیث

اہلِ جنّت کیلئے حق تعالیٰ کی دائمی رضا :۔

(۱۰۵) عن ابی سعید قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان اللہ تعالیٰ یقول لاھل الجنۃ یا اھل الجنۃ فیقولون لبّیك ربنا وسعدیك والخیر کلّہ فی یدیك فیقول ھل رضیتم؟ فیقولون ومالنا لا نرضیٰ یا رب وقد اعطیتنا مالم تعط احداً من خلقك فیقول الا اعطیکم افضل من ذالك فیقولون یا رب وایّ شیئ افضل من ذالك؟ فیقول احل علیکم رضوانی فلا اسخط علیکم بعدہ ابداً۔ (متفق علیہ)

(ترجمہ) حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان فرمایا، کہ:۔ (جنّتی جب جنّت میں پہونچ جائینگے اور وہاں کی نعمتیں اُنکو عطا ہو جائینگی تو) اللہ تعالیٰ ان کو مخاطب کرکے فرمائیں گے کہ اے اہلِ جنّت! وہ عرض کرینگے کہ اے ہمارے رب ہم حاضر ہیں، حاضر ہیں، آپ کی بارگاہِ قدس میں حاضر ہیں، اور ساری خیر اور سب بھلائی آپ ہی کے قبضہ میں ہے (جس کو جو چاہیں عطا فرمائیں یا عطا نہ فرمائیں)۔ پھر اللہ تعالیٰ ان بندوں سے فرمائیں گے، تم خوش ہو؟ (یعنی جنّت اور جو نعمتیں جنّت میں تم کو دی گئیں تم اُن سے راضی ہو؟)۔ یہ جنّتی بندے عرض کریں گے، اے پروردگار! جب آپ نے ہمیں یہاں وہ کچھ نصیب فرمایا ہے، جو اپنی کسی مخلوق کو نہیں دیا تھا (یعنی آپ کی بخشش اور آپکے کرم سے جب یہاں ہمیں وہ نعمتیں اور وہ راحتیں اور لذّتیں نصیب ہیں، جو دُنیا میں کسی

بڑے سے بڑے کو بھی نصیب نہیں تھیں) تو ہم کیوں راضی اور خوش نہ ہوں گے!———

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، کیا میں تمہیں اس سب سے اعلیٰ و افضل ایک چیز اور دوں! وہ بندے عرض کریں گے، کہ خداوندا! وہ کیا چیز ہے جو اس جنت اور اسکی ان نعمتوں سے بھی افضل ہو؟ - اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں تم کو اب اپنی دائمی اور ابدی رضامندی، اور خوشنودی کا تحفہ دیتا ہوں، اس کے بعد اب میں کبھی تمپر ناراض نہ ہوں گا۔ (بخاری و مسلم)

(تشریح) جنت اور اس کی ساری نعمتیں عطا فرمانے کے بعد اُس ربِ کریم کا اپنے بندوں سے پوچھنا کہ "تم راضی ہو، خوش اور مطمئن ہو؟"، بجائے خود کتنی بڑی نعمت ہے، اور پھر دائمی رضا کا تحفہ، اور کبھی ناراض نہ ہونے کا اعلان کتنا بڑا انعام اور احسان ہے، اس سے جو لذت اور مسرت اہلِ جنت کو اُسوقت حاصل ہوگی اگر اُس کا ایک ذرہ اس دنیا میں ہم پر منکشف کر دیا جائے تو دنیا کی کسی لذت اور مسرت کی چاہت ہمارے دلوں میں نہ رہے — بیشک بیشک اللہ کی رضا، جنت اور اس کی ساری نعمتوں سے بہت ہی اعلیٰ و بالا ہے۔ "ورضوانٌ من اللہ اکبر" اور لذت و مسرت میں اعلانِ رضا سے بڑھ کر صرف "دیدارِ الٰہی ہے"۔

جنت میں دیدارِ الٰہی :—

حق تعالیٰ کا دیدار وہ سب سے بڑی نعمت ہے جس سے اہلِ جنت کو نوازا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ نے جن کو عقلِ صحیح اور ذوقِ سلیم عطا کیا ہے وہ اگر خود اپنے وجدان میں غور کریں تو اس نعمت کی خواہش اور تمنا وہ ضرور اپنے میں پائیں گے، اور کیوں نہ ہو جو بندہ اپنے خالق اور رب کی بے شمار نعمتیں اس دنیا میں پا رہا ہے اور پھر جنت میں پہونچ کر اس سے لاکھوں گنی نعمتیں پائے گا، لازماً اُس کے دل میں یہ تمنا اور تڑپ پیدا ہوگی کہ کسی طرح میں اپنے اس محسن اور کریم رب کو دیکھ پاتا جس نے مجھے وجود بخشا، اور جو اس طرح مجھپر اپنی نعمتیں اُنڈیل رہا ہے۔ پس اگر اُسے کبھی بھی یہ نظارہ نصیب نہ ہو، تو یقیناً اس کی لذت و مسرت اور اُس کے عیش میں بڑی کمی اور بڑی تشنگی رہیگی، اور اللہ تعالیٰ جس بندہ سے راضی ہو کر اُس کو جنت میں پہنچائیں گے اُس کو ہرگز اس سے تشنہ اور محروم نہیں رکھیں گے۔

اہلِ ایمان کے لئے قرآن مجید میں بھی اس نعمتِ عظمیٰ کی بشارت سنائی گئی ہے، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی صحابۂ کرامؓ کو صاف صاف اسکی خوشخبری دی ہے، اور تمام اہلِ ایمان نے بغیر کسی تردد کے اس پر یقین کیا ہے ــــ لیکن بعض ایسے طبقے اور ایسے لوگ جو آخرت کی چیزوں کو بھی اس دنیا کے انداز سے سوچتے ہیں اور یہاں کے اپنے محدود علم و تجربہ کو علم اور تجربہ کا آخری اور انتہائی درجہ سمجھتے ہیں انھیں اس مسئلہ میں شبہات پیش آتے ہیں، وہ سوچتے ہیں کہ دیکھا تو اُس چیز کو جا سکتا ہے جو جسم ہو، جس کا سفید یا زرد وغیرہ کوئی رنگ ہو، اور جو آنکھ کی سیدھ میں ہو ــ اور اللہ تعالیٰ نہ جسم ہے، نہ اُس کا کوئی رنگ ہے، اور نہ اس کے لئے آگے یا پیچھے کی کوئی جہت ہے، تو پھر اُس کو دیکھا کیونکر جا سکتا ہے! ــــ حالانکہ یہ سراسر مغالطہ ہے اگر اہلِ حق کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار دُنیا کی انہی آنکھوں سے ہوگا جو صرف جسم کو اور کسی رنگ دار چیز ہی کو دیکھ سکتی ہیں، اور جن کی بینائی صرف اس چیز کا ادراک کر سکتی ہے جو اُن کی سیدھ میں یعنی سامنے ہو، تو بیشک ان منکرین کا یہ سوچنا کسی درجہ میں صحیح ہوتا، لیکن نہ قرآن و حدیث نے یہ تبلایا ہے، اور نہ اہلِ حق کا یہ عقیدہ ہے۔

اہلِ حق، اہل السنۃ والجماعۃ جو قرآن و حدیث کے اتباع میں اس کے قائل ہیں کہ جنّت میں حق تعالیٰ کا دیدار اُن بندوں کو نصیب ہوگا جو اس نعمتِ عظمیٰ کے مستحق ہوں گے، وہ اس کے بھی قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ جنّتیوں کو بہت سی ایسی قوتیں عطا فرمائیں گے جو اس دنیا میں کسی کو عطا نہیں ہوئیں، اور انہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایسی آنکھیں عطا ہوں گی جن کی بینائی کی قوت اتنی محدود اور کمزور نہ ہوگی، جتنی کہ اس دنیا میں ہماری آنکھوں کی ہے، اور اُن ہی آنکھوں سے اہلِ جنّت کو حق تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا جو نہ جسم ہے، نہ اس کا کوئی رنگ ہے، اور نہ اُس کے لئے کوئی جہت ہے، بلکہ وہ ان سب چیزوں سے وراء الوراء ہے، وہ نور ہے، سراسر نور ہے، اور سارے انوار کا سرچشمہ ہے۔

اس توضیح کے بعد بھی رویتِ باری کے مسئلہ میں جن لوگوں کو عقلی استحالہ کا وسوسہ ہو، اُنھیں ذرا دیر کے لئے اس پر غور کرنا چاہئے، کہ اپنی مخلوقات کو اللہ تعالیٰ بھی دیکھتا ہے یا نہیں؟ اگر دیکھنا صرف ان ہی ذرائع سے اور ان ہی شرائط کے ساتھ ہو سکتا ہے جن سے، ہم دیکھتے ہیں، تو پھر تو چاہئے کہ

اللہ تعالیٰ بھی کسی کو نہ دیکھ سکتا ہو، کیونکہ نہ اس کے آنکھ ہے، اور نہ کوئی مخلوق اسکی نسبت سے کسی جہت میں ہے۔ پس جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ آنکھوں کے بغیر دیکھتا ہے، اور ہماری آنکھیں جن چیزوں کو کسی طرح اور کسی حال نہیں دیکھ سکتیں، وہ اُن کو بھی دیکھتا ہے، اور بغیر مقابلہ اور جہت کے دیکھتا ہے، انھیں رویتِ باری کے مسئلہ میں بھی اس قسم کا کوئی وسوسہ نہ ہونا چاہئے، اور اللہ و رسولؐ کی اطلاعات اور بشارات پر یقین کرتے ہوئے سمجھ لینا چاہئے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور رحمت سے ایسی آنکھیں نصیب فرمائیں گے جو حق تعالیٰ شانہٗ کے جمال کے نظارہ کی لذّت بھی حاصل کر سکیں گی۔

قرآنِ پاک میں اہلِ ایمان کو بشارت سنائی گئی ہے، کہ "وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" (مطلب یہ ہے کہ اہلِ جنّت کے چہرے اُس دن تر و تازہ ہوں گے، وہ خوش و خرم اور شاد ہونگے، اور اپنے رب کو دیکھتے ہوں گے) ——— اور اس کے بالمقابل دوسرے موقع پر مکذبین اور منکرین کے بارہ میں فرمایا گیا ہے "وَإِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ ۝" (یعنی یہ بدنصیب لوگ اُس دن اپنے رب سے روک دیئے جائیں گے، اُسکی زیارت اور اُس کی دید سے محروم رکھے جائیں گے)۔

جنّت میں حق تعالیٰ کی رویت سے متعلق رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جو احادیث مروی ہیں وہ سب مل کر حدِ تواتر کو پہونچ جاتی ہیں، اور ایک مومن کے یقین کے لئے بالکل کافی ہیں — ذیل میں اُن میں سے صرف چند حدیثیں درج کی جاتی ہیں:-

---

(۱۰۶) عن صہیبٍ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا دخل اھل الجنۃ الجنۃ یقول اللہ تعالیٰ تریدون شیئاً ازیدکم؟ فیقولون الم تبیض وجوھنا الم تدخلنا الجنۃ وتنجنا من النار، قال فیرفع الحجاب فینظرون الی وجہ اللہ فما اعطوا شیئاً احبّ الیھم من النظر الی ربھم ثم تلا للذین احسنوا الحسنی وزیادہ۔ (رواہ مسلم)

(ترجمہ) حضرت صہیب رومی سے مروی ہے کہ رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان فرمایا، کہ

جب جنّتی جنّت میں پہونچ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ اُن سے ارشاد فرمائیں گے:۔ کیا تم چاہتے ہو میں تم کو ایک چیز مزید عطا کروں؟۔ (یعنی تم کو جو کچھ ابتک عطا ہوا، اُس پر مزید اور اُس سے سوا ایک خاص چیز اور عنایت کروں)۔ وہ بندے عرض کرینگے:۔ آپنے ہمارے چہرے روشن کئے (یعنی سرخروئی اور خوبروئی عطا فرمائی) اور دوزخ سے بچا کر جنّت میں داخل کیا (اب اس کے آگے اور کیا چیز ہو سکتی ہے جس کی ہم خواہش کریں)۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ ان بندوں کے اس جواب کے بعد یکایک حجاب اُٹھ جائے گا۔ (یعنی اُن کی آنکھوں سے پردہ اُٹھا دیا جائے گا) پس وہ روئے حق اور جمالِ الٰہی کو بے پردہ دیکھیں گے۔ پس اُن کا حال یہ ہوگا (اور وہ محسوس کریں گے) کہ جو کچھ ابتک اُنھیں ملا تھا اُس سب سے زیادہ محبوب اور پیاری چیز اُن کے لئے یہی دیدار کی نعمت ہے۔ یہ بیان فرما کر آپنے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی "لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ" (جن لوگوں نے اس دنیا میں اچھی بندگی والی زندگی گذاری اُن کے لئے اچھی جگہ ہے (یعنی جنّت و مافیہا) اور اُس پر مزید ایک نعمت (یعنی دیدارِ حق)۔ (مسلم)

(تشریح)۔ ۱۔ آنکھوں سے پردہ اُٹھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دفعۃً اُنکی آنکھوں کو بینائی کی ایسی طاقت عطا فرمادے گا کہ وہ روئے حق کا نظارہ کرسکیں گی۔ واللہ اعلم

۲۔ رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آخر میں جو آیت تلاوت فرمائی اُس کے ذریعہ یہ بتلایا ہے کہ اس آیت میں "زیادۃ" سے مُراد حق تعالیٰ کے دیدار کی نعمت ہے جو جنّت اور نعمائے جنّت کے علاوہ، اور ان سے سوا ہے۔

---

(۱۰۷) عن جرير بن عبد الله قال كنّا جلوسًا عند رسُول الله صلى الله عليه وسلم فنظر الى القمر ليلة البدر فقال انكم سترون ربكم كما ترون هٰذا القمر لا تضامون فى رؤيته فان استطعتم ان لا تُغلبوا على صلوٰة قبل طلوع الشمس وقبل غروبها فافعلوا، ثم قرء وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل غروبها۔ (متفق عليه)

(ترجمہ) جریر بن عبداللہ بجلی سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ (ایک رات کو) ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے چاند کی طرف دیکھا، اور یہ چودھویں رات تھی (اور چودھویں کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ اور بھرپور نکلا ہوا تھا) پھر آپ نے ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ یقیناً تم اپنے پروردگار کو اسی طرح دیکھو گے جیسے کہ اس چاند کو دیکھ رہے ہو، تمہیں اُسکے دیکھنے میں کوئی کشمکش نہیں کرنی پڑے گی اور کوئی زحمت نہ ہوگی، پس اگر تم یہ کر سکو کہ طلوع آفتاب سے پہلی نماز، اور غروب آفتاب سے پہلے والی نماز کے مقابلہ میں کوئی چیز کبھی تم پر غالب نہ آئے (یعنی کوئی مشغلہ اور کوئی دلچسپی اور آرام طلبی ان نمازوں کے وقت میں تمھیں اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے) تو لازماً ایسا کرو (پھر انشاء اللہ دیدارِ حق اور نظارۂ جمالِ الٰہی کی نعمت ضرور تم کو نصیب ہوگی —)، اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی:۔ "وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا" (اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اسکی تسبیح کرو (یعنی اس کی پاکی بیان کرنے کے ساتھ اسکی تعریف بیان کرو) سورج کے نکلنے سے پہلے، اور اُسکے ڈوبنے سے پہلے)۔　　(بخاری ومسلم)

(تشریح) - ۱ - دنیا میں جب کسی حسین وجمیل چیز کے دیکھنے والے لاکھوں کروروں جمع ہو جائیں اور سب اُس کے دیکھنے کے انتہائی درجہ میں مشتاق ہوں، تو ایسے موقعوں پر عموماً بڑی کشمکش اور بڑی زحمت ہوتی ہے، اور اس چیز کو اچھی طرح دیکھنا بھی مشکل ہوتا ہے، لیکن چاند کا معاملہ یہ ہے کہ اس کو مشرق ومغرب کے آدمی بغیر کسی کشمکش اور زحمت کے، اور پورے اطمینان سے بیک وقت دیکھ سکتے ہیں، اِسلئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُس کی مثال سے سمجھایا کہ جنت میں حق تعالیٰ کا دیدار اسی طرح بیک وقت اُسکے بے شمار خوش نصیب بندوں کو نصیب ہوگا، اور کسی کو کشمکش اور زحمت سے سابقہ نہیں پڑے گا، سب کی آنکھیں بڑے سکون واطمینان سے وہاں جمالِ حق کے نظارہ کی لذت حاصل کریں گی - اللّٰھُمَّ اجعلنا منھم۔

۲ - آخر میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک ایسے عمل کی طرف بھی توجہ دلائی جو بندہ کو اس نعمت (دیدارِ حق) کا مستحق بنانے میں خاص اثر رکھتا ہے، یعنی فجر و عصر کی نمازوں کا خصوصیت سے

ایسا اہتمام کہ کوئی مشغولیت اور کوئی دلچسپی ان نمازوں کے وقت میں اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے ...... اگرچہ فرض تو پانچ نمازیں ہیں، لیکن نصوصِ کتاب و سنّت ہی سے مفہوم ہوتا ہے کہ ان دو نمازوں کو خاص اہمیت اور فضیلت حاصل ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآنی آیت "وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا" پڑھ کر، ان دو نمازوں کی اسی خصوصیت اور فضیلت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

(۱۰۸) عن ابی رزین العقیلی قال قلت یارسول اللہ اکلنا یریٰ ربہ مخلیا بہ یوم القیٰمۃ قال بلیٰ قلت وما آیۃ ذالک؟ قال یا ابا رزین الیس کلکم یری القمر لیلۃ البدر مخلیا بہ قال بلیٰ قال فانما ھو خلق من خلق اللہ واللہ اجل واعظم۔ (رواہ ابوداؤد)

(ترجمہ) ابو رزین عقیلی سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ میں نے ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا:- یارسولؐ اللہ! کیا قیامت میں ہم میں سے ہر ایک اپنے رب کو اکیلا (بغیر بھیڑ بھاڑ اور کشمکش کے) دیکھ سکے گا؟- آپؐ نے فرمایا:- ہاں! دیکھ سکے گا- میں نے عرض کیا:- اور کیا اسکی کوئی نشانی اور مثال (ہماری اس دنیا میں بھی) ہے؟ - آپؐ نے فرمایا:- اے ابو رزین! کیا چودھویں رات کو تم میں سے ہر ایک چاند کو بجائے خود اور اکیلا بغیر بھیڑ بھاڑ کے نہیں دیکھتا ہے؟- عرض کیا، کہ:- ہاں بیشک، چاند کو تو ہم سب اسی طرح دیکھتے ہیں- آپؐ نے فرمایا، کہ:- وہ تو اللہ کی مخلوق میں سے بس ایک ادنیٰ مخلوق ہے، اور اللہ تو بڑی جلالت والا، اور نہایت عظمت والا ہے (پھر اُس کے لئے کیا چیز مشکل ہے)- (ابوداؤد)

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ لَذَّةَ النَّظْرِ اِلٰى وَجْهِكَ وَالشَّوْقَ اِلٰى لِقَائِكَ

یادگار موتیں

(مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

مشہور حدیث ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا۔ اکثروا ذکر ھادم اللذات (لذتوں کو ڈھا کر رکھدینے والی، یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کیا کرو) سچ پوچھئے تو اسی نبوی وصیت کی تعمیل اس مضمون سے مقصود ہے۔ ایسے واقعات جن کا موت سے تعلق ہے۔ ان ہی کا ذکر اس عنوان کے تحت انشاء اللہ کیا جائے گا۔ موت کے یاد کرنے کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے۔ بڑے بڑے مواعظ اور لچھے دار تقریروں کے مقابلے میں موت کا ہلکا سا خیال زیادہ نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی انگوٹھی میں کہتے ہیں، کہ کفی للمرء بالموت واعظا (آدمی کے لئے موت کافی واعظ ہے) کے الفاظ کھدے ہوئے تھے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہر مہینے میں "الفرقان" کے ناظرین کے سامنے یہی زندہ واعظ کھڑا ہوگا۔ سب سے زیادہ یاد رکھنے کی مستحق جو چیز ہے اُسی کو یہ زندہ واعظ آپ کو یاد دلاتا رہے گا۔ ابتداء میں تو چند خاص استثنائی حوادث کا تذکرہ کیا جائے گا، بعد کو ارادہ یہی ہے اللہ اسے پورا کرے کہ مرتے ہوئے مرنے والوں پر جو کچھ گذری اور اتفاقاً کتابوں میں ان کا تذکرہ کر دیا گیا ہے، حتی الوسع اسی کو جمع کر دیا جائے، ممکن ہے کہ آئندہ وہ کوئی کتاب ہی بن جائے۔ وانما الاعمال بالنیات و لکل امرء ما نوی واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

اگرچہ ایسی صورتیں شاذ و نادر کبھی کبھی پیش آئی ہیں، لیکن ہمارے ہاں کی مستند کتابوں میں چند ایسے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بعض لوگوں سے زندگی کے آثار کا تجربہ کیا گیا۔

خواب میں نہیں بلکہ بیداری میں ان کا مشاہدہ کرایا گیا۔ اس سلسلہ میں پہلا واقعہ تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایک صحابیؓ ہی کا ہے، سیر صحابہؓ کی شاید ہی کوئی کتاب ہوگی، جس میں اجمالاً یا تفصیلاً اس واقعہ کا تذکرہ نہ پایا جاتا ہو۔

کہتے ہیں کہ حضرت عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی خلافت کا زمانہ تھا، ایک انصاری صحابیؓ جن کا مدینہ کے قبیلہ خزرج سے خاندانی تعلق تھا، اسم گرامی ان کا زید بن خارجہ بن ابی زہیر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) تھا۔ اُن صحابیوں میں تھے جو بدر میں شریک ہونے کی وجہ سے تمام صحابہؓ میں خصوصی امتیاز کے مستحق قرار پائے تھے۔ بہرحال ان ہی کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی وفات ہو چکی تھی، جیسے مرنے والے کی لاش پر چادر ڈالدی جاتی ہے ان کو بھی چادر اُڑھا دی گئی تھی، اچانک دیکھا گیا کہ چادر چہرے سے ان کے سرک گئی، اور انکی زبان مُبارک سے السّلام علیکم، السّلام علیکم کی آواز نکل رہی ہے، گھر والے جو قطعی طور پر انکی موت کو یقینی ٹھہرا چکے تھے سب اچنبھے میں تھے، ایک صحابیؓ حضرت نعمان بن بشیر نفل کی دوگانہ ادا کر رہے تھے، ان کے کان میں بھی "السّلام علیکم" کی آواز آئی، نماز میں سُبحان اللہ، سُبحان اللہ کے الفاظ ان کی زبان پر جاری تھے۔ ہر ایک حیرت میں تھا کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے، پھر سنا جا رہا تھا کہ وہی مرنے والے صحابی حضرت زیدؓ کہہ رہے ہیں:۔ انصتوا انصتوا (چپ رہو، چپ رہو) گویا کچھ سنانے کے لئے چپ رہنے کا یہ حکم دے رہے ہیں، اسکے بعد خاص قسم کے فقرے یکے بعد دیگرے سُنے گئے، جو عجیب و غریب تھے، کہہ رہے تھے:۔

محمدؐ رسُول اللہ، یہی بات تھی۔ کتاب اوّل۔ (پہلے نوشتہ) میں،

صَدَقَ، صَدَقَ، صَدَقَ (سچ بولے، سچ بولے، سچ بولے)۔

یہ فقرہ ختم ہوا، تب سُنا گیا:۔

ابوبکر الصدیق، ضعیف فی جسدہ قوی فی امر اللہ

(جسمانی طور پر کمزور، اور اللہ کی بات میں زور آور)

کان فی الکتاب الاوّل (یہی بات کتاب اوّل، یا پہلے نوشتہ میں تھی)

صَدَقَ، صَدَقَ، صَدَقَ (سچ کہا، سچ کہا، سچ کہا)۔

اس کے بعد تیسرا فقرہ اُن کی زبان سے سنا گیا:—

عمر بن الخطابؓ، قوی فی جسدہ قوی فی امر اللہ (جسمانی طور پر بھی زور آور، اور اللہ کی بات میں بھی زور آور) صَدَقَ، صَدَقَ صَدَقَ (سچ کہا، سچ کہا، سچ کہا)۔

چوتھا فقرہ یہ تھا:—

عثمان بن عفانؓ، مضت اثنتان (دو گذر گئے) وبقی اربع (چار باقی ہیں)۔

اسی کے ساتھ یہ بھی فرما رہے تھے، ترجمہ ان کے عربی الفاظ کا یہ ہے، کہ:—

"فتنے اُٹھ کھڑے ہوئے، بے زوروں کو زور والے کھانے لگے۔ الساعۃ (مقررہ گھڑی) قائم ہوگئی، قریب ہو کہ بیر اریس کی خبر تم تک پہونچے، اور کیا ہے بیر اریس"

بعض کتابوں میں ہے کہ آخر میں یہ بھی سنایا گیا کہ مشہور انصاری صحابی عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کا نام لیکر کہہ رہے ہیں:—

"السلام علیک عبد اللہ بن رواحہ"

اور اسی کے ساتھ یہ بھی بولے، کہ:—

"کیا تم میرے ساتھ خارجہ اور سعد کو پا رہے ہو؟"

عربی کے الفاظ ہیں:— "ھل احسست بی خارجۃ وسعدا" مذکورۂ بالا مواد حافظ ابن عبد البر کی کتاب "استیعاب" اور حافظ مزی کی "تہذیب" سے ماخوذ ہے۔

کون کہہ سکتا ہے، کہ الکتاب الاول (پہلے نوشتہ) سے ان کی کیا مُراد تھی، باقی فقرے ظاہر ہیں، جن میں کچھ گذرے ہوئے واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور حضرت عثمانؓ کے ذکر کے بعد جو کچھ ان کی زبان سے سنا گیا، اس میں مستقبل میں پیش آنے والے بعض حوادث کی طرف

اشارہ ہے، جن میں "بیرارِیس" کے واقعہ کو خاص اہمیت دیگئی ہے، یہ قبا کے مشہور کنویں کا نام ہے جس میں حضرت عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی انگلی سے وہ انگوٹھی گر پڑی، اور لاکھ ڈھونڈی گئی مگر نہ ملی[1]۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس انگوٹھی میں کیا راز تھا، عجیب بات ہی کہ اس انگوٹھی کے گم ہو جانے کے بعد اسی کے نمونے پر حضرت عثمانؓ نے دوسری انگوٹھی جو بنوائی تھی، ان کے شہید ہو جانے کے بعد اس کا بھی پتہ نہ چلا، کہ کون لے گیا، اور کیسے غائب ہو گئی۔

آخری فقرہ جس میں حضرت عبداللہ بن رواحہ صحابیؓ کو خطاب کر کے پوچھا گیا ہے، کہ:۔ خارجہ اور سعد کو تم میرے ساتھ پا رہے ہو؟۔ ارباب سِیر نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ ان دونوں میں ایک یعنی خارجہ تو مرنے والے صاحب کے والد کا نام تھا، اور سعد ان کے بھائی تھے، شاید ان دونوں کی رُوح

---

[1] کامل ابن اثیر نے اس انگوٹھی کے گرنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ:۔ جب بیرونِ عرب کے سلاطین کے نام رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خطوط روانہ کرنے کا ارادہ فرمایا تو لوگوں نے عرض کیا کہ ان سلاطین کے دربار کا قاعدہ ہی کہ جن خطوط پر مہر نہیں ہوتی وہ قبول نہیں کئے جاتے، تب رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پہلے لوہے کی ایک انگوٹھی بنوائی، جبرئیل امینؑ نے جب منع کیا تو تانبے کی بنوائی، لیکن اس سے بھی روکا، اسکے بعد چاندی کی انگوٹھی بنوائی گئی جس پر تین سطروں میں محمد رسول اللہ کے تینوں الفاظ کندہ تھے۔ یہی انگوٹھی بحکم جبرئیلؑ استعمال ہوتی رہی۔ خطوط پر مہر اسی سے لگائی جاتی تھی۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ابوبکر صدیقؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد اس کو استعمال کیا، اُنکے بعد عمر فاروقؓ اسی کو پہنتے اور استعمال کرتے رہے، حضرت عثمان غنیؓ جب خلیفہ ہوئے تو لکھا ہے کہ چھ سال تک اپنے ایام خلافت میں اسی انگوٹھی کو استعمال کرتے رہے، ایک دن اسی آریس نامی کنویں کے من پر بیٹھے ہوئے تھے کہ انگلی سے نکل کر انگوٹھی کنویں میں گر گئی، اس واقعہ کو بہت اہمیت دی گئی، کنویں کا پانی نکلوایا گیا، ڈھونڈنے والوں نے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، لیکن انگوٹھی نہ مل سکی۔ ابن اثیر کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ اغتم لہ غماشدیدا حضرت عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو اس انگوٹھی کے گم ہو جانے کا بہت زیادہ غم ہوا، انھوں نے بڑے بڑے انعامات کا بھی اعلان کیا، لیکن کھوئی ہوئی انگوٹھی نہ ملی، مجبور ہو کر اسی کے نمونے پر دوسری انگوٹھی بنوائی، جسے پہنے رہتے تھے، جس دن شہید ہوئے پتہ نہ چلا کہ اسے کون لے بھاگا۔ واللہ اعلم

اس وقت ان کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی تھی، اسی کی طرف اشارہ فرما رہے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے زمانہ میں پیش آنے والے واقعات کی طرف ایماء کرتے ہوئے ان کی زبان سے جو یہ الفاظ نکلے، یعنی :—

قامت الساعۃ (استیعاب ص ۱۹۲ ج ۱) الساعۃ (گھڑی) قائم ہوگئی۔

اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے، کہ کسی خاص دور کے اختتام کی تعبیر بھی، عہدِ صحابہ میں قامت الساعۃ سے کی جاتی تھی، اگر یہ واقعہ ہے تو اس سے بعض حدیثوں بلکہ بعض خاص قرآنی آیتوں کے سمجھنے میں بڑی سہولت پیدا ہوسکتی ہے۔

بہرحال جتنی دیر میں یہ فقرے ختم ہوئے ہوں، اتنے وقت تک مرنے والے میں زندگی کے آثار کا مشاہدہ دیکھنے والوں کو ہوتا رہا۔ فقرے ختم ہوئے، اور جس حال میں پہلے تھے، پھر اسی حال کی طرف واپس ہوگئے۔

عہدِ صحابہؓ کے بعد ایک دوسرا واقعہ تابعین کے زمانہ میں کچھ اسی نوعیت کا پیش آیا، اس کا تذکرہ بھی ہمارے یہاں کی معتبر کتابوں میں کیا گیا ہے، میں اس وقت ابنِ سعد کے طبقات سے اس واقعہ کو نقل کر رہا ہوں۔

مشہور تابعی حضرت ربعی بن حراش کے بھائی کا یہ قصہ ہے جن کا نام ربیع تھا، خود ربعی تو بڑے جلیل القدر صحابیوں کے شاگرد تھے، جابیہ نامی مقام میں حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے جو تاریخی خطبہ دیا تھا، اس میں ربعی شریک تھے، حضرت حذیفہ صحابی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) انکے بہنوئی تھے، ربعی کی بہن ان کے نکاح میں تھیں۔

ابن سعد نے دو مستقل سندوں کے ساتھ اس قصے کو بیان کیا ہے، جس سند میں ابو عوانہ مشہور محدث صاحبِ کتاب ہیں، ہم اسی سند کی روایت کا خلاصہ درج کرتے ہیں، خود ربعی سے براہِ راست یہ سنا گیا کہتے تھے :— میرے بھائی ربیع بیمار ہوئے، مرض ان کا شدید تھا، جس کی وجہ سے وہ صاحبِ فراش ہوگئے،

اسی عرصہ میں اپنی ایک ضرورت سے مجھے باہر جانا پڑا، واپسی پر لوگوں نے بتلایا کہ ابھی میرے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔

اس خبر کے سننے کے ساتھ بے ساختہ زبان پر "انا للہ وانا الیہ راجعون" جاری ہوا، اور لپکا ہوا، میں اپنے بھائی کے پاس پہونچا، دیکھا چادر ان کو اُڑھا دی گئی ہے، اور پشت پر لٹا دیئے گئے ہیں، الغرض مرنے والوں کے ساتھ جو طرزِ عمل اختیار کیا جاتا ہے، ان کے ساتھ بھی دستور کے مطابق وہی سب کچھ کر دیا گیا تھا، میں نے فوراً خوشبو جو مُردوں کو استعمال کی جاتی ہے، اس کے منگوانے کا اور کفن کے مہیا کرنے کا حکم دیا، اسی حال میں ہم بیٹھے تھے، دوسری روایت میں ہے کہ ان کے لئے ہم دُعا کر رہے تھے اور استغفار پڑھ رہے تھے، کہ اچانک دیکھتا ہوں کہ چادر چہرے سے ان کے اُلٹ گئی، اُن کا چہرہ بالکل تندرستوں کا چہرہ معلوم ہوتا تھا، حالانکہ طویل اور شدید علالت کے وہ شکار تھے، چادر اُلٹنے کے ساتھ ہی پہلا فقرہ ان کی زبان پر جو جاری ہوا، وہ "السلام علیکم" کا تھا، بے ساختہ میری زبان سے بھی "وعلیک ورحمۃ اللہ" کے الفاظ نکلے، اس کے بعد میں کہنے لگا:۔

"سبحان اللہ! بھائی مرنے کے بعد؟"

مطلب ان کا یہ تھا کہ مرنے کے بعد تم بول رہے ہو، آخر یہ کیا ہے، جواب میں وہی کہتے ہیں کہ میں نے سنا ربیع کہہ رہے تھے:۔

"تم لوگوں سے الگ ہونے کے بعد میری مُلاقات اپنے رب سے ہوئی، جو مجھ سے رَوح اور ریحان کے ساتھ ملا، میرا رب قطعاً غصّہ والا نہ تھا"

جو ان کے عربی الفاظ "انی لقیت ربی بعدکم فلقانی بروح وریحان ورب غیر غضبان" کا ترجمہ ہے، روح وریحان جیسا کہ معلوم ہے، قرآن کے اصطلاحی الفاظ ہیں۔ مقربین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد "روح وریحان" کو وہ پاتے ہیں۔ ان غیبی حقائق کی تشریح اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کی جا سکتی کہ راحت و سکون، آسودگی و طمانیت کی ضمانت ان کے اندر ہو گی۔

ربعی کہتے ہیں، کہ مذکورۂ بالا الفاظ کے بعد میرے ان ہی مرے ہوئے بھائی نے یہ بھی کہا، کہ:۔

کسانی اثوابا خضرا من سندس واستبرق۔	میرے رب نے مجھے سبز جوڑے پہنائے، جو سندس اور استبرق کے تھے۔

اسی کے ساتھ یہ خبر بھی انھوں نے دی، کہ:۔

وجدت الامر ایسر مما فی انفسکم۔	تم لوگوں کے جی میں جو باتیں ہیں، ان سے معاملہ کو بہت زیادہ آسان میں نے پایا۔

واللہ اعلم، اس کا کیا مطلب ہے، بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ دہشت اور خوف، ڈر اور ہراس کی جو کیفیت موت کے متعلق زندہ انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ اسی کا ازالہ کرتے ہوئے اطمینان دلاتے ہیں کہ عام خیالات کے برخلاف وہاں کا معاملہ چنداں دشوار نہیں ہے، آگے اس کی نصیحت کرتے ہوئے کہ پھر بھی چاہئے کہ لوگ فریب اور دھوکہ میں نہ رہیں، لاتغتروا (دھوکہ میں نہ پڑجانا) کا لفظ بھی انکی زبان سے نکلا، جس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ جس سے جتنا بن پڑے مرنے کے بعد کے حالات کو درست کرنے کی تیاریوں میں مشغول رہے۔ آخر میں یہ کہتے ہوئے، کہ:۔

"میں نے اپنے رب سے اجازت لی تھی کہ تم لوگوں کو بشارت سنادوں۔"

مرنے والے صاحب ربیع نے کہا، کہ:۔

فاحملونی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانہ وعدنی ان لا یسبقنی حتی ادرکہ۔	مجھے اٹھا کر رسول اللہؐ کے پاس لے چلو، کیونکہ رسول اللہؐ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہی کہ اسوقت تک مجھے چھوڑکر آگے نہ نکل جائینگے جبتک کہ میں انکو پا نہ لوں۔

ربعی کہتے ہیں کہ بس ان الفاظ کے بعد میں نے دیکھا کہ جیسے کنکری پانی میں پھینکی جائے، اور پانی میں وہ بیٹھ جاتی ہے، اسی طرح میرے بھائی پر موت طاری ہوگئی، یعنی جیسے مرے ہوئے تھے، اسی طرح مرے ہوئے دکھائی دینے لگے۔

کون جانتا ہے کہ بے شمار مرنے والوں میں سے کبھی کبھی اس قسم کے آثار کا مشاہدہ قدرت کی طرف سے جو کرایا جاتا ہے اس کا مقصد کیا ہوتا ہے، سننے والوں میں دو ہی قسم کے آدمی ہوسکتے ہیں، ایک وہ جو

گپ اور خرافات ٹھہرا کر زندگی کے اپنے مشاغل میں غرق ہو جاتے ہیں، اور زیادہ تر اسی قسم کے نفوس کی کثرت ہے، لیکن "علی کل شئی قدیر" جن کے ایمان کا جزو ہے، وہ اس سے بھی عجیب تر باتوں کو سنتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ اطلاقی اقتدار میں سب ہی طرح کی باتوں کی گنجائش ہے، کسی نہ کسی شکل میں واقعہ پیش آیا، جن کا یہ تاثر ہو، ان کے لئے یہ سوچنے کی بات ہے کہ ربیع جن کی بے جان لاش سامنے تھی، ان ہی کا یہ کہنا کہ مجھے استبرق اور سندس کے جوڑے پہنائے گئے، ظاہر ہے کہ یہ لباس اس جسم کو تو پہنایا نہیں گیا جس پر چادر پڑی ہوئی تھی، پھر جوڑے جس جسم کو پہنائے گئے اس جسم کی نوعیت چادر کے نیچے والے جسم سے چاہئے تو یہی کہ الگ ہو۔

ان کے بیان کے اور فقروں کا مطلب تو ظاہر ہے، البتہ یہ کہنا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وعدہ فرمایا ہے کہ جب تک میں نہ آلوں، آپ مجھے پیچھے چھوڑ کر آگے نہ چلے جائینگے، یعنی:۔ "لا یسبقنی حتی ادرکہ" کا جو مطلب ہے، اس سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے، شاید سوختہ سامانوں کے لئے نوید روح پرور ہے، پتہ چلتا ہے کہ مرنے والا جن کے دین پر مرتا ہے، مرنے کے ساتھ ہی ان کے قدموں تک پہونچنے کا موقع اس کو دیا جاتا ہے، گویا بخاری وغیرہ والی مشہور روایت کہ مرنے والوں سے دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی پوچھا جاتا ہے، کہ "ما تقول فی ھذا الرجل" (تم اس شخص کے متعلق کیا کہتے ہو) جیسا کہ معلوم ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی سے اس سوال کا تعلق ہے، مومن آپ کو پہچان لے گا، اگر غور کیا جائے تو ربیع کے بیان سے اس حدیث کے سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

بیداری کی حالت میں دیکھنے والوں نے مرنے کے بعد جن آثار کا مشاہدہ کیا ہے، یہ تو اس کی دُو تاریخی مثالیں تھیں، واقعہ یہ ہے کہ ایسی صورتیں شاذونادر ہی پیش آتی ہیں، قصہ کہانی کی کتابوں کو چھوڑ کر قابلِ اعتبار کتابوں میں یہی دُو واقعے مجھے ایسے ملے ہیں، جن میں دیکھنے والوں نے بحالتِ بیداری ان آثار کو دیکھا، باقی خواب میں تو مرنے والوں سے زندوں کا ایسا تعلق جسکی توجیہ خیالی قوت کے

کرشموں سے ہم نہیں کرسکتے، اس باب میں تو واقعات کا کافی ذخیرہ معتبر کتابی وثیقوں میں پایا جاتا ہے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، مثالاً اس کو اسی مشہور واقعہ سے سمجھ سکتے ہیں ۔

دو صحابی یعنی حضرت صعب بن جثامہؓ اور عوف بن مالکؓ میں غیر معمولی گہری دوستی تھی، مواخاۃ اور بھائی چارہ کا رشتہ دونوں میں زندگی بھر قائم رہا، حضرت صعبؓ نے ایک دن اپنے دوست عوف بن مالکؓ سے کہا، کہ بھائی! دیکھو! ہم دونوں میں پہلے جو مر جائے وہ وعدہ کرے کہ خواب میں آکر وہ ملاقات کرے گا، عوف نے کہا، کہ کیا یہ ہو سکتا ہے۔ بولے، کیوں نہیں؟۔ اتفاق یہ پیش آیا کہ حضرت صعبؓ کا عوفؓ سے پہلے انتقال ہوگیا، واقعی چند دنوں کے بعد عوفؓ خواب میں دیکھتے ہیں کہ حضرت صعبؓ ان کے سامنے ہیں، عوفؓ نے پوچھا، کہ واقعی تم میرے بھائی صعبؓ ہو؟ بولے ہاں وہی ہوں، عوفؓ نے دریافت کیا، کہو! تم پر کیا گذری، صعبؓ نے کہا کہ کچھ آزمائشوں کے بعد میری مغفرت ہو گئی، عوفؓ کہتے ہیں کہ اتنے میں میری نظر اُن کی گردن پر پڑی جس پر ایک سیاہ دھبہ تھا، میں نے پوچھا یہ کیا ہے، کہنے لگے، کہ :۔

"بھائی! یہ دس اشرفیاں ہیں، فلاں یہودی سے ان کو میں نے بطور قرض لیا تھا (اور واپس کئے بغیر مر گیا)"

صعبؓ نے اسی کے بعد یہ بھی عوفؓ سے کہا، کہ :۔

"قرض کی لی ہوئی یہ اشرفیاں اس وقت تک ایک سینگھ میں میرے گھر میں رکھی ہوئی ہیں، کاش! یہودی تک ان اشرفیوں کو تم پہونچا دیتے"

صعبؓ نے اسی کے ساتھ یہ اطلاع بھی دی، کہ :۔

"مرنے کے بعد میرے گھر میں جتنے حادثے اب تک پیش آئے ہیں، انکی خبریں مجھے پہونچا دی گئی ہیں، حتّٰی کہ ایک بلّی میرے گھر میں تھی، چند دن ہوئے وہ مر گئی، مجھے اس کی بھی اطلاع ہے"

گذشتہ ہی کی نہیں، بلکہ مستقبل میں پیش آنے والے ایک حادثہ کا بھی عوفؓ سے صعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے

تذکرہ کیا، فرمایا، کہ:۔

"میری ایک بچی ہے، چھ دن بعد اُس کا بھی انتقال ہو جائے گا، چاہئے کہ
لوگ اُس بچی کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں"

عوفؓ کہتے ہیں کہ خواب سے بیدار ہو کر اٹھا، صبح ہوئی، تب اپنے دوست صعبؓ کے گھر پہونچا، اندر اپنے آنے کی اطلاع دی، صعبؓ کی بیوی نے شکایت کی، کہ صعبؓ کے انتقال کے بعد آج آپ آئے ہیں، دوستوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا جاتا ہے!۔ میں نے کچھ حیلے حوالوں سے جیسا کہ دستور ہے کام لیا، پھر جو خواب دیکھا تھا، اُس سے گھر والوں کو مطلع کیا۔ سینگ جس میں اشرفیاں تھیں، خواب میں اس کی جگہ بھی بتا دی گئی تھی، عورتوں سے اجازت لیکر حضرت عوفؓ وہاں تک پہونچے، واقعی جیسا کہ ان سے کہا گیا تھا، دیکھا کہ سینگ میں دس اشرفیاں بھری ہوئی ہیں، گھر والوں سے اجازت لی، کہ یہودی کو ان کے پہونچانے کا حکم دیا گیا ہے۔ بھلا ایسے سچّے خواب کے بعد کون انکار کر سکتا تھا، حضرت عوفؓ ان اشرفیوں کو لیکر باہر نکلے، یہودی سے دریافت کیا کہ صعبؓ پر تمہارا کچھ باقی ہے۔ یہودی نے کہا، کہ ہاں! کچھ تھا تو، لیکن وہ بڑے نیک آدمی تھے، میں نے اُن کو بخش دیا۔ میں نے کہا، کہ لو! تمہاری اشرفیاں بجنسہ سینگ میں رکھی ہوئی تھیں، خواب میں صعبؓ نے مجھے اطلاع دی، اور تم تک پہونچانے کو کہا۔ یہودی دیکھ کر دنگ ہو گیا، بولا، کہ بجنسہ وہی ہیں۔ بعض روائتوں میں ہے کہ اس واقعہ کے بعد وہ مسلمان ہو گیا، اور بولا، کہ:۔

"محمد رسول اللہ ﷺ کے صحابیؓ کیسے لوگ ہیں، مرنے کے بعد بھی اپنا قرض
ادا کرتے ہیں، حالانکہ ان کے اور میرے سوا اس قرض سے کوئی واقف نہ تھا،
کیونکہ لینے کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا"

بہرحال حضرت عوفؓ نے پھر صعبؓ کے گھر والوں سے پوچھا، کہ تمہارے ہاں کوئی حادثہ پیش آیا، مختلف پیش آنے والے واقعات کا لوگ ذکر کرتے رہے، آخر خود حضرت عوفؓ نے کہا، کہ کوئی بلّی بھی تمھارے ہاں مری ہے، لوگوں نے تصدیق کی۔ پھر حضرت صعبؓ کی بچی کو انھوں نے بلایا، دیکھا کہ اس کو بخار ہے، گھر والوں سے کہدیا کہ اسکی خبر گیری میں غفلت سے کام نہ لیجیو، صعبؓ نے خاص طور پر اس بچی کے متعلق مجھ سے کہا ہے، کہ

اچھا سلوک اس کے ساتھ کیا جائے۔ کہتے ہیں کہ چھ دنوں کے بعد بچی بھی مر گئی۔

سیر صحابہ کی مختلف کتابوں میں اس واقعہ کا ذکر پایا جاتا ہے۔ مشہور ناقد محدث علامہ ابن قیمؒ نے اپنی تصنیف "کتاب الروح" میں بھی اس کو نقل کیا ہے۔

واقعات جو بیان کئے گئے ہیں، اگر وہ صحیح ہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ خواب عوفؓ کا صرف خیالی خواب تھا، اشرفیوں کا بحالتِ بیداری پانا، بلّی کے مرنے کے واقعہ کی توثیق، اور بچی کی موت، کیا ان امور کی توجیہ خیالی مخزونات کے نظریہ سے ہو سکتی ہے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہ جانے والوں کے ساتھ مرنے والوں کی روح تعلق پیدا کر سکتی ہے، اس سلسلہ میں بعض عجیب و غریب واقعات کتابوں میں ملتے ہیں، انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ ان کا تذکرہ کیا جائے گا۔

ایک سو چالیس برس پہلے

ایک مردِ حق آگاہ کی مجلس میں

(نسیم احمد فریدی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نماز عصر کے لئے مسجد میں تشریف لائے ہوئے تھے، بعد ادائے نماز ملا گل محمد غزنوی نے کسی شخص سے کلام کیا، حضرتؒ نے بہت ڈانٹا اور فرمایا، کہ:—

"بارگاہِ حق تعالیٰ میں بے ادب نہیں ہونا چاہئے، یہاں پر غیر حق کی جانب ہرگز متوجہ نہ ہونا چاہئے، دیکھو بادشاہ ظاہری کے سامنے کس قدر آداب ملحوظ رکھے جاتے ہیں، پس بادشاہِ حقیقی کے روبرو بدرجۂ اولیٰ انکسار و تواضع ہونا چاہئے— اپنے کو عدم محض اور نیست کرکے "دربار" پر آیا کرو۔"

فرمایا— "میاں ابوسعیدؒ نے اپنے احوالِ باطن میں ایک رسالہ تحریر کیا ہے، میں نے اُس کو شروع سے آخر تک دیکھا ہے، مکتوباتِ امام ربانیؒ کے مطابق ہے۔"

فرمایا، کہ— "مولانا خالد رومی[1] سے بھی میں نے کہدیا ہے کہ وہ اپنے احوالِ باطن کو تحریر کریں، انشاء اللہ تعالیٰ وہ بھی اپنے حالات تحریر کرکے بھیجیں گے۔"

---

[1] آپ کے متعلق حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقی مجددی مدظلہٗ تحریر فرماتے ہیں:— (بقیہ صفحہ ۲۶ پر)

مولانا رؤف احمد رافت رامپوریؒ اس مقام پر لکھتے ہیں، کہ :۔

"مولانا خالدؒ افضل خلفاء حضرت والا ہیں، بغداد میں ہدایت و رہنمائی میں مصروف اور مرجع خلائق ہیں، اُن کا ایک عریضہ حضرت والا کی خدمت میں آیا تھا، اُس میں لکھا تھا کہ سو عالم متبحر صاحبِ تصانیف اس فقیر کے حلقہ میں آکر قابلِ اجازت ہو گئے ہیں، اور پانچ سو اکابر علماء داخلِ سلسلہ ہوئے ہیں، اور اُن عوام و خواص کی تعداد جو بیعت ہو چکے ہیں حدِ شمار سے باہر ہے"

ایک شخص مکۂ معظمہ سے حضرت کا نام سُن کر خانقاہ میں آیا، اور اُس نے بیان کیا، کہ :۔

"میں نے بیت اللہ شریف میں بغداد کے ایک قافلے کے لوگوں کی زبانی سنا کہ ایک عالم متبحر مولانا خالد نے ہندوستان پہونچ کر حضرت شاہ غلام علی سے طریقۂ نقشبندیہ اخذ کیا ہے، اور خرقۂ خلافت زیبِ تن کرکے آیا ہے، وہ اقلیم روم میں بڑی شہرت رکھتا ہے، وہاں کے علماء و اکابر اُس کے ہاتھ پر بیعت ہوئے ہیں، مینے جب یہ سُنا تو میں

---

۲۵ کا بقیہ حاشیہ

"آپ (حضرت شاہ غلام علی دہلوی قدس سرہٗ) ہی کے ایک خلیفہ حضرت مولانا خالد کُردیؒ تھے، جن کے مناقب میں علامہ شامیؒ نے جن کی شرح درمختار مرآج مفتیان مذہبِ حنفی کی بنیاد ہے، ایک مستقل رسالہ تالیف فرمایا جس کا نام :۔

سل الحسام الهندى لنصرة مولانا خالد النقشبندى ہے، یہ رسالہ مصر میں چھپ چکا ہے۔

علامہ شامیؒ نے رسالۂ مذکورہ میں حضرت مولانا خالدؒ کے علمی و عملی کمالات خوب تفصیل سے بیان فرمائے، اور ۱۲۲۴ھ میں اُن کا براہِ ایران پورے ایک سال سفر کے بعد دہلی پہونچنا، اور حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونا اور ان کے دریائے فیض سے سیراب ہوکر قطب ارشاد بن کر اپنے وطن واپس ہونا، اور وہاں مرجع خواص و عوام ہونا مفصل ذکر کیا ہے" الخ

۱۲۴۲ھ میں مولانا خالد کردی نقشبندیؒ کا انتقال ہوا۔

(الفرقان مجدد الف ثانی نمبر)

حضرت والا کی ملاقات کا مشتاق ہوا، آخر الامر بفضلِ خدا اس آستانِ فیض نشان پر پہونچ گیا ہوں۔"

کچھ عرصہ بعد ایک مغربی حضرت کا اسم مبارک سنکر قطع منازل کر کے مولنا خالد رومیؒ سے ملاقات کرتا ہوا حاضرِ دربار ہوا، اُس نے بیان کیا، کہ:۔

"ایک لاکھ آدمیوں کے قریب اُن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو چکے ہیں، اور ایک ہزار متبحر علماء داخلِ طریقہ ہوئے ہیں۔"

حضرت والا نے یہ سنکر فرمایا:۔

"اس خوشخبری کے سننے سے میرا دل پر پشہ کی برابر بھی خوش نہیں ہوا، فخر و مباہات کا تو ذکر ہی کیا ہے۔"

فرمایا:۔ "جس کا یقین زیادہ ہے، اُس کا مقام اونچا ہے۔"

درسِ کلام مجید فرما رہے تھے، اور اُس کے معانی کی تحقیق میں مشغول تھے، ایک شخص نے عرض کیا، کہ آپ کی تحقیق مولنا شاہ عبد العزیزؒ سے بھی زیادہ ہے۔ فرمایا:۔

"توبہ، توبہ! وہ تو بحرِ علم اور دریائے بیان ہیں۔"

فرمایا ـــــ "ایک روز مولوی شاہ رفیع الدین ایک کتاب پڑھ رہے تھے، میں بھی اُس مجلس میں حاضر تھا، ناگاہ انوار و برکات کا ظہور ہوا ـــ میں نے کہا کیا سبب ہے اِن دو سطروں کے پڑھنے سے بہت فیض وارد ہوا ـــ مولوی صاحب نے فرمایا کہ یہ دو سطریں حضرت عبد الاحد رحمۃ اللہ علیہ کی نوشتہ ہیں۔"

اسی سلسلے میں یہ بھی فرمایا، کہ:۔

"دوسرے دن بھی ایسا ہی اتفاق ہوا، میں نے کہا آج فیض بنوعِ دگر آشکارا ہوا ہے مولوی صاحب نے فرمایا کہ یہ سطور (جو میں نے پڑھیں) حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے

قلم کی لکھی ہوئی ہیں "

فرمایا ــــــ " حضرت مرزا جانِ جاں شہیدؒ فرماتے تھے :- تیس۳۰ سال اپنے ان تین۳ مرشدوں کی خدمت کی ہے ۔

۱۔ حضرت سید نور محمد بدایونیؒ

۲۔ حضرت حافظ سعداللہؒ

۳۔ حضرت شیخ محمد عابدؒ

حضرت شیخ محمد عابدؒ کے وصال کے بعد سے تیس۳۰ سال ہوگئے ہیں کہ اشغال و اذکار اور حلقہ و مراقبہ میں مشغول ہوں اور لوگوں کو بیعت کرتا ہوں، اب جبکہ ساٹھ سال گذرے ہیں تب فنائے قلبی بتمامہ میسر ہوئی ہے، اور یہ بات پیدا ہوئی ہے کہ اپنے آپ کو مُردہ تصوّر کرتا ہوں، اپنی ہستی و خودی کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا ہے، لوگ آتے ہیں مجھے سلام کرتے ہیں، یا دوسروں کا پیغام سُناتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ میں مُردہ ہوں، یہ میری قبر پر آکر سلام کررہے ہیں اور پیام پہونچا رہے ہیں، جب دوبارہ مجھ سے کہتے ہیں تو میں غور کرتا ہوں، کہ شاید میں زندہ ہوں "

فرمایا ــــــ کہ :-

" تبدیلیِ اخلاق رذیلہ " اور " رفعِ انانیت " کے لئے کلمۂ طیبہ کی تکرار اور ذکر کی کثرت ہونی چاہئے ــ جس وقت انوارِ الٰہی غالب آئینگے، پچھلے اخلاق و اوصاف میں شکستگی آئے گی "

فرمایا ــــــ کہ :-

" حضرت مجدد صاحبؒ اور اُنکے تابعین کے احوال ظاہر میں شریعت سے آراستہ اور

باطن میں طریقت سے پیراستہ ہیں، اُن کا قول ہے کہ جو معارف بال برابر بھی شریعت کے مخالف ہوں وہ ایک جَو کے عوض بھی نہیں خریدے جا سکتے۔"

فرمایا ——— کہ:—

"حدیث کے پڑھنے سے عجیب فیوض و برکات ظاہر ہوتے ہیں، افسوس کہ لوگوں نے اِس برکت کے دیکھنے سے اپنی آنکھوں کو بند کر رکھا ہے۔ کل چند احادیث مناقب صحابہؓ میں پڑھی گئیں، میں نے مشاہدہ کیا کہ جسم کو غسل سے زیادہ طہارت اور دل کو تصفیہ سے زیادہ لطافت حاصل ہوئی۔"

مرتبِ ملفوظات فرماتے ہیں، کہ میں ایک دن حلقہ میں حاضر ہوا، اتفاقاً درمیانِ حلقہ جگہ باقی نہیں رہی تھی، فقراء کے پسِ پشت بیٹھ گیا، حضرتؒ نے یہ شعر زبانِ مُبارک سے پڑھا:—

فریضہ است ترا آمدن بدرگہ دوست
اگر دروں ندہد بار آستاں دریاب

حضرتؒ کو عُرس حضرت مودود چشتیؒ میں ایک فقیر نے طلب کیا، تو فرمایا ——— کہ:—

"میں مجلسِ سماع اور محفلِ وجد و تواجد میں ہرگز نہیں جاتا، اگرچہ کسی بڑے سے بڑے بزرگ کا عُرس کیوں نہ ہو۔"

بعدازاں فرمایا ——— کہ:—

"خداوندا مجھ سے کون سی خطا سرزد ہوئی، کہ صبح ہی صبح مجلسِ بدعت میں مجھکو طلب کیا گیا۔"

فرمایا ——— کہ:—

"عنایاتِ الٰہی جو نالائق کے حق میں صادر ہوتی ہیں، میں اُن کا کس منہ سے شکر ادا کروں۔ لوگ طلبِ حق میں بغداد، سمرقند، بخارا، تاشقند سے اس جگہ آتے ہیں اور نسبتِ نقشبندیہ مجددیہ

مستفیض ہوتے ہیں، ہر شخص اپنی استعداد کے موافق فیض حاصل کرتا ہے، میری کیا حیثیت ہے، یہ تمام عنایاتِ حضرت ایزد رحمٰن ہیں جو بواسطۂ توجہات مرزا جانِ جاناںؒ مجھ کمترین کے شاملِ حال ہیں "

فرمایا ——— کہ :—

" چاروں طرف سے لوگ یہاں آتے ہیں اور اقامت پذیر ہوتے ہیں، قریب ایک سو چالیس اشخاص وہ ہیں جو خانقاہ میں مستقل طور پر رہتے ہیں، طالبین کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے، بااین ہمہ میرے دل میں کوئی خطرہ نہیں گذرتا کہ انکے کھانے کے لئے روٹی اور پہننے کے لئے کپڑا درکار ہے (کہاں سے انتظام ہوگا) الحمدللہ میرا دل "خطراتِ این و آں" سے پاک و صاف ہے "

فرمایا ——— کہ :—

" حضرت خواجۂ بزرگ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام نے رواج پایا "

فرمایا ——— کہ :—

" بزرگانِ نقشبندیہ میں متعدد نسبتیں ظہور پذیر ہوئی ہیں، لیکن اصل نسبت حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ کی ہے "

بعدازاں ایک لطیفہ ارشاد فرمایا ——— کہ :—

" حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ نے دیگ طعام پکائی، اُس میں بہت سا نمک حضرت مخدوم اعظمؒ نے ڈالا، نسبت نے تیزی پکڑی، پھر سُرخ مرچیں حضرت میر ابوالعلیؒ نے ڈالیں، اُس سے نسبت تیز تر ہوگئی، پھر حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اُس میں دہی ڈال دیا، اُس سے عجیب کیفیت ہوگئی "

مکتوبات کا درس دے رہے تھے اُس میں کسی موقع پر دُنیا اور اہلِ دُنیا کی مذمت ارقام فرمائی ہے کہ جو شخص دنیا میں پھنسا ہوا ہے اُس کو بروزِ جزا سوائے حسرت و ندامت کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا، اُس پر فرمایا ——— کہ :-

"دُنیا نام ہے حاجتِ اصلیہ سے زیادہ طلب کرنے کا"

نیز فرمایا ——— کہ :-

"جو چیز دل کو حق تعالیٰ سے غافل کر دے، وہی دُنیا ہے" اور یہ شعر پڑھے۔ ؎

چیست دُنیا و لباسِ دُنیوی   از خدا غافل شدن اے مولوی

چیست دُنیا از خدا غافل شدن   نے لباس و نقرۂ و فرزند و زن

جامع ترمذی کا درس دے رہے تھے، یہ حدیث پڑھی گئی :-

فضل عائشۃ علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام۔   یعنی حضرت عائشہؓ کی فضیلت تمام عورتوں پر ایسی ہے جیسی تمام کھانوں میں ثرید کی فضیلت۔

اس پر ارشاد فرمایا ——— کہ :-

"اس حدیث سے تمام عورتوں پر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی فضیلت ثابت ہوئی"

پھر فرمایا ——— کہ :-

"اُن کو علم، اجتہاد، فقاہت، ترک و تجرید، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا محبوب ہونے کے باعث تمام عورتوں پر فضیلت ہے"

فرمایا ——— کہ :-

"حضرت عائشہؓ کے ترک و تجرید کے بارے میں وارد ہے، کہ ایک دن اُنکے پاس ہزار ہا درہم و دینار آئے، سب کو ایک ہی مجلس میں صدقہ کر دیا، ایک کوڑی اپنے پاس نہ رکھی"

فرمایا:—

"حضرت فاطمہؓ کو جو فضیلت ہے وہ جگر گوشۂ رسولؐ ہونے کی حیثیت سے ہے، حضرت مریمؑ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں ہونے کی وجہ سے فضیلت ہے، حضرت آسیہ کو جو فضیلت ہے وہ ایک تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کے باعث ہے، دوسرا اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے فرعون کے ہاتھ سے انتہائی شدائد اپنے اوپر جھیلیں، اور فرعون کے ظلمت کدہ میں جہاں ہر طرف کفر وضلالت کی آندھی چل رہی تھی، اپنے چراغِ ایمان کو بجھنے نہیں دیا"

فرمایا:—

"شیخ سعدی شیرازیؒ "انوارِ ولایتِ سہروردیہ" اپنے اندر رکھتے ہیں اور بہت ذکی ہیں، اِن دو شعروں میں تمام سلوک کو بیان فرما دیا ہے":— ؎

مرا پیر دانائے فرخ شہاب — دو اَمر ز فرمود بر روئے آب

یکے آنکہ بر خویش خود بیں مباش — دگر آنکہ بر غیر بد بیں مباش

یعنی مجھ کو میرے مُرشد حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے ساحلِ آب پر یہ دو نصیحتیں فرمائیں

۱- خود بینی نہ کرنا کہ اپنے آپ کو اچھا سمجھنے لگو۔

۲- بدبینی نہ کرنا کہ دوسروں کے عیب تلاش کرو اور اُن کو بُرا سمجھو۔

فرمایا:—

"جو شخص ہم سے تعلق رکھتا ہے اُس کو چاہئے کہ ہمارا سا لباس اور ہمارا سا طور وطریقہ اختیار کرے"

حضرتؒ درسِ حدیث دے رہے تھے کہ چشتیہ سلسلے کے ایک بزرگ ملاقات کیلئے تشریف لائے
اُس وقت فرمایا:۔

"ہم متوسلان نقشبندیہ" بادہ نوشانِ جامِ مودت" ہیں، ہماری "گزک" درود اور حدیث ہی، جو قلب کو گوناگوں ذوق بخشتی ہے، اور نگارِ حقیقی کے چہرے سے نقاب کشائی کرتی ہے" بعدازاں ایک آہِ سرد کھینچی اور فرمایا:۔

واشوق المدینہ ـــــ واشوق المدینہ ـــــ واحسرۃ المدینہ

حضرت حسن بصریؒ کا ذکر آیا تو فرمایا۔ ـــــ کہ:۔

"موالی میں سے تھے، لیکن ایک بڑی فضیلت رکھتے ہیں وہ یہ کہ ایام رضاعت میں ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے پستانِ مبارک کو اُنکے منہ میں دیا خدا کی قدرت کہ دودھ اُترا، اور اُنھوں نے نوش فرمایا"

فرمایا:۔

"اُن کی عادت تھی کہ ہر روز چالیس ہزار مرتبہ سبحان اللہ پڑھتے تھے"

ضمناً یہ بھی فرمایا ـــــ کہ:۔

"علماء وصوفیا دونوں کو افضلیت تسبیح و تہلیل میں اختلاف ہے، متاخرین نے تہلیل کو افضل قرار دیا ہے"

فرمایا ـــــ کہ:۔

"اکثر طرق و سلاسل حضرت حسن بصریؒ تک منتہیٰ ہوتے ہیں، وہ درحقیقت کبرا و صلحا کے پیشوا ہیں"

۱۱ر رجب المرجب کو فرمایا:۔

"آج کا دن حضرت شاہ ناصر الدین قادریؒ کے وصال کا دن ہے، ان کا مزار

محلہ حبش پورہ (دہلی) میں واقع ہے، یہ میرے والد کے مرشد تھے، اس دن کی شب گذشتہ میں اس سرائے فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھارے تھے، میں بھی اُسی دن اپنے وطن (پنجاب) سے دہلی آیا تھا، جب دہلی پہونچا تو میرے والد بہت خوش ہوئے کہ وہ مجھے اپنے مرشد سے بیعت کرائیں گے۔"

ایک شخص حاضر ہوا، اُس نے کلماتِ شوقیہ ادا کرنے شروع کئے، حضرتؒ نے یہ دو شعر پڑھے :۔ ؎

مُرغانِ چمن بہر صباحے خوانند ترا با صطلاحے

ندانم آں گُلِ خنداں چہ رنگ بُو دارد کہ مُرغِ ہر چمنے گفتگوئے اُو دارد

اسی مجلس میں یہ شعر بھی پڑھا :۔

یکبار بگو یدم نظیری مشہور شوم بہ بے نظیری

پھر فرمایا ——— کہ :۔

"اس شعر کا اصل مضمون حافظ شیرازیؒ کے اس شعر میں پایا جاتا ہے" :۔ ؎

نامِ من رفتست روزے برلب جاناں زسہو

اہلِ دل را بوئے جاں می آید از نامم ہنوز

فرمایا :۔

"حافظ شیرازیؒ کے بعض مضامین موافق حدیث ہیں" ثبوت میں یہ شعر پڑھا :۔ ؎

ساقیا عشرت امروز بفردا مفگن یا ز دیوان قضا خط امانے بمن آر

(اس میں اس حدیث کا مضمون ہے)

اذا أمسیتَ فلا تنتظر صباحك واذا اصبحتَ فلا تنتظر مساك ۔ جب تو شام کرے تو صبح کا انتظار نہ کر، اور جب صبح کرے تو شام کا منتظر نہ رہ (نہ جانے کب موت آجائے)

پھر فرمایا:۔
"آج کے کام کو کل کے حوالے نہ کیا کرو، فرصت کو غنیمت شمار کرو۔"

فرمایا:۔
"اکثر اولیاء کو اپنے تصرفات کا خود پتہ نہیں ہوتا۔"

فرمایا ــــــ کہ:۔
"میرے احباب میں سے جو صبر و توکل اور قناعت و تقویٰ کا راستہ چلتا ہو اور "حضور و جمعیت" اور "انوار و کیفیات" قلب میں رکھتا ہے، میری جانب سے اُس کو اجازت ہے کہ طالبوں کو بیعت کرے، اور جس کے صبر و توکل وغیرہ میں نقصان ہے اُسے دوسروں کو مُرید کرنا خطا ہے، گو وہ میرے اجازت یافتگان میں سے ہو، لیکن حقیقۃً وہ مجھ سے مجاز نہیں ہے۔"

فرمایا:۔
"کلمۂ طیبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ آیاتِ قرآنی میں سے ایک آیت ہے، اور محمد رسول اللہ بھی کلامِ ربّانی سے ایک کلمہ ہے، پس کلمہ کو اس لحاظ سے کہ یہ آیت کلامِ باری ہے پڑھا جائے تو فیض بنوعِ دگر آئے گا، اور اگر اس لحاظ سے پڑھا جائے کہ یہ ایسا کلمہ ہے جس کے پڑھنے سے آدمی مسلمان ہوتا ہے، اور ہم اپنے پیغمبرؐ کی طرف سے مامور ہیں کہ زبان سے یہ کلمہ ادا کریں اور دل میں اسکی تصدیق کریں تو فیض باندازِ دگر حاصل ہوگا۔"

نیز فرمایا ــــــ کہ:۔
"بلحاظ معنیٔ اوّل کلمہ پڑھنا جنبی کو حرام ہے۔"

فرمایا ــــــ کہ:۔
"طالب کو چاہئے کہ ایک لمحہ بھی مطلوب کی یاد سے غافل نہ ہو۔" پھر یہ شعر پڑھا:۔

ایں شربتِ عاشقی است خسروؔ بے خونِ جگر چشید نتواں

فرمایا:۔

”حنفی مسلک والے کو ضروری ہے کہ موطائے امام محمدؒ اپنے پاس رکھے، اُس کتاب میں یہ عجیب کام کیا ہے کہ اخبار صریح و آثار صحیح اپنے مذہب کی تائید میں لائے گئے ہیں“۔

بعدازاں فرمایا۔۔۔۔۔ کہ:۔

”فقہ کے چاروں مسلکوں میں چار خاصے ہیں، جو ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں“۔

۱۔ خاصۂ مذہب حنفی کتاب ”ہدایہ“ ہے کہ دوسرے فقہا کے یہاں اس کے پایہ کی کوئی کتاب نہیں۔

۲۔ مذہب امام شافعیؒ میں امام غزالیؒ زبردست محقق ہوئے ہیں۔

۳۔ مذہب حنبلیؒ میں حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ سرآمدِ مقربانِ بارگاہِ الٰہی ہیں۔

۴۔ مذہب مالکیؒ میں خود امام مالکؒ کا وجود آیۃ من آیات اللہ ہے۔

ایک روز طالبین کو توجہ دینے میں مشغول ہوئے، ایک شخص سے فرمایا کہ وہ اہلِ حلقہ کو پنکھا کرے اور ارشاد فرمایا۔۔۔۔۔ کہ:۔

”حضرت مرزا جانِ جاناں شہیدؒ فرمایا کرتے تھے، کہ:۔ ”میں کشفاً دیکھتا ہوں کہ جو کوئی اہلِ حلقہ کو پنکھا کرتا ہے ہر ایک کے فیضِ توجہ میں شریک ہو جاتا ہے، اسلئے کہ اُس سے ہر ایک کو راحت پہونچتی ہے“۔۔۔۔۔ اور حضرت شہیدؒ یہ بھی فرمایا کرتے تھے، کہ: ”ایک دن میں اپنے مُرشد سید السادات حضرت سید نور محمدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، دیکھا کہ حضرت والا بہت خوش خوش بیٹھے ہیں، اس کا سبب دریافت کیا تو حضرت اقدسؒ نے فرمایا، کہ

آج میں نے فقرا کو بہت سے پنکھے تقسیم کئے ہیں، اس عمل کی قبولیت کی وجہ سے درگاہِ الٰہی سے فیوض و برکات بارش کی طرح برس رہے ہیں۔"

تکرار بیعت کا ذکر ہوا تو فرمایا:—

"طالب کو متعدد شیوخ سے بیعت کرنا جائز ہے، چنانچہ بعد از وفاتِ سرکارِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت صدیق اکبرؓ سے بیعت کی گئی، اور اُن کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ سے — ظاہر ہے کہ صحابہؓ کا خلفائے راشدینؓ سے بیعت ہونا انتظامِ امور [illegible] کے [illegible] دُنیا کے لئے، اس سے معلوم ہوا کہ تکرار بیعت [illegible] ہے" [illegible]

"تصوّف کیا ہے؟"

اُردو میں تصوف سے متعلق کئی اچھی اچھی چیزیں ہمارے اس زمانہ میں شائع ہوچکی ہیں، لیکن ہمارا خیال ہے، کہ یہ تازہ طبع کتاب اپنے اختصار کے ساتھ انصاف و تحقیق اور مباحث کے سلجھاؤ کے لحاظ سے بہت ممتاز سمجھی جائیگی، اور انشاءاللہ ان تمام حق پسند حضرات کے لئے اطمینان کا باعث ہوگی جو تصوف کے بارہ میں بھی انصاف سے غور کرنا چاہتے ہیں، اور جن کو اس کے نام سے خواہ مخواہ کی ضد اور چڑ نہیں ہے ——— [illegible]

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر "الفرقان"، مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی - مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مندرجۂ ذیل آٹھ مقالے ہیں۔ گویا ان تینوں حضرات کی مشترک تصنیف ہے —

۱ — تصوّف پر ابتدائی غور اور تجربہ۔
۲ — تصوّف اور اُس کے اعمال و اشغال کے متعلق میرے چند یقین۔
۳ — تصوّف اور اُس کے اعمال و اشغال کے متعلق بعض شبہات۔
۴ — تصوّف کے متعلق بعض شکوک و شبہات کا جواب۔
۵ — یقین اور اُس کے ثمرات۔
۶ — تصوّف اور شیخین (یعنی تصوّف کے بارہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور شیخ ابن القیمؒ کی تصریحات)۔
۷ — اہلِ تصوّف اور دینی جدوجہد — ۸ — طالبانِ سلوک کو ابتدائی مشورے۔

(۱۵۰ صفحات - کتابت طباعت دیدہ زیب - کاغذ اعلیٰ قیمت ۱۲/)

تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ

(از مولینا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۵)

اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک حج کے سلسلہ سے مکہ معظمہ میں موجود ہیں۔ ایک دن کعبہ کے اندر حاضری کا قصد کیا، وہاں حضرت عمر فاروقؓ کے پوتے حضرت سالمؒ کو جلوہ افروز پایا، خلیفہ نے عرض کیا کہ حضرت مجھ کو خدمت کا موقع دیا جائے اور کچھ حکم دیا جائے جس کی تعمیل کا شرف حاصل کروں حضرت سالمؒ نے ارشاد فرمایا کہ

"اللہ کے گھر میں اللہ کے سوا اور کسی سے مانگنا شرم کی بات ہے۔"

جب دونوں حضرات کعبہ سے باہر نکلے تو خلیفہ نے پھر عرض کیا کہ اب تو کعبہ سے باہر ہیں اب کچھ طلب فرمائیں حضرت نے فرمایا کہ میں آپ سے کیا مانگوں؟ دنیا یا دین؟ ہشام نے کہا کہ دنیا، ارشاد ہوا

"دنیا تو میں نے اس کے مالک حقیقی سے بھی کبھی طلب نہیں کی پھر آپ (جو اس کے مالک نہیں ہیں) کیسے مانگوں؟"

(۶)

بنی امیہ کی طرف سے ابن ہبیرہ کے سپرد عراق کا انتظام و انصرام ہے، ابن ہبیرہ نے ایک مرتبہ شیر بیشۂ استقامت، پیکرِ علم و معرفت، مجسمۂ زہد و تقویٰ امام ابوحنیفہؒ سے عرض کیا کہ آپ کبھی قدم رنجہ فرماتے تو مجھ پر احسان ہوتا، فرمایا میں تم سے مل کر کیا کروں گا؟ مہربانی سے

پیش آؤ گے تو خوف ہے کہ تمہارے دام میں آجاؤں، عتاب کروگے تو میری ذلت ہے، تمہارے پاس جو زر و مال ہے مجھ کو اس کی حاجت نہیں، میرے پاس جو دولت ہے اس کو کوئی شخص چھین نہیں سکتا۔

ابن ہبیرہ نے بعض اکابر علماء کو اپنے نظام حکومت میں شامل کر رکھا تھا۔ دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ امام ابوحنیفہ بھی عہدہ قضا یا خزانہ کا افسر اعلیٰ ہونا قبول فرمالیں، مگر امام اعظم کا کمال احتیاط اور غایت ورع اس خدمت سے مانع تھا، صاف انکار فرما دیا، ابن ہبیرہ نے قسم کھا کر کہا کہ جبراً منظور کرنا ہوگا امام کے ہم صحبت بزرگوں نے اس خدمت کی منظوری کے لئے بہت کچھ کہا مگر امام نے جواب میں ارشاد فرمایا:-

"اگر ابن ہبیرہ کہے کہ مسجد کے دروازے گن دوں تو یہ بھی مجھ کو گوارا نہیں، نہ کہ وہ کسی مسلمان کے قتل کا فرمان لکھے اور میں اس پر مہر کر دوں؟"

ابن ہبیرہ کا حکم ہوا کہ امام کو ایک سو دس کوڑے مارے جائیں حکم کی تعمیل ہوئی مگر امام کی استقامت میں کوئی فرق نہیں آیا اور ابن ہبیرہ کو اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی۔

عہد بنی عباس میں بھی یہی قضا کا عہدہ امام کے کمال تقویٰ کے لئے آزمائش کا سبب بنا تھا خلیفہ منصور عباسی نے قضا کا عہدہ پیش کیا، امام نے انکار فرمایا منصور نے قسم کھائی کہ ہم ضرور قاضی بنائیں گے امام اعظم نے بھی قسم کھائی کہ میں اس منصب کو ہرگز قبول نہ کروں گا۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ حضرت آپ غور نہیں فرماتے کہ امیر المومنین قسم کھا رہے ہیں، ارشاد فرمایا امیر المومنین کفارہ ادا کرنے پر مجھ سے زیادہ قادر ہیں، اسی وقت امام کو زندان خانہ بھیج دیا گیا اور اسی سلسلہ میں امام کا انتقال ہوا۔ اِنّا للّٰہ وانا الیہ راجعون

اللہ اللہ یہ وہی عظیم المرتبت امام ہیں جن کے حق میں ابراہیم بصری کا بیان ہے کہ ایک دفعہ نماز میں یہ آیت پڑھی گئی

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ یعنی خدا کو ظالموں کے اعمال سے بے خبر نہ سمجھو

امام اعظم پر یہ آیت سن کر ایسی حالت طاری ہوئی کہ پورا بدن کانپنے لگا، زائدہ کا بیان ہے کہ رات کے نوافل میں ایک دن آیت وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُوْمِ پر پہونچے تو بار بار اس آیت کو پڑھتے تھے یہاں تک کہ صبح ہوگئی

صحیح کہا سہل بن مزاحم نے کہ امام ابوحنیفہ کے لئے دنیا متوجہ کی گئی مگر انھوں نے توجہ نہ کی، دنیا

کے قبول کرنے کیلئے ان کے کوڑے لگائے گئے مگر انھوں نے قبول نہ کیا۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ابتلاء و آزمائش کو امام احمد بن حنبلؒ یاد فرماتے اور رویا کرتے تھے۔

(۷)

دوسری صدی ہجری کا وسطی زمانہ ہے ابو جعفر منصور عباسی خلیفہ حج کے لئے مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں ایک رات کو طواف کے وقت دیکھا کہ ایک شخص ملتزم کے پاس کھڑا دعا مانگ رہا ہے کہ

الٰہی میں تجھ سے فریاد کرتا ہوں عالم کے فتنہ و فساد کی اور ظلم و طمع کی جس سے حقداروں کی حق تلفی ہو رہی ہے،

طواف سے فراغت کے بعد ابو جعفر نے اس شخص سے دریافت کیا کہ تم کیا دعا مانگ رہے تھے؟ کون ظلم کرتا ہے؟ کون فساد کرتا ہے؟ اس شخص نے کہا کہ جناب والا آپ ہی ہیں، آپ ہی نے ظلم و فساد برپا کر رکھا ہے، آپ ہی کی حرص و طمع نے سب کو تباہ کر رکھا ہے کسی حقدار کو اس کا حق نہیں پہونچتا ہے!

خلیفہ نے کہا تم کیا کہتے ہو خزانہ میرے قبضہ میں ہے، عیش و عشرت کا سامان میرے لئے مہیا ہے، مجھ کو ظلم و طمع سے کیا واسطہ؟ اس شخص نے کہا

امیر المومنین آپ سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا خدا نے مسلمانوں کی خدمت و حفاظت آپکے سپرد کی، مگر آپ عیش میں مبتلا ہیں، مسلمانوں کا مال چھین چھین کر جمع کر رہے ہیں۔ دروازہ پر پہرہ دار مقرر ہیں غریب و مظلوم آپ تک پہنچ نہیں سکتے، آپ یہ رنگ دیکھ کر وزراء اور مصاحبین نے وہ آفت مچا رکھی ہے رشوت اور ظلم کا بازار گرم ہے اے امیر المومنین آپ کا تعلق خاندان نبوت سے ہے پھر بھی آپ مسلمانوں پر ظلم روا رکھتے ہیں؟ بیت المال کا خزانہ اپنے لئے جمع کرتے ہیں؟ خدا کے سامنے آپ کیا جواب دیں گے؟

منصور پر گریہ طاری تھا کہنے لگا آخر میں کیا کروں؟ جواب ملا کہ علماء و صلحاء امت سے کام لیجئے! خلیفہ نے کہا کہ وہ لوگ تو مجھ سے دور رہنا چاہتے ہیں، اس مرد مسلمان نے کہا کہ وہ لوگ آپ سے اس لئے دور رہتے ہیں کہ مبادا کہیں آپ ان کو بھی اپنے ظلم میں شریک نہ کرلیں، آپ یہ خطرہ دور کردیں سب اہل دین آپکے شریک ہوجائیں گے۔

(۸)

سلطان عالمگیر نے نواب مکرم خاں سے دریافت کیا کہ آپ کی عمر کیا ہے؟ نواب نے عرض کیا کہ م

م چار سال اسلطان نے تعجب کیا اور کہا کہ آپ اپنی عمر چار سال کیسے کہتے ہیں تو آپنے کہا کہ حضور اصل میں میری

(مدیر الفرقان کی ایک تقریر جو ۲۲ ذیقعدہ مطابق ۱۵ اگست جمعہ کے دن مالیگاؤں ضلع ناسک (صوبہ بمبئی) میں بعد نماز جمعہ وہاں کی بڑی مسجد (نورانی) میں کی گئی تھی —— بمبئی سے واپس ہوتے ہوئے وہاں دو دن قیام ہوا تھا۔ اس کے بعد شنبہ کی صبح کو ایک خصوصی اجتماع میں اور پھر شب کو ایک اجتماع عام میں جو تقریریں ہوئی تھیں اگر وہاں کے ان احباب نے وہ مرتب کر کے بھیج دیں جنھوں نے تقریر نوٹ کرنے کا اہتمام کیا تھا تو انشاء اللہ آئندہ اشاعتوں میں ہم ان کو بھی ہدیۂ ناظرین کر سکیں گے)

(بعد خطبہ)

حضرات! میں اس وقت بمبئی سے آرہا ہوں، میرا یہ سفر حج کو جانے والے بعض حضرات کو رخصت کرنے کے لئے اور حجاج میں تبلیغی کام کے سلسلے میں ہوا تھا۔ حاجیوں کا آخری جہاز (اسلامی) کل ہی روانہ ہوا ہے۔ بہت سے حاجیوں کے دوست احباب اور اعزہ ان کو رخصت کرنے کے لئے کسی طرح جہاز پر پہنچ گئے تھے۔ میں بھی ان ہی میں تھا۔ جب جہاز چھوٹنے کا وقت قریب آیا تو یہ سب اتر آئے میں بھی اتر آیا اس آخری وقت میں انھوں نے جس طرح حجاج کو رخصت کیا اور حجاج نے اپنے ان دوستوں اور عزیزوں کو جس طرح خدا حافظ کہا وہ منظر میری آنکھوں میں بالکل تازہ ہے کل ہی کی تو بات ہے۔ اس منظر سے میرا ذہن ایک خاص حقیقت کی طرف منتقل ہوا ہے اور اس وقت میں آپ کے سامنے اسی کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے ایک فرضی مثال عرض کرتا ہوں۔ فرض کیجئے اللہ کا کوئی خاص بندہ ہے اس نے کچھ

لوگوں پر بہت احسانات کئے ہیں، عمر بھر ان کی خدمتیں کی ہیں اور اسی کی تعلیم و تربیت سے وہ آدمی بنے ہیں اور یہ لوگ بھی اسکی محبت کا بڑا دم بھرتے ہیں اور اس کے ساتھ خلوص اور وفاداری کا بڑا دعویٰ کرتے ہیں۔ ایک وقت آیا کہ اللہ نے اپنے اس بندہ کے لئے سفر حج کا سامان کردیا اور اس نے حج کا ارادہ کرلیا، اور فرض کیجئے کہ جس طرح ہمارے بہت سے تبلیغی احباب دو دو تین تین برس کی نیت سے حجاز جاتے ہیں تاکہ اس مقدس سرزمین میں اور نہایت اعلیٰ صلاحیتیں اور اونچی نسبتیں رکھنے والے وہاں کے باشندوں میں دینی جد و جہد کے رواج کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کریں تو اسی طرح فرض کیجئے کہ اللہ کے اس بندہ کا ارادہ بھی زیادہ مدت تک مدینہ طیبہ قیام کرنے کا ہے تو چلتے وقت اس نے اپنے ان دوستوں کو جمع کیا جن پر اس نے عمر بھر احسانات کئے تھے اور جو اسی کی تعلیم و تربیت اور محنت سے آدمی بنے تھے اور جو اس کی محبت اور وفاداری کا بڑا دعویٰ بھی رکھتے تھے اور ان سب کو اس نے کچھ وصیتیں کیں اور اس سلسلہ میں ایک خاص وصیت یہ بھی کی کہ میرے پیچھے میرے گھر بار کی فکر رکھنا اور میرے چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کا بھی تم ہی انتظام کرنا اور ان کی ہر طرح کی نگرانی اور دیکھ بھال رکھنا۔ الغرض ان کی جو فکریں میں اٹھاتا اور ان کی تعلیم و تربیت کے لئے جو کچھ میں کرتا، میری واپسی تک وہ سب کچھ تم کرنا ــــ ان لوگوں نے اس کا پورا پورا اقرار کیا اور ذمہ داری لی اور اللہ کو گواہ بنا کر اطمینان دلایا کہ ہم یہ سب کچھ کریں گے اور جو کچھ ہم سے ہوسکے گا اس میں کوئی کمی اور کوتاہی نہیں کریں گے ــــ پس اپنے ان دوستوں سے یہ عہد و اقرار لے کر اللہ کا وہ بندہ روانہ ہوگیا ــــ لیکن بعد میں اس کے ان دوستوں نے اپنے اس محسن اور مربی کی وصیت کو بھلا دیا اور اپنے عہد و اقرار کو نہیں نباہا، چند روز تک تو یہ اس کے گھر والوں کی کچھ خبر لیتے رہے اور کبھی کبھی جا کے حال پوچھتے رہے مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد بالکل بے پروا ہوگئے بلکہ اس کے گھر کی طرف سے نکلنا بھی چھوڑ دیا۔ چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت اور اخلاقی نگرانی کے سلسلہ میں بھی انھوں نے کچھ نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچے بری صحبتوں میں پڑ کے آوارہ ہوگئے ان میں بری سے بری عادتیں آگئیں۔ انھیں شراب پینے اور سینما دیکھنے کی لت پڑ گئی۔ اور گھر کی چیزیں بیچ بیچ کے وہ شراب

اور سینما کا شوق پورا کرنے لگے پھر وہ چور اور جواری بھی ہو گئے اور آخر ایک دن ان حرکتوں کی بدولت جیل میں پہونچ گئے۔ پھر ان بچوں کی ماں یعنی حج کو جانے والے اس اللہ کے بندہ کی بیوی فرض کیجئے بیمار پڑی اور ان دوستوں نے اس کی بھی کوئی خبر نہیں لی اور نہ کسی اور نے دوا دارو کی کوئی فکر کی یہاں تک کہ وہ بیچاری اس دنیا سے رخصت ہو گئی، اور پھر جب گھر بالکل خالی ہو گیا تو چوروں اُٹھائی گیروں نے گھر کا سب سامان حتیٰ کہ دروازوں کے کواڑ اور چھتوں کے کڑی تختے بھی نکال لئے اور پھر برسات نے آکر کھڑی ہوئی دیواریں بھی گرا دیں اور اس طرح اس بندۂ خدا کا بنا بنایا گھر بالکل برباد ہو گیا —— تو ذرا تصور کیجئے کہ جب کسی ذریعہ سے مدینہ طیبہ میں اس کو اپنے ان دوستوں کی اس غفلت شعاری اور بے وفائی کی اور اس کے نتیجہ میں بچوں کے آوارہ ہو کر جیل میں پہنچ جانے کی اور بیوی کے کس مپرسی کی حالت میں مرنے اور پھر گھر کے اُجڑنے اور دیواروں تک کے گر جانے کی اس کو خبر ملے گی تو اس کو کتنا صدمہ ہو گا اور زبانی محبت کا دعویٰ کرنے والے اپنے ان بے وفا دوستوں کی طرف سے اس کے دل کی خوشی یا ناخوشی کا کیا حال ہو گا؟

حضرات! یہ کوئی واقعہ نہیں ہے بلکہ فرضی اور بالکل فرضی مثال ہے لیکن اس میں ہمارے اور آپ کے لئے بڑا سبق ہے۔

ذرا غور کیجئے! اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین بنا کر بھیجا یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اب قیامت تک کے لئے اور ساری دنیا کے لئے آپ ہی نبی ہیں اور آپ کے بعد دنیا کے کسی حصہ میں کسی وقت بھی کوئی نبی نہیں بھیجا جائے گا اور اس کی وجہ سے یعنی ختم نبوت کے اس منصب کی وجہ سے قیامت تک کے سارے انسانوں کی اور ساری دنیا کے آدمیوں کی ہدایت کی فکر اور کوشش کی ذمہ داری حضور پر آ گئی کیونکہ جو نبی جس قوم کی طرف بھیجا جائے اس کے ذمہ ہے کہ وہ اس قوم تک اللہ کا پیغام پہنچانے کی اور اس کی ہدایت کی جو کوشش اور فکر کر سکتا ہو وہ کرے، پھر اس بڑی اور وسیع ذمہ داری کی ادائیگی کی صورت

اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے یہ مقرر ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مقصد کے لئے اپنی اُمّت سے کام لیں اور آپ کی امت قیامت تک اس کام کو آپ کی نیابت میں کرتی رہے اور گویا آپ ہی کی طرف سے اس خدمت کو انجام دیتی رہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی طریقہ اختیار فرمایا۔ جب تک آپ اس دنیا میں رہے اپنے پورے امکان بھر اللہ کی مخلوق کی ہدایت کی فکر اور کوشش کرتے رہے اور جو لوگ آپ کی بات مان کر آپ کی امت میں شامل ہوتے رہے اُن سے بھی آپ دعوت و ہدایت کا یہ کام لیتے رہے اور اللہ کے وہ سب بندے پوری وفاداری اور جانبازی کے ساتھ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ نبوت سے تقریباً ۲۲-۲۳ سال بعد دنیا سے حضورؐ کے رخصت ہونے کا وقت آگیا۔ اس وقت آپ نے اپنی والی یہ ساری فکر اور کوشش کلی طور پر اُمت کے سپرد کردی اور اُس وقت امت کا جو طبقہ موجود تھا اُس نے صرف قول سے نہیں بلکہ اپنے حال اور عمل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے طور پر مطمئن کر دیا کہ ہم اسی طرح آپ کی والی اس فکر اور کوشش کا حق ادا کرتے رہیں گے اور اس خدمت کو آپ کی طرف سے برابر انجام دیتے رہیں گے اور اس طرح آپ کا کام نیابتہً ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کام کو امت کے سپرد کر کے رخصت ہوگئے اور پھر ایسا ہی ہوا کہ ایک عرصہ تک یہ کام بالکل اُسی انداز میں ہوتا رہا اور امت کے ذریعہ حضورؐ کی بعثت کا مقصد جاری ہوتا رہا۔

لیکن کچھ مدت کے بعد شیطان حضورؐ کی امت کو اس کام سے غافل کر دینے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر نہ امت میں اس کام کی فکر رہی اور نہ اس کے لئے وہ جد وجہد رہی جس پر حضور اس امت کو لگا کر گئے تھے۔ بلکہ کچھ اور زمانہ گذرنے کے بعد تو امت اس کو بھی بھول گئی کہ حضور کے دعوت و ہدایت کے اس کام کو جاری رکھنا اُس کے ذمہ ہے اور حضور اپنا یہ کام قیامت تک کے لئے اس کے سپرد کر گئے ہیں اور اس مقصد کے لئے اس کو اپنا نائب بنا کر گئے ہیں ۔۔۔ امت کی اس غفلت اور کوتاہی کے دو نتیجے ہوئے ایک یہ کہ دوسری قوموں کو دعوت دینے اور اللہ کے دین کی طرف بلانے کا جو کام جاری تھا وہ بند ہوگیا اور اس کی وجہ سے اسلام میں قوموں کے نئے داخلہ کا

سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ سوچنے کی بات ہے کہ ہماری اس غفلت و تقصیر کی وجہ سے کروروں بلکہ اربوں انسان یعنی حضرت آدم کے فرزند اس مدت میں ایسے مر چکے ہیں جن کو دوزخ سے بچانے کی اور ایمان کے راستہ سے جنت میں پہنچانے کی کوئی فکر اور کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے اور دوسرا نتیجہ امت کی اس غفلت اور کوتاہی کا یہ ہوا ہے کہ بہت بڑی تعداد خود امت محمدیہ میں ایسی پیدا ہو گئی ہے جو پشتوں سے مسلمان ہونے کے باوجود اسلامی تعلیم و تربیت سے بالکل محروم ہے اور اس کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے مسلمان ہونے کا کیا مطلب ہے۔ ان میں سے بہت سوں کے عقیدے کافرانہ اور مشرکانہ ہیں اور عام زندگی کافروں اور مشرکوں سے کچھ بھی ممتاز نہیں ہے۔ پھر ان میں چور بھی ہیں، ڈاکو بھی ہیں، شرابی اور جواری بھی ہیں بلکہ بہت سے علاقوں کا حال یہ ہے کہ وہاں کے مسلمان کہلانے والے بداخلاقیوں اور بداطواریوں میں اسلام کے منکروں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ آج کتنی برائیاں ہیں جن میں مسلمان کہلانے والوں کا حصہ دوسروں سے زیادہ ہے۔ سینما جو اس زمانہ کا "ام الخبائث" ہے واقف لوگ بیان کرتے ہیں کہ اس کے دیکھنے والوں میں سب سے زیادہ حصہ مسلمانوں کا ہے۔ کئی برس پہلے کا ایک واقعہ ہے جو مجھے ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ میں مرادآباد سے دہلی جا رہا تھا، انٹر کلاس کے جس ڈبہ میں میں تھا، اس میں دو ہندو صاحبان اور بھی تھے اور ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سینما کے کاروبار سے خاص تعلق رکھتے ہیں بلکہ اُن میں سے ایک صاحب کسی سینما کے غالباً مالک تھے اور وہ شاید میرٹھ کے تھے۔ جب ٹرین امروہہ کے اسٹیشن سے گزری تو اُن میں سے ایک نے دوسرے صاحب سے کہا کہ یہاں امروہہ میں فلاں صاحب سینما قائم کر رہے ہیں اور اس پر اتنی لاگت لگا رہے ہیں۔ آپ کا کیا اندازہ ہے کامیاب ہو سکے گا یا نہیں؟ جن سے سوال کیا گیا تھا یہ وہی صاحب تھے جو کسی جگہ کے سینما کے مالک تھے۔ انھوں نے سوال کرنے والے سے پوچھا کہ یہاں کتنی آبادی ہے؟ انھوں نے بتلایا کہ اتنی آبادی ہے (مجھے اب ٹھیک یاد نہیں کہ انھوں نے کتنی آبادی بتلائی تھی۔ غالباً ساٹھ ستر ہزار یا اس سے کچھ زیادہ بتلائی تھی) انھوں نے کہا کامیاب ہونا مشکل ہے۔ پھر انہی صاحب نے سوال کرنے والے صاحب سے پوچھا کہ محمڈنس آبادی کتنی ہے یعنی مسلمان کتنے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ وہی لوگ زیادہ ہیں پھر پوچھا کہ ان میں روزمرہ کی محنت مزدوری

اور دستکاری کرنے والے کتنے ہوں گے؟ اس نے جواب دیا کہ ایسے ہی لوگ بہت زیادہ ہیں۔ سب کچھ معلوم کرکے اس نے کہا کہ پھر کامیاب ہو جائے گا ــــــ حضرات یہ بات دس برس سے زیادہ کی ہے لیکن میرے دل میں ہرے زخم کی طرح تازہ ہے۔

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ دعوت وہدایت اور دینی تعلیم وتربیت کا اپنا والا جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک کے لئے امت کے سپرد کیا تھا جب امت نے اس کو چھوڑ دیا تو اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ دین میں قوموں کی نئی آمد اور نئے داخلہ کا سلسلہ ہی بند ہوگیا اور دوسری اس سے بھی زیادہ افسوسناک خرابی یہ پیدا ہوئی کہ خود امت کا بہت بڑا حصہ دین سے اس قدر بیگانہ ہوگیا کہ وہ ایمانیات تک سے بے خبر ہے اور اعمال اور اخلاق میں وہ اسلام سے اتنا ہی دور ہے جتنے کہ غیرمسلم لوگ بلکہ بعض برائیوں میں اس کا حصہ غیرمسلموں سے بھی زیادہ ہے۔ اگر ہمارے اور آپ کے دلوں میں امت کا اور دین کا کچھ بھی درد ہو تو اس صورت حال پر ہمارے دلوں کو رونا چاہیے ؎

یا قلبُ بعد الیوم لما لم تذب وجدًا علیہ فانت من جلمود

آپ حضرات نے سنا ہوگا کہ امت اپنے پیغمبر کی روحانی اولاد ہوتی ہے۔ اسی رشتہ سے قرآن پاک میں حضورؐ کی ازواج مطہرات کو مسلمانوں کی مائیں کہا گیا ہے ارشاد ہے:۔

وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ (یعنی حضور کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں)

اور ایک حدیث میں ہے حضورؐ نے ارشاد فرمایا:۔

انا منکم بمنزلۃ الوالد من ولدہ یعنی میں تمہارے لئے ایسا ہی ہوں جیسا کہ اپنی اولاد کیلئے باپ ہوتا ہے تو ذرا سوچئے کہ امت جو حضورؐ کی روحانی اولاد ہے جب اس کے اس قدر بگڑ جانے کی اطلاع حضورؐ کو فرشتوں کے ذریعہ ہوتی ہوگی جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے تو حضورؐ کے قلب مبارک پر کیا گزرتی ہوگی اور آپ کو کتنا دکھ اور صدمہ ہوتا ہوگا اور جو لوگ اس حالت کو دیکھتے ہوئے بھی کوئی فکر نہیں کرتے اور اس کو بدلنے اور درست کرنے کے لئے جو کوششیں اس وقت بھی کی جا سکتی ہیں

؎ (ترجمہ) اے دل اگر آج کے ان حالات کی وجہ سے اور اس دینی زوال کے غم سے تو پگھل نہ جائے تو تو پتھر کا ہے ۱۲

وہ بھی نہیں کرتے تو حضورؐ کے قلب مبارک کو ان کی طرف سے کیسی شکایت ہو گی۔

حضرات! میں اس وقت آپ سے اور اپنے نفس سے بھی بس یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ہم ذرا سوچیں کہ حضورؐ کی فکر اور حضورؐ کے کام کو چھوڑ کے ہم نے حضور کے ساتھ کتنی بڑی بے وفائی کی ہے اور آئندہ کے لئے اپنے رویہ کو بدلیں، حضورؐ کی فکر کو اپنی فکر بنائیں اور دین کی دعوت وخدمت اور اس کے لئے جد وجہد کی جو ذمہ داری حضورؐ نے امت پر ڈالی ہے اس کی اہمیت کو محسوس کریں اور ہم میں سے ہر ایک اپنی زندگی کا پروگرام ایسا بنائے جس میں اپنی ذات کی اور اپنی اولاد کی اور گھر بار کی فکر کے ساتھ حضورؐ کے اس کام کی بھی فکر ہو اور اپنے اپنے ذاتی کاموں کی کوشش کے ساتھ دین کی جد وجہد میں بھی ہم میں سے سب کا کچھ حصہ ہو۔

یہ دینی دعوت اور دینی تحریک جس کو عام طور سے لوگ تبلیغی تحریک اور تبلیغی جماعت کی تحریک کہتے ہیں اس کا اصل مقصد اور اس کا اصلی پیام بس اتنا ہی ہے کہ حضورؐ والی فکر اور حضورؐ والے کام اور حضورؐ والی جد وجہد کو ہم اپنی فکر اور اپنا کام اور اپنی جد وجہد بنائیں اور خود ایمانی زندگی حاصل کرنے کے لئے اور امت میں ایمان اور ایمانی زندگی کو عام کرنے کے لئے نئے سرے سے ایک عام اور ہمہ گیر کوشش ہو۔ اگر یہ جد وجہد اس وسیع پیمانہ پر ہونے لگے جیسا کہ اس کا حق ہے تو انشاءاللہ فضا بالکل بدل جائے گی اور جب ہمارے معاشرہ میں ایمان اور عمل صالح کی فضا قائم ہو جائے گی اور حضور کی لائی ہوئی ایمانی زندگی کسی درجہ میں ہماری قومی زندگی بن جائے گی تو دوسری قوموں کے لئے بھی اسلام قبول کرنے کا راستہ کھل جائے گا اور وہ عملی زندگی میں اسلام کی خوبیوں اور اس کی برکتوں کو آنکھوں سے دیکھ کر پاسکیں گے۔

اس جد وجہد کے لئے ہمارے سامنے ایک طریقہ اور پروگرام ہے جس سے آپ بھی نہ کچھ ضرور واقف ہوں گے کیونکہ اللہ کے فضل سے یہ کام آپ کے یہاں کچھ عرصہ سے ہو رہا ہے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہفتہ وار اجتماع بھی ہوتا ہے اور ہر ہفتہ ایک نہ ایک جماعت کہیں کا سفر بھی کرتی ہے۔ اور کبھی کبھی بڑے بڑے سفر بھی کئے جاتے ہیں اور باہر کی جماعتیں بھی میں نے سنا ہے کہ بار بار

یہاں آئی ہیں اس لئے آپ ہمارے طریقہ کار اور پروگرام سے کچھ نہ کچھ ضرور واقف ہوں گے، پھر بھی میں اتنا عرض کرتا ہوں کہ ہمارے اس کام میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اس کی عام دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کا پروگرام اس طرح بنائیں کہ ہر سال میں ایک دفعہ کم از کم ایک چلہ یا ایک مہینہ کا اور ہر مہینہ میں کم از کم تین دن کا وقت اپنے دوسرے کاموں سے اس دینی جد وجہد کے لئے اور حضور والے اس کام کے لئے فارغ کریں اور جماعت کی شکل میں کہیں جائیں اور ان دنوں کو اس طرح گزاریں کہ اللہ کے ساتھ اور دین کے ساتھ خود اُن کے اپنے تعلق میں بھی ترقی ہو اور اللہ کے دوسرے بندوں میں بھی ایمانی زندگی کے لئے جد وجہد ہو اور اُن کو بھی اس جد وجہد پر کھڑا کرنے کی دعوت اور کوشش ہو۔ اس وقت زبانی بس میں اتنا کہہ سکتا ہوں اس سے آگے کی تفصیلات آپ کی سمجھ میں اچھی طرح اس وقت آسکیں گی جب آپ اس طرح کے دو چار سفر جماعتوں کے ساتھ کریں گے۔ اس سفر اور نقل وحرکت کے علاوہ اس کے سلسلہ کی کچھ اور چیزیں بھی ہیں جن کی طرف ہم خصوصیت سے دعوت دیتے ہیں اور وہ ہر حال میں اور ہر جگہ کرنے کی ہیں بلکہ ان کی دعوت ہم مردوں کے علاوہ اپنی بہنوں عورتوں کو بھی دیتے ہیں۔

ان میں پہلی چیز یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اس کی عادت ڈالے کہ کلمہ طیبہ کے ذریعہ وہ بار بار اپنے ایمان کو تازہ کیا کرے یعنی ہماری یہ عادت اور مستقل حالت ہو جائے کہ ہم اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہوئے بھی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دھیان فکر کے ساتھ اور کلمہ کی عظمت کے احساس کے ساتھ کلمہ شریف پڑھ پڑھ کے بار بار اُس عہد واقرار کو تازہ کیا کریں جو اس کلمہ کی روح ہے اور جب تک اس کی عادت نہ پڑے اُس وقت تک اپنا معمول مقرر کرلیں کہ ایک بار صبح کے وقت اور اسی طرح ایک بار شام کو کم از کم دس دس دفعہ خوب دھیان اور فکر کے ساتھ اور دل کی بیداری کے ساتھ کلمہ شریف پڑھا کریں اور اُس کے ذریعہ اپنے ایمانی عہد کو تازہ کیا کریں۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ نماز جہاں تک ہوسکے بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ اور پوری پابندی اور پورے اہتمام کے ساتھ پڑھی جائے۔ نماز بڑی چیز ہے اور اُس میں آدمی کی زندگی کو ایمانی

زندگی بنانے کی اور گندگیوں سے اس کو پاک کرنے کی بڑی تاثیر ہے۔ آج ہماری نمازیں جو بے اثر ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کو جس طرح پڑھنا چاہئے ہم اس طرح پڑھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ میں اس تنگ وقت میں تفصیل سے نہیں بتا سکتا کہ نماز خشوع وخضوع کے ساتھ کس طرح پڑھی جاتی ہے اور اس کی کیا تدبیر ہے۔ آپ کے یہاں اللہ کے جو ایسے بندے ہوں جن کے متعلق آپ کا اندازہ ہو کہ ان کی نمازیں خشوع وخضوع والی نمازیں ہوتی ہیں۔ آپ اُن سے پوچھئے یا کتابوں سے رہنمائی حاصل کیجئے۔ الحمد للہ اس سلسلہ میں اچھی اچھی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ان کو پڑھ کر اپنی نمازوں کو انشاء اللہ اچھی نماز بنایا جا سکتا ہے خود اس عاجز کا بھی ایک رسالہ "نماز کی حقیقت" کے نام سے ہے وہ بھی اس مقصد کے لئے انشاء اللہ مفید ہو سکتا ہے۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ نماز کے علاوہ اللہ کے ذکر کی عادت ڈالی جائے اور اللہ کی یاد سے اُنس پیدا کیا جائے۔ ذکر اللہ کا سب سے اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ ذکر زندگی میں بس جائے اور ہر حال میں اس حال کے مناسب اللہ کی یاد ہو لیکن یہ بات سیکھنے سے اور بڑی مشق سے حاصل ہوتی ہے، اور کم سے کم درجہ یہ ہے کہ صبح شام کچھ ذکر کا معمول مقرر کر لیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے ذکر کے جو کلمات تعلیم فرمائے ہیں۔ ان میں کلمہ تمجید بڑا جامع کلمہ ہے اور اس کی بڑی فضیلت ہے یعنی "سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر" تو سو دفعہ صبح (فجر سے پہلے یا فجر کے بعد) اور سو دفعہ شام (بعد مغرب یا بعد عشا) اس کے پڑھنے کی عادت ڈال لی جائے اور اسی طرح اس کے ساتھ سو سو دفعہ استغفار اور درود شریف پڑھنا معمول بنا لیا جائے اور جلدی گنتی پوری کرنے کے لئے بہت رواں اور جلدی جلدی نہ پڑھا جائے بلکہ سمجھ سمجھ کے اور مزے لے لے کے دل وزبان سے پڑھا جائے۔ اگر آپ خوب اچھی طرح پڑھیں گے تو بھی ان تینوں کلموں کے سو سو دفعہ پڑھنے میں آدھ گھنٹے سے کم ہی وقت لگے گا۔ بہر حال صبح شام اتنے ذکر کی عادت ہم میں سے ہر وہ شخص ڈال لے جسکو ابھی تک اتنے ذکر کی بھی عادت نہیں ہے

(۴) چوتھی بات جو ہم اپنے ہر بھائی سے کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس کو اس کی فکر ہونی چاہئے کہ اللہ و رسولؐ اُس سے کیا چاہتے ہیں اور دین کیا ہے اور اس کا کیا مطالبہ ہے اور پھر اپنی زندگی کو اس کے

مطابق چلانے کی فکر کرنا چاہئے۔ دراصل جماعتوں کے ساتھ باہر نکلنا بھی اسی لئے ہے کہ جماعتی ماحول میں خود ان چیزوں کی مشق اچھی طرح کی جاسکے اور دینی تربیت حاصل کی جاسکے۔ اور چل پھر کر ان ہی چیزوں کی دوسروں کو دعوت دی جائے۔

آخر میں میں پھر عرض کرتا ہوں کہ طریق کار اور پروگرام کے سلسلے میں جو کچھ اس وقت میں نے آپ سے عرض کیا ہے یہ پوری بات نہیں ہے پوری بات صرف عمل اور تجربہ ہی سے اور اس دعوت اور جدوجہد کو لے کر جماعتوں اور قافلوں کی شکل میں اللہ کے بلاد میں پھرنے ہی سے آپ کے سامنے آئے گی، اللہ تعالیٰ آپ کے اندر اس کے لئے عزم پیدا کرے اور توفیق دے۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ۔

اگر آپ نے اس دعوت کو قبول کرلیا اور اس جدوجہد کو اپنی زندگی کا جز بنالیا اور امت میں یہ کام جس طرح ہونا چاہئے کسی درجہ میں اگر ہونے لگا تو پھر ساری دنیا میں ایک نئی زندگی انشا، اللہ آئے گی اور دنیا کا نقشہ بدل کے رہے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب روضۂ اقدس میں اس کی اطلاع ہوگی کہ آپ کی امت نے پھر سے آپ کی فکر کو اپنی فکر بنالیا ہے اور دعوت اور دینی جدوجہد کا جو کام آپ امت کے سپرد کرکے گئے تھے، امت کا ایک بڑا عنصر اس کے لئے پھر کھڑا ہوگیا ہے اور اب آپ کے لاکھوں امتی اپنے ذاتی کاموں اور اپنے گھروں کو چھوڑ چھوڑ کے اس دعوت کو لئے ہوئے شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ اور ملک بہ ملک پھر رہے ہیں تو ذرا سوچئے کہ حضورؐ کی روح پاک کو اس سے کیسی خوشی اور کتنی ٹھنڈک حاصل ہوگی اور اپنے ان امتیوں کے لئے قلب منور سے کیسی کیسی دعائیں نکلیں گی۔

دینی بھائیو اور بزرگو! اگر سب کچھ قربان کرکے بھی یہ دولت حاصل کی جاسکے تو ارزاں ہے — بس اللہ تعالیٰ ہمارے اور آپ کے دلوں کو اس کے لئے کھولے اور توفیق و ہمت نصیب فرمائے اور اس راہ کا چلنا ہمارے لئے آسان فرمائے۔ اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْنَا عَلٰی مِلَّةِ رَسُوْلِكَ وَقَوِّنَا عَلَى الْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِكَ

تعارف وتبصرہ

(از: ع ۔ س)

معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل

از نعیم صدیقی، اڈیٹر "چراغ راہ" ناشر مکتبۂ چراغ راہ ۹ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی ع۱ ـــــ

دیدہ زیب کتابت وطباعت، (۳۳۶ صفحات)، مجلّد مع گرد پوش، قیمت: ــــ (للعہ)۔

اس زمانے میں معاشی پریشانیوں کی بدولت بنی آدم کے لئے زندگی ایک مصیبت بنی ہوئی ہے، انسان پریشان ہے کہ زندگی کے دن کیسے پورے کرے، اطمینانِ خاطر کہاں سے لائے، اور عزت و آبرو کو کس طرح بچائے؟ اشتراکی فلسفہ کا کہنا ہے کہ اس کے پاس ان تمام سوالات کا کافی وشافی جواب ہے، اور اسکے عملی نظام کا قیام ان پریشانیوں سے نجات پانے کا ضامن ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ جو ملک اس کو قبول کرے گا، اُسکے اسلام کی خیر نہیں ہے! قبول کرنے والے نہ بھی چاہیں مگر اشتراکیت اپنے مزاج اور طبعی عمل سے مجبور ہے ــــ پاکستان بھی باقی دنیا کی طرح سخت معاشی پریشانیوں اور ناہمواریوں سے دوچار ہے، اور اُسے جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈھ لینا ہے۔ نعیم صدیقی صاحب نے اپنی اس تصنیف کے ذریعہ ملّتِ پاکستان کی ایک ایسے حل کی طرف رہنمائی کی ہے جو اسکے مزاج اور اسکی روایات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہ حل ہے اسلام کا معاشی نظام، اپنے پورے پس منظر کے ساتھ ــــ

کتاب کے بنیادی مباحث یہ ہیں:ــ

کمیونزم یا اسلام ــــ معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل ــــ معاشی اصلاح کی اسلامی اسکیم

اسلامی اسکیم کا عملی نفاذ

ان مباحث پر تقریباً ایک سو ذیلی عنوانات کے تحت شرح وبسط کے ساتھ بحث کی گئی ہے، اور دکھلایا گیا ہے کہ اسلام موجودہ دور کے معاشی مسائل کو کس قدر اطمینان بخش طور سے حل کرسکتا ہے۔

اشتراکیت، مذہب اور اخلاق

از:- نذر محمد خالد۔ ناشر مکتبۂ چراغِ راہ۔ (۱۴۰ صفحات) عمدہ کتابت وطباعت۔ قیمت:- (عہ) ۔

روس میں اشتراکی انقلاب کے بعد مذاہب اور اخلاق پر کیا گذری؟ یہ ایک بڑی دردناک داستان ہے اور یہیں سے یہ بات دُنیا نے جانی کہ اشتراکیت، مذہب اور اخلاق کو برداشت نہیں کرسکتی، اشتراکی مبلغین اس حقیقت کو طرح طرح کے پروپیگنڈے اور تاویلات میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، اور باور کرانا چاہتے ہیں کہ اشتراکیت کو مذہب واخلاق سے کوئی بیر نہیں ہے، مگر وہ یہ نہیں سوچتے کہ بانیین اشتراکیت کے اقوال ونظریات اور حاملین مذہب واخلاق پر "سُرخ فوجوں" کی دست درازیوں کے تاریخی واقعات کو وہ آخر کہاں لیجا کر دفن کردینگے!۔

یہ کتاب جو اوّل سے آخر تک اِدّعا آت سے نہیں، ٹھوس تاریخی اور تصنیفی مواد سے لبریز ہے، ان لوگوں کے لئے ایک چیلنج ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا، کہ اشتراکی جنت کی تعمیر کے لئے مذہب واخلاق کی تخریب ضروری ہے۔

ہندوستانی سوشلزم

از:- سید اصغر علی عابدی۔ ۴۸ صفحات۔ (قیمت:- ۸/) ناشر مکتبۂ "فکرِ نو" ۱۳۵ع شاہ گنج (الہ آباد)۔

اس کتابچہ میں عابدی صاحب نے ہندوستانی سوشلزم کی حقیقت پر روشنی ڈال کر بتلایا ہے کہ یہ یورپ سے آیا ہوا حقیقی سوشلزم نہیں ہے، بلکہ مختلف اجزاء سے تیار کیا ہوا ایک نیا مرکب ہے اور اس کا تجزیہ کرکے دیکھا جائے تو اس میں گاندھی ازم اور ہندو ازم کی کافی آمیزش نظر آتی ہے۔ نہایت دلچسپ کتابچہ ہے اور صاف گوئی اور بے باکی کے لحاظ سے قابلِ داد۔

۱۔ جنّت سے زمین پر ۴ر	از:۔ ابنِ احمد قرنی (ایم، اے)۔ مکتبۂ فلاحِ انسانیت،
۲۔ پہلا خون ۴ر	لوٹیا بلڈنگ
۳۔ خوفناک طوفان ۶ر	آرام باغ روڈ
۴۔ خدائی معمار ۸ر	کراچی

بچّوں کو قصّوں کہانیوں سے بہت دلچسپی ہوتی ہے، کہانیوں کی چھوٹی چھوٹی کتابوں کو وہ بہت پسند کرتے ہیں، اور کہانی جو سبق دیتی ہے وہ اُن کے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے، جس کو وہ مدّتوں نہیں بھولتے۔ عام طور سے لوگ تجارتی نقطۂ نظر سے کہانیاں لکھ کر مارکیٹ میں لاتے ہیں۔ اُنھیں اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ ان کہانیوں کا اثر بچّوں کی نفسیات پر اچھا پڑے گا یا بُرا۔ ابنِ احمد صاحب قرنی نے ہمارے آپ کے بچّوں کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے سچّی اور اصلاحی کہانیوں کا ایک دلچسپ اور سبق آموز سلسلہ شروع کیا ہے۔ زیرِ تبصرہ چاروں کتابیں چار کہانیوں پر مشتمل ہیں، جو قرآنی قصص سے ماخوذ ہیں۔

المکالمۃ الاعظمیہ	(یعنی اُردو عربی ترجمہ حصّۂ اوّل وحصّۂ دوم) از:۔ مولانا محمد حسن اعظمی
الجزء الاوّل والجزء الثانی	(فاضل جامعہ ازہر مصر)۔ ناشر۔ پروپرائٹر مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ

حیدرآباد دکن۔ قیمت:۔ فی حصّہ (عہ)۔

اس تالیف کا مقصد عربی طلباء میں عربی سے اُردو اور اُردو سے عربی ترجمہ کی استعداد پیدا کرنا ہے کتاب سے اس مقصد میں کامیاب ہونے کی کہاں تک توقع ہے؟ سچّی بات ہے کہ اس حیثیت سے رائے زنی کا حق اہلِ تدریس وتعلیم کو ہے، خاص طور سے ان حضرات کو جو انشاء سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں کوئی رائے ظاہر نہیں کرنا چاہتے، مگر کتاب کے "حرفِ آغاز" (دیباچہ) میں فاضل مؤلف نے اپنی تالیف کی فوقیت جتانے کے لئے عربی ادب وانشاء کے معاملہ میں عام ہندوستانی علماء کو جو ایک سِرے سے نااہل قرار دیدیا ہے، اور یہ خیال قائم کرلیا ہے کہ جسنے مصر وشام جاکر نہیں پڑھا، وہ نہ صحیح عربی بول سکتا ہے نہ لکھ سکتا ہے یہ ایک بڑی ناروا جسارت ہے۔ الحمدللہ ہندوستان وپاکستان میں متعدد ایسی ہستیاں موجود ہیں، جو صحیح نہیں،

نہایت سلیس و بلیغ اور شگفتہ عربی بولنے اور لکھنے پر ماہرانہ قدرت رکھتی ہیں، اور اہلِ عرب بھی اُنکے قائل ہیں۔

سیاسی ادارات

از:- محمد رحمت علی صاحب ایم اے (عثمانیہ) ناشر:- رضوی اینڈ کمپنی، نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن
کاغذ، کتابت، طباعت معمولی - ۶۲ صفحات - قیمت:- ۸؍

قدیم روما اور یونان میں کون کون سے سیاسی ادارے تھے، یہ ادارے کس نہج پر قائم کئے جاتے تھے، پھر یہ کس ڈھنگ پر کام کرتے تھے وغیرہ وغیرہ؟- اس مقالہ میں انھیں امور کی تفصیل اور تحقیق پیش کیگئی ہے قیمت ظاہری حیثیت سے بہت زیادہ ہے۔

عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی (جلد اوّل)

از:- جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب - ناشر:- مکتبۂ ابراہیمیہ - حیدرآباد (دکن)
کتابت، طباعت اور کاغذ بہتر - ۳۲۰ صفحات - مجلّد - قیمت:- للعہ؍

کتاب نئی نہیں ہے، یہ دوسرا ایڈیشن ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ "رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیاسی زندگی" کی طرح یہ بھی کوئی مستقل تالیف نہیں ہے، بلکہ ڈاکٹر صاحب کے مختلف مقالات ہیں جو بقول خود ڈاکٹر صاحب کے "انفرادی طور پر، بہ اجازت و بلا اجازت نہ معلوم کتنی دفعہ کہاں کہاں چھپے۔ کتابی صورت میں پہلی بار ان کو دہلی کے مکتبۂ جامعہ نے چھاپا تھا، اور اب دوسری بار حیدرآباد کے مکتبۂ ابراھیمیہ نے اس صورت میں یکجا کر دیا ہے۔ ہر مقالہ اپنے موضوع پر خوب ہے، خاص طور سے تین مقالے:- (۱- قرآنی تصورِ مملکت - ۲- اسلامی عدل گستری اپنے آغاز میں - اور ۳- عہدِ نبویؐ کی سیاست کاری کے اصول) تو بہت ہی خوب، اور قابلِ دید ہیں۔

کتابی اغلاط بہت ہیں، جن کی وجہ سے چھ صفحے کا غلط نامہ شروع میں لگانا پڑا ہے۔

انتخاب

ادارہ

سمپورنانند جی غور فرمائیں!

۱۵ اگست کو مظلوم اور دل گرفتہ مسلمانوں نے جو احتجاجی مظاہرہ کیا اس سلسلہ میں ایک بیان تو پنڈت جواہر لال نہرو نے دیا یعنی کہ "ایسے لوگ انجان ہیں" اور ایک بیان شری سمپورنانند جی نے دیا کہ "یہ لوگ غدار ہیں۔ یہ بات ہم نے اس لیے کہی کہ اس سے نہرو اور سمپورنانند کے ذہنی رجحانات کا پتہ چلتا ہے حالات کی ستم ظریفی یہ ہے کہ نہرو بھی کانگرس میں ہیں اور ہندوستان کے وزیر اعظم ہیں اور سمپورنانند جی بھی کانگرسی ہیں اور یو پی کے وزیر داخلہ ہیں۔ درحقیقت یہ اجتماع ضدین ہی ہماری داخلی سیاست کی پیچیدگیوں کا خاص سبب ہے۔ بہرحال ہم سمپورنانند جی کی خدمت میں سناتن دھرم مہابیر دل کے صدر شری شمبھوناتھ چوپڑا کا وہ مکتوب پیش کرتے ہیں جسے موصوف نے "ٹائمز آف انڈیا" کے ایڈیٹر کے نام لکھا ہے۔ آنریبل وزیر داخلہ غور فرمائیں اور ایک پبلک بیان دیکر شمبھوناتھ جی کے بارے میں اپنے افکار عالیہ کا اظہار کریں۔ شمبھوناتھ جی نے ایڈیٹر کو لکھا ہے کہ

"آپکے اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی ہے جس میں ۱۵ اگست کو سیاہ جھنڈیوں سے مظاہرہ کرنے والوں کیخلاف بدترین غداری کے الزام میں چارہ جوئی پر زور دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ہندوستان کی جمہوری حکومت اپنی حقیقت..... اس قدر جلد بے نقاب کرنے کے لیے تیار ہو تو مظاہرین ہی نہیں بلکہ دوسرے لاکھوں، کروڑوں انسان اس اقدام کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس نامناسب عبارت کے خلاف احتجاج کے سلسلہ میں مسلمانوں کو نہ صرف ہندوستان کی بلکہ تمام دنیا کی اخلاقی حمایت حاصل ہو۔ حضرت محمدؐ صاحب اس خدا کے پیغمبر ہیں جس کی ہم سب عبادت کرتے ہیں، اس لیے ناموس پیغمبر کا تحفظ ہر قسم کی فرقہ داریت سے بلند ہے اور ہمارا فرض ہو کہ ہم اس مقدس فرض کی ادائیگی کے لیے جد و جہد کریں — ہم اپنی اس جد و جہد کو انتہا تک پہنچا کر رہیں گے۔ ہمیں دوسرے مذاہب اور ادیان دین کا احترام کرنا چاہیئے تاکہ دوسرے مذاہب کے پیرو ہمارے مذاہب اور مذہبی رہنماؤں کا احترام کریں۔"

"مدینہ"

عزّت و ذلّت "ریاست" دہلی کا ایک مشہور اور پرانا اخبار ہے۔ اس نے اپنے ایک مضمون میں ہندستانی مسلمانوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اسکا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ پہلے تو ہندو ایک مسلمان کو خانصاحب، خانصاحب کہتے تھے مگر اب مسلمان ایک ہندو کو لالہ جی لالہ جی کہتے نہیں تھکتے

۲۔ پہلے کوئی ہندو اس لیے چھت پر نہ سو سکتا تھا کہ کہیں پڑوس میں کسی مسلمان خاتون کی بے پردگی نہ ہو لیکن اب وہ دندناتے ہوئے چھتوں پر سوتے ہیں اور کسی مسلمان کی مجال نہیں کہ دم مار سکے۔

۳۔ پہلے دہلی میں گائے ذبح ہوتی تھی، اب اگر کوئی مسلمان چھپا چوری بھی یہ حرکت کرے تو خود اس کے بھائی مسلمان ہی ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے اسے گرفتار کرا دیتے ہیں۔

۴۔ آج کوئی ہندو مسلمان خاتون کو دیکھکر اگر اس پر آوازے کسے تو کسی مسلمان کی یہ ہمّت نہیں کہ لوٹ کر کچھ کہہ سکے البتہ اگر کوئی مسلمان غنڈہ کسی ہندو عورت کے ساتھ یہی حرکت کر بیٹھے تو اسکی پسلیاں تک توڑ ڈالی جائیں گی۔

یہ اور اسی طرح کی بہت سی باتیں لکھکر مسلمانوں کو یہ بتانے کی کوشش کیگئی ہے کہ اس آزاد ملک میں آج ان کا مقام کیا ہے؟

مسلمانوں کی حالت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اسے بہت زیادہ غلط نہیں کہا جا سکتا بلکہ بعض بعض مقامات پر تو حالت اس سے بھی کچھ زیادہ خراب ہی ملے گی ___

کیا واقعی مسلمان اس بات کے سوچنے کیلئے ابھی تیار نہیں ہیں کہ اس ملک میں انکی یہ حالت کیوں ہو گئی اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ ہم یہ بات ان مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں جو یہ ایمان رکھتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارادے سے ہوتا ہے، اور یہ کہ مسلمانوں کو عزّت اور سرفرازی حاصل کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا اور اسکی نافرمانی سے بچنا بہت ضروری ہے۔ (الحسنات رامپور)

۵۵ سال بعد! (ہمارے وقایع نگار کے قلم سے) ناگپور ۲۲ جولائی۔ ۱۶ جولائی کو جامع مسجد برہانپور کے سامنے سے ۵۵ سال بعد بالی کے لیے شیو جی کی پوجا کا جلوس باجا بجاتا ہوا نکلا۔ مسلمانوں نے ڈپٹی کمشنر کو تار بھی دیئے اور جلوس کوئی چار گھنٹہ تک کا رہا۔ لیکن ڈپٹی کمشنر کے یہاں سے جواب آیا کہ سرکار حکم دے چکی ہے کہ باجے کو مسجد اور مندر کے سامنے سے گزرنے کی آزادی حاصل ہے۔ اور مسلمانوں کو تنبیہ ملی، کہ حکم سرکار کی مخالفت سے باز رہیں، جلوس بخیریت گزر گیا"

بیشک خبر تھی بھی ایسی ہی کہ "سٹیٹسمین" پریس میں اتنی خوشی کے ساتھ شائع ہو۔ لیکن باجہ کی "آزادی" اور ذبیحہ پر "پابندی" کے ساتھ دیکھیے ابھی اور کن کن چیزوں کو "آزادی" حاصل ہونے والی اور کن کن چیزوں پر پابندی لگنے والی ہے! ___ "آزادی ہند" کے مخالفوں کی بدگمانیاں اور پیش گوئیاں آج سے چند سال قبل والی بالآخر کچھ صحیح ہی نکلتی آ رہی ہیں۔

(صدق جدید لکھنؤ)